PAGES MISSING WITHIN THE BOOK ONLY

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگارِ علامہ فصیح آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

فہرستِ مضامین

جلد ۳۹ — نمبر ۳

ہمایوں بابت ماہِ مارچ ۱۹۴۱ء

تصویر: سرائے کی چٹان

چندہ سالانہ: پانچ روپے چھ آنے، ششماہی: تین روپے مع محصول — قیمت فی پرچہ: ۸/

جہاں نما

اُردو ٹائپ

مسٹر ایشور داس نگو نے جو لائل پور کے ایک بنک میں ملازم ہیں ہمیں ایک نو ایجاد اُردو ٹائپ کا نمونہ بھیجا ہے۔ اردو ٹائپ کا مسئلہ مدت سے اہلِ فن کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے مگر اب تک کوئی تسلی بخش ٹائپ ایجاد نہیں ہوا۔ اردو ٹائپ کی کامیابی کے رستے میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ دوسری زبانوں کے ٹائپ کے مقابلے میں ہمارے ہاں الفاظ کے بہت زیادہ جوڑ ہیں مثلاً نستعلیق عثمانیہ ٹائپ میں تقریباً چھ سو جوڑ ہیں اور نسخ میں سو تین سو۔ اسی وجہ سے یہ ٹائپ ناکام رہے ہیں۔

مسٹر ایشور داس نگو کی ذہانت قابلِ تعریف ہے کہ انھوں نے اُردو کے لئے ایک بہت اچھا ٹائپ ایجاد کر لیا ہے۔ یہ ٹائپ اردو کے علاوہ عربی اور فارسی کے لئے بھی یکساں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ آپ یہ سن کر نگو صاحب کے کمال کی داد دیں گے کہ اُن کے ایجاد کردہ ٹائپ میں صرف ۴۸ جوڑ ہیں اور اُن کا دعویٰ ہے کہ وہ مزید تخفیف سے اس عدد کو ۴۲ تک پہنچا سکتے ہیں۔

اُردو رسم الخط کی ایک دقت یہ ہے کہ اس کے حروف دوسرے حروف کے ساتھ مل کر اپنی صورت بدلتے رہتے ہیں۔ ایک ایک حرف کئی کئی صورتیں بدلتا ہے۔ اُردو کے حروفِ ہجا ۳۶ ہیں لیکن اس کے ٹائپ میں ۲۵۰ سے لے کر ۵۹۴ تک جوڑ ہو سکتے ہیں۔ ٹائپ کے اس قدر کثیر التعداد ٹکڑوں کے ساتھ کسی عبارت کی تشکیل اس قدر محنت اور وقت کا کام ہے کہ اس سے ٹائپ کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

یہی حالت اُردو ٹائپ رائٹر کی ہے۔ ریمنگٹن کے اردو ٹائپ رائٹر میں حروفِ ابجد کی ستر مختلف صورتیں ہیں۔ ہندسے اور دیگر نشانات جن کی تعداد بائیس ہے ان پر مستزاد ہیں۔ اس ٹائپ کے حروف کی کنجیوں (KEYS) کی تعداد ۴۶ ہے اور ہر کنجی دو حروف (بالائی و زیریں) کی حامل ہے۔ بالائی حروف کے استعمال کے لئے "شفٹ کی" استعمال کرنی پڑتی ہے اور ٹائپ کرتے وقت "شفٹ کی" کو اتنا زیادہ استعمال کرنا پڑتا ہے کہ اس سے ٹائپ کی رفتار بہت سست ہو جاتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ٹائپ رائٹر کا مقصد بھی فوت ہو جاتا ہے۔

مذکورۂ بالا وجوہ سے اردو املا میں بھی مشکل پیدا ہوتی ہے حروف کی یہ ہم متغیر صورتیں نو آموزوں کے لئے پریشان کن ہیں۔ اس لئے اردو پڑھنے اور پڑھانے میں ذرا دقت محسوس ہوتی ہے کیونکہ محض اردو حروفِ ابجد سیکھ کر کوئی شخص اس وقت تک اردو عبارت کو پڑھنے کے قابل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ حروف کی متغیر صورتوں سے بھی آشنا نہ ہو جائے۔

اردو ٹائپ، ٹائپ رائٹر اور ابجد کی ان مشکلات کو پیشِ نظر رکھ کر نگو صاحب نے لکھنے کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا ہے۔ اسی طریقے سے اُنھوں نے ٹائپ کے لئے حروف بنائے ہیں۔ اور یہ کوشش کی ہے کہ مجوزہ صورت حروف کی موجودہ صورت سے زیادہ سے زیادہ مشابہ رہے۔ اور سب حروف عبارت میں حتی الامکان اپنی اصل صورت قائم رکھیں۔ حروف کو جوڑنے میں آسانی پیدا کرنے کے لئے تمام حروف کی بلندی یکساں رکھی گئی ہے۔ اس ٹائپ کے استعمال سے

اردو، فارسی اور عربی عبارت کا چھاپنا ٹائپ کرنا اور لکھنا پڑھنا آسان ہو جائے گا۔ کیونکہ اس میں جوڑوں کی تعداد کم ہے اور حروف کی صورت بار بار بدلتی نہیں۔

مگو صاحب نے ہمیں اپنے ایجاد کردہ ٹائپ کی عبارت کا ایک نمونہ بھی بھیجا ہے جسے ہم سمجھنے سمجھانے کے لئے ذیل میں نقل کرتے ہیں ہمیں امید ہے کہ اہلِ نظر مگو صاحب کی ہر ممکن طریقے سے حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔

نمونہ ہندوستانی ٹائپ

ا ب پ ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ ر ڑ
ز ژ س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک گ
ل م ن و ہ ھ ی ے ۓ ۔

۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶ ۷ ۸ ۹ ۰

ہندوستانی ٹایپ میں الفاظ
لکھنے کے لیئے ۔ انگریزی کی طرح ۔
حروف کو اُنکی اصلی شکل میں مِلا
دیا جاتا ہے۔

ایشور داس مگو
دی سنٹرل بنک آف انڈیا لمیٹڈ ۔
لائلپور ۔

ِ ُ َ ٗ ً ٍ ّ ، ؟ ٰ ٓ / = —
× ÷ + ٭ ٪ : . ! ( )

پنجاب یونیورسٹی کے امتحانوں کے مصارف

میاں عبدالحی وزیرِ تعلیم پنجاب کے بیان کے مطابق ۱۹۴۷ء میں یونیورسٹی کے مختلف امتحانات کے لئے کل ۲۴۰۵ ممتحن مقرر کئے گئے تھے سوالات کے پرچے تیار کرنے۔ اور جوابات کے پرچے دیکھنے کی مجموعی اجرت ۲۲۶۷۱۹ روپے ادا کی گئی۔ سب سے زیادہ اُجرت جو کسی واحد ممتحن کو دی گئی ۱۰۲۸ روپے ہے۔ ممتحنوں میں سے ۶۴۴ افراد بیرون پنجاب سے مقرر کئے گئے تھے۔

پنجاب میں جرائم کا اضافہ

سردار بہادر اجّل سنگھ نے پنجاب اسمبلی میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے پنجاب میں جرائم کی رفتار کے متعلق حسب ذیل اعداد و شمار پیش کئے :-

سال	قتل	ڈاکا	لوٹ مار	نقب زنی
۱۹۳۶	۸۹۸	۸۴	۴۵۲	۱۳۴۲۶
۱۹۳۷	۹۳۳	۸۷	۴۸۱	۱۴۰۴۴
۱۹۳۸	۱۰۴۱	۹۲	۵۶۷	۱۵۶۲۱
۱۹۳۹	۱۱۳۳	۱۴۹	۶۷۴	۱۶۷۲۷

جن لوگوں پر قتل کا الزام ثابت ہوا۔ اُن کی تعداد سال وار حسب ذیل ہے :-

۱۹۳۶	۷۶۶
۱۹۳۷	۸۰۹
۱۹۳۸	۷۶۴
۱۹۳۹	۸۹۶

سردار صاحب نے کہا کہ "قتل کی وارداتوں کے اضافے کی کوئی خاص وجہ معلوم نہیں ہو سکی۔ البتہ مشرقی پنجاب میں ڈاکے اور لوٹ مار کے واقعات کے اضافے کی وجہ اس علاقے میں مفرور مجرموں اور مفرور فوجی ملازموں کی موجودگی ہے۔ نقب زنی کی وارداتوں میں اس لئے اضافہ ہوا ہے کہ مشرقی ضلعوں میں قحط ہے۔ اس کے بعد پارلیمنٹری سکرٹری صاحب نے شاید پنجابیوں کی تسلی کے لئے فرمایا کہ جرائم کی رفتار میں یہ اضافہ پنجاب ہی میں نہیں دوسرے صوبوں میں بھی ہوا ہے۔ مثلاً صوبجات متحدہ میں نقب زنی کی وارداتیں ۱۹۳۶ء کے مقابلے میں ۱۹۳۹ء میں ۱۱۴۸۳ سے ۴۰۹۴۱ تک پہنچ گئیں۔ ڈاکے کی وارداتیں ۱۳۱ سے ۱۱۵۔ اور قتل کی وارداتیں ۷۹۳ سے ۱۳۴۲ تک پہنچ گئیں۔ صوبجات متوسط، بمبئی اور مدراس میں بھی جرائم میں اضافہ ہی ہوا ہے۔"

دوسرے صوبوں کی جرائم پیشگی کی اطلاع بڑی تسلی بخش ہے۔ اب ہمیں کس بات کا کھٹکا ہے۔ مرگِ انبوہ جشنے دارد۔

ہندوستانی زبان اور سینما

مسٹر کے۔ اے عباس آرین پاتھ میں سینما کے ذریعہ سے ہندوستانی زبان کی ترقی کے متعلق ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ اگر سینما کو ہندوستانی زبان کا ذریعۂ تعلیم بنایا جائے

تو ہر شخص بہت جلد یہ زبان سیکھ جائے گا۔ مضمون نگار نے بتایا ہے کہ ہندوستانی فلمیں اُن علاقوں میں بھی بہت ہر دل عزیز ہیں جہاں کی زبان ہندوستانی نہیں۔ وہ لکھتے ہیں :-

سینما نے زبان کے سلسلے میں دو اہم کام کئے ہیں۔ اوّل یہ کہ اس کے ذریعے سے عام کے ذخیرۂ الفاظ میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ دوسرا کام جو اس سے زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ سینما نے اُن علاقوں کو بھی جہاں ہندوستانی نہیں بولی جاتی اس زبان سے کافی آشنا کر دیا ہے۔ دس سال قبل جنوبی ہند کے کسی باشندے سے آسان سے آسان ہندوستانی زبان کا کوئی فقرہ سمجھنے یا ادا کرنے کی بہت کم توقع کی جا سکتی تھی۔ دہلی کے کسی باشندے کے لئے بنگلور، حیدرآباد سندھ اور چٹاگانگ کے رہنے والوں پر اپنا مفہوم واضح کرنا تقریباً ناممکن سا تھا۔ آج حالت بہت بدل چکی ہے۔ اب ناگ پور کے بازار میں کوئی پنجابی کسی تامل سے بات چیت کرنے میں دقت محسوس نہیں کرتا۔ یہ سینما کے ذریعے سے اُن علاقوں پر ہندوستانی زبان کی یورشوں کا اثر ہے۔ جہاں یہ زبان نہیں بولی جاتی کانن بالا، دیویکا رانی اور سہگل وغیرہ کے فنی کمالات اور موسیقی کی ساحرانہ کشش ہر روز ہزاروں ایسے تماشائیوں کو جن کی زبان تامل، تلنگی، کنڑی، سندھی یا پنجابی ہوتی ہے کشاں کشاں مقامی تماشا گاہوں میں لے جاتی ہے جہاں ہندوستانی زبان کی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ اس طرح ہندوستانی زبان کی ہر دل عزیزی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اس بات کا صحیح اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ مقامی زبانوں کی فلمیں ہندوستانی فلموں کی جگہ نہیں لے سکیں اور جنوبی ہند میں تامل یا تلنگی زبان کی فلموں کے مقابلے میں ہندوستانی فلمیں بہت زیادہ روپیہ پیدا کرتی ہیں۔

والمیکی کی رامائن کا قدیم ترین نسخہ

حکومت نیپال نے لاہور کی "انٹرنیشنل اکیڈیمی آف انڈین کلچر" کو والمیکی کی رامائن کے ایک بہت قدیم نسخے کی ۵۰۰ تصویریں پیش کی ہیں۔ درختوں کے پتوں پر لکھے ہوئے اس نسخے سے پرانا کوئی نسخہ ہندوستان بھر میں موجود نہیں ہے۔ اس کی کتابت کا سال سمت ۱۰۷۵ وکرمی مطابق ۱۰۱۸ء ہے۔ "انٹرنیشنل اکیڈیمی آف انڈین کلچر" اس عظیم الشان نظم کا ایک نیا نسخہ مرتب کر رہی ہے جو ان تصویروں سے مزین ہوگا۔

دہلی کا مجوزہ براڈ کاسٹنگ ہاؤس

دہلی میں آل انڈیا ریڈیو کی ایک بہت بڑی مرکزی نشرگاہ کی تعمیر کی تجویز ہوئی ہے حکومت نے اس کی تعمیر کے مصارف کے لئے جن کا اندازہ نو لاکھ تیس ہزار روپے کیا گیا ہے اپنی منظوری دے دی ہے۔

دہلی کے سٹیشن کے پھیلاؤ اور اس کے حلقۂ عمل میں عالمگیر توسیع کی تجویز کے پیش نظر اس کے لئے ایسی عمارت اور ضروری ساز و سامان کی ضرورت بہت شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔

جدید عمارت میں سٹیشن ڈائرکٹر دہلی کے دفتر کے علاوہ نشر اطلاعات کا مرکزی ادارہ، صدر دفتر آل انڈیا ریڈیو، تجربہ گاہ اور سٹوڈیو وغیرہ بھی ہوں گے اور اس کے بعد کرائے کی عمارتوں کی ضرورت نہ رہے گی۔

ہندوستان کے محکمۂ تار و ڈاک کی آمدنی

سنہ ۱۹۴۰-۱۹۳۹ء میں محکمۂ تار و ڈاک کی بچت ۸۹۵۹۰۰۰ روپے تھی سنہ ۲۶-۱۹۲۵ء سے جب اس محکمہ کا حساب تجارتی طریق کار کے ماتحت رکھا جانے لگا کبھی اتنی بچت نہ ہوئی تھی۔ ڈائرکٹر جنرل نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ اس غیر معمولی بچت کی وجہ جنگ کے باعث تار و ڈاک اور ٹیلیفون کے استعمال کی کثرت ہے۔

محکمے کی کل آمدنی میں اس سال ۸۰۹۲۰۰۰ کا اضافہ ہوا۔ اس دفعہ کل آمدنی ۱۲۴۸۵۲۰۰۰ روپے ہے۔ گزشتہ سال کل آمدنی ۱۱۶۷۶۰۰۰ روپے تھی۔ کل آمدنی کا یہ اضافہ حسب ذیل مدّدوں پر مشتمل ہے:۔

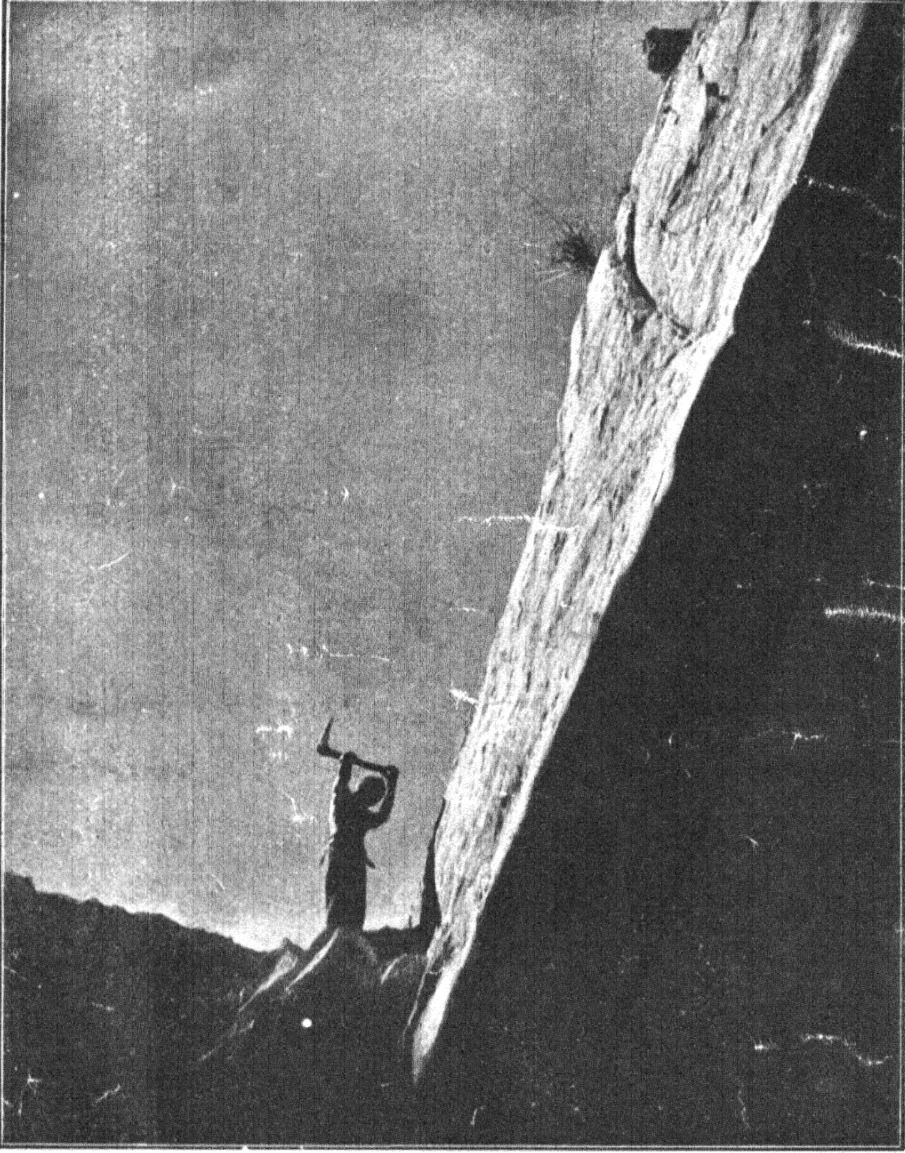
ڈاک خانہ	تقریباً ۱۹۰۰۰۰	روپے
تار	تقریباً ۴۰۰۰۰۰۰	روپے
ٹیلیفون	تقریباً ۲۱۰۰۰۰۰	روپے
ریڈیو یعنی بے تار برقی ٹیلیگراف	تقریباً ۱۰۰۰۰۰	روپے

یو۔پی میں تمباکو کی کاشت

حکومت نے بھراری (بندیلکھنڈ) کے سرکاری فارم میں تمباکو کی کاشت کی منظوری دی ہے جب سے برطانی حکومت نے امریکا سے تمباکو کی درآمد بند کرنے کا فیصلہ کیا ہے یہ تجویز زیر غور تھی حکومت نے بھراری کے سرکاری فارم میں چار سال تک ورجینیا کے تمباکو کی کاشت کا تجربہ کیا ہے جس سے ثابت ہوا ہے کہ بندیلکھنڈ میں جو پالے اور ژالہ باری وغیرہ سے نسبتہً محفوظ ہے تمباکو کی کاشت کامیاب ثابت ہوگی۔ تجویز یہ ہے کہ تقریباً چار سو ایکڑ زمین میں تمباکو کی کاشت ہو۔ ان میں سے سو ایکڑ زمین سرکاری فارم کی ہوگی۔ جہاں حکومت کا محکمہ تمباکو بوئے گا۔ باقی تین سو ایکڑ کی کاشت کو آپریٹو سوسائٹیوں کے انتظام کے ماتحت ہوگی۔

کل کاشت کی نگرانی محکمۂ زراعت کرے گا۔ اور تمام فصل "انڈین لیف ٹبیکو کمپنی لمیٹڈ" کے پاس فروخت ہوگی۔ جو صلاح و مشورہ سے محکمۂ زراعت کی مدد کرے گی +

حامد علی خاں



سرمایے کی چٹان

لندنی دوست کے نام خط

ذہنیت! ہاں ہوتی ہے لیکن ذہنیت ملکوں اور قوموں کی ہوتی ہے۔ یہاں نہ ملک ہے نہ قوم۔ ہندوؤں کے متعلق میں کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن پنجاب کے مسلمان کی یہ حالت ہے کہ صبح اٹھتا ہے تو خالی الذہن ہوتا ہے۔ ناشتے سے قبل اخبار میں جناح کا ہنگامہ خیز بیان پڑھ لیا تو اپنے آپ کو مسلم لیگی سمجھنے لگتا ہے۔ دوپہر کو صاحب بہادر نے دفتر میں چمکارا تو وفادار رعایا بن جاتا ہے۔ سہ پہر کو مہا بھائی تُم کانگرسی دوست سے بحث کر کے ہارنے کے بعد کانگرس پر ایمان لے آتا ہے اور شام کو موچی دروازہ کے باہر احراری لیڈر کے گرفتار ہونے کے بعد جلسے میں شامل ہو کر "مولانا زندہ باد" کے نعرے لگاتا ہے۔ رات کو بستر پر لیٹتا ہے تو پھر سب کچھ فراموش کر دیتا ہے اور اتنا بھی نہیں سوچتا کہ دن بھر جو چار پانچ دفعہ اُس نے اپنا ایمان بدلا ہے اُس سے اُس کو کیا فائدہ یا نقصان ہوا ہے۔ چنانچہ دوسری صبح وہ پھر خالی الذہن ہوتا ہے اور پھر سے اُس کی زندگی کا وہ چکر چلنے لگتا ہے جس کی تفصیل میں دے چکا ہوں۔ کہو ان حالات میں ذہنیت کی تربیت کس طرح ہو سکتی ہے۔ تم بُری ذہنیت کا ماتم کر رہے ہو لیکن لندن میں چار سال رہ کر ہندوستان کو غالباً بھول چکے ہو۔ یہاں اچھی اور بُری ذہنیت کا سوال ہی نہیں۔ یہاں تو اکثر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہماری ذہنیت ہے بھی یا نہیں۔ ہماری زندگی تو سینما ہال کی زندگی ہے۔ زندگی کی فلم پردۂ سیمیں پر چل رہی ہے۔ اور ہم ذہنی خلا کے ہال میں بیٹھے ہوئے اس کو دیکھ رہے ہیں۔ اگر اس فلم کے مناظر دلفریب اور قہقہہ انگیز ہیں تو ہم کرسی پر بیٹھے ہوئے لوٹن کبوتر بن رہے ہیں۔ اگر فلم یاس انگیز ہے اور دردناک مناظر سے لبریز ہے تو ہم آہستہ آہستہ سسکیاں لے رہے ہیں اور رومال سے آنکھوں اور ناک کے قطروں کو پونچھ رہے ہیں۔ فلم ختم ہو جاتی ہے تو ہم تنہا خالی ذہن کے ہال میں رہ جاتے ہیں۔ ہمیں ہیرو بننا آتا ہے لیکن اُسی وقت تک جب تک کہ ہنگامہ خیز زندگی کی فلم چلتی ہے۔ جب ہنگامہ نہیں ہوتا تو ہم کچھ بھی نہیں ہوتے۔ تم وہاں بیٹھے بیٹھے ہماری ذہنیت کو کوس رہے ہو اور کہتے ہو کہ ہماری ذہنیت ہی ہمیں آزادی کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہے۔ تم ولایتی باتیں کرتے ہو۔ یہ نہیں سمجھتے کہ ہمارے ہاں ذہنیت کا لفظ شرمندۂ معنی نہیں ہوا۔ یاد ہے ہم تم دونوں پٹنی ہائی سکول کو دیکھنے گئے تھے تو یہ دیکھ کر حیران ہوئے تھے کہ وہاں فرنگی بچوں کے عام مطالعہ کی کتابوں میں ہندوستان کے متعلق کتنی بے سروپا باتیں درج تھیں۔ تم نے تو سکول مسٹرس سے اچھی خاصی بحث بھی چھیڑ دی تھی کہ ہندوستان میں یوں نہیں ہوتا کہ گلی کوچوں میں ہاتھی اور سانپ پھن اٹھائے ہوئے پھر رہے ہوں اور یہ بھی غلط ہے کہ ہر ایک فرنگی لڑکی کو دیکھ ہندوستانی ٹوکری میں بند کر کے اُٹھا کر لے جاتے ہیں اور یا مار ڈالتے ہیں یا اُس کو دیوی بنا کر پوجنا شروع کر دیتے ہیں۔ تمہارا یہ خیال تھا کہ ہندوستان میں بھی سفید رنگ کے مرد اور عورتیں ہوتی ہیں اور مثال کے طور پر تم نے بار ہا اپنے اُبھرے ہوئے منگولی رخساروں پر انگلی لگائی تھی جن میں سے خون چھوٹ کر نکلنے کے لئے مچل رہا تھا۔ گو اس پر مسٹرس نے لجا کر آنکھیں نیچی کر

لی تھیں لیکن فرنگی زادی کو تم قائل نہیں کر سکے تھے کیونکہ تمہارے اصرار کے باوجود وہ کہہ رہی تھی "ممکن ہے اب ہندوستان کی حالت مختلف ہو لیکن بہت ممکن ہے کہ جب یہ کتاب لکھی گئی ہو اُس وقت ہندوستان کی وہی کیفیت ہو جو اس کتاب میں درج ہے۔ آخر سفید لوگ (فرنگی) اتنی دیر سے وہاں ہیں اُن کا کچھ اثر تو پڑا ہوگا"۔ یعنی یہ کہ سفید لوگوں کو دیکھ دیکھ کر ہاتھیوں اور سانپوں نے گلیوں میں آنا چھوڑ دیا ہے۔ سمجھتے ہو اُس کے مصر ہونے میں کیا راز مضمر تھا۔ یہی وہ چیز تھی جس کو تم ذہنیت کہتے ہو۔ اس سکول مسٹرس اور اُس کی اُستانی اور پھر اُس کی اُستانی سب یہی کتاب پڑھی ہوئی تھیں جس پر ہم معترض تھے اور اس کتاب سے ہر فرنگی بچے نے اپنی عمر کے ابتدائی حصے میں ہندوستان اور ہندوستانیوں سے نفرت کی ذہنیت پیدا کر لی تھی۔ ذہنیت پیدا کرنے کے لئے ملکی اور قومی سعی کی ضرورت ہوا کرتی ہے اور فرنگی اس کام کو بطریقِ احسن اپنے ملک میں سرانجام دے رہا تھا۔ یہاں سرے سے یہ کوشش ہی مفقود ہے۔ سکولوں اور کالجوں کے نصاب میں ہر وہ چیز موجود ہے جو قوم یا ملک کی عملی زندگی کو سنوارنے کے لئے مفید نہیں۔ لیکن ہر اُس چیز سے بے اعتنائی برتی گئی ہے جو آدمی کو انسان اور انسان کو مفید شہری بنا سکتی ہے۔ پھر جہاں تربیت کا یہ عالم ہو وہاں ذہنیت کس طرح پیدا ہو سکتی ہے۔ مانو نہ مانو میں بہرحال اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہاں ذہنیت کا فقدان ہے۔ اس لئے تم اس کے بُرا ہونے کا ماتم نہ کیا کرو۔

ذہنیت کا ذکر کرتے کرتے یہاں کی (Compleces) ذہنی الجھنوں (خُدا جانے اردو والوں نے complex کا عربی نما فارسی ترجمہ کیا کیا ہے۔ بہرحال میں نے اسے ذہنی اُلجھن کے نام سے پکارا ہے فلسفیوں کو اس پر اعتراض ہو تو بے شک رد کر دیں بہرحال تم میرا مطلب سمجھ جاؤ گے) کا خیال آ گیا۔ اگر دنیا کی ذہنی الجھنوں کی تاریخ لکھی گئی تو جہاں تمام دُنیا کی ذہنی اُلجھنوں کی قسمیں ایک ہی باب میں گنائی جائیں گی وہاں ہندوستان کی ذہنی اُلجھنوں کے لئے ایک علیحدہ باب مخصوص کرنا پڑیگا۔ وہ اس لئے کہ یہاں کی ذہنی الجھنیں دُنیا سے نرالی ہیں۔ دُنیا نے عام طور پر ذہنی اُلجھنوں کو دو طرح کی کیفیتوں سے نامزد کیا ہے۔ یعنی ایک طرح کی اُلجھن کو احساسِ کمتری (Inferiority Complex) کہتے ہیں اور دوسری کو احساسِ برتری (Superiority Complex)۔ یہاں بھی آئے دن ان "احساسات" کا ذکر ہوتا رہتا ہے اور لوگ دوسرے لوگوں کے متعلق رائے زنی کرتے ہوئے کسی "احساس" کا لیبل اُن پر چپکا دیتے ہیں۔ مگر مجھ سے پوچھو تو یہ کہوں گا کہ ہندوستان میں میں نے "احساسات" کے شکاروں میں سے ہر کسی کو "احساسِ کمتری" کا شکار پایا۔ فرنگی کے غلام میں "احساسِ برتری" ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ یوں کہنے کو غلاموں اور غلام زادوں میں ہر ایک طرح کا احساس موجود ہے لیکن بیشتر احساسات محض دکھاوے کے ہیں۔ اُن کی اصلیت کوئی نہیں۔ باور نہ آئے تو تفصیل سُن لو۔ "احساسِ کمتری" کی مثالیں تو تمہیں عام مل جائیں گی۔ مثلاً یہاں کے بیشتر لیڈر اپنے خطابات خود ہی گھڑ کر ان کو مشہور کر دیتے ہیں۔ یہ خطابات مسٹر اور مولوی سے شروع ہو کر لالہ شیخ اور مولانا کی حدود سے گذرتے ہوئے فخرِ قوم، رہبرِ اعظم اور فدائے ملت تک جا پہنچتے ہیں۔ کسی سے پوچھو کہ بھئی یہ خطابات انہیں کس نے دیئے تھے تو تحقیقات کے بعد پتہ چلیگا کہ انہوں نے سب سے پہلے خود ہی اپنے یا اپنے دوستوں کے اخبار میں اپنا نام ایسے درج کیا تھا یا کرایا تھا۔ جن لوگوں کی اخباری دُنیا تک رسائی نہیں وہ اپنے خط و کتابت کے کاغذات پر اپنے نام کے پہلے یا پیچھے مسٹر یا اسکوائر Esquire چھپوا لیتے ہیں۔ اور اگر لوگوں سے خط و کتابت نہیں تو گھر کے سامنے چھوٹے بڑے رنگوں کے مختلف بورڈ لگا دیتے ہیں جن پر بار بار اُن کے نام کے پہلے مسٹر لکھا

ہُوا ہوتا ہے۔ ابھی پریس نہیں بلکہ اگر آقا سے کوئی خطاب لے لیا ہے تو اُس کو اپنی ڈگریوں کے ساتھ ہی لکھ دینگے۔ اگلے دن ایک دوست کسی خان بہادر سے کتاب مانگ کر لائے تو یہ دیکھ کر تعجب ہُوا کہ انہوں نے نام کے بعد اپنی علمی ڈگریوں میں سب سے پہلے .K.B لکھ رکھا تھا۔ بہت دیر تک سوچتا رہا کہ الہی K.B. کس یونیورسٹی کی ڈگری ہو سکتی ہے آخر دوست سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ کتاب کے مالک خان بہادر بھی ہیں۔ علمی ڈگریوں کی اس ارزانی پر افسوس ظاہر کر کے خاموش ہو رہا۔ خیر یہ تو ایک ذاتی کمزوری ہے اور خطاب ٹھکرانے والوں یا خطاب یافتہ لوگوں کا کوئی ایسا قصور نہیں جس سے عوام کو کوئی نقصان پہنچ رہا ہو۔ لیکن یہاں "احساس کمتری" کے وہ نادر نمونے بھی دیکھ پاؤ گے جن کو دیکھ کر انسانیت منہ ڈھانپ لیتی ہے۔ یہاں ایک دفتر میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک صاحب سے اوپر کی منزل میں ملنا تھا۔ سیڑھیوں پر چڑھنے لگا تو ایک جانب لکھا ہُوا تھا:۔

یہ راستہ صرف افسروں کے لئے ہے

میں فوراً نیچے اتر آیا کیونکہ ایک تو میں افسر نہیں تھا دوسرے مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ کہیں یہ راستہ کسی افسر کے پاس ہی نہ لیجائے اور مجھے تو بخیال خود صرف ایک انسان سے ملنا تھا۔ افسر سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اب تم ہنس رہے ہو گے کہ میں نے "افسر" اور "انسان" میں تمیز پیدا کر دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تمیز میری پیدا کی ہوئی نہیں بلکہ یہ سب کچھ یہاں کے غلاموں اور غلام زادوں کا کیا دھرا ہے۔ لگے ہاتھوں غلاموں اور غلام زادوں کی تشریح بھی کر دوں۔ غلام وہ ہیں جو آقا کی خدمت کرتے ہوئے اپنی نصف سے زیادہ عمر گذار چکے ہیں اور اب یا پنشن لینے والے ہیں یا خطاب لے کر مرنے والے ہیں۔ غلام زادے وہ ہیں جنہیں اُن کی دیکھا دیکھی آقا کی خدمت کرنے کا نیا چسکا پڑا ہے اور ہمارے ایک اخبار نویس دوست کی طرح ابھی سے اس دُھن میں ہیں کہ فلاں فلاں غلام وزیر کی تعریف کر کے کسی روز خاں صاحب ہو جائینگے۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ بات یہ تھی کہ جب میں "افسروں" کا راستہ چھوڑ کر دوسری سیڑھیوں سے بالائی منزل پر پہنچا تو دیکھا کہ افسروں کا راستہ بھی دوسری سمت سے بل کھا کر وہیں آکر ختم ہو گیا ہے اور اس طرف بھی وہی الفاظ ایک بورڈ پر لکھے ہوئے تھے جن سے نچلی منزل میں افسروں اور انسانوں یا انسانوں اور کیڑوں میں فرق پیدا کیا گیا تھا۔ "یہ کیڑے" کا لفظ تمہیں پھر کھٹکا ہو گا لیکن میں اپنے تاثرات بیان کر رہا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب میں افسروں والے راستے سے لوٹ کر دوسری سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا تو پہلے تو مجھے یہ خیال آیا کہ کیا ہُوا اگر میں افسروں والے راستے سے نہیں جا سکا بہر صورت میں انسانوں والے راستے پر تو جا رہا ہوں (یہ احساس برتری کا کرشمہ تھا) لیکن معاً مجھے یہ خیال آیا کہ انسان تو دوسرے راستے سے اوپر چڑھتے تھے اور افسر ہی انسان تھے میں تو اُن کے مقابلے میں صرف ایک کیڑا ہوں۔ جس کے چڑھنے کے لئے یہی سیڑھیاں بنائی گئی تھیں (اس وقت احساس کمتری میرا دامنگیر تھا) اس کشمکش میں میں اُن صاحب کے کرے تک پہنچ گیا جن سے مجھے ملنا تھا کام کی نوعیت "سرکاری" نہ تھی۔ اس لئے میں بلا جھجک آگے بڑھتا چلا گیا لیکن دروازے تک پہنچا تو دربان نے ہاتھ دیکر روک لیا۔ میں اُس سے کہہ رہا تھا کہ وہ مجھے کیوں روکتا تھا اور وہ اس پر مصر تھا کہ میں اپنے کام کی نوعیت ایک کاغذ پر لکھ کر اندر بھجواؤں اور اجازت ملنے پر اندر جاؤں۔ مجھے شیشے میں سے نظر آرہا تھا کہ جن صاحب سے مجھے ملنا تھا وہ میز کے اوپر ٹانگیں رکھے ہوئے اخبار پڑھ رہے تھے اس لئے اُن کے قیمتی وقت کے ضائع ہونے کا احتمال نہ تھا۔ اور اسی لئے میرے اندر جانے میں کوئی رکاوٹ نہ ہونی چاہیئے تھی لیکن دربان بہر حال دربان تھا اور اسی کام کے لئے اُسے وہاں رکھا گیا تھا کہ وہ "صاحب" کے احساس کمتری کی نگہداشت کرے۔ اس لئے مجھے بہ ہزار دانے ہی پڑے۔ اور دربان ایک کاغذ پر میرا نام لکھ کر اندر لے گیا اور اندر داخل ہوتے ہی اُس نے سامنے رکے

شیشوں کے سامنے پردہ چھوڑ دیا۔ پانچ منٹ دس منٹ انتظار کیا۔ دربان کاغذ کے پُرزے سمیت گم تھا۔ ایک دفعہ تو جی میں آئی کہ بلند آواز سے اندر والے صاحب کا وُہی نام لے کر پکاروں جس نام سے لندن میں ہم اور تم اُسے پکارا کرتے تھے لیکن "احساس کمتری" دامنگیر رہا۔ اتنے میں دربان صاحب پُرمعنی انداز میں برآمد ہوئے اور کہا:۔

"تم اندر جا سکتے ہو" (گفتگو پنجابی میں ہو رہی تھی کہنے لگا "لنگھ جا")

ایک دفعہ لوٹ جانے کو جی چاہا لیکن اب کرکری تو ہو ہی چکی تھی۔ اس لئے اندر چلا گیا۔ مزاج پرسی کے بعد اندر والے صاحب نے اپنی تمام مصروفیتوں کی طویل داستان سنانے کے بعد جلدی نہ مل سکنے کی معذرت پیش کی دبیسے میز پر اخبار اب بھی رکھا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھتا اور کھسیانا ہو ہو جاتا۔ اس کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا اور چند منٹ بیٹھ کر چلا آیا۔ اس دفعہ احساس کمتری کو مٹانے کے لئے عمداً افسروں کے رستے سیڑھی اُترا۔ یہ خیر ہوئی کہ نہ کسی نے دیکھا اور نہ کسی نے پوچھا۔

اب تم منتظر ہو گے کہ "احساس برتری" کی کوئی مثال بھی تمہارے سامنے پیش کروں اور سب سے پہلا سوال جو تمہارے دل میں پیدا ہوا ہو گا وُہ یہ ہو گا کہ جو مثالیں میں اب تک پیش کر چکا ہوں وہ "احساس کمتری" کی تھیں یا "احساس برتری" کی۔ اگر تم ان کا تجزیہ کرو اور فرائڈ کی رائے لو تو اصطلاحی طور پر یہ ساری مثالیں "احساس برتری" کی تھیں۔ لیکن میں نے عمداً انہیں "احساس کمتری" کے نام سے یاد کیا ہے کیونکہ میں نے ان تمام چیزوں کو دیکھ کر یہ محسوس کیا ہے کہ ان احساسات کی پیدایش کا ذمہ دار یقیناً برتری کا جذبہ نہیں۔ اپنے آپ کو برتر ظاہر کرنے کا جذبہ ضرور کام کر رہا ہے۔ لیکن یہ جذبہ اپنی ذلت اور بیچارگی کے شدید احساس نے پیدا کیا ہے۔ غلام اور غلام زادہ صبح سے لے کر شام تک اس دُھن میں رہتا ہے کہ اپنے آپ کو کسی طرح برتر ظاہر کرے۔ لیکن اس کوشش کی نمود میں ہر وقت اُسے اپنی کمتری کا احساس رہتا ہے۔ پھر کہو اس ملک میں "احساس برتری" پیدا ہی کیسے ہو سکتا ہے۔ زندگی میں کامرانی اور شادمانی کا اطمینان حاصل کرنے کے بعد جب فراغت زیادہ میسر آتی ہے تو آزاد مُلکوں کے مرد اونچی ٹوپیاں اور عورتیں سنہری چشمے لگا کر عام آدمیوں سے الگ ہو کر چلنا شروع کر دیتی ہیں۔ اُس وقت لوگ اُنہیں Highbrowed (اونچی بھووں والے) پکارنے لگتے ہیں۔ کیونکہ اُن کی بھویں تنی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب ان کے دل میں احساس برتری پیدا ہو چکا ہوتا ہے۔ لیکن غلام کی زندگی کامرانی سے کب ہمکنار ہوتی ہے اور اس کی کامرانی میں شادمانی کو کیا دخل؟ پھر جب حالت یہ ہو تو "احساس برتری" کا تصور اور بلند ذہنیت کی تحصیل اس کے بس میں کہاں۔ یہ چیزیں آزاد مُلکوں کو راس آتی ہیں۔ تم جب ہندوستان کی بات کیا کرو تو ہندوستانی دل و دماغ کو کام میں لایا کرو ولایتی معیار اور ولایتی خیالات ابھی ہمارے کام کے نہیں۔

محمد باقر

غزل

(والاشان شہزادہ نواب معظم جاہ بہادر شجیعؔ حیدرآباد دکن)

شاید یہ میرے جذبۂ دل کا قصور ہے
تو دل کے پاس رہ کے بھی نظروں سے دُور ہے

کیوں آج بڑھ چلی ہے تصور کی بیخودی
وہ آ گئے تو ہوش میں آنا ضرور ہے

مستی میں کس کو یاد ہے توبہ کا ٹوٹنا
تم نے پلائی تھی ہمیں اتنا شعور ہے

باقی ہیں حسن و عشق میں اب تک نزاکتیں
اُن کو نگاہ پر ہمیں دل پر غرور ہے

دل مٹ گیا یہ دل کے مقدّر کی بات تھی
میرا قصور ہے نہ تمہارا قصور ہے

کیا پوچھتے ہو اہلِ محبت کی زندگی
مرنے کے اعتبار پہ جینا ضرور ہے

جلووں سے اُس کے مانگ لو تابِ نظر شجیعؔ
وہ دل سے دُور ہی نہ نگاہوں سے دُور ہے

زمانۂ حال کے والدین اور اولاد

اس نئے زمانے میں جو حیرت انگیز تبدیلیاں ہوئی ہیں اُن میں سے ایک وہ تبدیلی ہے جو آج کل کے والدین میں ہوئی ہے جب سے دنیا شروع ہوئی ہے اس وقت سے والدین کا عقیدہ تھا کہ اولاد کو اپنے والدین کا ممنون ہونا چاہئے کیونکہ یہی ان کو اس دنیا میں لانے کا باعث ہوئے ہیں، اور انہوں ہی نے شیر خواری کے زمانے میں پالا پوسا ہے۔ والدین سے محبت کرنا اولاد کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا فرض سمجھا جاتا تھا۔ اگر کوئی اولاد والدین سے محبت نہ کرتی تھی تو ڈنڈے کے زور سے محبت کرنا سکھانے میں والدین حق بجانب خیال کئے جاتے تھے۔ یہ بھی فرض کیا جاتا تھا کہ اگر کوئی ماں شرارت و خباثت کا مجسمہ نہیں تو وہ اپنی اولاد سے اتنی اور ایسی محبت کرتی ہے کہ کسی اور چیز سے نہیں کرتی۔ اس کے علاوہ ماں میں جبلتہً اور غلطۃً جانتی فرض کی جاتی تھی کہ بچوں کا رکھ رکھاؤ کیسا ہونا چاہئے۔ اگر کوئی بچہ بدتمیزی کرتا ہے تو قصور بچے کی فطرت کا ہے نہ کہ ماں کے رکھ رکھاؤ کا۔ جب تک والدین کے یہ عقیدے قائم اور باقی رہے اس وقت تک بچے پیدا کرنے میں لوگوں کو لطف آتا رہا اور اسی وجہ سے کثرتِ عیال اصول رہا نہ کہ استثناء۔

لیکن آجکل کے والدین ہر حیثیت سے بدل گئے ہیں۔ اب اکثر لوگ ہستی کو مُشتبہ رحمت سمجھتے ہیں۔ یہ اپنی اولاد سے معافی چاہنے کی طرف مائل ہیں۔ کیوں کہ ان ہی کی وجہ سے اولاد پر وہ مصیبتیں پڑتی ہیں جو ان کے خیال میں زندگی کا لازمہ ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ہر وقت اور تمام عمر بچوں کے ساتھ رہنا کوئی بڑی نعمت نہیں۔ اگر اولاد اُن سے فطری محبت کا اظہار کرتی ہے تو اُن کو اوڈی پس مؤلف[لے] کا شبہ ہوتا ہے۔ ان کو احساس ہے کہ بچوں کے رکھ رکھاؤ کا کوئی جبلّی علم ان کو نہیں۔ لہٰذا وُہ ان تمام غلطیوں کے متعلق بڑی بڑی کتابیں پڑھتے ہیں۔ جن کے سرزد ہونے کا اُن کو اندیشہ ہوتا ہے لیکن اس تمام مطالعے سے وہ اس قدر دہشت زدہ ہو جاتے ہیں کہ بچوں کی شکل سے ان کو ہول ہونے لگتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو "ماہرین" کے حوالے کر دیتے ہیں۔ "ماہرین" وہ لوگ ہوتے ہیں جنھوں نے اس قسم کی بڑی بڑی کتابیں بہت سی پڑھی ہیں۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے بچے اب والدین کی خوشی کا باعث نہیں رہے چنانچہ اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کی پیدائش برابر کم ہو رہی ہے۔

فرائڈ[۲] وہ شخص ہے جس نے پہلی مرتبہ والدین کو یہ بتا کر دہشت زدہ کر دیا کہ والدین سے اولاد کی محبت گناہ گارانہ بُری اور تباہ کن ہوتی ہے

لے Oedipus Complex نفسی تحلیل کی اصطلاح میں لڑکے یا لڑکی کی اس عموماً غیر شعوری خواہش کو کہتے ہیں کہ باپ یا ماں کو کسی طرح دفع کر کے ماں کو اپنی بیوی یا باپ کو اپنا خاوند بنائے۔ یا یوں کہو کہ یہ اولاد کی والدین سے حد سے زیادہ محبت کا نام ہے جس کے ساتھ شہوانی عنصر شامل ہوتا ہے۔ بعض مصنفین لڑکے کی اس خواہش کو مادری مؤلف اور لڑکی کی اس خواہش کو پدری مؤلف کہتے ہیں (مقتصد)

واٹسن فرائڈ سے ہر بات میں اختلاف کرتا ہے۔ لیکن اس بات میں وُہ اس سے متفق ہے۔ بظاہر اس کی رائے ہے کہ فطرت کا یہ عمل نہایت احمقانہ ہے کہ بچوں کی مائیں ہوتی ہیں لیکن اس کی توقع ہے کہ حکومت بہت جلد فطرت کے اس نقص کو رفع کردیگی[1]۔ ظاہر ہے کہ بچے کو اپنی کھلائی سے بھی اتنی ہی محبت ہوجاسکتی ہے جتنی کہ اس کو اپنی ماں سے ہوتی ہے لیکن یہ صورت بھی اتنی ہی تباہ کن اور خطرناک ہے۔ لہذا آیا کو برابر بدلتے رہنا چاہئے۔ بچے کو ایک الگ کمرے میں تنہا سونا اور نہایت ہی پاک و صاف ماحول میں رہنا چاہئے۔ خیال یہ ہے کہ اس طرح وہ اس ماہرانہ سنگدلی کا مالک بنجاتا ہے جس کی اس کو آئندہ زندگی میں بہت ضرورت پڑتی ہے۔

میرا اپنا خیال ہے کہ یہ عقیدہ بالکل غلط ہے۔ اس کی تجربی شہادت قریب قریب بالکل صفر ہے اس کی بنیاد محض نظری ہے ایک نفسیاتی قانون ہے کہ ہر محبت شہوانی ہوتی ہے اور ایک اخلاقی قانون ہے کہ ہر شہوانی محبت ناپسندیدہ ہے۔ بہ شرطیکہ یہ شہوانی اجتماع کی طرف مودی نہ ہو۔ میں ان قوانین میں سے کسی سے بھی متفق نہیں لیکن پہلے قانون کی میں خاص طور پر مخالفت کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں شبہ نہیں کہ والدین کی محبت اولاد سے، اور اولاد کی محبت والدین سے جزاً جسمانی ہوتی ہے۔ بلکہ یہاں تک کہا جاسکتا ہے کہ جس محبت کے ساتھ جسمانی عنصر نہ ہو وہ محض خواب ہے۔ محبت کرنے والے والدین اپنے بچوں کو سینے سے لگاتے ہیں اور پیار کرتے ہیں۔ اسی طرح بچے بھی خصوصیت کے ساتھ کم عمری میں اپنی ماؤں کے جسموں کی گرمی کو پسند کرتے ہیں۔ اپنی ماؤں کے قریب رہنے کی وجہ سے ان کو محفوظیت کا احساس ہوتا ہے لیکن ان دونوں حسیات کو شہوانی کہنا، میرے نزدیک، بعض اہم تفریقات کو نظر انداز کرنا ہے۔ جو تشفی شیرخوار بچوں کو اپنی ماؤں سے حاصل ہوتی ہے وہ ان تشفیوں کا مجموعہ ہوتی ہے جو ہم کو گرم پانی کی بوتلوں اور پوٹیس سے حاصل ہوتی ہیں۔ اولاد کے تعلق سے والدین کی حسیات اس سے زیادہ پیچیدہ ہوتی ہیں، اور مجھے اس سے انکار نہیں کہ بعض والدین کی ان حسیات میں شہوانی عنصر شامل ہوتا ہے لیکن جہاں یہ شہوانی عنصر غالب ہوجاتا ہے۔ وہاں والدینی حسیات بگڑجاتی ہیں، اور ان کی فعلیتوں کا رُخ بدل جاتا ہے۔

اس کے علاوہ میں یہ بھی تسلیم کرنے کو تیار ہوں کہ اگر یہ شہوانی عنصر والدین میں بہت شدید ہوتا ہے تو کچھ دنوں کے بعد یہی عنصر اولاد کی حسیات میں بھی پیدا ہوجاتا ہے۔ لیکن ایسی مثالوں کو طبعی انسانوں کے خود رو جذبات کی طبعی ترقی کی مثال نہ سمجھنا چاہئے۔ اصل میں یہ ان لوگوں کے سقیم ردعمل ہیں جو نامناسب ماحول کے زیر اثر بگڑ چکے ہیں۔ ایک بلی اپنے بچوں کو چاٹتی ہے لیکن ان کے ساتھ اس کا سلوک بلاؤ کے ساتھ اس کے سلوک سے مختلف ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ڈاکٹر فرائڈ بلی کی ان حرکتوں کو دیکھے تو اُس کو اس بلی میں حرامکاری کا ہیجان نظر آئے گا۔ انسانی ماں کی جبلتیں اگر بگڑی ہوئی نہیں، اور اگر اس کی شہوانی زندگی تشفی بخش ہے تو وہ بھی اپنی اولاد کے تعلق سے اتنی ہی معصوم ہے جتنی کہ یہ بلی۔ پھر اگر خود اس کی حسیات صحیح ہیں تو بچوں کی حسیات بھی لازماً صحیح ہوں گی۔ اوڈی پس مولف اگر پیدا ہوتا ہے تو ماں کی بے راہ روی سے۔ یعنی یہ اس بات کا نتیجہ ہوتا ہے کہ ماں اپنے بچوں سے وہ نقلی تشفی حاصل کرنا چاہتی ہے جس کی اصل کو وہ جوانوں کے ساتھ شہوانی تعلقات پیدا کرکے حاصل کرسکتی ہے۔

---

[1] پروفیسر واٹسن کو خوش ہونا چاہئے کہ اس کی تمنا آخر پوری ہوگئی۔ مشینوں کے ذریعے سے انسانوں کے بچے پیدا کرنے کے متعلق امریکہ میں نہایت کامیاب تجربے کئے جا رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ چند ہی دنوں میں بے ماں اور بے باپ کے بچے پیدا ہوا کریں گے!!! (مقتضد)

ماں اور بچے کے درمیان جسمانی محبت اگر صحیح قسم کی ہے، تو یہ نہ صرف بے ضرر ہوتی ہے بلکہ بچے کی نشو و نما کے لئے ضروری بھی ہے۔ کسی شخص کا اپنے بچے سے خاص طور پر محبت کرنا بچے کے لئے مفید ہوتا ہے اس سے بچہ اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرتا ہے اور اس طرح اس میں پُرخطر زندگی بسر کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

جس بچے سے کوئی محبت کرنے والا نہیں ہوتا، وہ بزدل اور بالعموم دبلا پتلا ہوتا ہے۔ اس کو دُنیا پر ایک طرح کا غصہ آتا ہے۔ اس طرح اس میں غیر معقول غضبناکیوں اور بغاوتوں کا میلان پیدا ہو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بلاضرورت چوری کرنا شروع کر دے یا اس میں سوتے ہوئے چلنے کی بیماری پیدا ہو جائے۔ واٹسن کا نظریہ تعلیم تشکیل عادات پر مبنی ہے لیکن اس کے ذہن میں صرف عاداتِ فعل ہیں حال آں کہ عاداتِ حسیات بھی اس سلسلے میں اُتنی ہی اہم ہوا کرتی ہیں۔ یہ کہنا تو شاید نا انصافی ہوگی کہ اس نے عاداتِ حسیات کو کلیتہً نظر انداز کر دیا ہے۔ چناں چہ عاداتِ خوف کے متعلق اس نے بہت سی اچھی اچھی باتیں بیان کی ہیں۔ وہ اس سے بھی واقف ہے کہ روئیں دار ریچھ سے محبت کرنا بچوں کو کس طرح سکھایا جا سکتا ہے لیکن خبر نہیں کیوں اس نے انسانوں سے محبت کرنے کا ذکر نہیں کیا اس سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے کہ انسانوں سے محبت کرنا اور ان کو دوست رکھنا سب سے زیادہ قیمتی عادتوں میں سے ہے۔ اور اگر ہر جسمانی ملامست کو مشتبہ نظروں سے دیکھا جائے تو پھر اس عادت کی تشکیل مشکل ہو جاتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ جس ماں نے اپنے بچوں کو سینے سے لگانا نہیں سیکھا بچوں کے ساتھ اس کی محبت رُک جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے بھی اس سے محبت کرنا نہیں سیکھتے۔ جب یہ بچے دیکھتے ہیں کہ اوروں کا سلوک اپنے بچوں کے ساتھ زیادہ فطری ہے تو ان میں حسد پیدا ہوتا ہے۔ یہ حسد رفتہ رفتہ اتنا گہرا اور شدید ہو جا سکتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ آخر کار وہ سوتیلی کے دشمن بن جائیں۔ ان ہی تمام وجوہ سے میں والدینی محبت پر زمانہ حال کے نظریہ سازوں کے تمام حملوں کی مخالفت کرتا ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلے کے متعلق ہمارا علم اس قدر ناکافی ہے کہ اس کو فہم عامہ سے چھین کر سائنس کے حوالے کرنا جائز قرار نہیں دیا جا سکتا کتابوں کے مصنفوں کے لئے یہ صورتِ حال بہت مبارک ہے کہ جو شخص کوئی بات تفصیل اور زور کے ساتھ بیان کرتا ہے اس پر سب پڑھنے والے ایمان لے آتے ہیں لیکن ارتیابیت اور شک کا ایک درجہ اہل دنیا کے لئے بہت ضروری ہے کتابیں پڑھنا اور ان میں جو کچھ لکھا ہے اس پر یقین نہ کرنا تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہونا چاہیئے۔ لیکن اکثر تعلیم و تربیت یافتہ افراد میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی۔ میرا خیال ہے کہ نفسی تحلیل کا علم بڑا صحیح اور اہم ہے۔ لیکن اگر اس کی کتابوں کو آسمانی صحیفہ سمجھ لیا جائے تو اِس کے عملی نتائج بہت بُرے ہوتے ہیں۔

میں اس عقیدے کو تسلیم نہیں کرتا کہ والدین لازماً اپنی اولاد کے لئے بُرے ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میرا خیال ہے کہ بچوں کا اپنے والدین کو بہت دیکھنا بھی آسان نہیں۔ بچے کو دوسرے بچوں کی صحبت کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ صحبت عمر کے دو ابتدائی برسوں ہی میں ضروری نہیں ہوتی، بلکہ جوں جوں عمر ترقی کرتی جاتی ہے۔ یہ ضرورت بھی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ دن کا کچھ حصہ وہ سکول میں گزاریں۔ اس کے علاوہ والدین کو اپنی ایک خاص زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔ لہذا اگر بچے ہر وقت ان کے ساتھ رہیں تو ان کو بچوں کی روک تھام کرنی پڑتی ہے۔ آج کل کے مختصر خاندانوں میں والدین کا بچوں کی طرف بہت زیادہ توجہ کرنا بہت مشکل ہے۔ بچوں کی طرف

بہت زیادہ توجہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر وقت تعریف کے خواہش مند رہنے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے متعلق والدین کی تشویشات ان کو کمزور اور بزدل بنا دیتی ہیں یا پھر بار بار کی مداخلت کی وجہ سے وہ زود رنج ہو جاتے ہیں۔

عقلمند والدین بننا یقیناً بہت مشکل ہے۔ والدین کی ناکامی کے پانچ وجوہ میری سمجھ میں آئے ہیں، اوّل بچے سے محبت کا نہ ہونا یہ وجہ بہت عام ہے، اور اس سے وہ تمام نقص پیدا ہوتے ہیں، جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ دوم، محبت جو بچے پر پوری طرح قبضہ جمالے یہ دراصل شہوانی عنصر کے داخل ہونے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اسی سے اوڈی پس مولف پیدا ہوتا ہے اور وہ تمام بیماریاں رونما ہوتی ہیں جن پر نفسی تحلیل میں بحث ہوتی ہے۔ سوم ضرورت سے زیادہ تحریک بچوں کے رکھ رکھاؤ میں یہ نقص آج کل بہت کثیر الوقوع ہے۔ یہ وجہ اس خواہش کا بھی نتیجہ ہو سکتی ہے کہ بچوں کو بہت زیادہ اور خصوصاً انفعالی قسم کی خوشیاں مثلاً سینما، تھیٹر وغیرہ دیکھنا حاصل ہوں۔ یہ اس طرح بھی پیدا ہو سکتی ہے کہ ان کے لئے خود نمائی کے بہت زیادہ موقعے پیدا کئے جائیں اور اس طرح بھی کہ جوانوں کی صحبت میں اُن کو داخل کر لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ وہ بمشکل ہی اپنے آپ کو اس صحبت کے مطابق بنا سکتے ہیں۔ چہارم بہت زیادہ روک تھام۔ قدیم زمانے میں یہ بہت کثیر الوقوع تھی۔ لیکن آجکل اس کا دستور نہیں رہا۔ لیکن اگر ماں یا باپ نازک مزاج ہو یا عصباً کمزور ہو، یا اگر آداب محفل پر زور دیا جاتا ہو تو پھر یہ بھی بروئے عمل آجاتی ہے۔ پنجم ماں اور باپ کی اَن بَن۔ اس کا بچوں کے اعصاب پر بہت اثر پڑتا ہے۔ اگر ماں باپ بچوں کے سامنے اس اَن بن کے اظہار کو روکنے پر قادر نہ ہوں تو مناسب یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے بچوں کو گھر میں نہ رکھا جائے۔ والدین کی ناکامی کے ان پانچ وجوہ پر ایک اور وجہ کا اضافہ ہونا چاہئے یعنی صلاحیتوں پر بے اعتمادی۔ اس کی تلافی بہت ضروری ہے۔ والدین کو چاہئے کہ بچوں کو اُن کی صلاحیتوں پر اعتماد کرنا سکھائیں۔ اعتماد کے ساتھ صادر کی ہوئی غلط حرکت بے اعتمادی کی صادر کی ہوئی صحیح حرکت کے مقابلے میں اکثر اوقات بہتر ہوتی ہے۔

بچوں کے تعلق سے اگر تمہارا رویہ اور تمہارے جذبات صحیح قسم کے ہیں، تو تم ان کی نفسیاتی نگہداشت میں غلطی نہیں کر سکتے اور اس نگہداشت کے متعلق جو علم بھی تم حاصل کرو گے، وہ ان کی بہتری کے لئے ہوگا بہ شرطیکہ وہ حقیقی معنوں میں علم ہو، شتاب کارانہ نظریہ بازی نہ ہو۔ لیکن اگر تمہارے جذبات صحیح قسم کے نہیں، تو تمہارا تمام علم بیکار رہے۔ اگر بدقسمتی سے تم اپنے بچے سے جسمانی اور جبلی طور پر محبت نہیں کر سکتے، تو تمہارے اور بچے، دونوں کے لئے مناسب یہ ہے کہ اس بچے کو کسی اور کے حوالے کر دو۔ لیکن بچوں کے ساتھ تمہاری محبت اگر والدینی ہے، یعنی اگر تم ان سے صرف اس لئے محبت کرتے ہو کہ وہ تمہارے بچے ہیں، نہ اس بدلے کی خاطر جو وہ بڑے ہو کر تمہیں دیں گے، تو پھر تم کو اپنی محبت پر کسی قسم کا شبہ نہیں ہونا چاہئے اور نہ تم کو نظریہ بازوں سے ڈرنا چاہئے

(برٹرینڈ رسل)

معتصد ولی الرحمٰن (م ۹)
حیدرآباد دکن

خود پرست لیڈر

غلط کہتا ہے گو وہ شخص جو تم سے یہ کہتا ہے
کہ بحرِ ہند کی امواج میں گوہر نہیں ملتا

غلط گو یہ بھی ہے یعنی وطن کے نفس کے اندر
نظر میں خیرگی جس سے ہو وہ جوہر نہیں ملتا

غلط گو یہ بھی ہے جسمیں جہاں بانی کا سودا ہے
کسی کے دوش پر اس ملک میں وہ سر نہیں ملتا

غلط گو یہ بھی ہے یعنی دیارِ ہند کے اندر
کسی میں جذبۂ تیمور و اسکندر نہیں ملتا

غلط گو یہ بھی ہے ہندوستان والوں کے سینے میں
دلِ شبّیر و زورِ فاتحِ خیبر نہیں ملتا

مگر اس بات سے انکار کی جرأت نہیں ہوتی
کہ اس خطّے میں ڈھونڈے سے بھی کیرکٹر نہیں ملتا

اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اتنے برِّ اعظم میں
جو اپنے کو بھلا سکتا ہے وہ لیڈر نہیں ملتا

اور اس کا یہ نتیجہ ہے کہ ہر گوشے میں ہر گھر میں
خدا تو سیکڑوں ملتے ہیں پیغمبر نہیں ملتا

جوش ملیح آبادی

غائبانہ

(ATTILA VON ORBOK کے ڈرامہ EIN DISKRETER JUNGE سے ماخوذ ہے)

افراد:-

نصیبن	معمر ملازمہ
بیگم سجانہ	سابق ایکٹرس
مرزا شفیق بیگ	انشورنس کمپنی میں ملازم
متفند مرزا	شفیق کا دوست اور پڑوسی!
زمانہ	دورِ حاضر

(مرزا شفیق بیگ کے مطالعہ کا کمرہ۔ دائیں اور بائیں جانب دروازے ہیں۔ بائیں جانب سونے کا کمرہ۔ کمرے کے وسط میں لکھنے کی میز۔ میز کی دائیں جانب ایک صوفا۔ اور اس کے سامنے ایک چھوٹی سی میز۔ لکھنے کی میز کے بائیں جانب ایک نیچا سا دو خانے والا ایک شیلف ہے۔ برابر میں گدے دار آرام کرسی اور ایک کرسی کے پیچھے اونچا لیمپ۔ لکھنے کی میز پر دائیں جانب ٹیبل لیمپ کے نیچے شفیق کی ایک چھوٹی سی تصویر رکھی ہے اور بائیں جانب نازک سے تین پٹ کے فریم میں بیگم سجانہ کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔

جس وقت پردہ اٹھتا ہے تو سٹیج خالی ہوتا ہے۔ باہر دروازے کی گھنٹی بجتی ہے۔ چند سیکنڈ میں بائیں جانب کے دروازے سے ملازمہ نصیبن داخل ہوتی ہے)

نصیبن - (دائیں طرف کے دروازے کی جانب جاتے ہوئے) ناک میں دم آگیا ہے۔ ادھر ان کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ ابھی چائے بھی تیار کرنی ہے ۔ ۔ ۔ خبر نہیں کون آگیا۔ اگر پڑوسن کا لڑکا ہوا تو آج اُس کی خیر نہیں۔ ایسے کان مروڑوں کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے (ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموشی کا اشارہ کرتے ہوئے) شی!!! ٹھہر! (ادھر اُدھر دیکھ کر لکھنے کی میز پر سے فٹ رول اٹھاتی ہے) آج بچہ تیری ہڈی پسلی توڑ کر رکھ دوں تو میرا نام بھی نصیبن نہیں (باہر چلی جاتی ہے — تھوڑی دیر میں بہت احترام سے پیش قدمی کرتی ہوئی داخل ہوتی ہے۔ فٹ رول

(نوٹ: نشر و تمثیل سے قبل اجازت لینی ضروری ہے۔ ن۔ ش)

کمر کے پیچھے چھپائے ہوئے ہے اور نظر بچا کر لکھنے کی میز پر رکھ دیتی ہے ، آیئے آیئے !! تشریف لایئے (بیگم سجانہ داخل ہوتی ہیں بہت خوبصورت اور نہایت قیمتی ساڑھی باندھے ۔ چہرے پر غصہ جھلک رہا ہے) مجھے آداب طریقے بھلا کہاں آتے ہیں ۔ اگر مجھ سے کوئی بدتمیزی ہو تو معاف کر دیجئے گا . . . . . میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں ؟"

بیگم سجانہ ۔ ہوں ! تو یہاں رہتے ہیں مرزا شفیق بیگ — جو انشورنس کمپنی میں ملازم ہیں ؟

نصیبن ۔ جی ہاں یہ ہی اُن کا غریب خانہ ہے اور میں اُن کی ملازمہ ہوں — مغلانی بھی کیونکہ گھر داری میں ہی کرتی ہوں ۔

بیگم سجانہ ۔ کیا تمہیں کچھ علم ہے کہ شفیق بیگ کسی اخبار وغیرہ کے مضمون نگار بھی ہیں ؟

نصیبن ۔ مجھے تو پتہ نہیں ۔ لیکن اگر مضمون وضمون لکھتے بھی تو کوئی بڑی بات تو ہے نہیں ۔ جسے لکھنا پڑھنا آتا ہو اُس کے لئے کیا مشکل ۔ خط نہ لکھا مضمون لکھ دیا ۔ اور ہاں ان کے پاس ایک رسالہ بھی تو آتا ہے ۔ اس میں تصویریں بھی ہوتی ہیں ۔ ایسی پیاری پیاری شکل کی عورتیں . . . . .

بیگم سجانہ ۔ وہ واپس گھر کس وقت آتے ہیں ؟

نصیبن ۔ کبھی برسوں کی برسات میں دیر ہو جائے تو ہو جائے ورنہ ٹھیک پانچ بجے گھر پہنچ جاتے ہیں ۔ دم بھر پہلے نہ دم بھر بعد ۔ ان کے آنے کا وقت تو ہو چلا ہے ۔ آتے ہی ہوں گے (بیگم سجانہ کو کھڑا دیکھ کر) آپ تشریف رکھئے نا (آگے بڑھ کر پلو سے صوفے کو جھاڑتی ہے)

بیگم سجانہ (بیٹھ جاتی ہے) اچھا یہ تو بتاؤ مرزا شفیق کی شادی ہوگئی ہے یا نہیں ؟

نصیبن ۔ نہیں سچ ۔ آپ کے سر کی قسم ۔ شادی وادی کچھ نہیں ہوئی کنوارے ہی ہیں ابھی تو — ۔

بیگم سجانہ ۔ آخر تم مجھے اس طرح غور سے کیوں دیکھ رہی ہو ؟

نصیبن ۔ نہیں بیگم کچھ نہیں ۔

بیگم سجانہ ۔ بیگم ۔ تم بیگم کسے کہہ رہی ہو ؟

نصیبن ۔ واہ آپ نے خوب کہا ۔ اچھا تو کیا آپ بیگم سجانہ نہیں ہیں ؟

بیگم سجانہ ۔ بیگم سجانہ ۔ بیگم سے اب بیگم سجانہ ہوگئی ہیں ۔ خوب !

نصیبن ۔ آپ کچھ ہی کہا کریں لیکن میں تو آپ کو خوب پہچانتی ہوں ۔

بیگم سجانہ ۔ ہوں ۔ سمجھی ۔ تم نے مجھے فلم میں دیکھا ہوگا

نصیبن ۔ جی ہاں بیگم ! . . . . بڑھاپا آ گیا ہے ۔ تھک جاتی ہوں کام کرتے کرتے . . . . آپ کے پیروں میں بیٹھ جاؤں بیگم (بیٹھ جاتی ہے ۔ پیروں کو دباتے ہوئے) خدا آپ کو بڑی عمر دے ۔ بہاریں دکھائے امرادیں پوری کرے ۔

بیگم سجانہ ۔ لیکن میں نے تو شادی کے بعد سے کوئی فلم نہیں بنایا . . . . اور شادی کو اب تین سال ہونے آئے

نصیبن ۔ تین سال اگر ہونے آئے تو کیا ہوا ۔ میں آپ کو بھول کوئی تھوڑی ہی سکتی ہوں اور آپ جیسی شہرت کسی ایکٹرس کو بھلا کہاں نصیب ہو سکتی ہے ۔ جیسا آپ کا نام چمکا کسی اور کا نہیں چمک سکتا ۔ بچے بچے کی زبان پہ آپ کا ہی نام تھا . . . . کہا کرتے ہیں نا . . . . کہ طوطی بول گیا . . . . جس کو دیکھو

آپ ہی کا کام بھرتا تھا۔ میں بھی آپ ہی کے فلم دیکھا کرتی تھی۔

بیگم سجانہ۔ اچھا؟

نصیبن۔ ہاں بیگم! ...... میرے بھائی کی بیوی ... ...یعنی میری بھاوج کی نند ...... لاحول ولاقوۃ..... نند تو میں خود ہوئی..... بیگم غلطی ہوگئی ...... میری بھاوج کی بہن کی نند ...... کے بھائی کی چچازاد بہن جس منڈوے میں آپ کے فلم آیا کرتے تھے۔

بیگم سجانہ۔ یہ منڈوا کیا بلا ہے؟

نصیبن۔ اجی تماشا گھر کو ہم ان پڑھ لوگ منڈوا کہا کرتے ہیں ...... ہاں تو اس منڈوے میں نوکر تھی .... وہ ہوتا ہے نا عورتوں کا ڈبہ .... اس کے دروازے پر کھڑی رہتی تھی ...... اس چچازاد بہن کی سہیلی میرے پاس اکثر کاڑھنا سیکھنے آتی تھی۔ وہ مجھے بھی اپنے ساتھ فلم دکھانے لے جاتی۔ پیسے ویسے تو لگتے ہی نہ تھے اور فلم میں بڑا مزہ آتا تھا۔ بس یہ سمجھئے۔ ہلدی لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا آئے۔

بیگم سجانہ۔ کیوں کیا ٹکٹ نہیں لینا پڑتا تھا؟

نصیبن۔ ٹکٹ وکٹ تو میں جانتی نہیں اور نا ہی کبھی ٹکٹ لیا۔ بس وہ ایسے ہی بٹھا دیتی تھی۔

بیگم سجانہ۔ اچھا! اور تم تین سال کے عرصے میں مجھے بھولیں نہیں۔

نصیبن۔ بھلا آپ کو کیسے بھول سکتی ہوں .... میری یادداشت بہت خراب ہے لیکن پھر بھی آپ کا ایکٹنگ مجھے اب بھی یاد ہے ...... اور روز میاں شفیق جو آپ کا نام جپتے رہتے ہیں۔

بیگم سجانہ۔ میرا نام میاں شفیق جپتے رہتے ہیں۔ لیکن کیوں اچھا ممکن ہے کہیں ملاقات ہوئی ہو۔

نصیبن۔ (ہنس کر) آپ تو چہل کرتی ہیں بھلا کیوں کر ملاقات ہوئی ہو اور پھر ابھی آپ ہی جو پوچھ رہی تھیں ...... ان کی شادی کی بابت! میں نے دھوپ میں بال کوئی تھوڑی سفید کئے ہیں۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ آپ نے مجھے نادان سمجھا ہے ننھی سی بچی جو کچھ بات سمجھتی ہی نہیں۔

بیگم سجانہ۔ تم سمجھیں کیا؟ میری سمجھ میں تو کچھ آیا نہیں

نصیبن۔ لیکن میں تو سب سمجھتی ہوں کہ میاں شفیق کیوں دن رات آپ کا نام جپا کرتے ہیں اور آپ کیوں اُن کی شادی کی بابت پوچھ رہی تھیں۔

بیگم سجانہ۔ آپ ہی آپ نہ جانے کیا سمجھ لیا تم نے آخر یہ ہے کیا معما؟

نصیبن۔ (مسکرا کر) بیگم بُرا نہ مانئے گا۔ چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ خدا نہ کرے کہ میں آپ کو چور کہوں لیکن یہ کہ آپ نے ایکٹنگ کرنا چھوڑا نہیں۔ ایکٹنگ کرے تو ایسا تو کرے کہ بھلے آدمی کو دھوکے میں ڈال دے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ تو شفیق میاں کو جانتیں ہی نہیں۔

بیگم سجانہ۔ (حیرت میں) کیا بکواس ہے! میں انہیں نہیں جانتی۔ یہ بھی یاد نہیں کہ انہیں کبھی دیکھا بھی ہے بہت ممکن ہے کہ کبھی نظر بھی نہ پڑی ہو۔ اور پھر مجھے تیرے سامنے ایکٹنگ کرنے کی کیا غرض پڑی ہے؟

نصیبن۔ بیگم غرض ورض تو میں جانتی نہیں۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ یہ کوئی شرمانے کی بات تو ہے نہیں۔ ایسا ہو

ہی جاتا ہے۔

بیگم سجانہ۔ بس۔ کچھ تیز بھی ہے۔ خبر نہیں کیا کہے جا رہی ہے گستاخ کہیں کی۔ آخر تو نے مجھے کیا سمجھ لیا ہے۔ تو اور تیرے میاں دونوں ایک سے معلوم ہوتے ہیں کہ زبان کو لگام ہی نہیں۔

نصیبن۔ (ہاتھ جوڑ کر) غلطی ہوگئی بیگم۔ معاف کر دیجئے۔ اگر آپ ناراض ہوگئیں تو میں رہونگی کہاں؟

بیگم سجانہ۔ تیرے سامنے ہی تو میں ایکٹنگ بھی کرتی ..... ڈرتی ہوں نا تجھ سے۔

نصیبن۔ بس بیگم اب معاف کر دیجئے۔ اب میں سمجھ گئی کہ آپ ظاہر کرنا نہیں چاہتیں۔ اچھا نہ بتایئے آپ کی مرضی لیکن مجھے سب پتہ ہے۔ میں ہر وقت یہیں رہتی ہوں۔ مجھ سے بھلا کیا بات چھپی رہ سکتی ہے؟ شفیق میاں کو تو بڑا فخر ہے آپ کی ایسی ایسی تعریفیں کرتے ہیں ایسے خوش ہوتے ہیں کہ پھولے نہیں سماتے۔

بیگم سجانہ۔ لیکن کس بات کا! پھولے نہ سمانے کی وجہ؟

نصیبن۔ لیکن فخر نہ کیوں ہو اور پھولے نہ سمائیں تو کیا کریں (اٹھ کر لکھنے کی میز کے پاس جاتی ہے) اچھا یہ دیکھئے یہ رہیں آپ کی تصویریں۔ شفیق میاں ٹکٹکی باندھے میٹھی میٹھی نظروں سے انہیں دیکھا کرتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ بیگم آپ کی صورت ہی ایسی پیاری ہے کہ آنکھیں سیر نہیں ہوتیں ..... ہوں اور مجھے پتہ ہے کہ سونے کے کمرے میں کس کا کھڑے پاجامے والا جوڑا رکھا ہے۔

بیگم سجانہ (اٹھ کر لکھنے کی میز کے پاس آتی ہے اور تصویروں کو دیکھتی ہے) کھڑے پاجامے کا جوڑا؟ ایں یہ تصویریں ..... یہ تو میری تصویریں ہیں

نصیبن۔ جی ہاں (ہنستی ہے) جی ہاں آپ کی تصویریں ہیں۔

بیگم سجانہ۔ اور یہ جو لیمپ کے نیچے تصویر رکھی ہے ..... کیا یہ مرزا شفیق بیگ کی ہے؟

نصیبن۔ جی ہاں بیگم ایسی تو بری کھینچی ہوئی بھی نہیں کہ آپ پہچان بھی نہ سکیں۔ لیکن ہاں یہ بات ضرور ہے کہ ان کی شکل اس تصویر سے زیادہ خوبصورت ہے۔ کیوں ہے نا؟ بتایئے! شرم آرہی ہے!

بیگم سجانہ۔ مجھے نہیں معلوم۔ میں نے نہیں دیکھا (بگڑ کر) میری بلا جانے۔ اچھی شکل ہے یا بری۔ مجھے اس سے کیا واسطہ۔

نصیبن۔ آپ تو خفا ہوگئیں۔

بیگم سجانہ۔ لیکن یہ کیا؟ میری تصویروں پر یہ لکھا ہوا کیا ہے؟

نصیبن۔ مجھے تو معلوم نہیں۔ میں تو پڑھنا جانتی نہیں

بیگم سجانہ۔ (آواز سے پڑھتی ہے) میرے پیارے شفیق۔ اختری (چہرہ پر غصہ نمودار ہوتا ہے۔ دوسری تصویر کی عبارت پڑھتی ہے) عمر بھر تمہارا دم بھرنے والی تمہاری اختری (چہرہ سرخ ہو جاتا ہے۔ تیسری تصویر) نیاز کی مشتاق تمہاری ادنےٰ کنیز ..... ادنےٰ کنیز (غصہ سے کانپتی ہے) مجھے ادنےٰ کنیز تک لکھ دیا۔ اتنی جرأت۔ اب میں سمجھی۔ ہر

ایک سے کہتا پھرتا ہے کہ ڈرک جاتی ہے۔ (نصیبن سے)
شفیق بیگ سے زیادہ ذلیل آدمی اور کون ہو سکتا ہے۔ بیہودہ
بے غیرت۔

نصیبن (سہمی ہوئی) لیکن بیگم...... ہُوا کیا؟ آپ
اس قدر ناراض کیوں ہیں؟

بیگم سجانہ۔ ہُوا کیا؟ تجھے نہیں معلوم میں کیوں
خفا ہو رہی ہوں؟

نصیبن۔ آپ کے سر کی قسم بیگم۔ میری سمجھ میں تو آتا نہیں

بیگم سجانہ۔ تو اُس نے تجھ سے بھی جھوٹ بولا۔ ٹھہر
جاؤ انہیں اس کی پوری پوری سزا ملے گی۔

نصیبن۔ لیکن بیگم ہُوا کیا قصور؟

بیگم سجانہ۔ سب پتہ چل جائیگا۔ آخر انہوں نے سمجھا
کیا تھا؟ کسی پر عیب لگانا آسان تو نہیں۔

نصیبن۔ یہ آپ کیا کہتی ہیں، وہ تو نہایت شریف آدمی ہیں
انہوں نے کسی پر عیب نہیں لگایا۔

بیگم سجانہ۔ جی ہاں۔ اگر وہ شریف آدمی ہوتے تو مجھے یہاں
آنا ہی کیوں پڑتا۔ شریف ہی تو ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔

نصیبن۔ کیسی حرکتیں؟

بیگم سجانہ۔ سُن کان کھول کر۔ کبھی بھولے سے بھی
میری اُن کی ملاقات نہیں ہوئی۔

نصیبن۔ کیا سچ آپ ان کو نہیں جانتیں؟

بیگم سجانہ۔ کہہ تو رہی ہوں میں نے انہیں نہیں
دیکھا ــــ ابھی تھوڑے دنوں سے میرے جاننے والوں میں
چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ ان کا نام لے لے کر مجھے طعنے دیتے
جاتے تھے۔ میری سمجھ بالکل نہ آتا تھا کہ اس نام میں آخر بھید کیا ہے
میں نے پوچھ گچھ کی تو معلوم ہُوا کہ انشورنس کمپنی میں ملازم ہیں اور
یہاں رہتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ ممکن ہے کسی اخبار کے نامہ نگار
ہوں۔ فلم کے زمانے کی جان پہچان ہوگی۔ جب کوئی ایکٹرس
کسی متمول اور معزز خاندان میں شادی کر لیتی ہے تو اس کے
چال چلن کے متعلق افواہیں اڑا ہی کرتی ہیں۔

نصیبن۔ ہاں بیگم۔ بُرا زمانہ آگیا ہے۔ عیب چھپانے کی
بجائے اُلٹا انہیں مشہور کرتے پھرتے ہیں۔

بیگم سجانہ۔ میں چاہتی تھی کہ مرزا شفیق بیگ سے زبانی
گفتگو کر کے سمجھا دوں کہ نواب صاحب کو نام و ناموس کس
قدر عزیز ہے۔ اور اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ انشورنس کمپنی کا ملازم
مجھے بدنام کرتا پھرتا ہے.....

نصیبن۔ وہ تو آپ کی پرستش کرتے ہیں بیگم سجانہ۔

بیگم سجانہ۔ اچھی پرستش ہوئی۔ کیا خوب! ــــ
اب میں سمجھی کیا معمّا ہے۔ میں انہیں جانتی بھی نہیں اور وہ
ہیں کہ گلی گلی کوچہ کوچہ کہتے پھرتے ہیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے
پر فدا ہیں۔ جان دیتے ہیں۔ ایک جان دو قالب ہیں۔

نصیبن۔ گلی گلی کوئی ڈھنڈورا کہتے پھرتے ہیں۔ یہی اپنے
یار دوستوں میں ذکر آجاتا ہے۔

بیگم سجانہ۔ جی ہاں اگر گلی گلی نہ کہتے پھرتے تو مجھے کیسے
پتہ چلتا۔ آج کسے نہیں معلوم ان کی من گھڑت داستان

نصیبن۔ اچھا بیگم... یہ تو برا ہُوا

بیگم سجانہ۔ اور خبر نہیں کہاں سے میری تصویریں مل
گئی ہیں۔ ان پر میرے نام سے خبر نہیں کیا الا بلا لکھوا

لیا ہے۔ اب ایک ایک کو دکھاتے پھرتے ہیں۔

نصیبن۔ تو کیا آپ نے انہیں تصویریں نہیں دیں؟

بیگم سجانہ۔ میں کیوں دیتی؟ میں نے تصویریں نہیں دیں

نصیبن۔ پھر یہ لکھا ہوا کس کا ہے؟

بیگم سجانہ۔ یہ مرزا شفیق سے پوچھنا۔ میں نے نہیں لکھا.... او نِگی کنیز.... میں یہ ذلت برداشت نہیں کرسکتی۔ ٹھیر جاؤ اب نواب صاحب ہی اس کا فیصلہ کریں گے۔ بھنگاسی جان، چند بدمعاشوں کو اشارہ کرنے کی دیر ہے، پتہ بھی نہیں لگے گا کہ میاں کی بوٹیاں گئیں تو کہاں گئیں۔

نصیبن۔ کیا آپ سچ مچ شفیق میاں کی بوٹیاں کروانا چاہتی ہیں؟ سمجھ میں نہیں آتا شفیق میاں تو آپ کے پیچھے دیوانہ ہو رہے ہیں اور آپ اُن کی جان کے درپے ہیں۔

بیگم سجانہ۔ دیوانہ ہو رہے ہیں؟

نصیبن۔ ہاں بیگم کبھی تو ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ خوشی میں آکر ناچنے لگتے ہیں۔ کبھی سر پکڑ کر ایسے بیٹھ جاتے ہیں کہ کوئی سمجھے کہ ملک الموت روح قبض کرنے کے لئے ان کی گردن پر سوار ہے۔ اور یہی نہیں کبھی کبھی تو بالکل مجنوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ سُنا ہے نا آپ نے مجنوں لیلے کے کتے کو گلے لگا کر پیار کرتا تھا۔ اِس سے باتیں کرتا تھا۔

بیگم سجانہ۔ ہاں ہاں۔

نصیبن۔ شفیق میاں کا بھی یہی حال ہے۔ کچھ دن بھی تو نہیں ہوئے۔ کل ہی تو وہی کھڑے پاجامہ والا جوڑا نکالا، پہلے تو اسے چوما۔ پھر آنکھوں سے لگایا۔ اور پھر اس سے ایسی میٹھی میٹھی باتیں کیں ـــــ مجھے تو یاد بھی نہیں رہیں اور یاد بھی ہوں تو کیسے۔ وہ تو ہر وقت ہی مجنوں اور فرہاد کا پارٹ کرتے رہتے ہیں۔

بیگم سجانہ۔ کھڑے پاجامے کے جوڑے سے باتیں کیں؟....

نصیبن۔ جی ہاں بیگم! وہ کہتے تھے کہ جب یہ جوڑا آپ پہنے ہوئے تھیں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان کا ستارہ زمین پر اُتر آیا ہے...... وہ آپ کا نام تھوڑی ہی لیتے ہیں ہمیشہ آپ کو رقاصۂ فلک کہتے ہیں۔ رقاصۂ فلک۔

بیگم سجانہ۔ میں یہ جوڑا پہنے ہوئے تھی؟.... لیکن کب؟ کیسا جوڑا؟

نصیبن۔ آپ بہتر جان سکتی ہیں۔ مجھے کیا معلوم! آپ نے ہی تو دیا ہے۔

بیگم سجانہ۔ اچھا تو گویا میں نے اتار کر اِن کی نذر کر دیا.... خوب! سب پتہ چل جائے گا کہ کس طرح ستارہ زمین پر اُترتا ہے۔ ذرا دیکھنا اب۔ اگر دن میں تارے نظر نہ آجائیں تو میرا نام بھی اختری نہیں۔ نواب صاحب کو نجوم میں بڑی مہارت ہے۔

نصیبن۔ للّٰہ بیگم نواب صاحب کو خبر نہ کیجئے گا میں آپ کے پیروں پڑتی ہوں.... اگر نواب صاحب کو پتہ چل گیا تو معلوم نہیں وہ زندہ بھی چھوڑیں یا نہیں۔

بیگم سجانہ۔ زندہ؟...... نواب صاحب کا غصہ تم نے دیکھا نہیں ہے۔

نصیبن۔ غضب ہو جائے گا۔ بیگم! شفیق تو ایسا سیدھا

بچہ ہے۔ اپنی بیوہ ماں کا ایک ہی تو دیدہ ہے۔ رحم کیجئے بیگم!

بیگم سجانہ۔ جو شریف بہو بیٹیوں کو بدنام کرتا پھرے اُس کے لئے رحم؟

نصیبن۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر انہیں ہُوا کیا تھا۔ لیکن ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ ان کی اس میں کوئی بُری نیت نہیں تھی۔

بیگم سجانہ۔ کیا مطلب؟

نصیبن۔ وہ آپ کو بدنام کرنے کی غرض سے یہ سب کچھ نہیں کہتے پھرتے تھے۔

بیگم سجانہ۔ جی ہاں . . .

نصیبن۔ کسی پر عیب لگانا تو بہت بڑی بات ہے اُن سے تو کسی کو گالی بھی نہیں دی جاتی۔ اگر کوئی فقیر آکر ان کے سر پر بھی سوار ہو جائے تو ان سے یہ نہیں ہو سکتا کہ اسے جھڑک دیں اب یہی دیکھئے۔ مجھے ان کے ہاں کام کرتے ہوئے مدتیں گزر گئیں۔ اتنی مدت میں ایک دفعہ بھی فضیحتا کرنا تو کہاں، تو تکار سے بھی بات نہیں کی۔ آدمی ہی ہوں بیگم۔ بہتیری احتیاط کرتی ہوں پھر بھی کوئی نہ کوئی کام بگڑ ہی جاتا ہے۔ خدا انہیں عمر دے۔ کبھی یہ بھی نہیں پوچھا کہ نصیبن۔ تیرے منہ میں کے دانت؟

بیگم سجانہ۔ تو کیا میں نوکرانی اور فقیر سے بھی بدتر ہوں کہ ان کا تو لحاظ کریں اور میرا اتنا بھی خیال نہیں۔

نصیبن۔ کیا مطلب؟

بیگم سجانہ۔ انہیں مجھے بدنام کرتے ہوئے خیال نہیں ہُوا کہ میں ناحق کیوں اسے بدنام کر رہا ہوں۔ مجھے اس سے کیا غرض کہ وہ زمانے کے ساتھ کیسے ہیں۔ انہیں اس کی سزا ملنی چاہئے۔

نصیبن۔ میری اچھی بیگم ان سے بدلا نہ لیجئے۔

بیگم سجانہ۔ انہیں تو ایسی سزا ملنی چاہئے کہ دوسروں کو بھی نصیحت ہو۔

نصیبن۔ آپ میرا یقین تو کیجئے۔ وہ تو بہت ہی شریف آدمی ہیں۔ خبر نہیں ان کی سمجھ پر کیا پتھر پڑے تھے کہ یہ نہ سوچا کہ میں جو کسی پر عیب لگاؤں گا تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اور وہ بھی آپ جیسی شریف اور بھولی بھالی عورت پر۔ آپ جیسے نرم دل کی عورت ڈھونڈے سے بھی تو نہیں ملے گی۔

بیگم سجانہ۔ میں یہ وہ کچھ سننا نہیں چاہتی۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ آئندہ میرے متعلق ایک لفظ بھی نہ کہا جائے۔

نصیبن۔ جی ہاں۔ آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں۔ واقعی انہوں نے بڑی غلطی کی۔ انہیں ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہئے تھا اب میں آپ کو کیا بتاؤں . . . . اپنا ہی گھٹنا کھولو۔ اور آپ ہی لاجوں مرو۔

بیگم سجانہ۔ کیوں کیا ابھی کچھ باقی ہے۔

نصیبن۔ آج صبح ہی تو مجھ سے کہا کہ کل رات میں بیگم سجانہ کے ساتھ موٹر میں سیر کرنے گیا تھا۔ پرسوں جوئی کی دو بالیاں رومال میں باندھ کر لے گئے تھے۔

بیگم سجانہ۔ پرسوں لے گئے تھے؟

نصیبن۔ جی ہاں۔ کہتے تھے کہ آپ کو جوئی بہت پسند ہے۔ جب میں جوئی کی بالیاں خرید کر لائی تو میرے چاروں طرف وہ ناچے کہ کیا بتاؤں . . . . بچوں کو مات کر رکھا ہے۔

بیگم سجانہ۔ عجیب خبطی آدمی ہیں دیوانے کہیں کے۔

نصیبن۔ جی ہاں بیگم۔ بھلا سمجھدار آدمی ایسی باتیں تھوڑی کرتے ہیں۔ لیکن سچ بیگم یہ سب انہوں نے کسی بُری نیت سے نہیں کیا۔ دیکھئے اگر آپ نے نواب صاحب سے کہہ دیا تو کیا ظلم ہوگا؟ دیوانے کی باتوں کو تو درگذر کر دیتے ہیں۔

بیگم سجانہ۔ انہیں روکا نہ جائے تاکہ وہ جو چاہیں کہتے پھریں۔

نصیبن۔ اگر آپ انہیں ایک دفعہ بھی منع کر دیں تو میرا ذمہ، پھر کبھی ایسی حرکت نہیں کرنے کے۔ جب میں ان کی کسی بات پر خفا ہوتی ہوں تو سچ مچ رو دیتے ہیں۔ جس بات کو ایک دفع منع کر دو پھر کیا مجال کہ دوبارہ کریں۔ جس بات کو کہو فوراً مان لیتے ہیں۔ اللہ میاں نے انہیں ایسی نرم مٹی سے بنایا ہے۔ . . . .

بیگم سجانہ۔ اچھا میں ان سے کہہ کر دیکھتی ہوں۔ اگر یونہی مان جائیں تو اس سے اچھا اور کیا ہو سکتا ہے۔

نصیبن۔ آپ کے کہنے کی دیر ہے۔ وہ ضرور مان جائیں گے۔

بیگم سجانہ۔ لکھنا زیادہ مناسب ہوگا۔ میں کل انہیں تنبیہ کا خط لکھوں گی۔ دیکھتی ہوں کیا اثر ہوتا ہے۔ اچھا اب میں جاتی ہوں (کھڑی ہو جاتی ہے) ان کی قسمت ہی اچھی تھی جو تم یہاں مل گئیں۔

نصیبن۔ (پلو چوم کر) میں آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔ آپ نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ خدا آپ کو ہر طرح کا چین دے۔

بیگم سجانہ۔ مرزا شفیق بیگ کو یہ نہ بتانا کہ میں یہاں آئی تھی۔ وعدہ کرو۔

نصیبن۔ آپ کے سر کی قسم! بیگم مجال ہے جو ایک لفظ بھی زبان سے نکل جائے۔

بیگم سجانہ۔ ہاں دیکھو انہیں معلوم نہ ہونے پائے۔

(پیروں کی آہٹ)

نصیبن۔ یا اللہ یہ کیا ہُوا۔ وُہ تو آ گئے ان کے قدموں کی آواز۔

بیگم سجانہ۔ مرزا شفیق کے؟

نصیبن۔ جی ہاں۔ وہ آ گئے۔

بیگم سجانہ۔ اب میں کیسے جاؤں۔ کوئی دوسرا دروازہ ہے نکلنے کا؟

نصیبن۔ دوسرا دروازہ تو ہے نہیں! اب بیگم کیا ہو؟

بیگم سجانہ۔ (دفعتہً) وہ سونے کا کمرہ کدھر ہے؟

نصیبن۔ (دروازے کی طرف اشارہ کر کے) یہ رہا بیگم

بیگم سجانہ۔ خبردار! انہیں پتہ نہ چلے کہ میں یہاں ہوں۔ سمجھیں

نصیبن۔ آپ فکر نہ کیجئے۔ لیکن بیگم سنئے تو آپ سونے کے کمرے میں کریں گی کیا؟

بیگم سجانہ۔ دیکھتی جاؤ ہوتا کیا ہے۔

(بیگم سجانہ سونے کے کمرے میں چلی جاتی ہے)

نصیبن۔ ہونا کیا ہے! کیا گڑبڑ ہوئی ہے۔ خدا ہی خیر کرے۔

(نصیبن دم بیٹھی ہے چند لمحوں میں شفیق داخل ہوتا ہے۔ بہت خوش ہے۔)

شفیق۔ کہو۔ بوا نصیبن! کیا حال ہے چہرہ اترا کیوں رہا ہے۔

نصیبن۔ نہیں تو میاں۔

شفیق۔ اوہو سمجھ گیا۔ آج پان کھانے کو نہیں ملا۔

نصیبن۔ خدا تمہیں سلامت رکھے۔ تمہارے دم سے بہتیرے پان۔

شفیق۔ (سونگھتے ہوئے) بہت خوشبو آ رہی ہے! کہو بوا نصیبن۔ خیریت تو ہے۔ یہ تم نے عطر لگانا کب سے شروع کیا؟

نصیبن۔ نہیں میاں۔ بھلا مجھے عطر لگانے کی کیا ضرورت

شفیق۔ مجھے کیا معلوم ضرورت ہے یا نہیں۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ خوشبو آ رہی ہے۔ دیکھنا سنبھل کر رہنا۔ کہیں کوئی بھوت پریت سر پر نہ آ جائے۔

نصیبن۔ آپ تو مذاق کرتے ہیں۔

شفیق۔ مذاق نہیں۔ اچھا ذرا آج رات کو سفید چادر اوڑھ کر چھت پر سو کر تو دیکھو کیا ہوتا ہے۔

نصیبن۔ کیا ہو گا؟

شفیق۔ پلنگ سمیت اڑا کر لے جائیں گے سچ

نصیبن۔ توبہ۔ آپ تو ناک میں دم کر دیتے ہیں۔

شفیق۔ بتاؤ تو...... آخر تمہیں یہ آج سوجھا کیا۔ عطر بھی لگایا تو اس قدر کہ سارا کمرہ مہک رہا ہے۔

نصیبن۔ آپ کو تو وہم ہو گیا ہے۔ میں نے عطر نہیں لگایا۔ اور میرے پاس عطر آتا کہاں سے۔

شفیق۔ پھر یہ خوشبو آ کہاں سے رہی ہے؟ (سونگھتے ہوئے) خوشبو تو بہت نفیس ہے۔

نصیبن۔ ماشاء اللہ۔ شگون تو اچھا ہے۔ خدا وہ دن بھی لائے کہ دن رات گھر مہکا کرے۔ گھر میں آبادی اور رونق رہا کرے۔

شفیق۔ کیا مطلب۔

نصیبن۔ مطلب یہ کہ دلہن آئے۔ عطر سے مہکتی ہوئی پھولوں سے لدی ہوئی تاکہ خوشبو سے گھر مہک جائے۔

شفیق۔ لیکن یہ خوشبو کہاں سے آ رہی ہے؟

نصیبن۔ مجھے تو نہیں آ رہی۔

شفیق۔ نہیں نہیں آ رہی؟ واہ خوشبو ضرور ہے۔

نصیبن۔ آپ کو تو وہم ہو گیا ہے۔

شفیق۔ نہیں نصیبن۔ یوں بات نہیں بنے گی عطر تو تم نے ہی لگایا ہے۔

نصیبن۔ میاں آپ کے سر کی قسم۔ میں نے عطر لگایا ہو تو مجھ پر خدا کی مار ہی پڑے۔

شفیق۔ تو پھر شاید میری ناک خراب ہو گئی ہے..... اچھا۔ اب تم جلدی جاؤ اور چائے لاؤ۔

(نصیبن جانے لگتی ہے)

شفیق۔ ہاں سننا!

نصیبن۔ کیا میاں۔

شفیق - میں آج یہاں کھانا نہیں کھانے کا۔ مجھے سات بجے اپنی رفاعہ فلک سے ملنے جانا ہے۔ یہ دیکھو ان کا پرچہ آیا ہے۔

(خط جیب سے نکالکر دکھاتا ہے۔ اور میز پر ڈال دیتا ہے۔ اور ٹہل ٹہل کر مزے سے گنگناتا ہے)

نصیبن - (خط دیکھتے ہوئے) یہ پرچہ آپ کی رفاعہ فلک کے پاس سے آیا ہے۔ (نام زبان سے ٹھیک نہیں نکلتا۔)

شفیق - نصیبن بوا۔ تمہاری زبان پر آخر کب یہ لفظ چڑھے گا۔ جب کہتی ہو غلط کہتی ہو۔

نصیبن - میاں بڑا ثقیل لفظ ہے۔۔۔۔ اور پھر میں زبان پر چڑھا کر کیا لوں گی۔۔۔۔ ہاں میاں میں یہ کہہ رہی تھی۔ کہ آپ تو روز ان کے ساتھ کھانا کھا آتے ہیں، کبھی ان کو بھی تو یہاں لاکر کھانا کھلائیے۔ آخر ایسی بھی کیا بے غیرتی۔

شفیق - محبت میں تکلف نہیں ہوا کرتا۔ اور اگر دیکھا جائے تو محبت ہی بے غیرتی ہے۔ لیکن اس میں بے غیرتی کی کیا بات ہے۔

نصیبن - جی ہاں! آپ کے کہنے سے۔

شفیق - وہ بھی اپنا پیسہ خرچ نہیں کرتیں۔ اور نواب صاحب کے پاس مُفت کا آتا ہی ہے۔ باپ دادا چھوڑ مرے۔ اب بیٹھے توند پھلاتے ہیں۔

نصیبن - اس سے کیا غرض پیسہ آتا کہاں سے ہے میں تو یہ جانتی ہوں کہ اگر ایک دفعہ کسی کے ہاں کھائے۔ تو ایک دفعہ خود بھی اس کی دعوت کرے۔

شفیق - میں اگر انہیں بلاؤں بھی تو کھلاؤں کیا؟ وہ پُر تکلّف کھانے آئیں کہاں سے؟ اور پھر ایک دفعہ تو بات نبھ بھی سکتی ہے۔ روز روز تو نہیں۔

نصیبن - ہم تو اپنی حیثیت کے مطابق جو کچھ ہو گا سامنے رکھ دینگے۔

شفیق - آخر سامنے رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

نصیبن - در اصل میاں میرا ان کے دیکھنے کو بہت دل چاہ رہا ہے۔ فلم میں تو ان کو بہت دیکھا ہے۔ لیکن ویسے کبھی نہیں دیکھا۔ (تصویروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کیسی پیاری شکل ہے!

شفیق - اری نری ہی نہیں جو انہیں ایک بار دیکھ لیتا ہے۔ اس کی طبیعت ڈانوا ڈول ہو جاتی ہے۔

نصیبن - تم نے جو ان کی تصویریں یہاں لگا رکھی ہیں یا ذرا نامناسب سی معلوم ہوتی ہیں۔

شفیق - کیوں؟

نصیبن - تمہارے ہر دوست کی آتے جاتے نظر پڑتی ہے۔ کیا پتہ کس دن کیا فتنہ اٹھ کھڑا ہو۔

شفیق - فتنہ؟۔۔۔۔ کچھ نہیں ہوتا ہوتا ہوا تو بہت ہو گا تو یہی ہو گا۔ کہ میرے دوست جل مرینگے۔

نصیبن - یہی نہیں۔ ممکن ہے کہ جلن میں کچھ کر بیٹھیں۔

شفیق - تم کچھ جانتی ہو بوا نصیبن جس دن سے

میرے دوستوں کو معلوم ہے کہ میری بیگم سجانہ سے ملاقات ہے
بس اُسی دن سے میری اتنی عزت کرتے ہیں۔ کہ سر پر بٹھانے
کو تیار ہیں۔ دوست تو دوست، کمپنی کے منیجر صاحب بھی تو
میری بڑی عزت کرتے ہیں۔

نصیبن۔ اگر کوئی نواب سجانہ کو خبر کر دے تو۔

شفیق۔ نواب سجانہ؟ ہا ہا (ہنس کر) تو نے بھی بھلی فکر
کری۔ وہ اب بڑھے ہو چلے۔ ان کی بلا سے کچھ ہی ہوا کرے
اچھا اب جلدی سے چائے لا۔ دیکھوں کتنی جلدی چائے لاتی ہے۔

نصیبن۔ ڈر ہی لگتا رہتا ہے۔ بڑے آدمی ہیں خبر نہیں
کیا ہو جائے۔

شفیق، اب جاتی ہے یا نہیں۔ یا باتیں ہی بنائے جائیگی
مجھے بھوک لگ رہی ہے۔

(نصیبن جانے میں پس و پیش کرتی ہے۔)

شفیق۔ نصیبن میں پوچھتا ہوں کہ آخر تجھے کیا ہو گیا ہے

نصیبن۔ کچھ نہیں میاں۔

شفیق۔ جلدی سے چائے لا۔

نصیبن۔ لائی میاں

(نصیبن سہمی ہوئی سی جلدی سے باہر چلی جاتی ہے۔
شفیق اپنے شانوں کو جنبش دیتا ہے۔ بالوں میں
انگلیوں سے کلیل کرتا ہے۔ آخر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے
اخبار اٹھاتا ہے۔ سگرٹ سلگائی پیتا سونے کے
کمرے کی طرف ہے۔ —— تھوڑی دیر خاموشی سٹیج
پر روشنی مدھم ہو جاتی ہے بیگم سجانہ آہستہ سے سونے
کے کمرے کا دروازہ کھول کر چپکے سے کمرے میں آتی
ہیں۔ کھڑے پاجامہ والا جوڑا پہنے ہوئے)

بیگم سجانہ۔ (شفیق کی کرسی کے پیچھے کھڑے ہو کر)
آپ آ گئے؟

شفیق۔ (متحیر) ارے..... یہ کیا؟ اوہ ہوں ناممکن!
وہ نہیں ہو سکتیں۔

بیگم سجانہ۔ کون نہیں ہو سکتیں؟ کیا ناممکن ہے؟

شفیق۔ آپ کون ہیں؟..... یہاں کیونکر آئیں؟

بیگم سجانہ۔ تو کیا تم اپنی ادنیٰ کنیز کو نہیں پہچانتے؟
میرا اس طرح اچانک آنا ناگوار گذرا؟

شفیق۔ خدایا خیر (پہچان کر) بیگم سجانہ!

بیگم سجانہ۔ بیگم؟..... مجھے بیگم کا خطاب کس دن
سے عنایت ہوا۔ میں تو ہوں آپ کی ادنیٰ کنیز۔ آپکے نیاز
کی مشتاق۔

شفیق۔ (ایک دم از راہ احترام کھڑا ہو جاتا ہے) میں پوچھ
سکتا ہوں کہ بیگم سجانہ نے اس غریب خانہ پر تشریف لانے کی
کس لئے زحمت گوارا کی!

بیگم سجانہ۔ زحمت گوارا کی! کس نے؟ پیارے شفیق
تم تو مذاق کر رہے ہو۔

شفیق۔ میں بیگم سجانہ سے مذاق کرنے کی کبھی جرأت
نہیں کر سکتا۔

بیگم سجانہ۔ کل رات جب ہم تم کار میں سیر کر
رہے تھے۔ اس وقت نہیں خیال نہ آیا۔ کہ میں آج بھی نہیدے

پاس آسکتی ہوں۔ کیوں کیا تم میرے آنے سے ناخوش ہو؟

شفیق۔ آپ کس سیر کا ذکر کر رہی ہیں۔

بیگم سجانہ۔ لیجئے آپ تو بھول بھی گئے۔

شفیق۔ مجھے نہیں یاد۔ آپ کا یہاں آنے سے مطلب؟

بیگم سجانہ۔ یہاں آنے سے مطلب! خوب! کیا آپ محبوبہ سے ایسے ہی سوال کرتے ہیں؟

شفیق۔ محبوبہ!! اور آپ نے یہ جوڑا پہن رکھا ہے۔ کیا آپ واقعی بیگم سجانہ ہیں؟

بیگم سجانہ۔ بیگم سجانہ ہونے کی بھی ایک ہی رہی! نہیں تو اور کیا ہوں۔

شفیق۔ ہوں۔

بیگم سجانہ۔ کل رات کار میں آپ کیسے پیار سے باتیں کر رہے تھے۔ آپ کے الفاظ میں کس قدر چاشنی تھی۔ آپ کے جذبات میں کس قدر نفاست تھی۔ آپ کی زبان میں کس قدر شیرینی۔ آپ کی ہر بات پر میرا دل بے قابو ہو جاتا تھا آپ کا ایک ایک لفظ میرے اعصاب پر مدہوشی طاری کر رہا تھا۔ میں آپ کی باتوں میں مخمور بیٹھی تھی ——— آہا۔ وہ لمحے کس قدر پرکیف تھے۔ ان میں کیسا سرور تھا۔ میں کل کی سیر کبھی نہیں بھول سکتی۔

شفیق۔ کل کی سیر؟

بیگم سجانہ۔ تو کیا واقعی کل کی سیر بھول گئے۔

شفیق۔ معاف کیجئے گا بیگم سجانہ۔ آپ بھول رہے ہیں

بیگم سجانہ۔ لیجئے۔ میں بھول رہی ہوں یا آپ بھول رہے ہیں۔

شفیق۔ آپ کو کسی اور کیف و سرور کی یاد آ رہی ہے میں آپ کے ساتھ نہیں گیا نہ میری آپ کی باتیں ہوئیں۔

بیگم سجانہ۔ جی ہاں۔ آپ کے کہنے سے۔ اچھا کل آپ میرے ساتھ نہ تھے۔ تو کہاں تھے۔

شفیق۔ کل رات تو میں ایک بجے تک اپنے دوستوں کے ساتھ تاش کھیلتا رہا۔

بیگم سجانہ۔ کیوں بنتے ہیں آپ؟ اب آپ کہیں یہ نہ کہدیں۔ کہ مجھے کیا معلوم کیسی جوئی کی بالیاں میں نے نہیں دیں۔

شفیق۔ جوئی کی بالیاں..... ہاں ہاں..... نے

بیگم سجانہ۔ شکر ہے یہ تو یاد رہیں۔

شفیق۔ نہیں میں نے آپ کو نہیں دیں۔ میں نہیں دیں۔

بیگم سجانہ۔ پرسوں شام ہی کو تو آپ نے مجھے دی ہیں..... واقعی مجھے جوئی کی خوشبو بہت پسند ہے جوئی پر میری جان جاتی ہے..... اور آپ کی دی ہوئی جوئی کی بالیاں..... میں انکی خوشبو کبھی نہیں بھول سکتی۔ ان میں آپ کی محبت کی خوشبو.......

شفیق۔ آپ پھر بھول رہی ہیں بیگم سجانہ۔ میں نے جوئی کی بالیاں نہیں دیں..... میرا مطلب آپکو نہیں دیں۔

بیگم سجانہ۔ پھر کیسے دیں؟

شفیق - وہ تو ابھی دفتر کی میز کی دراز میں رکھی ہیں ۔

بیگم سجانہ - یہ بھی ایک ہی ہوئی ۔۔۔۔۔

شفیق یقین کیجئے ۔ پرسوں شام تو میں اور میرے دوست مقتدر مرزا بازار کچھ خریدنے گئے تھے ۔

بیگم سجانہ - خریدنے گئے تھے ! آپ کیا کہہ رہے ہیں ؟

شفیق - جی ہاں ! اور میں نے جوتے کا پالش ۔ کفوں کے بٹن اور ٹوتھ پیسٹ ۔۔۔۔ اور کیا خریدا تھا ؟ ۔۔۔۔

بیگم سجانہ - بننے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے ۔ بس ختم کیجئے اسے اب ۔ میں نے آپ کو سات بجے بلایا تھا لیکن اگر خود میں یہاں آگئی تو ایسی کونسی بات ہوگئی جس نے آپ کے دماغ کا توازن درہم برہم کر دیا ۔

شفیق - دماغ کا توازن ۔۔۔۔۔

بیگم سجانہ - (بات کاٹ کر) اب دیکھئے نا ۔ کہاں نواب صاحب اور کہاں ہیں ۔ میرے باپ سے بھی تو بڑے ہیں ۔ یہ تو عمر اور پھر مٹکا سی توند اور اس پر بالشت برابر قد ۔۔۔ غضب ہے عجب مینڈک سے واسطہ پڑا ہے ۔ آواز ایسی کہ جیسے مٹکے میں کنکر گر گڑ گر گڑ بول رہے ہوں ۔ ایک لفظ سمجھ میں نہیں آتا ۔۔۔۔ یہ موٹی موٹی انگلیاں اور ایک منٹ چین نہیں چھیڑے جاتے تھے ۔ میرا ناک میں دم کر دیا مجھ سے سات بجے تک بھی انتظار کرنا مشکل ہوگیا ۔ اب بتائیے میں کرتی بھی تو کیا کرتی ۔

شفیق - کیا واقعی نواب صاحب اس ہیئت کے ہیں ؟

بیگم سجانہ - کیسی ہیئت کے بھی ہوں ۔ اگر بالفرض یوسف بھی ہوں تو ہوا کریں ۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے تمھارے بغیر چین نہیں آتا

(شفیق کو دھکیل کر کرسی پر بٹھا دیتی ہے ۔ خود کرسی کے بازو پر بیٹھ جاتی ہے) ہاں تو آپ کو میرا پرچہ مل گیا تھا ؟

شفیق - کیسا پرچہ ؟ آپ نے لکھا تھا ؟ کب ؟

بیگم سجانہ - وہی پرچہ جو آج صبح میں نے آپ کو لکھا تھا ۔

شفیق - آپ نے لکھا تھا ؟

بیگم سجانہ - کیوں ۔ کیا ابھی تک نہیں ملا جب ہی آپ اس قدر برہم ہو رہے ہیں ۔ میں نے پہلے ہی اجازت مانگی تھی ۔ بلا اجازت اس کنیز کی یہاں آنے کی جرأت کیسے ہوتی ۔

شفیق - (میز پر سے خط اٹھاتے ہوئے) آج صبح تو میرے پاس یہ پرچہ آیا تھا لیکن یہ آپ کا تو نہیں ۔

بیگم سجانہ - (پرچہ اچک کر سونگھتی ہے) لو سونگھو میں نے پرچہ پر MISCHIEF سینٹ کی دو بوندیں ڈالی تھیں ۔ سونگھو ۔ ابھی تک خوشبو آرہی ہے ۔

(پرچہ شفیق کو دیتی ہے)

شفیق - (سونگھتے ہوئے) اوں ہوں ۔ اس میں سے تو سینٹ کی خوشبو نہیں آرہی (پھر سونگھتا ہے) اس میں سے تو ۔۔۔۔ تو ۔۔۔ استری کی راکھ کی ۔۔۔۔

بیگم سجانہ - (جلدی سے پرچہ چھین لیتی ہے) واہ ۔ اس میں سے تو MISCHIEF کی خوشبو آرہی ہے ۔ (سونگھتی ہے) آہا کیسی مست خوشبو ہے ۔۔۔۔ آخر آپ کی ناک کو کیا ہوگیا ہے ؟

شفیق - سمجھ میں نہیں آتا کیا ہوگیا ہے ۔ جب مجھے خوشبو آرہی تھی تو نصیبن کہتی تھی کہ عطر نہیں لگایا ۔ اور اب مجھے خوشبو نہیں آرہی تو آپ کہہ رہی ہیں کہ عطر لگایا ہے ۔۔۔ شاید ناک آج کچھ

خراب ہوگئی ہے (ناک کو رگڑتا ہے) لیکن یہ خط آپ نے نہیں لکھا ..... یہ تو میرے درزی .....

بیگم سجانہ (ٹھیرو) میں دیکھتی ہوں۔ میرا نہیں تو بھلا اور کس کا لکھا ہوا ہے ..... ذرا دیکھو تو .....

شفیق۔ میں نے دیکھ رکھا ہے۔

بیگم سجانہ۔ پڑھو تو .....

(خط دینے کو ہاتھ بڑھاتی ہے۔ جب شفیق لینے کو ہاتھ بڑھاتا ہے تو بیگم سجانہ خط نہیں دیتیں)

بیگم سجانہ۔ اچھا لو میں پڑھتی ہوں (خط پڑھتی ہے۔ ایک ہاتھ شفیق کی گردن میں حمائل ہے) میرے پیارے شفیق میں آج شام ٹھیک سات بجے اُسی جگہ موٹر میں انتظار کروں گی۔ دیکھو دیر نہ ہو جائے۔ میرا وہاں زیادہ دیر انتظار کرنا مناسب نہیں۔

نیاز کی طالب ا۔ اختری

شفیق۔ یہ آپ کیا پڑھ رہی ہیں؟

بیگم سجانہ۔ اس میں یہی لکھا ہوا ہے۔

شفیق۔ میں دیکھوں۔

بیگم سجانہ۔ لو تم دیکھ لو میرے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے یا نہیں۔ ذرا پڑھو تو میرے پیارے ننھے سے ناسمجھ مجنوں۔

شفیق۔ خط میں لکھا ہے "مکرمی تسلیم میں آپ کو آخری دفعہ متنبہ کئے دیتا ہوں۔ دو سال ہو گئے۔ آپ سے ایک دمڑی بھی وصول نہیں ہوئی۔ حساب فوراً صاف کر دیجئے۔ ورنہ میں ذمہ وار نہیں۔ اگر میں سر بازار آپ کی پتلون اُتروا لوں تو آپ کی کیا عزت رہ جائے گی۔ میں اپنی پھوٹی کوڑی بھی نہیں مرنے دینے کا۔ میرے پیسے پہنچ جائیں۔" یہ تو میرے درزی کا پرچہ ہے۔ سر بازار پتلون اُتروا لوں گا۔ ہمیشہ کم بخت اسی طرز میں لکھتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ چوروں سے واسطہ پڑا ہے جو اس کے پیسے لے کر بھاگ جائیں گے۔ بدتمیز!

بیگم سجانہ۔ (چیخ چیخ کر روتی ہے۔ اور شفیق کی گود میں اپنا منہ چھپا لیتی ہے) میرے پیارے شفیق۔ کیا محبت نے تمہیں اس قدر وارفتہ کر دیا ہے تم میرا خط بھی نہیں پہچانتے۔ آخر تمہاری آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے

شفیق۔ آپ کو یہ زیب نہیں دیتا۔

بیگم سجانہ۔ جی ہاں اور آپ کو اس طرح پیش آنا بہت زیب دیتا ہے۔

شفیق۔ للہ مجھ پر رحم کیجئے۔

بیگم سجانہ۔ رحم کی تو میں آپ سے التجا کرتی ہوں۔

شفیق۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ رو کیوں رہی ہیں؟ مجھ سے کیا خطا سرزد ہوگئی؟ نہیں بتائیں گی تو میں دیواروں سے اپنا سر پھوڑ لوں گا۔ اپنے کپڑے پھاڑ ڈالوں گا۔

بیگم سجانہ۔ میں کیوں رو رہی ہوں؟ اپنی قسمت پر رو رہی ہوں۔ بھلا آپ سے کیا خطا ہو سکتی ہے۔ آپ یہ کہہ کر میرے کانوں کو کیوں گنہگار کرتے ہیں۔ میں تو آپ کی کنیز ہوں اور وہ بھی ایک ادنیٰ کنیز۔

شفیق۔ میری کنیز؟ ادنیٰ کنیز؟ کس کی کنیز؟

بیگم سجانہ۔ (روتے ہوئے) کیسا ظلم ہے۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتی۔ آپ تو مجھے پہچانتے بھی نہیں۔ اپنی کنیز کو۔ کیا محبت نے آپ کی عقل بھی خبط کر دی ہے؟ آخر آج یہ ہوا کیا آپ کو؟ ہر وقت

میرے ساتھ رہنے سے کیا اتنی خوشی ہوئی کہ ہوش و حواس بھی جاتے رہے۔

شفیق۔آپ کے ساتھ رہنے سے؟ آپ کے ساتھ؟

بیگم سجانہ۔ہاں ہاں، میرے ساتھ!

شفیق۔میرے ساتھ۔ تمھارے ساتھ۔ اس کے ساتھ ہمارے ساتھ ان کے ساتھ۔

بیگم سجانہ۔میرے پیارے شفیق۔ خدارا ہوش میں آؤ مجھ پر رحم کرو۔ للہ انسانوں کی سی باتیں کرو۔ اچھا مجھے غور سے دیکھو تو سہی۔

شفیق۔دیکھ تو رہا ہوں۔

بیگم سجانہ۔تم ان آنکھوں کو نہیں پہچانتے جن کو تم نرگس شہلا کہا کرتے تھے۔

شفیق۔نرگس شہلا.... ہاں ہاں....

بیگم سجانہ۔اور یہ ہونٹ، انھیں تم یاقوت بتایا کرتے تھے۔

شفیق۔ہیں؟

بیگم سجانہ۔اس تل کو نہیں پہچانتے جس کے بدلے تم سمرقند اور بخارا دینے کو تیار تھے۔ مجھے دیکھو تو سہی۔

شفیق۔میں دیکھ تو رہا ہوں۔

بیگم سجانہ۔میں وہی ہوں جسے تم نقاشِ ازل کا بہترین شاہکار کہا کرتے تھے۔ میں وہی ہوں۔ تمھاری ادنیٰ کنیز تمھاری اختری۔

شفیق۔میری کنیز؟.... آپ کیا کہہ رہی ہیں؟

بیگم سجانہ۔آج تمھاری آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے (جھک کر دیکھتی ہے) آنکھیں دیکھنے میں تو بالکل صاف ہیں۔ کوئی جالا نہیں۔ ان میں وہی چمک ہے لیکن شفیق کیا بات ہے؟ آج محبت کی بجائے جنوں.....

شفیق۔جنوں؟ محبت کی بجائے؟ لیکن کس کی محبت؟ کیسا جنوں؟

بیگم سجانہ۔اچھا پیارے شفیق اگر تم مجھے نہیں پہچانتے تو اس جوڑے کو تو پہچانتے ہو۔

شفیق۔ہاں ہاں۔ یہ وہی جوڑا ہے۔ اسے تو میں پہچانتا ہوں۔

بیگم سجانہ۔شکر ہے یہ تو پہچانا.... تمھیں یاد ہے۔ ایک رات نکھری ہوئی چاندنی میں میں اس جوڑے کو پہنے ہوئے تھی۔ یاد ہے تم نے کیا کہا تھا؟ وہ لفظ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ مجھے حرف بحرف یاد ہیں۔

شفیق۔کمال ہے.... میں نے کیا کہا تھا؟

بیگم سجانہ۔تم نے کہا تھا "ایسا معلوم ہوتا ہے میری جان، ایک ستارہ زمین پر اتر آیا ہے۔ کوئی معمولی ستارہ نہیں ایک درخشاں ستارہ حسن و رقص کی تکمیل، رقاصۂ فلک!" اس رات پہلی دفعہ تم نے مجھے رقاصۂ فلک کہا تھا۔ اچھا تم مجھے رقاصۂ فلک ہی کہا کرتے ہو نا؟

شفیق۔جی ہاں.... رقاصۂ فلک.... لیکن....

بیگم سجانہ۔اور تم نے کہا تھا "تمھارے باریک دوپٹہ پہ کامدانی —— ایک کہکشاں ہے۔ اور یہ پائنچے کی موریاں کا

بیگم سجانہ۔ اب مجھے جھڑکیاں مل رہی ہیں (روتے ہوئے) گھر سے باہر دھکیلا جا رہا ہے۔ کبھی وہ دن تھے کہ میری خوشامد ہوتی تھی۔ میری تعریفیں ہوتی تھیں۔ اور اب میری موجودگی بھی ناگوار گزر رہی ہے میری صورت سے نفرت ہو گئی ہے۔ لیکن یہ تو قاعدہ ہی ہے۔ مرد ہوتے ہی ایسے ہیں۔ ہم سب کچھ ان پر نثار کر دیں۔ اور یہ ۔۔۔۔ جہاں طبیعت بھری پھر گیا۔۔۔ وہ ٹھوکریں مارتے ہیں۔۔۔۔ لیکن میں تو اپنے دل سے مجبور ہوں۔۔۔ ٹھوکریں کھاؤں گی۔۔۔۔

شفیق۔ یا الٰہی یہ کیا آفت ہے؟ یہ بیگم سجانہ ہیں یا نصیبن کی بھتیجی۔۔۔ یا دونوں۔۔۔۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔۔ اگر بیگم سجانہ ہیں تو انھیں یہ سب باتیں کیونکر معلوم ہوئیں۔

بیگم سجانہ۔ معلوم ہوئیں کیسے، آپ ہی نے تو بتائی تھیں۔

شفیق۔ کب؟

بیگم سجانہ۔ جب میں یہاں آئی تھی اور نصیبن باہر گئی ہوئی تھی۔ آپ تو بھول جاتے ہیں

شفیق۔ لیکن نصیبن کی بھتیجی بھی نہیں!۔۔۔۔ نصیبن کی بھتیجی؟۔۔۔ نہیں بیگم سجانہ؟ نہیں۔ تو پھر کیا؟ ضرور کوئی بلا ہے۔ کوئی چڑیل ہے۔

بیگم سجانہ۔ ہاں بس اسی کی کسر رہ گئی تھی۔ بلا، چڑیل اور کچھ۔ کوئی اور خطاب

شفیق۔ ارے نصیبن کی بھتیجی تجھے یہاں آنے کو کس نے کہا تھا؟ مجھے ستانے کی تجھے ہمت کیسے ہوئی؟ ٹھیر، ابھی نصیبن کو بلاتا ہوں وہ تیری خبر لے گی۔

بیگم سجانہ۔ میں لاکھ کہہ چکی میں نصیبن کی بھتیجی نہیں ہوں شفیق آخر آج تمھیں ہو کیا گیا ہے۔ میں کس طرح یقین کروں کہ تم اپنی اختری کو نہیں پہچانتے۔

شفیق۔ اپنی اختری! اختری۔ ہاں ہاں ۔۔۔ تم اختری ہو

بیگم سجانہ۔ شکر ہے تم نے پہچان تو لیا میرے پیارے شفیق (شفیق کی گود میں بیٹھنا چاہتی ہے)

شفیق۔ اختری؟ بیگم سجانہ؟ ناممکن۔۔۔ بھوت! بھوت!!

بیگم سجانہ۔ کہاں ہے بھوت؟

شفیق۔ میرے بلا چمٹ گئی۔ ارے چڑیل آ گئی۔ بچاؤ۔ بچاؤ۔ اُف آواز بھی تو نہیں نکلتی۔

بیگم سجانہ۔ میں کیا کروں؟ شفیق تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے

شفیق۔ اری او نصیبن! او نصیبن!! جلدی آ۔ دسپنہ لے کر۔ مجھے ایک چڑیل لپٹ گئی ہے

بیگم سجانہ۔ میری اب یہی قدر رہ گئی ہے۔ دسپنے لگوا کر نکالا جا رہا ہے۔ میں خود جاتی ہوں۔

شفیق۔ جاتی ہوں!۔۔۔ اری نصیبن اس بلا سے پیچھا چھٹا۔

بیگم سجانہ۔ میں اسی گھڑی جا رہی ہوں لیکن یہ یاد رہے کہ اب میں کبھی نہیں آنے کی۔ اور آپ بھی میرا نام کبھی نہ لیجئے گا۔

(بیگم سجانہ سونے کے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ سٹیج پر روشنی زیادہ ہوتی ہے شفیق اپنا سر دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے)

شفیق۔ اف (دامن سے ہوا کرتے ہوئے) یہ کیا بلا تھی؟ نصیبن کی بھتیجی بیگم سجانہ؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کون تھا۔ اُف

(نصیبن چاء لے کر آتی ہے)

نصیبن۔ لیجئے چاء آ گئی (چاء کی کشتی میز پر رکھتے ہوئے) کیا

آپ نے مجھے آواز دی تھی ؟

شفیق۔ (گھبرائی ہوئی آواز میں) ہاں۔ ہاں۔

نصیبن۔ آواز میرے کانوں میں آئی تو تھی میں جھاڑ کا سامان لگا رہی تھی۔ کیا کام تھا؟

شفیق۔ کچھ نہیں۔ اُف

نصیبن۔ (شفیق کو غور سے دیکھتے ہوئے) کیا ہو گیا؟ خیر تو ہے۔

شفیق۔ کچھ نہیں

نصیبن۔ جی کیسا ہے؟ کہیں دور پار دشمنوں کی طبیعت تو ناساز نہیں

شفیق۔ کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔

نصیبن۔ واہ۔ دیکھو تو سہی چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی ہے

شفیق۔ (خفگی میں) کچھ نہیں۔

نصیبن۔ تو اس قدر نڈھال پھر کیوں ہیں ؟

شفیق۔ کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔

نصیبن۔ کچھ نہیں کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔ ہر بات پر کچھ نہیں۔ آخر کچھ ہے بھی یا نہیں۔ ۔ ۔ ۔ تو پھر آواز کیوں دی تھی؟

شفیق۔ بوا نصیبن میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں۔

نصیبن۔ پوچھئے تو شکر ہے کچھ نہیں تو ختم ہوا۔

شفیق۔ دیکھو ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔

نصیبن۔ کیا پوچھتے ہیں آپ میں ٹھیک جواب دوں گی۔

شفیق۔ سچ سچ بتانا۔

نصیبن۔ اوئی میری توبہ کیسی نکاح کی سی شرطیں کر رہے ہیں آپ

شفیق۔ مجھے کس سے محبت ہے تمہاری بھتیجی سے یا بیگم سجانہ سے

نصیبن۔ آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ نوج میری بھتیجی سے آپ کو محبت ہو میری بھتیجی کہاں اور کہاں آپ۔ وہ تو ایک غریب گھر کی لڑکی ہے اور پھر اس کا بیاہ جو ہو چکا ہے۔

شفیق۔ میں پوچھتا ہوں مجھے کس سے محبت ہے تمہاری بھتیجی سے یا بیگم سجانہ سے۔

نصیبن۔ میں بھی تو یہی کہہ رہی ہوں اس کی شکل بھی تو ایسی نہیں کہ رغبت آئے۔ اس سے کیسے محبت ہو سکتی ہے لیکن یہاں محبت کے آنکھیں کوئی تھوڑی ہی ہوتی ہیں لیکن وہ یہاں آتی ہی کون سی تھی میں نے تو آپ کے منہ سے اس کا نام بھی نہیں سنا۔ اس سے محبت نہیں ہو سکتی۔

شفیق۔ تو پھر بیگم سجانہ سے محبت ہے نا۔

نصیبن۔ ہو نہ ہو انہی سے ہو سکتی ہے اور ان کا نام تو آپ روز ہی لیا کرتے تھے

شفیق۔ تو مجھے بیگم سجانہ سے محبت ہے تیری بھتیجی سے نہیں

نصیبن۔ ہاں یہاں بیگم سجانہ سے ہے آپ کو محبت۔ مجھے معلوم ہے

شفیق۔ میرے پیچھے بیگم سجانہ یہاں آیا کرتی تھیں ؟

نصیبن۔ نہیں میاں یہاں تو کبھی نہیں آئیں۔ اور پھر میں بھی تو آپ سے کہہ رہی تھی کہ میں نے بیگم سجانہ کو نہیں دیکھا۔

شفیق۔ ہاں کہہ تو رہی تھی۔

نصیبن۔ پھر؟

شفیق۔ اور تو نے بیگم سجانہ کو کبھی میرے خاندان کے قصے نہیں سنائے

نصیبن۔ نہیں میاں بھلا میں آخر سناتی تو کہاں سناتی۔

شفیق۔ اچھا آج کل تیری بھتیجی کہاں ہے ؟

نصیبن۔ آج کل کہاں ہے ؟

شفیق۔ اپنے میاں کے پاس

نصیبن۔ یہاں تو نہیں ہے ؟

شفیق۔ یہاں پھر بھلا کیسے ہو سکتی ہے آج آپ کیسی باتیں پوچھ رہے ہیں جن کا نہ کوئی سر نہ پیر۔

شفیق۔ اچھا تجھے معلوم ہے سونے کے کمرے میں کون ہے؟

نصیبن۔ ہوتا کون؟ کوئی بھی نہیں۔

شفیق۔ اچھی طرح سے معلوم ہے؟

نصیبن۔ اگر میرے پیچھے آپ نے کسی کو بلا کر اس میں بند کر دیا ہو تو مجھے کیا معلوم

شفیق۔ تو نے بیگم سجانہ کو اندر آتے نہیں دیکھا؟

نصیبن۔ لو اور سنو! بیگم سجانہ یہاں کہاں سے آئیں۔

شفیق۔ بیگم سجانہ یہاں نہیں آئیں؟

نصیبن۔ نہیں میاں! یہاں تو آدمی کی پرچھائیں بھی نہیں آئی۔

شفیق۔ تو پھر ضرور میرے دماغ میں خرابی ہے۔

نصیبن۔ آپ کو یہاں کسی آدمی کا شبہ ہوا تھا؟

شفیق۔ میں نے یہاں کسی کو دیکھا تھا۔

نصیبن۔ میاں آپ کی آنکھ لگ گئی ہوگی اور آپ کو یہ خیال رہا ہوگا کہ میں جاگ رہا ہوں۔

شفیق۔ ممکن ہے ایسا ہی ہوا ہو۔

نصیبن۔ کبھی کبھی معدے کے بخارات دماغ کو چڑھ جاتے ہیں

شفیق۔ ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔ اچھا میں کل جلاب لوں گا..... میرے سر میں بڑا درد ہو رہا ہے۔

نصیبن۔ میں چاء بناتی ہوں۔ چاء پی لیجئے۔ ذرا طبیعت سنبھلے گی

شفیق۔ میں خود چاء بنا لوں گا تو جا۔

(نصیبن جانے والی ہوتی ہے کہ بیگم سجانہ ساڑھی باندھے داخل ہوتی ہیں)

شفیق۔ نصیبن۔ دیکھتی ہے۔ بتا یہ عورت کون ہے؟

نصیبن۔ مجھے تو کوئی عورت نظر نہیں آ رہی بتاؤں کیسے کہ کون ہے۔

(بیگم سجانہ مسکرا رہی ہیں)

شفیق۔ کوئی عورت نظر نہیں آ رہی؟ اری یہ عورت، یہ کھڑی ہے!

نصیبن۔ میاں پتہ نہیں آپ کو کیا نظر آ گیا ہے۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں

(نصیبن چلی جاتی ہے)

شفیق۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں دیوانہ ہو گیا ہوں۔

بیگم سجانہ۔ دیوانہ آج ہوئے ہو؟ دوسروں کی عزت سے کھیلنا دیوانہ پن نہیں ہے؟

شفیق۔ (کھڑا ہو جاتا ہے) سمجھا! سمجھا!

بیگم سجانہ۔ مسٹر شفیق نہیں۔ آپ ابھی نہیں سمجھے

شفیق۔ بیگم سجانہ مجھے معاف کر دیجئے۔ میں بڑا قصور وار ہوں۔ مجھ سے بڑا بچپن ہوا۔ واقعی میں نے بڑی بے وقوفی کی لیکن میں بہت پشیمان ہوں یقین کیجئے مجھ سے جس قدر ہوگا۔ اس داغ کو مٹانے کی کوشش کروں گا

(بیگم سجانہ مسکرا کر میٹھی میٹھی نظروں سے شفیق کو دیکھ رہی ہیں)

بیگم سجانہ۔ آپ بھی خوب آدمی ہیں کسی شریف عورت کا نام بدنام کرنا آپ کے نزدیک کھیل ہے۔ بچپن! جیسے بچے ہی تو عزت سے کھیلا کرتے ہیں

شفیق۔ آپ مجھے زیادہ شرمندہ نہ کیجئے۔ میں بہت شرمندہ ہوں

بیگم سجانہ۔ واقعی!

شفیق۔ لیکن آپ کو علم کیسے ہوا بیگم سجانہ؟

بیگم سجانہ۔ آپ کو اس سے کیا غرض آپ نے اسے مشہور کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

شفیق۔ آپ میرا اعتبار کریں بیگم سجانہ میرے ذہن میں بھی یہ بات نہ آئی تھی۔ مجھے تو کبھی اس کا گمان بھی نہ ہوا کہ اس ناکام رومان کی کبھی تنی بھی پروا نہ ہوگی کہ آپ کے کانوں تک پہنچ سکے۔ اس غریب کی نحیف آواز.....

بیگم سجانہ۔ رومان؟ با عزت عورت پر عیب لگانا آپ کے نزدیک

رومان ہے؟

شفیق۔ آپ نے بالکل درست فرمایا۔ آپ کی ہر بات درست ہے لیکن پھر بھی۔ ایک بدنصیب کی رومان ہے۔ ایک ناکام دل کی روداد ہیں ایک نامراد تمنا ہوں حقیر و غم زدہ میری زندگی ایک واہمہ ہے۔ اس کے لئے ایک فرضی محبت بھی کافی ہے۔ آپ کے تصور نے اسے روشن کر دیا۔ آپکا تصور میری زندگی پر چھا گیا۔ میری زندگی کے جمود میں حرکت پیدا ہوگئی لیکن یہ حرکت ایسی تھی جیسے کالا دانہ شعلے کی نذر کر دیا جائے اور وہ سوختہ جاں چٹختا پھرے

بیگم سجانہ۔ اچھا تو آپ کالا دانہ ہیں اور وہ بھی چٹختے ہوئے۔

شفیق۔ کوئی مضائقہ نہیں اگر آپ مذاق اڑانا چاہتی ہیں تو شوق سے اڑائیے مذاق آپ جو چاہے کیجئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرے دل میں آپ کی محبت ایک عرصے سے موجزن ہے۔ روز بروز موجیں بلند ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ میری ہستی بھی ان میں غرق ہوگئی۔ آپ سے ملاقات ناممکن تھی میرے تصور میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ کبھی کوئی لمحہ ایسا بھی آئے گا کہ میں آپ کے دامن کو بوسہ دے سکوں۔ ڈرتے ہوئے بھی زبان سے نکال سکوں کہ مجھے آپ سے محبت ہے سائل ہوں بھیک چاہتا ہوں میری راتوں کی نیند مجھے واپس کر دیجئے۔ ممکن ہے خواب ہی میں آپ کا دیدار ہو جایا کرے۔ نہ سہی عالم بیداری میں..... لیکن جب دل نے بہت آہ و زاری کی تو اسے دلاسا دیا کہ آپ کی بارگاہ میں باریابی ناممکن نہیں۔ جو بات اکیلے میں دل سے کہا کرتا تھا آہستہ آہستہ باآواز دوستوں میں بھی کہنے لگا جب میں آپ کا نام لیتا تو دل میں مسرت کی ایک لہر سی دوڑ جاتی یہ تصور ہی میرے لئے جاں فزا تھا کہ مجھے آپ سے (گلا صاف کرکے) محبت ہے میں اپنی محبت کے فرضی قصے گھڑ کر دل خوش کر لیتا تھا۔

بیگم سجانہ (بہت متاثر لہجے میں) بیوقوف

شفیق۔ آپ مجھ سے ناراض نہ ہوں بیگم سجانہ

بیگم سجانہ نہیں مسٹر شفیق آپ بیچارے سے میں کیا ناراض ہوں گی

شفیق۔ میں آپ کی خفگی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔

بیگم سجانہ۔ میں سچ کہتی ہوں..... پتہ نہیں کہ اب کہنا چاہئے بھی یا نہیں..... میں آپ کے احساسات سن کر بہت محظوظ ہوئی۔ اگر کہیں اس سے پہلے ہی مجھے معلوم ہو جاتا تو..... (رک جاتی ہے)

بیگم سجانہ۔ آپ مجھے کس قدر ظالم سمجھتے ہوں گے؟

شفیق۔ آپ کہتے کہتے رک کیوں گئیں۔ آپ کیا کہنا چاہتی تھیں؟

بیگم سجانہ۔ نہیں..... کچھ نہیں شفیق۔ (اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے) اب میں اجازت چاہتی ہوں۔

شفیق۔ (ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے) بیگم.....

بیگم سجانہ۔ بہت دیر ہوگئی ہے شفیق۔ مجھے اس وقت جانے دو۔ اچھا رخصت!

(بیگم سجانہ جانے کو مڑتی ہیں شفیق ساکت کھڑا بیگم سجانہ کو دیکھ رہا ہے)

بیگم سجانہ۔ تو کیا آپ مجھے دروازے تک پہنچانے بھی نہیں آئیں گے ایسے خفا ہیں!

شفیق۔ (جلدی سے) نہیں میں خفا نہیں ہوں۔

(بیگم سجانہ اور شفیق جاتے ہیں بیگم سجانہ کے ہنسنے کی آواز آتی ہے شفیق ان کو رخصت کر کے واپس آتا ہے۔ کھڑکی کے کنارے پر بیٹھ کر تصویر دل کو دیکھتا ہے.. نصیبن آتی ہے)

شفیق۔ تم نے دیکھا نصیبن کس قدر خوبصورت ہیں معلوم ہوتا ہے۔ قدرت نے خود اپنے ہاتھوں سے انہیں بنایا ہے حسن کی تکمیل ہیں۔

نصیبن نہیں میاں میں نے تو کسی کو نہیں دیکھا۔ ہاں کانوں میں پائلوں کی

بھنک سی تو آئی تھی بہتیرا گھور گھور کر دیکھا۔ مجھے تو کچھ نظر آیا نہیں۔

شفیق۔ کیا کہا تم نے ؟ تم نے بیگم سجانہ کو نہیں دیکھا ؟

نصیبن۔ نہیں میاں۔

شفیق۔ اس کمرے میں انھیں آتے نہیں دیکھا بیگم سجانہ مجھ سے باتیں کرتی نظر نہیں آئیں ؟

نصیبن۔ میاں یہاں تو کوئی نہیں آیا آپ میری بات مانئے تو آپ کے تو دل میں خیال بیٹھ گیا ہے۔

شفیق۔ کیا کوئی نہیں آیا یہاں ؟ (ٹھنڈا سانس لے کر) اچھا ! کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے ؟ ..... کیا پتہ

نصیبن۔ کوئی آرہا ہے (پاؤں کی آہٹ)

شفیق۔ دیکھو تو سہی کون آرہا ہے کہیں بیگم سجانہ دوبارہ نہ آرہی ہوں

نصیبن۔ آپ کے سر پر تو بیگم سجانہ ہی سوار رہتی ہیں۔ یہاں تو مقتدر مرزا آرہے ہیں۔

مقتدر مرزا۔ (کمرے میں آتا ہے) کہو بھئی شفیق کیسی گزری ؟ سلام بوا نصیبن۔

نصیبن۔ سلام میاں۔ خدا تمھیں بڑی عمر دے۔

مقتدر مرزا۔ اس طرح منہ بنائے کیوں بیٹھے ہو۔ استاد اس دفعہ تم پکڑے گئے۔ مجھے تو یقین ہی نہ آتا تھا کہ بیگم سجانہ جیسی حسین اور مشہور عورت سے تمھاری ملاقات ہو سکتی ہے لیکن آج تم کتنا ہی منہ بنا کر بیٹھو کتنا ہی نہیں نہیں کرو میں تمھاری بات نہیں مانوں گا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے بیگم سجانہ کو یہاں سے جاتے ہوئے دیکھا ہے۔

نصیبن۔ آپ نے دیکھا !

مقتدر مرزا۔ مجھ سے تو صبر بھی نہیں ہوا۔ جلدی سے چکن ٹال بھاگا (ہاتھ بڑھاتا ہے) مبارک ہوں تمھیں تمھاری بیگم سجانہ

شفیق۔ (ہاتھ پر غصہ سے ہاتھ مارتا ہے) تمھاری عقل تو درست ہے ؟ کس بیگم سجانہ کو کہہ رہے ہو میں کسی بیگم کو نہیں جانتا۔ یہاں کوئی نہیں آیا۔ اور اگر اب دوبارہ تمھاری زبان پر ان بیگم کا نام آیا تو زبان کھینچ لوں گا۔

مقتدر مرزا۔ (حیران) انھیں ہو کیا گیا ؟ یہ کہتے ہیں کہ میں جانتا نہیں اور میں نے خود انھیں یہاں سے جاتے دیکھا ہے ہلکی بادامی ساڑھی تھی اور اس پر چمکیلا سا سنہری فیتہ۔ اور پر نہایت خوب صورت سلا ہوا کوٹ .... بھورے رنگ کا بہت خوش معلوم ہوتی تھیں۔ اب میں اپنی آنکھوں کا اعتبار کروں یا ان کی بات کا۔

نصیبن۔ شفیق میاں کچھ ایسی ہی طبیعت کے ہیں کسی عورت کی عزت پر تہمت کی سہار نہیں ہے۔ ان سے ایسا مذاق نہ کیجیے۔

مقتدر مرزا۔ (تصویریں دیکھتے ہوئے) ہاں۔ اگر میرے بھی ان جیسے نصیب ہوتے تو مجھے بھی سہار نہ ہوتی۔

(شفیق تصویریں اٹھا کر غصے کے ساتھ دراز میں بند کر دیتا ہے)

(پردہ)

ناصرالدین شمسی

ا

موضوع کی تلاش

یہ پھول، یہ کلیاں، یہ سبزہ، کچھ دور، یہ شاما کے نغمے
یہ چاند، یہ تارے، یہ بادل، کچھ دور، یہ زہرا کے نغمے
یہ جھیل، یہ چشمہ، یہ وادی، کچھ دور، یہ دریا کے نغمے
ایسے میں جو "منظرِ فطرت" پر اک نظم لکھوں تو کیسی ہو؟
یہ آم، یہ جامن، یہ بارش کھیتوں میں کسانوں کے نغمے
بالوں کی گھنی محفل سے پرے یہ نازک دھانوں کے نغمے
کچھ دور، ندی کے پورب میں خاموش مکانوں کے نغمے
ــــــ اور ایسے میں "منظرِ فطرت" پر اک نظم لکھوں تو کیسی ہو؟!

یہ چاندنی، یہ سیمیں لمحے، کچھ دور، فضا میں نغمہ سا
یہ وقت، یہ چھت، یہ تنہائی۔ جیسے کہ ہوں میں کھویا کھویا
یہ میز پہ شیلے کی نظمیں اور دھیان میں "کالج کی زہرا"
ایسے میں جو "حسن و محبت" پر اک نظم لکھوں تو کیسی ہو؟

مٹّی کے یہ گھر، یہ آبادی ، یہ سرد مسرّت کی دنیا
کچھ دور منگیتر کا میری۔ چکّی پہ محبّت کا نغمہ
اور میں کہ صدا سے چکّی کی کچھ گھبرایا، کچھ بے پروا
—— اور ایسے میں حسن و محبّت پر اک نظم لکھوں تو کیسی ہو؟

یہ مہمانداری کی گھڑیاں ، یہ "تاج محل" کا کاشانہ
یہ میز، یہ کرسی ، یہ بجلی ، یہ موپاساں کا افسانہ
دنیا کے نمایاں حصّے میں، دنیا والوں سے بیگانہ
ایسے میں جو "اپنی حالت" پر اک نظم لکھوں تو کیسی ہو؟
یہ میرے محلّے کی گلیاں ، قصبے کی یہ مبہم رعنائی
یہ شمع ، یہ تخت ، یہ جاڑے میں سب گھر والوں کی یکجائی
کچھ دور انگیٹھی سے ، میرا یہ سوچ ، یہ پھیکی انگڑائی
اور ایسے میں "اپنی حالت" پر اک نظم لکھوں تو کیسی ہو؟!

سلام مچھلی شہری

یادِ رفتگاں

دنیا فانی و گزشتنی ہے مبارک ہیں وہ لوگ جن کا چرچا رہ جائے۔ ورنہ بیشتر واقعات فراموش ہو جایا کرتے ہیں کسی اور کی کیا کہوں میں نے ہی جو کچھ دیکھا سنا تھا بہت سا بھول بسر گیا، اور جتنا حافظہ میں رہ گیا ہے، وہ بھی کیونکر گزارش کروں کہ تمام سامعین پر یکساں اثر انداز ہو۔

تاہم چند واقعات نشر کرتا ہوں محترم سامعین نتائج خود اخذ فرمالیں!

(۱)

سردار مائیکل فیلوز صاحب، عالیجاہ مہاراجہ مہدجی صاحب سیندھیا کے ایک اولوالعزم جرنیل جون بپٹیس کے خاندان میں تھے ہمارے سرگباشی مہاراجہ حضور علیؒ سر مادھو راؤ صاحب سیندھیا نے انہیں "بڑے بوا" کے سوائے کسی لفظ سے کبھی مخاطب نہیں کیا، اور یہ وہ لفظ ہے جس سے مرہٹہ اپنے بڑے بوڑھوں کو مخاطب کیا کرتے ہیں۔

مہاراجہ صاحب موصوف کے دل میں سردار صاحب کی ایسی منزلت تھی کہ جب کبھی آپ ریاست سے باہر تشریف لے جاتے تو راج گھرانے کی نگرانی بزرگ خاندان کے طور پر "بڑے بوا" یعنی سردار مائیکل فیلوز صاحب کو چھوڑ جاتے تھے۔

سردار صاحب سرکار دربار ہی نہیں بلکہ اپنی نیک دلی اور خوش خلقی کے باعث ریاست کے عوام و خواص میں بھی بیحد مقبول تھے۔ چنانچہ آپ کی شیریں منصف مزاجی کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔

جس وقت گوالیار کے راج گھرانے کا سکونتی محل "جے بلاس" سردار صاحب کی نگرانی میں تعمیر ہو چکا تو سرکار کو بہت پسند خاطر ہوا۔ لہذا جیواجی مہاراج کیلاش باشی نے خوشنود ہو کر ایک لاکھ روپیہ کی گراں بہا رقم صاحب موصوف کو عطا فرمائی۔

سردار صاحب ہدیۂ تشکر پیش کر کے عرض پرداز ہوئے:۔

عالی جاہا! مجھ ناچیز کے لئے یہی امر باعث صد افتخار ہے کہ میری خدمات بندگانِ عالی میں بارور ہوئیں، باقی رہا محل تو ان ہاتھوں نے ایک اینٹ تک نہیں چنی۔ بیچارے مصیبتوں کے مارے بھوکے ٹوٹے مزدوروں نے تپتی جلتی زمین تیز دھوپ اور گرم لوؤں میں نہایت عرق ریزی و جانفشانی سے پتھر ڈھو ڈھو کر محل تیار کیا ہے۔ دراصل یہ غریب ہی اس انعام کے مستحق ہیں۔۔۔۔۔۔!!

دیدنی تھا وہ نظارہ، جب اس دریا دل مسٹر مائیکل فیلوز نے کھڑے کھڑے غریب مزدوروں پر روپیہ کی بارش کر دی اور دعاؤں کے ہجوم میں خالی ہاتھ پلٹنے لگا۔

(باجازت آل انڈیا ریڈیو۔ دہلی)

(۲)

ان ہی سردار صاحب کے چھوٹے بھائی "بنّا صاحب" ایک شجاع و فاتح سپہدار تھے۔ ان کا شباب خوں ریز معرکوں میں گزرا تھا میں نے ان کا بڑھاپا دیکھا ہے آہ! اب ایسے گل مچھوں والے سبک جسم کے سجیلے انسان کہاں ....

فوجیوں میں بالعموم اکھڑپن ذرا زیادہ ہوا کرتا ہے سو بیشک بنّا صاحب کے مردانہ تیور اور رعب داب چہرے سے دلیری تو ضرور ٹپکتی تھی لیکن ویسے آپ واقع ہوئے تھے بڑے رنگین مزاج۔ آپ کو موسیقی اور شاعری سے بیحد لگاؤ تھا چھوٹا سا ہونے کی وجہ سے مجھے ان کی پُرلطف مجالس کی شرکت کا موقع نہیں ملا۔ البتہ بارہا ان کی سواری نکلتے دیکھی ہے اور بزرگوں کی زبانی کلام سنتا رہا ہوں غالباً آپ عاصی تخلص کرتے تھے۔ اور سب کچھ تو فراموش ہو چکا حضرت عاصی کا صرف ایک مطلع ابھی تک یاد ہے۔ فرماتے ہیں ؎

محبّت کی ہوئی جب رُو بکاری
کھلیں زُلفیں، بندھیں مشکیں ہماری

اس ایک ہی مطلع سے صاحب موصوف کی طبیعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ واللہ اعلم انھوں نے کیا کچھ نہ فرمایا ہو گا۔ اور نہ معلوم اب وہ ان کے خاندان میں محفوظ بھی ہے یا نہیں

سردار صاحب کی ڈیوڑھی پر اکثر رقص و سرود کی محفلیں برپا ہتی تھیں۔ اور معرکۃ الآرا مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے۔

ایک روز آپ کچھ خاموش خاموش سے رہ کر لگے خود بخود جھومنے مصاحبوں نے دریافت کیا:۔

جی حضور! کیا بات ہے؟

فرمایا۔ بھئی! ایک مصرع ہوا مصرع!!

جی حضور! مصرع .... خوب، تو ذرا زحمت فرمائیے!!

بولے مصرع ہے ؎

وصل بھی تیرا کبھی اے جانِ جاں ہو جائے گا؟

اے سبحان اللہ، کیا مصرع ہے .....

اہاہاہا .... اہاہاہا .... حضور کمال کر دیا .... واہ

سبحان اللہ، کیا تیور ہیں ......!

واللہ اسے کہتے ہیں مصرع۔ ع

وصل بھی تیرا کبھی اے جانِ جاں ہو جائے گا؟

خوب! خوب!!

سردار صاحب نے حکم دیا:۔

ہاں! وہ جمعدار! لو ذرا ہمارا صندوقچہ تو اٹھا دو!!!

حاضر الوقت چوب دار نے صندوقچہ حاضر کیا۔ سردار صاحب نے کھول صندوقچہ۔ ایک رومال میں اشرفیاں باندھ۔ وسطِ نشست کی چھوٹی سی میز، پہ رکھوا کر فرمایا:۔

لو بھئی! جو صاحب اس مصرع پر سب سے اچھا مصرع لگائیں، یہ رومال اُن کا!!

اب لیجیے جناب! ہر شخص ایک اُدھیڑ بن میں پڑ گیا۔ لگے مصاحبین قلا بازیاں کھانے، اندر ہی اندر جوڑ توڑ لگانے۔ اِدھر لالچ۔ اُدھر عزت آبرو کا دھڑکا۔ یہ کہے میں ور رہوں، وہ سوچے میرا بول بالا ہو۔

فرشی محلس تھی، ان ہی صاحبان میں سے کسی مصاحب کا ایک شاگرد لڑکا بھی موجود تھا، مؤدب اِستادہ ہو کر لگا گزارش کرنے:۔

جی حضور! کیا مجھے بھی گرہ لگانے کی اجازت ہے؟

ہاں! ہاں!! کیوں نہیں، لگاؤ اگر لگا سکتے ہو!!!

لڑکا بولا:۔

جی حضور! پھر میں اشرفیاں لے لوں؟

ضرور، مگر ہو مصرع، لے لینا!

لڑکا اینڈ کر اُٹھا، اٹھلاتا ہوا میز کے اُس طرف پہنچا۔ اور کہنے لگا:۔

جی حضور! مرحمت ہو مصرع!!

ارشاد ہوا ؎

وصل بھی تیرا کبھی اے جانِ جاں ہو جائے گا؟

مصاحبوں نے مصرع اُٹھایا ؎

وصل بھی تیرا کبھی اے جانِ جاں ہو جائے گا؟

تکرار ختم ہوتے ہی لڑکا کچھ عجب انداز سے کسی قدر ترچھا ہوا، اور ذرا گردن خمیدہ کر کے پتیلیاں گھما کر کہتا کیا ہے ؎

پھیر کر منہ، ہنس کے فرمایا، کہ "ہاں ہو جائے گا"!

پھر فوراً رومال بغل میں مار لگا دونوں دونوں ہاتھوں سے چوم رُخے سلام کرنے۔

آداب عرض.... ذرّہ نوازی.... غریب پروری.... حوصلہ افزائی سرکار کی....!

تحسین و آفریں کی دھوم دھام میں سردار صاحب کی آواز گونجی:۔

اُف! اُف!!..... رکھو رومال وہیں..... بیٹھ جا اپنی جگہ آ کر!!!

لڑکے کی صورت اُتر گئی، رنگ اُڑ گیا . . . . کہ ہائے قسمت نے پلٹا نہ کھایا . . . . مگر چارہ بھی کیا تھا، بے بسی نے مری چپال اپنی جگہ آبیٹھا۔

سردار صاحب نے جھوم کر حکم دیا ۔

ہاں! پھر کہہ اسی طرح . . . . ہاں !!

جی حضور! کیا مجھے بھی گرہ لگانے کی اجازت ہے ؟

ہاں! ہاں !! کیوں نہیں ، لگاؤ اگر لگا سکتے ہو !!!

لڑکا بولا :-

جی حضور! پھر میں اشرفیاں لے لوں ؟

ضرور، مگر پہلے مصرع۔ لے لینا!

لڑکا اینڈ کر اٹھا۔ اٹھلاتا ہوا میز کے اُس طرف پہنچا۔ اور کہنے لگا :-

جی حضور! مرحمت ہو مصرع !!

ارشاد ہوا ع

وصل بھی تیرا کبھی اے جانِ جاں ہو جائے گا ؟

بدستور سابق مصاحبوں نے مصرع اُٹھایا ع

وصل بھی تیرا کبھی اے جانِ جاں ہو جائے گا ؟

لڑکے نے اُسی ادا سے تڑپ کر جواب دیا ع

پھیر کر منہ ، ہنس کے فرمایا ، کہ " ہاں ہو جائے گا " !

اور جلدی سے بغل میں رومال مار، سلام کرتا ہوا چلنے لگا۔

نہیں نہیں رکھ۔ رومال بیٹھ اپنی جگہ . . . . اور کہہ اُسی طرح ، سردار صاحب نے بے چین ہو کر حکم دیا۔

غرض اس پُر کیف ڈرامے کا " ونس مور " تا دیر اسی شد و مد سے جاری رہا، جس کے ایک کردار خود بدولت سردار صاحب تھے۔ جب اچھی طرح جی سیر ہو گیا تو اُن اشرفیوں کے علاوہ ماہانہ وظیفے سے بھی اس لڑکے کی حوصلہ افزائی کی گئی۔

(۳)

ایک بڈھا اگرچہ المعروف بہ " دادا صاحب " موضع سرسودہ کی چوپال پر بیٹھا رستی بٹا کرتا تھا۔ قد میں مجھ سے ذرا کم، چھریرا بدن، سفید براق بال، آنکھیں مشعل کی مانند روشن، بتیسی نہایت خوش نما، صاف اور مضبوط، چہرہ شگفتہ، پھرتی میں آج کل کے نوجوانوں سے دس قدم آگے۔ میں نے

اس شخص کو ہر وقت بالکل ہشاش بشاش پایا۔ خیال فرمائیے گھٹتی کے پہرے راؤ صاحب کی صحت ایسی قابلِ رشک تھی تو بھلا جوانی میں کیا چیز ہوں گے۔

ایک دفعہ جب وہ کرتہ اتارے رسّی بٹ رہے تھے مجھ کو اُن کی پیٹھ میں بوری کی سیون کا سا اُبھرا ہوا ایک نشان نظر آیا جو سیدھے کھوے کے سرے سے شروع ہو کر بائیں جانب دھوتی میں غائب ہو گیا تھا۔

چند مہینہ قیام میں بے تکلفی ہو جانے کی وجہ سے میں نے پوچھا :۔

راؤ صاحب! معاف کیجئے گا، یہ نشان کیسا ہے؟

بولے۔ جوانی میں ہم ڈاکہ مارا کرتے تھے کسی خدا کے پوسے نے پیچھے سے تلوار کا ایک ہاتھ جڑ دیا تھا سو ذرا مسئلی سے سی دئے گئے تھے، اُس کا نشان ہے :

(۴)

شہر گوالیار کے وسط میں ایک بزرگ کی خانقاہ ہے۔ جسے "باباکپور کی درگاہ" کہتے ہیں۔ اس درگاہ میں اگلے زمانے سے نوبت نقّارہ اور کچّی گھنٹہ چلا آتا ہے۔ نقارچی اور گھنٹہ پانڈے مقررہ وقتوں اور خاص موقعوں پر اپنے فرائض انجام دینے پر مامور ہیں۔

موجودہ مہاراجہ صاحب کے جدِّ امجد سرکار شی جیواجی راؤ صاحب کے عہد تک دستور تھا کہ جب کبھی باباکپور کے رشغل یا کسی اور وجہ سے مہاراج سواری اس طرف سے گزرتی تو بیوقت بھی باباکپور کی نوبت بجا کرتی تھی۔

اس زمانے میں واصل خاں بانکے نہایت آن بان سے ہتھیار، دتیا سجائے، کمر کسے۔ چھوٹے بازار کی ایک دکان پڑے رہتے تھے۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ دوسرے بانکوں کے خلاف واصل خاں صاحب ظالم و جابر ہونے کے بجائے نہایت وضع دار، صادق القول اور بیحد خلیق واقع ہوئے تھے۔

ایک روز یکایک سوار، پیادے نمودار ہوئے اور نقیب کی للکار سنائی دی :۔

نذر دولت، غریب پرور حضور معلّیٰ عالیجاہ بہادر مہاراجہ صاحب سیندھیا سلامت!

ہائیں! واصل خاں صاحب کے کان کھڑے ہوئے۔ پوچھنے لگے بھئی یہ کیا ہے۔

کسی نے جواب دیا :۔

شاید مہاراج سواری آرہی ہے!

بولے۔ ارے! مہاراج سواری آرہی ہے، اور نوبت نہ جھڑی باباکپور کی ..... وہ شخص کہنے لگا :۔

جی ہاں! تعجب تو مجھے بھی ہے۔ سرکاری سواری آنے پر ہمیشہ نوبت جھڑا کرتی تھی۔ میں تو جانوں آج نقارچی وغیرہ کہیں چلے گئے ہوں گے!!

خوب! کہیں چلے گئے ہوں گے، میاں وہ تو آٹھوں پہر باری باری وہیں حاضر رہتے ہیں، بھلا جائیں گے کہاں، نہ یہ کچھ اور ہی بات ہے ....

اتنے میں ہجوم قریب آگیا۔ اور عین کان پر نقیب للکارا :۔

نذر دولت غریب پرور حضور معلّیٰ عالی جاہ بہادر مہاراجہ صاحب سیندھیا سلامت!

بس اب تو بانکے کو تاب نہ رہی۔ خنجر کھینچ کر بولا:۔

ہائے یہ زمانہ آگیا کہ حضور معلیٰ کی سواری گزرے اور باباکپور کی نوبت نہ جھڑے، آہ!!

اب جینے کا مزا نہیں، لعنت ہے ایسی زندگی پر اور غپ سے سینہ میں خنجر گھونپ لیا۔

ادھر خاں صاحب تیورا کر گرے۔ اُدھر سواری بالکل نزدیک آپہنچی۔ لوگ بانگ زخمی کو گھیرے کھڑے تھے۔ مہاراجہ صاحب نے دریافت فرمایا:۔

کیوں کیا معاملہ ہے؟

جواب ملا:۔

عالیجاہا! یہ واصل خاں بانکے ہیں۔ خلاف دستور آج سواری کے خیر مقدم میں باباکپور کی نوبت نہ جھڑنے پر انھوں نے کہا:۔

ہائے یہ زمانہ آگیا کہ حضور معلیٰ کی سواری گزرے اور باباکپور کی نوبت نہ جھڑے، آہ! . . . . اب جینے کا مزہ نہیں لعنت ہے ایسی زندگی پر۔ اور ایک دم سینے میں خنجر اتار لیا۔ اب ان کا دم نکل رہا ہے۔ اور لوگ تماشا دیکھ رہے ہیں . . . . . .

افسوس! مہاراجہ صاحب نے فرمایا . . . . . . زخمی پر حسرت بھری نگاہ ڈالی . . . . چندے خاموش رہے، پھر حکم دیا:۔

اچھا جہاں تک ہو ان کی اچھی طرح صاحب سنبھال کی جائے۔ دو سوار جاکر ڈاکٹر صاحب کو لائیں۔ نہ جانے بیچارے نے کیا خیال کیا۔ بچ جائے تو ہم کو بہت خوشی ہو!!

اور ایک سراسیمگی کے عالم میں حضور معلیٰ نو محلے کی راہ گورکھی[۱] کو روانہ ہو گئے۔ محلات میں پہنچتے ہی دوسرے ڈاکٹر صاحب کو طلب کرکے فرمایا:۔

فوراً گوالیار جائیے! ایک بانکے نے چھوٹے بازار میں خنجر گھونپ لیا ہے۔ نہایت غور سے اس کا معالجہ کیجئے!!

جب تک ڈاکٹر صاحب آئیں آئیں واصل خاں بانکے ٹھنڈے ہو چکے تھے۔

(۵)

ایک صاحب تھے حکیم نذیرالدین صاحب امروہی حکیم وکیم کاہے کے یونہی تھے۔ سونٹھ، سونف، چورن، پھنکی وغیرہ کے عطائی۔ بیچارے علاقہ "مینج محل" اور ریاست دتیا کے دو چار گاؤں میں دورہ کیا کرتے تھے۔ اِدھر اُدھر کے دیہاتوں سے کچھ تھوڑا بہت وصول کر لیتے تو کبھی گوالیار کبھی دتیا بھی ہو آتے تھے۔ جس گاؤں میں حکیم صاحب تشریف لے جاتے لوگ باگ دال دلیے سے تواضع کرتے بلکہ حیثیت بموجب کچھ نذرانہ درزانہ پیش کرنے میں بھی عذر نہ تھا۔ گزشتہ جنگ عظیم کے آخر میں جو تباہ کن انفلوانزا پھیلا اور مری پڑی، تو ہمارے حکیم نذیرالدین صاحب کی فیس معائنہ چار آنے سے لے کر آٹھ آنے تک مقرر ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس سلسلے میں صاحب موصوف کے ہاتھوں کوئی پانچ چھ ایک درجن انسانوں کو اس دکھ بھری دنیا کے مخمصوں سے نجات حاصل ہوئی۔ وہ ایک ہی خوراک میں ٹھنڈے ٹھنڈے سدھار گئے۔

دیرینہ نیازمندی اور وقتاً فوقتاً مختلف مقامات پر نشست و برخواست کی بنا پر بلاخوف تردید عرض کر سکتا ہوں کہ واللہ حکیم صاحب تھے طرفہ

---

[۱] شہر لشکر کے وسط مقام "بارہ" کے محلات جہاں اس زمانے میں راج گھرانا قیم تھا۔

معجون، یہ اور بات ہے کہ آپ کو طب سے کوئی واسطہ نہ ہو مگر حضرت کی نیک دلی، زہد، لال بجھکڑ قسم کی سادہ لوحی اور اوٹ پٹانگ باتوں پر دیہاتی ضرور لٹو تھے۔

جب آپ چلتے پھرتے اس نواح میں وارد ہوئے اور علاقے کا دورہ کرنے لگے تو کہیں ریاست دتیا کے ایک جاگیری گاؤں "بڑون" کی طرف بھی جا نکلے، ایک کائستھ لالہ جگن ناتھ صاحب سے ملاقات ہوگئی اور چند پھیروں میں کچھ ایسا رابطہ بڑھا۔ وہ میزاں پٹی کہ باید و شاید۔ وہ کائستھ صاحب اکثر اپنے فرزند جانکی پرشاد سے کہا کرتے تھے :-

دیکھو بیٹا! میرا پیچھا ہو جائے تو حکیم جی کو اپنا بڑا بوڑھا سمجھیو!!

خدا کا کرنا۔ ان لالہ جگناتھ صاحب کا ہو گیا انتقال، اب بقول تلسی داس ؎

تلسی بانہہ سپوت کی جو سپنے گہہ جائے — آپ نبھا دے، اوروں لڑکن سوں کہہ جائے

اے تلسی اگر کسی شریف زادے سے خواب میں بھی مصافحہ ہو جائے، تو وہ خود آخر تک نبا ہے اور بال بچوں کو بھی نباہ کی وصیت کر دے۔

سعادت مندی برخوردار جانکی پرشاد کی، اس نے اپنے والد آنجہانی کی وصیت پر حرف بحرف عمل کیا۔ حکیم صاحب کو اپنا بزرگ ہی گردانا اور ان کا بھی کہیں اور ٹھور ٹھکانا کہاں تھا۔ اسی گھر کے ہو رہے۔ مذہبی اختلافات چھوت چھات کی پابندی کے باوجود باہم کچھ ایسی یگانگت ہوئی کہ حکیم صاحب کوئی غیر نہیں اسی خاندان کے ایک فرد معلوم ہوتے تھے۔

آخر بیچارے کا انحطاط شروع ہوا، سرد و گرم عالم سے گزرتے۔ حوادث زمانہ کے تھپیڑے کھاتے گھاٹ کنارے آ گئے۔ ہاتھ پیر میں سکت نہ رہی۔ نوبت بہ نوبت تمام طاقتیں سلب ہوتی گئیں۔ اکثر علیل رہا کرتے تھے ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۷ء میں بارہا ان سے ملاقات ہوئی۔ حکیم صاحب میں پہلا سا دم خم نہ تھا۔ قصہ مختصر چند روز صاحب فراش رہ کر راہیٔ عدم ہوئے۔

بڑون کے اِنے گنے مسلمان اسلام کے معمولی مسائل سے نابلد ہیں انھیں کچھ معلومات نہیں بس نام کے ہی مسلمان ہیں پھر بھلا ایک کائستھ غریب کیا جانے۔ ان لوگوں کی کس طرح تجہیز و تکفین ہوتی ہے۔ واللہ اعلم کیوں کر اس نے حکیم صاحب کے گورگڑھے سے سبکدوشی حاصل کی۔

اب فاتحہ نہ درود رسوم نہ چہلم کرے تو کیا کرے لیکن والد آنجہانی کی وصیت کانوں میں گونج رہی تھی :-

دیکھو بیٹا! میرا پیچھا ہو جائے تو حکیم صاحب کو اپنا بڑا بوڑھا سمجھیو!

نباہ ضروری تھا لہذا جانکی پرشاد نے ہندو رسم اور اپنے عقیدے کے مطابق تیرھویں دن ہندو مسلمان جمع کر کے پکی رسوئی کی۔ بھلے آدمیوں کو خوب ڈٹ ڈٹ کر تر مال کھلایا اور حکیم صاحب کی روح کو شانتی پہنچانے کے خیال سے براہمن بھوجن کرا دیئے ......

میرزا فہیم چغتائی

خاموش محبّت

یہ بنگال کی ایک گمنام شاعرہ سربالا دیوی کی نظم کا منظوم ترجمہ ہے :-

سینے میں ہے رقصاں درد سا کیوں
یہ دل ہے مرا کیوں محوِ جنوں ؟
اظہارِ تمنّا کر نہ سکوں
جو دل میں ہے پنہاں کیسے کہوں ؟
امید ہے باعثِ ناکامی
انسان ہے حاصلِ مجبوری !
قسمت کا لکھا ہوتا ہے سدا
کیونکر نہ ہو وہ چاہے جو خدا
آجائے جو تابِ گویائی
جذبات میں بھر دوں دل کی لگی
لیکن یہ کبھی ہونے کا نہیں
ناچار کا کوئی چارا نہیں
بے آب ہیں آنکھیں مدّت سے
محروم ہوں اشک کی صورت سے
آنکھوں کی تنگ ظرفی تُف ہے
دریاؤں کی یہ خشکی تُف ہے
اُف ایسے زمانِ مصیبت میں
اُف ایسے دَورِ اذیّت میں

یہ موت بھی کام نہیں دیتی
آنے کا نام نہیں لیتی

امید کی کشتی ڈوب گئی
اظہار کی طاقت سلب ہوئی
یہ کس کی نظر نے لوٹ لیا
یہ کس نے مجھے ناکام کیا
لیکن یہ آہ و بکا کیسی ؟
ہے اس سے تو عشق کی رسوائی

ایسا نہ ہو بھڑکے دل کی لگی
بہتر ہے شعارِ خاموشی

مترجمہ جگر قریشی لدھیانوی

سیاسی اصطلاحات

۱- AMNESTY ایمنسٹی۔ یہ لفظ دراصل جرمن زبان کے لفظ A-MANESTOS امینسٹوس سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں بھلا دینا۔ لہٰذا سیاسی اصطلاح میں حکومت کے اس فعل کو کہا جاتا ہے کہ سیاسی قیدیوں کی عام معافی کا اعلان کر دیا جائے اور اسے مجرموں کے قتل یا ان کو سزا دینے سے باز رکھا جائے۔

۲- AUTOCRACY یہ لفظ بھی جرمن اصل سے تعلق رکھتا ہے جو دو مفرد الفاظ اوتوس AUTOS بمعنی ذاتی اور کراتوس KRATOS بمعنی قوت سے مرکب ہے۔ انگریزی میں اس کا دوسرا نام DESPOTISM بھی ہے۔ اس لفظ کے اصطلاحی معنی بھی وہی ہیں جو لغوی ہیں یعنی یہ کہ ایک ایسا طریقہ حکومت جس میں بادشاہ بالکل خود مختار ہو۔ اور اس کی سیاسی قوت غیر محدود ہو۔ مختصر یہ کہ اس کے کسی حکم کی مخالفت یا اس پر کسی قسم کا اعتراض نہ ہو سکے۔ اس حکومت کی بہترین مثال ایران اور افغانستان ہو سکتی ہے۔

۳- BICAMERAL SYSTEM بائی کیمیرل سسٹم۔ اس طریقہ حکومت کو کہتے ہیں جو دو ایوانوں پر مشتمل ہو۔ اس طریقہ حکومت میں قانون سازی اور اس کے نفاذ کے احکام جاری کرنے کے لیے دونوں ایوانوں کا متفق ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس حکومت کی مثال انگلستان ہے۔ جہاں دو ایوان یعنی ایوان عام یا دارالعوام اور ایوان خاص یا دارالامراء موجود ہیں۔

۴- BLOC- بلوک اس کی اصل فرانسیسی ہے جس کے معنی ایک جماعت یا مجمع کے ہیں۔ اصطلاح میں قانون ساز جماعت کے ارکان یا مختلف جماعتوں کے ایسے سیاسی نمایندوں کے گروہ کو کہا جاتا ہے جو کسی خاص مسلک یا کسی وزارت کی تائید کرتا ہو۔

۵- BOLSHEVISM- بولشیوزم ہر شخص جانتا ہے کہ یہ لفظ ٹھیٹ روسی زبان کا ہے۔ یہ اصطلاح اس اصول کی وضاحت کرتی ہے کہ مالدار اور غریب طبقے میں فطری طور پر دشمنی کی خلیج حائل ہے۔ اور اس امر پر زور دیتی ہے کہ ان تمام جماعتوں کے خاتمے کے لئے آپس میں جنگ ضروری ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر سب مل کر ایک جماعت ہو جائیں۔ یہی وہ جماعت ہوگی جو آگے چل کر قوم کی فلاح و بہبود کے لئے اشتراکی اصولوں پر حکومت کرے گی۔

۶- BOLSHEVIK- بولشیوک۔ روس کی انتہا پسند اشتراکی جماعت کے رکن کو اس نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہی وہ جماعت ہے جس نے ۱۹۱۷ء میں علم بغاوت بلند کیا اور اپنی غیر معمولی قوت کے بل پر شاہی خاندان کو قتل کر دیا۔ اسی بغاوت کے بعد روس میں ایک نئے طریقے کی حکومت قائم ہوئی۔ جو دنیا میں اپنی طرز کی ایک ہی حکومت ہے۔ اس طریقہ حکومت میں عام مساوات کے خیال کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اور امیر و غریب کے سوال کو یکسر مٹا دیا گیا ہے۔

۷- BUREAUCRACY بیوروکریسی ایک ایسی حکومت جو وسیع پیمانے پر مختلف محکموں پر مشتمل ہو۔ گو بظاہر یہ طریقہ کار آسان معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں

عملی دشواریاں بہت زیادہ پیدا ہوتی ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اصول بے ڈھنگے پن میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ اس طریقہ حکومت کی بہت زیادہ قابل اعتراض خرابیاں اس کی سختی کٹر پن اور ناقص طریقہ کار ہے۔ اس قسم کی حکومت میں بھلائی کا پہلو بہت کم دکھائی دیتا ہے۔

۸- کاکس CAUCUS کسی سیاسی جماعت یا ادارے کے ارکان کی طرف سے ایک ایسے جلسے یا کانفرنس کا مقرر کیا جانا کو کسی سیاسی مہم یا کسی اور سیاسی مقابلہ کے سلسلے میں امیدوار کے انتخاب پر غور و فکر کرنے کے لئے بنائی گئی ہو۔

۹- CIVIL DISOBEDIENCE سول ڈس اوبی ڈینس یا سول نافرمانی بغیر غیظ و غضب یا بلا تشدد کے حکومت کے ساتھ اشتراک عمل کرنے یا اس کے احکام کی تعمیل سے انکار کرنا ہندستان کا ہر شخص سابقہ بیس سالہ دور میں اس تحریک سے خوب واقف ہوچکا ہے۔

۱۰- COMMINTERN کمن ٹرن۔ یہ لفظ دو انگریزی الفاظ کمیونسٹ اور انٹرنیشنل کا مخفف مرکب ہے جس کے معنی قومی اشتراکیت کے ہیں۔ اور یہ تمام دنیا کی اشتراکی تحریک پر حاوی ہے۔ اس ادارہ کا صدر مرکز شہر ماسکو واقع ملک روس ہے۔

۱۱- CONTRABAND کونٹرے بینڈ۔ اس لفظ کے لغوی معنی خلاف قانون یا ممنوع کے ہیں لیکن سیاسی اصطلاح میں ایسے فعل کو کہا جاتا ہے کہ ابتدا میں ایک غیر جانب دار ملک سے کسی برسر پیکار ملک کو فوجی اور بحری استعمال کے لئے اشیاء۔ ساز و سامان یا اسلحہ جات روانہ کئے جائیں اور مسلمہ جنگی قانون کے تحت ایسی چیزوں کو دشمن کے ملک میں یا بین قومی سمندروں میں روک لیا جائے۔ لہٰذا اس فعل کو کونٹرے بینڈ کہا جائے گا۔

۱۲- CONSCRIPTION کونسکرپشن زمانہ جنگ میں بری یا بحری مقاصد کے لئے جبری بھرتی کو کہا جاتا ہے۔

۱۳- COMMUNISM کمیونزم انقلابی سوشلزم کا دوسرا نام ہے۔ تدریجی ترقی یا اصلاح اور ترقی پذیر سمجھوتہ کے مرادف ہے نیز یہ تحریک اصلاحی سوشلزم کے بھی خلاف ہے۔ اصلاحی سوشلزم پارلیمنٹی اداروں کو قبول کرتے ہوئے اس بات کا حامی ہے کہ ہر شے میں تدریجی طور پر تبدیلیاں عمل میں لائی جائیں اور اس قسم کی اصلاح سے ترقی کے دروازے کھول دیئے جائیں۔ تشدد آمیز سوشلزم کارل مارکس کا نظریہ ہے جو ۱۹۱۷ء کے مشہور عالم روسی یا بولشوک بغاوت کی شکل میں رونما ہوا۔

۱۴ COUPD'ETAT کو دے تا فرانسیسی الفاظ کو اور دے تا سے مرکب ہے جس کے معنی حکومتی ضرب کے ہیں۔ اور اصطلاح میں فوجی قوت کے ذریعے حکومت کی اچانک تبدیلی کو کہا جاتا ہے جیسا کہ ۲ دسمبر ۱۸۵۱ء کو فرانس کے شہنشاہ لوئی نیپولین نے اپنی قوت کے زور سے ملک کے دستور کو یکایک بدل دیا تھا۔

۱۵- COMMUNIST PARTY کمیونسٹ پارٹی یا اشتراکی جماعت ایک ایسے ادارے کا نام ہے جو کارل مارکس کے اصولوں کا پابند ہو۔ اس مرکزی ادارے سے دنیا کے متعدد ہم خیال ادارے ملحق ہیں۔ اسی مرکزی ادارے کا دوسرا نام کمیونسٹ انٹرنیشنل یا کمن ٹرن ہے جس کا ذکر ہم اوپر کرچکے ہیں۔

۱۶- DEMOCRACY ڈیموکریسی لنکن کے الفاظ میں اس طریقہ حکومت کا نام ہے کہ "عوام کی حکومت عوام کی جانب سے اور عوام ہی کے لئے ہو" حکومت کا یہ اصول شخصی حکومت سے بالکل مختلف ہے۔

۱۷- EXTRA TERRITORIALITY حدود سلطنت میں رہنے کے باوجود بعض مقامات یا جائدادوں یا بعض اشخاص کا بیرونی مختص

مستثنیات سے استفادہ کرنے کو کہتے ہیں مثلاً ریاست حیدرآباد میں قانون آبکاری کے خلاف شراب تیار کر لینے کی بعض خانہ انوں کو اجازت ہے اسی طرح یورپین اقوام قانون ملک سے بری ہیں۔ یا یہ کہ سکندرآباد کا علاقہ مملکت میں رہنے کے باوجود قانون ملک سے بری ہے۔

۱۸- EMBARGO امبارگو حکومت کے ایک ایسے قانون کا نام ہے جس کی رو سے جہاز بندرگاہ چھوڑ کر بغیر اجازت کے نہیں جا سکتے۔

۱۹- EXTRADITION اکسٹرا ڈیشن۔ ایک حکومت یا ملک کا کسی دوسری حکومت یا ملک کو مجرمین کا حوالے کر دینا۔

۲۰- FASCIST فاسسٹ۔ اٹلی کی قومی جماعت کا نام ہے۔

۲۱- FASCISM فاسزم یا فاسسیت۔ اٹلی میں مسولینی کی لیڈری میں ایک سیاسی قومی تحریک شروع ہوئی تھی جو اس کی سرکردگی میں اب تک جاری ہے۔ اس تحریک کے مقاصد اشتراکیت کے بالکل خلاف ہیں۔

۲۲- PROTOCOL پروٹوکول کسی سیاسی دستاویز کا وہ مسودہ جس کے ذریعے کسی سیاسی معاملہ کی ابتدا ہوئی ہو۔

۲۳- POURPARLER پورپارلے مختلف معاملات جماعتوں یا ممالک کے نمایندوں کی وہ غیر رسمی ابتدائی بات چیت جو آپس میں کسی خاص مسئلے کے تصفیہ کا پیش خیمہ ثابت ہو۔

۲۴- FEDERALISM فیڈرلیزم۔ وفاقیت۔ ایک ایسی طرز کی حکومت کو کہتے ہیں جس کے ذریعے سے اسٹیٹ کی سیاسی قوتوں کو دستور ملک کے مطابق قومی حکومت اور مقامی حکومتوں میں منقسم کر دیا جاتا ہے۔ ایسی وفاقی حکومت کے اجزائے سیاسی کو اسٹیٹ اور صوبہ وغیرہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

۲۵- PICKETING پکٹنگ جو کسی کسی دکان یا کاروباری بازار کے مقابل اس مقصد اور کوشش کے ساتھ پھرتے رہنا کہ عوام اس خاص مال کی سرپرستی نہ کریں یا یہ کہ خود دکان دار ایسے معاملہ سے باز رہیں۔

۲۶- WHIP وہپ کسی سیاسی جماعت کے نمایندے کو کہتے ہیں جس کا کام اپنی جماعت کے ارکان پر پورا پورا قابو رکھنا۔ ان کی رائیں حاصل کرنا اور جماعت کی پالسی کو قائم رکھنے میں مدد دینا ہوتا ہے۔

۲۷- REPUBLIC ری پبلک یا جمہوریت ایک سیاسی برادری کا نام ہے جس کا کوئی خودمختار بادشاہ شہزادہ یا شہنشاہ نہیں ہوتا۔ بلکہ حکومت کا صدر ہوا کرتا ہے۔ اس وقت ممالک متحدہ امریکہ اس کی بہترین مثال ہے۔

۲۸- LITTLE ENTETE لٹل آں تتے چیکوسلواکیا۔ یوگوسلاویا اور رومانیا کو کہا جاتا ہے۔ یہ تینوں چھوٹی ریاستیں جزیرہ نما بلقان میں واقع ہیں۔ آج کل چیکوسلواکیا جرمنی کی سیادت میں ہے۔

۲۹- NATIONALISATION نیشنلائزیشن تجارتی اور صنعتی خانگی اداروں کو معاوضہ کے ساتھ یا بلا معاوضہ حکومت کی نگرانی میں لے لینا۔

۳۰- NAZI نازی جرمنی کی قومی سیاسی جماعت جو ہر اڈولف ہٹلر کی بنائی ہوئی ہے۔ اور اب تک ہٹلر ہی کی لیڈری میں کام کر رہی ہے جرمنی کی

حالیہ ترقی اسی جماعت کی رہین منت ہے۔

۳۱- NEUTRALITY نیوٹریلیٹی یا غیر جانب داری۔ دو اقوام یا ممالک کے درمیان جنگ ہوتی رہے تو اس کا امکان ہے کہ کوئی ایک ملک یا بعض ممالک کسی ایک شریک جنگ قوم کا ساتھ دیں مثلاً موجودہ جنگ میں اولین مرحلہ جرمنی اور پولینڈ کے مابین ہوا اس وقت جرمنی اور روس ایک طرف تھے اور دوسری جانب برطانیہ اور فرانس کی پوری ہمدردی پولینڈ کے ساتھ تھی۔ اٹلی اس وقت اگرچہ شریک جنگ نہیں تھا تاہم وہ خاموش ہو رہا مگر بعض یورپی ممالک یا سلطنتوں نے کھلم کھلا اس بات کا اعلان کر دیا کہ ان کو شریک جنگ کسی جماعت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ یا جرمنی اور فرانس کی لڑائی کے موقع پر امریکہ نے اعلان کر دیا کہ وہ جنگ میں کسی قوم کی طرف سے حصہ نہیں لے گا۔ لیکن ہر دو برسرپیکار اقوام میں سے جو بھی اس سے معاملت کرے اس کو قیمتہً ہر چیز فروخت کرنے کے لئے تیار ہے پس کسی ملک کے ایسے ارادے یا اعلان کو غیر جانب داری کہا جاتا ہے۔

۳۲- PROPORTIONOL REPRESENTATION متناسب نمایندگی (پروپورشنل ری پریزنٹیشن) انتخابات کے دوران میں اس طریقۂ کار کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعہ رائیں اس طرح گنی جاتی ہیں کہ منتخب جماعت میں ہر فرقہ یا جماعت کی نمایندگی کی قوت ایک خاص تناسب کے ساتھ قائم رہے۔

۳۳- PLEBISCITE پلی بی سائیٹ کسی ملک کے جملہ افراد کی مرضی کے اظہار کا نام ہے۔ اور یہ عمل اس وقت کیا جاتا ہے جب کسی طے شدہ مسئلہ کی منظوری یا غیر منظوری کے متعلق عوام کی رائے معلوم کرنی ہو۔ یہ وقت صرف اسی وقت پیش آتی ہے جب کسی جماعت کے نمایندوں کو اس فیصلے سے شدت کے ساتھ اختلاف ہو۔

۳۴- PUBLIC UTILITIES مفاد عامہ۔ برقی روشنی گیس ٹیلیفون بس موٹر سروس یا کسی قسم کی مختلف خدمات جن سے سب افراد مساویانہ طور پر مستفید ہوتے ہوں امور مفاد عامہ کہلاتے ہیں۔

۳۵- RACKETTER راکٹر کسی شخص یا ادارے کا کسی تجارتی یا صنعتی ادارے کو اس بات کی دھمکیاں دے کر رقمیں حاصل کرتے رہنا۔ کہ اگر مطلوبہ رقم نہ دی جائے تو وہ ان کے کاروبار میں مداخلت کرے گا۔

۳۶- REPARATIONS ریپاریشنز۔ جنگی نقصانات کو کہتے ہیں۔

۳۷- REFERANDUM کسی مجوزہ قانون کا بعینہٖ عوام کے سامنے فیصلے کی غرض سے پیش کیا جانا۔

۳۸- ROME BERLIN AXIS روم برلن اکسیز یا روم برلن محور۔ یہ ایک اصطلاح ہے جو امور خارجہ کی حد تک اطالوی برلن پیکان کو ظاہر کرتی ہے۔ گو یہ معاہدہ بہت پہلے عمل میں آچکا تھا لیکن اس کو استحکام اس وقت حاصل ہوا جب مسولینی ۱۹۳۶ء میں رائش کو گیا۔ روما برلن محور کا معاہدہ دراصل اطالوی حبشی جنگ کا نتیجہ ہے جب کہ اٹلی کے خلاف حبشہ کو معاشی امداد دینے سے جرمنی نے صریح انکار کر دیا تھا۔ یورپ کی متعدد حکومتوں نے حبشہ کی مالی اور معاشی امداد کی تھی۔

۳۹- SABOTAGE سابوتاژ۔ کسی کارخانہ کے مزدوروں کا جھگڑے کے دوران میں بدنیتی کے ساتھ کارخانہ اور اس کے مال و اسباب کو عمداً نقصان

پہنچانا۔

۴۰- SANCTIONS مجلس اقوام کے رہنمی نامے کی دفعات ۱۲، ۱۳، ۱۵، ۱۶، اور خصوصاً ۱۶ میں اس لفظ کی صراحت اس طرح کی گئی ہے کہ اقوام کی وہ قوتیں جو جنگ۔ کے زمانے میں عود کر سکتی ہیں۔ ان قوتوں میں کسی برسرپیکار قوم سے تجارت کرنے یا اس کو رقم دینے سے انکار کرنا بھی شامل ہے۔

۴۱- SELF DETERMIN ATION سلف ڈیٹرمنیشن۔ اس اصول کا نام ہے جس کے ذریعے ہر ایک شخص یا کوئی قوم اپنی آزادی کے مسئلہ کا تصفیہ بطور خود کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کو اس بات کا بھی حق حاصل ہوتا ہے کہ اپنے طریقۂ حکمرانی اور سیاسی قسمت کے فیصلہ پر بھی غور و خوض کرے

۴۲- SOCIALISM سوشلزم۔ ایک ایسے اصول کا نام ہے جس کے ذریعے زمین یا اور کسی پیداوار کو مالک کی ملکیت سے خارج کر کے حکومت کی نگرانی اور اختیار میں دے دیا جائے۔

۴۳- SOVIET سوویٹ۔ روس کے زبردست علاقے کی جمہوریتیں جن پر حیثیت ڈکیٹیٹر مہاراج اسٹالن کا راج ہے سوویٹیس کہلاتی ہیں۔ سوویٹ ایک روسی لفظ ہے جس کے معنی کونسل کے ہیں۔ یہ لفظ ۱۹۰۵ء کے انقلاب روس کے بعد مقبول عام ہوا۔ اس انقلاب میں یہ اسکیم تھی کہ حکومت میں ایک نمائندہ جماعت کا اصول قائم کیا جائے اور ایسی جماعت کے انتخاب کے لئے رایوں کا حق صرف مزدوروں کو اور سپاہیوں کو دیا جائے۔ سوویٹ طریقۂ حکومت اس اصول پر مبنی ہے کہ چھوٹی چھوٹی جماعتوں یا کونسلوں کے نمائندے بڑی کونسلوں میں شرکت کے لئے بھیجے جاتے ہیں اور اسی طرح ہر جماعت یا کونسل درجہ بدرجہ بڑی کونسلوں میں اپنے نمائندے روانہ کرتی ہے۔ یہاں تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے جب تک کہ پورے صوبے کی نمائندگی نہ ہو جائے۔ بالآخر یہ نمائندے کانگرس یا سب سے بڑی حکومت کو بھیجے جاتے ہیں۔

۴۴- STATUTE OF WESTMINSTER ۲۴ نومبر ۱۹۳۱ء کو دارالعوام نے پاس کیا تھا جس کے ذریعے ۱۹۲۶ء اور ۱۹۳۰ء کی امپیریل کانفرنسوں کی توثیق کا باقاعدہ طور پر اعلان کیا گیا تھا۔ ان کانفرنسوں میں حکومت متحدہ برطانیہ عظمیٰ شمالی آئرلینڈ، مملکت کنیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ، آئرش فری اسٹیٹ اور نیوفونڈ لینڈ کے نمائندے اور وزرائے اعظم شریک تھے ۱۹۲۶ء کی کانفرنس نے لفظ ڈومینین کی یہ تعریف کی کہ مختلف جماعتیں یا اقوام جو برطانوی راج میں شامل ہوں اور مرتبہ میں مساویانہ حیثیت رکھتی ہوں۔ اور گھریلو یا باہر کے معاملات میں کسی عنوان بھی ایک دوسرے کے محکوم نہ ہوں لیکن سب کے سب ایک عام اتحادی اصول کے تحت برطانوی دولت عالیہ میں شامل ہیں۔

۴۵- MORATORIUM موراٹوریم ایک ایسا دور جس میں نہ تو کسی قسم کا کاروبار ہی انجام دیا جاتا ہے۔ اور نہ قرض وغیرہ جاری یا ادا کئے جاتے ہیں۔ اس قسم کے عمل کا اعلان حکومت کی جانب سے صرف اسی وقت ہوتا ہے جب کہ مالیاتی پستی محسوس کی جاتی ہو۔

۴۶- RIGHT AND LEFT رائٹ اینڈ لفٹ قانون ساز اداروں میں قدامت پرست یا کٹر قسم کی جماعتوں کا یہ عام قاعدہ ہے کہ وہ اسپیکر کی سیدھی جانب بیٹھتی ہیں اور لبرل جماعتیں بائیں جانب۔ اس لئے یہ اصطلاحات قدامت پسند اور لبرل کے لئے سیاسی معاملات میں ان کا نشان امتیاز بن گئی ہیں۔ اسی طرح سنٹر کی اصطلاح درمیانی یا بین بین خیالات کی جماعت کے لئے مستعمل ہے۔

۴۷- SYNDICALISM سنڈی کیلزم بھی تحریک کا نام ہے جس کے ذریعے پیداوار اور اس کی تقسیم کو صنعتی کارکنوں تک منتقل کیا جاتا ہے

۴۸- GESTAPO گسٹاپو۔ یہ لفظ دو جرمن الفاظ کے مرکب کا مخفف ہے یعنی GEHEIME جے ہائی مے معنی تلاش اور ...... STAATSPOLIZEI اسٹاٹ پولزائی یعنی اسٹیٹ پولس۔ یہ جماعت سٹی پولس سے بالکل مختلف ہے GENDARMERIE جنڈارمیری اور CRIMINAL POLICE کریمنل پولس وزیر داخلہ کے راست تحت رہتی ہے لیکن گسٹاپو کو اس سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ گسٹاپو کا سب سے اہم کارنامہ غیر نازیوں کے خلاف مقدمات کا چالان کرنا اور نازی اصول کے خلاف تنقید و تبصرہ کرنے والوں کو دبوچنا ہوتا ہے۔ جرمنی کی یہی ایک سب سے زیادہ ظالم فوج ہے۔ یہ فوج جرمنی کی جاسوسی کا مکمل نظام ہے۔ جس کے باعث ہر گھر کا ہر فرد لرزہ تا رہتا ہے۔

۴۹- BLACKOUT بلیک آؤٹ یہ ایک قدیم لفظ ہے جس کا اصل مفہوم تھیٹر کے اسٹیج کی روشنی کو یکدم گل کر دینا ہے۔ اور آج کل اسی مفہوم میں ہوائی حملوں کے سلسلے میں روشنی گل کر دینے یا روشنی کو سیاہ پردوں کے ذریعے چھپا دینے کو کہتے ہیں۔

۵۰- PRIZE COURT پرائز کورٹ ایک ایسی عدالت کا نام ہے جس کا قیام جنگ کے زمانے میں محض اس غرض سے عمل میں آتا ہے کہ وہ اس بات کا تصفیہ کرے کہ بحریہ نے کسی جہاز یا سامان کی لدی ہوئی کشتیوں کو جو گرفتار کیا ہے۔ آیا وہ عمل مطابق قانون ہے یا نہیں اگر یہ عدالت اس بات کا فیصلہ کر دے کہ سامان یا جہاز جو گرفتار کر لیا گیا ہے وہ درحقیقت دشمن کی ملک سے ہے یا یہ کہ غیر جانب دار ملک کا ہے لیکن ممنوعہ ہے۔ تو اس کو فروخت کر دیا جاتا ہے۔ اور جو آمدنی ہوگی ختم جنگ پر بحری بیڑے میں تقسیم کر دی جائے گی۔

۵۱- U-BOAT یو بوٹ بہت ہی عام لفظ ہے سب میرین یا آب دوز کے لئے جرمن لفظ UNTERSEE BOOT انٹر سی بوٹ ہے جس کے معنی سمندر کی تہ والی کشتی کے ہیں۔ اسی لئے UNTERSEE یا انڈرسی UNDERSEA کا مخفف حرف U قرار دیا گیا ہے اور BOOT BOAT مستعمل ہے۔

۵۲- MANDATES COMMISSION مینڈیٹس کمیشن۔ گیارہ ارکان کی یہ ایک مستقل جماعت ہے۔ اس میں اکثریت ان نمایندوں کو حاصل ہے جن کے ملک محکوم یا زیر نگرانی ہوں۔ یہ جماعت ان محکوم ممالک کی سالانہ روداروں کی جانچ پڑتال کرتی اور ان کے متعلق لیگ کونسل کو ضروری ہدایات دیتی ہے۔ اگر ایسے ممالک کی رعایا کا کوئی مظلوم شخص فریادی ہو تو اس جماعت کا فرض ہے کہ وہ اس شخص کی درخواست کو لیگ تک پہنچا دے۔

۵۳- INDIRECT TAXATION ان ڈائرکٹ ٹیکسیشن ٹیکس اشیا پر عائد کیا جاتا ہے نہ کہ اشخاص پر۔ وہ اس طرح کہ ہر وہ شخص جو چیزیں خریدتا ہے دراصل وہ ساتھ ہی ٹیکس بھی ادا کرتا ہے یعنی کسی شئے کی قیمت خرید میں اس کا محصول بھی شامل ہے جو تاجر نے حاصل کرتے وقت ادا کیا تھا۔ اس طریقہ ادائی کو بالواسطہ محصول کہا جاتا ہے۔ ایسے ٹیکس عائد کرنے کے دو اہم ذرائع کروڑ گیری اور چنگی ہیں۔

۵۴- RECONNAISSANCE ری کنا ئے سنس۔ یہ لفظ ان معنی میں مستعمل ہے کہ کسی دشمن کے ملک کی طبعی او جغرافی حالت اور یہ کہ اس کے ذرائع آمدنی یا اس کی فوجوں کی نقل و حرکت کو معلوم کرنے کی غرض سے فوج کا ایک دستہ یا ہوائی جہاز مقرر کیا جائے جو صرف اس خاص کام کو انجام دیتا رہے۔

۵۵- CAMOUFLAGE کیموفلاژ۔ یہ لفظ صرف جنگ سے مخصوص ہے یعنی یہ کہ جنگ کے زمانے میں سپاہیوں فوج یا سامان یا آلات حرب

وغیرہ کو ایک خاص طریقے سے چھپا نا فن میں داخل ہے۔ سابقہ جنگِ عظیم اور حالیہ جنگ میں بھی جنگ سے متعلق ہر چیز کو اس ڈھب سے چھپایا جاتا ہے کہ دشمن اصل شے کا پتہ نہیں چلا سکتا۔

۵۶- MILITARY ATTACHE ملٹری اتاشی جنگ کے زمانے میں غیر جانبدار حکومتیں کسی ایک فریقِ جنگ کے پاس اپنے عہدہ دار محض اس غرض سے بھیجتی ہیں کہ وہ جنگ کی صحیح خبریں اپنے ملک کو بھیج سکیں۔

۵۷- BLOCKADE بلاکیڈ۔ قانون بین قومی کی ایک اصطلاح ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ دشمن کے ملک سے سامان کی برآمد اور درآمد کو روک دیا جائے۔ سمندری بلاکیڈ کے سلسلے میں غیر جانبدار ممالک کو سخت نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ اگر ان کے جہاز کسی بلاکیڈ کئے ہوئے ملک کو پہنچنے کی کوشش کریں تو یہ جہاز اور ان پر کا پورا سامان بلاکیڈ کرنے والی قوت کی جانب سے ضبط کر دیا جاتا ہے۔

۵۸- PROFITEERING اس لفظ کے معنی یہ ہیں کہ قومی معاشی پستی کے زمانے میں صنعت و حرفت۔ تجارت۔ اشیا کی خرید و فروخت اور ان کی تقسیم کے سلسلے میں غیر جائز طریقے پر قیمتوں میں ناروا اضافہ کر کے فائدہ اٹھانا۔

۵۹- HABEAS CORPUS ہیبیس کارپس ایک ایسی تحریر جو کسی عدالتِ مجاز کی جانب سے جاری کی جاتی ہو۔ جس شخص کے نام یہ تحریر جاری کی گئی ہو اس کو اس بات کا حکم دیا جاتا ہے کہ مطلوبہ شخص کو یا اس کے جسم کو جس کو حراست میں رکھا گیا ہو عدالت میں پیش کیا جائے۔ یہ لفظ دو لاطینی الفاظ ہابیرے HABERE بمعنی رکھنا اور کارپس CORPUS بمعنی جسم سے مرکب ہے۔ گویا جسم کا رکھنا یعنی اپنی تحویل یا نگرانی میں رکھنا ایسا حکم خاص طور پر کسی جیلر کے نام دیا جاتا ہے جو عموماً مجرموں یا ملزموں کو حراست میں رکھتا ہے۔ اگر وہ شخص جس کے نام ایسا حکم جاری کیا گیا ہو قیدی کی ذات کو عدالت میں حسبِ ہدایت پیش کرنے سے قاصر رہے تو تحقیرِ عدالت کی علت میں اس شخص پر عدالت میں مقدمہ چلایا جا کر سخت سزا تجویز کی جاتی ہے۔

۶۰ FUEHRER فیوہرر۔ اس جرمن لفظ کے معنی سردار۔ لیڈر یا گائیڈ کے ہیں جرمنی میں یہ خطاب ہٹلر ڈکٹیٹر جرمنی کو دیا گیا ہے

۶۱- PROHIBITION پرو ہبیشن۔ عام لفظ ہے حکومت کا وہ حکم جو مسکرات کی فروخت کے متعلق جاری کیا جائے لیکن اس مانعتی قانون میں اتنی لچک ضرور ہوتی ہے کہ یہی نشی اشیا ردواؤں کے استعمال یا مذہبی ضروریات کے لئے حسبِ ہدایت فروخت کی جا سکتی ہیں۔

۶۲- TARIFF ٹیرف یہ لفظ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ کسی ملک میں جب بیرون ملک سے اشیا درآمد کی جاتی ہیں تو ان پر ایک خاص تناسب کے ساتھ محصول عائد کیا جاتا ہے۔ اسی متناسب محصول کا نام ٹیرف ہے +

۶۳- OSLO POWERS اوسلو پاورز۔ ان میں ہالینڈ۔ بلجیم۔ لکزمبرگ۔ فن لینڈ۔ ڈنمارک۔ ناروے اور سویڈن شامل ہیں۔ چونکہ ناروے کے پایۂ تخت اوسلو میں ان تمام ممالک کی ایک اہم کانفرنس ہوئی تھی۔ اس لئے اس متحدہ جماعت کا نام اوسلو پاورز پڑ گیا۔

جی۔ ایم خان

اصغر کا روزنامچہ

۲ جنوری ۱۹۳۹ء

آج میں ذرا دیر میں اٹھا، پھر بھی دو ایک گھنٹے کام کرلیتا اگر اسمعیل نہ آدھمکتا۔ میں آغا سے ملنے گیا۔ لیکن وہ کہیں باہر چلا گیا تھا۔

میں نے ماؤنٹ رائل میں لنچ کھایا۔ ممتاز کے ساتھ میں "سکوآش" کھیلا اور اسے ہرایا۔ ۔ ۔۔۔۔ ۴ میرے چہرے اور پیشانی پر ممتاز کے ریکٹ سے سخت چوٹ آئی۔

چائے میں نے نہیں پی لیکن اسمعیل کے ساتھ ہنگیریئن طعام گاہ میں شام کا نہایت نفیس کھانا کھایا اور اس کے بعد ہم سینما دیکھنے چلے گئے۔ ایک بالکل معمولی سی تصویر کے ساتھ ایک نہایت معمولی سا دن ختم ہوگیا۔

میں نے ذرہ برابر بھی کام نہ کیا۔ یہ سستی اب محض مذاق کی حد سے بڑھتی جاتی ہے۔ بہتر ہے کہ کل سے میں دس دن خوب جی لگا کے کام کروں۔

سو اب سپین میں فاشسٹوں کو فاش شکستیں ہو رہی ہیں جمہوریئے بھی کیسے باکمال لوگ ہیں۔ اور کیسے وہ تین سال تک جان توڑ کر لڑے اور جرمنی اور اٹلی کے متحدہ فوجی دماغوں کی روک تھام کرتے رہے۔ اس پر مجھے حیرت ہوتی ہے اور اس میں یورپ کے لئے مجھے امید کی ایک چنگاری نظر آتی ہے۔ کیونکہ یہ چیزیں کبھی فنا نہیں ہوسکتیں، اپنے وطن کی محبت اور آزادی اور حریت اور خوشی جو پس جاتی ہیں جب بھی کوئی ملک شہنشاہیت کا شکار ہو جائے ممکن ہے کہ سپین اور آزادی کی راہ میں لڑنے والے اس کے بہادر جنگ جو اب بھی دنیا کو فاشیت کے مصائب سے بچالیں۔ میں اس کے لئے دعا کرتا ہوں۔

(ایک بجے شب)

(ترجمہ از ل)

اصغر بشیر

مطبُوعات

ادارۂ ادبیاتِ اُردو حیدر آباد دکن کی کتابیں

"ادارۂ ادبیاتِ اُردو" کے قیام کو بہت عرصہ نہیں گزرا۔ لیکن اس قلیل مدّت میں اس ادارے کی طرف سے بہت اچھی اچھی اور بلند پایہ کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ذیل میں چند کتابوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

سرگزشتِ ادارۂ ادبیات اُردو:۔ تین سو صفحات سے زاید کی یہ نفیس چھپی ہوئی مجلد و مصور کتاب ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی سرگرمیوں کا نہایت روشن مرقع ہے۔ اس کتاب میں ادارۂ ادبیات کے مختلف شعبوں اور مختلف کارکنوں کے متعلق دلچسپ معلومات ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ اندازہ ہوتا ہے کہ نوجوانانِ دکن کا یہ ادارہ کتنا منظم اور بلند پایہ ہے۔ یہاں ادارہ کے متعلق مولانا عبدالماجد دریابادی کی رائے نقل کی جاتی ہے۔ ادارۂ ادبیات کے ماہوار رسالے "سب رس" کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"سب رس کا نام ہی نام جب تک سنتا رہا معنی کچھ سمجھ میں نہ آئے۔ ایک آدھ سے پوچھا گچھا بھی مشکل حل نہ ہوئی جب سب رس خود ہی دیکھنے میں آیا تو معنی کا راز کھل رہا "سب" یعنی کل کا کل، سارے کا سارا، رس ہی رس!۔ واہ کیا مٹھاس ہے اور کیا لطافت، کیا ذائقہ ہے اور کیا حلاوت! آنکھیں اب کھلیں۔ ادارۂ ادبیات کی مطبوعات لگیں ایک ایک کر کے وصول ہونے، نزول کرنے آج ایک پیکٹ آیا اور کل دوسرا، اور پرسوں تیسرا، اے لیجئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انبار لگ گیا کتابوں کا۔ رسالوں کا، مقالوں کا، تاریخ پر، تنقید پر، علوم پر، فنون پر، صنعتوں پر، سائنس کی حکمتوں پر، ادب پر، خلاصہ یہ کہ سب پر! یا الٰہی یہ کوئی ادبی ادارہ ہے کہ کوئی مشینی کارخانہ کہ جب دیکھئے ڈھلی ڈھلائی، چھپی چھپائی کتابیں دھڑا دھڑ نکلتی چلی آرہی ہیں:۔

کون کہتا ہے کہ قوم کے نوجوان سب کے سب بے عمل ہی ہوتے ہیں کم از کم اس ادارے کے نوعزیب کارکنوں پر ہمّت اور سرگرمی اور جوشِ عمل ہے کہ پھٹا پڑتا ہے۔ اللہ اس کو قائم رکھے اور ہم لوگوں کو توفیق اس کی عطا ہو کہ تائید نہ کر سکیں جب بھی یہ تو نہ ہو کہ اس کی تخریب کے درپے ہو جائیں":۔

ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی سرگزشت پڑھنے کے قابل ہے اور حوصلہ افزائی اور تقلید کے قابل بھی ہے۔ اہلِ اُردو کو ایسے ادارہ کی دل کھول کر سرپرستی کرنی چاہیئے۔ اس کتاب کی قیمت صرف ۱۲ ؍ ہے:۔

شعرائے عثمانیہ:۔ جامعہ عثمانیہ کے چھبیس ۲۶ نوجوان شعراء کے دلآویز کلام کا دلچسپ انتخاب۔ بڑی تقطیع حجم ۲۳۰ صفحات۔ مجلد۔ نفیس کتابت و کاغذ۔ قیمت عہ:۔

رباعیاتِ جذب:۔ جناب راگھوندر راؤ صاحب جذبؔ وکیل عالم پوری کی رباعیات کا مجموعہ۔ دیباچہ حضرت ماہر القادری نے لکھا ہے۔ زیادہ تر

نصیحت آموز اور اخلاقی مضامین ہیں مدارس کے کتب خانوں کے لئے بھی بہت موزون ہے صفحات ۱۲۰ - قیمت ۲ / ۸

مغربی تصانیف کے اُردو تراجم :- میرحسن صاحب ایم۔اے نے یہ کتاب بہت محنت سے لکھی ہے ۱۸۰۱ء سے لیکر موجودہ دَور تک کے تراجم اور مترجموں کا خاصا جامع ذکر ہے۔کتاب پڑھنے کے قابل ہے۔قیمت عہ ؎

مکتوبات شاد عظیم آبادی :- مرتبہ جناب محی الدین صاحب قادری زور۔ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی۔یہ سب خطوط بجز ایک کے سید ہمایوں مرزا مرحوم بیرسٹر حیدر آباد دکن یا انکی بیگم صاحبہ محترمہ صغرا ہمایوں مرزا کے نام لکھے گئے ہیں خط دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہیں چھوٹی تقطیع حجم ۱۰۰ صفحات قیمت عہ ؎

کاغذ کی ناؤ :- مختصر نثری تمثیلوں کا مجموعہ از صاحبزادہ میر محمد علی خان صاحب میکش۔ریڈیو ڈراما لکھنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔لیکن صاحبزادہ صاحب کامیاب ہوئے ہیں۔حجم ۱۲۰ صفحات۔قیمت عہ ؎

محبت کی چھاؤں :- میرزا ظفر الحسن صاحب بی۔اے (عثمانیہ) کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔تعارف پروفیسر عبدالقادر سروری، ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی نے لکھا ہے۔افسانے نوجوانوں کی دلچسپی کے ہیں۔حجم ۱۳۲ صفحات۔قیمت مجلد عہ ؎

اُردو مثنوی کا ارتقاء :- از پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ایم۔اے ایل ایل۔بی۔اُردو مثنوی کے متعلق یہ جامع اور سیر حاصل کتاب لائق تعریف محنت اور کاوش سے لکھی گئی ہے کتاب پُر از معلومات اور پڑھنے کے قابل ہے۔بڑی تقطیع حجم ۲۴۳ صفحات قیمت ۱؎ ۱۲

نذرِ دکن :- مرتبہ سکینہ بانو صاحبہ داعی شعبۂ نسواں و مدیرہ سب رس۔اس کتاب میں دکن اور شاہانِ دکن کے متعلق خواتین دکن کے دلچسپ اور پُر از معلومات مضامین جمع کئے گئے ہیں۔کتاب تصویروں سے مزین ہے اور پڑھنے کے قابل ہے قیمت مجلد عہ ؎

تاریخ گولکنڈہ :- از جناب عبدالمجید صاحب ایم۔اے ایل ایل۔بی۔پروفیسر تاریخ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد (دکن) یہ قطب شاہی سلطنت کی نہایت جامع اور دلچسپ تاریخ، اور اس عہد کے تمدن و معاشرت اور سیاسی حالات کا ایک نہایت کامل اور دیدہ زیب مرقع ہے۔یہ بلند پایہ کتاب اہلِ ذوق کے پڑھنے کے قابل ہے۔بڑی تقطیع حجم ۳۲۵ صفحات۔گیارہ تصاویر بھی شامل ہیں۔قیمت مجلد ؎

نمودِ زندگی :- مقام مسرت ہے کہ ادارۂ ادبیات اُردو نے جناب سید علی منظور صاحب حیدرآبادی کے کلام کا مجموعہ اس نام سے شائع کیا ہے۔سید صاحب جدید طرز کے شعراء میں بہت بلند پایہ ہیں ان کا کلام ہمایوں میں چھپتا رہتا ہے ہمارے قارئین نے بارہا اُن کے کلام کو خاص طور پر سراہا ہے۔حجم ۲۰۷ صفحات قیمت عہ ؎

پھول بن :- ادارۂ ادبیاتِ اُردو نے قدیم کتابوں کو دیباچوں حواشی اور تشریحات کے ساتھ شائع کرنے کا اہم کام بھی اپنے ذمے لیا ہے۔یہ کام بہت محنت اور کاوش کا ہے۔اسی سلسلے میں ابن نشاطی کی اُردو مثنوی پھول بن شائع ہوئی ہے جو آج سے تین سو سال پہلے لکھی گئی تھی یہ کتاب اہلِ ذوق کے مطالعہ کے قابل ہے۔پھول بن کو پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ایم۔اے ایل ایل۔بی نے بہت قابلیت سے مرتب کیا ہے۔حجم بڑی تقطیع کے ۱۴۷ صفحات۔قیمت درج نہیں ؎

مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال:- یہ بھی اسی سلسلے کی ایک کتاب ہے جس کے فاضل مرتب میر سعادت علی رضوی ایم اے ہیں۔ اس کے مصنف ملا غواصی ہیں یہ بھی آج سے تین سو سال پہلے کی مثنوی ہے جو حواشی اور تشریحات کے ساتھ نہایت عمدگی سے مرتب کی گئی ہے۔ قیمت درج نہیں۔ حجم بڑی تقطیع کے ۱۷۹ صفحات۔

کلام الملوک:- قدیم سلاطینِ دکن کے فارسی کلام کا یہ مجموعہ میر سعادت علی صاحب رضوی ایم اے نے مرتب کیا ہے۔ شاعر بادشاہوں کے کلام کے ساتھ ان کی تصاویر بھی دی گئی ہیں۔ کتاب مطالعہ کے قابل ہے۔ حجم ۱۱۲ صفحات قیمت درج نہیں۔

طوطی نامہ:- یہ مثنوی ملا غواصی نے آج سے تین سو سال پہلے اردو زبان میں لکھی تھی اب میر سعادت علی صاحب نے ایک مفصل مقدمے کے ساتھ مع تشریحات اسے مرتب کیا ہے اور ادارۂ ادبیات نے قدیم کتب کے سلسلے میں اسے شائع کیا ہے جس کے لئے اہلِ اردو کو ادارہ کا شکر گزار ہونا چاہیئے۔ بڑی تقطیع۔ حجم ۲۹۰ صفحات قیمت درج نہیں۔

قصۂ بے نظیر:- تین سو سال پہلے کی ایک اردو مثنوی۔ از صنعتی مرتبہ پروفیسر عبد القادر سروری ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ سلسلہ مذکورہ بالا کی یہ کتاب بھی پڑھنے کے قابل ہے۔ حجم ۱۱۱ صفحات قیمت درج نہیں۔

فنِ تقریر:- مرتبہ ادارۂ ادبیات اردو۔ اس کتاب میں فنِ تقریر کے متعلق معلومات درج ہیں۔ حجم ۹۳ صفحات قیمت ۱۲ر۔

سلکِ گوہر: (ڈراما) از محمد جلال الدین صاحب انسکٹ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (عثمانیہ) شائع کردہ ادارۂ ادبیات اردو۔ ڈراما منظوم ہے قیمت ۴ر۔

محمد حسین آزاد:- شمس العلماء مولوی سید محمد حسین آزاد دہلوی کے حالاتِ زندگی اور تصنیفات و کلام پر تبصرہ از محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ نقوی ایم۔ اے (عثمانیہ)۔ کتاب پڑھنے کے قابل ہے۔ حجم ۲۰۰ صفحات قیمت عہ۔

مقدمۂ تاریخِ دکن:- از جناب عبد المجید صاحب صدیقی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ قدیم زمانے سے لیکر موجودہ دور تک کی تاریخ دکن کو سمجھنے کے لئے یہ کتاب ایک سرسری خاکے کا کام بوجہ احسن دے سکتی ہے جن لوگوں کے پاس مفصل تاریخیں پڑھنے کا وقت نہ ہو وہ اس کتاب سے قدیم وجدید تاریخ دکن کے متعلق بہت کچھ واقفیت حاصل کر سکتے ہیں حجم ۱۳۹ صفحات قیمت عا ر۔

اردو دانی کی کتابیں:- (پہلا حصہ) یہ جدید طرز کا ایک قاعدہ ہے جس کے متعلق یہ دعویٰ ہے کہ اس سے نو عمر پڑھنے والے پرانے قاعدے کے مقابلے میں صرف چوتھائی حصہ وقت میں پڑھنا لکھنا سیکھ سکتے ہیں۔ قاعدہ مفید معلوم ہوتا ہے۔ قیمت ۲ر۔

پتہ:- اوپر کی سب کتابیں ادارۂ ادبیات اردو۔ خیریت آباد حیدرآباد (دکن) سے ملتی ہیں۔

انجمنِ ترقیٔ اردو (ہند) دہلی کی کتابیں

حیات کیا ہے:- از جناب محشر عابدی صاحب بی۔ اے۔ ایم۔ ایس سی (عثمانیہ) انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی۔ اردو میں ادبی کتابوں کی

اشاعت کے ساتھ سائنس کے مختلف شعبوں کے متعلق بھی کتابیں شائع کرتی رہتی ہے حیاتیات کے متعلق یہ کتاب اُردو داں طبقے کے لئے ایک نئی چیز ہے زندگی کے مظاہر کے متعلق حکما نے اب تک جو مختلف نظریئے قائم کئے ہیں ان کا دلچسپ بیان اس کتاب میں ہے بہت سی تصویریں بھی ہیں حجم ۱۰۴ صفحات قیمت درج نہیں ؛

حکایاتِ رُومی:۔ (پہلا حصہ) ترجمہ از مرزا نظام شاہ ۔ بہ نظر ثانی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی ۔ مولانائے روم کی حکایات کا نہایت کامیاب ترجمہ ہے جو لوگ فارسی مثنوی سے مستفید نہیں ہوسکتے ان کے لئے بیش بہا نعمت ہے ۔ حجم ۸۴ صفحات قیمت درج نہیں ؛

اخوانُ الصّفا عربی کی مشہور کتاب کا ترجمہ ہے مولوی اکرام علی مرحوم نے صاف ستھرا ترجمہ کیا ہے اور اب بہت سے نسخوں سے مقابلہ کرنے کے بعد انجمن ترقی اُردو نے شائع کیا ہے ۔ حجم ۱۵۵ صفحات قیمت درج نہیں ؛

تاریخ ادبیاتِ ایران (۱۹۲۴-۱۵۰۰ در عہد جدید) مصنفہ پروفیسر براؤن مترجمہ سید وہاج الدین احمد صاحب کنتوری ۔ مددگارِ نائبِ معینِ امیرِ جامعہ ۔ مؤلفِ "نفسیاتِ ترغیب" وغیرہ ۔

کتاب مشہورِ آفاق ہے اس کا ترجمہ بہت کامیابی سے کیا گیا ہے حجم ۱۷۶ صفحات ۔ قیمت درج نہیں ؛

اصطلاحاتِ پیشہ وراں:۔ مؤلفہ مولوی ظفر الرحمٰن صاحب دہلوی ۔ اس کتاب میں ہندوستان کے مختلف فنون اور صنعتوں کے اصطلاحی الفاظ و محاورات نہایت محنت سے جمع کر دیئے گئے ہیں ۔ کتاب نہایت دلچسپ اور پُر از معلومات ہے الفاظ سے ہندوستان کے قدیم تمدن پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے جگہ جگہ خاکوں سے الفاظ و محاورات کا مفہوم سمجھایا گیا ہے ۔ حجم ۲۴۳ صفحات قیمت درج نہیں ؛

حیاتِ جاوید:۔ اس کتاب میں مولانا حالی نے سرسید احمد خاں کے حالاتِ زندگی اور اُن کی سرکاری، قومی، ملکی اور مذہبی خدمات کا مفصل ذکر کیا ہے بڑی تقطیع حجم ۹۵۴ صفحات ۔ علاوہ ضمیمہ جات و انڈکس مولانا حالی اور سرسید احمد خان کی تصاویر سے مزین ہے کتاب جس قابلیت سے لکھی گئی ہے مولانا حالی کا نام اس کا گواہ ہے ۔ قیمت درج نہیں ؛

پتہ:۔ اُوپر کی سب کتابیں انجمن ترقی اُردو دہلی سے ملیں گی ؛

سُلطان محمُود غزنوی:۔ از پروفیسر محمد حبیب صاحب بی ۔ اے (آکسن) مسلم یونیورسٹی علی گڈھ ۔ اصل انگریزی کتاب کا ترجمہ سید جمیل حسین صاحب ایم ۔ اے علیگ نے کیا ہے ۔ سلطان محمود کے متعلق یہ محققانہ تصنیف پڑھنے کے قابل ہے ۔ حجم ۲۸۰ صفحات قیمت عہ

پتہ:۔ ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد ؛

جواہرِ سخن (جلد چہارم) ۱۲۰۰ھ سے ۱۲۵۰ھ تک کے شعراء کے کلام کا یہ انتخاب مولوی محمد مبین کیفی چریا کوٹی نے کیا اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ایم ۔ اے ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی نے اس پر نظر ثانی کی ۔ انتخاب محنت سے کیا گیا ہے اور پڑھنے کے قابل ہے ۔ بڑی تقطیع ۲۲۷ صفحات قیمت عہ

ناشر:۔ ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد ؛

جنگ آلودہ دُنیا۔ مرتبہ وینکٹیش نارائن صاحب تیواری۔ موجودہ جنگ کی خبروں کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ مفید ہے کتاب میں اہم نقشے اور متعدد چارٹ شامل ہیں جن سے مضامین کے سمجھنے میں بہت سہولت ہوتی ہے تیواری صاحب کی محنت اور کاوش قابلِ تعریف ہے

حجم ۱۶۰ صفحات قیمت درج نہیں۔ ناشر:۔ انڈین پریس الہ آباد ٭

یادِ چکبست۔ مرتبہ پنڈت آنند نرائن مُلا صاحب چکبست اُردو کے بلند مرتبہ شاعر تھے۔ اس کتاب میں مُلا صاحب نے چکبست کے متعلق تقریباً ۲۰ اُردو شعراء کے مضامین اور نظمیں جمع کی ہیں لکھنے والوں میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق، نیاز، اثر لکھنوی، ڈاکٹر تاراچند، سجاد حیدر یلدرم وغیرہ شامل ہیں مضامین اور نظمیں قابلِ مطالعہ ہیں حجم ۱۷۰ صفحات۔ کاغذ کتابت نفیس۔ کتاب مجلّد ہے۔ ناشر انڈین پریس الہ آباد ٭

افتتاحِ الاندلس:۔ از محمد جمیل الرحمٰن صاحب ایم اے۔ پروفیسر تاریخ عثمانیہ یونیورسٹی۔ یہ ابن القوطیہ کے رسالے تاریخ افتتاح الاندلس کا ترجمہ ہے۔ توضیح مطالب کے لئے مقدمہ اور حواشی کا اضافہ کیا گیا ہے ترجمہ اچھا ہے اور کتاب پڑھنے کے قابل ہے قیمت عہ۔ ناشر کتابستان الہ آباد ٭

خیال آفرین دماغ:۔ یہ حضرت عرش تیموری مصنف "قلعہ معلّٰی کی جھلکیاں" کا ایک تجزیاتی وتخلیلی ڈراما ہے۔ حضرت عرش کے خیالات کی جدّت قابلِ لحاظ ہے کتاب کا حجم ۷۵ صفحات ہے اور قیمت ۶ر۔ ناشر: حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی ٭

مُسافر کی ڈائری:۔ خواجہ احمد عباس نے جاپان، امریکا، یورپ، ٹرکی اور بغداد وغیرہ کی سیاحت کے بعد یہ دلچسپ اور قابلِ مطالعہ کتاب لکھی ہے۔ لندن کے متعلق خواجہ صاحب کی رائے بہت دلچسپ ہے اس لئے یہاں نقل کی جاتی ہے:۔

"مجھے لندن آئے پورا ایک مہینہ گزر گیا۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ نہ مجھے یہ شہر پسند آیا نہ میں نے اس کو اچھی طرح دیکھنے کی کوشش کی ممکن ہے کہ اپنے سیاسی عقیدوں کی وجہ سے لندن کے خلاف تعصب میں مبتلا ہوں۔ ممکن ہے لندن میں خوبصورت عمارتیں ہوں مگر میں نے تو فقط دھوئیں سے کالے ہوئے بدصورت مکانوں کی یکساں قطاریں دیکھیں۔ ممکن ہے یہاں بھی دلچسپ، رحمدل، مہمان نواز اور کالے گورے کی تفریق کو نہ ماننے والے انسان بستے ہوں مگر میں ان سے نہیں ملا۔ سوائے مشہور ناول نویس مس ایتھل مینن کے جو آرٹسٹ ہے اور سوشلسٹ اس لئے لندن کی نمائندگی نہیں کرسکتی ممکن ہے لندن کی زندگی میں بہت سی دلچسپ خصوصیات ہوں مگر میں اُن کو کیسے دیکھ سکتا جبکہ میں نے زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں گزارا اور زیادہ باہر اس لئے نہیں نکلا کہ سڑک یا ہوٹل یا تھیٹر جہاں بھی جاؤں گا کالا رنگ میری تحقیر کرائے گا۔

بہرحال لندن وہ شہر ہے جہاں:۔

دُنیا کا بدترین کھانا ملتا ہے صبح شام سوائے اُبلے ہوئے گوشت اُبلے ہوئے آلو اور اُبلی ہوئی گوبھی کے اور کچھ نہیں نظر آتا۔ تمام شہر میں بہترین کھانا ہندوستانی ہوٹلوں میں ملتا ہے جو کافی تعداد میں ہیں ٭

زمین کے نیچے ریلوں کا جال بچھا ہے اس ریل کا انتظام حیرت انگیز ہے بھیک مانگنا جرم ہے مگر دھیلے کی دیاسلائی کی ڈبیا دو آنے میں فروخت کی جاسکتی ہے۔ سڑک کے کنارے اپاہج اور مفلس آرٹسٹ اپنی بنائی ہوئی تصویریں آٹھ آٹھ دس دس آنے میں فروخت کرتے ہیں۔

وزیرِ اعظم جو دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کا حکمران ہے ایک تنگ گلی میں ایسے چھوٹے سے مکان میں رہتا ہے جس میں ہندوستان کے

وائسرائے کا بینڈ ماسٹر بھی سننے سے انکار کردیگا ۰

بادشاہ اور ملکہ کی موٹر جب بازار سے گزرتی ہے تو وہ انتظام نہیں کیا جاتا جو ہمارے ملک میں گورنروں کے لئے کیا جاتا ہے۔

ہائیڈ پارک میں جس کا جی چاہے جا کر تقریر کرسکتا ہے اگر اس کو پانچ چھ سننے والے مل جائیں۔ اس کے بعد وہ اخبار میں وہ خبریں اور رائے پڑھ سکتا ہے جو لارڈ بیور بروک اس کو پڑھوانا چاہتے ہیں اور ریڈیو پر وہ تمام باتیں سُن سکتا ہے جو بی بی سی کے لکھ پتی کرتا دھرتا اس کو سنانا چاہتے ہیں۔ اسی کو کہتے ہیں آزادیٔ رائے۔

"صفائی پسند انگریز دن میں صرف ایک بار منہ دھوتے ہیں اور ہفتے میں ایک بار نہاتے ہیں قمیص کا کالر روز تبدیل کرتے ہیں۔ مگر قمیص جب پسینے میں سڑ جائے تب ہی بدلی جاتی ہے۔ چھ چھ مہینے ایک ہی کالی پتلون میں گزار دیتے ہیں"

متعدد تصاویر زینتِ کتاب ہیں۔ حجم تقریباً ۲۰۰ صفحات۔ قیمت مجلد ایک روپیہ ۸/۔ ناشر: حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی۔

لفٹنٹ:۔ مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی کا ایک مزاحیہ افسانہ ہے جو مرزا صاحب کی خصوصیاتِ تحریر کا جامع ہے۔ قیمت ۶/

خراب مضمون:۔ یہ مرزا عظیم بیگ چغتائی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو اُن کے نزدیک ناقابلِ اشاعت تھے لیکن بعض احباب کے اصرار سے چھپوا دیئے گئے ہیں۔ یہ کتاب اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت دلچسپ ہے بالخصوص نقادوں کیلئے۔ قیمت ۱۲/ ۰

دونوں کتابیں دفتر کتابت جودھپور سے مل سکتی ہیں ۰

کلامِ عاصی:۔ مسٹر منوہن ایم۔ اے قابلِ مبارکباد ہیں کہ انہوں نے کاشتھ اُردو سبھا قائم کرکے ایک مفید کام انجام دیا ہے بقول من موہن صاحب "کاشتھ اُردو سبھا دہلی اس لئے قائم کی گئی ہے کہ اُن قابل مصنفوں اور شاعروں کے کلام کی اشاعت کرے جنہوں نے اُردو ادب میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے" اس سلسلہ میں غالب اور ذوق کے ہمعصر اور شاہ نصیر کے مایۂ ناز شاگرد منشی گھنشیام لال عاصی کا کلام ۲۶۴ صفحات پر شائع کیا گیا ہے جو اپنے وقت کی شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ قیمت فی جلد ۳/۔ ناشر: کاشتھ اُردو سبھا دہلی ۰

کلامِ رونق:۔ یہ افتخار الشعراء منشی پیارے لال صاحب رونقؔ دہلوی مرحوم کے کلام کا انتخاب ہے جو کاشتھ اُردو سبھا دہلی نے شائع کیا ہے۔ اس کے مرتب جناب پروفیسر بانکے بہاری لال صاحب دہلوی ایم۔ اے۔ ایم۔ او۔ ایل۔ منشی فاضل ہیں ۰

بہت سی نظمیں ہندوؤں کے مذہبی تہواروں سے اور ہندو بزرگوں کے متعلق ہیں۔ موضوع نئے نئے ہیں اور نظمیں اچھی ہیں۔ کتاب قابلِ قدر ہے۔ ۱۶۰ صفحات۔ قیمت ۱۲/ اعلیٰ کاغذ قیمت ۱/۔ ناشر:۔ کاشتھ اُردو سبھا دہلی ۰

پسٹالوزی:۔ یہ کتاب حکیم پسٹالوزی کے فلسفۂ تمدن و تعلیم کے متعلق ہے جس کے مصنف ڈاکٹر عبدالحمید صاحب زبیری بی۔ اے (جامعہ) ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں۔ اشپرانگر نے ایک موقع پر کہا تھا کہ "کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتی جب تک اس میں ایک پسٹالوزی پیدا نہ ہو" اس کتاب کا مطالعہ اہلِ ہند کے لئے بے حد ضروری ہے حجم ۱۲۵ صفحات۔ کتابت۔ طباعت۔ کاغذ نفیس قیمت مجلد ۳/۔ ناشر: مکتبۂ جامعہ دہلی ۰

یارانِ میکدہ:۔ جناب عبدالشکور صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی علیگ نے اس کتاب میں اپنے بارہ مزاحیہ مضامین جمع کئے ہیں "مولوی حافظ"

"کالے خاں"، "باجی" وغیرہ مختلف کردار ہیں جن کی قلمی تصویر مزاحیہ رنگ میں دکھائی گئی ہے حجم ۱۵۱ صفحات قیمت درج نہیں ناشر مکتبہ جامعہ قرولباغ دہلی

دانہ و دام :- یہ نوجوان اور ہونہار افسانہ نویس راجندر سنگھ صاحب بیدی کے چودہ افسانوں کا مجموعہ ہے جسے مکتبۂ اُردو لاہور نے شائع کیا ہے۔ راجندر سنگھ صاحب افسانہ نویسی کے فن سے خوب واقف ہیں اور ہندوستانی زندگی کی نہایت کامیاب نقاشی کرتے ہیں ان کا یہ مجموعہ قابلِ قدر ہے کاغذ اور طباعت نفیس ۳۰۳ صفحات۔ قیمت مجلد عہ

حاجی لق لق کے افسانے :- حاجی لق لق اپنی مزاحیہ نظموں کے لئے مشہور ہیں اس کتاب میں مکتبۂ اُردو لاہور نے حاجی صاحب کے ۲۴ مزاحیہ افسانے جمع کئے ہیں۔ جو امید ہے کہ دلچسپی سے پڑھے جائیں گے قیمت مجلد ۱۲ر

قوم :- اُردو بک سٹال لاہور نے ۱۳ صفحات کی ایک قومی نظم نفیس کاغذ و کتابت کے ساتھ اس نام سے شائع کی ہے۔ قیمت ۴ر

کیلے کا چھلکا :- سندباد جہازی ایڈیٹر شیرازہ لاہور اُردو کے مسلّم ادیبوں میں سے ہیں ان کا مزاحیہ اندازِ تحریر بے حد مقبول ہے اُردو اکیڈیمی بیرون لوہاری دروازہ لاہور نے اس نام سے ان کے چند مضامین کا مجموعہ سلیقے سے شائع کیا ہے مضامین بہت دلچسپ ہیں حجم ۱۶۷ صفحات قیمت مجلد عہ

نمستے علیکم :- ایم اسلم صاحب مشہور لکھنے والے ہیں یہ ان کے ۱۶ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے حجم ۲۰۰ صفحات قیمت مجلد عہ۔

پتہ :- اُردو اکیڈیمی بیرون لوہاری دروازہ - لاہور

اندھی دُنیا :- حضرت اختر انصاری کے ۲۴- افسانوں کا مجموعہ اس نام سے شائع ہوا ہے۔ بقولِ مصنف "یہ افسانے سماج کے پکّے ہوئے پھوڑے اور تہذیب کے سڑے ہوئے اعضاء پر ایک بید ردنشتر کے کچوکے ہیں یہ افسانے ریاست وسیاست کے بے ایمان ٹھیکیداروں کا پول کھولتے ہیں۔ یہ افسانے ایک مظلوم لیکن بیدار ہوتی ہوئی انسانیت کی پکار ہیں"

افسانے پڑھنے کے قابل ہیں۔ قیمت عہ۔ ناشر: مکتبۂ جہاں نما۔ اُردو بازار دہلی

نازو :- یہ حضرت اختر انصاری کے ۱۴ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ حضرت اختر انصاری بہت کامیاب افسانہ نویس ہیں اُن کے افسانوں کا یہ مجموعہ بھی بہت دلچسپ ہے قیمت مجلد عہ۔ ناشر: مکتبۂ جہاں نما۔ اُردو بازار - دہلی۔

صراط الحمید جلد اوّل و جلد دوم۔ حجم جلد اوّل ۵۰۳ صفحات۔ جلد دوم ۴۰۲ صفحات۔ یہ الحاج صلاح الدین محمد الیاس صاحب برنی ایم اے ایل ایل بی علیگ کا سفرنامہ ہے پہلا حصہ سفرنامۂ مقاماتِ مقدسہ واقع عراق، شام، فلسطین و حجاز ہے۔ دوسرا حصہ سفرنامۂ حرمینِ شریفین واقعہ مکہ معظمہ و مدینہ منورہ ہے۔ دونوں جلدیں مشہور مقامات کی تصویروں سے مزیّن ہیں۔ الیاس برنی صاحب کا اندازِ بیان بیحد دلآویز اور اُن کا سفرنامہ معلومات کا خزانہ ہے قیمت جلد اوّل عہ۔ جلد دوم عہ

پتہ :- پروفیسر محمد الیاس صاحب برنی۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن۔

نئی روشنی :- پانچ ایکٹ کا ایک مزاحیہ ڈراما از فضل الرحمٰن صاحب حجم ۱۵۶ صفحات قیمت عہ۔ ناشر: مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن۔

فلسفۂ برگساں :- مؤلفہ محسن الدین صاحب بی اے ایل ایل بی عثمانیہ۔ برگساں کے نظریات پر وضاحت سے روشنی ڈالی گئی ہے حجم ۹۶ صفحات قیمت عہ۔ ناشر مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

عاصمہ :۔ ایک ناول۔ مصنفہ ابوظفر مولوی موید الدین حسن صاحب۔ اس میں ایک ڈیوڑھی کی کنیز کے سبق آموز واقعات زندگی نہایت دلآویز پیرائے میں بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت عہ۔ ناشر:۔ مکتبۂ ابراہیمیہ۔ حیدرآباد دکن۔

حج زینب :۔ یہ لیڈی ایولن کیبولڈ زینب کے سفرنامۂ حج کا اُردو ترجمہ ہے جو محسن شبّیر صاحب نے کیا ہے مقدمہ نواب سرنظامت جنگ نے لکھا ہے یہ سفرنامہ پڑھنے کے قابل ہے۔ کتابت وطباعت نفیس ۲۷۶ صفحات قیمت مجلد ے۔ ناشر:۔ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن۔

بے انصافی کا انصاف :۔ یہ ایک اخلاقی ڈراما ہے اس کے مصنف پنڈت دیودت شرما بی۔ ایس۔ سی ایل ایل۔ بی وکیل امرت سر ہیں۔ حجم ۲۱۳ صفحات قیمت عہ۔ مصنف سے طلب فرمائیے۔

خبطی :۔ محمد علی صاحب واحدی نے طالب علموں کے متعلق یہ چند افسانے لکھے ہیں۔ ۱۲۰ صفحات قیمت ۸ر۔ پتہ:۔ انوار بکڈپو لکھنؤ۔

قیمتی باتیں :۔ اخلاقی موضوعات پر ایک ایک شعر فیض لدھیانوی نے اس کتاب میں ایسے ایک سو اشعار لکھے ہیں قیمت ۲ر۔ ناجی بکڈپو محلہ دارا شکوہ لاہور

ہندوستان کی صنعت اور تجارت :۔ یہ پُر از معلومات اور نہایت مفید کتاب ہر ہندوستانی کے مطالعہ کے قابل ہے اور اس کے فاضل مصنف منت اللہ صاحب رحمانی ایم۔ ایل۔ اے قوم کے شکریے کے مستحق ہیں۔ ہندوستان کی اقتصادی تاریخ ۱۴۴ صفحات میں بیان کی گئی ہے۔ قیمت درج نہیں۔ پتہ:۔ مکتبۂ سیفیہ مونگیر۔

پیامِ رسالت :۔ ابوالافتخار قاضی محمد رمضان صاحب تبسم قریشی کی یہ تعلیمی نظم ایک خاص رنگ میں لکھی گئی ہے امید ہے کہ اس کی قدر کی جائے گی۔ ۱۶ صفحات۔ حضرت مصنف سے اقبال گنج گجرات (پنجاب) کے پتے سے طلب کیجئے۔

اشکِ خونین :۔ جناب بسمل دہلوی کی نظموں کا یہ مجموعہ ادارۂ ادب لاہور نے شائع کیا ہے۔ قیمت مجلد عہ۔

نادر خطوطِ غالب :۔ مرزا غالب کے ۲۷ غیر مطبوعہ خطوط کا یہ مجموعہ سید محمد اسمٰعیل صاحب رسا ہمدانی گیاوی ٹربل ایم۔ اے گولڈ میڈلسٹ نے شائع کیا ہے کتاب میں غالب کی ایک تصویر شامل ہے یہ کتاب قابل قدر ہے امید ہے کہ پرستاران غالب اسے ہاتھوں ہاتھ لینگے قیمت ۸ پتہ کاشانۂ ادب لکھنؤ

حسن و عشق :۔ اس کتاب میں حسن و عشق کے متعلق قدیم و جدید شعراء کے سیکڑوں شعر جمع کر دیئے گئے ہیں۔ محمد صدیق صاحب خیرآبادی نے اسے مرتب کیا ہے کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں نظر آتی ہیں جن کی اصلاح ہونی چاہیئے۔ حجم ۸۴ صفحات قیمت ۴ر۔ پتہ:۔ محمد صدیق صاحب۔ کارخانۂ عطر محمد زکریا محمد ایوب۔ چوک لکھنؤ۔

سیرتِ بتولؓ :۔ حضرت فاطمہؓ کی یہ سوانح عمری اعجاز الحق صاحب قدوسی نے لکھی ہے مسلمان لڑکیوں کے لئے اس کا مطالعہ بہت مفید ہے قیمت ۶ر۔ پتہ:۔ سلیم اختر صاحب قدوسی۔ نامپلی جدید۔ مکان ۱۳۲۷۔ لال ٹیکری حیدرآباد دکن۔

پنڈت جواہر لال نہرو کا مذہب :۔ اس کتاب میں ہندومت کی تعریف کے بعد یہ ثابت کیا گیا ہے کہ پنڈت جواہر لال لا مذہب یا آزاد خیال نہیں بلکہ ہندوؤں کا غلبہ چاہتے ہیں اور اسلام کو خطرے کی نظر سے دیکھتے ہیں اس کے مصنف شبیہ الحسنین صاحب بدایونی ہیں حجم ۱۱۱ صفحات

قیمت ۵ر ۔ پتہ :- محمد ولی الحسنین صاحب ۔ قاضی محلہ ۔ بدایوں ۔ یوپی ۔

مرقعِ بنارس :- شہر بنارس کی مختصر اور صحیح تاریخ، مساجد، منادر، مقابر اور دوسری زیارتگاہوں کے حالات کتبِ معتبرہ سے لکھے گئے ہیں۔ مرتبہ چودھری نبی احمد صاحب سندیلوی ایم۔ آر۔ اے۔ ایس۔ حجم ۲۳۶ صفحات قیمت عہ ۔ کتاب محنت سے لکھی گئی ہے اور مطالعہ کے قابل ہے۔ پتہ سلطانیہ برقی پریس نظیر آباد لکھنؤ۔

رہنمائے تاریخِ اُردو - حاجی محمد عبدالقادر صاحب نے اُردو شاعری کے فنِ "تاریخ نگاری" کی اس تاریخ میں اصولِ تاریخ نگاری مع مشہور تذئیلات کے درج کئے ہیں۔ اس کے علاوہ شعرائے اُردو کے حالات بھی بیان کئے ہیں کتاب قابلِ قدر ہے حجم ۱۵۰ صفحات قیمت ۱۲ر ۔ معارف پریس اعظم گڑھ سے طلب فرمایئے ۔

غیر ملکوں میں ہمارے ہم وطن Our Countrymen Abroad :- اس انگریزی کتاب کے مصنف دھرم لیش دیو صاحب ہیں جو کانگریس کے اس شعبے کے معتمد ہیں جس کا تعلق غیر ممالک میں مقیم ہندوستانیوں سے ہے۔ پنڈت جواہر لال صاحب نہرو نے دیباچہ لکھا ہے اس کتاب میں اُن مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کا تعلق غیر ممالک میں مقیم ہندوستانیوں سے ہے کتاب پُر از معلومات اور پڑھنے کے قابل ہے۔ حجم ۹۸ صفحات قیمت ۸ر

پتہ :- دفتر آل انڈیا کانگریس کمیٹی ۔ سوراج بھون ۔ الہ آباد ۔

شمعِ ازل :- حضرت اثر زبیری لکھنوی نے اس کتاب میں تاریخِ اسلام کی مقدس ہستیوں کے ولولہ انگیز واقعات بیان کئے ہیں حجم ۲۲۶ صفحات قیمت عہ ۔ پتہ :- زبیر منزل پاٹا نالہ لکھنؤ ۔

تذکرۂ بے نظیر :- مؤلفہ سید عبدالوہاب "افتخار" بہ ترتیب و تصحیح سید علی منظور صاحب ایم۔ اے۔ یہ فارسی زبان کے شعراء کا مشہور تذکرہ ہے۔ جسے الہ آباد یونیورسٹی نے شائع کیا ہے۔ کتاب بہت قابلِ قدر ہے بڑی تقطیع کے تقریباً پونے دو سو صفحات قیمت عہ ۔ پتہ کتابستان ۔ الہ آباد ۔

دولتِ عثمانیہ - مؤلفہ محمد عزیز صاحب ایم۔ اے علیگ ۔ اس کتاب میں سلطنتِ عثمانیہ کے عروج و زوال کی تاریخ اور جمہوریۂ ترکیہ کے کارناموں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ زیر نظر اس کتاب کی جلدِ اوّل ہے جس میں عثمانِ اوّل ۶۸۷ھ سے مصطفیٰ رابع ۱۲۲۳ھ تک کے حالات درج کئے گئے ہیں فاضل مؤلف کی تحقیق و تنقید اور تبحر لائقِ تحسین ہے اُردو میں ایسی کتابیں کم نکلتی ہیں۔ اس کتاب کی قدر نہ کرنا ظلم ہے پہلی جلد کا حجم ۹۰۴ صفحات ہے۔ قیمت درج نہیں ۔ پتہ :- دارالمصنفین اعظم گڑھ ۔

اُردو رسمِ خط :- محمد سجاد مرزا صاحب ایم۔ اے کینٹب نے اُردو رسمِ خط کے متعلق نہایت جامع معلومات کتاب لکھی ہے۔ اس میں اُردو ۔ عربی ۔ فارسی کے قدیم بنیادی رسمِ خط کی بہت سی عکسی تصویریں شامل ہیں یہ کتاب اہل الرائے کے مطالعہ کے قابل ہے قیمت ۸ر پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن ۔

تماشا ۔ ایک دُکھیاری پاپن کی زندگی کا تماشا ۔ ڈراما از کشن پرشاد صاحب کول ۲۱۰ صفحے قیمت عہ ۔ لیڈر پریس الہ آباد ۔

ایثار - ناول از نورالحسن صاحب قیمت ۸ر ۔ پتہ :- انجمن ترقی اُردو حیدرآباد دکن ۔

مطالعۂ حافظ :- (اور اس سے کیا مستنبط ہوتا ہے) از جناب حفی دہلوی ایم اے علیگ ۔ کلام حافظ کا تشریحی مطالعہ بڑی تقطیع ۱۶۰ صفحات ۔ قیمت عمہ ۔ پتہ :- کتب خانۂ علم و ادب دہلی ۔

طلسمِ عمل - از سید مجتبیٰ حسن صاحب بی اے اس کتاب میں زندگی بسر کرنے کے سنہرے اصول بیان کئے گئے ہیں حجم ۲۵۸ صفحات نفیس کتابت و طباعت قیمت عمہ

صہبائے ہند:- حضرت نشور نے مختلف اہم موضوعات پر نظمیں لکھ کر قوم کو پیغام حیات دیا ہے مجموعہ قابل قدر ہے، ۳۴ صفحات قیمت ۸ مجلد ۱۲ پتہ: نامی پریس کانپور

حسرت سیاستدان اور حسرت شاعر:- مولانا حسرت کی شاعری کے متعلق حبیب الرحمن صاحب پیام بی-اے کی یہ کتاب دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے قیمت ۶/ - پتہ:- مکتبہ ابراہیمیہ - حیدر آباد دکن

عقل و جنوں:- مجموعہ نظم حضرت برق موسوی قیمت عہ - پتہ:- مکتبۂ ابراہیمیہ - حیدر آباد دکن

دانائے راز:- از حضرت خاموش علامہ اقبال کی یاد میں لکھی گئی ہے امید ہے کہ اس کی قدر کی جائیگی قیمت ۱۲/- پتہ:- دائرۂ ادب اردو لدھیانہ

اساسات قومیتِ ملتِ اسلامیۂ ہند:- خطبۂ صدارت جناب راغب احسن صاحب ایم-اے- اس کتاب میں برّ اعظم ہند میں قومیتِ اسلام کے اصولِ حیات، داعیۂ استقلال اور اس کے ماضی و حال اور مستقبل پر ایک مومنانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ حجم ۱۹۹ صفحات قیمت درج نہیں سیکرٹری صاحب کلکتہ ضلع مسلم لیگ نمبر ۸ زکریا سٹریٹ کلکتہ

بہاراں:- یہ حضرت اثر لکھنوی کا مجموعۂ کلام ہے حضرت اثر نغز گو شعراء میں سے ہیں ان کا کلام کسی تبصرے کا محتاج نہیں امید ہے کہ اہلِ ذوق اسے ہاتھوں ہاتھ خریدیں گے۔ حجم ۴۷۹ صفحات قیمت ے/- پتہ:- نظامی پریس لکھنؤ

کلیاتِ بحری- مع مقدمہ و تشریح از ڈاکٹر محمد حفیظ صاحب ایم-اے- پی-ایچ-ڈی- آج سے ڈھائی سو سال پہلے کی شاعری کا ایک نمونہ ہے بحری کے کلام پر فاضلانہ تبصرہ کیا گیا ہے اور اس کے حالات پر بہت کچھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب قابلِ قدر ہے۔ ۱۴۱ صفحات قیمت ے/ پتہ: نولکشور پریس لکھنؤ۔

نغمۂ عندلیب:- لالہ گوبند سنگھ صاحب شاہجہان آبادی (۱۲۶۱ھ) کی ایک دلآویز مثنوی ہے چودھری نبی احمد صاحب نے اس کتاب کو مرتب کیا ہے اور سلطانیہ بک ایجنسی نظیر آباد لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔ حجم ۲۳۰ صفحات قیمت درج نہیں

مسلمانانِ ہند کی حیاتِ سیاسی:- از محمد مرزا صاحب دہلوی یہ کتاب ہندوستان میں مسلمانوں کی جماعتی زندگی کے اہم مسائل پر حاوی ہے اس کا مطالعہ ہر سوچنے سمجھنے والے مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ قیمت مجلد ۸/ - پتہ۔ کتب خانۂ علم و ادب دہلی

تجلی: "بحر المعانی" ایم حسن اختر لودیانوی کا مجموعۂ کلام ہے۔ اختر صاحب بہت اچھی قومی نظمیں لکھتے ہیں ان کا کلام زندگی پرور ہے ۱۸۴ صفحات۔ شاعر کی تصویر شامل ہے قیمت غیر مجلد عہ مجلد ۱۲ مصنف سے مالی گنج لودھیانہ کے پتے سے مل سکتی ہے

پاکستان اور مسلمان- انیس الرحمن صاحب نے یہ کتاب پاکستان کے خلاف لکھی ہے حجم بڑی تقطیع کے ۸۶ صفحات قیمت درج نہیں پتہ نامی پریس الہ آباد

جاہ و جلال:- یہ مشہور ڈرامانگار کارل چیپک کے ایک ڈرامے کا ترجمہ ہے جو صوفی غلام مصطفٰے صاحب تبسم کی مترجمانہ قابلیت کا رہینِ منت ہے۔ ڈراما پُر زور اور مصنف اور مترجم کی قابلیت کا گواہ ہے امید ہے کہ اہلِ ذوق اس کی قدر کریں گے حجم ۱۵۲ صفحات قیمت عہ پتہ۔ گورنمنٹ کالج لائبریری لاہور

اُردو شاعری کی مختصر تاریخ:- از جناب محمد جمیل صاحب ایم-اے- قدیم شعراء سے لیکر موجودہ عہد تک کے شعراء کے حالات اور کلام پر سرسری تبصرہ کیا گیا ہے۔ ۲۶۰ صفحات قیمت ۸/ - پتہ: نولکشور پریس- لکھنؤ

عہدِ حاضر کے بڑے لوگ (حصۂ اول):- از محمد مرزا صاحب دہلوی۔ اس جلد میں مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی، مسٹر سی۔ آر۔ داس اور مسٹر محمد علی جناح کے حالات جمع کئے گئے ہیں۔ اندازِ تحریر منصفانہ اور ادیبانہ ہے۔ ۱۲۸ صفحات۔ قیمت ۸؍ پتہ دائرہ ادبیہ دریا گنج دہلی۔

جوہرِ تمثیلات:- رانگھو ناتھ راؤ صاحب جذب وکیل اہلِ اردو کے شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے سنسکرت کے ایک قدیم ترین ادیب کوسم دیو کی "درشٹانت شتک" کا منظوم اردو ترجمہ کر دیا ہے۔ ترجمہ بہت اچھا ہے قیمت ۴؍ مصنف سے عالم پور پوسٹ کرنول کے پتے سے طلب کیجئے۔

خزینۂ تاریخ:- بزمِ تاریخ کلیۂ جامعۂ عثمانیہ کا گلدستۂ مضامین اس میں مختلف تاریخی موضوعات پر طلبہ اساتذہ کے قابلِ قدر مضامین جمع کئے گئے ہیں، ۱۴۷ صفحات قیمت عہ۔ پتہ:- بزمِ تاریخ کلیۂ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔

ہندوستان میں بیکاری و مفلسی اور اس کا علاج:- کتاب کا موضوع نام سے ظاہر ہے ناشر اپل اینڈ کمپنی مری پنجاب قیمت ۱۲؍ ہمایوں کے خریداروں سے ۱۰؍ (مع محصول)۔

یادگارِ نصیر: مجموعۂ انتخابِ کلام مولوی محمد نصیر الدین صاحب علوی مرحوم (ایم۔اے، ایل ایل۔بی) مرتبہ سید ظہور الدین صاحب علوی ایم۔اے (اردو) ایم۔اے (فارسی) ایل ایل۔بی علیگ۔ غزلیہ کلام کے شائقین کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہے قیمت عہ۔ پتہ:- شروانی بک ڈپو۔ علی گڑھ۔

پس پردہ:- یہ جناب چندر بھوشن سنگھ صاحب کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ افسانے دلچسپ ہیں اور زبان قابلِ تعریف۔ امید ہے کہ اس کتاب کی قدر کی جائے گی۔ قیمت ۱۴؍ پتہ: چندر بھوشن سنگھ صاحب۔ فنِ زمانہ کانپور۔

افسانۂ پدمنی:- از جناب محمد احتشام الدین صاحب دہلوی ایم۔اے (علیگ) چتوڑ کی رانی پدمنی سے سلطان علاء الدین خلجی کے عشق کی داستان اور اس کی مؤرخانہ تحقیق۔ کتاب پڑھنے کے قابل ہے۔ ۱۴۸ صفحات قیمت عہ۔ پتہ: کتب خانہ علم و ادب دہلی۔

انی جینا:- مترجمہ ابو القلم دبیر صاحب۔ یونانِ قدیم کی ایک دلچسپ و دلآویز داستان ہے ترجمہ صاف اور سلیس ہے ۸۷ صفحات قیمت مجلد ۱؍ پتہ ابو القلم دبیر صاحب محبوب گنج حیدرآباد دکن۔

انمول کہانیاں:- از شوکت عثمانی صاحب۔ یہ دس قابلِ قدر کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے مصنف کی پہلی کتابیں "روس یاترا" اور "چار مسافر" وغیرہ مقبول ہو چکی ہیں۔ یہ افسانے ایک مخصوص پیغام کی ترجمانی کرتے ہیں اور زبان و بیان کے لحاظ سے بلند پایہ ہیں۔ ۱۳۱ صفحات قیمت ۱۲؍ ناشر: بھارت پبلشنگ ہاؤس۔ آگرہ۔

پاکستان اور ہندوستان: تحریکِ پاکستان کے متعلق سید عبد القدوس صاحب ہاشمی نے یہ نہایت پُر از معلومات کتاب شائع کی ہے۔ حجم ۲۳۵ صفحات۔ قیمت مجلد عا؍ ناشر:- دار الاشاعتِ سیاسیہ حیدرآباد دکن۔

تاریخِ جنوبی ہند:- ہندو مسلم سیاسی تعلقات کی ۵۰۰ سالہ تاریخ کے علاوہ زمانۂ قدیم سے لیکر انگریزی قبضہ تک ہندوستان کے حالات۔ اس کے مصنف محمود خاں صاحب محمود کی کتاب تاریخِ سلطنتِ خداداد میسور اس سے قبل مقبول ہو چکی ہے کتاب متعدد تصاویر سے مزین ہے انداز تحریر محققانہ ہے حجم ۴۲۰ صفحات قیمت ہے پتہ مسلم بکڈپو پیٹرو پارک بنگلور۔

ہندوستانی تہذیب کی تکمیل:- از کالی داس صاحب کپور ایم۔اے ایل ٹی۔ اس کتاب میں ہندوستانی تہذیب کے مختلف عناصر سے دلچسپ تاریخی بحث کی گئی ہے۔ کتاب تصاویر سے مزین ہے۔ ۱۵۰ صفحات قیمت مجلد ۸؍ ناشر: نولکشور پریس لکھنؤ۔

اردو ٹکٹ:- ادارہ اشاعتِ اردو واٹرلو روڈ لکھنؤ نے ہمیں یہ دلچسپ قابلِ قدر اور مفید ٹکٹ بھیجے ہیں جن پر قدیم و جدید علماء و شعراء اردو کی تصویریں ہیں اور ڈاک کے لفافوں کے علاوہ خطوط پر چسپاں ہو کر اردو کا بہت اچھا پروپیگنڈا کر سکتے ہیں۔ یہ اختراع لائق تعریف ہے۔ اردو کے بہی خواہوں کو ادارہ مذکورہ سے یہ ٹکٹ منگوا کر استعمال کرنے چاہئیں۔ اس طرح بہت سے اکابر کی تصویریں بھی حاصل ہو جائیں گی۔

اُردو رسائل وجرائد

مشہور:- اُردو کا ادبی وطبی ماہوار رسالہ ہے۔ مضامین اور ظاہری صورت دلکش ہے قیمت عہ سالانہ۔ پتہ:- ممتاز منزل فراشخانہ دہلی ؛

ندیم کا سالگرہ نمبر ۱۹۴۰ء:- گیا کا یہ مشہور ادبی رسالہ سید ریاست علی صاحب ندوی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے زیرِ نظر اس کا "بہار نمبر" ہے جو بڑے حد محنت سے مرتب کیا گیا ہے۔ صوبۂ بہار نے اُردو کی جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اس نمبر سے اُن کے متعلق پورا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کا حجم ۵۲۴ صفحات ہے۔ اور قیمت ع‌ہ ہے۔ پتہ: دفتر رسالہ ندیم۔ گیا ؛

انڈیا:- یہ ہفتہ وار اُردو اخبار حضرتِ ساقی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ فاضل مدیر اس میں ادبی وسیاسی رنگ کے امتزاج کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ فی پرچہ ار۔ سالانہ چندہ للعہ۔ پتہ:- دفتر انڈیا لاہور ؛

چمنستان:- یہ رسالہ حضرت آغا شاعر دہلوی مرحوم کے فرزند ارجمند جناب آغا سرخوش قزلباش کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ مضامینِ نظم و نثر لطیف اور ادبی معیار بلند ہے۔ یہ رسالہ حضرت آغا شاعر مرحوم کی یادگار کے طور پر جاری کیا گیا ہے اور ہر طرح قابلِ قدر ہے۔ چندہ سالانہ عہ قیمت فی پرچہ ۳ر۔ پتہ:- دفتر رسالہ "چمنستان" دہلی

ادبِ مشرق:- جناب آغا بیدار بخت صاحب خدمتِ ادب کے سلسلے میں بہت نام پیدا کر چکے ہیں۔ ہمیں مسرت ہے کہ عاشق محمد صاحب کی معاونت سے اب اُنھوں نے ایک اچھے ماہوار ادبی رسالے کی ادارت کے فرائض اپنے ذمے لئے ہیں۔ یہ رسالہ بہت ہونہار معلوم ہوتا ہے۔ ادبی و فکاہی مضامین اس کا موضوع خاص ہیں۔ چندہ سالانہ للعہ قیمت فی پرچہ ۵ر۔ پتہ: ادبِ مشرق لاہور

زیب النسا:- یہ ایک اچھا نسوانی رسالہ ہے جس کی ایڈیٹر محترمہ صغرا ہمایوں مرزا ہیں۔ امید ہے کہ خواتین اس کی قدر کریں گی۔ سالانہ چندہ ے۔ فی پرچہ ۴ر۔ پتہ:- دفتر زیب النساء لاہور۔

الندوہ:- اس رسالے کا مقصد مسلمانوں کی ادبی و تعمیری خدمت ہے۔ اس کے عالمانہ انداز کے مذہبی مضامین قابلِ قدر ہیں۔ جب رسالے کے نگراں علامہ سید سلیمان ندوی ہیں تو اس کی خوبی میں کیسے شک ہو سکتا ہے۔ فی پرچہ تین آنے۔ سالانہ چندہ دو روپے۔ پتہ:- دفتر الندوہ۔ بادشاہ باغ لکھنؤ

معلومات:- یہ رسالہ جو احمد الدین صاحب احمد مارہروی کی ادارت میں شائع ہوا ہے اسم بامسمّیٰ کہلانے کے قابل ہے۔ مضامین مفید اور پُر از معلومات ہیں فی پرچہ ۴ر۔ سالانہ چندہ ے۔ پتہ: دفتر معلومات۔ اٹاوہ۔

حاذق:- محمد مجید حسن صاحب مالک مدینہ کا یہ طبّی رسالہ مفید اور پُر از معلومات ہے۔ فی پرچہ ۲ر۔ سالانہ چندہ عہ۔ پتہ: دفتر حاذق۔ بجنور ؛

قرآنی دنیا / مومنہ: یہ دونوں رسائل علی الترتیب ابو محمد مصلح صاحب اور صبیحۃ النساء بیگم صاحبہ کی ادارت میں شائع ہوتے ہیں۔ مقصد ان کے نام سے ظاہر ہے۔ اچھے رسائل ہیں۔ قرآنی دنیا کا چندہ تین روپے اور مومنہ کا ڈیڑھ روپیہ ہے۔ پتہ: تھانہ والا بلڈنگ چکلہ سٹریٹ بمبئی ؛

فہرستِ مضامین

جلد ۳۹ — نمبر ۴

ہمایوں بابت ماہِ اپریل ۱۹۴۱ء

تصویر: ـــــــ شالامار باغ کشمیر (محل میانہ)

قیمت ۸ر

جہاں نما

ہندوستان کے متعلق چند دلچسپ اعداد و شمار

ہندوستان کی کل آبادی (۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق) ۳۵۳۰۰۰۰۰۰ یعنی دنیا کی کل آبادی کا پانچواں حصہ ہے۔

بنگال آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا صوبہ ہے۔ اس کی آبادی ۵۰۱۱۴۰۰۲ ہے۔

صوبجاتِ متوسط میں موت کا اوسط سب سے زیادہ یعنی ۳۳٫۵ ہے۔

آسام میں موت کا اوسط سب سے کم یعنی ۲۳٫۸ ہے۔

مدراس میں عورتوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے یعنی یہاں فی ۱۰۰۰ مرد ۱۰۲۵ عورتیں ہیں۔

پنجاب میں عورتوں کی تعداد سب سے کم یعنی یہاں فی ۱۰۰۰ مرد ۸۳۱ عورتیں ہیں۔

برما میں بچوں کی موت کا اوسط سب سے کم یعنی ۲۳ فی صدی ہے۔

یہودیوں میں سب سے زیادہ بچے پیدا ہوتے ہیں یعنی ہر گھر میں بچوں کا اوسط ۵٫۹ ہے۔

ہندوستان کی اکثریت ہندو مذہب کی پیرو ہے یعنی آبادی کے ہر ۱۰۰۰۰ افراد میں سے ۶۸۲۴ ہندو ہیں

بنگال میں بیواؤں کی تعداد سب سے زیادہ یعنی ۲۲۶ فی ۱۰۰۰ ہے۔

ریاست جموں و کشمیر رقبے کے لحاظ سے ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست ہے لیکن آبادی کے لحاظ سے حیدرآباد دکن کا درجہ کہیں زیادہ بلند ہے

۱۹۳۱ء کی مردم شماری میں ہندوستانیوں کے بعض دلچسپ پیشوں کا انکشاف ہوا مثلاً پیشہ ور شناخت کنندہ گواہ۔ قبرستان کا گداگر۔ موتیوں پہ پانی ڈالنے والا۔ جادو سے وباؤں کو دور کرنے والا۔ زائچہ بنانے والا۔ جادوگر۔ جادوگرنی کین میلیا۔ دانتوں میں سونے کی کیلیں لگانے والا۔ مردہ بیلوں کے سینگ توڑنے والا۔ گندہ خون چوسنے والا۔ جھولا جھلانے والا۔ گھاس کے تنکے بیچنے والا وغیرہ۔

احمدآباد کی میونسپل کمیٹی سب سے قدیم ہے۔ یہ ۱۸۳۴ء میں قائم ہوئی تھی۔

۱۹۲۱ء میں ہندوستان کی آبادی ۳۱½ کروڑ تھی اور ۱۹۳۱ء میں ۳۵ کروڑ سے زیادہ۔

جیکب آباد کا درجہ حرارت گرمیوں میں بعض اوقات سائے میں بھی ۱۲۵° تک پہنچ جاتا ہے۔ اور سردیوں میں صرف ۲۵° تک رہ جاتا ہے۔

چراپونجی میں ۴۶۰ انچ سالانہ بارش ہوتی ہے لیکن سندھ کے بالائی حصے میں ۳ انچ سالانہ سے زیادہ بارش نہیں ہوتی۔

ہندوستان کے صرف ۱۱ فی صدی باشندے شہروں میں رہتے ہیں۔

ہندوستان میں ہر ۱۰۰۰ مرد کے مقابلے میں ۹۴۰ عورتیں ہیں۔

ہندوستان میں موت اور پیدائش کی شرح بہت بلند ہے۔ اس باب میں دنیا کا کوئی مہذب ملک اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

صوبۂ بمبئی روئی کے لئے، پنجاب گیہوں کے لئے اور بنگال سن کے لئے مخصوص ہے۔

برطانوی ہندوستان میں آبادی فی مربع میل ۱۹۶ اور ریاستوں میں ۱۲۳ ہے۔

ہندوستان کے ۷۰ فی صدی باشندوں کا پیشہ زراعت یا اس کے متعلقات ہیں۔

ہندوستان کا زراعتی قرضہ ۹۰۰۰۰۰۰۰۰ روپے ہے۔ یہ رقم ہندوستان کی کل مال گزاری سے ۱۵ گنا زیادہ ہے۔

ہندوستان میں ہر فرد کو تقریباً ایک ایکڑ مزروعہ زمین مل سکتی ہے۔

دنیا بھر کے اَن پڑھ لوگوں کا ¼ حصہ صرف ہندوستان میں ہے۔

ہندوستان کے ۳۵ کروڑ باشندوں میں سے صرف ۲½ کروڑ پڑھ لکھ سکتے ہیں۔

۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۱ء تک ہندوستان کے خواندہ افراد میں صرف ایک فی صدی کا اضافہ ہوا۔

اختر شماری

علم ہیئت کے ماہرین کے اندازے کے مطابق آنکھ کی مدد سے نظر آنے والے ستاروں کی کل تعداد صرف ۷۰۰۰ ہے۔ دوربین کی مدد سے نظر آنے والے ستاروں کی تعداد جے۔ ای۔ گور کے اندازے کے مطابق ۷۰،۰۰۰،۰۰۰ اور پروفیسر نیوکومب اور پروفیسر ینگ کے اندازے کے مطابق ۱۰۰،۰۰۰،۰۰۰ ہے۔ ستاروں کی تعداد کے متعلق جدید اندازہ اس سے بہت زیادہ یعنی ۱،۶۰۰،۰۰۰،۰۰۰ ہے۔

ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کی آبادی

ذیل میں ہندوستان کے اُن شہروں کے نام اور اُن کی آبادی درج کی جاتی ہے جن کے باشندوں کی تعداد ایک لاکھ سے کم نہیں۔

کلکتہ (مع ہوڑہ)	۱۴۸۵۵۸۲	لاہور	۴۲۹۷۴۷
بمبئی	۱۱۶۱۳۸۳	رنگون	۴۰۰۴۱۵
مدراس	۶۴۷۲۳۰	احمدآباد	۳۱۳۷۸۹
حیدرآباد دکن	۴۶۶۸۹۴	بنگلور	۳۰۶۴۷۰
دہلی	۴۷۷۴۴۲	لکھنؤ	۲۷۴۶۵۹

شولاپور	۱۴۴۶۵۴	ناگ پور	۲۱۵۱۶۵
جے پور	۱۴۴۱۷۹	بنارس	۲۰۵۳۱۵
بریلی	۱۴۴۰۳۱	الہ آباد	۱۸۳۹۱۴
ترچناپلی	۱۴۲۸۴۳	سری نگر	۱۷۳۵۷۳
ڈھاکہ	۱۳۸۵۱۸	پٹنہ	۱۵۹۶۹۰
میرٹھ	۱۳۶۷۰۰	مانڈلے	۱۴۷۹۳۲
اندور	۱۲۷۳۲۷	اجمیر	۱۱۹۵۲۴
جبل پور	۱۲۴۳۸۲	ملتان	۱۱۹۴۵۷
پشاور	۱۲۱۸۶۶	راولپنڈی	۱۱۹۲۸۴
امرت سر	۲۶۴۸۴۰	بڑودہ	۱۱۲۸۶۰
کراچی	۲۶۳۵۶۵	مراد آباد	۱۱۰۵۶۲
پونا	۲۵۰۱۸۷	میسور	۱۰۷۱۴۲
کان پور	۲۴۳۷۵۵	سلیم	۱۰۲۱۷۹
آگرہ	۲۲۹۷۶۴		

عشق کے دیوانے

(۱)

ایک شخص نرینک زابوبڈاپسٹ کے ایک بازار میں بے ہوش پڑا ہوا ملا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے پولیس کو بتایا کہ میں ایک مطبع میں کام کرتا ہوں اور میں نے اپنی بے وفا محبوبہ کے نام اور پتے کے ٹائپ کے حروف کو جمانے کے بعد نگل لیا ہے۔ کل ۵ حروف دو کامے اور ایک سیمی کولن تھا۔ ان سب کو اس نے ہلکے زہر کے ایک گلاس کی مدد سے نگلا تھا۔ (نیویارک ورلڈ ٹیلیگرام)

(۲)

پامرہل۔ روڈ آئلینڈ کے ایک سنگتراش جان براؤننگ نے اُن سب لڑکیوں کے قدآدم مجسمے بنا رکھے ہیں جن سے وہ کبھی محبت کر چکا ہے۔ لطف یہ ہے کہ ان مجسموں کو اس نے قبرستان کے سامان میں جگہ دے رکھی ہے۔

(امریکن میگزین)

(۳)

جب ہنیرسٹیاڈچسر اور مار بروکا عاشق ولیم کانگریو (شاعر) مرگیا تو ڈچس نے اس کا ایک قدِ آدم مومی مجسمہ تیار کرایا۔ یہ مجسمہ شاعر سے ہوبہو مشابہ تھا اور اسے ویسا ہی لباس پہنایا گیا تھا جیسا کانگریو اپنی زندگی میں پہنتا تھا۔ یہ مجسمہ میز پر ڈچس کے مقابل بٹھایا گیا تھا۔ جہاں وہ اس سے گھنٹہ بھر باتیں کرتی رہتی تھی۔ ڈچس معینہ اوقات پر شاہی معالج کو بلا کر اس مجسمے کے پاؤں کا معائنہ کرانی کیونکہ کانگریو کو نقرس کی شکایت تھی۔

(افسانہ نگاروں اور شعرا کے عاشقانہ خطوط اور ریکارڈ)

گڑ کے فائدے

مسٹر آر جے ترویدی سابق رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹیز (صوبجاتِ متحدہ) کا بیان ہے کہ گڑ آیورویدک کتابوں کے مطابق ہاضمہ کو درست کرکے جسم کو قوی بناتا ہے۔ یہ سل اور دمہ کے امراض میں مفید ہے۔ مثانے کی تکالیف کو رفع کرتا ہے اور دل کو تقویت بخشتا ہے بعض مصنفوں نے اس کے طبی خواص کو بہت کچھ سراہا ہے۔ عمدہ اور صاف گڑ کے خلاف کوئی شخص کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ ملوں کی صاف کی ہوئی کھانڈ جو بلوری معلوم ہوتی ہے مفید نہیں کیونکہ اس میں سے گلوکوز اور ضروری وٹامنز ضائع ہو چکی ہوتی ہیں۔

ہوائی جہازوں کی یادگار پروازیں

سال	ملک اور طیارے کا نام	ہوا باز اور اس کے ملک کا نام	رفتار فی گھنٹہ
۱۹۰۳ء	ممالک متحدہ امریکا — رائٹ	او. رائٹ (امریکا)	۳۰ میل
۱۹۰۹ء	فرانس — کرٹس	کرٹس (امریکا)	۴۷ میل
۱۹۱۰ء	امریکا — بلیریٹ	لیبلاں (فرانس)	۶۶ میل
۱۹۱۲ء	فرانس — ڈیپرڈسیں	ودریں (فرانس)	۱۰۶ میل
۱۹۱۳ء	فرانس — ڈیپرڈسیں	پریود (فرانس)	۱۲۶ میل
۱۹۱۹ء	امریکا — کرٹس	رافز (امریکا)	۱۶۲ میل
۱۹۲۰ء	فرانس — نیوپور	لی کانتے (فرانس)	۱۹۴ میل
۱۹۲۱ء	" — "	"	۲۰۵ میل
۱۹۲۲ء	امریکا — کرٹس	مچل (امریکا)	۲۲۲ میل
۱۹۲۳ء	"	ولیمز (امریکا)	۲۶۶ میل

سال	ملک اور طیارے کا نام		ہوا باز اور اس کے ملک کا نام	رفتار فی گھنٹہ
۱۹۲۴ء	فرانس	فربوئے	بونے (فرانس)	۲۷۸ میل
۱۹۲۷ء	اٹلی	میکی	ڈی برنارڈی (اٹلی)	۲۹۷ میل
۱۹۲۸ء	"	"	" (")	۳۱۸ میل
۱۹۲۹ء	انگلستان	سپر میرین	آرلیبر (انگلستان)	۳۵۷ میل
۱۹۳۱ء	"	"	سٹینفورتھ (")	۴۰۶ میل
۱۹۳۳ء	اٹلی	میکی	ایگیلو (اٹلی)	۴۲۳ میل
۱۹۳۴ء	"	"	"	۴۴۰ میل
۱۹۳۸ء	جرمنی		جنرل یوڈیٹ (جرمنی)	۴۴۶٫۶۶ میل
۱۹۳۹ء	جرمنی		پی وینڈل (جرمنی)	۴۶۹٫۱۱ میل

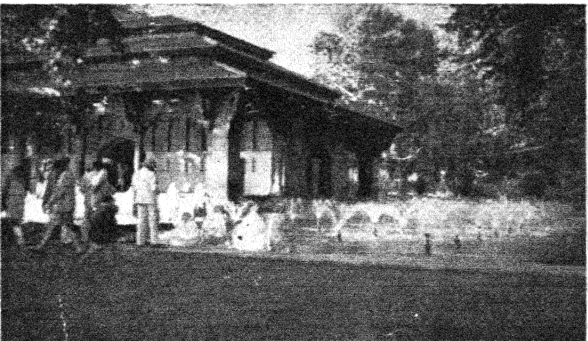
سر شاہ محمد سلیمان

سر شاہ محمد سلیمان جن کی موت پر ۱۲ مارچ ۱۹۴۱ء ملک کے علمی و سیاسی حلقوں میں بہت ماتم کیا گیا ہے ۳ فروری ۱۸۸۶ء کو جونپور میں پیدا ہوئے تھے۔ جونپور اور الہ آباد میں ان کا سکول اور کالج کا زمانہ نہایت امتیاز سے گزرا۔ الہ آباد یونیورسٹی کے گریجوئیٹوں میں وہ اول رہے تھے چنانچہ سرکاری وظیفے کے ساتھ اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان بھیجے گئے جہاں پہنچ کر وہ کرائسٹ چرچ کالج (کیمبرج) میں داخل ہوئے۔ بیرسٹری کی سند حاصل کرنے کے بعد انھوں نے ہندوستان واپس آنے سے پہلے ۱۹۱۰ء میں ڈبلن یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف لاز کی ڈگری بھی حاصل کی ۱۹۱۲ء میں انھوں نے الہ آباد میں وکالت شروع کی اور بہت جلد ممتاز ترین بیرسٹر بن گئے ۱۹۲۰ء میں وہ الہ آباد ہائی کورٹ میں قائم مقام جج مقرر ہوئے اور اس کے بعد ۱۹۲۳ء میں سر محمد رفیق کے جانشین کی حیثیت سے مستقل جج مقرر ہو گئے۔ ۱۹۳۱ء میں وہ قائم مقام چیف جسٹس ہوئے۔ اور ۱۶ مارچ ۱۹۳۲ء کو سر گرموڈ میرز کی جگہ صوبجات متحدہ میں پہلے ہندوستانی چیف جسٹس مقرر ہوئے چیف جسٹس کی حیثیت سے انھوں نے بہت سی مفید قاعدے بنائے جن کا مقصد یہ تھا کہ مقدمات کے فیصلے جلد ہو سکیں۔ علی گڑھ اور الہ آباد کی یونیورسٹیوں کے معاملات میں انھیں بہت دلچسپی تھی۔ سر شاہ سلیمان ۱۹۲۹ء میں نائٹ بنائے گئے تھے انھیں سائنس سے بھی بہت دلچسپی تھی چنانچہ طبیعیات اور زمان و مکان کے نظریئے کے متعلق انھوں نے بہت کچھ چھان بین کی تھی۔ ان دنوں وہ ہندوستان کے فیڈرل کورٹ کے اور علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ ان کی وفات سے ملک میں ایک ایسی جگہ خالی ہوئی ہے جو مدتوں پر نہ ہوگی +

پروفیسر معتضد ولی الرحمٰن کی رحلت

قارئین ہمایوں کو اس اطلاع سے دلی رنج ہوگا کہ ہمایوں کے ایک فاضل مضمون نگار جناب معتضد ولی الرحمٰن صاحب پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن مارچ ۱۹۴۱ء کے پہلے ہفتے میں فالج کے ناگہانی حملے کے باعث رحلت فرما گئے اِنَّا لِلّٰہ وَاِنَّا اِلَیہ راجعون۔ ان کی عمر ۴۲ سال کے قریب تھی ہم دلی رنج کے ساتھ پروفیسر صاحب کی بے وقت موت پر ان کے افراد خاندان سے اظہار ہمدردی کرتے ہیں +

حامد علی خاں



شالامار باغ کشمیر (محل میوانم)

زبان

دوسروں پر اپنے خیال کے اظہار کے لئے انسان کو مختلف ذرائع اختیار کرنا پڑتے ہیں۔ کبھی وہ اشاروں سے مطلب بتاتا ہے، کبھی چیخ پکار سے اپنے غم کو ظاہر کرتا ہے، کبھی شور و غوغا سے خوشی کا اظہار کرتا ہے، کبھی تالی بجا کر کسی کو بلاتا ہے، کبھی الفاظ سے اپنے مدعا کو دوسروں تک پہنچاتا ہے، کبھی نقش و نگار سے جذبات کا اظہار کرتا ہے، کبھی اپنے دلی مقصد کو ظاہر کرنے کے لئے تصویریں بناتا ہے۔ غرض دوسروں تک اپنے خیالات کو پہنچانے کے لئے طرح طرح کے طریقے مختلف زمانوں میں ایجاد ہوتے رہے ہیں۔ اظہارِ خیال کے یہ مختلف ذرائع کیوں اور کس طرح اپنے مقصد کو پورا کرتے ہیں؟ اس کو سمجھنے کے لئے ذرا گونگوں اور بہروں کی دنیا کی سیر کیجیے، پھر آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ کیسے کیسے انوکھے ڈھنگ اپنی مطلب برآری کے ان مجبور انسانوں نے بھی نکال لئے ہیں۔

خدا نہ کرے کہ کبھی ایسا ہو لیکن اگر چند لمحوں کے لئے دنیا کے بسنے والوں کی قوتِ گویائی سلب کر لی جائے تو پھر سوچیے کہ ان کے پاس اظہارِ خیال کا کیا طریقہ ہوگا؟ سوائے اشاروں کے دوسری چیز اس وقت کام نہیں آسکتی کیوں کر کوئی گونگا ہو اور کیوں کوئی بہرا بنے۔ آپ ذرا اپنے رہوارِ زندگی کو دو چار منٹ ٹھہرا کر اس منظر کا خیال کیجیے کہ گہوارۂ طفلی سے باہر آکر کارزارِ حیات میں آپ گامزن ہوئے ہیں اور ابھی چار پانچ ہی منزلیں آپ طے کر پائے ہیں۔ مجاز کو چھوڑ کر حقیقت ملاحظہ فرمائیے کہ اسی منزل پر آپ ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ سامنے مسہری پر والد ماجد آرام فرما رہے ہیں، کمرے کا دروازہ بند ہے۔ آپ کو تاکید کی گئی ہے کہ خبردار سونے میں خلل نہ آنے پائے۔ اتنے میں آپ کے برادرِ بزرگ جو عرصۂ حیات میں آپ سے دو چار منزل آگے ہیں کمرے کا دروازہ کھول کر داخل ہونا چاہتے ہیں۔ اب آپ حیران ہیں کہ کس طرح ان کو کمرے میں آنے سے روکیں یا اگر آنے سے روک نہ سکیں تو کم از کم بات چیت کرنے کے لئے تو منع کر ہی دیں۔ اور بات چیت کرنے کا خود آپ کو بھی حکم نہیں ہے۔ اس لئے سوائے اشارے کے آپ کسی دوسری چیز سے کام نہیں لے سکتے۔ چنانچہ اشارے ہی سے آپ بھائی جان کو منع کریں گے کہ دیکھنا آگے نہ بڑھنا۔ ابا میاں سو رہے ہیں۔ آپ کے بھائی جان پھر آخر آپ سے بڑے ہیں، ابا میاں کو سوتا دیکھ کر وہ خود چپکے سے دروازہ بند کرتے ہیں اور اسی اشارے میں آپ سے کہتے ہیں کہ امی جان صندوق کی کنجی منگا رہی ہیں۔ سوچیے اس مطلب کو بڑے بھائی نے کس طرح ادا کیا ہوگا۔ یقیناً انھوں نے پہلے اپنے دونوں ہاتھوں سے صندوق کو بتایا ہوگا اور اس کے بعد ایک انگلی سے کنجی کا اشارہ کر کے جلدی سے مٹھی کو بند کر کے ہاتھ کو گھمایا ہوگا جیسے سچ مچ وہ کوئی کنجی گھما کر صندوق کھول رہے ہوں۔ آپ بھی پھر اسی اشارے میں جواب دیتے ہیں کہ کمرے کے باہر دالان میں جو کوٹ ٹنگا ہوا ہے اس کی جیب میں کنجی پڑی ہوئی ہے۔

بڑے بھائی اس اشارے کو سمجھ کر باہر جانا چاہتے ہیں کہ آپ پھر ان سے اشارے میں فرماتے ہیں کہ دروازہ آہستہ سے بند کرنا۔ آواز نہ ہونے پائے۔ یہ ہے وہ گُم سُم بات چیت جس سے اپنے بچپن میں ہم میں سے ہر ایک کو دو چار ہونا پڑا ہوگا۔ معاف فرمائیے۔ آپ کا رہوارِ زندگی رک کر گھبرا گیا ہوگا اس لئے اس کو تو آگے چلائیے۔ اور اب توسنِ قلم کی زبان سے زبان کی کہانی سنیئے۔

اشاروں ہی اشاروں میں بات چیت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی بات چیت کے اصول کو واضح کر دیا جائے۔

چپ چاپ بات چیت کے لئے عموماً دو قسم کے اشارے استعمال کئے جاتے ہیں۔ پہلی قسم وہ ہے کہ اس میں جس چیز کا ذکر کیا جاتا ہے وہ حقیقت اس جگہ پر موجود ہوتی ہے جیسے کوئی گونگا جوتے یا ٹوپی کی بابت کچھ کہنا چاہتا ہے تو وہ اس جوتے یا ٹوپی پر ہاتھ رکھ کر یا اس کی طرف انگلی اٹھا کر بتائے گا جس طرح ہم آپ متکلم یا غائب کا ذکر کرنے کے لئے "میں" اور "وہ" کی ضمیر استعمال کرتے ہیں اسی طرح گونگا حاضر و غائب کا ذکر اپنی طرف یا ان کی جانب انگلی اٹھا کر کرے گا۔ سرخ رنگ کا اشارہ کرنے کے لئے ہونٹوں کو بتائے گا اور نیلے رنگ کا ذکر گونگا آسمان کی طرف اشارے سے کرے گا۔ اشاروں میں بات چیت کی قسم دوم نقل ہے جیسے پیاس کے اظہار کے لئے منہ تک ہاتھ لے جا کر پانی پیتے ہوئے دکھانا نیند آنے کا اشارہ کرنے کے لئے سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر اور آنکھوں کو بند کر کے سوتے بن جانا۔ ہاتھ کو ایک خاص قسم کا جھٹکا دے کر گھوڑے یا کوچبان کا ذکر کیا جاتا ہے۔ روشنی کے اظہار کے لئے ہتھیلی پر دو انگلیوں کو رکھ کر رگڑنا اور اس کے بعد ایک انگلی کو کھڑے بڑھا کر موم بتی کی شکل بنانا اور پھر روشنی بجھانے کے لئے اس موم بتی والی انگلی کو پھونک مار کر بجھانا وغیرہ وغیرہ۔

اسی چپ چاپ بات چیت یا اشاروں میں انسان کے مزاج کی مختلف کیفیتوں کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ سردی کا پتہ بدن میں کپکپی پیدا ہونے سے چلتا ہے مسکرا کر خوشی۔ رضامندی۔ مہربانی اور لطف و کرم کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس کے خلاف تیوری چڑھا کر غصہ خفگی اور نارضامندی بتائی جاتی ہے۔ کسی ایک مطلب کو پورے طور پر ظاہر کرنے کے لئے بعض اوقات صرف ایک اشارہ کافی نہیں ہوتا۔ اس لئے دوسرے اشاروں سے بھی مدد لی جاتی ہے۔ جیسے قلم کا ذکر کرنے کے لئے صرف انگلی سے ہتھیلی پر لکھنا کافی نہیں ہوتا۔ اس سے کسی کتاب یا خط کا بھی شبہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے قلم کے لئے انگلی کے اشارے کے سوا اس کو دوات میں ڈبونا۔ اور صاف کر کے رکھنا بھی ضروری ہوگا۔ ان اشاروں سے صاف پتہ چل جائے گا کہ اشارہ کرنے والے کا اصل مقصد قلم کا ذکر کرنا ہی تھا۔

اگر گونگوں کی بات چیت کے طریقوں سے ہمارے سارے مطلب ادا ہو جاتے تو بلا شبہ دنیا کے نہیں تو کم از کم اپنے ملک کے موجودہ آدھے جھگڑوں کا کہیں ذکر بھی نہ ہوتا۔ جب تک انسان نے اپنے اظہار مطلب کے لئے زبان کا استعمال نہ کیا ہوگا وہ بھی درحقیقت گونگا ہی رہا ہوگا۔ ایسے ہی دو گونگے کبھی اشاروں میں بات چیت کر رہے ہوں گے کہ ایک کی پیٹھ پر کسی کوے نے بیٹ کر دی ہوگی۔ وہ گونگا ایک دم سے چیخ پڑا ہوگا "ایں" دوسرے گونگے نے جو یہ آواز سنی ہوگی تو اس کے منہ سے بھی نکلا ہوگا "ایا۔ اہا"۔ اب یہیں سے اشاروں کو چھوڑ کر آوازوں سے کام لیا جانے لگا ہوگا۔ درحقیقت انسان جو بلا وجہ گونگے بنے ہوئے تھے اب زبان کے مزے لینے لگے ہوں گے۔ غم و تکلیف کا اظہار "ایں" "آں" سے ہوتا ہوگا۔ خوشی کا اظہار "اہا" سے ہوتا ہوگا۔ خدا کا شکر ہے کہ تجربوں کی اس وراثت کو ہم بھول گئے ایسا نہ سمجھئے اور بلا تفریق ملک و مذہب و ملت تقریباً ساری دنیا کے آدمی اپنی اپنی زبانوں میں غم و خوشی کا اظہار ان ہی لفظوں میں کرتے ہیں۔ ان بیچارے گونگوں کو بڑی مشکل کا سامنا ہوتا ہوگا جب کہ ان کے کھانے پینے کی چیزوں کو کوئی بلی آ کر بگاڑ جاتی ہوگی۔ ایک فرضی گونگا۔ دوسرے فرضی گونگے کو کس طرح بتاتا ہوگا کہ ایک بلی آ کر اس کا دودھ پی گئی تھی۔ یہ تو وہ بتا سکتے ہوں کہ ایک جانور آیا تھا کیونکہ چوپائے کی چاروں انگلیوں کو ہتھیلی پر رکھ کر جانور کی شکل بنانا مشکل کام نہ ہوگا لیکن دنیا میں اس وقت بھی ہزاروں چوپائے آ چکے ہوں گے۔ اس لئے کسی دوسرے آدمی کا ذہن بلی کی طرف شکل سے منتقل ہوتا ہوگا۔ دودھ اور برتن کے اشارے تو انھوں نے مقرر کر لئے ہوں گے لیکن بلی کا ذکر کرتے ہوئے کسی گونگے کی زبان سے نکل گیا ہوگا "میاؤں"۔ بس اسی وقت سے بلی کے لئے "میاؤں میاؤں" مشہور ہو گیا ہے۔ ابھی تک ہمارے گھروں میں جب بچے بولنا سیکھتے ہیں تو بلی کی آواز سن کر وہ بھی میاؤں میاؤں کہنے لگتے ہیں۔ زبان کی ابتدا گویا یہیں سے ہوئی ہے۔ یہ بات ایک دوسری مثال سے اور بھی واضح ہو جائے گی۔ فرض کیجئے آپ کمرے میں اکیلے ہیں۔ تنہائی کا مونس کوئی بھی نہیں ہے

کشتیٔ عمر کی روانی کا حساب بتانے کے لئے کمرے میں کلاک لٹکا ہوا ہے جس میں سے ٹِک ٹِک کی نہ رکنے والی صدا چلی آ رہی ہے۔ اس صدا دینے والی چیز کا نام کسی نے بعد میں گھڑی یا کلاک رکھا ہوگا لیکن ماہرینِ زبان کا خیال ہے کہ پہلے پہل اس کو ٹک ٹک کے نام سے ہی یاد کیا ہوگا۔ شاید آپ اس کو نہ مانیں تو ایک اور مثال سنئے۔ ریل کے "انجن" کو ابھی تک آپ اپنے بلند اقبال کو اس طرح دکھاتے ہیں کہ دیکھو بیٹے سامنے سے وہ آ رہی ہے "چھک چھک"۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ زبان نے کس طرح آوازوں سے سبق سیکھا یہی آوازیں اور اشارے دراصل ہماری فطری زبان ہیں ضرورت پڑنے پر الفاظ کی ایجاد ہوتی رہی۔

بے جا نہ ہوگا اگر اس موقع پر حضرتِ انسان کے اشاروں اور زبان کی بنیاد ڈالنے والی مندرجہ بالا قسم کی آوازوں کا موازنہ جانوروں کے اشاروں اور آوازوں سے کیا جائے۔ اس سے خدانخواستہ کسی کی توہین مقصود نہیں کہ کوئی یہ سوچنے لگے کہ کہاں مہذب انسان اور کہاں محض جانور۔ موازنہ سے یہ مقصد ہے کہ یہ ثبوت پیش کیا جائے کہ زبان جو ہمارے اظہارِ خیالات کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس کی بنیاد کن چیزوں پر پڑی۔ سب جانتے ہیں کہ جانوروں کے منہ سے جو بے ساختہ آوازیں نکلتی ہیں وہ سب دوسرے جانوروں کے لئے پیغام ہیں جس طرح ہم آپ بیٹھے بیٹھے جمائی لینے لگتے ہیں۔ یا اپنی انگلیاں چٹخاتے ہیں یا کبھی کبھی اپنے آپ ہنسنے لگتے ہیں اسی طرح غیر اختیاری آوازیں اور حرکتیں ان جانوروں سے بھی سرزد ہوتی ہیں جب ننھی ننھی چڑیاں سبزہ زار میں پھدکتی پھرتی ہیں تو اس سے اُن کا مطلب اپنا اظہارِ خوشی ہوتا ہے جب گھوڑا پیٹ بھر کر کھانا کھا چکتا ہے تو وہ اپنے نعلوں سے زمین کریدنے لگتا ہے۔ یا جب جانور کسی تکلیف کی وجہ سے چلاتے ہیں۔ عموماً یہ حرکتیں بے ساختہ بنائی ہیں کہتے ہیں۔ اور جانوروں کی گفتگو کہانیوں میں تو سب ہی سن چکے ہیں کہ چکوے نے چکوی سے کیا کیا کہا لیکن انسان نے تجربے سے بھی اس بات کا پتہ چلا لیا ہے کہ ایک جانور دوسرے ہم جنس تک پیغام رسانی کی بھی کوشش کرتا ہے۔ ایک کوّے کی کائیں کائیں سن کر سیکڑوں کوّے جمع ہو جاتے ہیں۔ کتے کی خلاف معمول بھونکنے کی آواز سن کر اس کے دوسرے عزیز و اقارب بھی بطور اظہارِ ہمدردی جمع ہو کر یقیناً بطرز طرح کے مصرعہ پر غزلیں ارشاد فرما کر مشاعرے میں شامل ہو جاتے ہیں لیکن جانوروں اور انسانوں کی آوازوں میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ اول الذکر صرف چیخ پکار کر رہ جاتے ہیں حضرت اشرف المخلوقات چیخ پکار بعد میں کرتے ہیں۔ پہلے اظہارِ مقصد و مطلب برآری کے لئے نرم الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ جب اپنے کو شکست پاتے ہوئے دیکھتے ہیں تو گفتگو میں تیزی آ جاتی ہے اور چیخ پکار آخری منزل پر ہوتی ہے۔

زمانہ و تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ مختلف ممالک و اقوام میں مختلف زبانیں رائج ہوئیں۔ ان میں سے بہت سی ترقی پا کر ختم ہو چکی ہیں اور بہت کافی ابھی عروج پر ہیں۔ ان زبانوں کی تفصیل یہاں بیان کرنے کا مقصد نہیں ہے صرف یہ سن لیجئے کہ اظہارِ مطلب کے لئے جو اشارے ابتدائے تمدن میں استعمال ہوئے ہوں گے وہ ابھی تک بہت سی متمدن قوموں میں برقرار ہیں کسی زبان کے مقرر کو سنئے اور دیکھئے تو پتہ چلے گا کہ شکریہ ادا کرنے کے لئے وہ اب بھی سرنگوں ہو جاتا ہے تقریر میں زور پیدا کرنے کے لئے گھونسا بناتا ہے۔ اشارہ کرنے کے لئے انگلی اٹھاتا ہے۔ دوست اور دشمن کا شمار انگلیوں پر کرے گا۔ جذبات کے اظہار کے اشارے بھی سب قوموں میں یکساں ہیں آہا۔ اوہ۔ اوہو۔ نہ۔ ہوہ۔ واہ۔ اس قسم کے اشارے اور آوازیں متعدد زبانوں میں اب بھی ایک مطلب ادا کرنے کے لئے استعمال ہوتی ہیں بہت سے لفظ ملتے جلتے بھی ہیں مثلاً ہماری زبان میں کوا سنسکرت میں کاکا اور انگریزی میں کرو۔ ایک ہی جانور کے نام ہیں۔ اپنے یہاں کا ڈھول سنسکرت کا ڈنڈ اور انگریزی کا ڈرم ایک ہی چیز ظاہر کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں کے بہت سے بچے سیٹی کو "پیپنی" کہتے ہیں۔ ملایا کے رہنے والے بھی اپنی زبان میں سیٹی کے لئے "پی پی" کا لفظ لاتے ہیں۔ ارتقائے زبان کی ان تفصیلات میں جانے کا موقع

نہیں ہے۔ چند دلچسپ مثالیں دے کر فی الحال اس مضمون کو ختم کیا جاتا ہے۔ اگر ناظرینِ "ہمایوں" نے دلچسپی کا اظہار کیا تو بشرطِ فرصت دوسرے دل پسند انکشافات بھی پیش کئے جا سکتے ہیں۔

ماہرینِ زبان کا خیال ہے کہ ساری دنیا کی زبانوں کی بنیاد ان آوازوں پر رکھی گئی ہے جو بچے کے منہ سے بے ساختہ نکلتی ہیں۔ دنیا کی کونسی زبان ہے جس میں والدہ کے لئے "ما" کا لفظ شروع میں نہیں آتا۔ انگریزی میں مدر، مامی، ماما۔ فارسی میں مادر۔ فرانسیسی میں میتر۔ عربی میں اُم۔ سنسکرت اور ہندی میں ماتا۔ اور اپنے یہاں ماں ایک ہی ہستی کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ والد کا بھی ان زبانوں میں تقریباً یہی حال ہے۔ بچے کے مُنہ سے اپنے آپ نکلے ہوئے ہزاروں لفظ رائج ہیں۔ جن پر زبان کا دارومدار ہے۔

چند ان الفاظ کی سرگزشت بھی سنئے جنھوں نے اپنے موجودہ نام پائے ہیں۔ گھڑی کے لئے انگریزی میں "واچ" کا لفظ آتا ہے۔ یہ لفظ اب اپنے یہاں عام ہو گیا ہے۔ گھڑی ساز کی جگہ اب "واچ میکر" استعمال ہونے لگا ہے۔ سنئے ٹِک ٹِک سے اس بیچاری بے جان چیز کا نام "واچ" کس طرح پڑا۔ انگریزی میں کسی سوتے ہوئے آدمی کو جگانے کے لئے لفظ ویک (WAKE) آتا ہے۔ سونے والے نے کسی سے کہا کہ مجھکو فلاں وقت جگا دینا۔ وہ جگانے والا "واچ مین" WATCHMAN یا عموماً گھر کا چوکیدار ہوتا ہے۔ اس لئے اس واچ مین سے ہم کو وقت کا اندازہ ہوا کہ اب ہمارے اُٹھنے کا وقت آگیا ہے۔ گھڑی بھی یہی فرض انجام دیتی ہے کہ زندگی کے اوقات کا اندازہ کراتی ہے۔ اب بے جان چیز کو WATCHMAN واچ مین کس طرح کہہ سکتے تھے۔ اس لئے صرف واچ رہا۔

آپ ہنسیں گے اگر میں آپ سے پوچھوں کہ ریل کے ڈبوں کو کونسی چیز کھینچتی ہے۔ آپ ہنسئے نہیں میں خود ہی بتائے دیتا ہوں کہ ریل گاڑی کو انجن کھینچتا ہے۔ سنئے کہ اس دھواں دھار چیز کا نام "انجن" کس طرح پڑا۔ "ان" EN کے معنی سب جانتے ہیں کہ "اندر" کے ہیں۔ دراصل انجن کا دوسرا حصہ یعنی "جن" لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی پیدا ہونے والی چیز کے ہیں۔ اس طرح انجن کے معنی ہوئے "اندر پیدا ہوئی چیز" یا اندرونی طاقت۔ لاطینی جن کا اپنے یہاں کے جن سے بھی مقابلہ کیجئے کہ بہت عرصے تک سیدھے سادے ہندوستانی بھاپ سے چلنے والے انجن کو سچ مچ کا بھوت سمجھتے رہے۔ اس طرح آپ سمجھ جائیں گے کہ کوئلہ اور بھاپ سے چلنے والی چیز کا نام انجن کیوں پڑا۔ اور اگر یوں بھی یقین نہ آئے تو ان کے معنی سمجھ کر کسی ڈکشنری میں GENIUS کے معنی دیکھئے پھر تو آپ انجن کے معنی اور طاقت دونوں کے قائل ہو جائیں گے۔

(ماخوذ)

سید احسن مارہروی۔ ایم۔ اے

غزل

والاشان شہزادہ نواب معظّم جاہ بہادر شجیعؔ (حیدرآباد دکن)

پوچھا ہے مُدّعا نگہِ شرمسار نے
کچھ کہہ دیا ہے اُن سے دلِ بیقرار نے

مٹنا ضرور تھا ترے ترکِ ستم کے بعد
ہم کو بچا لیا ستمِ روزگار نے

تم آؤ یا نہ آؤ نظر محوِ دید ہے
پردے اُٹھا دیئے ہیں غمِ انتظار نے

اُن کا حریمِ ناز کہاں اور ہم کہاں
مجبور کر دیا دلِ بے اختیار نے

ہر جلوہ اک حجابِ نظر بن کے رہ گیا
لُطفِ نظر بھی لُوٹ لیا حُسنِ یار نے

وعدہ تو کر گئے ہو مگر یہ خبر نہیں
دُنیا سے کھو دیا ہے ہمیں اعتبار نے

پہلا سا خوابِ ہوش کا عالم کہاں شجیعؔ
کھولی ہے آنکھ بے خودئ انتظار نے

ایک جج کی ڈائری

وہ ایک جج تھا جس کی راست بازی کا ہر شخص قائل تھا اور جس کی زندگی نوجوان وکیلوں کے لئے قابلِ تقلید نمونہ سمجھی جاتی تھی۔ تمام وکلا اور دوسرے جج اس کا بہت احترام کرتے تھے۔ اس نے اپنی ساری زندگی مجرموں کی تلاش اور کمزوروں کی امداد کے لئے وقف کر دی تھی۔ بدمعاشوں اور خونیوں کا اُس سے بڑھ کر دشمن اور کوئی نہ تھا۔ وہ بدمعاشوں اور خونیوں کے صحیح جذبات و خیالات کا پتہ اُن کی روح کی گہرائیوں میں پہنچ کر لگا لیتا تھا اور ان کے چھپے ہوئے رازوں کو اُن کے چہرے پر ایک نگاہ ڈال کر معلوم کر لیتا تھا۔ جب ہی سال کی عمر میں وہ اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا تو ہر ممکن طریق سے اس کی عزت و تکریم کا حق ادا کیا گیا اور ساری قوم کے رنج و ماتم کے درمیان اس کو قبرستان لے جایا گیا۔ ہر شریف انسان نے اس کے جنازے پر آنسوؤں کے پھول برسائے اور اپنی محبت اور احترام کا اظہار کیا۔

لیکن کیا حیرت کی بات ہے کہ اس کی میز میں علاوہ اور کاغذات کے مندرجہ ذیل ڈائری بھی ملی جس کا عنوان تھا "کیوں ؟"

"۱۰ مارچ ۱۸۵۶ء میں ابھی ابھی کورٹ سے نکلا ہوں مجرم کو موت کی سزا کا حکم سنایا جا چکا ہے اور میں یہ جاننا چاہتا تھا سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں اس شخص نے اپنے پانچ بچوں کو مار ڈالا کیسی تلخ حقیقت ہے! انسان کو اس قسم کے کتنے ہی آدمیوں سے سابقہ پڑتا ہے جو کسی کی زندگی کو برباد کر ڈالنے میں ایک قسم کی خوشی محسوس کرتے ہیں۔ ہاں معلوم ہوتا ہے کہ ایسا کرنا خوشی کا باعث ہوتا ہے! ہلاک کرنا! ٹھیک ہے! تباہ کرنا! مقصدِ قدرت سے کتنا نزدیک ہے تعمیر و تخریب ان ہی دو لفظوں میں کائنات کی پوری تاریخ پنہاں ہے۔ آخر کسی کو مار ڈالنے میں مسرت کیوں ؟

"۲۵ جون: یہ سوچنا کہ اس صفحۂ زمین پر ایک ہستی ہے جو چلتی اور دوڑتی ہے اسراسر مہمل ہے ہستی؟ کون سی ہستی؟ وہ کونسی جاندار اور سانس لینے والی چیز ہے جو اصولِ حرکت کو مجسم کرتی ہے اور ایک قوت رکھتی ہے جو تمام حرکات پر قابو رکھتی ہے؟ اس چیز کی کوئی بنیاد نہیں۔ اس کے قدم زمین پر موجود نہیں۔ یہ زندگی کا ایک بیج ہے جو زمین میں ڈال دیا گیا ہے اور زندگی کا یہ بیج جو میں نہیں جانتا کہ کہاں سے آتا ہے اپنے دل کی مرضی سے برباد کیا جا سکتا ہے اور یہی اس کا انجام ہے۔

"۲۶ جون تو پھر، کیا قتل کرنا واقعی جرم ہے؟ خصوصاً جب ہم یہ جانتے ہیں کہ تخریب قانونِ قدرت ہے۔ ہر جاندار کے لئے دوسرے کی جان کا لینا لازمی و لابدی ہے ہم دوسروں کو مارتے ہیں خود زندہ رہنے کے لئے لیکن محض کسی کی جان لینے کی خاطر بھی تو خون کیا جاتا ہے۔ ہاں خون کرنا انسان کی سرشت میں داخل ہے انسان مجبور ہے۔ ایک جانور دوسرے جانور کی تاک میں ہر وقت لگا رہتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کا ہر لمحہ دوسرے کمزور جانوروں کو ہلاک کرنے میں صرف کرتا ہے۔ آدمی بھی دوسرے آدمیوں کی جان لیتا ہے کسی مالی منفعت کے لئے نہیں بلکہ ہلاک کرنے میں اس کو خوشی

حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اس نے شکار کرنے کا طریقہ ایجاد کیا ہے۔ ایک بچہ جو بھی چھوٹا موٹا کیڑا یا چڑیا اس کے ہاتھ پڑ جائے اسے مار ڈالتا ہے لیکن جذبات کی تسکین کے لئے یہ کافی نہیں، صرف جانور کو مار ڈالنا کافی نہیں ہم کو اپنے ساتھیوں کو بھی ہلاک کرنا چاہئے۔ قدیم زمانے میں جذبات کی اس پیاس کو انسانی قربانیوں کے خون سے بجھایا جاتا تھا لیکن اب ایسا کرنا ممکن نہیں۔ اب ایسا کرنے والوں پر مقدمہ چلایا جاتا ہے۔ اور سزا دی جاتی ہے لیکن چونکہ ہم قانونِ فطرت کو توڑ کر زندہ نہیں رہ سکتے۔ اس لئے ہم اکثر جنگ چھیڑ دیا کرتے ہیں جس میں ایک قوم دوسری قوم کے خون کی ندیاں بہا دیتی ہے اور تباہی و بربادی کا خمیازہ شہریوں کو اٹھانا پڑتا ہے جن میں عورتیں بھی ہوتی ہیں اور بچے بھی جو لڑائی کے دنوں میں شام کے وقت جب چراغ جل جاتے ہیں تو قتل و غارت گری کے شان دار کارناموں کی داستانیں پڑھتے ہیں۔

ممکن ہے کسی کے دل میں یہ خیال گزرے کہ اس قسم کے لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے ہرگز نہیں، بلکہ ایسے لوگوں کی عزت افزائی زیادہ سے زیادہ کی جاتی ہے۔ ان کو تمغے ملتے ہیں، انعامات ملتے ہیں اور خطابات سے ان کو نوازا اور سرفراز کیا جاتا ہے جب وہ گلیوں میں سے اپنے خونی ہتھیاروں کے ساتھ گزرتے ہیں تو انھیں دیکھ کر شہریوں کو رشک آتا ہے قتل و غارت گری، ہلاکت و بربادی! یہ قدرت کا اٹل قانون ہے جو ہر جان دار کے دل میں نقش ہے، کسی کی جان لینے سے زیادہ دنیا میں اور کوئی شان دار اور شریفانہ فعل نہیں،

"۳۰ر جون ،تم کو خون کرنا چاہئے، یہ قانون قدرت نے بنایا ہے کیونکہ وہ دائمی بہار کو پسند کرتی ہے۔ اس کے ہر غیر ارادی فعل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہی چلاتی ہے۔

جلدی کرو، جلدی کرو، جلدی کرو،

جس قدر جلد وہ تخریب کرتی ہے۔ اسی قدر جلد تعمیر کرتی ہے۔

"۲ جولائی، انسان! انسان کیا ہے؟ سب کچھ اور کچھ بھی نہیں۔ جو کچھ ہے اور جو کچھ ہوتا رہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمی بجائے خود ایک مستقل دنیا ہے جو ایک دوسری بڑی دنیا میں رہتا ہے لیکن انفرادی بے قدری اور ناچیزی کا اندازہ لگانے کے لئے تم کو دنیا کا سفر کرنا پڑیگا ایک جہاز میں بیٹھ کر کہیں کا سفر کرو، ساحل آدمیوں کے ہجوم سے گلزار نظر آئے گا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد تم دیکھو گے کہ وہاں سوائے خشک ساحل کے اور کچھ بھی نہیں۔ آدمیوں کا ہجوم غائب ہو چکا ہے۔ اتنا ذلیل! اتنا ناچیز! یہ ہے آدمی۔ ایک ریل میں بیٹھ کر ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں جاؤ اور کھڑکی میں سے سر نکال کر دیکھو تو تم کو ہر جگہ آدمی ہی آدمی نظر آئیں گے ان گنت۔ لاتعداد کھیتوں میں، میدانوں میں، پہاڑ کی وادیوں میں ہر جگہ آدمی نظر آئیگا مُردہ دل کسان کا منتہائے نظر صرف کھیتوں کو پانی دینا اور غلہ پیدا کرنا ہے۔ بدشکل عورتیں جن کا مقصدِ حیات کھانا پکانا اور بچے جننا ہے۔ یورپ جاؤ۔ امریکہ جاؤ، وہاں بھی تم کو لاکھوں کی تعداد میں آدمی نظر آئے گا۔ لاکھوں پیدا ہوتے ہیں۔ زندہ رہتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ اور مرنے کے بعد اتنا ہی نشان اپنا چھوڑ جاتے ہیں جتنا قدموں کے نیچے آکر مر جانے والی ایک چیونٹی۔ افریقہ جاؤ، عرب میں جاؤ، ہر جگہ تم کو یہی تماشا نظر آئے گا کہ انسان کی انفرادی حیثیت کوئی حقیقت نہیں رکھتی نسل کی وقعت ہوتی ہے۔ ہاں تم دنیا کے کسی گوشے میں چلے جاؤ اور لاتعداد ان گنت انسانوں کو دیکھو، ان گنت؟ ہاں یہی تو اصلی راز ہے۔ مارنا جرم ہو گیا ہے اس لئے کہ ہر شخص کا نام رجسٹر میں موجود ہوتا ہے۔ بچہ پیدا ہوا اور دفتر میں اس کا نام چڑھ گیا اور پھر قانون اس کی جان کی حفاظت کو اپنا فرض سمجھتا ہے

دیکھا! جس کا نام رجسٹر میں نہیں اس کو تم جب چاہے مار ڈالو۔ جہاں چاہے مار ڈالو۔ کوئی تم سے پوچھنے والا نہیں۔

تو گویا انسان کی جان سے زیادہ قیمت اس رجسٹر کی ہے جس میں اس کا نام درج ہوتا ہے۔

۳ جولائی آدمی کو مار ڈالنے میں ایک دلچسپ اور تلخ مسرت حاصل ہوتی ہوگی۔ ایک آدمی دوسرے آدمی کو پکڑتا ہے، زمین پر گراتا ہے، اس کے جسم کے کسی حصے میں سوراخ کرتا ہے جس کے ذریعے سے خون نکلنا شروع ہوتا ہے اور پھر...... ہاں پھر سوائے ایک تودہ گوشت کے اور وہاں کیا رکھا ہے؟

۵ اگست تو اگر میں، جس کی ساری عمر مجرموں اور قاتلوں کے مقدموں کی روئداد سننے اور ان کو سزا دینے اور پھانسی پر لٹکانے میں گزری ہے۔ اس لئے کہ انھوں نے اوروں کو چاقو سے مارا، ہاں اگر میں بھی اسی طریقے پر عمل کروں تو کسی کو کیا معلوم ہوگا؟

۱۰ اگست، کسی کو کیا معلوم ہوگا! مجھ جیسے آدمی پر کون شبہ کر سکتا ہے؟ ....

۱۵ اگست، خواہش، آرزو، ترغیب، قتل کی خواہش، آرزو، ہوس میرے دل و دماغ پر چھا رہی ہے، یہ میرے سارے جسم میں سرایت کر رہی ہے، اس نے میری روح پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور اب میرے دماغ میں سوائے قتل و خون کے اور کوئی خیال نہیں۔ اب میری آنکھیں خون دیکھنا چاہتی ہیں میرے کان وہ آخری دردناک چیخ سننا چاہتے ہیں جو انسان کے منہ سے مرنے سے پہلے نکلتی ہے، اب میرے ہاتھ قتل کی آرزو میں کانپ رہے ہیں! قتل! کتنا شریفانہ فعل ہے! کتنا عجیب و غریب اور کتنا دلچسپ!!

۲۲ اگست، اب کسی قسم کا انتظار میرے لئے ناقابل برداشت تھا، تجربہ کے طور پر میں نے ایک چھوٹے سے جانور کی جان لی ہے۔ میرے نوکر لطیف نے ایک مینا پال رکھی تھی میں نے لطیف کو ایک کام سپرد کر کے باہر بھیج دیا۔ اور چڑیا کو پنجرے میں سے نکال کر اپنے ہاتھ میں پکڑا۔ ہاں میں اس کے قلب کی حرکت کو اچھی طرح سن سکتا تھا۔ میں اسے لے کر اپنے کمرے میں آیا۔ رہ رہ کر میں اس کی گردن زور زور سے دباتا تھا۔ اس کے قلب کی حرکت تیز تر ہوتی گئی میں اس کی گردن مروڑ کر مار سکتا تھا لیکن پھر خون کیسے دیکھتا۔ اس لئے میں نے اس کی گردن نہیں موڑی میں نے ایک چاقو لیا۔ اور اس کے ننھے جسم میں ایک چھوٹا سا سوراخ کر دیا۔ ہاہا خون بہنے لگا۔ اور میں اس نظارے سے حظ اٹھا رہا تھا کتنا خوبصورت خون، سرخ! صاف!! میرے دل میں اس خون کو پینے کی آرزو پیدا ہوئی میں نے ذرا سا زبان پر رکھ کر چکھا بھی۔ آہ، کیسا مزے دار تھا! لیکن یہ ایک ننھی سی چڑیا کا خون تھا، ایک بیل کا خون کتنا مزے دار ہوگا! اس کے بعد میں نے وہ کیا جو قاتل کیا کرتے ہیں میں نے چاقو کو دھویا۔ اپنا ہاتھ دھویا اور پانی کو پھینک دیا۔ اور پھر اس ننھی چڑیا کے جسم بے جان کو باغ میں لے جا کر ایک درخت کی جڑ کے پاس دفن کر دیا کسی کو اس کا پتہ نہیں چل سکتا۔ لطیف بہت رویا۔ اس نے سمجھا کہ اس کی مینا پنجرہ سے بھاگ گئی۔ وہ مجھ پر کبھی شک کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ہاہا!

۲۵ اگست، میں ایک انسان کی جان لینا چاہتا ہوں میں ضرور ایک انسان کی جان لوں گا۔ لوں گا۔ اور ضرور لوں گا۔

۳۰ اگست، میں نے اپنا ارادہ پورا کر لیا کیسی معمولی بات! ایک روز میں جنگل میں سیر کرنے کے لئے نکل گیا۔ اس وقت میرے دماغ میں کوئی خیال نہ تھا میں نے دیکھا کہ ایک بچہ، ہاں ایک چھوٹا سا لڑکا، ہاتھ میں روٹی کا ایک ٹکڑا لئے چلا آ رہا ہے جب وہ میرے قریب پہنچا تو اس نے مجھے

سلام کیا۔ فوراً میرے دل میں اس کے مار ڈالنے کا خیال پیدا ہوا۔

"تم بالکل اکیلے ہو لڑکے؟"

"جی ہاں۔"

"بالکل اکیلے، تمھارے ساتھ اور کوئی نہیں؟"

"جی نہیں۔"

اُس کے مار ڈالنے کا خیال۔ اب میرے دماغ میں پختہ ہوگیا۔ میں نے اس کی گردن زور سے پکڑ لی ...... اور پھر .... ہاں زور سے دبانا شروع کیا۔ وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ایسی ڈراؤنی ہوگئی تھیں کہ میرے دل میں خوف پیدا ہوا۔ اُف! وہ گول گول دہشتناک آنکھیں!! لیکن افسوس چند ہی سکنڈ میں اس کا ہاتھ پاؤں مارنا بند ہوگیا۔ میں نے اُس کے مردہ جسم کو وہیں پاس کی ایک کھاڑی میں پھینک دیا اور اس پر گھاس ڈال دی۔

میں گھر گیا اور نہایت مزے کے ساتھ کھانا کھایا۔ کسی کو مار ڈالنا کتنی معمولی سی بات ہے۔ اس رات میں بے حد خوش و خرم تھا اور میرے دوستوں نے میری خوش گپی اور خوش طبعی کی بے حد تعریف کی۔

لیکن میں نے اس کا خون تو دیکھا ہی نہیں۔ بہرحال مجھے خوشی ہے۔

"۳۱ اگست، اس لڑکے کی لاش ملی۔ پولیس قاتل کی تلاش میں ہے۔ ہا ہا!!

"یکم ستمبر، دو آوارہ گردوں کو گرفتار کرلیا گیا ہے لیکن ان کے خلاف کوئی شہادت نہیں ملتی۔

"۲ ستمبر، مقتول کے والدین مجھ سے ملنے کے لئے آئے۔ اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا رہی تھیں۔ ہا ہا!

"۷ اکتوبر، قاتل کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کسی آوارہ گرد نے یہ کام کیا ہوگا۔ ہا ہا! کاش میں اس کے جسم سے لہو بھی بہتا ہوا دیکھ پاتا!

"۱۸ اکتوبر، خون کرنے کا چسکا اب میری رگ رگ میں سرایت کرچکا ہے۔ یہ خواہش بھی جنونِ عشق کی طرح ہے۔

"۲۰ اکتوبر، دوسرا شکار! لنچ کھاکر میں دریا کے کنارے ٹہلنے چلا گیا۔ وہاں دیکھا تو ایک ماہی گیر ایک درخت کے سایہ میں پڑا سو رہا ہے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ وہیں پاس کے ایک کھیت میں مجھے ایک پھاوڑا نظر آیا۔ میں اسے اٹھالایا۔ اور اس سے اس ماہی گیر پر ایک ایسا زبردست وار کیا کہ اس کا بھیجا نکل پڑا۔ آہ! اس مرتبہ خون کی کمی نہیں تھی۔ لال لال خون تیزی سے بہ رہا تھا، اور پانی میں جاکر مل جاتا تھا۔ میں چپ چاپ وہاں سے چل دیا۔ غرض کہ کوئی مجھے دیکھ لیتا! آہ میں کتنا قابلِ تعریف قاتل گنا جاتا!

"۲۵ اکتوبر، ماہی گیر کے قتل نے شہر میں ایک سنسنی پھیلا دی ہے، اس کے بھتیجے پر جو اس کے ساتھ مچھلیاں پکڑنے گیا تھا قتل کا الزام لگایا جاتا ہے۔

"۲۶ اکتوبر، مجسٹریٹ نے اس کے بھتیجے کو ملزم قرار دے دیا۔ شہر کے ہر شخص نے اس کو صحیح تسلیم کرلیا! ہا ہا!!

"۲۷ اکتوبر، بھتیجے نے اپنی صفائی میں بہت معمولی باتیں پیش کیں۔ وہ کہتا ہے کہ میں گاؤں میں روٹی لینے کے لئے گیا تھا۔ اور قسم کھاتا

ہے کہ میرے چچا کا قتل میری غیر حاضری میں ہوا لیکن اس کا یقین کون کرے ؟

"۲۸ اکتوبر۔ بھتیجے کو بجلی کے ذریعے سے تکلیف پہنچائی گئی اور بہت زیادہ تکلیف ، اور اس نے تقریباً اقبالِ جرم کرلیا انصاف ! ہا ہا !!

"۵۔ نومبر۔ آج بھتیجے کے خلاف مقدمہ کی شان دار پیشی ہے۔ وہ اپنے چچا کا وارث تھا۔ میں اس کا صدر جج رہوں گا۔

"۲۵ جنوری۔ موت ، موت ، موت ، میں نے اسے پھانسی کی سزا دی۔ ہا ہا ! ایڈووکیٹ جنرل نے ایک فرشتے کی طرح مقتول کی حمایت میں بحث کی۔ دوسرا شکار ! میں اس نوجوان کو پھانسی کے تختے پر لٹکتا ہوا دیکھنے کے لئے جاؤں گا۔

"یکم مارچ۔ ختم ، اس کو آج صبح پھانسی ہو گئی۔ خوب اس کا خاتمہ ہوا ، قابل داد ! مجھے وہ منظر دیکھ کر بڑی مسرت حاصل ہوئی۔ آدمی کے سر کو کٹتے ہوئے دیکھنا یقیناً قابلِ دید منظر ہے۔ خون اپنی پوری تیزی کے ساتھ بہ نکلا۔ کاش میں اس میں نہا سکتا ! کتنا لطف آتا اگر میں اس میں اپنے جسم کو ، بالوں کو اور چہرہ کو تر کرتا اور پھر سر سے پیر تک لال لال ہو کر نکلتا۔ کاش ان لوگوں کو معلوم ہوتا !!

"اب مجھے بس کرنا چاہیئے۔ کاغذ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا میری گرفتاری کا باعث ہو سکتا ہے"

اس کی ڈائری میں اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تھا لیکن کسی جرم سے متعلق نہیں۔ ایک بیرسٹر نے جس کو یہ کاغذات مخفی طور پر دکھلائے گئے تھے ، کہا کہ دنیا میں اس قسم کے پاگل بہت ہیں۔ اتنے ہی خطرناک ، جنتی اور جنونی جتنا کہ یہ پاگل جج تھا۔ اور وہ پاگل ہم میں رہتے ہیں۔ اور کوئی ان پر شک بھی نہیں کرتا"

ماخوذ از موپساں

عبدالرزاق قریشی

غزل

فصلِ گل آئی کھلا غنچۂ ارماں اپنا
ہاتھ اپنا ہے ، جنوں اپنا ، گریباں اپنا

مجھ بلا نوش کا قفلِ درِ مقصود کھلے
بادہ اپنا ہو ، خم اپنا ہو ، خمستاں اپنا

اس محبت میں کہاں ہوشِ تن آسانی کا
نہیں منت کشِ جامہ تنِ عریاں اپنا

وہ ستم کیش وفا پر نہ ہو مائل تو نہ ہو
بےکسی اپنی ، غم اپنا ، دلِ ناداں اپنا

کیا جگہ پائے خوشی دل میں ہمارے تنویرؔ
اک نہ اک دردِ نیا رہتا ہے مہماں اپنا

سید عبدالغنی تنویرؔ کولار (میسور)

رہزنی یا رہبری

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی (غالب)

سمجھ میں آئے گا اک عمر کے بعد
میں جو کچھ ہم نشیں سمجھا رہا ہوں

نہ جا اِن کفر کی باتوں پہ میری
یہ حق کے گیت ہیں جو گا رہا ہوں

اُلجھتا ہوں زبوں عقلوں سے جتنا
خود اپنے سے اُلجھتا جا رہا ہوں

بہ شکلِ رہبری ہر قافلے کو
حقیقی راستے پر لا رہا ہوں

تفکّر چھا رہا ہے مجھ پہ جتنا
میں اتنا زندگی پر چھا رہا ہوں

بغاوت کی ہوا کے بازوؤں پہ
وفا کی سمت اُڑتا جا رہا ہوں

ہوائے تند سے لڑتا جھگڑتا
گھٹا کی طرح گھِرتا جا رہا ہوں

جسے یوں کھو رہا ہوں ہر قدم پر
اُسی کو ہر نفس میں پا رہا ہوں

اُسی کے بُعد پر نازاں ہوں اتنا
اُسی کے قُرب پر اِترا رہا ہوں

اُسی کے رمز سے آگاہ ہو کر
اُسی کی بات کو جھٹلا رہا ہوں

اُسی کے نام کو تاریک کر کے
اُسی کی ذات کو چمکا رہا ہوں

جوشؔ ملیح آبادی

غزل کے جدید رجحانات پر ایک سرسری نظر

متاخرین کے دور دوم میں لکھنؤ کی شاعری پر ناسخی رنگ چڑھا ہوا تھا۔ امیر نے اسے خوش نما بنا دیا لیکن جذبات کی نازک تکمیل یہاں بھی زیادہ نہ ہو سکی جلال نے البتہ لکھنوی لباس میں دہلی کے حسنِ معنی کو پیش کیا۔ اور اس طرح غزلِ جدید کے لئے راہ کھول دی۔ دہلی میں داغ نے بالکل نیا تغزل شروع کیا۔ جو نہ صحیح معنوں میں لکھنوی ہی ہے اور نہ دہلوی۔ اس میں دہلی کا سوز و گداز نہیں لیکن جذبات ہیں لکھنؤ کا سا تصنع نہیں لیکن ابتذال ہے۔ شوخی و شیرینی سب سے بڑھی ہوئی ہے۔ حالی نے جو پچھلی باتوں سے بھی باخبر تھے اور نئی تبدیلیوں سے بھی آشنا، جدید اردو غزل کا سنگِ بنیاد رکھا۔

اس وقت مغلیہ حکومت کا علم سرنگوں ہو چکا تھا۔ اور تمام ملک میں انگریزی تسلط کی بنیادیں استوار ہو چکی تھیں۔ سیاسی نظام کے بدلنے سے تمام اجتماعی اور معاشرتی نظام متزلزل ہو چکا تھا۔ اس وقت زندگی کی دوبارہ تنظیم نظریات میں ضروری تبدیلی اور نئی باتوں سے تطابق اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی سخت ضرورت تھی جن میں یہ نیا زاویۂ نگاہ پیدا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ یا جو اپنی پرانی دنیا کو چھوڑنے کے لئے آمادہ نہیں تھے وہ ریاستوں میں چلے گئے مثلاً امیر و داغ لیکن حالی زمانہ شناس اور دوراندیش تھے۔ انھوں نے رسمیات سے ہٹ کر ایک نئی راہ نکالی۔ مشاہدہ اور غور و فکر سے کام لیا۔ اور پیش نظر حالات اور واقعات کو اپنا موضوعِ شاعری بنایا۔ معاشرہ کی عظمتِ دیرینہ اُن کی آنکھوں کے سامنے مٹ رہی تھی۔ انھوں نے قوم کو اس کا احساس دلایا۔ اور بعض بعض غزلیں تک اسی تلقینی رنگ میں لکھیں۔

یہ زمانہ سائنس و عقلیات کی ترقی اور مغربی فکر و خیال سے روشناسی کا بھی تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جذبات و معاملاتِ حسن و عشق میں اعتدال برتا جانے لگا اور ادنیٰ خیالات اور بازاری معاملات ممنوع الاظہار قرار دئے گئے۔ تصوّف کا عنصر بہت کم ہو گیا۔ مطالعۂ فطرت اور رفعتِ فکر پر زور دیا جانے لگا اور حیات اور وجدانیات کی ایک دنیا تعمیر کی جانے لگی یہی وجہ ہے کہ حالی کی غزلوں میں جدید معنویت اور نئی ذہنیت کارفرما ہے۔ قدیم کلام میں بھی شیفتہ جیسے اصلیت پسند شاعر کا رنگ جھلکتا ہے۔ ذیل کے اشعار حالی کی واقعیت پسندی کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں:-

کہنے کی بات ہو تو اسے کہہ سنائیے ۔۔۔ جو دل پہ بن رہی ہو۔ وہ کیونکر دکھائیے

دنیا کی ہو ہوس تو دل و دیں گنوائیے ۔۔۔ یاں کھوئیے بہت سا تو کچھ جا کے پائیے

یہ کیا کہ دل ہے دیر میں اور کعبے میں مقام ۔۔۔ ہو رہیے بس وہیں کے جہاں دل لگائیے

اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق ۔۔۔ رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور عالم میں تم سے لاکھ سہی، تم مگر کہاں
یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر تھا اُس کو مجھ سے ربط، مگر اس قدر کہاں

اب وہ اگلا سا التفات نہیں جس پہ بھولے تھے ہم وہ بات نہیں
کوئی دل سوز ہو تو کیجے بیاں سرسری دل کی واردات نہیں

اسی طرح اکبر کی غزلوں کا بھی لہجہ بعد میں بالکل بدل گیا۔ ان کے تغزل میں فلسفیانہ رنگ، وسعت عمق، پاکیزگی، خیال، سچائی اور اعتدال پایا جاتا ہے اور بعض بعض جگہ پیامی، اصلاحی اور ظریفانہ انداز بھی نمایاں ہو گیا ہے۔

اقبال کی غزلوں میں "روحانیت" اور واقعیت کی آمیزش ہے بعلوم جدیدہ۔ سیاسیات حیات اور کائنات کے عالمگیر مسائل، مشرق و مغرب کی آویزش، نئی ذہنیت اور نئے وجدان کے ایسے نقوش بال جبریل اور ضرب کلیم کی غزلوں میں ملتے ہیں کہ اُن سے اُردو شاعری میں بالکل ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ انھوں نے غزل کو قومیاتِ شعری میں داخل کر کے اس سے نظم کا کام لیا ہے۔ اور اسی لیے، اس میں تسلسل خیال پایا جاتا ہے لیکن ان کوششوں نے بعض بعض اشعار کی شعریت کو سخت صدمہ پہنچایا ہے۔ ایک غزل ملاحظہ ہو

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر چمن اور بھی، آشیاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا کہ تیرے زماں اور مکاں اور بھی ہیں

شاد کے یہاں لکھنویت ہے لیکن ایسی جذبات نگاری بھی ہے جو میر کی یاد دلاتی ہے۔ ناسخ کے سے صنائع و بدائع ہیں لیکن اعتدال سے زیادہ نہیں۔ اُن کے یہاں اخلاق و فلسفہ کا بھی عنصر ہے۔ تغزل میں سادگی و متانت ہے۔ سادہ ترکیبیں اور دلکش الفاظ ہیں لکھنویت اور دہلویت کا خوشنما امتزاج ہے جس نے کلام میں ایک نئی انفرادیت پیدا کر دی ہے۔ اشعار ذیل کی انفرادیت داد سے مستغنی ہے۔

میں حیرت و حسرت کا مارا، خاموش کھڑا ہوں ساحل پر دریائے محبت کہتا ہے آ، کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم
مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے آ جاؤ جو تم کو آنا ہو ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
دلِ مضطر سے پوچھ اے رونقِ بزم میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں
نہ تھا میں معتقد اعجازِ مے کا بڑی مشکل سے منوایا گیا ہوں

ریاض کی تمام خمریانہ "شاعری دنیائے اردو میں بڑی لطف انگیز اور مسرت خیز چیز ہے۔ فارسی کی تقلید میں رندی و شراب نوشی کا تذکرہ قدیماً

نے بھی کیا ہے لیکن ریاض کے یہاں رنگینی و شوخی، مسرت زائی و شیرینی زیادہ ہے۔ ان کی زندگی بڑی پریشانیوں میں گزری لیکن وہ طبعاً نشاط پسند تھے۔ چنانچہ اپنی شاعری اور حسن کاری سے عیش و خرمی کی ایک دنیا بنائی۔ اسی میں زندہ رہے اور اسی میں مرے۔ وہ حقیقتہً ابیقوری فلسفہ کے مظہر اور اس عہد کی یادگار تھے جب اودھ کی زندگی کا مفہوم باوجود تباہی و بربادی کے صرف مسرت و نشاط کا حصول تھا۔ اُن کے کلام میں بعض بعض جگہ ابتذال اور واسوخت کا بھی رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ ان اشعار کی نشاط انگیزی ملاحظہ ہو۔

صدقے ادائے ناز کے قاتل نے بعد ذبح — دیکھا جو مڑ کے جان سی بسمل میں آ گئی

گلا بیٹھا ہوا خدمت اذاں کی اور کعبہ میں — بھلے سے ہم د بالائے تھے ناقوس برہمن کو

چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی — تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی

صفی کی غزلوں میں کہیں کہیں خطیبانہ رنگ، نظم کی شان اور لکھنویت آ گئی ہے لیکن پھر بھی اُن کے یہاں ایسے سادہ اور لطیف اشعار کی کمی نہیں ؎

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا — ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

ثاقب لکھنوی میر و غالب کے کلام سے متاثر ہیں اور دہلی اور لکھنؤ اسکول کے امتزاج اور اختلاط کا حقیقی آئینہ ہیں۔ زبان پر قدرت رکھتے ہیں۔ مضمون آفرینی اور نکتہ وری اُن کی خصوصیات ہیں۔

اس دور کے شاعروں میں یاس یگانہ کو بھی مہارتِ شعری حاصل ہے۔ ان کے یہاں تعبیر بلند، گہرائی اور پختگی موجود ہے۔ اور اسی کے ساتھ ایک نئی لگاوٹ، ایک نئی کسک اور ایک نیا نکھار رہتا ہے مثلاً ؎

بلند ہو تو کھلے تجھ پہ زور پستی کا — بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

نشۂ عشق کو اس طرح اترتے دیکھا — عیب پر اپنے کوئی جیسے پشیماں ہو جائے

آرزو نے غزل گوئی کو شاید ایک سماجی فعل سمجھ کر اس کو زیادہ عام فہم بنانے کی کوشش کی ہے۔ بعض غزلیں انھوں نے بے عطف و اضافت اور بغیر عربی و فارسی الفاظ کے کہی ہیں۔ ان میں نرمی، شیرینی اور نغمگی ہے لیکن بعض بعض جگہ اسی کوشش نے رقت پیدا کر دی ہے اور علوئے خیال کو کم کر دیا ہے۔

حسرت کے یہاں جدید رنگ آمیزی کے ساتھ میر کی سی مصوری ہے۔ ان کے یہاں زبان بھی ہے اور جذبات بھی ہیں لیکن وہ جذبات جو شاعری کی جان ہیں اور جن کے متعلق ارسطو کہتا ہے کہ جس میں سوز و الفت جو احساسات کی روح ہیں موجود نہیں، وہ انسان لازمہ انسانیت سے خارج ہے۔ اُن کے یہاں سوز و گداز محبت، والہانہ تاثر اور حسن و عشق کی نفسیات بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق فرماتے ہیں: "میرا یقین ہے کہ حسرت کی شاعری اُن کے بقائے دوام کا باعث ہوگی"۔ حسرت نے زندگی کے حقائق کو اسی کے ہنگاموں میں شریک ہو کر سمجھا ہے لیکن ایک اعلیٰ فن کار کی طرح ان کے یہاں خارجیت اور داخلیت کا بہت ہی مناسب امتزاج ہے۔ اور تلقینی انداز نمایاں نہیں ہے۔ مثلاً۔

روکشِ حسن مراعات چلی جاتی ہے
ہم سے اور اُن سے وہی بات چلی جاتی ہے

ہم سے ہرچند وہ ظاہر میں خفا ہیں لیکن
کوششِ پرسشِ حالات چلی جاتی ہے

حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

بڑھ گئیں تم سے تو مِل کر اور بھی بے تابیاں
ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

ہم رہے یاں تک تری خدمت میں سرگرمِ نیاز
تجھ کو آخر آشنائے نازِ بے جا کر دیا

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

جوہر کے تغزل میں آپ بیتی کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ سیاسی اور مذہبی رجحانات اور اسیری و نظربندی کی زندگی نے ان کے کلام کو خاص طور پر متاثر کیا ہے۔ ذیل کی غزل آپ کی طرزِ خاص کی آئینہ دار ہے:۔

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں اُن سے خلوت کی ملاقاتیں

ہر آن تسلّی ہے۔ ہر لحظہ تشفّی ہے
ہر وقت ہے دل جوئی، ہر دم ہیں مداراتیں

کوثر کے تقاضے ہیں، تسنیم کے وعدے ہیں
ہر روز یہی چرچے، ہر رات یہی باتیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بُلا بھیجیں
بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

بیٹھا ہوا توبہ کی تو خیر منایا کر
ٹلتی نہیں یوں جوہر اس دیس کی برساتیں

فانی بدایونی "یاسیات کے امام" اور ایک مستقل رنگ کے مالک ہیں۔ اپنے طرز میں بڑی بڑی حقیقتوں کو جذبات کی مصوری تخیّل کی بلندی۔ اور واردات کی نزاکتوں کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور یہی اُن کے تاجِ کمال کا طرّہ ہے کیٹس کی طرح دردِ عشق اور خلشِ غم اُن کا سرمایۂ حیات ہے لیکن فانی حزن و افسردگی ہی کے تخلیقی فلسفہ میں یدِطولیٰ نہیں رکھتے بلکہ اُن کے کلام میں کیف و سرمستی، جوشِ بیان، رنگینی و شوخی، اخلاقیات اور معاملہ بندی کے بھی اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ یہ اشعار دیکھئے کیا مرتبہ رکھتے ہیں:۔

قطرہ دریائے آشنائی ہے
کیا تری شانِ کبریائی ہے

تری مرضی جو دیکھ پائی ہے
خلشِ درد کی بن آئی ہے

وہم کو بھی ترا نشاں نہ ملا
نارسائی سی نارسائی ہے

کون دل ہے جو دردمند نہیں
کیا ترے درد کی خدائی ہے

آرزو پھر ہے - درپئے تدبیر — سعیٔ ناکام کی دہائی ہے
موت ہی ساتھ دے تو دے فانیؔ — عمر کو عذرِ بے وفائی ہے

عزیزؔ نے بھی اردو غزل کو بلند معیار پر لانے کی بڑی کوشش کی ہے۔ پہلے تو غزل صرف خلوت وجلوت کے حدود میں گھری ہوئی تھی۔ اب ساری کائنات اس کی آغوش میں ہے۔ عزیزؔ کا کلام اس کا آئینہ دار ہے۔ اُن کی حیثیت غزل کے ارتقا میں سنگِ راہ کی سی ہے۔ جہاں بیک وقت قدیم وجدید تغزل کے خط وخال نظر آتے ہیں شیرینی ونرمی۔ اشاراتی انداز، اور نفسیاتی توازن، اُن کی غزلوں میں پوری طرح موجود ہے۔ عزیزؔ غالبؔ اسکول سے تعلق رکھتے ہیں لیکن بعض جگہ مشکل پسندی کی وجہ سے اشعار ثقیل اور دور از فہم ہو گئے ہیں بعض جگہ تقلید بھی بہت کو رانہ ہے لیکن اس کے باوجود مضمون کی جستجو، الفاظ کی تلاش، تراکیب کی چستی اور خیال کی حلاوت میں انھیں بڑی دسترس حاصل ہے۔ عزیزؔ نے نظمیں اور قصیدے بھی لکھے ہیں جو بہت کامیاب ہیں۔ غزل کا رنگ یہ ہے :-

پہلے آئنہ اک نظر دیکھو — پھر مرا دل مرا جگر دیکھو
قتل اور مجھ سے سخت جاں کا قتل — تیغ دیکھو ذرا کمر دیکھو
کہہ کے بیمار سے یہ بجھ گئی شمع — رات ہوتی ہے یوں بسر دیکھو
پوچھتے کیا ہو اپنا جذبِ نگاہ — اک خدائی ہے تم جدھر دیکھو

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حُسن — بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

شیشۂ دل کو یوں نہ اُٹھاؤ — دیکھو ہاتھ سے چھوٹا ہوتا

اصغرؔ کی طبیعت پر صوفیانہ رنگ چڑھا ہوا تھا اور غالبؔ اور اقبالؔ کے طرزِ کلام سے متاثر تھے اسی لئے ان کے یہاں مسرت زائی، بلند خیالی اور معنویت ہے لیکن بعض بعض جگہ متصوفانہ فلسفہ طرازی نے شعریت کو دبا دیا ہے۔

جگرؔ کے یہاں حافظؔ کی سی رنگینی اور خیامؔ کی سی رندی وسرشاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں تفاول ومسرت کا عنصر زیادہ ہے۔ ان کے تغزل میں سرخوشی ومسرت۔ روانی وشگفتگی، لطیف مصوری اور حسن وعشق کی نفسیات پوری طرح موجود ہیں۔ اُن کی یہ غزل کتنی رنگین اور کیف آور ہے :-

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی، نظر میں اب تک سما رہے ہیں — یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں، یہ آ رہے ہیں۔ وہ جا رہے ہیں
وہی قیامت سا قدِّ بالا وہی ہے صورت وہی سراپا — لبوں کو جنبش، نگہ کو لرزش، کھڑے ہیں اور مسکرا رہے ہیں
شراب رنگیں، جمال رنگیں، وہ سر سے پا تک تمام رنگیں — تمام رنگین بنے ہوئے ہیں، تمام رنگین بنا رہے ہیں
بہار رنگ وشباب ہی کیا، ستارہ وماہتاب ہی کیا — تمام ہستی جھکی ہوئی ہے۔ جدھر وہ نظریں جھکا رہے ہیں

فراقؔ کا تغزل دورِ حاضر کے میلانات کا مظہر ہے۔ ان کے کلام کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ حیات کائنات کے نئے شعور واحساس وانفرادیت

اور آفاقیت کی ہم آہنگی کو غزل میں نمایاں جگہ دینا چاہتے ہیں۔

ان شعراء کے علاوہ چند غزل گو شاعروں کے نام یہ ہیں۔ اُن میں سے بعض کے یہاں نیا رنگ ہے بعض کے یہاں پرانا اور بعض کے یہاں دونوں رنگوں کا اختلاط ہے:۔ وحشت جمیل۔ دل۔ احسن۔ آزاد قمر۔ نوح۔ سائل کیفی حفیظ جون پوری آشفتہ۔ اثر لکھنوی۔ رضا۔ مضطر محشر۔ قدیر۔ بیکش۔ صفدر۔ ماہر سیماب۔ مانی جگر بریلوی۔ ہادی۔ حامد حسن، عجب اثر ہ

دورِ حاضر کی غزل گوئی ماضی سے صرف لب ولہجہ، انداز و وسعت کے اعتبار سے بدلی ہوئی ہے لیکن اس جدت پسندی اور نئی شش جہت کی تعمیری کوشش میں درد و تاثر اور شعریت بھی گھٹ گئی ہے۔ انقلاب اور لفظ تراشی کے جوش میں اصولِ شعر و غزل سے بے اعتنائی برتی گئی ہے۔ زبان و محاورہ کی لغزشیں بھی سرزد ہوئی ہیں لیکن یہ دورِ تدخل ہے، کیا عجب ہے، یہ گزرنے والی موج غزل کی زمین کو جو جامعیت اور مرکزیت کی وجہ سے سرفراز ہے۔ اور بھی زرخیز کر جائے۔

خواجہ احمد فاروقی بی۔ اے

ایک کلرک کے جذبات

گو ہوں پیشے سے غلامِ تن فروش و جاں فروش
دل ہی دل میں کڑھتا ہوں مگر اک منضبط جوش و خروش

گو بظاہر ہوں محررِ دفترِ سرکار کا
اصل میں شیدائی ہوں میں جنگ کا پیکار کا

جنگ جس میں مملکت کی ہو تمنا، وہ نہیں
ہو غرض اپنی ہی جس کا اصل منشا وہ نہیں

جنگ جو کمزور قوموں کو بناتی ہو غلام
اور اُن کی صبحِ رخشاں کو کرے تاریک شام

توبہ توبہ میں تو ایسی جنگ کا شیدا نہیں
ایسی جنگ انسانیت کا ننگ ہے اے ہم نشیں

جنگ کرنی ہے مجھے سرمایہ داری کے خلاف
برہمن کی مندروں پر ٹھیکیداری کے خلاف

جنگ میں ہے آج میرے سامنے ظالم سماج
لوٹ کر معصوم کو کھانا ہے جس کا ابتہاج

برسرِ پیکار ہوں میں آج اُن اوہام سے
ذہنِ انساں کے لئے جو کم نہیں صمصام سے

ہو مبارک، کاش مجھ کو ایسی جنگِ مستطاب
انقلاب اے انقلاب اے انقلاب اے انقلاب!

منوہر لال ہادی

لہ یہ نظم ہر کلرک کے جذبات کی ترجمان نہیں۔ محض ایک کلرک کے احساسات کی آئینہ دار ہے۔ ہادی

بسنت

پھر آگیا پلٹ کے زمانہ بسنت کا
صحنِ چمن ہے آئنہ خانہ بسنت کا

لائی ہے پھر نسیمِ سحر مژدۂ بہار
چھیڑا ہے بلبلوں نے ترانہ بسنت کا

دامن کو چاک کرتے ہیں جوشِ نشاط سے
غنچوں کو مل گیا ہے بہانہ بسنت کا

کلیوں سے چھیڑ چھاڑ میں ہے مست عندلیب
منہ چومتی ہے رکھ کے بہانہ بسنت کا

سودا سروں میں سینوں میں ارماں دلوں میں شوق
کیا جوش آفریں ہے زمانہ بسنت کا

پھولے ہوئے ہیں کھیت یہ سرسوں کے زرد زرد
یا ہے جگرؔ لباسِ شہانہ بسنت کا

جگر بریلوی

آمدِ بہار

حسن کے پھر جلوہ فرمانے کا موسم آ گیا
قلبِ افسردہ کے بہلانے کا موسم آگیا

زحمت سرما گئی، آئی بہارِ جاں فروز
پھر دل و دیدہ کے گرمانے کا موسم آگیا

ڈھل رہی ہے حُسن کے سانچے میں فطرت ہو بہو
اے تمنّاؤ! مچل جانے کا موسم آگیا

عازمِ گلگشت ہے ہر گلبدن غنچہ دہن
قہقہوں کے پھول برسانے کا موسم آگیا

ہر قدم پر حُسن۔ ہر منظر حسین۔ ہر شے جمیل
ہر قدم پر دل مچل جانے کا موسم آگیا

ہاں یہی موسم تھا جب کھائی تھی ہیں نے یہ چوٹ
آج پھر وہ زخم اُبھر آنے کا موسم آگیا

دل کو پھر دُنیا کے ہنگاموں سے وحشت ہو چلی
قیس پھر دیوانہ کہلانے کا موسم آگیا

قیس شروانی

چند ضروری الفاظ

مکرمی: السلام علیکم

نمیقہ انیقہ وصول ہوا۔ میں عموماً عربی اور فارسی کے الفاظ استعمال کرتا ہوں۔ اور ان کے استعمال کو اس وقت تک ضروری سمجھتا رہوں گا جب تک برادران وطن سنسکرت ایسی مردہ زبان کے الفاظ کا استعمال ترک نہیں فرمائیں گے۔

راجہ نرندر ناتھ صاحب اردو والوں پر تو اعتراض فرماتے ہیں کہ وہ عربی۔ فارسی الفاظ رائج کرنا چاہتے ہیں لیکن ہندی داں اصحاب کی سنسکرت نوازی پر نظر نہیں فرماتے جنھوں نے مدعی۔ مدعا علیہ وکیل وغیرہ رچے ہوئے الفاظ کی جگہ عجیب وغریب الفاظ اختراع فرمائے ہیں۔

نیازمند

محمد عباس طالب صفوی

سال گزشتہ میں نے سالنامہ "پارس" سے چند الفاظ انتخاب کرکے ماہنامہ "ہمایوں" میں شائع کئے تھے۔ اور مجھے توقع تھی کہ ملک کے صائب الرائے ادیب ان الفاظ کو زبان میں شامل کرنے نہ کرنے کے متعلق اظہار خیال فرمائیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔

ضرورت ہے اور شدید ضرورت ہے اس امر کی کہ انجمن ترقی اردو کی سرپرستی میں فرانس کی اکادمی کی طرح ایک علمی اور ادبی اکادمی کی تشکیل و تدوین ہو۔ اور صرف ان نئے الفاظ اور محاورات کو داخل زبان سمجھا جائے جنھیں اس کی سرکار سے حسن قبول کا خلعت مل چکا ہو۔

جنگ کی وجہ سے اردو اخبار نویس آئے دن ایسے الفاظ سے دوچار ہوتے ہیں جن کے لئے کوئی مفرد لفظ نہ مولانا عبدالحق کے لغت میں ملتا ہے نہ مولانا سید سلیمان ندوی کے جدید عربی لغت میں نظر آتا ہے۔ اس لئے چار و ناچار یا تو وہ ان الفاظ کو علی حالہ قائم رکھتے ہیں (مثلاً تارپیڈو) یا طولانی تشریح کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں مثلاً AERODROME کا ترجمہ یا یوں کہئے کہ تشریح عام طور سے ہوائی بیڑے کے مستقر یا اڈے سے کی جاتی ہے حالانکہ جدید عربی میں اس کے لئے "مطار" کا لفظ موجود ہے اور چونکہ ہمارے کان طیارے کے لفظ سے آشنا ہیں اس لئے مطار بہت جلد ہماری زبان پر چڑھ سکتا ہے۔

اس وقت ۱۹۴۲ء کی چھپی ہوئی جدید عربی کی ایک کتاب EVERY DAY ARABIC" BY N AHMAD & RABIN" پیش نظر ہے اور اس میں سے میں کچھ ایسے الفاظ ناظرین ہمایوں کے سامنے پیش کرتا ہوں جن کے لئے کوئی مفرد لفظ ہماری زبان میں موجود نہیں ہے۔ اے کاش انجمن ترقی اردو کے کارکن اس طرح کے ضروری الفاظ کے تراجم کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیں تاکہ اردو اخباروں کے مترجمہ الفاظ کا اختلاف رفع ہو جائے۔

(1) AIR RAID SHELTER — ملجا۔ مخبا

(2) AIR RAID WARDEN — مراقب

انذار	(3) AIR RAID ALARM
ظلام ِحلکۃ	(4) BLACKOUT
محارب	(5) BELLIGERENT
طرّاد	(6) CRUISER
اقناع	(7) GAS MASK
طلیعۃ	(8) OUTPOST
اشعار	(9) PASSWORD
غوّاصہ	(10) SUBMARINE
دبّابہ	(11) TANK

طالب صفوی

نظامِ نو

اس کے راستہ میں چند بڑے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے

وہ کچھ دیر خاموشی سے سوچتا رہا۔ پھر نہ معلوم کہاں سے ایک بہت بڑا فولادی ہتھوڑا اٹھا لایا اور دیوانہ وار ان پتھروں پر پل پڑا۔

نہ اسے وقت کا خیال آیا۔ نہ تکان کی اس نے کچھ پروا کی۔ وہ مسلسل ہتھوڑا چلاتے گیا۔ ہر ضرب پر اس کا ہاتھ زیادہ جوش و قوت سے اٹھتا۔

پتھر ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئے۔ کام ختم ہو گیا۔ وہ کھڑا ہو کر ہانپنے لگا۔ باوجود تکان کے وہ خوش تھا کہ اتنا بڑا کام کر ڈالا۔

ارے۔ مگر اب جو اس نے دیکھا۔ تو اس کا راستہ بجائے چند بڑے بڑے پتھروں کے بے شمار چھوٹے چھوٹے پتھروں سے پٹا پڑا تھا +

محمد ایوب

مجبوری کا عالم

بے ثباتی کا نقشہ دکھانا پڑا
غیر مرئی کو مرئی بنانا پڑا

غم کو لفظوں کی صورت میں لانا پڑا
مرثیہ اپنے ڈھب کا سنانا پڑا

کس کی چلتی ہے پیشِ قضا و قدر
اپنے مرحوم بچے کا رُخ دیکھ کر

آسماں کی طرف سر اٹھانا پڑا
چاند کو داغ دل کا دکھانا پڑا

تیرگی کے حوالے ہے نورِ نظر
رو رہا ہوں میں ننھی سی اک قبر پر

خاک میں لختِ دِل کو چھپانا پڑا
اپنی بے چارگی کو دکھانا پڑا

مجھ کو ازبس کہ پیارا تھا نامِ حسن
نام رکھا تھا اُس کا غلامِ حسن

ایسے پیارے کا غم یوں اُٹھانا پڑا
قبر میں اپنے ہاتھوں لِٹانا پڑا

دیکھ کر جس کو اک عمر کی تھی بسر
قبر میں آہ تنہا اُسے چھوڑ کر

اپنے گھر مجھ کو مجبوراً آنا پڑا
پھر غضب یہ کہ کھانا کھلانا پڑا

تعزیت کے لئے دوست آنے لگے
دیکھ کر مجھ کو آنسو بہانے لگے

اپنے نزدیک سب کو بٹھانا پڑا
دردِ دل دوستوں کو سنانا پڑا

رو دیئے سن کے سب میری ناچاریاں
وہ دلاسے وہ پُرسے وہ غم خواریاں

اُن کی باتوں میں دل یوں لگانا پڑا
بن کے تصویرِ غم بیٹھ جانا پڑا

اے اجل کتنی بے لطف ہے زندگی
زندگی سے عبارت ہے شرمندگی

زندگی سے مجھے ہاتھ اٹھانا پڑا
یعنی شرمندگی کو چھپانا پڑا

جس کی تابندگی تھی مرے رُخ کی ضَو
جس کی رخشندگی تھی مرے دل کی لَو

گوشۂ قبر اس کو بسانا پڑا
روز و شب مجھ کو آنسو بہانا پڑا

علی منظور

موت

ہر صبح میں اک تاریکی ہے ہر شام میں اک ویرانی ہے
دنیا کی حقیقت کیا کہئے، یا جہل ہے یا نادانی ہے

اُس کو بھی ترستی ہیں روحیں وہ جوشِ غضب کاہ میں ہے
کچھ لطف نہ ایسے درد میں ہے کچھ بات نہ ایسی آہ میں ہے

اک کھیل ہے نورس بچوں کا، بیکارِ حیاتِ انسانی
یہ درس دیا جاتا ہے یہاں ”ہستی مبہم“ دنیا فانی!

جس جام میں رقصِ مے ہوتا ہو، زہر اسی میں گھلتا ہے
دُنیا میں جوانی کے ہاتھوں دروازۂ پیری کھلتا ہے

جب دل میں خزاں کا موسم ہو، ایسے میں بہار آئی بھی تو کیا!
جب روح میں ماتم برپا ہو، پھر بانگِ ہزار آئی بھی تو کیا!

احساسِ حقیقت ہو تو یہاں انوارِ طرب معدوم نہیں
افسانہ پرستی کو تیری یہ راز مگر معلوم نہیں

فطرت سے ملی ہے رقص کی خو مے جھوم رہی ہے مینا میں
قدرت نے دیا ہے درسِ طپش بے چین ہیں موجیں دریا میں

کیونکر نہ ہنسیں نورس غنچے تعمیر کا اُن کی راز ہے یہ
کس طرح نہ ہو سرگرمِ نوا فطرت ہے، یہ اس کی ساز ہے یہ

مہتاب کے شیریں جلووں سے روشن ہے جبینِ لیلیٰ شب
خورشید کی رخشاں کرنوں پر نازاں ہے عروسِ صبحِ طرب

مامور ہے اشک افشانی پر، اک عمر سے شبنم گریاں ہے!
مجبور ہے اس حیرانی پر، آئینہ ازل سے حیراں ہے!

آباد کرے میں دُنیا کے ایسا ہی نظامِ موت بھی ہے — ہم موت سمجھتے ہیں جس کو اک نغمۂ سازِ ہستی ہے
قدرت نے جسے رکھا ہے جہاں قائم ہے وہ اپنے مرکز پہ — اک موج رواں ہے دریا میں اک موج ہوا میں گرمِ سفر
دنیا کی جو کشتی ہے، دنیا، مصروف ہے اُس کے کھینے میں — سرگرم ہے یاں آئینِ اجل تعلیمِ بصیرت دینے میں
احساسِ عمل ہے ہر شے میں، ذرّے بھی یہاں بیکار نہیں — اس راز سے جو آگاہ نہ ہو، خوابیدہ ہے وہ بیدار نہیں

عرفانِ اجل احساس کی دھیمی شمع کو اُکسا دیتا ہے!
جو روحیں نیند کی ماتی ہیں، اُن روحوں کو چونکا دیتا ہے!

ہر رند میں ہے یہ آگاہی، ہاتھوں سے صراحی چھوٹ نہ جائے — ہر ذرّے میں ہے یہ بیداری خورشید سے رشتہ ٹوٹ نہ جائے
صنّاع کے دل میں حسرت ہے، جو نقش بنے، مٹ جائے نہ وہ — مالی کی یہ خواہش ہوتی ہے، جو پھول کھلے مرجھائے نہ وہ
اربابِ زمانہ موتی کو سونے میں چھپا کر رکھتے ہیں — مٹی کے کھلونوں کو بچے سینے سے لگا کر رکھتے ہیں
الجھی ہوئی دنیا ہے جتنی خود اپنی ادھوری صنعت میں — بیداریٔ فکر اتنی بھی نہیں کیا نقشِ طرازِ فطرت میں
آئینۂ حسنِ بزمِ ازل کیا اپنی ضیا کھو سکتا ہے — انسان کہ ہے سرنامۂ فطرت، یوں بھی فنا ہو سکتا ہے؟
اک خواب کہ ہستی مبہم ہے اک وہم کہ دنیا فانی ہے — جو درسِ فنا دیتی ہے یہاں دانش تو نہیں نادانی ہے

آگاہ ہیں اس سے اہلِ نظر اور ایک زمانہ آئے گا!
جب عام نگاہوں پر اختر یہ رازِ نہاں کھل جائیگا!

سیّد علی اختر حیدرآبادی

جنگل کا ایک منظر

۷ دسمبر ۱۹۳۹ء کی ایک رنگین شام

اس رنگین شام کی کیفیت میں اپنے سب سے چھوٹے بیٹے سید عون حسین سلمہ اللہ تعالےٰ کے نام معنون کرتا ہوں جس کی یاد سے متأثر ہو کر میں نے ایراولی پربت کے دلکش مناظر کو اس نظر سے دیکھا۔

آغا حسین

ریاست الور کے شمال میں تحصیل فیروز پور جھرکہ واقع ہے پہلے کبھی یہ علاقہ ریاست فیروز پور کہلاتا تھا۔ اس ریاست میں ہمارے سب سے بڑے شاعر اسد اللہ الغالب کا علاقہ، جاگیر بھی شامل تھا لیکن افسوس ہے کہ وہ خدائے سخن اس سے محروم رہا۔ فیروز پور سے کوئی پانچ میل کے فاصلے پر پختہ سڑک کے نزدیک ایک گاؤں ہے جس کا نام بائی کھیڑہ ہے اس علاقے میں عموماً میوات آباد ہیں۔ سڑک کے دونوں طرف پہاڑوں کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ یہ پہاڑ سیکڑوں میلوں تک پھیلے ہوئے ہیں اور ایراولی پربت کے دشوار گزار سلسلوں سے جاملے ہیں۔

دو دن تک مجھے اس گاؤں میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا جنگل کی ہیبت ناک خاموشی ایراولی پربت کے خوبصورت مناظر غروب آفتاب کی کیفیت پہاڑوں کے پیچھے سورج کا آہستہ آہستہ جانا جھیل کے کناروں پر چھوٹے چھوٹے آبی پرندوں کے نغمے۔ شام کی تاریک و غمناک فضائیں سبزی مائل نیلگوں پانی میں تاروں کا جھلملانا۔ بے حد دل فریب منظر تھا۔ میں سورج کے غروب سے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے مشرقی پہاڑیوں کی طرف جانکلا حسن خاں میو میرے ساتھ تھا۔ ان پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ زمین نشیب و فراز ہے نیل گائے، چکارے۔ اور دیگر وحشی جانوران جنگلوں میں بکثرت پائے جاتے ہیں چھوٹی چھوٹی خاردار جھاڑیاں اور کئی قسم کے پہاڑی خودرو پودے انسان کو تیز چلنے سے روکتے ہیں بعض دفعہ کانٹوں سے الجھنا پڑتا ہے۔ غالب کا یہ شعر بار بار یاد آرہا تھا ؎

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

کوئی دو میل تک مشرقی گھاٹیوں کے ساتھ پُر پیچ راہوں میں چلتے رہے۔ وہاں سے سڑک کا رُخ کیا۔ سڑک دونوں پہاڑوں کے بیچ میں ہوتی ہوئی چلی گئی ہے۔ گاؤں جنوب کی طرف رہ گیا تھا ہم نے ایک پگڈنڈی کا رستہ لیا۔ ہر طرف گیہوں اور جَو کے خوشنما کھیت تھے ہم سورج کی طرف جارہے تھے۔ اور سورج اپنے مغربی نشیمن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کچے کنوؤں سے زمیندار اپنے کھیتوں کو سیراب کر رہے تھے بھیگی ہوئی زمینوں کی خوشبو جنگل کی نم آلود فضاؤں میں نہایت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ دور تک ہلکے دھانی رنگ کا فرش بچھا ہوا تھا۔

شام کی دل گداز فضائیں سورج کو اقصائے غرب کی طرف لئے جا رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت جلد ایران کے بہار آفریں سبزہ زاروں اور دریائے نیل کی رنگین وادیوں میں طلوع کرے گا۔ اب ہم جھیل کے گہرے نیلگوں کناروں پر پہنچ رہے تھے۔ ہوائیں جھیل کی لہروں کو بہائے لئے جا رہی تھیں معلوم ہوتا تھا کہ جھیل بڑی سرعت کے ساتھ دوسرے کناروں کی طرف بھاگی چلی جا رہی ہے جھیل کی موجوں میں شفق کی سرخی تھی۔ گویا زمرد کے طشت میں ارغوانی رنگ گھولا ہوا ہے۔ اور زمرد یں طشت ایک بھاگتے ہوئے بچے کے ہاتھ میں ہے۔ بچہ کبھی کبھی ٹھہر جاتا ہے اور بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگتا ہے۔ اور دیر تک دیکھتا رہتا ہے میں بچے کی سرگیں آنکھوں کو دیکھ رہا تھا جو جھیل کی سیاہ گہرائیوں کے مشابہ تھیں۔ مغربی افق پر ہلکے ہلکے بادل تھے کبھی گلابی کبھی ہلکے نارنجی کبھی بہت سے رنگ ملے ہوئے بادلوں کی دلفریب رنگینیاں۔ ڈاکٹر اقبال کا یہ مصرع یاد دلا رہی تھیں ؎

اُودے۔ اُودے۔ نیلے نیلے۔ پیلے پیلے پیرہن۔ جن کو بچے معصومانہ انداز میں اس طرح ادا کرتے ہیں۔ اُودے اُودے۔ دیلے دیلے۔ پیلے پیلے دے دہن سورج کی آخری شعاعیں۔ گلابی بادلوں کو گہرے ارغوانی رنگوں میں تبدیل کر رہی تھیں۔ اس طرح کچھ عرصہ گزر گیا۔ اب فضائیں تاریک ہو رہی تھیں سورج غروب ہو چکا تھا۔ خاموش فطرت پر اندھیرا چھا رہا تھا۔ ہم دونوں دیر تک خاموش کھڑے رہے۔ آسمان پر تارے نظر آنے لگے تھے۔ مریخ سرخ لباس پہنے ہوئے تھا۔ اور تیز تیز نظریں زمین پر ڈال رہا تھا۔ زہرہ نے ہلکے رنگ کا زردی مائل سبز لباس پہن رکھا تھا۔

جھیل کے کناروں پر آبی پرندوں نے بولنا شروع کیا۔ اُن کی خوش آیند صدائیں دوسرے کنارے سے آ رہی تھیں۔ خاموش اور پر کیف شام ان دل گداز نغموں سے گونج رہی تھی۔ خدا جانے وہ کیا کہہ رہے تھے۔ اُن کی یہ دلکش صدائیں موجوں کی گہرائیوں میں غرق ہو رہی تھیں۔ اس طرح کافی عرصہ گزر گیا۔ خوب صورت ننھے پرندے اپنے شام کے نغمے ختم کر چکے تھے۔ رات اندھیری تھی۔ تارے جھلملا رہے تھے۔ مشرقی گھاٹیوں میں دور سے آگ لگی ہوئی معلوم ہوتی تھی جو غالباً ان تاریک پہاڑوں کے نزدیک گوالوں نے روشن کی تھی۔

ہم دونوں دیر تک ان دلفریب مناظر کو دیکھتے رہے۔ آخر جھیل کی خوب صورت لہروں کو ساتھ لے کر گاؤں کی طرف لوٹنا شروع کیا جس طرح بچے یہ خیال کرتے ہیں کہ چاند ان کے ساتھ چل رہا ہے۔"

سید آغا حسین

اے بڑے آدمی

اے بڑے آدمی!
تو سورج کی طرح فیاض تھا۔
جو غروب ہونے کے بعد بھی
آسمان پر شفق کی دل ربا رنگینیاں چھوڑ جاتا ہے۔

خالدہ

رباعیاتِ ناطق

عزیزم میاں بشیر احمد صاحب

السلام علیکم۔ میں کان پور کے جلسۂ کل ہند اردو کانفرنس سے آپ کے لئے ایک ادبی تحفہ لایا ہوں۔ ناطق صاحب لکھنوی نے اردو زبان پر کچھ رباعیاں لکھی تھیں جو وہاں پڑھی گئیں۔ مجھے پسند آئیں۔ اس لئے میں نے آپ کے رسالے کے لئے اُن سے مانگ لی تھیں۔ یہ اُن کے قلم سے لکھی ہوئی ہیں اس لئے اگر آپ رسالے میں درج کرنے کے بعد یہ کاغذ مجھے واپس بھیج دیں گے تو اچھا ہوگا۔ میں ان کی یادگار کے طور پر اسے رکھنا چاہتا ہوں۔

آپ کا خیر طلب

عبدالقادر

ہندو کا بھی قشقہ ہے نشانِ اُردو
مسلم کے بھی ابرو ہیں کمانِ اُردو
لب مِل گئے دونوں کے تو اردو بولی
دونوں کے دہن میں ہے زبانِ اُردو

اُردو جو نہ ہوتی تو سبھی سر دُھنتے
ملتے نہ اُنھیں پھول، یہ کانٹے چُنتے
ہر صوبہ کے لوگ اپنی اپنی کہتے
سنتے وہ ہماری نہ ہم اُن کی سنتے

ایسے ملے جیسے رُخ و گیسو باہم
یا جیسے کہ پیوستہ ہوں ابرو باہم
اردو کی زبانی یہ خبر ملتی ہے
ملتے تھے کبھی مسلم و ہندو باہم

ملا و برہمن کی ہے کیسی اُردو
تھی اردو کے آغاز میں جیسی اُردو
دُہراتی ہے تاریخ گنواری بولی
دو چار صدی پہلے تھی ایسی اُردو

پنڈت ہو کہ ملا ہو کہ بقال اُردو
عالم ہو کہ تاجر ہو کہ دلالِ اُردو
عربی کے لغت ہوں کہ گنواروں کے بھان
ہر قسم کی اردو ہے بہر حال اُردو

اُردو کے قریں پہنچے تھے کس مشکل سے
کے صدیوں میں نکلی تھیں یہ راہیں دل سے
پھر عربی و سنسکرت کے سمت مڑے
پھر گھر کی طرف پلٹ پڑے منزل سے

سید ابوالعلا حکیم ناطق لکھنوی

تختۂ جہاز پر سے ایک چاندنی رات کا سماں

وہ کونسی شبِ مہتاب ہے کہ جس کی بہار
نہ چھین لے دلِ نظّارگی کا صبر و قرار
مگر جہاز کے تختے سے اُس کی کیفیت
بلا مبالغہ ہے آنکھ کے لئے جنّت
یہ وہ نظارہ ہے جس کی نہیں ہے کوئی مثال
جہاں میں اتنا کہاں ہے بھلا وفورِ جمال؟
کہ اس نظارے میں ہے چاندنی سراپا نور
کیا ہے جس نے لباسِ برہنگی میں ظہور
ہے اپنی حالتِ اصلی میں نور جلوہ نما
کہ جیسے خالقِ عالم نے اس کو خلق کیا
نہ پردہ شکل کا ہے اور نہ رنگ کا حائل
بس ایک نور کا پھیلا ہے بحرِ بے ساحل
نگاہ جائے جو حدِ خیال تک بھی دُور
تو آئے گا نظر اس کو تمام نور ہی نور
کہ آسمان کی خلوت کے سب اُٹھا کے حجاب
ہوا ہے سامنے آپ اپنے جلوہ گر مہتاب
ہے آئنے میں سمندر کے جلوہ آرائی
فرازِ بامِ فلک سے ہے خود تماشائی
شرابِ حُسن کی مستی میں عشق کا ہے سرور
فسونِ ناز سے اپنے ہوا ہے خود مسحُور
ہے خود کو تاک رہا ٹکٹکی لگائے ہوئے
سوائے اپنے ہر اک چیز کو بھلائے ہوئے
میں اس شرابِ تجلّی کے کیف سے سرمست
کھڑا ہوا ہوں خموشی سے جامِ دیدہ بدست
ہے میرے دل پہ بھی طاری وہی طلسمِ سکوت
اثر سے جس کے ہے اس وقت نقش حیرت بہوت
اور اس سکوت میں ہے یوں جہاز گرمِ سفر
کہ جیسے خواب میں ہو کوئی چل رہا اُٹھ کر

محمد ہادی حسین آئی۔سی۔ایس (آسام)
سابق ایڈیٹر ہزار داستان لاہور

غزل

ہم نے جو دردِ دل کے فسانے سنا دیئے
کونین کی نگاہ سے آنسو بہا دیئے

اللہ رے ابتدائے محبّت کی بے خودی
ہم نے حجاب و دید کے جھگڑے چکا دیئے

توبہ کا پاس تھا مجھے لیکن میں کیا کروں
تیری نگاہِ مست نے ساغر پلا دیئے

چھیڑی جو میں نے تیری جوانی کی داستاں
تارے، شراب، پھول، سبو، مسکرا دیئے

اے دوست شوقِ دید کی گستاخیاں معاف
بجمہ نے تیری راہ میں تارے بچھا دیئے

بجمہ تصدّق بی۔ اے۔ بی۔ ٹی

ہم لوگ

کامراں کامگار ہیں ہم لوگ
ناشناسِ قرار ہیں ہم لوگ

ہم سے تازہ ہے گلستانِ ادب
گو خرابِ بہار ہیں ہم لوگ

ہیں جہاں کے لئے پیامِ سکوں
خود مگر بے قرار ہیں ہم لوگ

ہم امیرِ سرور و نغمہ ہیں
بزم کے تاجدار ہیں ہم لوگ

کس کو پرواسکوں کی اے ہمدم
اے خوشا بے قرار ہیں ہم لوگ

اک بجھا سا چراغِ حسرت ہیں
اک لٹی سی بہار ہیں ہم لوگ

فکر میں بھی شگفتہ دل ہیں ہم
غم میں بھی نغمہ بار ہیں ہم لوگ

صفیہ شمیم ملیح آبادی

خودکشی

عشرتِ دہر کے ہنگاموں میں
رونقِ بزم میں تنہائی میں
اپنے خوابوں کو بھلانا چاہا
تلخیٔ زیست مگر کم نہ ہوئی

بادہ کش رند کبھی
اور کبھی زمزمہ درِ سازِ بہار
میں نے سو روپ بھرے
میں نے سو رنگ سے جینا چاہا
تلخیٔ زیست مگر کم نہ ہوئی

بارہا ساغر و مینا کے حسیں سائے میں
نغمہ و شعر سے محصور
غمِ دہر سے دور
مسکراتے ہوئے گزری ہوئی نادانی پر

دل پہ وہ چوٹ لگی
روح بھی غم کے نہاں خانے سے
شدّتِ درد سے چلّا اُٹھی
"زندگی! آہ تری بند ہیں راہیں مجھ پہ"

کشمکش ختم ہوئی آج مگر
ٹوٹ گئے
تری اُمّید کے جال!
میں نے ٹھکرا دیا موہوم تمنّاؤں کو
دل میں باقی ہے یہی ایک خیال
ایک دیوانہ خیال
تُند لہروں کی روانی میں کہیں
لے کے سو جاؤں دہکتے ہوئے ارمانوں کو

سیف الدین سیف

میری زندگی کا ایک ورق

کوئی بات ہو جس میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کا نام آجائے روح میں ایک لرزش سی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور پھر اُن کی زندگی کا کوئی واقعہ جس میں گویا وہ سامنے کھڑے یا بیٹھے ہوئے باتیں کرتے دکھائی دیں اُن لوگوں کے لئے جنھیں اُن کی ملاقات کا شرف حاصل تھا ایک بڑی آسمانی نعمت ہے جب دیوندر ستیارتھی صاحب نے مجھے یہ واقعہ سنایا۔ مجھے وہ دن یاد آگئے جب مجھے بھی یہ فخر حاصل تھا کہ کبھی کبھی ڈاکٹر صاحب کی صحبت سے فیض پاؤں۔

ہر شخص کے لئے بڑے آدمیوں کے لئے عام آدمیوں کے لئے ان کا دروازہ ہر ایک کے لئے کھلا رہتا تھا۔ جو اس دروازے سے واپس آتا دل میں ایک دولت لے کر واپس آتا ستیارتھی صاحب کا یہ ننھا افسانہ سنیئے اور حقیقت کو روبرو دیکھ لیجئے۔ پ ا

ہمارے گھر میں جب بھی کسی کی موت واقع ہوتی میری آنکھوں سے آنسو نہ گرتے مگر اپنے اس دوست کی موت نے جیسے برسوں کے جمع کئے ہوئے آنسو انڈیل دیئے۔

دیہاتی ناچ کا ایک گیت، جو میں نے اپنے گاؤں میں سنا تھا میں نے اسے کئی بار سنایا تھا ——— "قبراں اُڈیکدیاں جیوں پُتراں نوں ماواں!" یعنی قبریں انتظار کر رہی ہیں جیسے مائیں بیٹوں (کی راہ دیکھا کرتی ہیں)! اور اس کے ساتھ قبر کی اس تشبیہ کی تعریف کرتے ہوئے میں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ یہ ایک بے مثال خیال ہے۔ اور دنیا کے ادب میں ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے گا حالانکہ یہ وہ بھی جانتا تھا کہ میں یوں ہی جذبات کے زیر اثر یہ بات کہہ رہا تھا۔

جس دن اس کی موت کی خبر پہنچی مجھے فوراً اس گیت کا خیال آیا۔ اور میں یہ سوچ کر حیران رہ گیا کہ اس نے کبھی کھل کر یہ کیوں نہیں بتا دیا تھا کہ وہ قبر کو اپنی حقیقی ماں سے کہیں بڑھ کر سمجھنے لگا ہے اور جلد اس کی گود میں جا سوئے گا۔

اس کا گھر قصور میں تھا ہم مہندرا کالج پٹیالہ میں ایک ساتھ داخل ہوئے تھے سنگیت میں اسے خاص دلچسپی تھی۔ اپنے شہر کے کسی گویے سے اس نے کئی پکے راگ سیکھ رکھے تھے اصرار کرنے پر وہ اکثر کوئی چیز گا کر سناتا اس نے اچھا گلا پایا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آواز بنسری کی لے سے مل کر بنی ہے۔

جب وہ کلاونت کی طرح راگ کی الاپ شروع کرتا تو میں ہنسی نہ روک سکتا سوچتا کہ یہ صرف راگ ہی نہیں ہے بلکہ گلے کے ساتھ کشتی لڑنے کا مظاہرہ بھی ہے ایک دو بار میں نے اپنی طنز ظاہر بھی کی اس کا جواب اس کے پاس ایک ہی تھا "تم پکے راگ کی اہمیت کیا جانو؟ تمھیں تو گنواروں کے گیت ہی پسند ہیں:

گرمی کی چھٹیوں کے بعد کالج میں آیا تو پتہ چلا کہ وہ ابھی نہیں لوٹا گھر پہ بیمار ہے۔ اور پھر معلوم ہوا کہ اس نے کالج بدل لیا ہے۔ اور اب لاہور کے ڈی اے۔ وی کالج کا طالب علم ہے۔

مجھے بھی قبض رہنے لگا۔ یا یہ کہئے کہ میں سمجھنے لگا کہ مجھے قبض رہنا چاہئیے! میرا رنگ کچھ کچھ زرد ہونے لگا۔ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتا اور دل میں کہتا کچھ کچھ زرد تو ہو چلا ہوں۔ اگر گھر جا کر پتا جی سے کہہ دوں کہ پٹیالہ کا پانی مجھے راس نہیں اور لاہور جانے کے لئے اصرار کروں تو شاید میں بھی ڈی اے وی کالج میں داخل ہو جاؤں۔

پتا جی نے خرچ بھیجنے کا مسئلہ چھیڑا مگر میں نے ایک نہ مانی۔ وہ

لاہور سے بہت جلد میری کتاب "میں ہوں خانہ بدوش" شائع ہو رہی ہے۔ یہ اسی کا ایک باب ہے۔

میری ضد سے واقف تھے پھر جب کالج بدلنے پر پتہ چلا کہ وہ لڑکا بدستور بیمار ہے۔ اور ابھی گھر سے نہیں لوٹا تو ایک عجب بے کلی سی رہنے لگی اور جب موت کی خبر پہنچی تو میری روح پر ایک بوجھ سا آپڑا۔

پڑھائی میں میرا جی نہ لگتا تھا۔ کالج میں پہلی دلچسپیاں موجود تھیں۔ مگر وہ سب رونق مجھے بے جان معلوم ہوتی تھی میرے کمرے میں اب پہلی سی صفائی بھی نہ رہی تھی۔ کئی ماہ اسی طرح گزر گئے۔

کبھی کبھی میں پنجابی شاعری کا وہ عام ٹکڑا۔ جسے میں نے پہلے پہل ایک میراثی چھوکرے کی زبانی سنا تھا گنگنانے لگتا ——

"عقل کہے میں سب توں وڈی وچ کچہری لڑدی
شکل کہے میں تیتھوں وڈی میرا دنیا پانی بھردی
دولت آکھے تیتھوں وی وڈی میں نہیں کسے توں ڈردی
موت کہے تسیں تنے جھوٹھیاں میں جو چاہاں سو کردی!"

'عقل کہتی ہے —— میں سب سے بڑی ہوں میں کچہری میں بحث کرتی ہوں۔ خوبصورتی کہتی ہے —— میں تجھ سے بھی بڑی ہوں دنیا میری غلام ہے۔ دولت کہتی ہے —— میں تجھ سے بھی بڑی ہوں میں کسی سے ڈرتی نہیں۔ موت کہتی ہے —— تم تینوں جھوٹ بولتی ہو۔ میں جو چاہوں۔ وہی کروں۔

میں کالج جاتا ضرور مگر صرف وقت کاٹنے کے لئے۔ پڑھائی تو پڑھائی مجھے تو ان دنوں زندگی ہی بے معنی معلوم ہوتی تھی بے معنی ہی نہیں بے ربط بھی۔ موت کا راز کیا ہے۔ بدھ نے اس کے متعلق کتنا سوچا تھا۔ اور اس کے پیرو کہتے ہیں کہ اس نے اسے پالیا تھا۔ مگر موت سے تو وہ بھی نہ بچ سکا۔ پھر وہ موت کا راز آخر تھا کیا جسے اس نے پالیا تھا؟

امتحان میں میں اس سال پاس ہو گیا۔ یہ کچھ خوشی تھی کبھی کبھی سوچتا کہ کالج چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ اور آوارہ ہو کر ملک کا کونہ کونہ چھان ماروں

زندگی کی یہ سب ذمہ داریاں کیوں اتنی ضروری مان لی گئی ہیں؟ اور پھر ایک دن موت آتی ہے اور وہ سب پیالیاں جن میں آدمی رنگ گھولتا ہے اور اپنی عمر کا بیشتر حصہ خرچ کر ڈالتا ہے۔ اپنے حلق میں انڈیل لیتی ہے!

جیسے زندگی کا سب رس سوکھ گیا ہو میں ہنس نہ سکتا تھا۔ آنکھ سے دیکھتا کم۔ دل سے سوچتا زیادہ۔ اور مجھے یہ محسوس ہوتا کہ یہ زندگی اک الجھن کے سوا کچھ نہیں . . . . . . جو لوگ خودکشی کر لیتے ہیں یہی ثبوت دیتے ہیں نا کہ انھوں نے اس جال میں پھنسے رہنا منظور نہیں کیا . . . . . . وہ کیا بُرا کرتے ہیں؟ . . . . اور اگر میں بھی خودکشی کر لوں . . . . . .

شرارتی لڑکوں کی چیخیں مجھے سرے سے ناپسند تھیں۔ نیند کے دھارے میں بھی چیخیں مجھ تک پہنچتیں اور میں ان کی طرف سے کان بند کر لینا چاہتا۔ دنیا میں کتنے بچے پیدا ہوتے رہتے ہیں آخر کس لئے؟ یوں کالج میں آکر چیخیں مار مار کر وہ کیوں کسی بھلے مانس کے کان کھا ڈالتے ہیں! ٹیگور کا وہ خیال کہ جب بھی کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ پیغام لاتا ہے کہ ابھی تک خدا دنیا کی تخلیق سے مایوس نہیں، میرے ذہن میں گونج اٹھتا۔ کب مایوس ہوگا خدا؟ اور کیا خدا سچ مچ کہیں ہے بھی؟ اکثر مجھے بڑے بوڑھوں کا وہ طنز آمیز فقرہ یاد آتا جو وہ بچپن میں کچھ اس طرح کی شرارتیں کرنے والوں پر کسا کرتے تھے —— کیوں بے! پیدا ہوا تھا یا یوں ہی دھرتی سے اُگ آیا تھا؟ اور پھر مجھے کالج کے شرارتی لڑکوں پر ترس آنے لگتا۔ وہ نا سمجھ ہیں۔ سمجھ آجائے سہی . . . . اُن میں سے بھی ایسے بیسیوں لڑکے نکل آئیں گے جو میری طرح خودکشی کا خیال پختہ کر لیں . . . . .

یہ ۱۹۳۵ء کا واقعہ ہے ——

میں نیلا گنبد کے چوک میں آکھڑا ہوا۔ اب یہاں گہما گہمی نہ تھی۔ رات نے خاموش ماں کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اور میں اس ماں کی موجودگی میں خودکشی پر غور کر رہا تھا —— راوی میں جا کودوں۔ یا ریل کے آگے سر کٹوادوں سر ہی نہیں بند بند؟ . . . . اور رات چپ تھی۔

انار کلی کی طرف سے ایک نوجوان آتا دکھائی دیا۔ وہ میرے پاس سے گزر گیا۔ مگر پھر لوٹ آیا۔ جیسے اس نے میرا راز بھانپ لیا ہو۔

بولا۔ کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں؟"

"تو بھی"

"اپنا کوئی دوست نہیں غم گسار نہیں۔"

"میں تو ہوں۔"

اس کی بڑی اور روشن آنکھوں میں میں نے انسانی ہمدردی کی جھلک دیکھ لی۔ اس کی آواز نے بھی مجھ پر اثر کیا۔ اس کا لباس میری طرح سادہ تھا۔

وہ بولا "میرے ساتھ چلو گے؟"

میں اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ جیسے اس نے مجھ پر کوئی جادو کر دیا تھا۔ راستے میں وہ پہلے خاموش رہا پھر اس نے پوچھا "آخر تم اتنے اداس کیوں ہو؟"

"میرے دل میں بہت پریشانی رہتی ہے میں اس زندگی کے کچھ معنی نہیں سمجھتا۔ اور میں تو چاہتا ہوں کہ یہ کھیل ختم کر ڈالوں . . . . ."

سائیکل ٹھہرا کر کے وہ مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ جیسے وہ میرے خیال کی داد دے رہا ہو۔ اور خود بھی کسی دن خودکشی کرنے والا ہو۔

ہم آگے بڑھے۔ خاموشی نے ہم دونوں کے ہونٹ سی دئے۔ وہ کون تھا۔ یہ میں نے اب تک نہ پوچھا تھا میں کون ہوں، اس نے بھی تو یہ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی تھی ہم صرف دو آدمی تھے، بغیر کسی لیبل کے۔

اس وقت وہ میرا مرحوم دوست بھی آملتا تو شاید مجھے پہچان نہ پاتا۔ میں ایک نیا آدمی تھا۔

چلتے چلتے ہم میکلوڈ روڈ پر جا پہنچے۔ یہ سڑک میں سینکڑوں بار دیکھی تھی اس خاموشی میں وہ کتنی متین تھی کتنی پُرسکون۔ وہ نوجوان آگے آگے جا رہا تھا اور میں اس کے پیچھے پیچھے۔

ہم ایک مکان میں داخل ہوئے۔ یہ کس کا گھر تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا۔ میں نے پوچھا بھی نہیں۔ اس نے مجھے برآمدے میں ایک بنچ پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ اور خود اندر چلا گیا۔

آدھ گھنٹے کے بعد وہ ایک بزرگ صورت آدمی کے ہمراہ باہر آیا میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور آداب بجا لایا۔

میں کہاں ہوں؟ اور کس کے سامنے کھڑا ہوں؟ یہ سوالات اس وقت میرے دل میں جگہ نہ پا سکے۔ میں صرف ایک آدمی تھا اور میرے سامنے دو آدمی بیٹھے تھے۔ جن میں سے ایک کو جو بزرگ صورت تھا، آداب بجا لانے میں میں حق بجانب تھا۔

نوجوان نے اس بزرگ کو میری حالت بتا دی ہوگی۔ یہ میں سمجھ گیا میں گھبرایا نہیں۔ میرے ماحول کا سب سے ضروری سوال تھا۔ موت کا راز میں اسے سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس کے بغیر زندگی بے معنی معلوم ہوتی تھی، اس کے متعلق مجھ میں ایسے بیسیوں تاثرات اُٹھتے رہتے تھے جنھوں نے سچ مچ مجھے دیوانہ بنا ڈالا تھا۔ موت کے بعد بھی زندگی کا سلسلہ ٹوٹ تھوڑا ہو گا۔ اور اس کے بعد کی حالت اس موجودہ حالت سے اچھی ہی ہوگی۔ اور اگر نہ ہو تو بھی کونسا گھاٹا پڑ جائے گا؟ . . . . . اور میرا فیصلہ جھٹ خودکشی کے حق میں اور بھی پختہ ہو جاتا۔

وہ بزرگ بولا: "اچھا تو تم خودکشی کرنے جا رہے تھے؟"

"ہاں، صاحب!"

اس کے بعد وہ چپ ہو گیا۔ وہ کیا سوچ رہا تھا میں کچھ نہ جانتا تھا۔ میں چپ بیٹھا تھا۔ اور وہ نوجوان بھی اس بزرگ کی بغل میں چپ بیٹھا تھا

وہ بزرگ پھر میری طرف مخاطب ہوا: "اچھا تو تم خودکشی کا ارادہ

اب بھی رکھتے ہو؟"

میں چپ رہا۔ جیسے میں کوئی مجرم تھا۔ حوصلہ کرکے میں نے دھیرے سے کہا "کچھ کچھ"

وہ مسکرایا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں سچ مچ ایک مجرم ہوں۔ اور یہ صرف اس کی عظمت ہے کہ میرے تھپڑ مارنے کی بجائے وہ صرف مسکرا رہا ہے۔

پھر وہ بولا "تمھارا مذہب؟"

میں چپ تھا۔ میں مذہب کی قید میں نہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ طالب علم کی زندگی کے لئے مذہب کے قافیئے اور ردیف کی چنداں ضرورت نہیں۔

اس نے کہا "تم کچھ جواب نہ دوگے تو میں تمھیں اپنی بات کیسے سمجھاؤں گا؟ ہاں تو بتلاؤ کہ تم مسلمان ہو۔ ہندو یا عیسائی؟"

میں نے بتایا کہ میں ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوا ہوں۔

"تو تم مسئلہ تناسخ میں تو یقین رکھتے ہو؟"

"کچھ کچھ"

وہ پھر چپ ہو گیا۔ میں اس کے سنجیدہ چہرے کی طرف دیکھنے لگا میں نے سمجھا کہ میں کسی خضر کے سامنے بیٹھا ہوں۔ اور وہ میری رہنمائی کرنے چلا ہے۔ دل میں اب پہلی بے کلی نہ تھی۔ میں سوچنے لگا کہ یہ میری زندگی کا ایک اچھا دن ہے۔

وہ بولا "اس مسئلہ کے مطابق مرنے کے بعد تمھاری تین حالتیں ہو سکتی ہیں۔۔۔۔۔"

یہاں وہ ذرا رک گیا۔ میں نے سوچا یہ آدمی ضرور ایک بڑا عالم ہے اور اس کے قدموں میں یوں بیٹھ کر زندگی اور موت کا گہرا راز پالینا میرے لئے ایک فخر کی بات ہے۔

"۔۔۔۔ یا تو تم اس صورت سے بہتر صورت پا سکتے ہو۔ یا بالکل ایسی ہی۔۔۔۔۔ اور یا پھر اس سے بھی خراب۔۔۔۔۔"

میں دھیان سے سن رہا تھا۔

"۔۔۔۔۔ تو گویا بہتر زندگی پانے کی صرف ایک تہائی امید ہی رہ جاتی ہے۔۔۔۔۔۔ اور پھر خودکشی کی تکلیف!۔۔۔۔۔ نہیں بھائی نہیں۔۔۔۔ اس تھوڑی سی موہوم امید پر میں تو کبھی مرنا پسند نہ کروں"

میں ایک نیا آدمی بن گیا۔

اب میں مجرم نہ تھا۔ اس بزرگ نے مجھے بچا لیا تھا۔ میں جینا چاہتا تھا۔ موت کے بعد زندگی کے متعلق میرے شکوک و شبہات بیدار ہو گئے۔۔۔

آداب بجا لاکر میں نے اجازت لی۔ وہ نوجوان مجھے دروازے تک پہنچانے آیا۔ میں نے احسان مندانہ نگاہ سے اس کی طرف دیکھا اور آہستہ سے اس نے میرے کان میں کہا "آپ شاعر اقبالؔ ہیں!"

دیوندر ستیارتھی

یادِ اقبال

سرمایۂ علم و خرد و اہلِ فن — وہ شاعرِ بے مثال و یکتائے زمن
پھیلی ہوئی روشنی تھی جس کے دم سے — افسوس کہ بجھ گئی وہی شمعِ سخن
اب قوم کی آنکھوں کا ستارہ نہ رہا — جس سے اردو کو تھا سہارا نہ رہا
سر پیٹ کے دنیائے ادب کہتی ہے — افسوس کہ اقبال ہمارا نہ رہا
غفلت میں تھی قوم اُس کو خبردار کیا — خطرے سے قدم قدم پہ ہشیار کیا
ہر حال میں مذہب کا رہا دل سے خیال — مرتے ہوئے توحید کا اقرار کیا
اشعار میں وہ خودی بتانے والا — بھٹکے ہوؤں کو راہ پہ لانے والا
طوفانِ اجل کی گود میں سوتا ہے — منجدھار سے کشتی کو بچانے والا
جو قوم پہ جان اپنی فدا کرتا ہے — اپنے لئے سامانِ بقا کرتا ہے
مرتا ہے تو اس کے لئے بچہ بچہ — درگاہِ الٰہی میں دعا کرتا ہے
اقبال کی ہستی کو سحر سے پوچھو — اختر سے، شمس سے قمر سے پوچھو
پوچھو غیروں سے یا نہ پوچھو لیکن — اقبال کے شعروں کے اثر سے پوچھو
گو ہم میں نہیں ہے اب وہ فردوس مقام — پیغامِ حیات ہے مگر اس کا کلام
آغاز مبارک تھا جہاں میں جس کا — صد شکر ہوا بخیر اس کا انجام
کب پنجۂ موت سے بھلا ڈرتے ہیں — ہنستے ہوئے دنیا پہ نظر کرتے ہیں
اللہ کے نام پر نکلتی ہے روح — مرنے والے جہاں میں یوں مرتے ہیں

اختر کاکوی

تبرکاتِ احسن

کیا کہیئے حسرتوں کی خلش ہجرِ یار میں
الجھا ہوا ہے دامنِ دل خارزار میں

آہیں رکی رہیں دلِ پُراضطرار میں
یہ رکھ رکھاؤ چاہیئے صبر و قرار میں

ایسے چمن سے عاشقِ گل کیا نہال ہوں
پھولوں کی ڈالیاں ہوں جہاں دستِ خار میں

جھکتی ہے وہ تو اور بھی کھنچتے ہیں دل اُدھر
پنہاں ہیں شوخیاں نگہِ شرمسار میں

دل بے قرار، عمر گریزاں، نفس رواں
ہم کیا جمیں کسی نظرِ اعتبار میں

احسن بلاکشانِ محبت کی خیر ہو
حلقے پڑے ہیں آج سوا زلفِ یار میں

حضرت احسن مارہروی مرحوم

غزل

شورشِ دل کا تلاطم کس گھڑی کس دم نہ تھا
تھا یہ اک قطرہ سمندر سے مگر کچھ کم نہ تھا

عہدِ طفلی سے جوانی تک رہے تھے خوابِ ناز
آئی جب پیری تو دم لینے کا ہم میں دم نہ تھا

اک جہنم ہو گیا جن سے سمجھے ہست و بود
حلقۂ آغوشِ مادر خلد سے کچھ کم نہ تھا

جب کوئی ہمدرد پایا ٹپ سے آنسو گر پڑے
قطرۂ خونِ جگر کب رشکِ موجِ یم نہ تھا

عمر بھر روتے ہی گزری شاعرِ غم آشنا
تیری قسمت میں بجز زخمِ جگر مرہم نہ تھا

آغا شاعر قزلباش دہلوی مرحوم

قلوبطرہ کی مو

ایک تاریخی خاکا

کردار

قلوبطرہ .. .. ملکۂ مصر

انطونی .. .. قلوبطرہ کا عاشق

شارمین، آئرس .. .. قلوبطرہ کی خواصیں

فسانہ گو .. .. جو داستان کے کچھ حصے پڑھے گا

افسانہ گو: قلوبطرہ دنیا کی حسین ترین عورت تھی۔ اس کا حسن کئی انقلابوں اور خوں ریزیوں کا باعث ہوا ـــــ اس ساحرہ کے حسن و عشق کے قصے جہاں دریائے نیل کے ملاحوں کو ازبر یاد ہیں وہاں تمام دنیا کو بھی معلوم ہیں۔

قلوبطرہ مصر کے نالائق بادشاہ **بطلیموس اولیت** کی بیٹی تھی یہ بادشاہ ۸۰ قبل از مسیح سے لے کر ۵۱ قبل از مسیح تک حکمراں رہا۔ اپنی سترہ برس کی جوان بیٹی قلوبطرہ کے سر پر اپنا زنگ خوردہ تاج رکھ کر اس نے دنیا کو خیرباد کہی۔

ملکۂ مصر قلوبطرہ فاتحوں کی فاتح تھی۔ اس نے **جولیس سیزر** کو اور اس کی موت کے بعد **مارک انطونی** کو جس کے ہاتھ میں ان دنوں دنیا کی باگ ڈور تھی اپنے حسن و جمال سے مسحور کیا ـــــ

اس حسین قاتلہ نے انطونی کو تو ہمیشہ کے لئے تباہی کے سیلاب میں بہا دیا۔

تاریخی واقعات بتاتے ہیں کہ انطونی نے اپنی بیوی **اوکتاویہ** کے ناپسندیدہ رویے سے مجبور ہو کر اس کے بھائی **اوکتے ویانوس** کی سخت توہین کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہو گئی۔ اور پارتھینیوں پر فتح حاصل کر کے انطونی نے روم کو مکمل طور پر تاراج کرنے کی کوشش کی اور اسکندریہ کی پرانی عظمت کو زبردست دھکا لگایا۔ ـــــ اس نے صاف طور پر اعلان کر دیا کہ روم کی سلطنت کا اصل حق دار قلوبطرہ اور اس کا بیٹا **سیزرین** ہے۔ ان حالات کے پیش نظر **اوکتے ویانوس** اور انطونی کی جماعتوں میں جنگ ہونی ناگزیر تھی ـــــ چنانچہ **اکتی ایم** کے مقام پر ایک معرکہ خیز جنگ ہوئی ـــــ اس جنگ میں قلوبطرہ بھی شریک تھی مگر اپنی جان بچا کر بھاگ نکلی اور اسکندریہ میں پناہ لی۔ انطونی شکست کھا کر وہیں چلا آیا۔ جہاں اس نے اپنی وفادار فوجوں کو دوبارہ جمع کرنے کی کوشش کی ـــــ

انطونی اور **قلوبطرہ** اب محسوس کرنے لگے تھے کہ انھوں نے ایک دوسرے

کو سمجھنے میں غلطی کی ہے چنانچہ دونوں کے دلوں پر غم والم کی گھٹائیں چھا گئیں — لیکن ایک آرزو ابھی تک ان کے دل میں باقی تھی کہ انجام کار ان کا ملاپ ہو جائے۔

انطونی لبیا سے ناامید ہو کر اسکندریہ آیا — اس اثنا میں اوکتے ویانوس کی فوجیں اسکندریہ کے دروازوں تک پہنچ گئیں — انطونی نے ایک بار پھر اپنی کھوئی ہوئی طاقت اور دلیری سے کام لے کر دشمن کا مقابلہ کیا لیکن فوج نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا — بالکل تنہا دل میں ہزاروں حسرتوں کا خون لئے جب وہ اپنے محل میں آیا تو قاصد نے خبر دی کہ قلوبطرہ نے خودکشی کر لی ہے — یہ دراصل قلوبطرہ کی ایک چال تھی۔ اسے ڈر تھا کہ انطونی اس کی غداری پر خشمگیں ہوگا — لیکن قلوبطرہ کو معلوم نہیں تھا کہ اس کی یہ چال اس کے عاشق پر بہت مہلک اثر کرے گی — انطونی دل میں بہت شرمندہ ہوا کہ ایک عورت کی محبت اس سے بڑھ گئی چنانچہ جوش میں آکر اس نے اپنے سینے میں تلوار بھونک لی۔

جب قلوبطرہ کو اطلاع ہوئی تو اس نے بڑی منتوں سے اپنے عاشق کو کہلا بھیجا کہ جس طرح ممکن ہو وہ اس کے پاس چلا آئے — چنانچہ انطونی کے ملازم اپنے زخمی آقا کو اٹھا کر اس عمارت کے دروازے تک لے آئے جس میں قلوبطرہ نے خود کو چھپا رکھا تھا قلوبطرہ نے خوف سے دروازہ نہ کھولا۔ ایک کھڑکی سے نیچے رسیاں پھینکی گئیں جن کی مدد سے زخمی انطونی کمرے کے اندر سلایا گیا۔

(انطونی کے کراہنے کی آواز)

قلوبطرہ:- انطونی — انطونی (رو کر)۔۔۔۔ تیرے دشمنوں کو یہ کیا ہو گیا ہے — یہ لہو — یہ لہو — کوئی ہے — کوئی ہے — آئرس — آئرس — کچھ کرو۔ مقدس دیوتاؤں کی خاطر کچھ کرو۔

انطونی:- یہ کون ہے — یہ کس کا ہاتھ ہے — تو زندہ ہے — تو زندہ ہے قلوبطرہ — تو سچ مچ زندہ ہے — آہ۔ میری موت کو کس قدر صدمہ پہنچا ہے۔ وہ مڑ مڑ کر تیری زندگی کی طرف دیکھ رہی ہے — قلوبطرہ — قلوبطرہ۔

قلوبطرہ:- انطونی میں زندہ ہوں پر موت کی گود میں — تو مطمئن رہ تیری موت اکیلی سفر پر نہیں جائے گی — تو مجھ پر شک کرتا ہے انطونی — تو سمجھتا ہے کہ میں نے لڑائی میں تجھے دھوکا دیا — نہیں نہیں — مقدس دیوتاؤں کی قسم نہیں — میں ڈر گئی تھی جنگ کے میدان میں میری روح کے قدم لڑکھڑا گئے تھے — میں بھاگ نکلی — جان بچانے کے لئے نہیں — خودکشی کرنے کے لئے — اس لئے میں نے تجھے اطلاع بھیجی پر مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تو مجھ سے پہلے اس راستے پر گامزن ہو جائے گا جس پر تیری محبوبہ چلنے کا ارادہ کر رہی تھی۔

انطونی:- جان من۔ مجھے تجھ پر پورا بھروسا ہے — چھوڑ ان بے کار باتوں کو۔۔۔۔۔۔ زندگی اور موت کے درمیان جب ایک مٹھی بھر ریت کا فرق رہ جائے تو ایسی باتیں نہ کرنی چاہئیں — آ۔ پیار محبت کی باتیں کریں۔

قلوبطرہ:- (پھوٹ پھوٹ کر روتی ہے) انطونی — انطونی —

(تھوڑا وقفہ)

انطونی:- قلوبطرہ۔ یہ تو نے کیا کیا — اپنا سارا چہرہ میرے خون سے تر بتر کر لیا — تیرے گالوں کی سرخی میرے خون کی شرمندۂ احسان نہیں ہونی چاہئے — لا میں اسے پونچھ دوں۔

انطونی: میرا دم گھٹتا جا رہا ہے ——— دنیا سکڑ رہی ہے

قلوبطرہ: انطونی۔ انطونی مصر کے سارے مقدس دیوتا اپنی شہ نشینوں میں اوندھے پڑے ہیں ——— میری پکار کون سنے گا ——— کون سنے گا۔

انطونی: قلوبطرہ ان باتوں کو چھوڑ جن کا جواب بڑے بڑے کاہن بھی نہیں دے سکے ——— زندگی کی مختصر گھڑیاں جو موت نے مجھے بخشی ہیں فضول باتوں میں ضائع نہ ہوں ——— جان من۔ ابھی تک میرے پاس چومنے کے لئے ہونٹ حسن کا نظارہ کرنے کے لئے آنکھیں اور تیری نقرئی آواز سننے کے لئے کان موجود ہیں ——— آ ——— اس پرانی یاد کو تازہ کریں جب اودی اودی گھٹائیں جھوم کر اٹھتی تھیں اور تیرے بربط سے نغمے یوں اٹھتے تھے جیسے دو آتشہ شراب سے چنگاریاں ——— جب تیری آواز ہوا میں پہیلیاں بکھیرتی تھی ——— یاد ہیں تجھے وہ دریائے نیل کی راتیں . . .

(آواز ہلکی ہو جاتی ہے)

قلوبطرہ: (گھبرا کر) . . . . . انطونی . . . .

(تھوڑا وقفہ)

انطونی: (ہوش میں آکر) . . . . کیوں . . . . نہیں نہیں . . . . میں زندہ ہوں ——— مجھے یاد ہے میں کیا کہہ رہا تھا ——— دریائے نیل کی راتیں صرف اس لئے خاموش ہوتی تھیں کہ تجھے انطونی سے کچھ کہنا ہوتا تھا ——— جو صرف اس لئے اندھیاری ہوتی تھیں کہ تجھے نقاب الٹنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے ——— مجھے یاد ہیں مجھے یاد ہیں وہ راتیں جب تیری اجلی پیشانی سے میں سیاہ زلفیں یوں ہٹاتا تھا جیسے یونانیوں کی دیوی ارورا رات کے سیاہ پردے ہٹا کر مشرق کے روپہلے پھاٹک کھول دے ——— آہ لیکن اب اس پیار کا مدفن بننے والا ہے۔ اس سینے میں جو کہ زخمی ہو رہا ہے ——— قلوبطرہ تیرا انطونی اب چند گھڑیوں کا مہمان ہے۔

قلوبطرہ: (چلا کر) . . . . . انطونی . . . . انطونی . . . . میرے مالک . . . . . میرے مالک ——— تیری کنیز کے دل میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ ایسی دکھ بھری باتیں سن سکے ——— قلوبطرہ کے سینے میں عورت کا دل ہے انطونی۔

انطونی: جب انطونی مر جائے تو صبر کرنا اور زندہ رہنا۔

قلوبطرہ: (چلا کر) ایسا ہرگز نہیں ہوگا ——— قلوبطرہ کی زندگی تیری زندگی سے وابستہ ہے ——— مایوس نہ ہو پیارے کیا پتہ ہے کہ یہ زخم اچھے ہو جائیں۔

انطونی: (کمزور آواز میں) ان نئے زخموں نے پرانے گھاؤ بھی ہرے کر دیئے ہیں ——— میرے جسم سے اب خون کے آخری قطرے نکل رہے ہیں ——— لیکن کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ وہ شخص جو زرہ اور لہو سے کھیلتا رہا ——— جس کا اوڑھنا بچھونا جنگ کا میدان تھا ——— آج میدان جنگ میں کسی حریف کے ہاتھوں مرنے کے بجائے ایک حسین عورت کے زانو پر سر رکھے جان دے رہا ہے ——— جنگجو سپاہی ہونے کی حیثیت سے مجھے یہ موت پسند نہیں اس لئے کہ کسی کشور کشا فاتح کو ایسی موت زیب نہیں دے سکتی ——— لیکن چونکہ میں جنگی سپاہی کے مقابلے میں عاشق زیادہ ہوں اس لئے یہ موت میرے لئے باعث راحت ہے ——— مجھے یہ اطمینان تو نصیب ہے کہ میں تیرے مرا ہوں ——— صرف تیرے لئے ——— قلوبطرہ ——— قلو . . . .

قلوبطرہ: انطونی ——— انطونی (چلاتی ہے) . . . . انطونی . . . . اُف میں ——— اُف میری دنیا تاریک ہو گئی ——— میں اجڑ گئی ——— برباد ہو گئی۔

شہر پر اب اوکتے ویانوس کا قبضہ تھا۔ انطونی کی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے تھے اس لئے شہر کو مسمار کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ اوکتے ویانوس نے قلوبطرہ کو گرفتار کرنے کی غرض سے ایک فوجی افسر گالس کو روانہ کیا۔ اس کی خواہش تھی کہ قلوبطرہ زندہ گرفتار کر کے اس کے حضور میں پیش کی جائے۔ گالس اس مہم میں کہاں تک کامیاب ہوا۔ اس کے متعلق تاریخ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ باتیں کرتے کرتے وہ کس حیلے سے قلوبطرہ کو دروازے کے پاس لے آیا۔ اسی اثنا میں تین آدمی کھڑکی کے ذریعے سے عمارت میں اترے اور قلوبطرہ سے وہ خنجر چھین لیا جسے وہ ہاتھ میں لئے کھڑی تھی۔ اس نے یہ ارادہ کر رکھا تھا کہ اگر کسی نے اس کو گرفتار کرنا چاہا تو وہ خنجر سے اپنا کام تمام کر لے گی۔

—— قلوبطرہ کو معلوم تھا کہ اس کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا جائے گا۔ اس نے جب یہ سنا کہ وہ جلاوطن کر دی جائے گی تو اس نے اجازت طلب کی کہ اسے انطونی کی قبر کی زیارت کرنے دی جائے۔ یہ اجازت اسے مل گئی۔ چنانچہ آخری بار وہ چند سپاہیوں اور ایک دو سہیلیوں کے ساتھ انطونی کی آرام گاہ کی طرف روانہ ہوئی۔

(رونے کی آواز)

قلوبطرہ:۔ انطونی ...... انطونی ...... قبر کی گہرائیوں سے نکل آ —— تیری قلوبطرہ آنکھوں میں آنسو، دل میں غم اور جگر میں کئی ٹیسیں لئے تیرے پاس آئی ہے ...... وہ مغموم ہے ...... بے حد مغموم ہے انطونی ...... تیری موت اس کی زندگی پر ایسے نقش چھوڑ گئی ہے جو کبھی نہیں مٹیں گے —— تجھ سے اس نے سچی محبت کی۔ صرف تجھ ہی کو اس نے وہ گوہر دیا جس کو حاصل کرنے کے لئے فرشتے بھی آسمان پر تڑپتے ہوں گے۔

(رونے کی آواز —— تھوڑا وقفہ)

قلوبطرہ:۔ لیکن ...... لیکن میں تیری قاتل ہوں —— میں نے ہی یہ منحوس گھڑی تیرے سینے پر ڈالی ہے —— تیری زندگی پر موت کا بھاری پتھر میں نے ہی رکھا ہے —— میں زندہ ہوں لیکن اکیلی —— تیری قبر کی تنہائی اس تنہائی سے بہت کم خوفناک ہے جس میں کہ میں لپٹی ہوئی ہوں —— تو مردہ ہے لیکن ایک نئی زندگی کے راستے پر گامزن ہے —— میں زندہ ہوں لیکن موت کی تمنا نہیں کر سکتی۔ وہ میری موت نہیں چاہتے، زندگی چاہتے ہیں —— زندگی جو کہ مسلسل موت ہو گی —— اے آرام کرنے والے۔ اب کہ تو موت کی آغوش میں بے خبری کی نیند سو رہا ہے مجھ پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے جا رہے ہیں —— قدرت کی ستم ظریفیاں دیکھ، تو رومن ہے اور مصر میں مدفون ہے۔ میں مصری ہوں اور روم میں دفن کی جاؤں گی —— انطونی —— انطونی۔ اس بےکسی کے عالم میں تجھے میں کچھ نذر نہیں کر سکتی۔ میری زندگی حاضر ہے جس کے ہر ذرے پر تیرے بوسے اور آنسو چمک رہے ہیں —— اب تیری کنیز کے دل میں کوئی تمنا ہے تو صرف یہ کہ مرنے کے بعد اسے تیرے پہلو میں دفن کیا جائے —— کیا میری یہ خواہش پوری ہو گی —— میں کچھ نہیں کہہ سکتی —— میں کچھ نہیں کہہ سکتی ......

اوکتے ویانوس نے حکم دے رکھا تھا کہ ملکہ پر سخت پہرہ رہے تاکہ وہ خودکشی نہ کرنے پائے —— اس کا ارادہ تھا کہ قیدی بنا کر قلوبطرہ کو روم لے جائے۔ اور وہاں اپنی فتح کی خوشی میں ایک شاندار جلوس نکالے اس جلوس میں وہ قلوبطرہ کو زنجیریں پہنا کر اپنے جلو میں رکھے مگر ملکہ مصر کو یہ بےعزتی منظور نہ تھی۔

قلوبطرہ اس عمارت میں جو کہ اس نے خاص طور پر اپنے لئے تعمیر

کے مندر کے پاس بنوائی تھی نظر بند تھی۔ اس کے ساتھ اس کی دو خواصیں تھیں آئرس اور شارمین۔

(آئرس مندرجہ ذیل گیت گاتی ہے)

اے نیل کی رانی
رفتار میں اڑتے ہوئے بادل کی روانی
ہونٹوں کے خموں پر شفق آلود سا پانی
اے نیل کی رانی
سینہ ہے کہ لہروں پہ کنول ناچ رہے ہیں
زلفیں ہیں کہ لہراتی ہے ساون کی جوانی
اے نیل کی رانی

قلوبطرہ:۔ (اکتا کر) ...... بند کر —— بند کر آئرس اس گیت کو بند کر —— موت کو ایسی لوریاں نہ سنا —— آنے دے اسے —— آنے دے۔

آئرس:۔ ملکۂ مصر کی طبیعت آج ناساز معلوم ہوتی ہے۔

قلوبطرہ:۔ (ہنستی ہے) ملکۂ مصر —— میرا مذاق اڑاتی ہے آئرس؟ —— تیری اس ملکہ سے تو وہ بانسری بجانے والی چھوکریاں ہزار درجے بہتر ہیں جو اپنا گلا جب چاہے کاٹ سکتی ہیں —— ملکۂ مصر سے تو وہ کسبیاں بڑے آرام اور سکون میں ہیں جو اسکندریہ کے گلی کوچوں میں راہ گزروں سے آنکھیں لڑاتی رہتی ہیں —— کیا واقعی میں ملکہ ہوں —— کیا واقعی میں مصر کی وہ سرکش حکمراں ہوں جس کا غلام بننے میں انطونی جیسے فاتح نے فخر محسوس کیا —— کیا سچ مچ میں وہی مہارانی ہوں جس کے ابرو کے ایک اشارے پر سرمش جیسا باغی ناچا کیا —— کیا میں وہی حسینہ ہوں جس کی ایک ادا نے سیزر کو تمام جنگی داؤ پیچ بھلا دئے —— نہیں نہیں —— میں کچھ بھی نہیں ہوں صرف ایک عورت باقی رہ گئی ہوں جو رومیوں کے خوف سے چوہیا کے مانند اپنے بل میں دبکی بیٹھی ہے —— میں عنقریب گرفتار کر لی جاؤں گی میرے ان گورے گورے ٹخنوں میں جن پہ سونے اور چاندی کے خلخال جھنجھناہٹیں نچھاور کیا کرتے تھے لوہے کی موٹی زنجیریں پہنا کر دو مجھے روم کے بازاروں میں پھرائیں گے —— مجھے ننگا کر دیا جائے گا روم کے کنجڑوں اور حجاموں کی آنکھیں بھی اس حسن کا نظارہ کریں گی جو اب تک صرف چند خوش نصیب لوگوں تک محدود رہا ہے —— روم کا تپتا ہوا سورج میرے اس گدرائے ہوئے جسم کی تمام رعنائیوں کو بھسم کر دیگا —— ملکہ —— کیا ملکہ ایسی ہی بدنصیب عورتوں کا نام ہوتا ہے —— (وقفہ) .... کیا اس ذلت سے بچنے کی کوئی ترکیب نہیں۔

شارمین:۔ جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔

قلوبطرہ:۔ (ہنستی ہے) .... جان کی امان .... کہہ تجھے کیا کہنا ہے —— شارمین تیری ان سیاہ آنکھوں میں آنسو آج ایسے چمک رہے ہیں جیسے کالی گھٹاؤں میں پانی —— بتا تجھے کیا کہنا ہے۔

شارمین:۔ ملکۂ مصر ملکۂ مصر ہی رہے گی —— اس کے دشمنوں کو اپنے ارادے میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔

قلوبطرہ:۔ کیسے —— کیسے شارمین جلد بتا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

شارمین:۔ میرے منہ میں خاک .... اگر ملکہ کو دشمن ذلیل کرنے ہی کا ارادہ رکھتے ہیں تو بہتر ہے کہ ......

قلوبطرہ:۔ لیکن یہ کیونکر ہو سکتا ہے —— تو ٹھیک کہتی ہے

شارمین:۔ اس ترکیب سے ملکہ ملکہ ہی رہے گی۔ مرتے دم تک اس کی شان میں فرق نہ آئے گا لیکن تو جانتی ہے کہ ہم پر کتنی کڑی نگرانی کی جا رہی ہے ـــــ زرشتہ موت کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ اگر پہرہ داروں نے سن لی تو معلوم ہے مجھے اوکٹے ویانوس میری اولاد کے ساتھ کیسا سلوک کرے گا ـــــ اور تو جانتی ہے اگر میں اپنی کوشش میں ناکام رہی تو وہ موت کے دروازے ایک عرصے تک مجھ پر بند کر دے گا ـــــ وہ مجھے آہستہ آہستہ مارنا چاہتا ہے۔ وہ ایک طویل مدت تک مجھ پر جانکنی کا عالم طاری کرنا چاہتا ہے ـــــ مگر ایسا نہیں ہونا چاہئے بقول تیرے اس کو اپنے ارادوں میں ناکامی ہونی چاہئے ـــــ آئرس ـــ آئرس۔

آئرس:۔ ارشاد۔

قلوپطرہ:۔ مجھے ایک ایسا سانپ چاہئے۔ جو صرف ایک بار ڈسنے سے مجھے موت کی نیند سلا دے۔ ـــــ کیا اسکندریہ کے سپیرے تیری کالی زلفوں کے بدلے تجھے ایسا سانپ نہیں دیں گے۔

آئرس:۔ کنیز کوشش کرے گی۔

قلوپطرہ:۔ اور دیکھ یہ سانپ اس طور پر میرے پاس لایا جائے کہ پہرہ داروں کو بالکل شک نہ ہو۔

آئرس:۔ لونڈی ہوشیاری سے کام لے گی۔

قلوپطرہ:۔ شاباش آئرس شاباش۔ تیری ملکہ کی موت ہمیشہ تیری احسان مند رہے گی ـــــ اب تو جا اور اپنا کام کر۔ میں اس کمرے میں تیرا انتظار کروں گی۔

(وقفہ ـــــ بربط کے تار چھیڑنے کی آواز)

قلوپطرہ:۔ شارمین چھوڑ اس بربط کو ـــــ جا میرے غسل کا سامان تیار کر۔ میرا بہترین لباس نکال ـــــ میرا جسم آج قیمتی سے قیمتی عطروں میں بسا دے ـــــ ملکہ ملکہ ہی رہے گی ـــــ اس کا وقار کبھی اس ردی کتے کے آگے گھٹنے نہیں ٹیکے گا ـــــ جا میری موت کے استقبال کی تیاریاں کر۔

افسانہ گو:۔ قلوپطرہ نے غسل کیا۔ شارمین نے اس کو خوشبوؤں میں لپیٹ دیا۔ جو لباس اس نے موت کا استقبال کرنے کے لئے پہنا بہت حسین اور خوش رنگ تھا۔ سر پر تاج تھا جس پر گدھ بنا ہوا تھا۔ گدھ کے پھیلے ہوئے پر قلوپطرہ کے کانوں کو ڈھانپے ہوئے تھے ـــــ وہ بلا کی حسین نظر آ رہی تھی۔

قلوپطرہ:۔ شارمین ادھر آ ...... ادھر آ اور ان البیلی اور بدمست رامشگروں کی داستانیں سنا جو اسکندریہ کی گزرگاہوں پر حسن و عشق کا چھڑکاؤ کرتی رہتی ہیں ـــــ ان الھڑ چھیل چھبیلی کمسن بانسری بجانے والی چھوکریوں کی باتیں کر جو مصر کے باغیچوں میں ہر جھاڑی کو اپنی جوانی کا راگ سنا چکی ہیں ـــــ دیوی اشطر کے مندر میں جانے والی ان کنواریوں کے رنگین فسانے سنا جن کی جوانیاں پھٹ پڑنے والے جام ہیں ـــــ مصر کے ان عشق پیشہ نوجوانوں کی کہانیاں یاد کر جن کے لبادوں کے ہر شکن میں کئی کئی کپکپاہٹیں اٹکی رہتی ہیں۔

شارمین:۔ کنیز کو گانے کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔

قلوپطرہ:۔ تو اٹھا بربط اور ایک ایسا گیت سنا کہ فرشتے بھی آسمان کی کھڑکیاں کھول دیں۔

شارمین:۔ (مندرجہ ذیل گیت گاتی ہے)

پل پل تارے ٹوٹ رہے ہیں کیوں تیرے نینن سے ـــــ میری راج کماری
آگ مجھے نو لاکھ سے کھیلو۔ لاگے مجھے تو من سے ـــــ جیون کھیل ہے پیاری

ڈھونڈے سے رستہ نہ ملے تو راہ میں ہنسنا گانا   دنیا گیت ہے سجنی
دکھ ہی دکھ ہیں جب قسمت میں دکھ سے من بہلانا   اپنی ریت ہے سجنی

نین نہ آئے تو راتوں کو تارے گن گن کاٹو   اُف یہ ڈوبتے تارے
کانٹوں پہ ہنس ہنس کر لیٹو اور یوں ہی دن کاٹو   یہ دن پیارے پیارے

پل پل تارے ٹوٹ رہے ہیں ......

قلوپطرہ :- کتنا حسین گیت ہے   کیسی دلکش آواز ہے
آنسوؤں کی انوکھی دنیا اس میں آباد ہے ...... (ٹھہر کر)
...... شارمین ...... شارمین ...... تو کہاں ہے آئیری
چھاتی سے چمٹ جا ...... بادل چھا رہے ہیں (گرجنے کی آواز) ......
تاریکی پھیلتی جا رہی ہے ...... اب مجھے جانا ہوگا ...... اب
مجھے جانا ہوگا۔

آئیرس :- ملکۂ مصر کے سفر کا سامان تیار ہے۔

قلوپطرہ :- تو آگئی ——— تو آگئی آئیرس ——— لے آئی وہ سانپ ...... کہاں رکھا ہے تو نے اسے ...... (پروقار انداز میں) ...... ملکۂ مصر کا سامان سفر تیار ہے لیکن جلدی کیا پڑی ہے۔ ملکہ جب چاہے سفر اختیار کرے گی ——— میں ملکہ ہوں کنیز نہیں ——— آئیرس ...... تو جانتی ہے میرے سر پہ یہ گدھ کی شکل کا تاج ہوگا ——— گدھ کے پھیلے ہوئے پروں کے نیچے میرے کان چھپے ہوں گے ...... بادل برسیں گے ...... بجلی چمکے گی ...... اس شان سے تیری ملکہ کی سواری نکلے گی ...... اس شان سے اس کی موت کا رتھ آسمان کی جانب روانہ ہوگا۔ جہاں چاند اپنے محل میں تارے اس کی خدمت میں پیش کرے گا ——— چلو آئیرس چلو ...... میرا وقت بہت قیمتی ہے ———

آئیرس :- ملکۂ مصر کے لیے یہ لونڈی نارنجیوں کی ایک ٹوکری نذر کے طور پر لائی ہے

قلوپطرہ :- اس کا ڈھکنا اٹھاؤ۔

آئیرس :- (ڈھکنا اٹھانے کی آواز) پہرہ داروں کی نگاہیں ان خوش رنگ چھلکوں کے نیچے کالے ناگ کو نہیں دیکھ سکیں جو مصر کا سب سے زہریلا سانپ ہے

قلوپطرہ :- سب سے زہریلا سانپ ...... (آہستہ آواز میں) ...... تجھے یقین ہے کہ اس کا زہر واقعی بہت مہلک ہے ؟

آئیرس :- لونڈی کو اس کا یقین ہے مگر آپ کو ...... (سانپ کی پھنکار ——— دبی ہوئی چیخ ——— پھر گرنے کی آواز)

قلوپطرہ :- ٹوکری بند کر دے شارمین ——— ٹوکری بند کر دے ...... آہ۔ غریب آئیرس مر گئی ——— شارمین لا یہ ٹوکری مجھے دے ——— میری کنیز میری راہ دیکھتی ہوگی ——— میں اسے زیادہ دیر تک انتظار میں نہیں رکھنا چاہتی ...... آہ۔ ان نارنجیوں کی خوشبو کتنی پیاری ہے ...... (وقفہ) ...... سورج غروب ہو رہا ہے۔ کالی گھٹائیں چھا رہی ہیں ...... میں دعا مانگنا چاہتی ہوں شارمین میں دعا مانگنا چاہتی ہوں ...... لیکن مجھ سے تو سارے دیوتا ناخوش ہیں ......

(دور سے عبادت گاہوں سے تربی اور نرسنگے کی ہلکی ہلکی آواز آتی ہے)

قلوپطرہ :- آہ ——— یہ نرسنگے اور تربی کی دھیمی دھیمی آواز کتنی خوشگوار ہے ...... آج دریائے نیل بھی کتنا نکھرا ہوا ہے ...... شارمین میری محبت کی ساری داستانیں اس دریا کی لہروں میں لپٹی ہوئی ہیں ——— الوداع نیل کی بل کھاتی ہوئی لہرو الوداع ——— پربت کے کالے بادلوں کی چھتی ہوئی گھٹاؤ الوداع ——— ریت کے ٹیلوں کے پیچھے چھپنے والے سورج الوداع ——— ریگستان میں لہراتی ہوئی پگڈنڈیو الوداع ——— کھجور کے لانبے لانبے درختو میرا سلام قبول کرو ——— گھاس

کی کلی ہنستی ہوئی ہتیپو میرا اسلام لو...... قلوپطرہ زندگی سے پیار ضرور کرتی ہے پر موت سے ڈرتی نہیں...... موت...... آہ ایسے حالات میں موت کا ذائقہ کتنا شیریں ہوتا ہے (ٹوکری کا ڈھکنا کھولنے کی آواز) —— سانپ کی پھنکار —— پھر دبی ہوئی چیخ)....

شارمین الوداع......... (قبر کی سی خاموشی طاری ہو جاتی ہے) ———

سعادت حسن منٹو

غزل

وہ جتنے دُور ہوتے جا رہے ہیں
قریب اتنا ہی اُن کو پا رہے ہیں

انھیں شاید نہیں یہ بھی گوارا
خیالوں سے بھی نکلے جا رہے ہیں

مجھی سے کیا، حیا ہے فطرتِ حُسن
وہ خود اپنے سے بھی شرما رہے ہیں

نویدِ مرگ ہیں اُن کی نگاہیں!
مزے جینے کے اب کچھ آ رہے ہیں

مآلِ عشق ہے برباد ہونا!
سزا اپنے کیئے کی پا رہے ہیں

مجھے اور شکوۂ جورِ تغافل!
بھلا یہ آپ کیا فرما رہے ہیں!

ستم اُن کے بعنوانِ کرم ہیں
تمناؤں سے کھیلے جا رہے ہیں

وہ آتے ہیں، وہ آئے، لو وہ آئے
ہم اپنے دل کو یوں بہلا رہے ہیں

ارے او آنے والے آ بھی جا اب
فلک کے پھول بھی مرجھا رہے ہیں

مری ہستی ہے اک احساسِ باطل
مری ہستی پہ وہ یوں چھا رہے ہیں

سلیمان اریب

انتظار

تو کیا پھر میری ثروت آئے گی تاروں کی چھاؤں میں

مہ و انجم کی ہلکی نقرئی خوش رنگ چھاؤں میں
شراب و شہد سے بھیگی ہوئی رنگیں فضاؤں میں
بہار مے کدہ سے کھیلتی ٹھنڈی ہواؤں میں
تو کیا پھر میری ثروت آئے گی تاروں کی چھاؤں میں

خوشی سے باغ میں نوخیز کلیاں کھلتی جاتی ہیں
بہاریں مسکرا کر پیت کے نغمے سناتی ہیں
برستی بوندیاں مستی کے مے خانے لٹاتی ہیں
تو کیا پھر میری ثروت آئے گی تاروں کی چھاؤں میں

جلو میں اس کے مہر و ماہ کا اک کارواں ہوگا
چمن کی ہر روش سے طور کا جلوہ عیاں ہوگا
نسیم عنبر افشاں سے معنبر بوستاں ہوگا
تو کیا پھر میری ثروت آئے گی تاروں کی چھاؤں میں

میں چھپ کر پیڑ کے پیچھے خوشی کے گیت گاؤں گا
سکوتِ شب میں حشرِ نغمہ سے طوفاں اٹھاؤں گا
میں یوں اپنے لئے فردوس دنیا کو بناؤں گا
تو کیا پھر میری ثروت آئے گی تاروں کی چھاؤں میں

مری آواز سن کر پہلے وہ کچھ مسکرائے گی
بہارِ نشۂ و مستی پھر آخر رنگ لائے گی
وہ میری ہم نوا ہو کر مجھے بے خود بنائے گی
تو کیا پھر میری ثروت آئے گی تاروں کی چھاؤں میں

عزیز اختر سرحدی

بَرات

گاؤں کنارے باجا باجے پیتم دیس بسانا ہوگا

آئے براتی آئے ساجن
آنکھوں میں بٹھلانا ہوگا

دے رہے تن من بیچ کے گاہک
ہاتھ اُن کے بِک جانا ہوگا

گاؤں کنارے باجا باجے پیتم دیس بسانا ہوگا

دھمک رہی ہے دور سے ڈھولک
سوئے بھاگ جگانا ہوگا

چمک رہی ہے مشعل کی لَو
اب تو لگن لگانا ہوگا

گاؤں کنارے باجا باجے پیتم دیس بسانا ہوگا

گونج رہی شہنائی قرنا
من کی پیاس بُجھانا ہوگا

دُھن بنسی کی پریم کی دُھن ہے
اِسی میں گھُل مِل جانا ہوگا

گاؤں کنارے باجا باجے پیتم دیس بسانا ہوگا

پھول کہیں بدھی کے ہنس کر
آنکھ سے آنکھ ملانا ہوگا

پریم کی بھینی بھینی خوشبو
ساجن گھر پھیلانا ہوگا

گاؤں کنارے باجا باجے پیتم دیس بسانا ہوگا

چھل بل دُنیا کی تھوڑی
اس میں جی نہ کڑھانا ہوگا

ساجن کا پیغام یہی ہے
سُکھ کا ساتھ نبھانا ہوگا

گاؤں کنارے باجا باجے پیتم دیس بسانا ہوگا

مقبول احمد پوری

اَصغر کا روزنامچہ

منگل - ۳ جنوری سنہ ۱۹۳۹ء

اور اب ایک دن اَور - اور پھر کچھ ایسا اہم بھی نہیں - نہ جانے یہ روزنامچہ لکھنے کا کام مجھے شروع بھی کرنا چاہیئے تھا یا نہیں مجھے دل کش صفحات کو ایسے خیالات سے پُر کرنا پڑے گا جو اپنی مثالیت اور جلد بازی میں حماقت آمیز ہیں -

آج مجھے ابا جان کا ایک خط ملا - معلوم ہوتا ہے وہ اِس مسلم لیگ کے بہت ہی شیدائی ہو گئے ہیں - میں جانتا ہوں وہ اِس سے پہلے تقریباً ایک سوشلسٹ تھے لیکن اُردو سے انہیں اتنی محبت ہے کہ جب بہار میں کانگرس نے اِس کا قلع قمع کرنا چاہا تو وہ فرقہ وارانہ راہ پر چلنے پر مجبور ہو گئے - میں چاہتا ہوں انہیں میرا خط ضرور مل جائے - ورنہ خدانخواستہ میرے کاروبار میں ایک مالی بُحران پیدا ہو جائے گا -

آج میں دو گھنٹے پڑھتا رہا .... بھی ایک اعجوبہ ہے - وہ ایک مادہ پرست بھی ہے اور ساتھ ہی اشتمالیت کا ایک زبردست حامی بھی - وہ آج میرے ہاں "سکواش" کھیلنے نہیں آیا - مجھے اس سے ذرا ملال ہوا - کیونکہ میں کپڑے بدل کر تیار ہو چکا تھا - بہرحال میں پیشہ ور سکواش باز کے ساتھ کھیلا - اس نے مجھے تقریباً ہلکان کر دیا - اس نے بے رحمی کے ساتھ مجھے میلوں ہی بھگایا - اور خود وہ مزے سے اِدھر سے اُدھر چہل قدمی کرتا رہا - خیر ایک کھیل میں میں بھی اس سے ۸ - ۱۰ پر بازی لے ہی گیا - جو کچھ ایسا بُرا نہ تھا - آج رات میرے دل پر کچھ بوجھ سا ہے - میرا جی چاہتا ہے کہ میں شعر لکھوں لیکن اس خواہش کے مقابل میں اِدھر نیند کا بہت زور ہے - جو اس پر غالب آ رہا ہے - آج کل سردی بڑھ رہی ہے - خدا کرے کہیں پھر برف باری نہ شروع ہو جائے - ورنہ مجھے "ڈیلی ورکر" میں ایک مقالہ لکھنا پڑے گا - جیسے "برڈ" نے "سٹینڈرڈ" میں لکھا :*

(ترجمہ از ب)

اصغر بشیر

---

* برڈ ایک اخبار نویس مصنف ہے - غالباً اس نے انگریزوں کی جبلّی عادت کے مطابق انگلستان کے متلوّن مزاج موسم کو سٹینڈرڈ اخبار میں چند فصیح گالیاں دی ہوں گی - ڈیلی ورکر لندن میں مزدوروں کا اخبار ہے جس میں سوشلسٹ لوگ لکھتے ہیں +

محفلِ ادب

مہاجن اور مفلس

جوشؔ ملیح آبادی

(۱) مہاجن

قد کی لمبائی سے اک حد تک کمر جھولی ہوئی   سر پہ چٹیا، مردہ چوہے کی طرح پھولی ہوئی
دانت میلے، پنڈلیاں پیچیدہ، دھوتی داغ دار   ناک میں مونچھوں کے گچھے، پیٹ میں توندی کا غار
سامنے غلّے کے بورے، پشت پر الماریاں   بغبغوں میں کروٹیں لیتی ہوئی زرداریاں
کہنیاں، تکیے کے اندرون سے دھنستی ہوئی   چست صدری، دائرے پر توند کے پھنستی ہوئی
خوب لے لے کر ڈکاریں، دل کو بہلاتا ہوا   دونوں نتھنوں کو پھلائے توند سہلاتا ہوا
ہنس کے غوطے آبِ سرد و گرم میں دیتا ہوا   قرض کے طالب کے دل کا امتحاں لیتا ہوا
عذر کرتا پے بہ پے، تیوری چڑھاتا بار بار   شدّتِ حاجت کا اندازہ لگاتا بار بار
کشتیِ ہستی کو جوئے سیم میں کھیتا ہوا   اُلٹی سانسیں فربہی کے بار سے لیتا ہوا
رُخ کی تاریکی پہ زر کی سُرخیاں چھائی ہوئی   بے حقیقت خاک، سونا بن کے اِترائی ہوئی
کان کے بالے، نمودِ زر کا دم بھرتے ہوئے   سود کے بارے میں کچھ سرگوشیاں کرتے ہوئے
عالمِ اخلاق کو زیر و زبر کرتا ہوا   بے زری کی شام سے اخذِ سحر کرتا ہوا

(۲) مفلس

ضعف سے آنکھوں کے نیچے تتلیاں پھرتی ہوئی   اوجِ خودداری سے دل پر بجلیاں گرتی ہوئی
لاش کاندھے پر خود اپنے جذبۂ تکریم کی   ملتجی چہرے پہ لہریں سی امید و بیم کی
عزّتِ اجداد کے سر پہ دمادم ٹھوکریں   رشتۂ آواز پہ نقطوں کی پیہم ٹھوکریں

نام

(کرشن چندر، حجاب امتیاز علی، منٹو، ایم اسلم سے معذرت کے ساتھ)

میرے دوست کرشن چندر کا قول ہے کہ کتاب لکھنے کی نسبت کتاب کا نام تجویز کرنا زیادہ مشکل ہے۔ ایک عرصہ تک مجھے اس قول کی صداقت کے متعلق شک رہا لیکن جب پچھلے ہفتے مجھے ایک کتاب کا نام تجویز کرنے کی ناگہانی مصیبت پیش آئی تو مجھے اپنے دوست پر ایمان لاتے ہی بنی حقیقت یہ ہے کہ ایک کتاب کے لئے جتنے خوبصورت نام تجویز ہو سکتے ہیں وہ تو متقدمین نے پہلے ہی اپنا لئے ہیں "کہکشاں" "کارواں" "کوثر" "نرگس" اور "شعلے" سب کے سب بہت مدت سے کسی نہ کسی سرورق کی زینت بن چکے ہیں۔ اب صرف "جہنم" "دھواں" اور "چنبیلی" متاخرین کے لئے باقی رہ گئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ آج کل اچھے ناموں کی نہ صرف کمی ہے بلکہ ایک اچھا خاصہ قحط ہے معلوم ہوتا ہے کہ متقدمین نے یہ سازش کر رکھی تھی کہ کوئی اچھا نام ان کی زد سے نہ بچے منشی پریم چند کو ہی لیجئے۔ ان کے ہر ایک ناول کے نام میں وہ مقناطیسی کشش ہے کہ انسان ان کی جانب راغب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا "چوگانِ ہستی" "فردوسِ خیال" جیسے نام ایک خوبصورت شعر کی طرح پڑھنے والے کے دل میں بے ساختہ اتر جاتے ہیں۔ علامہ اقبال کی تقریباً ہر تصنیف کے نام میں وہ جاذبیت ہے کہ ہمیں بے اختیار اُن کی عظمت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ "بالِ جبریل" اور "ضربِ کلیم" جیسے ناموں میں ایک نغمے کی شیرینی اور متعدد تلواروں کی جھنکار پوشیدہ ہے۔ اب ان کے مقابلے میں ہمارے زندہ شاعروں کی کتابوں کے نام ملاحظہ فرمائیے۔ "زیروزبر" "صبح و شام" "سیاہ و سفید" "ایں و آں" "شیر و شکر" شاید ان ہی ناموں کے پھیکے پن کو دیکھ کر میرے دوست نریندر ریاتھ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ موجودہ زمانے کے شعراء اگر بجائے ایسے نام ایجاد کرنے کے پرانے ناموں کو تھوڑے بہت تصرف کے ساتھ استعمال کریں تو مناسب ہوگا مثلاً بالِ جبریل کی طرز پر "بالِ عزرائیل" یا "بالِ اسرافیل" یا "بالِ بابیل" وغیرہ مجھے اُن کی اس تجویز سے کلیۃً اتفاق ہے مثلاً حجاب امتیاز علی کے افسانوں کا نام "صنوبر کے سائے" مجھے بہت پسند ہے گو یہ صحیح ہے کہ میں نے آج تک صنوبر کا درخت نہیں دیکھا اور نہ کبھی اس کے سائے ہی میں بیٹھا ہوں۔ اب اگر کوئی صاحب اپنی کتاب کا نام "کیکر کے سائے" تجویز کریں تو مجھے از حد مسرت ہوگی کیونکہ پنجاب میں کیکر بکثرت ہوتا ہے۔ اور ہم میں سے تقریباً ہر ایک کو اس کے سائے میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس جدت کا یہ بھی فائدہ ہوگا کہ ہر ایک نام کا ایک سلسلہ قائم ہو جائے گا مثلاً "کیکر کے سائے" کے بعد "شیشم کے سائے" اور پھر "شہتوت کے سائے" اور پھر "انار کے سائے" اب یہ ظاہر ہے کہ جو شخص صنوبر کے سائے کا مطالعہ کرے گا یقیناً اس کی خواہش ہوگی کہ اب چنار کے سائے پڑھوں اور اگر اور کسی بات کے لئے نہیں تو صرف اس امر کے لئے کہ ان دونوں درختوں میں کس کی چھاؤں زیادہ میٹھی اور گھنی ہے نیز مصنفوں کو اپنی نئی کتابوں کے نام تلاش کرنے میں سہولت ہو جائے گی مثلاً کرشن چندر صاحب "طلسمِ خیال" کے بعد "پروازِ خیال" "نیرنگِ خیال" "سمندِ خیال" جیسے ناموں کے ماتحت اپنے تمام افسانوں کے مجموعے شائع کر سکتے ہیں اور "نظارے" کے بعد "شرارے" "شرارے" کے بعد "غبارے" اور "غبارے" کے بعد "طیارے"، نہایت آسانی کے ساتھ معرضِ وجود میں لا سکتے ہیں۔

آپ کچھ ہی کہیں کسی کتاب کے لئے آجکل ایک اچھا نام تجویز کرنا بھی جوئے شیر لانا ہے۔ آج کل اچھا نام صرف اتفاق سے رکھا جا سکتا ہے جیسے سعادت حسن منٹو نے اپنے ڈراموں کا نام "آؤ" رکھ دیا ہے۔ اپنے ڈراموں کے مجموعے کا نام "آؤ" رکھ کر منٹو نے نہ صرف انتہائی جرأت ہی سے کام لیا

ہے بلکہ ہر ایک مصنف کو نام تجویز کرنے کا ایک نہایت سہل طریقہ بتایا ہے۔ بے شک اب اچھے ناموں کی کمی ہے مگر ابھی اردو زبان میں مصادر کی کمی نہیں اور پھر ہر ایک مصدر سے فعل امر بنانا چنداں مشکل نہیں چنانچہ انھوں نے آنا مصدر سے فعل امر بناتے ہوئے "آؤ" سے ابتدا کی ہے اب آپ اُن کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے "جاؤ"، "گاؤ"، "کھاؤ"، "لڑو"، "دوڑو"، "بھاگو" وغیرہ متعدد نام سوچ سکتے ہیں۔ ان ناموں میں جہاں سادگی ہے۔ وہاں ندرت کا بھی ... ہے۔ مثلاً پڑھنے والا جب "بھاگو" جیسی کتاب کا سرورق پڑھے گا تو کم از کم مصنف کی ایک بات پر تو عمل کرے گا یعنی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے گا۔

دوسرے اس قسم کے نام میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہو سکتی ممکن ہے کہ "ہوائی قلعے" کا سرورق پڑھ کر کوئی شخص غلطی سے یہ سمجھ لے کہ شاید اس کتاب میں ہوائی جنگ کے متعلق کچھ ہدایات دی گئی ہیں یعنی یہ بتایا گیا ہے کہ ہوا میں کس طرح قلعے بنانے چاہئیں۔ اور کس طرح دشمن کو نرغے میں لانا چاہئے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے "سحر فرانس" کو کوئی جادو یا طلسم کی کتاب تصور کرے مگر "آؤ" کا مطلب سوائے "آؤ" کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ اس کے بعد بھی اگر آپ کو "آؤ" جیسا نام ناپسند ہو تو آپ کم از کم اس بات کا اعتراف تو کریں گے کہ "آؤ" ایم اسلم کے "نمستے علیکم" سے بدرجہا اچھا نام ہے "آؤ" جتنا مختصر ہے "نمستے علیکم" اتنا ہی بے ڈھب ہے۔ "آؤ" میں اچھوتا پن نہ سہی مگر اختصار تو ہے "نمستے علیکم" میں ہندو مسلم اتحاد ہو تو ہو۔ مگر ترنم اور اختصار نہیں۔

شاید "نمستے علیکم" کو دیکھ کر میرے دوست مہندر ناتھ نے کہا تھا کہ اس سے بہتر تو یہ ہوتا کہ اسلم صاحب اس کتاب کا نام "مسجد و مندر" رکھ دیتے گو میری دانست میں "شیخ و برہمن" زیادہ موزوں رہتا۔ میرے دوست مہندر ناتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر ہمارے مصنف انگریزی مصنفوں کی پیروی کرتے ہوئے اپنے ناولوں کے نام اردو کے اچھے شعروں اور مصرعوں سے اخذ کریں تو یہ جدت خوب رہے۔ مثلاً ٹامس ہارڈی نے اپنے ایک ناول کا نام (UNDER THE GREENWOOD TREE) رکھا ہے۔ اور یہ مصرع شیکسپیئر کے ایک مشہور گیت کا حصہ ہے۔ اسی طرح ہارڈی کے ایک اور ناول کا نام (FAR FROM THE MADDENING CROWD) ہے اور یہ مصرع ٹامس گرے کی ایک المیہ نظم سے لیا گیا ہے۔ میرے دوست کا خیال ہے کہ اردو ناول نویسوں کو بھی اب اس طرح کے نام رکھنے چاہئیں۔ مثلاً عشق و محبت کی داستانوں کے نام کچھ اس قسم کے ہوں "عشق پر زور نہیں..." "عشق نے غالب نکما کر دیا"۔ "..... دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی"۔ "جہاں ریحانہ رہتی تھی"۔ اور رنج و غم کے افسانوں کے نام اس طرح کے ہوں "ہم رونے پہ آجائیں تو"۔ "مجھ غم زدہ کو نیند نہ آئی تمام رات"۔ "تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو"۔ وغیرہ وغیرہ۔

چنانچہ میں نے ان کی اس نصیحت پر عمل کرتے ہوئے اپنے ایک دوست کی کتاب کا یہ نام تجویز کیا ہے "شرم تم کو مگر نہیں آتی"۔ یہ مصرع جیسا کہ آپ کو معلوم ہے حضرت غالب کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔ اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ اس مصرع کی معنوی اور صوری خوبیوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے میری جدت کی داد دیں گے +

ادبِ لطیف

کنھیا لال کپور ایم۔ اے

مطبوعات

میری دُنیا:- یہ عقیل احمد صاحب جعفری کی قومی و ملکی نظموں کا مختصر مجموعہ ہے۔ صاحبِ درد شاعر کے زندگی پرور جذبات قابلِ قدر ہیں عقیل صاحب مشہور شاعر ہیں اس لئے ہم تعارف کے لئے اُن کے کلام کا نمونہ درج کرنا ضروری نہیں سمجھتے قیمت درج نہیں۔ پتہ عقیل احمد صاحب جعفری۔ خیرآباد۔ ضلع سیتاپور

صحیفۂ اولیا:- انبیاء و اولیاء کی قرآنی دعاؤں کا یہ انتخاب محنت سے کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ اس کتاب کی قدر کی جائے گی۔ پتہ :- دواخانہ حکیم لقمان علی محلہ شاہ بہلول سہارن پور (قیمت ۲ر مقرر ہے)

آدھ گھنٹے میں ہندی:- چالیس صفحے کا یہ رسالہ مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی نے لکھا ہے۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ اس کی مدد سے آدمی آدھ گھنٹے میں ہندی رسم الخط سیکھ سکتا ہے۔ رسالہ مفید معلوم ہوتا ہے۔ چار آنے کے ٹکٹ بھیج کر "دفتر کتابت" جودھ پور سے طلب کیجیے۔

نقشِ ناتمام:- یہ رام پور کے نوجوان شاعر حضرت سحر کا مجموعۂ کلام ہے۔ اس میں نظمیں، غزلیں اور قطعات سبھی شامل ہیں۔ غزل کے یہ دلکش اشعار قابلِ ملاحظہ ہیں ؎

اہلِ دل آزمائے جاتے ہیں — پڑ رہی ہے اٹھائے جاتے ہیں
آپ کو میری اُلجھنوں سے غرض — آپ کیوں یاد آئے جاتے ہیں
گرم گرم اشک، سرد سرد آہیں — راز یوں ہی چھپائے جاتے ہیں؟

ذیل کے دو قطعے خوب ہیں بالخصوص دوسرے قطعے میں سحر کی قادر الکلامی لائقِ تعریف ہے:-

(۱)

ہمت بامراد میں ہارا — قسمتِ نامراد جیت گئی
ہر طرف شامِ غم کا نظارا — ہائے وہ زندگی جو بیت گئی

(۲)

صورتِ شعر میں ڈھلتے ہوئے موسم کی قسم — نکہتِ گل پہ مچلتے ہوئے موسم کی قسم
میں ہوں ہمعموم جوانی کا فسانہ ہے سحر — روپ پر روپ بدلتے ہوئے موسم کی قسم

کتاب شاعر کی تصویر سے مزین ہے حجم۔ ۱۹ صفحات قیمت ۶ر۔ پتہ :- مرزا عباس علی بیگ۔ باغیچہ غازی مظفر خاں۔ رام پور

میرے نغمے:- یہ حضرت سلام مچھلی شہری کا مجموعۂ کلام ہے۔ افسوس ہے کہ اس کے سیاسی حصے کو چھاپنے سے پریس نے انکار کر دیا۔ سلام صاحب ایک نوجوان ترقی پسند اشتراکی شاعر ہیں۔ خیال کی تازگی۔ ان کے کلام کی امتیازی خصوصیت ہے۔ حضرت سلام ابھی بالکل نومشق ہیں لیکن ان کے متعلق آیندہ بڑی بڑی امیدیں قائم کی جا سکتی ہیں۔ ان کے تکار کی تازگی زبان اور عروض کی بعض خامیوں کی تلافی کر دیتی ہے۔ اس کے علاوہ زبان کے نقائص کے لئے اُن کی یہ

...یہ قابل لحاظ ہے ۔

مجھے معاف ہوائے ناقدِ زبان و ادب — قیودِ فن سے اگر دور ہوں مرے جذبات
تری کتاب میں شاید "ادب برائے ادب" — مرے خیال میں لیکن "ادب برائے حیات"

تو پھر ادب میں ابھی انقلاب کی خاطر
کہاں ہے فرصتِ پابندی قیود و نکات

نظموں کے علاوہ چند غزلیں بھی اس مجموعے میں شامل ہیں جن میں اس قسم کا پختہ اندازِ تغزل بھی ملتا ہے :-

میں نے سو بار تری مست نگاہوں کی قسم — رنگ دیکھا ہے چھلکتے ہوئے پیمانے کا
چاند کے ماتھے پہ جس طرح پسینہ آجائے — اللہ اللہ وہ عالم ترے شرمانے کا
جلوہ افروز ہے مہر و مہ و انجم بن کر — ذرّہ ذرّہ مرے ٹوٹے ہوئے پیمانے کا
حسن ہشیار کہ طوفانِ فغاں کا بیڑے — اب تہیّہ ہے دو عالم سے گزر جانے کا
کچھ سرِ شمع جو دیپک سا سنا کرتا ہوں — ایک نغمہ ہے وہ جلتے ہوئے پروانے کا

ہمیں امید ہے کہ اردو شاعری میں نئے رجحانات سے دلچسپی لینے والے اصحاب اس مجموعے کو خرید کر نوجوان شاعر کی حوصلہ افزائی کریں گے ۔ حجم ۸۰ صفحات کتابت ۔ کاغذ نفیس قیمت ۸ ر پتہ :۔ حضرت سلام مچھلی شہری سنگل پورہ فیض آباد ۔

رسائل

سالنامۂ ادبی دنیا:۔ ادبی دنیا لاہور نے اس دفعہ بھی حسبِ معمول بڑی تقطیع کے ڈھائی سو صفحات پر اپنا سالنامہ شائع کیا ہے ۔ اس کے ساتھ تصاویر کی بھی وہی فراوانی ہے جو "ادبی دنیا" کی امتیازی خصوصیت ہے علمی و ادبی مضامین ۔ افسانے ، ڈرامے اور نظمیں معیار کے لحاظ سے قابلِ تعریف ہیں قیمت فی پرچہ عہ ر

وشواوانی :۔ یہ الہ آباد کا ایک نیا ہندی رسالہ ہے جس کا پہلا پرچہ ہمیں ریویو کے لئے بھیجا گیا ہے ۔ اس کے متعلق ڈاکٹر محمد اشرف صاحب ہمیں لکھتے ہیں ۔

"آپ کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ بالآخر ہندی زبان میں ایک اعلیٰ پایہ کا ماہنامہ اس غرض سے شائع ہو رہا ہے کہ مسلمانوں کے تاریخی تمدنی کارناموں سے ہندی داں پبلک کو روشناس کرایا جائے اور ایک متحدہ تمدن کی حمایت کی جائے ۔"

چونکہ یہ مقاصد بہت اچھے ہیں اگر پنڈت سندر لعل صاحب جو اس رسالہ کے بانی ہیں ان مقاصد کو پیش نظر رکھیں تو یہ رسالہ بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے ۔ عام اہلِ پنجاب کی طرح راقم بھی ہندی سے ناواقف ہے اس لئے یہ رسالہ رائے حاصل کرنے کے لئے ایک ہندی آشنا دوست کو دیا گیا تھا ۔ اُن کی رائے ذیل میں درج کی جاتی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں ۔

"وشواوانی کو میں نے جستہ جستہ پڑھا ہے ، کانگریس کے اُس تمام زہر سے پُر ہے جو مسلمانوں کے خلاف آئے دن اُگلا جاتا ہے ۔ بہادر شاہ ظفر کی شکایت میں ایک شعر یوں درج ہے

بھلوں کو ہیں لاجم بھلائی کی باتیں — بُروں کو ہیں جیسا بُرائی کی باتیں



فہرستِ مضامین



"ہمایوں" بابت ماہِ مئی سنہ ۱۹۴ء

تصویریں چھاپنے کی اجازت نہیں ہے

چندہ سالانہ :- پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصول) قیمت فی پرچہ :- آٹھ آنے

جہاں نما

ہندوستانی یونیورسٹیاں

ہندوستان میں جامعی تعلیم کی بنیاد ۱۸۵۷ء میں پڑی جب کلکتے، مدراس اور بمبئی کی یونیورسٹیوں کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ ان یونیورسٹیوں کے قیام سے متعلق ضروری قوانین کا نفاذ علی الترتیب ۲۴ جنوری، ۱۸ جولائی اور ۵ ستمبر ۱۸۵۷ء کو ہوا۔ ابتدا میں کلکتہ یونیورسٹی کا حلقۂ عمل تمام شمالی ہندوستان تھا۔ اس وجہ سے بہت سی انتظامی دشواریاں پیش آ رہی تھیں۔ ان دشواریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے دو اور یونیورسٹیاں قائم کی گئیں چنانچہ ۱۸۸۲ء میں پنجاب یونیورسٹی اور پانچ سال بعد ۱۸۸۷ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی قائم ہوئی۔ ۱۹۳۰ء میں کلکتہ یونیورسٹی کے نظامِ تعلیم میں ایک اہم انقلاب واقع ہوا یعنی یہ فیصلہ کیا گیا کہ انٹرنس کے امتحان تک تمام مضامین کا ذریعۂ تعلیم و امتحان طالب علم کی مادری زبان ہو۔ لڑکیوں کے لئے بھی نصابِ تعلیم میں کچھ تبدیلیاں کی گئیں۔ اب بنگال میں ذریعۂ تعلیم لازماً طلبہ کی مادری زبان ہے اور انگریزی کو ایک ثانوی زبان کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ یہ انتظام گزشتہ پچھتر سال کی روش سے ایک نہایت اہم انحراف ہے۔ ۱۹۳۶ء میں کلکتہ یونیورسٹی نے فوجی تعلیم کا کام بھی اپنے ذمے لے لیا۔ فوجی تربیت کے لئے دو سال کا نصاب مقرر کیا گیا ہے۔

ہندوستانی یونیورسٹیوں کی تاریخ میں لارڈ کرزن کی متعینہ کمیشن (۱۹۰۲ء) کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس کمیشن کی سفارشات زیادہ تر یونیورسٹیوں کے انتظامی معاملات میں اصلاح پر مشتمل تھیں۔ حکومت ہند نے ۱۹۰۴ء میں یونیورسٹیوں کے دستور العمل میں ترمیمات کرنے کی منظوری دی۔ ۱۹۰۴ء کے ایکٹ نے یونیورسٹیوں کے اختیارات میں بہت کچھ توسیع کر دی۔ یونیورسٹیوں کو اپنے الگ کتب خانے، معمل اور عجائب خانے قائم کرنے کی اجازت بھی مل گئی۔ ہر یونیورسٹی کا حلقۂ عمل معین کیا گیا۔ عام کالجوں کے علاوہ خود یونیورسٹیوں کو اعلیٰ تعلیم کے انتظام کے لئے اساتذہ مقرر کرنے کی اجازت مل گئی۔ یونیورسٹیوں کی طرف سے کالجوں کے معائنے کا باقاعدہ بندوبست کیا گیا۔

اب تک تمام یونیورسٹیاں سرکاری سرپرستی کے ماتحت قائم ہوئی تھیں لیکن ۱۹۱۶ء اور ۱۹۲۰ء میں ایک نیا قدم اٹھایا گیا۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کی خاص ضروریات کے لئے دو مذہبی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں جن کے قیام کے لئے زیادہ تر خود ان دونوں قوموں نے روپے وغیرہ کا انتظام کیا۔ بنارس ہندو یونیورسٹی ۱۹۱۶ء میں اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۱۹۲۰ء میں قائم ہوئی۔ سنسکرت، عربی، فارسی اور مذہبی علوم کی تعلیم کا خاص انتظام ان دونوں یونیورسٹیوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ صوبہ بہار و اڑیسہ کے قیام کے بعد ایک اور یونیورسٹی یعنی پٹنہ یونیورسٹی ۱۹۱۷ء میں قائم ہوئی۔ دو اور یونیورسٹیاں ہندوستانی ریاستوں میں بھی قائم ہوئیں۔ میسور میں میسور یونیورسٹی اور حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی علی الترتیب ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۸ء میں قائم ہوئیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ بجز انگریزی کے تمام مضامین کے لئے اس کا ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔

پنجاب اور قومی زبان کا مسئلہ

ہندوستان میں قومی زبان کے مسئلے سے کونسا تعلیم یافتہ شخص واقف نہیں؟ تقریباً تین چوتھائی صدی سے یہ جھگڑا جاری ہے۔ سو سال سے زائد عرصہ گزر گیا کہ انگریزی حکومت نے فارسی کی جگہ اردو کو سرکاری و عدالتی زبان قرار دیا۔ اس کے تین تیس برس بعد پہلے بہار اور پھر یو۔پی میں ہندی کا شاخسانہ کھڑا کیا گیا۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی کے شروع میں یو۔پی میں اردو کے ساتھ ہندی کو بھی عدالتوں میں کچھ عمل دخل حاصل ہو گیا۔

۱۹۱۰ء میں ہندی ساہتیہ سمیلن کی بنیاد پڑی اور پہلے مالوی جی اور پھر گاندھی جی کی مسلسل کوششوں سے ہندوستان کے کونے کونے میں ہندی کا پروپگنڈا شروع ہو گیا۔ ۱۹۳۱ء میں کانگرس نے مسلمانوں کو اطمینان دلانے کے لئے یہ قرارداد منظور کی کہ ہندوستان کی قومی زبان ہندوستانی ہے جو شمالی ہند میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جو اردو اور دیوناگری دونوں خطوں میں لکھی جاتی ہے۔ ۱۹۳۶ء میں گاندھی جی نے ایک نئی نام نہاد ادبی انجمن "بھارتیہ ساہتیہ پریشد" بنائی اور اس کی زبان "ہندی الفوا ہندوستانی" قرار دی۔ ۱۹۳۷ء میں کانگرس نے سات صوبوں میں حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی ہندوستانی کی آڑ میں ہندی رائج کردی اور یہ کام اس شدومد سے کیا کہ تھوڑی مدت میں اردو والوں کو اپنی کس مپرسی کا احساس ہونے لگا۔ کہاں ہندو مسلمانوں کی وہ مشترک زبان جو اُن کی مشترک تہذیب کا ایک واضح نشان تھی اور کہاں یہ نئی سنسکرتی ہندی جس سے محض ویدک تہذیب کی یاد تازہ ہونے لگی! ہندوستانی تہذیب کی مشترک زندگی کو سخت دھکا لگا۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے مشہور مقالے "زبان کا مسئلہ" (مطبوعہ ۱۹۳۷ء) میں لکھا ہے کہ "انیسویں صدی میں پہلے ہندوؤں میں اپنی جداگانہ قومیت کا احساس پیدا ہوا۔ اور انھوں نے ہندی کی طرف رجوع کیا۔ اس کے بعد مسلمانوں میں یہ احساس پیدا ہوا۔ اور وہ اردو کو اپنی خاص ملکیت سمجھنے لگے۔ یعنی پنڈت نہرو کے نزدیک زبان کی علیحدگی کا آغاز ہندوؤں کی طرف سے ہوا۔

نئی ہندی کے خوفناک نمونوں سے اُردو کی دُنیا کافی آشنا ہو چکی ہے۔ گاندھی جی کی ۱۹۳۶ء کی پرشدی تقریر کس نے نہیں سنی:۔

"اس سبھا کا سبھاپتیو مجھے دینے کے کارن جب میں ڈھونڈتا ہوں تو دو ہی پرتیت ہوتے ہیں۔۔۔۔ میری ٹرشٹی میں تو ادشے ہونی چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ"

سبھاش بابو نے فروری ۱۹۳۸ء میں بہ حیثیتِ صدرِ کانگرس ارشاد فرمایا:۔

"سبھاپتی مہاشے اور مترو! آپ نے آگامی ورش کے لئے اکھل بھارت ورش راشٹریہ مہاسبھا کا ادھکشن نرواچت کر میرا جو سمان کیا ہے وغیرہ وغیرہ"

شری سمپورن نند جی نے اگست ۱۹۳۸ء میں بہ حیثیتِ وزیرِ تعلیم جو "دیا کھیان" نشر کیا۔ وہ ان سے کم نہیں:۔

یہ تقریر انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں زیر صدارت مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو پڑھی گئی۔

"آدھنک کال جس میں کہ ہم رہ رہے ہیں اس کی یہ بھی ایک بشستا ہے کہ شکشنڈ شمیا کے پرت کا اگرشٹر بہت درشدہ اور بیابک ہوگیا ہے وغیرہ وغیرہ"

قلمدانِ وزارت کو بالائے طاق رکھنے کے بعد بھی آپ ساکنانِ خطۂ خاک کو اسی قسم کی علمی زبان میں مخاطب فرماتے ہیں۔ ابھی حال میں آپ نے جیل خانے سے جو خطبۂ صدارت لکھ کر ہندی ساہتیہ سمیلن کے انتیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ پونا میں (۲۵ر دسمبر ۱۹۴۰ء کو) غائبانہ طور پر پیش کیا۔ اس کے چند جملے تبرکاً یاد رکھنے کے قابل ہیں:

"سواگت پکش مہودے اور ستر دسمیلن کے سبھاپتی پد پر آسین کر کے آپ نے مجھے جو شمان پردان کیا ہے۔ اس کے لئے میں آپ کا مرینی ہوں ...... علی ہذا القیاس

اور صرف ایسی اعلیٰ ترین چوٹی کی ہستیوں پر ہی موقوف نہیں بلکہ یہ سارا آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ کئی سو سال کی قدیم ہندی نے جو فطری طور پر ترقی کرتے کرتے اردو بنی اور جس کی کھڑی بولی کی بعض صفتیں اب بھی انسانوں کی زبان کہلا سکتی ہیں انیسویں اور بیسویں صدی میں آکر ایک عجیب و غریب بھیانک شکل اختیار کر لی ہے جس کا تصور بھی ہندوستانی دماغ کے لئے سخت پریشان کر دینے والا ہے۔ آسانی، مزدوری، اخبار، علاوہ، امید، عمر، شروع، فتح، سپاہی، خوش، تعلیم، آمدنی، خیمہ، ان الفاظ کو کون بھلا مانس ہندوستان میں نہیں سمجھتا لیکن نہیں یہ معصوم الفاظ اب سرلتا۔ آویشک۔ سماچار پتر۔ اتریکت۔ آشا۔ آیو۔ آرمبھ۔ وجے۔ سینگ۔ پرسن۔ شکشا۔ انت۔ سماپت کر دئے گئے ہیں۔ خیر یہ تو عرب اور فارس سے آئے تھے۔ ان کا یہ تصور تھا لیکن نہیں یہاں کے سیدھے سادے الفاظ کی بھی بری گت بن رہی ہے۔ اب برس ورش ہے بسنت وسنت، دکھن۔ دکشن گنتی۔ سنکھیا بھلا مانس۔ سد پرش۔ برا دشٹ۔ گھمنڈ۔ ابھمان۔ یہاں تک کہ بیچاری مٹی ماٹی ہو گئی ہے۔ پانی پانڑی اور سمندر سمدر۔ اعوذ برب الناس۔

آخر اس عجوبہ پسندی اور اس جدت طرازی کی کیا وجہ ہے؟ آخر بیٹھے بٹھائے ایک ہوش مند انسان کیوں پانی کو "پانڑی" اور دکھن کو "دکشن" کہنے لگے؟ بجائے "خوش" ہونے کے "پرسن" ہو جائے۔ اور بجائے آزادی کے "سوتنترتا" کے لئے لڑنے لگے؟ اس قلابازی کے کیا معنی ہیں؟ سنئے یہ محض ایک معمولی لفظی یا لسانی کھیل نہیں، بلکہ ایک زبردست تہذیبی اور سیاسی انقلاب ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمانوں کا عہدِ سلطنت ختم ہونے کے بعد جب انگریزوں نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں سنبھالی تو ہندوؤں کی ایک جماعت نے نہیں معلوم کن اشاروں کے ماتحت پرانی ہندو تہذیب کو از سرِ نو زندہ کرنے کی ٹھان لی۔ اور ساتھ ہی اپنا نصب العین بنایا کہ اپنی زندگی میں سے ہر اس چیز کو نکال باہر کریں جس سے اسلام یا مسلمانیت کی ذرا سی بو بھی آتی ہو۔ ادھر اسلامی اثرات ملک کے رگ و پے میں اس حد تک سرایت کر چکے تھے کہ ان کا اخراج گویا گوشت سے ناخن کے جدا ہونے کے برابر ہو گیا۔ چیر پھاڑ کرنے والوں نے یہ نہ سوچا کہ وہ اپنے ہی تن من پر کیا ظلم ڈھا رہے ہیں۔ ساہتیہ سمیلن کے پچھلے اجلاس میں سمپورنانند جی نے فرمایا کہ اردو کے متعلق جو کہا جاتا ہے کہ وہ کم از کم یو۔پی کی زبان ہے، یہ بالکل غلط ہے۔ اردو تو فقط ایک مصنوعی زبان ہے۔ جسے ہم ہرگز ہندوستانی تسلیم نہیں کر سکتے کیونکہ وہ ہرگز عوام کی زبان نہیں بن سکتی۔ وہ محض

چند عدالتوں میں گھومنے والے اشخاص کی رائے کا مظہر ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندی ہندوستانی قوم کی آواز ہے جسے کوئی دبا نہیں سکتا۔ وہ ہندو مسلم روایات اور ویدوں سے قبل کی روایات کی حامل ہے۔ اسے چند فرقہ پرست یا اُن کے بعض مددگار جو اُن کے پٹھو بنے ہوئے ہیں تباہ نہیں کر سکتے یہ بھی کہا کہ ہندی میں اکثریت سنسکرت کے الفاظ کی ہوگی۔ ریڈیو والے ان الفاظ کو بگاڑ رہے ہیں مثلاً وہ بکرما دتیہ کو بکرما جیت کہتے ہیں۔ نیز سمپورنجی اس سے بھی سخت برہم ہوئے کہ ریڈیو والے ہمیشہ آداب عرض کہتے ہیں کبھی نمسکار نہیں کہتے۔ دیکھا آپ نے کس طرح ویدک تہذیب کا پرچار اور اس پر اصرار ہو رہا ہے۔ کیا کہتے ہیں اس بارے میں وہ لوگ جنھوں نے السلام علیکم چھوڑ کر آداب عرض کی وسطی راہ اختیار کی؟

اسی طرح پنڈت امرناتھ کاک نے پنجاب ہندی ساہتیہ سمیلن کے تیرھویں سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے ۲۸ جنوری ۱۹۴۲ء کو لاہور میں کہا کہ بھارت ورش ایک ہے۔ اور اس کی ایک ہی مشترک زبان ہے اور وہ ہندی ہے اور یہ کہ ہندی پرچار ہی ہے جس سے ہندو دھرم، ہندو تمدن اور ہندو کلچر کی حفاظت تبلیغ اور ترقی ہو سکتی ہے۔" کاک صاحب کے نزدیک" اردو کی کوئی جداگانہ ہستی ہی نہیں" اور ہندی انسانی گفتگو کا ایک ایسا مظہر ہے جو انسان کے اندر ربّانیت کی نشانی ہے۔"

کہئے۔ اس کے بعد کسے گفتگو کا یارا ہے؟

۵ فروری ۱۹۴۲ء کو بہار ساہتیہ سمیلن کے سترھویں سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے بابو راجندر پرشاد نے کہا کہ ہندی اب ایک زندہ زبان ہے جو سارے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ صدرِ استقبالیہ نے کہا کہ ہندی ہی قومی زبان ہے اور ہندی اردو کو ملانے کی کوشش فضول اور مصیبت خیز ثابت ہوگی۔ ۳۰ مارچ ۱۹۴۲ء کو کاکا کالیلکر صاحب کی کوشش سے سندھ میں راشٹر بھاشا سمیلن کا اجلاس ہوا جس کے لئے گاندھی جی اور ٹیگور نے خاص پیغامات بھیجے۔ دسمبر ۱۹۴۲ء میں مسلمانوں کے ایک وفد نے حکومتِ سندھ کو توجہ دلائی تھی کہ ہندی کے پرچارک سندھی زبان کو سنسکرت آمیز بنانے کے نیک کام میں مصروف ہیں۔ بنگالی مسلمانوں کو بھی مدت سے اسی قسم کی شکایت ہو رہی ہے یعنی پرچین بھارت کا پریم بھارت ورش کے کونے کونے میں ایک آفت مچا رہا ہے مسلمانوں کی ہزار سالہ ہندوستانی تاریخ کو باقاعدہ طور پر مٹایا جا رہا ہے۔ کیا کوئی انصاف پسند۔ خود دار شخص اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھ سکتا ہے؟

اس رویّے پر چند برس سے کانگرسی مسلمان تنگ نالاں ہیں اور قابلِ رحم حد تک نالاں ہیں۔ کیا کریں ان کی متحدہ قومیت کی اُمید بیل پر اس زبان کے طوفان نے پانی پھیر دیا ہے۔ ڈاکٹر اشرف نے ۲۶ ستمبر ۱۹۳۹ء کو کانگرس کمیٹی میں یہ قرارداد پیش کی کہ کانگرس اپنی ۱۹۲۵ء کی ہندوستانی والی قرارداد کو دہرائے اور اصرار کرے کہ کانگرسی اردو ہندی بحث سے الگ ہیں۔ مگر شنوائی نہ ہوئی۔ جولائی ۱۹۴۱ء میں آزاد مسلم کانفرنس والوں نے بھی لکھنؤ میں یہی زبان کا دُکھڑا رو دیا۔ مگر بے فضول۔ نومبر میں نیشنلزم کے حامی شیرِ کشمیر شیخ عبداللہ بھی حکومت کشمیر کی ہندی نواز پالیسی کے خلاف غرّائے اور دہاڑے مگر نیشنلسٹ حلقوں میں ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ لاہور میں ۹ دسمبر کو آل پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے جس میں کانگرسی اور احراری عنصر کا غلبہ ہے۔ اس امر کا مظاہرہ کیا کہ اُردو ہی ملک کی قومی زبان ہے۔ اور اس کی مخالفت کرنا درحقیقت متحدہ قومیت کی مخالفت کرنا ہے۔ مگر بے سود! ابھی ۱۲ اپریل ۱۹۴۲ء کو کشمیر اسمبلی میں نیشنل کانفرنس والوں نے

بہتیرا شور مچایا کہ برائے خدا اردو ہندی کا جھگڑا شروع کر کے کشمیر میں قومیت کا جنازہ نہ نکالا جائے۔ مگر کون سنتا ہے طوطی کی نقار خانے میں؟ واقعہ یہ ہے کہ ہندوؤں کی اس جماعت نے جو اس وقت اپنی قوم میں سب سے زیادہ اثر رکھتی ہے۔ یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اردو چونکہ مسلمانوں کی زبان ہے اس لئے ہندو اسے چھوڑ کر اپنی اصلی زبان یعنی سنسکرت ہندی کی طرف رجوع کریں گے۔ اس میں شبہ نہیں کہ سرسپرو اور پنڈت کیفی سی انصاف پسند اور بلند نظر ہستیاں موجود ہیں۔ رگھوپتی سہائے صاحب فراق گورکھپوری کے سے کئی حق پسند ادیب اب بھی سچ بات کہنے سے نہیں جھجکتے لیکن بدقسمتی سے اکثریت ان لوگوں کی ہوتی جاتی ہے بلکہ ہو گئی ہے جو یا اردو سے منہ پھیر چکے ہیں یا چپ چاپ دیکھتے بیٹھے ہیں۔

فراق صاحب راقم کے نام اپنے ایک خط مورخہ ۵ جنوری ۱۹۴۲ء میں لکھتے ہیں "میں اردو کے طرفداروں کا یہ دعویٰ خلوص پر مبنی سمجھتا ہوں کہ اردو اور صرف اردو ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے۔ مجھے اس بات سے بھی دکھ ہوتا ہے کہ ہندی کے طرفدار پانچ سات فی صدی بھی وہ فارسی عربی الفاظ اپنی تحریروں میں نہیں لاتے جو ہندستان کی زندگی کے اجزا بن گئے ہیں۔ مجھے ہندی والوں کی اس تنگ نظری پر شرم آتی ہے۔ مگر میں مستقبل سے ناامید نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا نا کہ سو فی صدی ہندو اردو چھوڑنا چاہیں گے۔ اور سو فی صدی مسلمان اردو سیکھنا چاہیں گے۔ یہی سہی"۔ "کیا کئی کروڑ مسلمان صرف اپنے بل بوتے پر اردو کو زندہ نہیں رکھ سکتے؟" اور اخیر میں یہ مشورہ بھی دیتے ہیں کہ "ہندی والے کچھ اردو اور اردو والے کچھ ہندی سیکھ لیں"۔ یہ ہے ایک آزاد خیال دور اندیش ہندو کی رائے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ صورتِ حال کیسی نازک ہے اور ہماری ذمہ داریاں کس قدر اہم ہو گئی ہیں؟

اس زبان کے مسئلے پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ پہلے نیشنلسٹ پہلو لیجئے۔ ہندوستان سے ملک میں جس میں طرح طرح کے شدید اختلافات ہیں اگر ایک نیشن وجود میں آ سکتی تھی تو وہ شاید اسی طرح کہ یہاں ایک ایسی مشترکہ قومی زبان تسلیم کر لی جاتی جس میں مختلف قوموں کی تہذیب کے عناصر موجود ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ زبان سوائے اردو کے اور کوئی نہ ہو سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سرسپرو سے محب وطن اپنے ہم مذہبوں کی تنگ نظری پر کفِ افسوس ملتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہندوؤں کی اکثریت نے اردو کے خلاف اپنا فیصلہ صادر کر دیا ہے۔

تعلیمی نقطۂ نگاہ سے دیکھئے۔ اب ہندوستان کے اکثر ماہرین تعلیم اور کئی یونیورسٹیاں اس بات کا اظہار کر چکی ہیں کہ وقت آ گیا ہے کہ بجائے ایک اجنبی زبان کے ذریعۂ تعلیم اپنی زبان کو بنایا جائے۔ سر عبدالقادر سے سناتن دھرم کالج لاہور نے اپنی گذشتہ کانووکیشن (منعقدہ ۱۵ر مارچ ۱۹۴۱ء) کے موقع پر فرمائش کی کہ وہ اپنا ایڈریس زبان انگریزی کی بجائے اردو میں دیں۔ اور یہ پہلا موقع تھا کہ لاہور میں کانووکیشن کا ایڈریس اپنی زبان میں دیا گیا۔ اس کے چند ہی روز بعد پرنس آف ویلز کالج جموں کی کانووکیشن میں پرنسپل سوری کی تجویز کے مطابق جلسے کی تمام کارروائی انگریزی کی بجائے اردو میں کی گئی۔ اس موقع پر خواجہ غلام السیدین ڈائرکٹر آف ایجوکیشن کشمیر نے جو ایڈریس اردو میں پڑھا وہ قابلِ غور ہے۔ انھوں نے کہا کہ اپنی زبانوں کو چھوڑ کر کسی غیر زبان میں تعلیم حاصل کرنا۔ اور اس کو اپنی روزمرہ کی بات چیت اور کاروبار یا ادبی اظہار کا ذریعہ بنانا ایک تعلیمی حماقت اور ذہنی غلامی ہے۔ اس سے پڑھے لکھوں اور عام ان پڑھ لوگوں کے درمیان ایک دیوار قائم ہو جاتی ہے"

اس ملکی نقصان کے علاوہ ادبی نقصان یہ ہوتا ہے کہ کوا ہنس کی چال چل کر اپنی چال بھی بھول جاتا ہے۔ اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن بدقسمتی سے شمالی ہند کے تعلیمی حلقوں میں زبانوں کی رسہ کشی جاری ہے مختلف فرقے اپنی زبان جدا جدا بتاتے ہیں۔ اب مشترک ذریعۂ تعلیم ہو تو کونسا ہو ؟

اس فرقہ بندی کے ساتھ اپنے اپنے قومی کلچر کا سوال وابستہ ہے۔ شمالی ہند میں کچھ عرصے سے کلچر ایک حد تک مشترک ہو کر ایک مشترک زبان میں ظاہر ہو رہا تھا مسٹر راج گوپال اچاریہ نے پاکستان کے خلاف یہی وجہ پیش کی تھی کہ ہندو مسلمانوں کا ایک کلچر ہے جس کا مظہر اردو ہے لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو اردو کو گڑھے میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ اُس وقت اردو کو ہندوستانی بنا دیا جاتا ہے اور ہندوستانی کو ہندی۔ پھر علاوہ بیچارہ مشترک کلچر بے کار ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسے کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ ہندوستانی نیشنلزم اس کس مپرسی پر جتنے آنسو بھی بہائے کم ہیں۔

جداگانہ کلچر اور جداگانہ زبانوں کا تازہ ترین مظاہرہ پنجاب میں ہوا اور ہو رہا ہے۔ ۸ دسمبر ۱۹۴۲ء کو لاہور میں ایک اردو کانفرنس ہوئی جس کی صدارت کرتے ہوئے مولوی عبدالحق صاحب نے فرمایا "حضرات! آپ کا صوبہ بہت قابلِ مبارک باد ہے کہ یہاں کم سے کم لسانی اتحاد ہے۔ آگے چل کر یہ اتحاد آپ کے بہت کام آئے گا" لیکن اس کے دوسرے ہی روز ۹ دسمبر کو جب میاں عبدالحی وزیر تعلیم نے پنجاب اسمبلی میں اپنی ایک جوابی تقریر میں کہا کہ پنجاب میں ذریعۂ تعلیم اردو ہے تو اس پر اسمبلی میں اور باہر ہندو پریس میں اور پلیٹ فارم پر وہ دھواں دھار تقریریں ہوئیں مقالات لکھے گئے اور دھمکیاں دی گئیں کہ حکومت کو یکے بعد دیگرے بہت سے نرم نرم بیانات شائع کرنے پڑے تاکہ غلط فہمی دور ہو لیکن غلط فہمی تو وہاں دور ہو سکتی ہے جہاں دل صاف ہوں اور جہاں دل بدل چکے ہوں، جہاں نیت ڈانواں ڈول ہو چکی ہو۔ وہاں سرکاری بیانات اور صلح کے پیغامات سے کیا بنتا ہے ؟ ہندوؤں کا وہ طبقہ جسے ہندوؤں کی قیادت کا دعویٰ ہے مصر ہے کہ ہندوؤں کی زبان ہندی ہے۔ وہ جو کہیں گے ہندی میں اور جو سنیں گے ہندی میں۔ اسی طرح سکھوں کا وہ طبقہ جسے سکھوں کی نمایندگی کا دعویٰ ہے مصر ہے کہ سکھوں کی زبان گورمکھی ہے۔ وہ پڑھیں گے تو گورمکھی میں اور نہ پڑھیں گے تو گورمکھی میں۔ یہ ہے وہ راہ جو ہمارے غیر مسلم پنجابی بھائیوں نے اختیار کی ہے۔ اس پر کوئی سوائے اس بات کے اور کیا کہہ سکتا ہے کہ یہ راہ سیدھی پاکستان کو جاتی ہے !

پنجاب کی تاریخ پر نظر ڈالئے۔ گزشتہ سال (۱۹۴۲ء) میں اردو کی ابتدائی تاریخ کے متعلق جو تین کتابیں "نظمِ اردو"، "ہندو ادیب" اور "تاریخ ادب اردو" غیر پنجابی اصحاب نے لکھی ہیں۔ وہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ اردو کی ابتدا پنجاب سے ہوئی۔ ڈاکٹر گراہم بیلی کی بھی یہی رائے ہے "لاہوری اردو کی بنا جو غالبًا اردو کی پہلی صورت تھی ۱۰۲۶ء میں رکھی گئی۔ جب محمود غزنوی نے پنجاب کو اپنی مملکت محروسہ میں شامل کر لیا۔ اور مسلمانوں اور ہندوؤں کے میل جول سے لازم طور پر ایک ملی جلی زبان وجود میں آنی شروع ہوئی "ہماری زبان" (یکم مارچ ۱۹۴۲ء) لکھتا ہے "یہ مانا جائے یا نہ مانا جائے لیکن اتنا ضرور ماننا پڑے گا کہ ان قوموں کا جنھوں نے اُردو بنائی سب سے پہلے اور سب سے زیادہ میل ملاپ پنجاب ہی میں رہا۔ اسی وجہ سے اردو کی پنجاب میں ایک اٹل حیثیت قائم ہے۔" یہاں اردو میں پنجابی کے الفاظ کثرت سے ہیں مثلاً رسنا۔ نسنا۔ ہور۔ بیٹھی وغیرہ۔ گورو نانک (سن وفات ۱۵۳۹ء) کا شعر ہے ؎

سانس ماس سب جیو تمھارا ..... تو ہے کھرا پیارا نانک شاعر ایوکہت ہے ..... سچے پروردگارا!

اس زبان کو ہندی کہو۔ ہندوستانی کہو کچھ کہو۔ یہ آج کل کی ہندی سے مختلف اور آج کل کی اردو کے قریب تر ہیں ہے بس ثابت ہوا کہ پنجاب کا اردو سے گہرا اور پرانا اور اٹل تعلق ہے جو نو سو سال سے قائم ہے اور جسے دنیا کی کوئی طاقت ہٹا نہیں سکتی۔

واقعہ یہ ہے کہ ۱۰۲۶ء سے لے کر آٹھ سو سال سے زیادہ عرصے تک فارسی پنجاب کی سرکاری زبان بنی رہی۔ اس کے بعد انیسویں صدی کے وسط میں جب پنجاب انگریزی عملداری میں شامل ہوا تو حکومت نے فارسی کی جگہ اردو کو سرکاری اور تعلیمی زبان قرار دیا۔ ۱۸۵۹ء میں کورٹ آف ڈائرکٹرز نے لندن سے اپنے ایک مراسلے میں لکھا کہ پنجابی زبان کا برقرار رکھنا یا اس کے انحطاط کو روکنا ٹھیک نہیں پنجاب اور بعض دوسرے صوبوں میں جو کم پایہ مقامی بولیاں ہیں" اردو ہندوستانی" ان پر فوقیت رکھتی ہے۔ لہٰذا پہلے تعلیم یافتہ لوگوں کو اس سے آشنا کرنا چاہیئے۔ بعد میں عوام الناس پر خود بخود اس کا اثر پڑے گا[۵۱]۔ لارڈ لارنس نے بھی اردو ہی پر زور دیا اور بتایا کہ اردو بڑی تیزی سے عوام میں پھیل رہی ہے[۵۲]۔ ڈائرکٹر آف انسٹرکشن پنجاب نے ۵۶-۱۸۵۵ء کی رپورٹ میں) لکھا کہ یہ شروع ہی میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ سرکاری سکولوں کی زبان اردو۔ اور فقط اردو ہوگی۔ جو فارسی رسم خط میں لکھی جائے گی۔ لوگوں کو ان کی اپنی زبان میں تعلیم دینا ضروری تھا اور اردو ان کی اپنی زبان ہے۔ دیہات کے سکولوں اور تحصیل کے سکولوں میں اردو ہی کے ذریعے سے تعلیم دی جاتی ہے[۵۳]۔ ۸۲-۱۸۸۱ء میں ڈائرکٹر نے لکھا کہ سکھوں کے زمانے میں صوبے کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ انگریزی حکومت نے اس کی جگہ اردو کو سرکاری زبان بنایا۔ اس لیئے شہروں اور دیہات میں ہمیں اسی زبان میں تعلیم دینی چاہیئے جب تک کہ حکومت صوبے کی سرکاری زبان کو بدل نہ دے[۵۴]۔ اس کے بعد اس نے لکھا کہ" اس صوبے میں بہت سی بولیاں ہیں پس اگر ہم لوگوں کی اصلی مادری بولی میں انھیں تعلیم دینا چاہیں تو ہمیں ایک بولی میں نہیں بلکہ کئی بولیوں میں الگ الگ تعلیم دینی پڑے گی"۔ بیس برس ہوئے انگلستان اور سکاٹ لینڈ میں بھی یہی حالت تھی لیکن کبھی کسی نے وہاں یہ تجویز پیش نہیں کی کہ مختلف بولیوں کو برقرار رکھا جائے۔ حالانکہ سکاٹ لینڈ کی زبان میں وہ ادبی خوبیاں ہیں جن سے پنجابی قطعاً محروم ہے[۵۵]۔ اخیر میں وہ لکھتا ہے کہ" یہ جو کہا جاتا ہے کہ پنجابی بچّوں کی تعلیم اردو پڑھنے کی وجہ سے ناقص رہ جاتی ہے۔ بالکل غلط ہے صوبے کے بہترین پرائمری مدرسے میں دیہاتی جتنی جلدی اردو پڑھنا سیکھ لیتے ہیں۔ اتنی جلدی خود دہلی کے سکولوں میں بھی طلبہ نہیں سیکھ سکتے[۵۶]۔ یہ درست ہے کہ حکومت نے زبان کے متعلق اپنی اس پالیسی کو زبردستی تمام تعلیمی اداروں پر عائد نہیں کیا۔ اور آریہ سماج کے چند سکولوں میں ہندی میں تعلیم دی جاتی رہی خصوصاً لڑکیوں کے سکولوں میں لیکن وہاں بھی جو ہندی استعمال کی جاتی رہی اس میں فارسی کا خاصا عنصر تھا۔ دسمبر ۱۸۸۳ء میں حکومت نے ایک سرکاری سکول میں گورمکھی کی جماعت کھولنے سے انکار کر دیا۔ اور اس طرح اپنی تعلیمی پالیسی کی پھر تصدیق

---

[۵۱] دیکھو پنجاب ایجوکیشن رپورٹ بابت ۸۲-۱۸۸۱ء صفحہ ۳۸-۳۷ پیرا ۹۱ [۵۲] ایضاً صفحہ ۳۸ پیرا ۹۳ [۵۳] رپورٹ ۵۶-۱۸۵۵ء صفحہ ۱۰ پیرا ۶۹

[۵۴] رپورٹ ۸۲-۱۸۸۱ء صفحہ ۳۹ پیرا ۹۷-۹۶ [۵۵] ایضاً پیرا ۹۸

[۵۶] ایضاً صفحہ ۴۰ پیرا ۱۰۰ +

کردی جس کے مطابق تعلیمی زبان اردو اور صرف اردو رہی ہے[۵۱]۔ ۱۶-۱۹۱۵ء کی رپورٹ مظہر ہے کہ "لڑکوں کے سکولوں میں اردو ہی کو بطور سکول ورنیکلر کے پسند کیا جاتا ہے کہیں کہیں پنجابی بطور ثانوی زبان کے پڑھی جاتی ہے۔ اور ہندی زیادہ تر لڑکیوں کے سکولوں میں پڑھائی جاتی ہے[۵۲]۔ رپورٹوں میں بار بار جو ورنیکلر کا ذکر آتا ہے اس سے مراد صرف اردو ہی ہے۔ جیسا کئی مثالوں سے واضح ہے[۵۳]۔

حال کی "لسانی شورش" میں کہا گیا ہے کہ پنجاب ایجوکیشن کوڈ بابت ۱۹۱۲ء میں ورنیکلر پرائمری سکولوں کے نصاب کے سلسلے میں ورنیکلر کے لفظ کے سامنے اردو۔ پنجابی یا ہندی تینوں زبانوں کا ذکر ہے۔ اس لئے ثابت ہوا کہ پنجاب میں تینوں زبانیں سرکاری طور پر ذریعۂ تعلیم مانی گئی ہیں۔ اس سے زیادہ نادانی یا تجاہلِ عارفانہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ پنجاب یونیورسٹی تحقیقاتی کمیٹی (۳۳-۱۹۳۲ء) بھی نہ جانے کیوں اسی مغالطے میں پڑ گئی۔ ۱۸۸۸ء ۱۸۹۰ء اور ۱۹۰۵ء کے کوڈ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ صرف اردو ہی سرکاری ورنیکلر ہے۔ پہلی جماعت کے تحت میں صرف اردو قاعدے کا ذکر ہے۔ باقی ماندہ جماعتوں میں بھی صرف اردو نصاب مذکور ہے حساب۔ تاریخ وغیرہ سب کے متعلق اردو کتابوں کا ذکر ہے یعنی ذریعۂ تعلیم صرف اردو ہے۔ یہاں تک ابتدائی سکولوں میں بھی ہندی پنجابی کا کہیں ذکر نہیں بلکہ دوسری جماعت میں اردو کا قاعدہ اور پہلی کتاب مذکور ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ سرکاری یا لوکل باڈیز کے تعلیمی اداروں میں صرف اردو ذریعۂ تعلیم رہی ہے اور ورنیکلر کا لفظ اُردو کا مرادف ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ۱۹۱۲ء کے کوڈ میں ورنیکلر کے ساتھ (اردو۔ ہندی۔ پنجابی) تینوں زبانوں کا ذکر کیا گیا لیکن اس سے صرف یہ مراد ہے کہ جو پرائیویٹ تعلیمی ادارے ہندی اور پنجابی میں تعلیم دینا چاہیں وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ اگر حکومت خود ذریعۂ تعلیم میں کوئی تبدیلی کرنا چاہتی تو سرکاری سکولوں میں اس کا کچھ ثبوت ملتا۔ کم از کم حکومت کوئی اعلان شائع کرتی جس سے اس کی تعلیمی پالیسی میں کسی تبدیلی کا اظہار ہوتا۔ اسی طرح ۱۹۳۴ء کا محکمۂ تعلیم کا ایک اعلان ہے کہ طلبہ ورنیکلر فائنل یعنی آٹھویں جماعت کا امتحان اردو ہندی یا پنجابی میں دے سکتے ہیں۔ یہاں بھی صرف امتحان کا ذکر ہے۔ ذریعۂ تعلیم کا ذکر نہیں مختلف پرائیویٹ تعلیمی اداروں کے طلبہ جن کا ذریعۂ تعلیم ہندی یا پنجابی ہو۔ اس امتحان میں حصہ لے سکتے ہیں۔ ۱۹۳۶ء کے امتحان میں ۱۴،۷۶۳ طلبہ نے اردو میں ۱۸۹ طلبہ نے ہندی میں اور ۵ طلبہ نے پنجابی میں جواب دیئے۔ یونیورسٹی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ (صفحہ ۳۰۲) سے بھی یہی ثابت ہے کہ پنجاب میں آٹھویں جماعت تک نصاب کی کتابیں بالعموم اردو میں ہوتی ہیں اور آخری امتحان میں پرچوں کے جوابات اردو ہی میں دیئے جاتے ہیں۔ اس کمیٹی نے سفارش کی کہ نظامِ تعلیم میں ذریعۂ تعلیم کی موجودہ آسانیاں برقرار رکھی جائیں لیکن کہا کہ مختلف زبانوں کی مختلف جماعتیں بنا کر دیں سکولوں کے حصے بخرے کرنے کو ہم خوف کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس سے بہت سا زائد خرچ بھی ہوگا۔ اور جو بات اس سے بڑھ کر افسوسناک ہے وہ یہ کہ قومیتوں کے درمیان جو خلیج حائل ہے وہ اور بھی وسیع ہو جائے گی۔ کمیٹی کی یہ بھی رائے تھی کہ اگر ذریعۂ تعلیم کی زبان کافی ترقی یافتہ نہ ہو تو وہ غیر ملکی زبان سے بھی زیادہ نقصان رساں ثابت ہو سکتی ہے۔ اسی رپورٹ میں علامہ یوسف علی نے پنجابی بولیوں پر ایک نوٹ لکھا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ:-

[۵۱] رپورٹ ۸۷-۱۸۸۶ء صفحہ ۶۶-۱۵۔ پیراگراف ۹ [۵۲] رپورٹ ۱۶-۱۹۱۵ء صفحہ ۱۶ [۵۳] رپورٹ ۵۷-۱۸۵۶ء صفحہ ۱۱ پیراگراف ب، اور رپورٹ ۲۴-۱۹۲۳ء بسلسلہ نصاب پرائمری کل

سرسری طور پر دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کی زبان پنجابی ہے اور اسی کو ذریعۂ تعلیم ہونا چاہیئے لیکن فی الحقیقت پنجابی محض ایک جغرافی فقرہ ہے۔ پنجابی کی کئی بولیاں ہیں جن کے بولنے والے ایک دوسرے کی بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔ سر جارج گریرسن نے اپنی کتاب "لنگوسٹک سروے آف انڈیا" (جلد ۹ حصّہ اوّل صفحات ۶۱۰ تا ۶۳۸) میں اس پر خالص علمی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مغربی پنجاب کی بولیاں آریائی زبانوں کے اس زمرے میں بھی شامل نہیں جس میں مشرقی پنجاب کی بولیاں شامل ہیں۔ پنشتر لاکھ اشخاص مغربی بولیاں بولتے ہیں۔ اور ایک کروڑ بیس لاکھ لوگ مشرقی بولیاں۔ گریرسن کی رائے ہے کہ ہندوستانی پنجابی کی جگہ لے رہی ہے۔

غرض پنجاب کی خاص حالت کے پیش نظر اگر کوئی زبان یہاں مختلف قسم کے کام سرانجام دے سکتی ہے تو وہ اردو ہے۔ جنوب مشرقی پنجاب کو چھوڑ کر باقی حصّے میں پنجابی بولی جاتی ہے لیکن وہ ایک پنجابی دراصل کئی قسم کی پنجابیوں پر مشتمل ہے۔ علاوہ بریں اگر وسطی پنجاب کی بولی کو مستند مان لیا جائے تو بھی وہ اس قابل نہیں کہ ایک ترقی یافتہ زبان کی جگہ لے سکے۔ جدید علمی گورکھی۔ جدید ہندی کی طرح ایک سنسکرتی مرکب بن رہی ہے۔ اور کسی طرح اہل صوبہ کے لئے قابل فہم نہیں رہی۔ لکھنے والے گورکھی میں صرف کو کیول۔ قابل کو یوگ۔ ذریعہ کو دوارہ۔ آسمان کو آکاش اور کم کاج دا ویلا (کاروبار کا وقت) کو دیاپارک سماں لکھتے ہیں۔ حالانکہ بولنے والی پنجابی میں یہ لفظ کبھی استعمال نہیں ہوتے۔ اور بہت کم پنجابی ہیں جو ان الفاظ کو سمجھیں گے۔ سکھ بھی ہندوانہ اثر کے ماتحت عربی۔ فارسی کو چُن چُن کر گورکھی سے نکال رہے ہیں۔ نہیں معلوم وہ سردار اور گرنتھ جیسے اور بادشاہ اور خالصہ اور پنجاب اور پنجابی کے متعلق کیا رویہ اختیار کریں گے ؟ ہندی والے بھی اکثر بھول جاتے ہیں کہ ہندی عربی کا اور ہندوستان فارسی کا لفظ ہے۔ تنگ نظری آپ اپنی ناک کاٹتی ہے لیکن دیکھ نہیں سکتی کہ کیا ہو رہا ہے ؟

یہ پنجابی کی حالت ہے۔ ہندی کا حال اس سے بھی بُرا ہے۔ ہندی کو پنجاب سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ پنجاب میں پریوجن۔ بدھی آدریہ۔ پرشکار۔ دستاویز کا رکوئی نہ سمجھے گا لیکن مطلب عقل عزت۔ انعام ۔ چیز اور قبضہ کو دیہات والے بھی آسانی سے سمجھ لیں گے۔ اور الفوا ہندوستانی کو تو صرف یہاں کے پنڈت صاحبان ہی شاید سمجھ سکیں۔

پنجاب کے اٹھارہ روزانہ اخبارات میں سے صرف دو پنجابی میں ہیں اور ایک ہندی میں۔ اور ان کی اشاعتیں بہت تھوڑی ہیں پنجاب کے کل ۸۲۵۔ اخبارات و رسائل میں سے تقریباً ۵۵۰ اردو میں اور صرف ۹۰ گورکھی اور ۲۰ ہندی میں نکلتے ہیں تعلیمی دنیا میں اردو ہی کا بول بالا ہے ۱۹۴۰ء میں انٹرنس کے امتحان میں ۲۳۰۲۶ نے جغرافیہ اور تاریخ کے پرچوں کے جوابات اردو میں لکھے اور صرف ۹۰۸ ۲ نے ہندی اور پنجابی میں۔

ابتدائی اور ثانوی تعلیم میں یہ حالت ہے کہ بقول ہماری زبان" (مورخہ ۱۶ مارچ ۱۹۴۷ء) کے پنجاب میں اردو کے پرائمری اور مڈل سکول تقریباً نو ہزار ہیں۔ خالص ہندی کے ۱۶۸۔ ہندی۔ اُردو کے ملے جلے سکول، ۱۳۰۔ گورکھی کا صرف ایک مڈل سکول ۔ اور ۵۵ پرائمری سکول ہیں۔ سرکاری مدارس میں ذریعۂ تعلیم صرف اُردو ہے۔ اور لوکل باڈیز کے آٹھ ہزار سے زائد سکولوں کے مقابلے میں جن میں صرف اردو ذریعۂ تعلیم ہے صرف ۵۸ ایسے لوکل باڈیز کے سکول ہیں۔ جن میں ذریعۂ تعلیم صرف ہندی یا گورکھی ہے۔ بمعاصر موصوف لکھتا ہے کہ

ان اعداد سے صاف ظاہر ہے کہ درحقیقت صوبۂ پنجاب میں ذریعہ تعلیم اردو ہی ہے۔ اس سے صرف لڑکیوں کے مدرسے مستثنیٰ ہیں۔ جہاں یہ تینوں زبانیں ذریعہ تعلیم ہو سکتی ہیں۔

لیکن باوجود اس حقیقت کے اور باوجود اس امر کے کہ اردو ہی پنجاب کی سرکاری اور عدالتی زبان ہے۔ ہندوؤں اور سکھوں کی بعض جماعتوں نے گزشتہ چار ماہ سے صوبے بھر میں ایک آفت مچا رکھی ہے۔ انسوس کا مقام ہے کہ یہ لوگ جو نیشنلزم کے علمبردار ہیں مشترک تہذیب اور مشترک ملکی مفاد کی جڑ کاٹنے میں روز و شب مصروف ہیں۔ اگر واقعی ان کے تمام مطالبات تسلیم کر لئے جائیں اور تینوں زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنا دیا جائے تو پنجاب کی تینوں قومیں ایک دوسری سے قطعاً علیحدہ ہو جائیں۔ کوئی مسلمان کسی ہندو سے۔ اور کوئی سکھ کسی مسلمان سے خط و کتابت نہ کر سکے پھر ان لوگوں کے درمیان کونسی وجہ اشتراک باقی رہ جائے؟ یہ صورتِ حال خود ان قلیتوں کے لئے غایت درجہ ضرر رساں ہے لیکن قومی جوش کو دوراندیشی سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ یہاں عقل بے اختیار ہے!

حکومتِ پنجاب نے اعلان کیا ہے کہ وہ اس معاملے میں موجودہ حالت کو برقرار رکھے گی یعنی اس حالت کو جو ۱۹۳۶ء میں تھی۔ ۱۳ر فروری ۱۹۴۲ء کو پہلے ہندوؤں سکھوں کا ایک وفد اور پھر مسلمانوں کا ایک وفد ارباب حکومت کی خدمت میں حاضر ہوا دونوں سے کچھ نہ کچھ کہا گیا کسی نے کچھ سمجھا کسی نے کچھ لیکن موجودہ حالت کے صحیح معنی پھر بھی ٹھیک سمجھ میں نہ آئے۔

سچ یہ ہے کہ جب سے زبان سیاست کی لپیٹ میں آ گئی ہے، اس کے متعلق بھی زبانی جمع خرچ زیادہ ہوتا رہتا ہے۔ اور صحیح عمل بہت کم۔ جیسا کہ مولوی عبدالحق صاحب نے اردو کانفرنس لائل پور (منعقدہ ۲۳ر فروری ۱۹۴۲ء) میں فرمایا: "ہمارے سیاسی بزرگ سب کچھ کہتے ہیں لیکن ان کی باتوں میں لفظ زیادہ معنی کم ہوتے ہیں۔ صاف بات کبھی نہیں کہتے۔" "خلوت میں کچھ ہے اور جلوت میں کچھ۔ بالمشافہ ایک بات اور تحریر میں دوسری" "یہ سیاسی ہتھکنڈے کب تک کام دیں گے؟ یقیناً ایک دن ان کا بھرم کھل کے رہے گا"۔

ہم سمجھتے ہیں کہ پنجاب میں زبان کے معاملے میں موجودہ حالت کے صرف ایک ہی معنی ہو سکتے ہیں۔ جن علاقوں میں ہندی گورمکھی کا کبھی کوئی سکول نہیں کھولا گیا۔ وہاں صرف اردو ذریعہ تعلیم ہے۔ اور آیندہ بھی صرف اُسی کو ذریعہ تعلیم رہنا چاہیئے۔ انصاف پسندی اور صوبائی یکجہتی کا تقاضا یہی ہے کہ خواہ مخواہ کی تفریق کو تعلیمی معاملات میں دخل نہ دیا جائے۔

یہ سب کچھ صاف ہے اور واضح۔ وہ زبان جو ہندوستان کے طول و عرض میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی اور استعمال کی جاتی ہے وہ یقیناً اردو ہی ہے۔ اور اردو ہی ہے جس میں مختلف تہذیبوں کا عنصر جو ہندوستان میں آئیں موجود ہے۔ اور اس لئے اردو ہی ہے جو مختلف قوموں میں ارتباط کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ یہ سب کچھ درست ہے اور واضح لیکن جب یہ کہا جائے کہ نہیں اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ وہ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور ہندو اُسے چھوڑ کر ہندی سیکھیں گے۔ ہندی پڑھیں گے ہندی لکھیں گے اور صرف ہندی ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائیں گے اور سکھ صرف اپنے گرنتھ صاحب ہی کی زبان میں لکھیں پڑھیں گے۔ اور اسی میں جئیں مریں گے۔ جب یہ

کہا جائے تو ہمارے پاس اس کا کچھ جواب نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ بہتر ہے آپ کو اپنی راہ مبارک ہو ہمیں اپنی۔

خدا کا شکر ہے پہلے محبت آپ نے کم کی

اس حال میں ہم مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے؟ ہماری راہ صاف ہے ہمیں غم و غصے کا اظہار یا احساس نہ کرنا چاہیئے ہم نے اپنی تمدنی زبان فارسی چھوڑ کر ہندوستان کی مشترک زبان اردو اختیار کی۔ اردو ایک نہایت خوش نما۔ ترقی یافتہ اور ترقی پسند زبان ہے اس میں بڑھنے اور پھلنے پھولنے کی خوب صلاحیت موجود ہے۔ اب اگر ہندوؤں نے اس سے بے وفائی کی تو حرج نہیں ہم اس سے نباہ کریں گے۔ اس کا علم و ادب، اس کی مجلسیں، اس کے مشاعرے، ان سب کے دروازے ہندوستان کی سب قوموں کے لئے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔ ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو۔ لیکن یہ ہمیں خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ اب یہ ہماری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔

ہمیں اس کے معنی سمجھنے چاہئیں۔ زبان قوم کے تمدن کی علم بردار ہوتی ہے علم بردار گرا تو علم گرا۔ اور علم گرا تو قوم کا نشان گرا۔ اور نام مٹا۔ بے شک ہمارے مصنفین نے اس کے لئے دن رات پسینہ بہایا لیکن ہم لوگوں نے عام طور پر اس کی قدر نہیں جانی۔ سیاست کا پھیر پڑا اکر۔ مذہب کا نام لے کر ہم اپنے عوام و خواص کو جگا سکتے ہیں جوش دلا سکتے ہیں لیکن "زبان" یا "اردو" اب تک یہی ہوتا رہا ہے کہ ان کا ذکر کرو تو فقط کسی کسی کے کان پر جوں رینگتی ہے۔ لوگ اسے ایک شغل۔ زیادہ سے زیادہ ایک مشاعرے کے برابر سمجھتے ہیں زلف و خال کا ایک قصہ تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم میں سے اگر کوئی شخص "اردو اردو" پکارے تو اکثر لوگ زیادہ دل میں اور کچھ علانیہ بھی مسکرا دیں گے دل میں کہیں گے کہ شاید یہ کسی شاعر کا بچہ ہے اور زبان سے کہیں گے کہ ہاں بھائی! اردو تو خیر لیکن تم کوئی مفید قومی کام بھی کیا کرو۔ بریں عقل و تحقیق باید گریست۔

واقعہ یہ ہے کہ ہماری قوم نے ابھی اس مسئلے کی اہمیت کا ٹھیک اندازہ نہیں کیا۔ وقت نہیں آیا کہ ہم سمجھیں کہ زبان کی ہستی۔ ہمارے تمدن کی ہستی ہے۔ یہ سمجھیں کہ ہماری زبان مٹی تو ایک اجنبی فضا میں ہمارا دم گھٹنے لگے گا۔ اور ہماری قومیت نیم مردہ ہو جائے گی؟

غالباً کہا جائے گا کہ یہ خواہ مخواہ ڈرنے ڈرانے کی باتیں ہیں۔ اردو موجود ہے۔ لوگ اسے پڑھتے ہیں اور پڑھاتے ہیں۔ بولتے ہیں اور سنتے ہیں۔ اور بس قصہ ختم! لیکن کیا ہم دیکھ نہیں رہے کہ ہندوستان کی دوسری قوموں نے اس بنی بنائی زبان سے منہ پھیرنے کا ارادہ کر لیا ہے اسے فقط ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کہہ کر اپنا ڈیڑھ اینٹ کا مندر یا سوا اینٹ کا گردوارہ الگ بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟ کیا تازہ ترین شورش سے بھی ہم نے کوئی سبق نہیں سیکھا؟ اگر ہم محض حکومت پر تکیہ کر کے بیٹھے رہیں گے تو سخت غلطی کریں گے۔ اردو کے اس میدان میں ہم میں سے ہر ایک کو اردو کے لشکر کا سپاہی بن کر اترآنا چاہیئے۔ کرنے کے ہزاروں کاموں میں سے کم از کم ایک ایک کام کو سنبھال لینا چاہیے۔

ہماری سیکڑوں بڑی چھوٹی انجمنیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو اردو کا شعبہ قائم کر کے اردو کی ترقی اور اشاعت اور تبلیغ میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیئے۔ اگر اردو پنپ نہ سکی تو ہماری قومی زندگی کے ایک ایک شعبے پر برا اثر پڑے گا۔ یہ بات ہماری ہر انجمن کے کارکنوں کو خوب سمجھ لینی چاہیئے۔ انجمن ترقی اردو۔ اردو کا سب سے بڑا مرکزی ادارہ ہے جس کی اس وقت ملک بھر میں تقریباً دو سو شاخیں ہیں لیکن فقط یہ انجمن اردو کی

ضروریات کا سارا بوجھ برداشت نہیں کرسکتی۔ کیونکہ اردو کی ترقی و حفاظت کا کام اب بہت پھیل گیا ہے اور لازم ہے کہ مختلف قومی جماعتیں اور افراد اس میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں۔ جہاں تک شمالی ہند کا تعلق ہے انجمن حمایت اسلام لاہور کو اس بارے میں اپنی ذمہ داری کا بیش از بیش احساس ہونا چاہئے۔ سچ یہ ہے کہ اس تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے میں جب کہ ہمارے لئے اجنبی زبان کی مجبوریاں کم ہوتی جارہی ہیں۔ جب ہم کسی قسم کے اختیارات کو خود اپنے ہاتھوں میں سنبھالنے والے ہیں۔ قومی ترقی اور قومی نشو و نما کا تقاضا ہے کہ شمالی ہند میں جلد سے جلد ایک اردو یونیورسٹی قائم کی جائے اور انجمن حمایت اسلام اس کے قیام میں خاص طور پر حصہ لے۔

۲۴ مارچ ۱۹۴۷ء کو لکھنؤ یونیورسٹی کے کورٹ نے یہ قرارداد منظور کی کہ صوبے کی زبان کو جلد از جلد ذریعۂ تعلیم و امتحان قرار دیا جائے۔ پنجاب یونیورسٹی نے بھی چند برس سے اس مسئلے کی طرف توجہ مبذول کی ہے۔ اور باوجود اختلاف رائے کے یہ خیال روز بروز تقویت پا رہا ہے کہ بجائے انگریزی کے ذریعۂ تعلیم ہندوستانی زبانیں ہوں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستانی زبانوں سے کیا مراد ہے؟ ہمارے صوبے کے سکولوں کی تعلیمی زبان عام طور پر اردو رہی ہے۔ اب تھوڑی دیر سے ہندوؤں اور سکھوں کی ایک منظم جماعت اس بات پر مصر ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ہندی اور گورمکھی میں تعلیم دیں گے۔ اس کے ساتھ چند نام نہاد نیشنلسٹ اصحاب نے یہ آواز بلند کی ہے کہ یہاں کی تعلیمی زبان ہندوستانی ہونی چاہیئے جو ہندی اور اردو دونوں خطوں میں لکھی جائے۔ اس ہندوستانی کو معرضِ وجود میں لانے کیلئے وہ موجودہ اردو نصاب کو یکسر بدل دینا چاہتے ہیں۔ اسے عام فہم ہندوستانی یا آسان اردو بنانا چاہتے ہیں بلکہ ایک تجویز یہ بھی ہو رہی ہے کہ ایک ڈکشنری مرتب کی جائے جس میں صرف اردو، ہندی، پنجابی کے مشترک الفاظ لئے جائیں اور تمام نصابوں میں صرف یہی الفاظ استعمال ہوں۔ کیا کوئی ہوش مند شخص اس قسم کی لایعنی اور شرارت آمیز تجویز سے اتفاق کرسکتا ہے؟ سر تیج بہادر سپرو نے خوب کہا ہے کہ "ہندوستانی کوئی زبان نہیں۔ اس کا کچھ مطلب نہیں۔ میں اس زبان کے لئے اردو کا لفظ پسند کرتا ہوں۔ جب کوئی میرے سامنے ہندوستانی کا لفظ کہتا ہے تو میرے دل کو تکلیف ہوتی ہے اور سخت صدمہ ہوتا ہے۔ ہندوستانی کی اصطلاح دھوکے کی ٹٹی ہے۔ اپنی قومی زبان اردو کو اردو کہنے سے نہ ڈریں اور اعلان کے ساتھ کہیں کہ ہماری زبان اردو ہے۔" سر سپرو کے نزدیک صحیح قسم کی اردو وہ ہے جو مولوی عبدالحق صاحب لکھتے ہیں اور جو ان کی مطبوعات میں استعمال ہوئی ہے۔ لہٰذا اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ ہم پنجاب میں اردو اور خالص اردو کا جھنڈا بلند کئے رکھیں اور اپنی بنی بنائی ترقی یافتہ زبان کی صورت کو مسخ ہونے سے بچائیں تاکہ اس کا مخصوص ادب اور ہمارا مخصوص تمدن دونوں محفوظ رہیں اور زمانے کی رفتار کے ساتھ مناسب ردّ و بدل اور اصلاح کے ساتھ دونوں ترقی کرتے چلے جائیں

ہمارے لئے یہاں کی تعلیمی زبان اردو ہے۔ اور اردو ہی رہے گی۔ اور اب جب کہ سب مضامین ہندوستانی زبانوں میں پڑھانے کی تجویز پیش ہو رہی ہے ہمارا اصرار ہے کہ ذریعۂ تعلیم اردو ہی ہو۔ ہم اردو کے خالص روپ کو ہندوستانی کی لسی یا اردو ہندی پنجابی کی ملی جلی کچی لسّی میں تبدیل کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ ہم ان ہندوؤں اور سکھوں کو جو اردو سے اجتناب کرنا چاہیں ہرگز مجبور نہیں کرنا چاہتے کہ وہ اس سے محبت کریں لیکن ساتھ ہی ہم ہر سکول، ہر عدالت اور ہر دفتر کے تین تین ٹکڑے ہوتے دیکھنا کیسے گوارا کرسکتے ہیں۔ لہٰذا وقت آگیا ہے کہ یا پنجاب یونیورسٹی کو ایک ایسی یونیورسٹی بنایا جائے جس میں اردو کے ذریعے اعلیٰ تعلیم پانے کی بہترین سہولتیں مہیا کی

جائیں اور یا کوئی اور متبادل صورت پیدا کی جائے۔ اس مسئلے پر انجمن حمایت اسلام کو خاص طور پر غور کرنا چاہیئے۔ کیونکہ کم از کم پنجاب کے مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں اس کی ذمہ داری غایت درجہ اہم ہے محض فرقہ واری کے الزام سے بچنے کے لئے کچھ نہ کرنا ایک قومی جرم کے برابر ہوگا۔

اس سلسلے میں جب تک کوئی نئی صورت پیدا نہیں ہوتی انجمن کو اپنے تمام اداروں میں اردو کی اشاعت و ترقی کی طرف خاص طور پر توجہ کرنی چاہیئے۔ اردو کو تمام سکول اور کالج کے طلبہ کے لئے ایک لازمی مضمون بنا دیا جائے۔ صوبے میں اردو کی ترقی کے لئے انجمن کا ایک خاص محکمہ کھولا جائے۔ محض کبھی کبھی سالانہ اجلاس میں ایک اردو کی مجلس قائم کر دینا کافی نہیں۔ اردو کی طرف ہماری بے اعتنائی کی ایک مثال یہ ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کی ۴۰-۱۹۳۹ء کی رپورٹ کے مطابق ۴۸۶۴ طلبہ نے ہندی کے اعلےٰ امتحانات میں شرکت کی اور صرف ۶۸۵ نے اردو میں اور ۳۰۱۷ لڑکیوں نے ہندی لی اور صرف ۱۵۵ نے اردو۔

ہم اپنی ایک نئی دنیا بننے تک بے کار نہیں رہ سکتے۔ فقط انتظار کی گھڑیاں نہیں گن سکتے۔ اردو کے مسائل گوناگوں ہیں اور اس کی ضروریات روز افزوں۔ اس کی لسانی، طباعتی اور ادبی ضروریات کی طرف اردو انجمنوں کو بالخصوص متوجہ ہونا چاہیئے اور اس کی تعلیمی اور اشاعتی ضروریات کے سلسلے میں دوسرے اداروں اور خاص و عام افراد کو بھی حصہ لینا چاہیئے۔

لسانی ضروریات کے ضمن میں زبان کو عام فہم اور سہل الحصول بنانے کا مسئلہ ہے۔ ہمارا موجودہ ادب اور ہماری موجودہ صحافت قابلِ قدر ہے لیکن اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ کم لکھے پڑھے بالغ لوگوں کے لئے آسان لٹریچر اور عام فہم اخبار مہیا کئے جائیں اور طلبہ کی سہولت کے پیش نظر اردو ادب سے واقفیت پیدا کرنے کیلئے مختصر کتابیں لکھی جائیں۔

طباعتی مسائل میں ٹائپ کا مسئلہ فوری توجہ کا محتاج ہے۔ امید ہے کہ انجمن ترقی اردو ہند اس بارے میں جلد کسی فیصلے پر پہنچے گی۔

ہمارے ادب میں دنیا کا بہترین لٹریچر منتقل کرنے کی ضرورت ہے جس میں موجودہ ہندوستانی زبانوں کی کتابیں بھی شامل ہوں۔ نیز ضرورت ہے کہ ہماری بہترین کتابوں کے مختلف ارزاں ایڈیشن شائع کئے جائیں اور مفید موضوعات پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھوائے جائیں تاکہ مختلف قسم کی معلومات آسانی سے حاصل ہوسکیں۔ یاس انگیز جذبات سے ہم مدتوں متاثر ہو چکے۔ اب ہمیں امید افزا زندگی بخش خیالات درکار ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ہمارے ادب کا رُخ اب اسی سمت کو ہے۔

ہمیں تعلیم پھیلانے کی طرف خاص طور سے متوجہ ہونا چاہیئے۔ ہمیں اپنی پوری قوم کو تعلیم دینی ہے۔ ہمیں سارے ملک کو اردو زبان و ادب سے آشنا کرنا ہے۔ اس کے لئے مطالعہ گھر۔ عام اور گشتی کتب خانے، شبینہ مدارس۔ بالغوں کی تعلیم، عام اور خاص جلسے جن میں اردو میں تقریریں، مقالے اور مناظرے ہوں۔ اصلاح شدہ مشاعرے، اردو کتب کی اشاعت کے لئے مشترک سرمایہ کی کمپنیاں، مصنفین و مؤلفین کی حوصلہ افزائی۔ ریلوے، ڈاک خانہ، ریڈیو اور سینما کے محکموں میں اردو کا تحفظ۔ یونیورسٹیوں میں اردو کی ترقی۔ ان کی طرف ہماری انجمنوں اور قومی کارکنوں کو باقاعدہ طور پر متوجہ ہونا چاہیئے۔ ہرچند آج کل پروپگنڈا زندگی کا ایک ضروری جزو بن گیا ہے۔ مگر محض

کبھی کبھی جلسے کرکے اخبارات میں ان کی روئدادیں چھپوا دینے سے قومی فرائض پوری طرح ادا نہیں ہو جاتے ہمیں ٹھوس اور باقاعدہ اور مسلسل کام کی زیادہ حاجت ہے۔

عام طور پہ ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ اردو کی نگہداشت اور ترقی اردو انجمنوں کے ذمے ہے۔ یہ ایک طرح اُن کا پیشہ ہے اور وہ اگر کبھی کبھی ان کے جلسوں میں چلا جائے۔ یا کسی کے اصرار پر ان کی رکنیت قبول کرلے یا انھیں چندہ یا کچھ عطیہ دے دے تو اپنے خیال میں وہ قوم پر احسان کرتا ہے۔ یا کم از کم اپنا فرض ادا کر دیتا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ خود ہماری قومی ضروریات اور ان نازک حالات کے پیش نظر جن سے آج کل ہم دوچار ہو رہے ہیں اس طور پر اپنے دل کی تسلی کرلینا بڑی غلطی بلکہ قومی گناہ ہے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے گوالیار اردو کانفرنس (منعقدہ ۲۷ جنوری ۱۹۴۱ء) میں اپنے خطبۂ صدارت میں خوب لکھا ہے کہ "زبان کا جانا زندگی کا جانا ہے"۔ اگر آپ کو اپنی زندگی اور تہذیب عزیز ہے تو اسے بچانے کی فکر کیجئے" پھر یہ کہہ کر کہ ہم بالطبع کاہل واقع ہوئے ہیں۔ اور کام سے جی چراتے ہیں لکھتے ہیں کہ افراد اور قوموں نے اپنی زبان اور تہذیب کے بچانے کے لئے جانیں کھپا دی ہیں۔ ہم آپ سے یہ نہیں چاہتے کہ جانیں دیں یا بڑی بڑی قربانیاں کریں۔ ہم تو آپ سے صرف یہ چاہتے ہیں کہ زیادہ نہیں تو تھوڑی سی توجہ اس طرف بھی فرمائیے۔ یاد رکھئے کہ یہی ذرا سی توجہ یہی تھوڑی سی زحمت اور آپ کی کمائی کا یہی قلیل اور حقیر حصہ آپ کی نجات کا باعث ہوگا" پھر وہ بعض معمولی کام گنواتے ہیں جو ہر شخص اپنی جگہ آسانی سے کرسکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ خطوں کے لفافوں پر پتہ اردو میں لکھیں جلسوں میں تقریریں اردو میں کریں۔ اپنے جلسوں کی روئدادیں اردو میں لکھیں۔ اپنے سائن بورڈ۔ اپنے نام کی تختیاں اردو میں ہوں۔ منی آرڈر اور رجسٹری کے فارم ڈاکخانے سے اُردو میں طلب کریں۔ اور اردو ہی میں خانہ پُری کریں۔ اپنے گھروں میں اور عام بول چال میں اردو استعمال کریں۔ باہم خط وکتابت اردو میں کی جائے۔ اردو اخبار اور رسالوں کی سرپرستی کریں۔ اردو کتابوں کا مطالعہ کریں۔ حساب کتاب اردو میں رکھیں۔"

یہ کیسی معمولی باتیں ہیں لیکن یہ واقعہ کہ ہمارے "قائد اردو" کو ان معمولی باتوں کی طرف ہمیں متوجہ کرنا پڑا صاف ظاہر کرتا ہے کہ ہماری قوم کس قدر غافل اور کاہل اور بے حس ہے۔

ہاں ہم غافل اور کاہل ہیں لیکن زمانے کے حالات ہمارے گردوپیش کے نازک اور خطرناک واقعات اب ہمیں جگا اور اکسا رہے ہیں اب ہمیں کاہلی اور بیزاری میں مزا نہ آئے گا۔ اب دوسری قوموں کی روز افزوں ترقی ہمیں پیش قدمی کرنے پر مجبور کر دے گی تھوڑی مدت ہوئی کہ ہماری قومی ہستی مٹتی نظر آتی تھی۔ آج بھی کچھ ظاہری اور بہت سے چھپے ہوئے خطرے ہم پر رہ رہ کر حملہ آور ہو رہے ہیں ہم پر ہر طرف سے ایک طوفانِ بے تمیزی ٹوٹ رہا ہے لیکن اب ہم اپنی خودی کو پہچان رہے ہیں۔ اب خوف ہمیں خوف زدہ نہیں کرسکتا۔ اب ترجمانِ حقیقت کی یہ پکار دن رات ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے ؎

سفینۂ برگِ گل بنائے گا قافلہ موجِ ناتواں کا ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہوگا!

بشیر احمد

غزل

والا شان شہزادہ نواب معظم جاہ بہادر شجیع (حیدرآباد دکن)

عاشقی ہوش ہوئی جاتی ہے
حشر بر دوش ہوئی جاتی ہے

دل میں جو شمع جلا کرتی تھی
آج خاموش ہوئی جاتی ہے

رفتہ رفتہ ترے آغوش کی یاد
خواب آغوش ہوئی جاتی ہے

کس کی فریاد پہ ساری دُنیا
ہمہ تن گوش ہوئی جاتی ہے

اب خبر لے کے مری بیخبری
حاصلِ ہوش ہوئی جاتی ہے

تم جو آئے تو کہانی دل کی
سب فراموش ہوئی جاتی ہے

بے خودی فیضِ محبت سے شجیع
ہوش ہی ہوش ہوئی جاتی ہے

روحانی سرمایہ

کسی زمانے میں چین میں چند بزرگ تھے (شاید اب بھی ہوں) جن کا عقیدہ یہ تھا کہ روزانہ طلوعِ آفتاب محض اُن کی پے در پے شبانہ دعاؤں کا نتیجہ ہے اور اگر یہ دعائیں (جن کے لئے حکومت اِن بزرگوں کو وافر انعام عطا کرتے تھے) کسی وجہ سے رُک جائیں تو پھر سورج شاید شرق سے کبھی منہ نہ دکھائے۔

بچپن میں لاہور میں یہ بھی سنا کہ انگریزی حکومت محض ایک مجذوب درویش کی نگاہِ سلطنت نواز کا کرشمہ ہے۔ ماننے والے یہاں تک کہتے تھے کہ اگر یہ سائیں ایک منٹ کے لئے آنکھیں بدل لیں تو نظامِ عالم تہ و بالا ہو جائے۔ خدائی کارخانے میں انہیں بے انتہا دخل تھا۔

دروغ برگردنِ راوی مگر یہ معتبر ذرائع سے سنا کہ جب حجرہ نشینوں کے بارِ گراں کو حضرت اتاترک نے اپنی سیاست سے ترک کندھوں سے اتار پھینکا تو بہت چہ مے گوئیاں ہوئیں کہ خلیفۃ الاسلام سے باغی ہونا اور بات ہے فقیروں کے منہ آنا ہنسی ٹھٹھا نہیں طوفانِ نوح آجائے گا۔

گنگا اشنان کرنے والوں سے بیسیوں دفعہ سنا کہ گنگا کے کنارے وہ وہ یوگی ریاضت میں مشغول ہیں کہ زندہ دفن کردو ان کا بال بیکا نہیں ہوتا۔ ایک کیا کئی انگریزوں نے ان کے کمالات کی داستانوں سے خوب روپیہ کمایا ہے یہی وجہ ہے کہ پنجہ صاحب کی مشہور زیارت گاہ کے لاکھوں معتقد ہیں۔ قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ حسن ابدال ایک درویش نے آزمائش کے طور پر ایک پہاڑ اٹھا کر گرو صاحب کی طرف پھینک مارا۔ گرو صاحب نے واہ گرو کا نام لے کر یہ پہاڑ اپنے دستِ مبارک سے روک لیا۔ جسے باور نہ ہو وہ اپنی آنکھوں سے جا کر پہاڑ پر گرو کے پنجہ کا نشان دیکھ لے۔ اگر اس کل جُگ کے یوگی انگریزوں سے خراجِ تحسین لیتے ہیں تو آج سے چار سو سال پہلے کے گرو اور فقیر کیا کیا نہ کرتے ہوں گے۔ اکبر بادشاہ کئی دفعہ پا پیادہ خواجۂ خواجگان کے مزار شریف کی زیارت کیلئے اجمیر شریف گیا۔ اور ہزاروں کیا لاکھوں لوگوں کا اب تک اعتقاد ہے کہ ہمایوں کے بیٹے بابر کے پوتے کی فقیر پرستی چار پشتوں کے لئے چغتائیوں کو وہ بادشاہی دے گئی کہ باید و شاید۔ فقیروں کیلئے بادشاہی بخش دینا کوئی غیر معمولی بخشش نہیں۔ جو لوگ آفتاب کا چلنا پھرنا بند کر سکتے ہیں وہ اگر بادشاہی بخش دیں تو کیا بڑی بات ہے۔ فقیروں کی دنیا میں سینہ بسینہ بصیغۂ راز یہ بات چلی آتی ہے کہ انگریز گاندھی جی سے اس لئے ڈرتے ہیں کہ کہیں گاندھی جی بھی پا پیادہ اجمیر شریف کی طرف رُخ نہ کر لیں اور گاندھی جی سے یہ بات کچھ بعید بھی نہیں۔ یوں تو اُن کی طبیعت اس قدر کوہ وقار ہے کہ وہ کبھی تنگ آمد بجنگ آمد والا قصہ نہ کریں گے مگر جو کسی آزاد نے (فقیروں کی بھی ذاتیں ہوتی ہیں مثلاً غوث، قطب، ابدال، آزاد بھی ایک ذات ہے جو ہندو سنیاسی کے مماثل ہے) آدکی تو تعجب نہیں کہ مسٹر چرچل کا "ننگا فقیر" واردھا سے اجمیر شریف وارد ہوئے۔ پاؤں پاؤں چلنا گاندھی جی کے لئے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔

ہندوستان کا روحانی سرمایہ مندروں، مزاروں، گوردواروں میں مقفل بند ہے۔ کنجی اگر ملی تو جمنا کے کنارے کسی یوگی سے ملے گی۔

فقیر دوست عقل دشمن

رباعیّات

مَن یُجیبُ المُضطَر

اے خالقِ دو جہاں خدائے اکبر
از جیتے مرے بجانِ زار زار من
در حالتِ اضطرارِ عبدِ بے کس
یارب بسوال کہ مَن یُجیبُ المُضطَر[۱]

سعی لاحاصل

وادیدم بہ تلاشش او صد ابر بہار
در پیش خیال در دو دیدہ ام دور دور
در پیش بیش نگراں
جانش در چشمِ و در جیتے جیتے پیش بیدار
او در بر و من با انتظارش بیدار

کُلٌّ قد عَلِمَ صلاتَہُ و تسبیحَہُ[۲]

قائم بعبادتِ تو کہسار بہ پشت
مصروف برکوع و سجدہ ہی ہر نابت
دریا ز حباب سبحہ در کف دارد
انگشتِ شہادت است ہر خار بہ پشت

الواحدُ فی الکل و فی الکل واحد

از چشمِ حقیقت بنگر اندر شے
گر بیت نظر بکن نظر اندر شے
گر ہست کثیر در دو احد کل
در کل ہمہ واحد است در اندر شے
شے ہست اندر شی بر اندر شے

سید احمد حسین امجد

۱؎ اے رب تیرے سوا بے قرار کو کون تسکین دینے والا ہے ۱۲ ۲؎ یعنی دنیا میں ہر ایک اپنی عبادت اور تسبیح کے طریقے سے واقف ہے ۱۲

یادِ رفتگاں

(میری زندگی پر کن کا اثر پڑا)

انسان کی سیرت اور زندگی کو بہت سی چیزیں بناتی یا بگاڑتی ہیں عزیزوں اور دوستوں کی صحبت جن کے ساتھ اس نے اپنی عمر کا بڑا حصہ گزرا ہے۔ کتابیں جو اس نے پڑھی ہیں۔ وہ کام جو اس نے انجام دیئے ہیں۔ سیاسی یا سماجی ماحول جس میں اس نے تربیت پائی ہے۔ ان تمام اثرات کے میل جول سے اس کی سیرت کا مخصوص سانچہ تیار ہوتا ہے لیکن ان میں سب سے زیادہ اہم وہ ذاتی اثرات ہیں جو دوسرے لوگوں کے اس پر پڑتے ہیں۔ اگر زندگی کے کٹھن سفر میں اس کو بعض ایسے رہنما یا دوست مل جائیں جن کی سیرت کے پرتو سے یہ تاریک راستہ روشن ہو جائے تو اس کی بڑی خوش نصیبی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ خوش نصیبی میرے حصے میں آئی اور مجھے اپنے عزیزوں اور دوستوں ہی میں ایسی ہستیوں کی صحبت نصیب ہوئی جن کے صفائے باطن نے مجھ پر بہت گہرا اثر ڈالا۔

سب سے پہلا اور سب سے زیادہ دیرپا اثر جس نے میری سیرت کی تشکیل میں حصہ لیا میری والدہ مرحومہ کا اثر تھا۔ یوں تو ہر شخص قدرتاً اپنی ماں کی ذات اور سیرت کو ایک مثالی شکل میں دیکھتا ہے لیکن جذباتی تعلق کو چھوڑ کر اور ٹھنڈے دل کے ساتھ غور کرنے کے بعد بھی میرا خیال ہے کہ کم سے کم میں نے کسی اور شخص کی سیرت میں محبت، خلوص اور دل سوزی کی اس قدر فراوانی نہیں دیکھی۔ وہ مولانا حالی کی پوتی تھیں اور انھوں نے یہ تمام صفات جو شریف ہندوستانی بی بیوں کا مخصوص سرمایہ ہیں اپنے دادا سے ورثے میں پائی تھیں۔ اولاد کی محبت تو ہر ماں کے دل میں ہوتی ہے لیکن ان کی یہ محبت اور شفقت وسیع اور عام ہو کر اپنی پوری دنیا پر چھا گئی تھی۔ وہ ہر غریب اور محتاج کی امداد، ہر بیمار کی تیمارداری، ہر ستم رسیدہ کی دل جوئی کے لئے ہر وقت تیار رہتیں۔ ان کی خیرات کا یہ عالم تھا کہ باوجود دولتمند نہ ہونے کے ضرورت مندوں کے لئے ان کا دستِ کرم ہمیشہ دراز رہتا اور اس شان کے ساتھ کہ دائیں ہاتھ سے جو دیتیں اس کی خبر بائیں ہاتھ کو نہ ہوتی۔ اگر خاندان میں یا شہر والوں میں کوئی باہمی جھگڑے یا اختلافات ہوتے تو وہ ہمیشہ ان کو صلح و آشتی کے ساتھ طے کرانے کی کوشش کرتیں۔ عورتیں آتیں اور اپنے دکھ درد اور پریشانیوں کا بار ان پر ڈال دیتیں اور یہ نہایت خندہ پیشانی اور عالی ظرفی کے ساتھ اس بار کو اٹھا لیتیں۔ اُن کی ایک خاص صفت یہ تھی کہ وہ مظلوم اور کمزور کی حمایت اور سرپرستی کے لئے ہر وقت آمادہ رہتیں۔ ان کا جذبۂ انصاف اس قدر شدید تھا کہ اگر کسی معاملے میں غیر حق پر ہوتے تو وہ اپنوں کے مقابلے میں ان کی حمایت کرتیں۔ اور اس حق دوستی کے تلخ نتائج کی پروا نہ کرتیں۔ یہ صفت لوگوں میں بہت کم ہوتی ہے کیونکہ وہ عام طور پر حق و ناحق کو پرکھنے کے بجائے اپنے اور پرائے کی بھول بھلیوں میں سیدھے راستے سے بھٹک جاتے ہیں۔ ان کی زندگی سے مجھ کو یہ سبق ملا کہ انسان میں بغیر علمی

رسمی تعلیم کے محض دل و دماغ کی فراخی اور شرافت کی بدولت غیر شعوری طور پر وہ بیدار مغزی اور اخلاقی صفات پیدا ہو سکتی ہیں جن کی تحقیق اور تفسیر میں دنیا کے بہترین مفکروں نے اپنی عمریں تمام کی ہیں۔ ان کے عمل سے میں نے یہ انمول حقیقت بھی سیکھی کہ خدا کی رضا جوئی کا بہترین راستہ اس کے بندوں کی خدمت ہے۔

دوسرا زبردست اثر مجھ پر میرے والد آنریبل خواجہ غلام الثقلین مرحوم کا پڑا۔ ہندوستان میں اب بھی ان کے لاکھوں جاننے والے موجود ہیں۔ اور انھوں نے مفرد مصنف سیشل ریفارمر اور ممبر کونسل کی حیثیت سے جو خدمات انجام دیں۔ وہ ان سے بخوبی واقف ہیں۔ لیکن ان کے کاموں سے بھی زیادہ قابل قدر ان کی غیر معمولی شخصیت اور سیرت تھی جس نے ان کو اپنے معاصرین میں ممتاز کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنی تمام عمر قومی خدمت اور صحیح اصولوں کی اشاعت میں بسر کی لیکن ان کا کمال یہ تھا کہ باوجود اس دشوار گزار راستے کو اختیار کرنے کے وہ ان تمام آلودگیوں اور تعصبوں سے بلند اور بے نیاز رہے جو ہماری پبلک لائف کو خراب کرتی ہیں۔ ان میں ایک خاص فقیری اور بے نیازی کی شان تھی۔ قومی کام کے سلسلے میں انھیں کبھی ذاتی وجاہت، عزت یا ناموری حاصل کرنے کا خیال پیدا ہی نہیں ہوا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ انسان محض اعلیٰ مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ اور اس کو چاہیئے کہ انتہائی ایثار اور بے نفسی کے ساتھ ان مقاصد کی تحصیل کے لئے جدوجہد کرے۔ اس لئے ذریعہ کو مقصد پر اہمیت دینے کے کیا معنی؟ ان کی طبیعت میں ایک خاص وصف تھا جس کے لئے یونانی فلاسفہ نے BALANCE یعنی توازن کا لفظ اختیار کیا ہے۔ اور جس کے لئے اسلامی فلاسفہ عدل کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔۔۔ ان کے عقیدے اور عمل میں، دل اور دماغ میں، خیالات اور جذبات میں ایک خاص ہم آہنگی تھی۔ جس کی بدولت وہ اپنے ہر کام کو جرأت، استقلال اور ایمان کے ساتھ انجام دیتے تھے۔ وہ ہر معاملے میں سوچ بچار اور گہرے مطالعہ کے بعد اپنی رائے قائم کرتے اور ایمان داری اور آزادی کے ساتھ اس کا اظہار کرتے۔ اور باوجود مخالفت کے سختی کے ساتھ اس پر قائم رہتے۔ اسی وجہ سے ان کی زندگی میں کئی دفعہ ایسے مواقع پیش آئے کہ کبھی ہندو، کبھی مسلمان کبھی سنی کبھی شیعہ کبھی حکومت کبھی آزاد خیال طبقہ ان کے طرز عمل سے ناخوش ہوئے لیکن بعد کے واقعات نے نہ صرف ان کے خلوص نیت بلکہ ان کی دوراندیشی اور معاملہ فہمی کی تائید کی۔ وہ تمام عمر طالب علم رہے۔ ان کا مطالعہ غیر معمولی طور پر وسیع اور ہمہ گیر تھا۔ مشرق و مغرب کا ادب اور فلسفہ۔ تاریخ اور سیاست منطق اور اخلاقیات، مذہب اور فقہ، غرض علم کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس کا انھوں نے گہری نظر سے مطالعہ نہ کیا ہو لیکن اس علمی شغف نے ان کی قوت عمل کو کمزور نہیں کیا۔ یہ بھی ان کی طبیعت کے توازن کا ایک مظاہرہ تھا۔ انھوں نے جس کام کو اٹھایا مثلاً تعلیم نسواں اصلاح معاشرت، رسود کی شرح بندی۔ اس کو جرأت، استقلال اور سمجھداری کے ساتھ نبھایا۔ ان کی زندگی اور ان کی تصانیف کے مطالعے سے میں نے یہ سبق سیکھا انسان کو سب لوگوں کے ساتھ رواداری اور انصاف کے ساتھ پیش آنا چاہیئے لیکن جہاں حق کی حمایت کا مسئلہ ہو وہاں رائے عامہ کے ساتھ چلنا اور اس طرح سستی ہر دلعزیزی حاصل کرنا وقار انسانیت کے منافی ہے۔ اور زندگی انسان کی اپنی ملکیت نہیں جس کو وہ ذاتی تفریح اور آرام میں بسر کرے، بلکہ خدا کی امانت ہے جس کو بلند ترین مقاصد کی خدمت میں صرف کرنا اس کا فرض ہے۔

ایک اور بزرگ جن کا میں ہمیشہ احسان مند رہوں گا میرے چچا خواجہ غلام الحسنین مرحوم تھے جن کی حیثیت معلم مصنف مترجم۔ مذہبی عالم اور واعظ کے ہندوستان کے مختلف حصّوں میں کافی شہرت ہے لیکن میری زندگی کی ساخت میں ان کی شخصیت کی یہ اہمیت ہے کہ میں نے اس میں ایک حقیقی مذہبی آدمی اور ایک سچّے طالب علم کی مکمل ترین تصویر دیکھی۔ ان کی زندگی کے صرف دو مرکز تھے علم اور مذہب۔ ان کے علاوہ انھیں اور تمام چیزیں بے حقیقت معلوم ہوتی تھیں۔ مذہبی خدمت۔ مطالعہ تحریر و تقریر یہی ان کی زندگی تھی۔ ان کے سامنے انھیں کبھی اپنے آرام و راحت کا خیال پیدا ہی نہیں ہوا۔ وہ اپنے کام میں اس قدر مستغرق رہتے کہ گرمی۔ سردی۔ روشنی۔ اندھیرا۔ گھر کا شور وغل۔ دنیا کے پریشان کرنے والے واقعات ان کی توجہ کو نہیں ہٹا سکتے تھے۔ بار ہا دیکھا کہ وہ کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں یا مضمون لکھ رہے ہیں اور سورج ڈھلتے ڈھلتے شام ہوگئی ہے کمرے میں اندھیرا چھا گیا ہے لیکن انھیں اس کا احساس نہیں۔ وہ کتاب یا کاغذ پر دبے جھکتے جاتے تا کہ پڑھنے میں سہولت ہو۔ یہاں تک کہ یا تو کوئی شخص کمرے میں روشنی کر دیتا۔ یا اس قدر اندھیرا ہو جاتا کہ پڑھنا ناممکن ہو جاتا! وہ جس علمی یا مذہبی کام کو ہاتھ میں لیتے اس قدر خلوص اور انہماک کے ساتھ اس کو انجام دیتے گویا عالم کائنات کے توازن کا دارومدار اس کی صحیح تکمیل پر ہے۔ اپنی ادبی زندگی کے آغاز میں انھوں نے ہربرٹ سپنسر کی مشہور تعلیمی تصنیف کا ترجمہ کیا تھا جس کو انجمن ترقی اردو نے "فلسفۂ تعلیم" کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس وقت زبان کے ماہرین کی یہ رائے تھی کہ اردو میں ایسے ترجمہ کا بار اٹھانے کی صلاحیت نہیں لیکن انھوں نے اپنی قابلیت اور ان تھک محنت سے اردو کی علمی حیثیت میں ایک نئی وسعت پیدا کر دی۔ ان کی ہر تحریر میں ایک مخصوص سلاست اور روانی ہوتی تھی کیونکہ ان کا ادبی عقیدہ یہ تھا کہ ہر خیال کو اس وضاحت کے ساتھ ادا کرنا چاہئے کہ معمولی تعلیم اور سمجھ بوجھ کا آدمی بھی اس کو سمجھ سکے۔ وہ تقریباً تمام عمر پانی پت کے بورڈ سکول اور مسلم ہائی اسکول میں معلّم رہے اور اس حیثیت سے انھوں نے ہزاروں طلبہ کی سیرت کو بنایا اور سنوارا۔ اور معلمی کی اس قدیم شان کو زندہ کر دکھایا جو اس زمانے میں تقریباً ناپید ہو چکی ہے۔ اُن کی زندگی سے مجھ پر یہ حقیقت بھی کھلی کہ انسان باوجود ایک معمولی سا شغل اختیار کرنے اور ایک محدود ماحول میں زندگی بسر کرنے کے اپنے خلوص محنت۔ یک سوئی اور خدا شناسی کی بدولت عظیم الشان علمی اور مذہبی خدمت انجام دے سکتا ہے۔

مشاہیر میں سے دو بزرگوں کی شخصیت نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ ایک ڈاکٹر سر محمد اقبال۔ دوسرے سر سید راس مسعود۔ اس عقیدت مندی میں ہندوستان کے ہزاروں لاکھوں آدمی میرے شریک ہیں کیونکہ ان کی صحبت ایک نیض جاری تھی جس میں ہر قسم کے لوگ آتے اور اپنی صلاحیت کے مطابق مستفید ہوتے تھے طالب علمی کے زمانے میں مجھے اقبال کی ذات سے بالواسطہ یعنی ان کے کلام کی وجہ سے عقیدت تھی لیکن جب ان کی ملاقات کی نعمت نصیب ہوئی تو مجھے اس حقیقت کا از سرِ نو احساس ہوا کہ جو انسان واقعاً بڑے ہوتے ہیں وہ اپنے کارناموں سے بھی کہیں زیادہ بلند ہوتے ہیں۔ ان کا روشن دماغ ایک فوارۂ نور تھا جو ایک متحرک لائٹ ہاؤس کی طرح چاروں طرف کے اندھیرے کو روشن کر دیتا تھا۔ ان کے خیالات میں جدّت اور شگفتگی اور اظہار خیال میں ایک خاص ندرت تھی۔ وہ جس مسئلے کو بیان کرتے جو حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھا دے۔ اس میں ان کا معنی آفریں دماغ عجیب عجیب اور نئے نکتے پیدا کرتا اور ان کی لطیف ظرافت خشک سے خشک مسئلے میں دلچسپی کی ایک لہر دوڑا دیتی۔ وہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے شاعر تھے لیکن برخلاف عام شعراء کے کلام کے جو خود کو براہِ راست

خدا کا شاگرد سمجھتے ہیں اور مطالعے اور غور کو اپنی شان کے خلاف جانتے ہیں۔ انھوں نے اپنا مطالعہ تمام عمر نہایت سنجیدگی کے ساتھ جاری رکھا اور اس کی بدولت ان کا علم و عرفان زیادہ وسیع اور گہرا اور متنوّع ہوتا گیا۔ اور ان کی شاعری ایک آلۂ تفریح کے بجائے ہدایت اور معرفت کا سرچشمہ بن گئی۔ ان کی شاعری اور فلسفے میں بھی ان کی زندگی کی طرح ایک عالمگیر وسعت اور رواداری تھی۔ اس میں جبریل اور ابلیس۔ رومی اور نیٹشے، غالب اور گوئٹے بھرتری ہری اور قرۃ العین سب کے لئے گنجائش تھی کیونکہ یہ تمام شخصیتیں حقیقت کے مختلف پہلو بے نقاب کرتی ہیں۔ ان کے دل و دماغ کا مرکز اسلام کی تعلیم کی صحیح اور بصیرانہ تفسیر تھی لیکن انھوں نے کبھی عام مولویوں کی طرح دنیا کے گوناگوں علوم اور مشاہدات اور تجربات سے روگردانی نہیں کی بلکہ ہر طرف کی روشنی سے اپنے مرکزی مقصد کو منوّر کیا۔ عمر کے آخری دور میں ان کی شانِ فقر بہت بڑھ گئی تھی۔ وہ دنیا کی جھوٹی اور مصنوعی عزتوں کی طرف سے بالکل بے نیاز ہو گئے تھے۔ اور انسان دوستی کے راستے خدا شناسی کی منزل تک پہنچ گئے تھے ؎

میرا نشیمن نہیں درگہِ میر و وزیر　　　میرا نشیمن بھی تو شاخِ نشیمن بھی تو!

ان کا دربار امیروں اور رئیسوں کے دربار سے بالکل مختلف تھا۔ وہاں نہ پاسبان کی حاجت تھی نہ اجازت طلبی کی ضرورت۔ ان کا دروازہ امیر و غریب، عالم و جاہل۔ دیسی بدیسی سب کے لئے کھلا تھا اور ہر طرح کے لوگ ان کے پاس آتے علمی، سیاسی، مذہبی مسائل پر بحث کرتے مقامی معاملات پر مشورہ کرتے۔ ان کے لطیفے اور چٹکلے سنتے حقّہ پیتے بعض محض زیارت کرتے اور اس بندۂ خدا کے دل میں سب کے لئے جگہ تھی ہر ایک سے اس کی سمجھ اور مذاق کے مطابق مخاطب ہوتے اور انسانیت کے رشتۂ مشترک کا پورا احترام کرتے۔ جب کوئی صلاحیت رکھنے والا شخص ان کی صحبت سے اٹھتا تو اسے محسوس ہوتا کہ اس کی زندگی میں ایک نئی گہرائی اور معنویت پیدا ہو گئی ہے۔ قدرت بہت کم لوگوں کو اس قدر روشن دل و دماغ بخشتی ہے!

ڈاکٹر اقبال کی طرح سر سیّد راس مسعود کے بھی لاکھوں دیکھنے اور جاننے والے موجود ہیں۔ مگر اس وقت میں ان کی شاداب اور ہمہ گیر شخصیت کے صرف دو پہلوؤں کی طرف اشارہ کروں گا۔ ایک تو ان کا مجلسی پہلو تھا۔ جو پہلی ہی ملاقات میں ہر شخص کو اپنا گرویدہ کر لیتا تھا ان کی گفتگو میں ایک ایسا جادو تھا جس کا توڑ ممکن نہ تھا۔ ذہانت، بذلہ سنجی ظرافت اور مذاقِ شعر و سخن کی بدولت ان کی صحبت اس صدی کی بہترین مجلس ہوا کرتی تھی۔ وہ جہاں کہیں پہنچ جاتے نسیم بہار کی طرح افسردہ دلوں کو کھلا دیتے تھے لیکن ان کے قریب سے دیکھنے والے جن کو ان کی دوستی محبت اور اعتماد کی دولت حاصل تھی جانتے تھے کہ اس متبسّم سطح کے نیچے ان کے پہلو میں ایک نہایت حسّاس اور دردبھرا دل ہے جو اپنے دوستوں اور عزیزوں کے دکھ درد اور اپنی قوم اور ملک کی بہبود کے لئے بے چین رہتا ہے۔ یہ تڑپ۔ یہ تپش بہم اکثر اوقات ان کی شگفتگی کو ایک یاس اور افسردگی کی کیفیت میں بدل دیتی تھی۔ ان کی زبان پر اکثر یہ شعر رہتا تھا جو ان کے دردِ دل کی چغلی کھاتا تھا ؎

سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں　　　دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے!

ان کا دل ہر قسم کے تعصب اور تنگ نظری سے پاک تھا اور ان کے دوستوں میں ہندو، مسلمان، چھوٹے بڑے، امیر غریب، بچے بوڑھے ہندوستانی انگریز سب شامل تھے۔ وہ کم درجے کے لوگوں سے جھک کر ملتے اور ان کے ساتھ برابری کا برتاؤ کرتے تھے لیکن دماغ دار سربلندوں سے سربلندی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ انھیں مغرور اور خود پسند لوگوں سے نفرت تھی اور جب کبھی موقع ملتا ان کو اپنی بے امان ظرافت کا شکار بناتے تھے۔ کیونکہ ان کے مذہب اور تہذیب کی رو سے خدا کے بندوں میں ان کی دنیاوی تہذیب کی بنا پر امتیاز کرنا اور خود کو ان سے بلند اور برتر سمجھنا ایک گناہِ کبیرہ تھا۔

میرا یہ مضمون ادھورا رہ جائے گا، اگر آخر میں اپنے ایک عزیز دوست اور رفیقِ کار سید تجمل حسین مرحوم کا ذکر نہ کروں جو بارہ سال کے قریب میرے ساتھ علی گڑھ کے ٹریننگ کالج میں پروفیسر رہے۔ ریاست پٹیالہ میں سامانہ سیدوں کی ایک بستی ہے۔ مرحوم وہیں کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے کچھ عرصے صوبۂ متوسط میں مدرسی کی۔ اس کے بعد چند سال گجرات کے زمیندارہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر رہے۔ پھر صاحب زادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کی تحریک پر علی گڑھ میں پروفیسر مقرر ہوئے اور یہیں وفات پائی۔ دنیاوی اعتبار سے بظاہر یہ زندگی معمولی اور بے ہنگام معلوم ہوتی ہے لیکن ان کی ذات اس بات کا بیّن ثبوت تھی کہ اگر کسی انسان کی سیرت میں سچی شرافت خلوص اور پختگی ہو تو وہ اپنی حدود کو توڑ کر ان عالم گیر اثرات کا جزو بن جاتی ہے۔ جو دوسروں کی زندگی کو بناتے ہیں۔ وہ ایک حقیقی معلّم تھے۔ ان کی صحبت اور ذاتی مثال سے ان کے شاگردوں کو زندگی کے ایک بہتر تصور کی جھلک نظر آتی تھی اور ان کے دل میں عارضی طور پر ہی سہی وہ عین پسندی اجاگر ہو جاتی تھی جس کی چنگاری قدرت نے سب انسانوں کے سینے میں رکھی ہے لیکن وہ اکثر ناساز گار حالات کی وجہ سے افسردہ ہو کر رہ جاتی ہے وہ بات چیت میں، لین دین، معاملات میں، دوستی اور رفاقت میں اس قدر کھرے اور بے لاگ تھے کہ ان کے خلوص اور سچائی کے سامنے دنیا داروں کی ریا کاری شرمندہ ہو جاتی تھی۔ ان میں جرأت اس قدر تھی کہ سوائے حق کے دنیا کی کوئی طاقت اور کوئی انسان ان کو مرعوب نہ کر سکتا تھا۔ ہمدردی اور ایثار کا یہ عالم تھا کہ وہ ہمیشہ بغیر کسی تامل کے اپنے دوستوں عزیزوں، اجنبی لوگوں اور ہر قسم کے مصیبت زدوں کا بوجھ اپنے مضبوط شانوں پر اٹھا لیتے تھے۔ جہاں دوسروں کی ہمدردی زبانی ہوتی۔ ان کی خاموش اور عملی ہوتی تھی۔ جہاں لوگ یہ سوچتے کہ اس بار کو اٹھانے سے کس طرح بچیں انھیں یہ فکر ہوتی کہ کس طرح دوسرے کے کندھے سے اس رنج اور فکر کے بار کو ہٹا لیں لیکن شرافت، مروّت اور وضع داری کے ساتھ ساتھ وہ اعلیٰ درجے کے مدبر، منتظم معاملہ فہم اور مردم شناس آدمی تھے۔ اور چالاک یا سازشی لوگ اپنے گھٹیا اور اوچھے ہتھیاروں سے انھیں دھوکا یا شکست نہ دے سکتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر معلمی کا پیشہ اختیار کرنے کے بجائے وہ سیاست یا تجارت یا وکالت یا کوئی اور عملی میدان اپنے لیے پسند کرتے تو اس میں بھی اپنا سکہ بٹھا سکتے تھے لیکن مشیتِ الٰہی یہ تھی کہ وہ معلم بنیں۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ قدرت کی نکتہ شناس نظر میں ایک سچے معلم کی قدر جو لوگوں کے دل و دماغ بناتا اور سنوارتا ہے۔ ان لوگوں سے کم ہے جو ملکوں کی سیاست اور حکومت میں انقلاب پیدا کرتے ہیں؟

میں نے اس تقریر کے دوران میں اپنے محترم بزرگ سر عبدالقادر کی مثال کی پیروی کر کے صرف "نیک نام رفتگاں" کا ذکر کیا ہے کسی زندہ مرشد کا ذکر نہیں کیا۔ آپ شاید یہ پوچھیں کہ ان تمام لوگوں میں جن کا میں نے ذکر کیا ہے کوئی قدر مشترک بھی ہے؟ ہاں ایک چیز مشترک ہے اور وہ ہے ان کی انسانیت یعنی تنگی، تنگ نظری اور خود غرضی سے پاک ہونا۔ اور کام اور خدمتِ خلق کو اپنی ذات سے زیادہ اہم سمجھنا۔ ان کی خودی اپنی تنگ حدود کو توڑ کر وسیع ہو گئی تھی۔ اور وہ دریا کے بہان بخش پانی کی طرح اپنی دنیا کو سیراب اور زرخیز بناتی تھی یہی بات ہے جو آدمی کو سچے معنی میں انسان بناتی ہے۔ اور ایسے ہی انسانوں کے متعلق ڈاکٹر اقبال نے کہا ہے ؎

مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

خواجہ غلام السیدین

(باجازت آل انڈیا ریڈیو)

برسات میں نہر کے کنارے

یہ گھٹا یہ شبنمیں ماحول یہ ساون کی رُت
پڑ رہی ہیں نہر کے پانی پہ لہریں اس طرح
دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کوئی دیہاتی پری
اوڑھنی اپنی سکھاتی ہو فضا میں جس طرح

شاکر عروجی

محبّت کے کرشمے!

(۱)

ستاروں کو میں نے محبت سے دیکھا　　ستاروں نے اپنی مجھے روشنی دی
جو پھیلا دیا میں نے اُلفت کا دامن　　چمک بھر نے، چاند نے چاندنی دی

(۲)

سحر کے لئے میں نے اِک گیت گایا　　سحر نے مجھے اپنی پاکیزگی دی
جو پھولوں کو چوما تو پھولوں نے ہنس کر　　مجھے اپنی مستی بھری تازگی دی

(۳)

نظر بھر کے دیکھا جو روئے شفق کو　　شفق نے مجھے اپنی رنگینیاں دیں
جو جنگل میں گھوما تو خاموشیوں نے　　مجھے اپنی پُرکیف شیرینیاں دیں

(۴)

محبّت سے میں نے کیا ایک سجدہ　　گرا پائے یزداں پہ بے ہوش ہو کر
اُٹھا کر محبّت سے یزداں نے مجھ کو　　جگہ عرش پر دی ہم آغوش ہو کر

آثرؔ صہبائی

اردو پر ہندی کا جارحانہ حملہ

(وہ خطبۂ صدارت جو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو (ہند) نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے باونویں سالانہ اجلاس میں بتاریخ ۱۲ اپریل ۱۹۴۱ء پڑھا)

آپ کی انجمن نے چند سال سے اپنے سالانہ جلسے کے پروگرام میں اردو کے لئے بھی ایک دن رکھا ہے۔ یہ بہت مبارک خیال ہے۔ آپ کا صوبہ تقریباً سو سال سے اردو زبان کی پرورش اور خدمت کر رہا ہے۔ اور اس کے ذریعے سے اس نے وہ کام کیا ہے جو ہندوستان کے کسی دوسرے صوبے کو نصیب نہیں ہوا یعنی اس نے اپنی وسیع قلمرو میں لسانی اتحاد پیدا کر دیا ہے۔ اس کی سچی قدر ہمیں اب ہوئی ہے۔ جب کہ دوسرے صوبے اختلاف اور افتراق بڑھا رہے تھے آپ اختلاف مٹا کر اتحاد پھیلا رہے تھے۔ جب کہ دوسرے صوبے ہماری تہذیب اور زبان کی جڑیں کھوکھلی کر رہے تھے۔ آپ ان کی بنیاد مستحکم کر رہے تھے۔ یہ معمولی کام نہ تھا۔ آپ نے اور آپ کے اسلاف نے اس مہم کے سر کرنے میں جو محنت و مشقت اور جانکاہی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جو قربانیاں کی ہیں وہ کسی حال میں بھلائی نہیں جا سکتیں۔

لیکن بدقسمتی سے اب ایسا زمانہ آ گیا ہے کہ اب اس کی ترقی کا اتنا فکر نہیں جتنا اس کی حفاظت اور مدافعت کا ہے۔ ہمارا حال اس وقت اس شخص کا سا ہے جسے کتابوں کے نادر اور قلمی نسخوں کے جمع کرنے کی دُھن ہوتی ہے۔ وہ جگہ جگہ مارا مارا پھرتا ہے اور طرح طرح کی صعوبتیں جھیلتا ہے اور جہاں کہیں کسی نادر نسخے کا سراغ لگتا ہے فوراً وہاں پہنچتا ہے خوشامد سے، حیلے سے، روپیہ پیسہ صرف کر کے اسے حاصل کرتا ہے۔ اس طرح زندگی کا بڑا حصہ اور عمر بھر کی کمائی اس میں لگا دیتا ہے۔ جب ایک مدت کے بعد ایک بیش بہا اور بڑا ذخیرہ جمع کر لیتا ہے تو اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور پھولا نہیں سماتا لیکن معاً اسے ایک دوسرا فکر لاحق ہو جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اس انمول خزانے کا جمع کرنا بے شک بہت کٹھن اور دشوار تھا۔ اور میں اس دشواری پر غالب آ گیا لیکن اب اس کی حفاظت اس سے کہیں زیادہ دشوار ہے۔ گرد و غبار، آب و ہوا کے اثر، کیڑوں اور دیمک کی یورش اور شریف چوروں کی نظرِ بد سے اس کا بچانا آسان نہیں۔ اب باقی عمر ان سب کے مقابلے اور مدافعت میں بسر کرنی ہوگی۔ اس خیال سے اس کی خوشی آدھی رہ جاتی ہے۔ یہی حال اب ہمارا ہے۔ سالہا سال نسلاً بعد نسل ہم نے اپنی زبان کی نشو و نما اور اشاعت و ترقی میں کوشش کی اور عین اس وقت جب کہ ہم اسے علم و ادب سے اور زیادہ مالا مال کرنا چاہتے تھے ہمیں اس کے بچاؤ کی پڑ گئی۔ بچاؤ بھی کس سے؟ ان سے جو اس کی پرورش اور ترقی میں برابر کے شریک تھے۔ غیر سے مقابلہ اتنا مشکل نہیں جتنا اپنوں سے اور یہ سخت سانحہ ہے۔ اس سے ملک میں ہیجان پیدا ہو گیا ہے۔ تعلقات میں فرق آ گیا ہے اور اختلاف کا ایک ایسا سوتا کھل گیا ہے جو بند ہوتا نظر نہیں آتا۔

اے اہلِ پنجاب ہم آپ کی طرف سے مطمئن تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ اور صوبوں میں کچھ بھی ہو مگر آپ اس غیر معقول شورش سے محفوظ ہیں۔

کیونکہ آپ نے مدتِ دراز کی کوشش سے ایسا لسانی اتحاد پیدا کر لیا ہے کہ وہ معمولی مخالفتوں سے نہیں ٹوٹ سکتا۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ وہ آندھی جو آپ کے پڑوسی صوبوں میں زور و شور سے چل رہی ہے اس کی سرسراہٹ یہاں بھی محسوس ہو رہی ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے فطری استقلال و ہمت سے اس کے روکنے کے لئے سینہ سپر ہو جائیں گے اور اس طوفانِ بے تمیزی کو اپنے صوبے میں داخل نہ ہونے دیں گے

اس مہینے کے ایک مشہور ہندی رسالے میں جو بنارس سے شائع ہوتا ہے۔ ایک مضمون پنجاب کے ہندی اردو جھگڑے کے متعلق نکلا ہے۔ پنجاب کے متعلق اس میں وہی باتیں ہیں جو آپ بار بار اخباروں میں پڑھ چکے ہیں اور ان کا اعادہ فضول ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ پنجاب میں ہندی کوئی زبان ہی نہیں اور اس لئے اس پر بحث کرنا ہی غیر ضروری ہے۔ ریاست ٹراونکور میں بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ وہاں بھی ہندوؤں نے حکومت پر زور ڈالا کہ ہندی مدارس میں رائج کی جائے۔ حکومت نے صاف جواب دے دیا کہ ہندی یہاں کی زبان نہیں اس لئے داخل نصاب نہیں کی جا سکتی۔ یہ تو ہوا پنجاب کے متعلق۔ لیکن اس مضمون میں مضمون نگار نے عجیب منطق سے کام لیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی نو کروڑ بتائی جاتی ہے۔ ان میں اردو بولنے والوں کی تعداد صرف لاکھوں کے اندر ہے۔ کیونکہ عربی، فارسی یا اردو پڑھے لکھے مسلمان زیادہ تر شہروں ہی میں رہتے ہیں اور دیہات کے مسلمان سب ہندی بولتے ہیں۔ اس سے کئی نتیجے نکلتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ دوسرا یہ کہ صرف شہروں کے مسلمانوں کی زبان ہے۔ تیسرا یہ کہ باقی تمام آبادی کی زبان جس میں ہندو مسلمان دونوں شریک ہیں ہندی ہے۔

ہندی والوں نے عجب تماشا کر رکھا ہے۔ پہلے تو انھوں نے یہ الزام دینا شروع کیا کہ مسلمان اردو کو مسلمانوں کی زبان کہتے ہیں اور اس پر بہت غم و غصے کا اظہار کیا۔ چونکہ یہ سراسر بہتان تھا اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ اس کے بعد دوسری چال یہ چلی کہ خود ہی یہ کہنا شروع کیا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور ہندی ہندوؤں کی۔ چنانچہ اس رسالے کے اس مضمون میں لکھا ہے کہ "بدقسمتی سے ہندی ہندوؤں کی اور اردو مسلمانوں کی زبان سمجھی جانے لگی ہے۔" جب یہ بھی کافی نہ ہوا تو ایک نیا شگوفہ یہ چھوڑا گیا ہے کہ اردو صرف شہروں کے چند لاکھ مسلمانوں کی زبان ہے۔ باقی ملک کی زبان ہندی ہے۔ آج کل پراپیگنڈے کا زمانہ ہے اور پروپیگنڈے میں ہر قسم کی غلط بیانی جائز سمجھی گئی ہے۔ ان باتوں کی تردید کرنا تضیع اوقات ہے۔ میں ان سے صرف ایک سوال کرنا چاہتا ہوں کہ جب انگریزی عہد میں فارسی کی جگہ اردو، عدالتی، دفتری اور تعلیمی زبان قرار دی گئی تو اس وقت یہ صاحبزادی (ہندی) کہاں تھیں؟ اس وقت کوئی منہ سے نہ پھوٹا کہ اردو نہیں ہندی ہونی چاہئے۔ اور کہتا کس منہ سے کوئی زبان ہوتی بھی۔

اب آپ ہندی کی حقیقت سنئے۔ ہندی کوئی ایک زبان نہیں ہر صوبے اور علاقے اور مختلف اضلاع میں الگ الگ ہے۔ میرٹھ اور دہلی کے دیہات کا آدمی اودھ کے دیہات کی بولی نہیں سمجھ سکتا۔ اور اودھ کے دیہات والے کے لئے بہار کے دیہات کی بولی ناقابل فہم ہے۔ بہار کے ایک علاقے کا دیہاتی دوسرے علاقے کے دیہاتی کی زبان سمجھنے سے قاصر ہے۔ غرض آگرہ اور متھرا کے دیہات کی بولی سمجھنے کے لئے برج بھاشا، اودھ کے دیہات کے لئے اودھی یا پوربی حصار، رہتک کے لئے ہریانی، بھگیں کھنڈ، (سنٹرل انڈیا)

کے لئے بگھیلی۔ کان پور۔ فتح گڑھ۔ اٹاوہ۔ بریلی۔ علی گڑھ کے دیہات کے لئے قنوجی۔ بنارس۔ غازی پور۔ آرہ کے لئے بھوج پوری۔ بندیل کھنڈ کے لئے بندیل کھنڈی۔ مالوہ کے لئے ہردلی۔ اُجین کے لئے اُجینی۔ مارواڑ کے لئے مارواڑی۔ بیکانیر کے لئے بیکانیری۔ بہار اور پٹنہ کے دیہات کے لئے مگدھی۔ اودے پور کے لئے اودے پوری۔ جے پور کے لئے جے پوری۔ بھٹانیر کے لئے بھٹانیری۔ ترہت۔ پورنیا بھاگل پور۔ مونگیر کے لئے ترہتی اور میتھلی جاننے کی۔ اب اس پر یہ دعوے کہاں تک معقول ہو سکتا ہے کہ ہندی سب دیہات میں سمجھی جاتی ہے اور اردو کہیں نہیں سمجھی جاتی۔ ان کی مراد کون سی ہندی ہے؟ غالباً ان کی مراد اس نئی مصنوعی ہندی سے ہے جو حال ہی میں گھڑی گئی ہے اور وہ بھی اردو کے طفیل میں اور اسی کے قالب پر ڈھال کر۔ اور بنی تو ایسی کہ وہ نہ دیہاتی رہی نہ شہری۔ گاندھی جی نے اس ہندی کی بہت صحیح تعریف کی ہے کہ "یہ وہ زبان ہے جو کتابوں میں ہے اور بول چال میں نہیں"۔ اب اسی سے اندازہ کر لیجئے کہ وہ کہاں تک سمجھی جا سکتی ہے برخلاف اس کے اردو کتابی زبان بھی ہے اور بول چال کی بھی اور اس لئے ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے ہم نے ان دیہاتی جلسوں کو بھی دیکھا ہے جہاں اردو۔ اور اس نئی ہندی دونوں کے مقرر تھے جب ہندی مقرر نے اپنی ہندی میں تقریر شروع کی تو دیہاتیوں نے حقے گڑگڑانے شروع کر دئیے۔ برخلاف اس کے اردو کی تقریر انھوں نے خاصی توجہ سے سنی ہم نے اردو اور ہندی کے مشاعرے بھی دیکھے ہیں۔ اور جن صاحبوں کو ان کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے انھیں معلوم ہے کہ اردو مشاعروں میں جتنی رونق اور چہل پہل ہوتی ہے۔ کوی سمیلنوں میں اتنی ہی بے رونقی اور اداسی چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ ہندی اور اردو کے مشہور ادیب پنڈت پدم سنگھ شرما مرحوم نے اپنی آل انڈیا ہندی ساہتیہ سمیلن مظفر پور کی صدارتی تقریر میں بیان کی ہے جو یہ ہے:-

"اردو شعرا نے حالی کے رنگ کو اپنا لیا ہے بلکہ اسے اور چمکا دیا ہے۔ اردو اخبارات میں دیس بھگتی (حب وطن) اور معرفت کی جو نظمیں نکلتی ہیں وہ پڑھنے والے ...... کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ دل پر اثر کرتی ہیں۔ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ ہندی کی نئی اچناؤں (نظموں) میں یہ بات ابھی نہیں آئی ...... اردو والے شعروں میں جذبات و خیالات کا نیا پن بھرتے ہیں"

خیر سے اس پر یہ دعوے ہے کہ ہندی سارے ملک کی زبان ہے۔ اور اس کے حامی اسے پنجاب۔ صوبہ سرحد۔ سندھ ملیبار وغیرہ میں پھیلانے کا دم خم رکھتے ہیں۔ ہندی اردو کی بحث میں صرف ایک بات کا یاد رکھنا کافی ہے۔ ہندی بیسیوں ہیں اور اردو ایک ہے جو ہندوستان کے ہر علاقے میں بولی یا سمجھی جاتی ہے۔ بلکہ ہندوستان کے باہر بھی اس کے قدردان موجود ہیں۔ اس نے براعظم ہندوستان کو جو ٹکڑیوں میں بٹا ہوا تھا ایک کر دیا۔ اور سب سے پہلے ایک قومیت کی بنیاد ڈالی اور ہندی کی بھونڈی بولیوں کو ملا کر جھاڑ جھنکاڑ کو چھانٹا مشترک حصے کو قائم رکھا اور باہر کے خوب صورت۔ ضروری اور تمدنی الفاظ کا اس میں اضافہ کیا جس سے ایک ایسی مہذب اور پاکیزہ زبان وجود میں آ گئی۔ جو نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کی تاریخ میں ایک عجیب واقعہ ہے۔ ایک ایسی شائستہ لچک دار۔ پر لطف اور بھرپور زبان کو چھوڑ کر ایک اَن گھڑت کرخت۔ بے لطف اور بلغو بابولی کے اختیار کرنے کی رائے دینا سراسر ناعاقبت اندیشی

وطن سے دُور

(کراچی میں میری سب سے پہلی نظم)

ہر طرف اک اجنبیت سی برستی ہے یہاں
آنکھ بیگانوں میں اپنوں کو ترستی ہے یہاں

آہ! ان جلووں میں وہ مانوس تنویریں کہاں
آرزوؤں کے حسیں خوابوں کی تعبیریں کہاں

آہ! اس ماحول میں درد آشنا ملتا نہیں
زندگی کو زندگی کا آسرا ملتا نہیں

موت کی بستی میں زندوں کی بھلا سنتا ہی کون؟
زندگی کے گیت کی تانوں پہ سر دھنتا ہے کون؟

لحظہ لحظہ نو بنو عالم گزرتے ہیں یہاں!
لمحہ لمحہ دل میں سو طوفاں ابھرتے ہیں یہاں

آہ! ان بے تابیوں کی دوستوں کو کیا خبر
میری ان بے خوابیوں کی دوستوں کو کیا خبر

دور ہے مجھ سے وطن اور میں وطن سے دور ہوں
ایک طائر ہوں مگر اپنے چمن سے دور ہوں

مضطرب سی موج ہوں رہتی ہو جو ساحل سی دور
ایک درماندہ مسافر ہوں جو ہو منزل سے دور

اک سفینہ ہوں جو ہو گرداب میں آیا ہوا
پھول ہوں جو یادِ گلشن میں ہو مرجھایا ہوا

جب وطن کا نام آتا ہے تو رو لیتا ہوں میں
زخمہائے دل کو یوں اشکوں سے دھو لیتا ہوں میں

مسکراتی ہیں نگاہوں میں وفائیں اے مجید
آنسوؤں کا سیل بنتی ہیں، دعائیں اے مجید

میں یہ کہتا ہوں الٰہی! دوستوں کی خیر ہو
یا الٰہی گاؤں کی پگڈنڈیوں کی خیر ہو

اے خدا قائم رہیں پن گھٹ کی سب آبادیاں
اے خدا زندہ رہیں تا حشر دہقاں زادیاں

اے خدا پھولی ہوئی سرسوں کے کھیت آباد ہوں
گاؤں کے سب رہنے والے بامراد و شاد ہوں

اے مرے مالک! مری ننھی سی ماں جائی کی خیر
والدہ کی خیر میرے چاند سے بھائی کی خیر

یا الٰہی ان پھلے پھولے چمن زاروں کی خیر
خطۂ پنجاب کے شاداب نظاروں کی خیر

دل یہ کہتا ہے کہ جب سوئے وطن جاؤں گا میں
دیس کی رونق کو پہلے سے فزوں پاؤں گا میں

مجید لاہوری

بیوہ

خزاں کا دور دورہ تھا۔ بارشیں معمول سے بہت زیادہ ہوئیں۔ درختوں کے زرد پتے پاؤں تلے روندے جانے کی بجائے بارش کے پانی کے بہاؤ کے ساتھ گڑھوں میں پڑے ہوئے تھے۔ رات کے وقت ہم اکثر شطرنج کھیلتے۔ ایک رات یہ فیصلہ ہوا کہ سب اپنی اپنی زندگی کا ایک واقعہ سنائیں حاضرین میں سے بعض نے اپنی شجاعت، جرأت اور بہادری کے کارہائے نمایاں سنائے لیکن کوئی واقعہ ایسا نہ تھا جس میں سب نے دلچسپی لی ہو۔ ہم دل بہلاؤ کا یہ طریقہ ترک کرنے ہی والے تھے کہ ایک نوجوان لڑکی نے جو اپنی غیر شادی شدہ بوڑھی پھوپھی کے ہاتھ سے کھیل رہی تھی اپنی پھوپھی کی انگلی پر چند سنہری گھنگریالے بال لپٹے ہوئے دیکھے، نہایت نرمی سے اس نے ان پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"ہمیں ان بالوں کی داستان سنائیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی بچے کے بال ہیں"

بوڑھی عورت کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا ——— سرخ اور پھر یک دم زرد ——— گہرا زرد! اور اس نے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے کہا "یہ ایک حسرت خیز داستان ہے۔ اتنی الم انگیز کہ میں نے اس کا ذکر کبھی نہیں کیا اور نہ کبھی کروں گی ——— یہ میری زندگی کی تمام ناکامیوں اور حسرتوں کا مرکز ہے ——— یہ جب کی بات ہے کہ میں ایک حسین دوشیزہ تھی لیکن اس جاں کاہ واقعے کی یاد اتنی غم آمیز اور غم خیز ہے کہ جب کبھی میں اس کا خیال کرتی ہوں مجھے آنسو پونچھنے پڑتے ہیں"

حاضرین نے یہ واقعہ سننے کی بہت کوشش کی لیکن بوڑھی عورت نہ مانی۔ آخر حاضرین کے اصرار سے مجبور ہو کر یوں گویا ہوئی:۔

"آپ سب نے سینٹیر خاندان کے متعلق جس کا اب ایک فرد بھی باقی نہیں رہا اکثر کہانیاں سنی ہوں گی میں اس خاندان کے آخری تین افراد کو جانتی ہوں لیکن تینوں چند ماہ کے اندر اندر مر گئے۔ یہ حسین سنہرے بال ان تینوں میں سے آخری کے ہیں ——— اس کی عمر صرف بارہ سال کی تھی۔ جب اس نے اپنے آپ کو میرے لئے ہلاک کر دیا۔ آپ یہ سن کر بہت حیران ہوئے ہوں گے لیکن سچ مانیئے کہ وہ غیر معمولی قسم کے انسان تھے ——— بے وقوف لیکن محبت کے لئے۔ باپ اور بیٹے ——— تمام کے تمام محبت کے روگ میں مبتلا تھے جذباتی ——— آہ! سب نے اپنی جانیں محبت کی دیوی کے بھینٹ چڑھا دیں۔ اپنے رشتہ داروں اور گرد و نواح کے لوگوں میں وہ پروانے مشہور تھے۔ اُن کے بال گھنگریالے اور سنہرے تھے۔ ان کی بڑی بڑی آنکھیں ——— بے قرار کرنے والی آنکھیں دل کو فگار کر کے رہتی تھیں۔ نہ جانے ان میں کیسی جاذبیت اور غیر معمولی کشش تھی۔

جس لڑکے کا میں ذکر کر رہی ہوں اس کے دادا کو پینسٹھ سال کی عمر میں اپنے ایک مزارع کی نوجوان لڑکی سے عشق ہو گیا۔ اور آخر اس سے

شادی کرلی لیکن تمام خاندان میں سے کسی نے بھی اس بات پر اعتراض نہ کیا۔ کیونکہ وہ سب محبت کو ایک فطری جذبہ سمجھتے تھے۔ ایک رات ایک شخص جسے اس نے شکار کے لئے بلایا تھا۔ خود اس کی نوجوان بیوی کو شکار کر کے لے گیا۔ دوسرے دن بوڑھا عاشق مردہ پایا گیا۔

اسی طرح اس لڑکے یعنی میرے محبوب کا باپ ۱۸۴۱ء میں پیرس کے ایک ہوٹل میں مردہ پایا گیا۔ کیونکہ اس کی محبوبہ —— ایک ایکٹریس نے اسے دھوکا دیا تھا۔ جب میرے محبوب نے خودکشی کی اس کی عمر صرف بارہ سال کی تھی۔ اس کی بیوہ ماں اسے لے کر ہمارے ہاں آئی تھی۔ اس وقت میری عمر سترہ برس کی تھی۔

آپ اس بات کا تصور نہیں کر سکتے کہ اس کی فطرت میں محبت کا عنصر کتنا زیادہ تھا۔ وہ ہمیشہ ایک خواب کے سے عالم میں رہتا۔ میں اکثر اس جذباتی نوجوان کو اپنی کھڑکی میں سے اِدھر اُدھر آتے جاتے دیکھتی۔ وہ ہر وقت خیالات میں ڈوبا رہتا تھا۔

شام کو کھانا کھانے کے بعد وہ کہتا —— "آؤ خواب دیکھنے چلیں" ہم دونوں اکٹھے سیر کو جاتے کسی صاف میدان میں وہ چلتے چلتے رک جاتا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہتا "دیکھو! چاند کی طرف دیکھو! آہ! تم نے میرا مفہوم نہیں سمجھا، اگر تم میرا مطلب سمجھ جاؤ تو تمہیں ایک سرمدی اور جاودانی راحت نصیب ہو لیکن جس نے محبت نہ کی ہو۔ وہ ایسی باتیں نہیں سمجھ سکتا" میں ہنس دیتی اور اسے اپنے آغوش میں لے لیتی —— اس ننھے سے بچے کو جو یہ ظاہر کرتا کہ وہ میری محبت میں ٹھنکا جا رہا ہے۔

اکثر وہ میری ماں کے پاس بیٹھ جاتا اور کہتا "مجھے کوئی داستان محبت سنائیے" اور میری ماں اسے اس کے باپ دادا کے دلچسپ اور جوان خون کو کھولانے والے واقعات سناتی۔ چھوٹا لڑکا یہ باتیں سن کر جوش میں آجاتا اور اکثر کہہ اٹھتا "میں بھی —— ہاں میں بھی محبت کرنا جانتا ہوں —— ان سب سے زیادہ!"

آہستہ آہستہ اس نے صاف طور پر مجھ سے محبت کا اظہار شروع کیا۔ ہم سب اس کی باتوں پر خوب ہنستے۔ ہر صبح وہ مجھے تازہ پھول دیتا —— آہ! وہ حسین پھول، اور ہر شام وہ اپنی خواب گاہ میں جانے سے پہلے میرے ہاتھ کو چوم کر کہتا —— "میری جان! مجھے تم سے محبت ہے"

آہ! میں گنہگار ہوں گنہگار! اسی لئے میں نے آج تک شادی نہیں کی —— میں اس کی طفلانہ محبت سے بہت خوش ہوتی۔ میرے لئے یہ ایک تفریح کا سامان تھا۔ اور ہماری ماؤں کے لئے بھی۔ وہ صرف بارہ سال کا تھا —— آپ ہی کہئے کون کہہ سکتا تھا کہ اس کی محبت آگے چل کر کیا رنگ لائے گی۔ میں اسے جتنے وہ چاہتا بوسے دیتی —— آہ وہ پھول! میں اسے محبت آمیز خطوط لکھتی اور وہ مجھے، جو ہماری مائیں پڑھ لیتی تھیں —— آہ اس کے خطوط! محبت کا سوز ان کے ایک ایک لفظ سے نمایاں تھا۔ اور ایک ایک حرف الفت کی داستان سناتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ہماری محبت اور ہمارے خطوط کا راز صرف ہمیں تک محدود رہے۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو ایک مرد سمجھتا تھا —— آہ! ہم کس کتنی سنگین غلطی ہوئی! ہم بھول چکے تھے کہ وہ خاندان سینٹیز سے تعلق رکھتا ہے۔

اسی طرح ایک سال گزر گیا —— ایک شام اس نے اپنے آپ کو میرے قدموں میں گرا دیا۔ اور میرے پاؤں پر پے در پے بوسے دیئے

وہ بار بار کہتا تھا: میں تم سے محبت کرتا ہوں مجھے تم سے عشق ہے۔ تمھاری محبت مجھے جلائے دیتی ہے۔ سچ مانو! اگر تم نے مجھے دھوکا دیا ——— اور تم نے مجھے چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ رشتہ محبت جوڑا تو میں وہی کچھ کروں گا جو میرے باپ نے کیا تھا ——— " اور ساتھ ہی آہستہ سے کہتا "تم جانتی ہو! میرے باپ نے کیا کیا تھا"

پھر اس نے اٹھ کر میرے کان میں کہا "کنی ویو" (یہ میرا پہلا نام تھا) ——— آہ! اس کی آواز میں کتنی نرمی تھی کتنی محبت اور کتنی مٹھاس ——— میں سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔

"آ ——— آؤ۔ ہم گھ ... گھر واپس چلیں" میری آواز میں لکنت آگئی۔ وہ خاموشی سے میرے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ گھر کے نزدیک پہنچکر اس نے میرا بازو پکڑ لیا ——— "میری جان! تم جانتی ہو کہ اگر تم نے مجھے دھوکا دیا تو میں خودکشی کر لوں گا"

میں خاموش ہوگئی۔ آہ! اب مجھے معلوم ہوا کہ پانی سر سے گزر چکا ہے۔ اب میں اس سے کچھ سرد مہری سے پیش آئی۔ دوسرے دن اس نے آہ سرد بھر کر مجھ سے کہا ——— "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم مجھے دھوکا دو گی" ———

میں نے ذرا سنجیدگی سے کہا "اب تم کافی بڑے ہوگئے ہو۔ اس لئے اب ہمیں یہ کھیل ختم کرنا چاہیئے" وہ خاموش ہوگیا۔ میں سمجھتی تھی کہ اب وہ میرا خیال چھوڑ دے گا۔ تھوڑے دنوں بعد وہ اپنے سکول چلا گیا۔ اگلے موسم گرما میں جب وہ گھر واپس آیا تو میری منگنی ہوچکی تھی۔ دوسرے دن اس کو میری نسبت کی خبر ہوئی۔ اب وہ حد درجہ غمگین معلوم ہوتا تھا۔ چند دنوں میں اس کا چہرہ بالکل اتر گیا۔ اس کے سرخ و سفید چہرے پر حسرت برس رہی تھی۔ ساتویں روز جب میں صبح سو کر اٹھی تو دروازے میں کاغذ کا ایک پرزہ پڑا ہوا دیکھا۔ میں نے اسے اٹھا لیا اور پڑھا۔

"تم نے مجھے دغا دی ——— تم نے وفا کی لاج نہ رکھی ——— آہ تم نے میری محبت کو ٹھکرا دیا۔ تمھیں معلوم ہے میں نے تم سے کیا کہا تھا، تم نے میری موت کا حکم دیا ہے۔ خیر کوئی مضائقہ نہیں ——— سر تسلیم خم ہے! کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ تم ہی سب سے پہلے مجھے دیکھو اس لئے باغ کے اسی گوشے میں آؤ، جہاں میں نے گزشتہ سال اظہار محبت کیا تھا۔"

مجھ پر جنوں کی سی حالت طاری ہوگئی۔ میں جلد جلد کپڑے پہن کر اس جگہ پہنچی۔ اس کی چھوٹی سی ٹوپی زمین پر بھیگی پڑی تھی۔ رات بارش ہوتی رہی تھی۔ میں نے اپنی آنکھیں اوپر اٹھائیں اور درخت کے پتوں میں کچھ دیکھا ——— اس کے بعد مجھے معلوم نہیں کیا ہوا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں فوراً گھر واپس آئی اور سب کو بتایا۔ لیکن پھر بیہوش ہوگئی۔

کافی دیر بعد مجھے ہوش آیا تو میری ماں میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ پہلے میں نے سمجھا کہ میں نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔ "اور کانسٹن ...... ؟" میں نے پوچھا۔ لیکن میری ماں نے کچھ جواب نہ دیا۔ مجھے اس کو دوبارہ دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ لیکن میں نے اپنی ماں سے کہہ کر اس کے چند بال لے لئے یہ ہیں وہ بال ——— بوڑھی عورت نے ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔ "آہ! اس کے بال" اس کے بعد بوڑھی عورت نے کئی مرتبہ رومال سے اپنے آنسو پونچھے۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد پھر کہا۔ میں نے شادی کرنے سے انکار کر دیا اور اس وقت سے بیوہ ہوں ——— اس ۱۲ سالہ بچے کی بیوہ! اتنا کہا اور زار و قطار رونا شروع کر دیا ——— ایک شخص نے دوسرے کے کان میں آہستہ سے کہا "آہ! جذباتی ہونا بھی کتنی بدقسمتی ہے"

"ناکام آرزو"

غزل

ہردم جو ذکرِ دوست کئے جا رہی ہوں میں
یہ شرطِ زندگی ہے جئے جا رہی ہوں میں
ہمدم نہ پوچھ لذتِ صہبائے معرفت
فطرت پلا رہی ہے، پئے جا رہی ہوں میں
زورِ قدر سے دیکھئے انسان کی بے بسی
ناکردنی بھی ہو تو کئے جا رہی ہوں میں
دارالعمل میں لطفِ مکافات دیکھئے
لیتی ہوں یاں وہی جو دئے جا رہی ہوں میں
دنیائے دوں ہے شاطر و مکار بالیقین
کیوں اس بلا پہ جان دیئے جا رہی ہوں میں
سب رہ گیا اثاثہ، مال و منال یاں
کیا چیز اپنے ساتھ لئے جا رہی ہوں میں

انیسہ ہارون بیگم شروانیہ
حیدرآباد دکن

دردِ جاوداں

مری فرقت میں تجھ کو سرگرانی اب بھی ہوتی ہے؟
محبت میں مصیبت زندگانی اب بھی ہوتی ہے؟
تجھے کیونکر گماں ہوگا کہ اتنی تلخ کامی پر
تمناؤں کی سینے میں روانی اب بھی ہوتی ہے
سنا ہے حسن کی بزمِ طرب میں ہم نشیں اکثر
مری مایوس آہوں کی کہانی اب بھی ہوتی ہے
زمانہ قیدِ محسوسات سے چھوٹے ہوئے لیکن
خزاں بردوش فصلِ زندگانی اب بھی ہوتی ہے
تمنا مسکراتی ہے نہ ارماں جگمگاتے ہیں
فضا عکسِ شفق سے ارغوانی اب بھی ہوتی ہے
خرابِ زیست ہوں یادِ محبت میں مگر ہمدم
مری ہر سانس عمرِ جاودانی اب بھی ہوتی ہے
زمانہ ہوگیا گزرے مگر بزمِ ادیباں میں
شمیمِ نکتہ داں کی نوحہ خوانی اب بھی ہوتی ہے

صفیہ شمیم ملیح آبادی

بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

کچھ عرصہ ہوا شبیر نے مجھے ایک تھیلا دکھایا ——— صرف دور سے! میں نے پوچھا بھئی اس میں کیا چیز ہے؟ کہنے لگے ع

چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط

اس کے بعد اس میں سے خط نکال نکال کر دور ہی سے مجھے دکھانے شروع کر دیئے ان خیالی حسینوں کے متعلق مجھے جو حسنِ ظن پیدا ہوا تھا وہ تو یہ دیکھ کر جاتا رہا کہ عمرو عیار کی اس زنبیل میں سب سے زیادہ خط غالباً میرے ہی لکھے ہوئے تھے البتہ "بتوں" کی تصویریں دیکھنے کا اشتیاق ابھی تک باقی ہے لیکن آج تک اس خواہش کو محض اس خیال سے دبائے بیٹھا ہوں کہ کہیں اس تھیلے میں میری ہی وہ منحوس تصویر نہ ہو جو مال کے ایک نالائق فوٹوگرافر نے کھینچی تھی اور جس کے متعلق اس کا اپنا فتویٰ یہ تھا کہ "اسے دیوار پر ٹانگنا زیادہ بہتر رہے گا" اور ہمارا خیال یہ تھا کہ اسے سوٹ کیس میں کپڑوں کی تہ کے نیچے رکھنا موزوں ہوگا۔ اصل قصہ یوں ہے کہ دو تین سال ادھر میں نے اور امجد نے ان فوٹوگرافر صاحب سے تین تصویریں اتروائیں ایک تصویر میں انھوں نے اپنے کمالِ فن کا یوں مظاہرہ کیا کہ دیکھنے والے کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم تارکول کے پیپے میں کھڑے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ حضرت آپ نے یہ کیا حرکت کی؟ فرمانے لگے کہ یہ تو فوٹوگرافک آرٹ ہے! آرٹ کے متعلق میری معلومات اتنی ہی پست ہیں جتنی بین الاقوامی سیاست کے متعلق اردو کے کسی روزانہ اخبار کے ایڈیٹر کی۔ اس لئے میں آرٹ کا لفظ سن کر سہم گیا۔ انھوں نے مجھے زیادہ مرعوب کرنے کی خاطر ایک اور تصویر لا دکھائی۔ ہمیں تو صرف تارکول کے پیپے میں کھڑا دکھایا گیا تھا۔ یہاں صاحبِ تصویر پر شبہ ہوتا تھا کہ تارکول کے حوض میں کافی عرصہ داد شناوری دینے کے بعد ابھی ابھی باہر تشریف لائے۔ میں نے کہا "ہاں یہ صاحب ہم سے بھی زیادہ مظلوم ہیں!" اس پر فوٹوگرافر صاحب کو ذرا غصہ سا آیا اور فرمانے لگے "آپ آرٹ کی توہین کر رہے ہیں" میں نے کہا "آرٹ وارٹ سے تو میں بالکل ناواقف ہوں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ کوئی شریف آدمی اس تصویر کو اپنی میز پر رکھنا گوارا نہ کرے گا" فرمانے لگے "میز پر ایسی تصویروں کو رکھتا کون ہے؟ اسے تو دیوار پر ٹانگنا زیادہ بہتر رہے گا" میں نے عرض کیا "اور سوٹ کیس میں رکھنا اس سے بھی بہتر" ...... میرے اس فقرے کی داد انھوں نے کچھ اس انداز میں دی کہ اس کی منظر کشی میرے لئے نہ آسان ہے اور نہ خوش گوار!

ایک دن میں نے دیکھا کہ میرے اپنے سوٹ کیس میں شبیر کے تھیلے کی طرح بے شمار کاغذ بھرے پڑے ہیں۔ ان میں زیادہ تر دوستوں کے وہ خط ہیں جو میں پھاڑا نہیں کرتا۔ کچھ ایسے بھی خط ہیں جو میرے دوستوں نے میرے بجائے کسی اور کو لکھے یا کسی اور نے ان کو لکھے، اور اب وہ نہ کاتب کے پاس ہیں نہ مکتوب الیہ کے پاس بلکہ میرے سوٹ کیس میں بند ہیں بعض خط میرے دوستوں نے اپنی رضامندی سے

مجھے روپئے بعض میں نے ان سے زبردستی چھینے بعض ان کی عدم موجودگی میں چرائے ——— اور بعد میں انھیں اس چوری کی اطلاع دیدی۔ ایسا کوئی خط نہیں۔ نے نہیں چرایا جس کی اطلاع چوری کے بعد مالک کو نہ دی ہو۔ ان میں سے اکثر خط اردو میں ہیں۔ کچھ انگریزی میں کچھ فارسی میں اور کچھ ایک ایسی زبان میں جو اردو ہے نہ انگریزی بعض خط تو اردو میں ہیں لیکن نیچے دستخط ہندی میں ہیں دو خط ایسے بھی ہیں جو ایک مختصر سی ڈاڑھی اور بڑے درنی ڈنڈے والے مولوی صاحب نے اپنے ایک دوست کو لکھے تھے۔ اور "تبرک" کے طور پر ان کی ایک ایک نقل مجھے بھی بھیج دی تھی۔ ان خطوں کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی جب جلال میں آتا ہے تو قانون اور اخلاق دونوں کی حدیں پھلانگ جاتا ہے۔

ان خطوں کے علاوہ بعض نامکمل مضمون ہیں جو میں نے لکھنے شروع کئے تھے لیکن کسی نہ کسی وجہ سے مکمل نہ ہو سکے کچھ مسودے ہیں۔ دوستوں کے مضمونوں کے کچھ تقریروں کے نوٹ ہیں بعض تقریریں خود میں نے لکھیں بعض میرے دوستوں نے۔ ان کی تقریروں کے نوٹ بھی اسی طرح میرے پاس پہنچے ہیں جس طرح ان کے خطوط اور بعض ایسی تحریریں ہیں جن کے متعلق اب کوشش کے باوجود مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ کس چیز کے متعلق ہیں؟

آپ کہیں گے کہ ان خطوں اور مضمونوں اور تقریروں کا تذکرہ ایک ایسے مضمون میں جو ایک ادبی رسالے میں چھپ رہا ہے اگر حماقت نہیں تو نامعقولیت ضرور ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ اگر کوئی شخص محض معقول باتیں ہی کرتا رہے۔ یا کم از کم محض معقول باتیں ہی کرتے رہنے کی کوشش کرے تو اس کا انجام لازمی طور پر یہ ہوگا کہ وہ یا تو پاگل خانے میں مرے گا یا جیل خانے میں اور میں نہ نبوت کا دعویٰ کرنا چاہتا ہوں نہ لیڈری کا۔ اس لئے کبھی کبھار دانستہ اور اکثر اوقات نادانستہ نامعقول حرکتیں کرتا رہتا ہوں اور پھر ان تحریروں میں بعض ایسی دلچسپ ہیں کہ انھیں محض اپنے آپ تک محدود رکھنا ان کے لکھنے والوں سے بے انصافی کرنا ہے۔ میں داد دینے کے معاملے میں بخیل ہوں اور وہ بیچارے ابھی تک جائز داد سے محروم رہے ہیں۔ شاید اسی صورت میں ان کی حق رسی کا کوئی سامان پیدا ہو جائے۔

زرد رنگ کے دو کاغذوں پر ایک آشنا اور مجوب طرز تحریر میں ایک تقریر کے نوٹ ہیں جو آج سے چار سال اُدھر لاہور کے لاجپت رائے ہال میں کی گئی۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جسے کرنے کی کوشش کی گئی۔" معلوم ہوتا ہے کہ نوٹ بڑی محنت سے لکھے گئے ہیں۔

۱۔ سرسید ہندوستان ایک خوبصورت دلھن ہے۔ ہندو مسلمان اس کی دو آنکھیں ہیں۔

(ا) ایک آنکھ اگر پھوڑ دی جائے۔ کانی۔ بدشکل اور ناپسند

(ب) اگر دونوں آنکھیں دو مختلف سمتوں میں دیکھیں بھینگی۔ ناپسند عیب دار ہو جائیں گی۔ ہندوستان کی حالت اس وقت یہی ہے

(ج) صحیح نظر دونوں آنکھوں کا مل کر کام کرنا۔

(د) بھینگے پن کا علاج ......

(یہ امر قابل ذکر ہے کہ میرے مقرر دوست ان دنوں میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے اور غالباً" فسٹ ایئر میں!)

اس کے بعد یہ لکھا ہے۔

۲۔ ہم نوجوانوں میں حرارت، قوت، ہمت ہے۔ بوجھ ہمیں کو سنبھالنا ہے۔

حالیؔ

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں

اس کے بعد یہ سلسلہ نمبر ۸ تک جاتا ہے اور ہر نمبر کے ماتحت ا۔ب۔ج۔د ضرور ہیں۔

آخر میں یہ شعر لکھا ہے

اقبالؔ

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اس تقریر کا قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے میرے دوست غالباً ان نوں مستقبل کا راشٹر پتی ابوالکلام آزاد بننے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ اور میں اس کوشش میں تھا کہ بڑا ہو کر اور کچھ نہیں تو کم از کم "فخر الملت والدین" ضرور بن جاؤں۔ میں مسلمان طلبہ کی ایک "فرقہ پرست" جماعت کا قائد اعظم تھا اور وہ بخیال خویش ہندو مسلم طلبہ کی ایک دیش بھگت جماعت کے پردھان تھے! لاجپت رائے ہال میں ہماری مذمت کرنے کے لئے ایک جلسہ منعقد کیا گیا لیکن دیش بھگت ابھی اپنے اپنے ہوسٹلوں میں تھے کہ فرقہ پرستوں نے لاجپت رائے ہال پر قبضہ کر لیا۔ میرے دوست اور ان کے ساتھی جب جلسہ گاہ میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہر طرف فرقہ پرست چھائے ہوئے ہیں خیر جلسہ شروع ہوا لیکن ہماری "فوجِ ظفر موج" نے وہ شور مچایا کہ کارروائی جاری رکھنا مشکل ہو گئی۔ کوئی بلی کی آوازیں نکال رہا ہے۔ کوئی گھوڑوں کی طرح ہنہنا رہا ہے۔ کوئی باجا بجا رہا ہے۔ کوئی بھیرویں الاپ رہا ہے۔ کوئی صاحب پاؤں سے طبلے کی آواز پیدا کرنے میں مصروف ہیں۔ اس نقار خانے میں بے چارے قوم پرست مقررین کی آوازوں کو وہ وقعت بھی حاصل نہ تھی جس سے روایتی طوطی کو بھی محروم نہیں رکھا گیا۔

یکایک ہمارے دوست سٹیج پر تشریف لائے۔ چہرہ غصے سے سرخ تھا۔ غالباً انھوں نے صدر کو "کامریڈ پریزیڈنٹ" کہہ کر مخاطب کیا اور اس کے بعد فرمانے لگے "یہ وہ لوگ بیٹھے ہیں جنھیں دیکھ کر مجھے شرم آرہی ہے"۔ یہ اشارہ ہم ناخلفوں کی طرف تھا! مجمع میں سے کسی نے آوازہ کسا "شرم آتی ہے تو نقاب اوڑھ لیجیے"۔ مقرر کا چہرہ اور سرخ ہو گیا۔ انھوں نے بھیپھڑوں کی پوری قوت سے چلانے کی کوشش کی لیکن اب انھیں کون بولنے دیتا تھا۔ آخر ڈاکٹر سیف الدین کچلو ان کی مدد کو آئے اور فرمانے لگے "یہ زندہ دلانِ پنجاب اپنی مہمان نوازی کے لئے مشہور ہیں۔ آپ کے یہ بھائی علی گڑھ سے تشریف لائے ہیں ......" ابھی انھوں نے اپنا فقرہ مکمل نہیں کیا تھا کہ ہم میں سے ایک مجاہد نے نعرہ لگایا "یہ تو پچھلے سال یہیں اناٹومی میں فیل ہوئے تھے"۔ اگرچہ ہمارے یہ بھائی کبھی فیل نہیں ہوئے تھے لیکن یہ نعرہ کام کر گیا اور ڈاکٹر صاحب اپنی جگہ جا بیٹھے۔ اس کے بعد ہم نے اپنے دوست کی آواز تو نہیں سنی۔ البتہ ان کے ہونٹ ضرور آدھ گھنٹے تک ہلتے رہے۔ بعد میں ان کی زبانی معلوم ہوا کہ انھوں نے ان نوٹوں کے مطابق اپنی پوری تقریر ارشاد فرمائی۔ یہ علیحدہ بات ہے

کہ ان کی باریک آواز "بیٹھ جاؤ" "ہم نہیں سننا چاہتے" "غدار ہے" "شرم دی کرو" "کھڑا چھڈ" اور سی بی" کے بے پناہ طوفان میں دب کر رہ گئی۔

اب وہ منظر یاد آتا ہے تو بے اختیار ہنسی آجاتی ہے میرے دوست نے راشٹر یہ پتی بننے کا ارادہ چھوڑ دیا اور میں نے ملّت کی قیادت سے توبہ کر لی۔ اب ہم صرف دوست ہیں اور یہ دوستی" راشٹر یہ پتی شپ" اور ملّت کی قیادت سے بہر حال بہتر ہے۔ کیونکہ راشٹریہ پتی کو بعض اوقات بدھان کے سنگھاسن سے اتار کر چار آنے کی ممبری سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اور ملّت کی قیادت کا تو کچھ اعتبار ہی نہیں صبح کو پھولوں کی بارش اور زندہ باد کے نعرے۔ شام کو کانوں میں مردہ باد کی آوازیں اور گلے میں جوتیوں کے ہار!

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جب کبھی میں اس جلسے کا ذکر کرتا ہوں۔ میرے دوست چڑے سے جاتے ہیں۔

ایک نوٹس ہے سیاہ حاشیے میں غالباً اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔

"۱۴۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء کا دن ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اس دن کان پور کے ایک مٹھائی والے نے ایک زندہ دل۔ خوش ذوق کلرک کو یہ چیلنج دیا کہ وہ ایک نشست میں پانچ سیر رس گلے کھا کر دکھائے۔ غیرت مند کلرک نے اس کا یہ چیلنج منظور کر لیا۔ اور پانچ سیر رس گلے کھا کر شرط جیت لی لیکن اس کے دو گھنٹے بعد ہی یہ عاشق صادق راہیٔ ملکِ بقا ہو گیا ؎

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

آرٹ کے لئے اس طرح زندگی قربان کر دینا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی مثال کم از کم اس زمانے میں بالکل ناپید ہے۔...."

اس کے بعد اس کلرک کی یادگار قائم کرنے کے متعلق بعض تجویزیں ہیں جن پر افسوس ہے کہ کبھی عمل نہیں ہوا۔

ایک خط ہے "تم لوگ ہندوستان میں بیٹھے ہوئے یہ سمجھتے ہو کہ بس انگلستان میں لوگوں کا اور خاص طور پر ہندوستانی طالب علموں کو سوائے عشق بازی کے اور کوئی کام نہیں اور یہاں یہ حالت ہے کہ باوجود سر توڑ کوششوں کے کوئی لڑکی اول تو اس قابل نظر نہیں آتی کہ اسے تحفۂ دل پیش کیا جائے اور اگر کہیں سو میں سے ایک دو لڑکیاں نظر پڑ بھی جاتی ہیں تو ان تک رسائی مشکل ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ اگر ان حالات میں تم ایک غیر ملکی بھابی جان سے محروم رہ جاؤ تو قصور کس کا ہے؟"

اس کے دو مہینے بعد کا لکھا ہوا ایک خط ہے۔ یہ بھی بھابی جان ہی کے سلسلے میں ہے "انگریز لڑکی سے شادی کرنے کے متعلق واقعی تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا تم اس کے سخت مخالف ہو اور کسی صورت میں بھی یہ پسند نہ کرو گے کہ میں انگریز بیوی کے ساتھ ہندوستان واپس آؤں یہ تو تم ضرور مانو گے کہ ہر انگریز لڑکی بدمعاش نہیں ہوتی اور محبت کئے جانے کے قابل بھی ہو سکتی ہے۔ اور اگر کوئی ایسی لڑکی مل جائے جو......"

معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں میرے یہ دوست کسی سے دل لگا بیٹھے تھے میں نے کہا کہیں پھنس تو نہیں گئے؟ جواب میں لکھ بھیجا "ابھی ابھی میں پھنسا تو نہیں مگر سوچ رہا ہوں کہ اگر پھنس جاؤں تو کیا حرج ہے؟ . . . . اور کسی خاص لڑکی کا تصور ذہن میں نہیں واقفیت دو چار سے ضرور ہے لیکن مجرمانہ نہیں بلکہ محض سیدھی دوستی ہے۔ جسے یہاں PLATONIC FRIENDSHIP کے نام سے پکارتے ہیں پچھلی چھٹیوں میں ٹماسکی میں بھی دو چار سے ملاقات ہوئی۔ مگر کوئی اس عزت افزائی کے قابل نظر نہ آئی۔"

ایک اور خط ہے: "میرے حسن ذوق کی بلندی سے تم واقف ہو۔ اس کا تعلق شادی سے نہیں۔ بلکہ اس کا واحد مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی لڑکی کو INFERIORITY — COMPLEX (خبط کمتری) نہ ہونے پائے اور وہ یہ نہ سمجھنے لگے کہ اس میں جنسی کشش موجود نہیں۔ اس لئے میں کسی عورت کو برا نہیں سمجھتا۔ ہاں شادی کا سوال دوسرا ہے۔ ممکن ہے بیوی کے اوصاف کے متعلق تمہارا نظریہ بالکل مختلف ہو لیکن میرا خیال ہے کہ میں انتہائی بدذوقی کا ثبوت نہیں دوں گا۔ اب رہا انگریز لڑکیوں کا قصہ جیسا میں نے پہلے بھی لکھا تھا فی الحال کوئی خاص لڑکی سامنے نہیں البتہ تلاش کرنے کا ارادہ ضرور تھا۔ اب وہ بھی ترک کر دیا ہے۔ اس کی ذمہ داری تم پر ہے اور تمھیں پر رہے گی۔ اگر مجھے پنجاب میں اچھی بیوی نہ ملی تو ساری عمر تمھیں بد دعا دوں گا کہ مجھے انگریز لڑکی سے شادی نہ کرنے دی۔ ہاں اگر انگریز لڑکی خراب ثابت ہوتی تو بھی تمہارا ہی قصور ہوتا کیونکہ میں نے تمہاری رائے اور رضامندی سے شادی کی ہوتی۔ بہرحال اب وقت گزر گیا ہے میں نے انگریز بیوی کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ اور تم اس ذمہ داری سے چھوٹ نہیں سکتے۔

جس لڑکی کے متعلق تم پوچھتے ہو وہ کافی خوبصورت ہے اور شریف معلوم ہوتی ہے۔ اس کی تصویر تمھیں ہندوستان پہنچ کر دکھا دوں گا۔ میں نے یہ تصویر دیکھی ہے۔ اگر خوبصورتی کا معیار یہی ہے تو دنیا میں سبھی عورتیں خوبصورت ہیں لیکن خوبصورتی تو اضافی چیز ہے۔ یہ مس صاحبہ ہمارے دوست کو پسند آ گئیں اور ہم نے بھی "مجھ سے محبت کرتے ہو تو میرے کتے سے بھی محبت کرو" کے پیش نظر ان کے حسن جہاں سوز کی تعریف کر دی!)
وہ مجھے اس لئے شادی کے لئے موزوں نہیں معلوم ہوتی کہ وہ روپے پر مرتی ہے اور سمجھتی ہے کہ میں بہت امیر ہوں جو طالب علمی کے زمانے میں کار میں رکھتا ہوں۔ خدا معلوم ہندوستان میں رولز رائس سے کم بات ہی نہیں کروں گا۔ اور میں بھی اس کے نظریئے کو خوب سمجھتا ہوں۔ اور اب تو اس سے ملاقات ہی کم ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ میری طرف سے مایوس ہو گئی ہے اور کسی اور "خاوند" کی تلاش میں ہے۔ یہ ایک کیا اس کے علاوہ اور بیسیوں ہندوستان کی دلدادہ پھرتی ہیں لیکن تمہاری نصیحت اور مخالفت (اے کاش یہ سطریں میرے دوست کی والدہ کی نظر سے گزر جائیں تا کہ میں اپنی شرافت کے متعلق اپنی والدہ سے ایک سرٹیفکیٹ مانگنے کی زحمت سے بچ جاؤں) کی وجہ سے میں ان سب حسینان فرنگ کو دھوکا دینے پر مجبور رہوں۔ تین چار مہینے اور یہاں ہوں۔ آخر یہی ہو گا کہ ان کے نازک دلوں کو توڑتا ہوا۔ ان کی امیدوں اور آرزوؤں کو خاک میں ملاتا ہوا اس حمید نظامی سے جا ملوں گا اور وہ یہ کہہ سکیں گے کہ "شکر ہے تیری جوانی رہی بے داغ!"

ایک اور خط ہے: "یہ تم نے شراب کے متعلق جو سوال کیا ہے بہت ٹیڑھا اور مشکل ہے۔ تم سے پہلے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اور اب بھی نہیں

ایک تحصیل دار صاحب کا خط ہے: "آج کل میرا شغل ریڈیو سننا ہے۔ روزمرہ کے پروگرام میں دس گھنٹے ریڈیو سننا۔ دو گھنٹے سیر۔ اور ایک گھنٹہ شیخ بو ربگا کی لغو باتیں"۔

اگر یہ مضمون شیخ صاحب کی نظر سے گزرا تو نہ میری خیر ہوگی نہ تحصیل دار صاحب کی!

یہی حضرت ایک اور خط میں لکھتے ہیں: "یہ سید وں کا گاؤں ہے۔ کھانے پینے کی سخت تکلیف ہے۔ آج کل محض مرغوں اور انڈوں پر گزارہ کر رہا ہوں"۔

ایک خط ہے: "میں تمھاری وابستہ مزاجیوں سے اب اس حد تک واقف ہو چکا ہوں کہ وہ حرکتیں جو تمھارا روزمرہ کا معمول ہیں، مجھے ناگوار نہیں ہو سکتیں۔ البتہ تمھارا گزشتہ خط اس قدر مہمل اور غیر متعلق تھا کہ اس کا جواب دینے کی کوئی صورت پیدا ہی نہیں ہوتی۔ ایک مرتبہ میں نے کوشش بھی کی کہ اس کے جواب میں تمھیں کچھ لکھوں مگر جب اسے دوبارہ پڑھا تو دیکھا کہ اس کا نہ سر ہے نہ پیر۔ اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو جواب کی متحمل ہوتی۔ ناچار اسے پھر اسی طرح رکھ دیا اور کسی الہامی لمحے کا انتظار کرنے لگا۔ اب تمھارا دوسرا خط آیا تو معلوم ہوا کہ کوئی بات تو ہاتھ آئی جس پر زیادہ نہیں تو کچھ نہ کچھ لکھنا ضرور ممکن ہے"۔

نیلے رنگ کے ایک کاغذ پر یہ تحریر ہے:-

30 . 11 . 1940

SATURDAY

9. 30 . P. M

خواجہ شبیر حسن صاحب نے وہ کارنامہ کیا جس پر آنے والی نسلیں بھی فخر کریں گی۔ یہ چند حروف بطور سند لکھے گئے تاکہ بوقت ضرورت کام آئیں"۔ آنے والی نسلیں خواجہ صاحب کے اس کارنامے پر ہرگز فخر نہیں کریں گی کیونکہ اس کی حقیقت انھیں کبھی معلوم نہیں ہوگی۔ البتہ [illegible] خواجہ صاحب کبھی کبھی اس کارنامہ کا ذکر چھیڑ کر ذرا خوش ہو لیتے ہیں۔

اسی طرح کی ایک تحریر اور ہے۔

"میں انوار الحق بلا جبر و اکراہ۔ برضا مندیٔ خویش۔ اور بہ قیام ہوش و حواس خدا کو حاضر و ناظر جان کر یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں مسٹر اے۔ ایچ۔ نظامی کو اپنے تازہ ترین فوٹو کی ایک کاپی دوں گا۔

انوار الحق

مورخہ ۲ رجولائی ۱۹۳۹ء"

ایک مجبوب ہستی کا خط ہے "میرا مقصد تقدیر اور تدبیر پر بحث کرنا نہیں۔ شاید در اصل لفظ بے معنی ہیں۔ شاید تدبیر کامیاب نہ ہو سکے۔ اور شاید تقدیر کا دنیا میں وجود ہی نہ ہو لیکن مجھے اس بات کا یقین ہے کہ صرف انسان کچھ نہیں کر سکتا۔

ایک غیبی طاقت اس کی مدد (یا مخالفت) ضرور کرتی ہے۔ اور میں اس امر کے لئے دعا کرتا ہوں کہ یہ غیبی طاقت خواہ اسے خدا کہہ لیں یا نیچر کے نام سے پکاریں یا دیوتاؤں کے لقب سے بلائیں۔ یہ غیبی طاقت میری مدد کرے۔ اور مجھے اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔ یہ مقصد کوئی بہت اعلےٰ وارفع مقصد نہیں محض خود غرضی پر مبنی ہے۔ یہ میرا "مقصد" ہے۔ اس لئے "میں" اس کو حاصل کرنا چاہتا ہوں آپ میری اس ذہنیت کو ذلیل سمجھیں۔ اس پر تعجب کریں۔ یا لعنت بھیجیں۔ اسے میری کم فہمی پر محمول کریں یا میری یاس انگیزی و قنوطیت پر بہر حال آپ جو کچھ چاہیں سمجھیں اور سمجھتے رہیں (اف رے جلال!) مجھے اس کا چنداں خیال نہیں۔ ہاں مجھے اس بات کا پختہ یقین ہے کہ میری قسمت اچھی ہے۔ اور میں دنیا میں بڑا آدمی (خواہ کسی معنی میں) بننے سے کسی صورت میں باز نہیں رہ سکتا۔ یہی میری قسمت ہے" خدا کرے کہ ایسا ہی ہو!

اس کے بعد ایک کاغذ ہے۔ اس پر یہ تحریر ہے۔

"جگا ڈاکو ——— عرف پنجاب کا شیر

ہیملٹ ——— عرف خون کا خون

کنگ بان ——— عرف صید ہوس

اب یہ عرف ملاحظہ فرمائیے!

✓ مہاتما گاندھی	عرف	میں نہ مانوں!	
سبھاش بابو	عرف	دنیا نہ مانے	
ر مولوی عبدالحق	عرف	اردو	
ا میاں بشیر احمد	عرف	ہماری قومی زبان	
نواب مظفر خاں	عرف	عفی عنہ	
سر سکندر حیات	عرف	اسلام کی آنکھوں کا تارا	(صرف پانی پت سے آگے)
چوہدری چھوٹو رام	عرف	آ بیل مجھے مار	
نواب ممدوٹ	عرف	انار کلی	
مولانا ظفر علی خاں	عرف	زندہ باد	
مسٹر محمد شفیع	عرف	یوم اقبال	

ڈاکٹر محمد عالم عرف حلقۂ دام خیال

ماسٹر تارا سنگھ عرف خون کی ندیاں

یہ فہرست نامکمل ہے معلوم ہوتا ہے کہ کسی بزرگ نے مجھے یہ بات سجھا دی تھی کہ اس طرح شرفا کی پگڑی اچھالنا مناسب نہیں۔ اس لئے میں نے نہ اسے مکمل کیا اور کہیں شائع کرایا۔ اگر میں اسے مکمل کرتا تو اس میں یہ اضافہ ضرور کرتا۔

ڈاکٹر محمد باقر عرف اردو سبھا

ایک خط ہے "کسی" نے "کسی" کو لکھا تھا: "میرے خیال میں بہتر ہو گا کہ آپ جمعہ کے دن تشریف نہ لائیں کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ ہماری ملاقات غیر دلچسپ اور ہماری باتیں BORING ہوں گی"

زمانے کے انقلابات ہیں! آج اگر مجھے یہ آرڈیننس نافذ کرنے کا اختیار دیا جائے کہ کاتب اور مکتوب الیہ کو ایک ماہ تک ایک دوسرے سے ملنے کی اجازت نہ ہوگی تو وہ دونوں اس آرڈیننس کی میعاد ختم ہونے سے پہلے پہلے واصل بحق ہو جائیں لیکن ع

برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی است!

حمید نظامی

حیاتِ نو!

کہولت کے شکار پیرِ صد سالہ کی موت کا کیا غم
ایک خوش اندام جوانِ رعنا کے لئے جگہ خالی ہو گئی
پژمردہ پھولوں اور خزاں زدہ پتوں پر کیا نوحہ خوانی
دیکھ کہ دلکش اور تازہ نرگس و لالہ قطار اندر قطار آ رہے ہیں

کہولت اور پژمردگی چہرۂ عالم پر بدنما داغ ہیں۔
بدنما اور پریشان کن منظر!
آنکھ جھپکنے کی دیر میں یہ کئی پردوں میں چھپا دیئے جاتے ہیں
ہاں کوئی گریہ وزاری دستِ قضا کو روک نہیں سکتی۔

وہ دیکھو نسیم دائمی بہار کی نوید لئے پھرتی ہے۔
دنیا کی آرائش گلِ نو شگفتہ سے ہو رہی ہے۔
دنیا حیاتِ نو اور حسنِ تازہ کا گہوارہ ہے
حسنِ تازہ اور حیاتِ نو زندہ باد!

ہاں اے ساقی! مئے ارغوانی کے زندگی بخش جرعے!
ہاں اے مطرب! کوئی جان آفریں نغمہ!
ہاں رگِ مضمحل میں اک تازہ برقی رَو!
میں حیاتِ دائمی کا حریص ہوں

عبد الغنی

گناہِ بے گناہی

ہوس سے عشق کو دست و گریباں کر دیا میں نے
زمانے کے خردمندوں کو حیراں کر دیا میں نے

لہو ٹپکا کے گرد آلود اور آوارہ تنکوں پر
زمیں کے چپے چپے کو گلستاں کر دیا میں نے

قدم بوسی ہی جن بدبخت ذروں کا مقدر تھی
جلا دے کر انھیں مہرِ درخشاں کر دیا میں نے

غریبوں کے گریباں کو قباؤں میں بدل ڈالا
امیروں کی قباؤں کو گریباں کر دیا میں نے

جلا کر شمعِ احساس و تفکر خانۂ دل میں
اندھیرے رہگزاروں پر چراغاں کر دیا میں نے

جسے تہذیبِ حاضر نے نکالا اپنی محفل سے
پھر اس جوشِ جنوں کو دین و ایماں کر دیا میں نے

غرض احساس کی قندیل کو سینے میں بھڑکا کر
پھر اس بھٹکے ہوئے انساں کو انساں کر دیا میں نے

مگر با ایں ہمہ اسلاف کی تاریخ کہتی ہے
کہ اپنی خانماں سوزی کا ساماں کر دیا میں نے

احمد ندیم قاسمی

وہ اور ہم

پہنچا ہے وہاں اپنی تباہی کا فسانہ
تمہید اٹھائیں تو گزر جائے زمانہ

شاکر ہیں کہ لے جائے جہاں بادِ مخالف
مغرب کے لئے جانبِ مشرق ہیں روانہ

اک وہ ہیں کہ چلتے ہیں زمانے کی روش پر
اک ہم ہیں کہ ہیں تیرِ قدامت کا نشانہ

فرشِ رہِ اغیار ہیں وہ "امن کی خاطر"
ہم اپنوں سے دن رات الجھنے میں یگانہ

ہر حال میں جاں دادۂ اربابِ وطن وہ
ہم فتنۂ احباب و اقارب کا نشانہ

بہتا ہے کراڑوں میں وہاں "بحرِ سیاست"
سیلاب یہاں وہ کہ نہ "منبع" نہ "دہانہ"

مذہب سے وہاں بحث نہیں حبِ وطن میں
یاں دست و گریباں ہیں "بھجن" اور "دوگانہ"

ہم شاد سبق وقت سے حاصل نہ کریں گے
اچھا ہے کچل جائے ہمیں پائے زمانہ

شاد عارفی

چودہ برس بعد

ابھی اگلے ہی دِن کی بات ہے۔ میں میکسیم گورکی کی آپ بیتی کا دوسرا باب پڑھ رہا تھا۔

"مدّت دراز کے بعد آج جو میں ماضی کی ورق گردانی کرتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ حقیقت یہی ہے۔ اور بار بار جی چاہتا ہے کہ میں اس کی تردید یا تاویل کردوں ..... دراصل میں آپ بیتی نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ اس تنگ و تاریک ماحول کا مرقع پیش کر رہا ہوں جس میں اس طبقے کا ایک عام روسی رہتا تھا۔ اور اب بھی رہتا ہے ...... میں بڑی محویت سے دیکھ رہا تھا کہ رنگ ساز کس آسانی سے مختلف چیزوں کے رنگ بدل دیتے ہیں۔ کسی پیلی چیز کو اٹھا کر وہ کالے رنگ میں ڈبوتے تو وہ نیلی ہو کر نکلتی۔ کسی بھوری چیز کو سرخ پانی میں ڈالتے تو وہ ارغوانی ہو جاتی۔ یہ تھا تو آسان لیکن میرے لئے یہ جادو کا کھیل تھا۔ میرا جی بہت چاہتا تھا کہ کوئی چیز اپنے ہاتھ سے رنگوں ..... میں نے ایک بھاری سی میز کی چادر نکالی اور آنگن میں پہنچ کر اس کا کونا نیلی ناند میں ڈالا ہی تھا کہ کہیں سے سگنوک مجھ پر جھپٹ پڑا ..... نانا نے مجھے اتنا پیٹا کہ میں بیہوش ہو گیا۔ میں کئی دن بیمار رہا ..... اس غم انگیز زمانے نے میری زندگی کی کایا پلٹ کردی۔ میری طبیعت میں ایک عجیب انقلاب ہو گیا اور میں خود اپنے میں ایک حیرت انگیز تغیر محسوس کرنے لگا۔ میرے دل میں دوسروں کی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو رہا تھا۔ اور میں اپنے اور ان کے دکھ درد کا اتنا خیال کرنے لگا گویا میرے دل کو چیر کر کسی نے اس میں سوز و غم کا جہان بسا دیا ہے۔"

میں سوچ رہا تھا کہ نانا کے ہاتھوں بری طرح پٹ کر گورکی کی طبیعت اسی طرح بدل گئی تھی جیسے بھوری چیز سرخ پانی میں ڈالنے سے ارغوانی ہو جاتی ہے۔

پچھلے دو ماہ سے میں نے یہ مکان کرایہ پہ لے رکھا ہے۔ اس نسبت روڈ کو میں بہت دنوں سے جانتا ہوں۔ لاہور کی یہ سڑک کبھی سنسان نظر نہیں آتی۔ کبھی کبھی تو سوچتا ہوں کہ سارے شہر کے تانگے ادھر ہی امڈے چلے آ رہے ہیں۔ موٹر گاڑیوں کے ہارن اور خوانچے والوں کے نعرے الگ کان کھایا کرتے ہیں۔ شروع کے تین چار دن تو بہت مشکل سے گزرے۔ پھر میں اس مکان سے مانوس ہو گیا۔ اب تو یہ وہم ہو چلا ہے کہ یہ کمرہ، جو دوسری منزل پر واقع ہے۔ ایسی فضا رکھتا ہے کہ خواہ مخواہ کام میں دل لگتا ہے۔ یہیں بیٹھ کر کئی دلچسپ چیزیں لکھ چکا ہوں۔ اور بڑی خوبی یہ ہے کہ ابھی تک بہت سے دوستوں کو یہ خبر نہیں ہوئی کہ میں یہاں رہتا ہوں۔

ہاں تو اس روز کی بات تو میں بھول ہی رہا ہوں۔ ایک صاحب، جو انگریزی وضع کا سوٹ پہنے ہوئے تھے، یہاں تشریف لائے۔ میں ان کی شکل سے واقف نہ تھا۔ ادب سے میں نے انھیں چارپائی پر بیٹھنے کے لئے کہا مگر وہ فرش پر بچھے ہوئے بستر پر جہاں بیٹھ کر میں اکثر

؎ ۳ر اپریل ۱۹۴۲ء

لکھنے پڑھنے کا کام کرتا ہوں آ بیٹھے۔

ابھی تک میں نے ان کا نام نہ پوچھا تھا۔ ان کی آنکھیں جو اتنی شفاف تھیں کہ ان میں ان کے جذبات صاف جھلکتے تھے کہہ رہی تھیں۔ اگر یہاں میز کرسیاں نہیں تو کیا حرج ہے ؟

میں نے پوچھا "کیسے آنا ہوا ؟"

"اس مضمون کے متعلق پوچھنا چاہتا ہوں جو آپ نے اس ماہ کے "ہمایوں" میں لکھا ہے "

"شوق سے پوچھئے "

"بس اتنا ہی پوچھنا ہے کہ اس کی کچھ تفصیل آپ بھول تو نہیں گئے ؟"

"میری آپ بیتی کا یہ ورق آج سے چودہ سال پہلے کا ہے۔ بہت ممکن ہے۔ میری یادداشت میں پوری تفصیل قائم نہ رہ پائی ہو بہر حال مجھے یہ واقعہ اسی صورت میں یاد ہے۔ اور بغیر خاص ادبی نمک مرچ کے میں نے اسے بیان کر دیا ہے "

"آپ نے لکھا ہے کہ رات کا وقت تھا، زیادہ گہما گہمی نہ تھی، آپ نیلے گنبد کے چوک میں آ کھڑے ہوئے۔ آپ کے دل میں خودکشی کے جذبات اُمڈ رہے تھے۔ انار کلی کی طرف سے ایک نوجوان آتا دکھائی دیا۔ وہ آپ کے پاس سے گزر گیا مگر وہ پھر لوٹ آیا۔ جیسے اس نے آپ کا راز بھانپ لیا ہو۔ وہ بولا کیا بات ہے ؟ آپ نے کہا کچھ نہیں۔ اور پھر جب آپ نے بتلایا کہ آپ کا کوئی دوست نہیں غمگسار نہیں تو وہ بولا "میں تو ہوں ..... مگر میں اُس شخص کو جانتا ہوں جو اس رات آپ کو شاہ اقبال کے گھر لے گیا تھا۔ اس کی زبانی مجھے پتہ چلا ہے کہ جب وہ نیلے گنبد میں آپ سے ملا تو وہ اکیلا نہ تھا "

"مگر اپنی یادداشت پر جھلانے کے سوا چارہ نہیں۔ اس شخص کا پتہ مجھے ضرور دیجئے گا۔ اس سے مل کر مجھے بیحد خوشی ہوگی "

"سنئے تو اس نے مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ نیلے گنبد کی سڑک پر اس وقت بہت رونق تھی۔ اپنے ایک دوست کے ہمراہ۔ وہ ایف سی کالج ہوسٹل کی طرف جا رہا تھا۔ اس رات چراغوں کا میلہ تھا "

"مجھے یاد نہیں "

"سنئے تو جب وہ اپنے دوست کے ہمراہ خوش خوش جا رہا تھا آپ لپک کر اس کے قریب آ گئے۔ اور آپ نے سوال کیا۔ "کیوں صاحب میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ اس زندگی کا مقصد کیا ہے ؟ اس نے آپ کا بازو کھینچ لیا۔ اور لال پیلے ہو کر پوچھا ——— تو کیا تم خودکشی کرنا چاہتے ہو ؟ آپ نے جھجکتے ہوئے اثبات میں جواب دیا تو اس نے کہا ——— ابھی میں تمہیں پولیس کے حوالے کئے دیتا ہوں۔ خودکشی کا خیال بھی جرم میں شامل ہے ..... مگر پھر وہ جھٹ آپ سے بغل گیر ہو گیا۔ اس نے نفسیات کا بہت مطالعہ کر رکھا تھا چراغوں کے میلے کی رات ہو اور کوئی کسی سے زندگی کا مقصد پوچھے۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ خودکشی کرنے جا رہا ہے۔ پہلے اس نے آپ پر خوف طاری کر دیا۔ اور پھر اپنی محبت کا اظہار کیا۔ اور پھر جب وہ بولا ——— ہمارے ساتھ آؤ گے ؟ تو آپ اُن دونوں اصحاب کے پیچھے ہو لئے ....

اور یہ بھی غلط ہے کہ آپ کو وہ سیدھا میکلوڈ روڈ کی طرف لے گیا۔ پہلے آپ اُن کے ساتھ گوالمنڈی کی طرف گئے۔ جہاں اس کا دوسرا ساتھی الگ ہو گیا.... شاعر اقبال کے ساتھ جو گفتگو ہوئی اس کی تفصیل آپ نے ٹھیک ٹھیک لکھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسے خوب یاد ہے کہ کس طرح شاعر نے آپ کے اپنے عقیدے کے مطابق مسئلہ تناسخ کی دلیل سے آپ کے دل پر یہ بات نقش کر دی تھی کہ جب مرنے کے بعد تین ہی حالتیں ہو سکتی ہیں۔ اس صورت سے بہتر صورت بالکل ایسی ہے۔ اور یا پھر اس سے بھی خراب۔ اور اس طرح بہتر زندگی پانے کی صرف ایک تہائی امید ہی رہ جاتی ہے تو خودکشی کا خیال سرے سے غلطی پر مبنی ہے.... مگر ایک بات اور بھی ہے۔ اس واقعہ کے ایک ماہ بعد اس شخص نے اخبار میں پڑھا کہ ڈی۔ اے۔ وی کالج لاہور کے ایک طالب علم نے راوی میں کود کر خودکشی کر لی تو اسے یقین ہو گیا کہ ضرور وہ وہی طالب علم ہو گا جسے وہ شاعر اقبال کے روبرو لے گیا تھا...... اور اب جب اسے آپ کا مضمون پڑھنے کو ملا تو اسے یوں محسوس ہوا کہ مردہ زندہ ہو گیا....

ایک دلچسپ بات اور بھی ہے کسی رسالے میں اس نے آپ کا فوٹو دیکھا تھا۔ اور بعد ازاں دیال سنگھ لائبریری میں ایک داڑھی والے عمر رسیدہ صاحب کو دیکھ کر اس نے یوں ہی یہ سمجھ لیا کہ وہی دیوندر ستیارتھی ہیں۔ یہ مضمون پڑھ کر وہ جھلایا کہ اگر وہی نوجوان جسے اس نے آج سے چودہ سال پیشتر شاعر اقبال سے ملایا تھا۔ دیوندر ستیارتھی ہیں تو وہ یقیناً عمر میں اس سے ایک آدھ سال چھوٹے ہونے چاہئیں......"

میں بُت بنا یہ تقریر سنتا رہا تھا ایک ایک بات میں نے بڑی دلچسپی سے سنی تھی۔ جب وہ بولتا تھا تو اس کی رس بھری آنکھوں کی پتلیاں ایک عجب دلکشی سے پھیلتی اور سکڑتی ہو جاتی تھیں۔ میں نے سوچا کہ اب یہ شخص میری یادداشت میں ہو بہو قائم رہے گا۔

میں نے کہا "آپ کا نام؟"

"عاشق حسین بٹالوی"

"خوب۔ آپ کے افسانے تو بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔"

"شکریہ.... ہاں تو مجھے حیرت ہوتی ہے۔ آپ کی یادداشت پر۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اس شخص نے نیلے گنبد میں آپ کو بری طرح جھنجھوڑا۔ اور پولیس کے سپرد کر دینے کی دھمکی دی۔ مگر اپنے ساتھ بیتی ہوئی بات ہی آپ بھول جائیں یہ تو بہت ستم ہے۔"

گورکی کی آپ بیتی کے الفاظ میرے ذہن میں پھیلنے لگے: "مدت دراز کے بعد آج جو میں ماضی کی ورق گردانی کرتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ حقیقت یہی ہے اور بارہا جی چاہتا ہے کہ اس کی تردید یا تاویل کروں.... "میں سوچنے لگا کہ پیلی چیز کو اٹھا کر کالے رنگ میں ڈبو دیں تو وہ نیلی ہو کر نکلتی ہے بھوری چیز کو سرخ پانی میں ڈال دیں تو وہ ارغوانی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مختلف واقعات زندگی کے مختلف رنگوں میں پڑ جانے سے اپنا اصلی رنگ کھو بیٹھتے ہیں۔

میں نے کہا "بات یہ ہے کہ اس واقعہ کے فوراً بعد میں نے اپنی خانہ بدوشی شروع کر دی تھی اور شروع شروع میں جن تکلیفوں میں سے گزرنا پڑا اُن کی وجہ سے میری جسمانی پرورش پوری طرح سے نہیں ہو پائی۔ یادداشت کا تو میں سمجھتا ہوں جسمانی صحت سے براہ راست تعلق ہوتا ہے... بہرحال اس شخص سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہو گی۔"

اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کہا "وہ شخص میں ہی ہوں۔"

دیوندر ستیارتھی

اصغر کا روزنامچہ

بدھ ۔ ۴ جنوری سنہ ۱۹۳۹ء

آج صبح مجھے ک کا ایک نہایت طویل اور دلچسپ خط ملا۔ میں تقریباً دو گھنٹے مطالعہ کرتا رہا۔ م کے ساتھ میں سکواش کھیلا اور اسے میں نے خاصی آسانی سے ہرا لیا۔ پھر میں اور وہ چند ریکارڈ سننے گئے جو وہ خریدنا چاہتا تھا۔ کالج کی ٹرم شروع ہونے میں آج تقریباً ایک ہفتہ باقی ہے۔ میں نے کچھ زیادہ کام نہیں کیا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کیا ہی نہیں۔ تاہم مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں نے کام کیا ہے؛ میں پیرن کو ٹیلیفون کرنا بھول گیا۔ کل میں ضرور کروں گا۔ آج کے دن بھی کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا؛ سو آج بھی کسی شئے کی بابت کوئی کہنے سننے کی بات نہیں ہے۔ مجھے تو اس کا شدید انتظار ہے کہ میرا کالج کھلے لندن سے میں تنگ آ گیا ہوں۔

مج کا ایک خط میری طرف آیا۔ مجھے اس کی توقع نہ تھی۔ لیکن اس کے خط میں کوئی نئی خبر بھی نہ تھی۔ اس کا خیال ہے کہ ف اور ز پر یورپ کی تعلیم کا کچھ خراب ہی اثر ہوا ہے۔ ر نے مجھے لکھا ہے کہ م کے دل کے اندر ف کے لئے کچھ چاہت پیدا ہوئی ہے۔ یہ بات اتنی پُر اسرار کیوں ہے؟ کیا م کا خیال ہے کہ میں ف کو چاہتا ہوں۔ غالباً میں اسے لکھ دوں گا کہ وہ شوق سے بغیر کسی جھجک کے ف کو اپنے لئے حاصل کر لے۔ یہ بے وقوف اپنے امتحان میں کامیاب نہ ہوا۔ میری رائے میں ملاقات کے وقت ایک سکول کی لڑکی کی طرح اسے شرم آ گئی ہو گی۔ خیر مجھے یقین ہے کہ آئندہ دفعہ ضرور وہ کامیاب ہو کے رہے گا۔ لاہور میں آج کل خوب رونق ہو گی۔ ر ف وہاں بعینہ وہی فلمیں دیکھ رہی ہے جو یہاں لندن میں دکھائی جا رہی ہیں۔

(ترجمہ از م۔ ب) اصغر بشیر

محفلِ ادب

کارلائل کی "بلومین"

حیدرآباد میں ریزیڈنسی کے قریب موٹربس کا ایک سٹینڈ ہے۔ جس کا نام "پتلی باؤلی" ہے۔ کیونکہ یہاں اس نام کی ایک خوش نما باؤلی تھی جس میں لوگ سیڑھیوں کے ذریعے سے اتر سکتے تھے۔ یہ باولی جو ایک صدی سے زیادہ عرصے تک لوگوں کو فائدہ پہنچاتی رہی۔ اب بند کردی گئی ہے اور آج کسی دیکھنے والے کے لئے اس سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ شہر سے آنے والی سڑک کا ایک حصہ اسی کے نام سے موسوم ہے ایک کتبے کے مطابق اس باؤلی کو حیدرآباد کے مشہور ریزیڈنٹ میجر کلیس کرک پٹرک نے ۱۸۰۰ء میں تعمیر کیا تھا۔ اور یہ اس تقریب کی یادگار میں کہ اسے ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ یہ بچی بعد کو اس قدر حسین نکلی کہ خود انگریزی ادب میں اس نے اپنے لئے جگہ پیدا کرلی۔ چنانچہ اسے کارلائل نے اپنے مشہور ناول ریمی نی سنس" میں کٹی کرک پٹرک" اور "سارٹر رسارٹس" میں بلومین" کے نام سے پیش کیا ہے۔ مشہور مصنف اسکاٹ نے اس لڑکی کو ایک جگہ ان الفاظ میں یاد کیا ہے:" وہ نصف بیگم تھی اور اس میں ایک تمثیلی انگریز عورت کا حسن بھی جھلکتا تھا"۔ وہ کس طرح کارلائل کی دوست بن گئی اور کس طرح اس کردار نگار نے اس کی تصویر پیش کی۔ اس کا مطالعہ آج بڑی دلچسپی رکھتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ہمارا ذہن اس زمانے تک پہنچ جاتا ہے جب کہ ہندستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا راج تھا۔ اور یہ وہ زمانہ ہے جب کہ اہل یورپ ہندستان کے بڑے گھرانوں کی لڑکیوں سے آزادی کے ساتھ میل جول بڑھاتے تھے۔

خیرالنساء اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں حیدرآباد کے ریزیڈنٹ میجر جیمس کلیس کرک پٹرک تھے۔ اور یہ حضور نظام علی خاں کا عہد حکومت تھا۔ ان کے لائق اور تجربہ کار مدارالمہام ارسطوجاہ بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان دونوں کے ساتھ میجر کرک پٹرک نے بڑے اچھے تعلقات قائم کرلئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی آٹھ سال کی مدتِ ملازمت میں حیدرآباد کے ساتھ تین معاہدے بھی طے کئے ان ہی میں ایک وہ معاہدہ بھی تھا جس کی رو سے حضور نظام نے فرانسیسی فوجی دستے کو اپنی ملازمت سے نکال دیا اور انگریزوں کے ساتھ ایک معاہدۂ اتحاد طے کیا۔ میجر کرک پٹرک جو حشمت جنگ کے خطاب سے سرفراز کئے گئے تھے، قدیم تزک و احتشام کے ساتھ رہتے تھے اور انھوں نے خیرالنساء نامی ایک مسلمان لڑکی سے شادی بھی کرلی تھی۔ خیرالنساء سیّد گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور ایک اچھے ایرانی خاندان کی لڑکی تھی؛ وہ اس کے نانا انگریزی فوجی دستے کے بخشی تھے۔ اس عہدے کی وجہ سے بہت سے انگریز ان کے گھر آیا کرتے اور ان کی

دعوتیں بھی ہوتی رہتیں۔ میجر کرک پٹرک بھی ان آنے جانے والوں میں شامل تھے اور چونکہ وہ نوجوان اور خوب رو تھے ان کے مردانہ حسن کے چرچے گھر کی عورتوں میں بھی ہونے لگے تھے جب خیرالنسا نے ان کو پہلی مرتبہ پردے کے پیچھے سے دیکھا تو وہ ان سے محبت کرنے لگی اور ایک بڑھیا کو پیام سلام کے لئے مقرر کیا۔ کرک پٹرک نے اپنے بڑے بھائی کے نام جو خط لکھے ہیں۔ ان میں اس امر کا تذکرہ کیا ہے کہ وہ ایک مرتبہ اپنے مکان میں تنہا بیٹھا تھا کہ ایک بڑھیا آئی اور اس سے کہنے لگی کہ ایک مرتبہ خیرالنسا نے تمھیں دیکھ لیا ہے۔ اور تم سے محبت کرنے لگی ہے۔ بڑھیا نے اس سے یہ بھی التجا کی کہ تم اس کی درخواست کو منظور کرو لیکن کرک پٹرک نے اسے ٹکا سا جواب دے دیا۔ بعد میں وہ دو تین مرتبہ پھر آئی اور اسی طرح واپس کر دی گئی۔

بالآخر ایک رات کو خود خیرالنسا کرک پٹرک کے پاس آئی اور اس نے بذات خود اپنی درخواست پیش کی۔ کرک پٹرک نے اس نوجوان حسینہ سے بحث تمحیص کا سلسلہ شروع کیا۔ مگر آخر میں اسے ناکام ہونا پڑا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی اصول کے مطابق ایک معاہدۂ نکاح طے پا گیا۔ حضور نظام نے بھی جنھوں نے اس شادی کی اجازت دی تھی اپنی طرف سے نوشہ کو بہت سے قیمتی جہیز دے دیئے۔ اور اسے "فرزند محبت پیوند" کے خطاب سے بھی سرفراز کیا۔ لیکن اس شادی کے بعد شہر حیدرآباد میں ایک ہل چل مچ گئی۔ اہل ہیں کمپنی کی حکومت کو یہ پسند نہ تھا کہ اس کے ملازم ہندستانی عورتوں کے ساتھ راہ و رسم پیدا کریں کیونکہ اسے ڈر تھا کہ کہیں یہ لوگ ہندستانیوں کے زیر اثر نہ ہو جائیں۔ حیدرآباد میں میجر کرک پٹرک کے بہت سے دشمن بھی تھے۔ انھوں نے گورنر جنرل کے پاس یہ رپورٹ کی کہ کرک پٹرک بداخلاقیوں کا مرتکب ہے لیکن جب گورنر نے تحقیقات کی اور کرک پٹرک کے خلاف جو الزامات لگائے گئے تھے انھیں بے بنیاد پایا تو اس نے کرک پٹرک کو بحال کر دیا اور اس کی بہت ستائش بھی کی کہ وہ اس کے مسلک کے مطابق بہت کامیابی کے ساتھ کام کر رہا ہے۔

ان کے بچے حیدرآباد میں ریزیڈنسی کی عالی شان عمارت کے نقشے کی ترتیب اور اس کی تعمیر کرک پٹرک ہی کے زمانے میں ہوئی اس وسیع رقبے میں اپنی بیوی کے لئے ایک زنانہ حصے کی بھی تعمیر کی تھی اور اس میں مصنوعی چشمے بنوا کر اسے بہت فرحت بخش بنا دیا تھا۔ عمارت کے اس زنانہ حصے کی دیواروں پر رنگ برنگ کے پھول، میوے، پودے، پرند اور دیگر جانور اتارے گئے تھے۔ اور یہ حصہ اس قدر خوشنما ہو گیا تھا کہ اس کا نام "رنگ محل" رکھا گیا۔ مگر یہ عمارت ۱۸۶۰ء میں گرا دی گئی۔

خیرالنسا سے کرک پٹرک کو دو بچے ہوئے جن میں سے ایک لڑکا تھا اور ایک لڑکی۔ ان دونوں کو جب کہ ان کی عمریں چار اور تین سال کی تھیں ان کی ماں کی رضامندی سے انگلستان بھجوا دیا گیا۔ تاکہ وہاں ان کی تعلیم و تربیت ہو۔ یہ بچے انگلستان میں اپنے دادا کے ساتھ رہنے لگے لیکن جب اس کا انتقال ہو گیا۔ تو پھر یہ اپنی چچا زاد بہن کے زیر نگرانی رکھے گئے لیکن انگلستان جانے کے بعد ان بچوں کو پھر اپنے ماں باپ سے ملنا نصیب نہ ہوا کیونکہ ان کی روانگی کے تھوڑے ہی عرصے بعد یعنی ۱۸۰۵ء میں میجر کرک پٹرک کا کلکتہ میں انتقال ہو گیا۔ اور خیرالنسا حیدرآباد میں واپس آ گئی۔ ہندستانی ماں نے اپنی لاڈلی بچی کا نام صاحب بیگم بی بی صاحبہ رکھا تھا لیکن اب

یہ نام بدل گیا اور رکھیتھرین آرد سا یا جیسا کہ عام طور پر مشہور رہے کٹی کرک پیٹرک کے نام سے موسوم ہوگئی۔ اس نے ۸۷ برس کی عمر پائی۔ اور اس کے کئی بچے بھی ہوئے لیکن اس کا بھائی جوان مرگیا۔ اس کی ایک بیوہ اور تین لڑکیاں تھیں۔

کارلائل سے دوستی جب کارلائل نے اپنی جامعہ کی زندگی ختم کی تو اس کے سامنے بہت سی مشکلیں تھیں۔ چنانچہ اسی کا اثر ہے کہ اس نے چرچ، مدرسہ اور قانون سب کو چھوڑ دیا۔ ۱۸۲۲ء میں اس نے اپنے دوست ایڈورڈ ارونگ کے توسط سے مسٹر بلر تک رسائی حاصل کرلی اور ان کے بچوں کا اتالیق ہوگیا۔ موصوف جو بہت مالدار آدمی تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے محکمۂ مال گزاری میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے اور اب انھوں نے وظیفہ حاصل کرلیا تھا۔ بلر خاندان کی بدولت کارلائل سماج کے ایک ایسے دولتمند، مہذب اور متمدن طبقے سے روشناس ہوا جس کے ساتھ ملنے جلنے کا اسے اب تک اتفاق نہ ہوا تھا۔ جب وہ اپنے وارڈز کے ساتھ لندن آیا تو یہاں مسز بلر نے اس کو اپنی بہن مسز اسٹراچی سے ملا دیا۔ اور یہی لڑکی ہے جس کے متعلق بعد میں کارلائل نے "عورتوں میں ہیرا" کے الفاظ استعمال کئے۔ یہ دونوں بہنیں ولیم کرک پیٹرک کی لڑکیاں تھیں جو کٹی کا چچا تھا۔ کارلائل نے کٹی سے پہلی مرتبہ ایڈورڈ ارونگ کے مکان پر ملاقات کی اور اس "نازک سیاہ آنکھوں اور بھورے بالوں والی ساحرہ سے بہت متاثر ہوا" کٹی اپنے دلفریب حسن کے لحاظ سے اپنا آپ جواب تھی۔ اس کا بوٹا سا قد تھا۔ سیاہ آنکھیں تھیں، بھورے بال تھے۔ گندمی رنگ تھا۔ یہ پیکرِ محبت بہت خوش مزاج بھی تھی اور میرا خیال ہے کہ وہ زندگی میں کسی دوسرے پر کبھی خفا نہ ہوئی تھی۔ وہ خود مختار بھی تھی اور پچاس ہزار پونڈ کی دولت کے ساتھ دولتِ حسن کی بھی مالک تھی لیکن اس کے باوجود اس میں غرور و تمکنت نام کو نہ تھی بلکہ وہ بہت منکسر المزاج واقع ہوئی تھی۔" چند روز بعد جب کارلائل اور کٹی زیادہ ملنے جلنے لگے تو یہ ایک دوسرے سے وابستہ ہوگئے۔ چنانچہ ۱۸۲۴ء میں یہ دونوں پندرہ دن کے لئے پیرس بھی ہو آئے لیکن اسی زمانے میں کارلائل نے یہ سنا کہ مسز اسٹراچی اپنی بہن کے لئے ایک اچھے بر کی تلاش کر رہی ہیں۔ اس سے کارلائل بہت متاثر ہوا۔ چنانچہ اپنی کبرسنی میں اس نے لکھا ہے: "مجھے یہ چیز اب زیادہ تکلیف دیتی ہے گو اس وقت بھی میں اس سے متاثر تھا۔ مسز اسٹراچی چاہتیں تو وہ آسانی سے اپنی بہن کے لئے میرا انتخاب کرسکتیں اور پھر ہم دونوں ہمیشہ ان ہی کے ساتھ رہتے۔" لیکن حالات ناموافق ہوگئے اور دونوں نے مختلف راہیں اختیار کیں۔ پیرس سے واپس آنے کے چند ہی مہینے بعد کارلائل کی شادی جین ولش سے ٹھیر گئی۔ جو "ایک تیز نظر اور چرب زبان دوشیزہ تھی۔" اسی طرح کٹی کے لئے بھی جیمس لسلو فلپس کا انتخاب ہوگیا جو ساتویں ہسار کا کپتان تھا۔ کارلائل نے اس شادی کے بعد کٹی کے فوجی شوہر پر جس نے ہندوستان میں خدمت انجام دی تھی۔ اس طرح چوٹ کی ہے: "کٹی سپاہیوں کے کسی سابق کپتان کو انعام میں دے دی گئی۔"

کارلائل کی تصانیف میں اس کا تذکرہ کٹی کا کوئی خاکہ پیش کرنے میں کہ اس کے مشرقی حسن وجمال کا کیا عالم تھا ان الفاظ کا حوالہ ناگزیر معلوم ہوتا ہے جن میں کارلائل نے اس کی تصویر کھینچی ہے۔ اس نے اس کی تصویر یوں پیش کی ہے: "وہ ایک لودھی رنگت کی دوشیزہ تھی۔ اس کی بھوری آنکھیں تھیں، وہ بہت خوبصورت تھی۔ اور اس کے حسن میں ایک دلکشی تھی۔ اس کے آواز میں ترنم

اور موسیقیت تھی اور وہ واقعی سنز اسٹراچی کی بہن معلوم ہوتی تھی"۔ ایک جگہ یوں لکھا ہے: "اس حسینہ کے چرچے ہر جگہ ہوتے تھے۔ اس کا حسن۔ اس کے اوصاف اور اس کی طبیعت کی رنگینیاں ہر محفل میں بار بار دہرائے جاتے تھے۔ اس کی آنکھوں میں نور تھا اور اس کے عارضِ گلگوں پر ایک طرف کاکلِ سیاہ سے پرچھائیں پڑتیں تو دوسری طرف سے تبسم شعاعیں آلماتی تھیں"۔ ایک اور موقع پر کارلائل کے جذبات ان الفاظ میں پھوٹ پڑتے ہیں: "جب کبھی بلومین اپنی معصومیت کے ساتھ چھوٹی بڑی عورتوں کی صف میں کھڑی ہو جاتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ دنیا کے ٹمٹماتی شمعوں میں ایک آسمانی تارا ٹوٹ آیا ہے"۔ اپنی پرانی ملاقاتوں کی یاد میں کارلائل لکھتا ہے "اس کے تبسم میں ایک جادو تھا۔ اور اس کی ہر بات ہنسی کا پہلو لئے ہوئے ہوتی تھی۔ اس کے لبِ نازک کا دہنا گوشہ خم کھایا ہوا تھا۔ اس کے سر اور آنکھوں کی حرکت میں ایک دل ربائی تھی۔ جب وہ اپنے لبِ نازک کو جنبش دیتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ دھیمے سروں میں نغمے نکل رہے ہیں جو اپنے ساتھ تبسم لئے ہوئے ہیں۔ وہ بہت ملنسار اور محبت آگیں تھی۔ وہ ایک پیکرِ لطافت اور اس کے ساتھ ساتھ جاذبِ نظر بھی تھی۔ اس کی زیرِ لب سریلی آواز دل میں اتر جاتی تھی اور اس کی ہر آدا زلطیف و معنی خیز ہوتی تھی"۔

غرض کارلائل نے اپنے خاص جوشیلے انداز میں ایک ایسی لڑکی کے متعلق اپنے اندرونی جذبات اور احساسات کا اظہار کیا ہے جس کی ماں حیدرآباد کی ایک مسلمان خاتون تھی۔ وہ کبھی "بلومین" کی دل ربا شکل اختیار کرتی ہے اور کبھی "کٹی کرک پیٹرک" کے نام سے ہمارے سامنے آتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ ان لوگوں کے لئے جو انگریزی ادب کے دلدادہ ہیں بڑی دلچسپی کا سرمایہ ہے۔

نیلم راجہ رام

(مترجمہ حفیظ صدیقی)

"سب رس"

مجلسِ لطیفہ گوئی

ایک آواز:۔ صاحبِ صدر! وقار صاحب بڑی دیر سے کیوں خاموش ہیں؟

صاحبِ صدر:۔ (توجہ دلاتے ہوئے) ہاں وقار صاحب! ؎

کچھ تو کہئے کہ لوگ کہتے ہیں

آج غالب غزل سرا نہ ہوا

مولانا وقار:۔ طوائف کے تذکرے میں ایک لطیفہ مجھ سے بھی سن لیجئے۔ مولانا سلیم پانی پتی نے ایک دفعہ مکان تبدیل کیا۔ از سوءِ اتفاق سے ایک ایسا مکان کرایہ پر لیا جو ایک دو ہی دن پہلے کسی طوائف نے خالی کیا تھا۔ جب مولانا پہلے روز اس مکان میں آئے تو مولانا حالی ان کے مہمان تھے۔ دونوں بزرگ رات کو دیر تک باتیں کرتے رہے۔ جب سونے کی تیاریاں کرنے لگے تو باہر سے

کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ مولانا سلیم نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ ایک دیدار و جوان سیڑھیوں میں کھڑا تھا۔ اور طوائف کی تلاش میں وہاں آیا تھا۔ وہ مولانا کو جانتا نہ تھا۔ ایک طوائف کے مکان پر ایک سفید ریش بزرگ کو دیکھ کر وہ بہت حیران ہوا۔ اور آہستہ آہستہ کچھ بڑبڑانے لگا۔ مولانا نے واپس جاکر مولانا حالی سے بیان کیا۔ وہ آئے تو نوجوان نے انھیں پہچان لیا کیونکہ ادھر اُدھر جلسوں میں کئی بار انھیں تقریریں کرتے اور نظمیں پڑھتے دیکھ چکا تھا۔ توبہ توبہ کر کے کہنے لگا "مولانا۔ آپ اور یہاں؟ خدا کی پناہ!"

مولانا نے کواڑ کھولتے ہوئے کہا "ہاں ہاں بھئی۔ آؤ۔ اندر آجاؤ۔ کچھ کہو تو کیا کام ہے"؟

لیکن نوجوان کہنے لگا "مولانا صاحب! مجھے معاف فرمائیے۔ جہاں آپ جیسے بزرگوں نے قبضہ کر رکھا ہے وہاں ہمیں کون پوچھے گا؟" (قہقہہ)

مولانا کہتے ہی رہے۔ اور بڑھ کر اس کا دامن بھی پکڑ لیا مگر وہ دامن چھڑا کر بھاگ گیا +

قاضی ظہیر الدین:- بات سے بات پیدا ہوتی ہے۔ بٹ صاحب کے لطیفے میں ایک تو فوجی بھرتی کا ذکر تھا اور ایک پٹھانوں کا اس پر مجھے دو لطیفے یاد آئے۔ ایک بنگالی بابوؤں کی بھرتی کے متعلق جو آپ نے سن لیا۔ دوسرا پٹھانوں کے متعلق بھی سن لیجیے۔ کسی شخص کو پٹھانوں کے ایک گاؤں میں رات ہوگئی۔ اس نے مسجد میں قیام کیا۔ سرِ شام ہی ایک پٹھان نے مسجد میں آکر اس سے پوچھا "خو تم مسافر ہے؟"

"ہاں مسافر ہوں" اس نے جواب دیا۔

"خو کانا کائے گا" پٹھان نے پوچھا۔

"جی ہاں کھاؤں گا" مسافر نے کہا۔

یہ سن کر پٹھان کھانا لینے چلا گیا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک اور پٹھان آگیا۔ اس نے بھی مسافر سے وہی باتیں پوچھیں جو پہلے مسافر نے پوچھی تھیں۔ اور پھر وہ بھی کھانا لینے چلا گیا۔ اتفاق کی بات کہ جو پٹھان بعد میں آیا تھا۔ اس کا گھر پہلے پٹھان کے گھر کی نسبت مسجد کے نزدیک تھا۔ چنانچہ وہ کھانا لے کر جلد ہی واپس آگیا۔ مسافر بیچارے کو کیا معلوم کہ پہلے کون آیا اور بعد کون؟ اور پھر اسے اس سے غرض بھی کیا تھی۔ اس کو تو رات گزارنی تھی چنانچہ اس نے کھانا شروع کر دیا اور پٹھان واپس چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پہلا پٹھان کھانا لے کر آ پہنچا۔ کیا دیکھتا ہے کہ مسافر بیٹھا مزے سے کھانا کھا رہا ہے یہ دیکھ کر وہ آپے سے باہر ہوگیا۔ کھانا وہیں رکھ دیا اور چھرا نکال کر یہ کہتا ہوا مسافر پر جھپٹا کہ "خو ام کو کہتا ہے کانا کائے گا۔ اور ادھر کانا کاتا ہے"۔

مسافر یہ طرفہ نظارہ دیکھ کر گھبرا گیا۔ مسجد کے احاطے کی دیوار پھلانگ کر اس طرف بھاگا جدھر پٹھان کھانا دے کر گیا تھا۔ پٹھان بھی ہاتھ میں چھرا لئے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ گلی کے نکڑ پر وہ پٹھان جا رہا تھا جو کھانا دے کر گیا تھا۔ مسافر نے اسے آواز دے کر کہا۔

"خان - اوخان - اِدھر دیکھو۔ یہ خان مجھے مارتا ہے۔ کہتا ہے۔ میں نے تمھارا کھانا کیوں کھایا ؟"
آگے جاتے ہوئے پٹھان نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور پھر نہایت متانت سے کہنے لگا "خو۔ شور کیوں مچاتا ہے۔ مارتا ہے تو مرجاؤ۔ اَم تمھارے بدلے میں اس کا سو مہمان ماریں گا" (قہقہہ)

باری صاحب:۔ میں بھی ایک لطیفہ سنانا چاہتا ہوں۔ اگرچہ یہ سرتاپا یاروں کی گھڑنت معلوم ہوتا ہے تاہم لطیفہ ہے اور دلچسپ ہے اس لئے سن لیجئے۔ کہتے ہیں کہ پچھلے دنوں مسلمانانِ بمبئی قائداعظم مسٹر محمد علی جناح کو نماز کے لئے مسجد میں گھسیٹ لے گئے۔ نماز باجماعت کوئی مشکل چیز نہیں۔ ناواقف سے ناواقف آدمی بھی اپنے ساتھیوں کی حرکات کی پیروی کرتا ہوا ادا کرسکتا ہے چنانچہ قائدِاعظم بھی نقل مطابق اصل کا فرض انجام دیتے رہے لیکن اخیر پر جب امام نے کہا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" تو مسٹر جناح اوّلیت کا ثواب حاصل کرنے کی غرض سے بول پڑے "وعلیکم السلام یا مولوی" (قہقہہ)

وقار صاحب:۔ خاکساروں کے متعلق تازہ ترین لطیفہ سن لیجئے:۔
۱۵ مارچ کو خاکسار شہیدوں کا دن منایا گیا ہے۔ اس موقع پر مختلف شہروں سے جلسوں کی کارروائیاں موصول ہوئی ہیں لیکن سب سے دلچسپ کارروائی دہلی سے موصول ہوئی ہے۔ وہاں میاں احمد شاہ خاکسار لیڈر کی سرکردگی میں جلسہ ہوا۔ کارروائی میں لکھا ہے کہ
"آخر میں "شہیدانِ تی" کے لئے دعا کی گئی" (قہقہہ)

صاحب صدر:۔ ایک مولوی صاحب کسی عطار کی دکان پر گئے اور "ر" کو گول کرکے صحیح مخرج سے ادا کرتے ہوئے عطار سے کہنے لگے،
"آپ کے پاس شی...... رُا (شیرہ) ہے ؟"
عطار نے جواب دیا "ہے تو سہی مگر اتنا گاڑھا نہیں" (قہقہہ)

قاضی ظہیر الدین:۔ مولوی حضرات کے متعلق بے شمار لطیفے مشہور ہیں۔ ایک عرض کرتا ہوں "ایک سیلانی شخص پھرتا پھراتا شام کے وقت کسی گاؤں میں پہنچا۔ نماز کا وقت تھا۔ سوچا پہلے نماز پڑھ لوں۔ مسجد میں پہنچا تو نماز ہو رہی تھی۔ اور ایک لڑکا قرآن اٹھائے مولوی صاحب کے سامنے کھڑا تھا۔ جوں جوں مولوی صاحب قرأت کرتے شاگرد ورق الٹتا جاتا۔ نووارد یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا اور سوچنے لگا "یہ بھی کیسا کم بخت مولوی ہے کہ دو چار رکوع زبانی یاد نہیں کرسکتا۔
نماز ختم ہونے کے بعد اس شخص نے سبب پوچھا تو مولوی صاحب نے کہا "بھئی احتیاط لازم ہے۔ میں اس لئے قرآن مجید سامنے رکھتا ہوں کہ کہیں کوئی غلطی نہ ہوجائے"
نووارد نے محض تفریحِ طبع کے لئے مسکراتے ہوئے کہا "سبحان اللہ کیا تقوےٰ ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو آپ کی امامت میں نمازیں پڑھتے ہیں مگر حضرت آپ نے یہ کمال اور یہ علم کہاں سے حاصل کیا ؟"
مولوی صاحب نے کہا "میرے استاد یہاں سے قریب ہی فلاں قصبے میں رہتے ہیں۔ ماشاءاللہ بڑے صاحب کمال

بزرگ ہیں۔"

نووارد وہاں سے رخصت ہو کر مولوی صاحب کے بتائے ہوئے گاؤں میں آیا۔ اور سیدھا مسجد میں گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک شخص ایک ہاتھ میں ایک کتاب اٹھائے اس میں سے پڑھ پڑھ کر اذان دے رہا ہے۔ اس نے سمجھ لیا ہو نہ ہو یہی بزرگ ان مولوی صاحب کے استاد ہیں۔"

نماز کے بعد وہ شخص مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان کے شاگرد اور اس کے علم و فضل کا ذکر کیا۔ اور ان سے عقیدت ظاہر کر کے پوچھا" آپ نے یہ کمال کہاں سے حاصل کیا؟"

مولوی صاحب نے کہا" میرے استاد اسی قصبے کے فلاں محلے میں رہتے ہیں اور اگر تم چاہو تو ان سے مل سکتے ہو۔"

نووارد نے کہا" میں ضرور ملوں گا۔ اور پھر ان کے بتائے ہوئے پتے پر گیا۔ ایک بوسیدہ سے مکان میں ایک سفید ریش بزرگ بیٹھے تھے۔ چند عقیدت مند بھی جمع تھے۔ نووارد نے مکان میں قدم رکھتے ہوئے کہا" السلام علیکم"۔

مولوی صاحب نے فوراً دایاں ہاتھ اپنی تھان بھر کی پگڑی پر رکھا۔ وہاں سے کاغذ کا ایک پرزہ نکالا۔ اسے کھول کر غور سے دیکھا اور پھر بولے" وعلیکم السلام"

نووارد بے اختیار پکار اٹھا" آمنا و صدقنا۔ آپ استادوں کے استاد ہیں۔"

مولانا عزیز: ہم نے یہ لطیفہ ایک اور طرح سنا ہے۔ اور وہ یوں کہ:۔

ایک شخص کسی گاؤں میں گیا۔ نماز کے وقت اس نے ایک شخص کو اذان میں یہ کہتے ہوئے سنا" نحن نشہد ان محمد رسول اللہ"

وہ شخص یہ سن کر بہت حیران ہوا اور مسجد میں پہنچ کر مؤذن سے اس کا سبب پوچھا۔ مؤذن نے بتایا کہ" یہ گاؤں مسلمانوں کا ہے۔ وہ سب اپنے اپنے باغوں اور کھیتوں میں کام کرتے رہتے ہیں۔ گاؤں میں چند گھر یہودیوں کے ہیں ان سے مسلمان یہ کام لیتے ہیں کہ وہ نماز کے وقت اذان دے دیا کریں۔ میں بھی چونکہ یہودی ہی ہوں اور چونکہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول نہیں مانتے اس لئے کہتا ہوں نحن نشہد ان محمد رسول اللہ"

نووارد شخص یہ سن کر بہت حیران ہوا اور وہاں کے مسلمانوں کی جدت سے خوش بھی۔ وہ ابھی وہیں بیٹھا تھا کہ مسلمان نماز کے لئے جمع ہونے شروع ہو گئے امام صاحب نے ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر نماز پڑھائی۔ نووارد پہلے ہی حیران تھا۔ اب اور بھی حیران ہوا۔ اور دل میں مصمم ارادہ کر لیا کہ مولوی صاحب سے ان باتوں کا سبب ضرور پوچھوں گا۔ نماز ختم ہونے کے بعد وہ شخص مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا" السلام علیکم"

مولوی صاحب بھاگ کر اندر گئے۔ الماری سے ایک کتاب نکالی۔ اس کے ورق الٹنے شروع کئے۔ بالآخر ایک صفحے پر کچھ دیکھ کر باہر آئے اور کہنے لگے" وعلیکم السلام" نووارد کی حیرت میں اب اور اضافہ ہو گیا۔ اس نے مولوی صاحب سے ان تینوں باتوں کا سبب پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ ہم لوگ دین کے بہت زیادہ پابند ہیں جب تم نے کہا" السلام علیکم" تو میں نے کتاب میں دیکھا۔ وہاں لکھا ہے کہ جب کوئی شخص السلام علیکم کہے تو جواب میں وعلیکم السلام کہو۔ اور ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر نماز اس لئے پڑھی کہ باغ سے آتے ہوئے رستے میں میرا پاؤں گوبر میں بھر گیا تھا اگرچہ میں نے دھو لیا مگر شک تھا کہ شاید پاک نہ ہوا ہو جیسا بچا سے نماز میں شریک نہیں کیا۔ اور باقی رہا یہودیوں سے اذانیں دلوانا تو یہ محض پابندیٔ وقت کے لئے ہے ہم کام کاج میں مصروف ہوتے ہیں ممکن ہے کام میں اذان یا نماز کا دھیان ہی نہ رہے۔ اس لئے یہ کام یہودیوں کے سپرد کر دیا ہے۔" (محمد افضل۔ شیرازہ ملخص)

مطبوعات

زباں دانی: فضل الٰہی صاحب عارف نے یہ کتاب لکھ کر صحیح اردو زبان سیکھنے والوں کی ایک بہت بڑی ضرورت پوری کی ہے۔ کتاب کے عنوانات کی اس سرسری فہرست سے اس کی جامعیت کا اندازہ ہوسکتا ہے:۔

(۱) تحقیقِ الفاظ (۲) املائی غلطیاں (۳) تذکیر و تانیث (۴) تابع مہمل اور تابع موضوع (۵) عورتوں کے ملبوسات زیور وغیرہ (۶) مختلف کھانے (۷) پھول درخت پودے (۸) پانی کے جانور حشرات الارض حیوانات (۹) بیماریاں (۱۰) رسوم و اوہام وغیرہ ہر عنوان کے ماتحت بہت سی مفید معلومات جمع کی گئی ہیں بعض معمولی لغزشوں سے قطع نظر کتاب بہت مفید ہے۔ اور ہر اردو جاننے والے کی نظر سے گزرنی چاہئے۔ اردو میں اس موضوع پر اب تک ایسی جامع کتاب ہماری نظر سے نہیں گزری حجم ۔۔۳ صفحات قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے پتہ:

اردو اکیڈیمی لاہور

اردو رسم الخط: مؤلفہ جناب محمد سجاد مرزا صاحب ایم۔ اے (کینٹب) پرنسپل اسلامیہ ٹریننگ کالج " حیدرآباد دکن۔ اردو رسم الخط اور ٹائپ کے متعلق یہ مفید اور جامع معلومات کتاب اہلِ اردو کی خاص توجہ کی مستحق ہے۔ قدیم رسم الخط کے کئی ہاف ٹون بلاک سے مطالب واضح کئے گئے ہیں۔ ٹائپ کے لئے ایک بہت اچھا خط تجویز کیا گیا ہے جس سے ٹائپ کی بہت مشکلات حل ہو جاتی ہیں قیمت آٹھ آنے

پتہ:۔ مکتبہ جامعۂ ملیہ۔ قرول باغ۔ نئی دہلی۔

فیضانِ حسین معروف بہ جذباتِ مخفی:۔ محترمہ صالحہ بیگم صاحبہ مخفی بنگال کی ایک مسلمان شاعرہ ہیں۔ اس کتاب میں حضرت امام حسین کی شہادت کے متعلق ان کی نظمیں اور مراثی وغیرہ جمع ہیں مخفی صاحبہ کا کلام اپنی پختگی، روانی اور تاثیر کے لحاظ سے قابلِ قدر ہے قیمت چار آنے ۔

پتہ:۔ نمبر ا۔ سید اسمٰعیل لین ڈاک خانہ پارک اسٹریٹ کلکتہ

پسِ پردہ: حضرتِ اختر بریلوی کا مجموعۂ کلام ہے حضرتِ اختر کی نظموں میں اصلاحی عنصر زیادہ ہے۔ امید ہے کہ یہ مجموعہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا قیمت ۱۲ر پتہ: میزان الادب بریلی (یو۔پی)

نئے مسائل: محمد مرغوب الدین صاحب بی۔ اے بی ٹی نے اس کتاب میں چند موجودہ مسائل کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے بعض موضوعات یہ ہیں:۔ امیر و غریب حکومت، جنگ وغیرہ قیمت ۸ر پتہ: مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

سائنس کے کرشمے: میر حسن صاحب ایم۔ اے کی یہ تالیف حیدرآباد دکن کے ادارۂ ادبیات اردو نے شائع کی ہے۔ اس میں سائنس کے متعدد موضوعات کے متعلق مختلف حضرات کے آٹھ مضامین جمع کئے گئے ہیں۔ کتاب مطالعہ کے قابل ہے قیمت مجلد عہ۔ ادارہ کے پتے سے طلب فرمائیے۔

راہِ آزادی (حصّۂ اوّل) از صولت علی خاں صاحب رام پوری قیمت ۱۲ مطبوعہ بریلی الیکٹرک پریس - بریلی

اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اقوامِ ہند کی جداگانہ حکومتوں کا قیام ہندوستان کی آزادی کے لئے پہلا قدم اور اس کے حصول کا واحد ذریعہ ہے

کاروانِ ادب:۔ یہ کتاب ڈاکٹر عبدالوحید صاحب بی۔ اے آنرز) پی۔ ایچ۔ ڈی لنڈن کی نگرانی میں تالیف کی گئی ہے۔ اور فیروز سنز لاہور نے شائع کی ہے۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے اردو میں یہ اپنی طرز کا پہلا کارنامہ ہے۔ اس میں فورٹ ولیم کالج کے زمانے سے لے کر آغا حشر کے عہد تک کے نثر نگاروں اور ان کی کتابوں کے متعلق مفید معلومات جمع کی گئی ہیں۔ خوبی یہ ہے کہ مشہور تصانیف کے خلاصے (حتی الامکان خود مصنّف کی زبان میں) درج کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اردو کی بہت سی مشہور تصانیف سے واقفیت ہوسکتی ہے اور خلاصوں کی وجہ سے مطالعہ پر وقت بھی کم صرف ہوگا بعض عنوان ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

باغ و بہار۔ گل بکاؤلی۔ فسانۂ عجائب۔ خطوطِ غالب۔ خطباتِ احمدیہ۔ حیاتِ سعدی۔ الفاروق۔ افاداتِ مہدی۔ توبۃ النصوح۔ حاجی بغلول۔ طوفانِ حیات (ڈرامے) اندرسبھا۔ اکبر۔ خوابِ ہستی وغیرہ۔

ہماری رائے میں یہ کتاب اس قابل ہے کہ سکولوں اور کالجوں کی لائبریریوں کے لئے منظور کی جائے۔ کاغذ اور طباعت نفیس ہے حجم ۴۸۴ صفحات قیمت مجلد ۸؎ ۔ فیروز سنز لاہور سے طلب فرمائیے۔

تعلیم و تربیت:۔ بچوں کا یہ ماہوار رسالہ فیروز سنز لاہور کے اہتمام میں شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ مضامین، تصاویر اور نقشے پر از معلومات اور دلچسپ ہیں۔ یہ رسالہ بچوں کے لئے بہت مفید ہے۔ حجم ۳۲ صفحات۔ سالانہ چندہ دو روپے۔ پتہ اوپر درج ہے۔

یادِ انوار:۔ از محمد امین صاحب زبیری مارہروی۔ یہ مولوی حاجی انوار احمد صاحب زبیری مارہروی کی سوانح عمری ہے حجم ۹۹ صفحات، قیمت درج نہیں۔ پتہ: منیجر مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ۔

انتخابِ جداگانہ کا تاریخی خلاصہ:۔ مولوی محمد امین صاحب زبیری نے یہ کتاب لکھ کر مسلمانوں کی ایک بہت بڑی سیاسی ضرورت پوری کی ہے۔ موجودہ سیاسیات کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید ہے۔ اس کی فروخت کا منافع مسلم لیگ کو دیا جائے گا۔ پانچ آنے کے ٹکٹ بھیج کر دفتر مسلم لیگ آگرہ سے طلب فرمائیے۔

کہکشاں:۔ یہ نعیمی اجمیری مرحوم کے ادبی مضامین اور افسانوں کا مجموعہ ہے جسے حضرت قیسی رام پوری نے شائع کیا ہے۔ کتاب دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے۔ اندازِ تحریر شگفتہ اور دلکش ہے۔ اور کتابت و طباعت نفیس حجم ۱۸۳ صفحات قیمت دو روپے

پتہ: حضرت قیسی رام پوری آڈٹ آفس اجمیر۔

شہرِ خموشاں اور دوسرے افسانے:۔ از سید محمود مورّخ صاحب بی۔ اے حجم ۱۶۷ صفحات قیمت ۱۲؎ پتہ مجلس فروش پبلشنگ ہاؤس دہلی مورّخ صاحب ایک مشہور اخبار نویس اور ادیب ہیں۔ ان کے افسانوں کا یہ مجموعہ قابلِ قدر ہے۔

رہبرِ املا:۔ جناب پوکرمل صاحب گپتا وکیل ہائی کورٹ الور (راجپوتانہ) نے یہ کتاب لکھ کر اردو املا سیکھنے والوں کے لئے بہت سہولت پیدا کردی ہے۔ اکثر مقامات پر حکایات اور تصاویر سے مطالب کی تشریح کرکے کتاب دلچسپ بنادی گئی ہے طلبہ اور دوسرے شائقین کے لئے یکساں مفید ہے حجم ۸۰ صفحات قیمت ۵ر مصنف سے مل سکتی ہے۔

مذاہبِ عالم:۔ پروفیسر پریتم سنگھ صاحب ایم۔ اے کی اس مختصر کتاب کے مطالعے سے دنیا کے بڑے بڑے مذاہب کے متعلق کافی معلومات بہم پہنچ سکتی ہیں ہر شخص اس ضروری کتاب کے مطالعہ کے لئے وقت نکال سکتا ہے۔ یہ کتاب قابلِ قدر ہے حجم ۶۰ صفحات قیمت ۱۲ر مصنف سے ۲۹ ٹمپل روڈ لاہور کے پتے سے طلب فرمائیے۔

ریاضِ روح:۔ یہ حضرت روحی آمبوری کا مجموعۂ کلام ہے جو زیادہ تر حمد و نعت اور قومی نظموں پر مشتمل ہے۔ آمبور مدراس میں واقع ہے ہمیں مسرت ہے کہ ایسے دور دراز علاقوں میں بھی اردو شاعری کا یہ چرچا ہے امید ہے کہ اہلِ ذوق اس کتاب کو خرید کر روحی صاحب کی حوصلہ افزائی کریں گے حجم ۵۰ صفحات۔

پتہ:۔ مولانا محمد عزیز الدین صاحب روحی سابق منشی مدرسہ مظہر العلوم ہائی سکول سوداگر پان۔ آمبور۔ علاقہ مدراس

مخزن التاریخ / **جامع التاریخ**: یہ جناب دلدار حسین صاحب اظہر الہ آبادی کی کہی ہوئی منظوم تاریخوں کے دو مجموعے ہیں شعر اچھے ہیں حجم علی الترتیب ۶۴ و ۴۸ صفحات قیمت درج نہیں۔

پتہ:۔ جہانگیر بک ڈپو لاہور

سوگوارِ شباب: حضرت مجنوں گورکھپوری اردو کے ایک اچھے نقاد اور افسانہ نگار ہیں بقولِ خود وہ عشقیہ افسانے اس لئے لکھتے ہیں کہ عشق اپنے مرعوب کن اور پُراسرار نام کی نقاب اتار کر سیدھے سادے جنسی جذبے کی صورت میں عوام کے سامنے آجائے اسی مقصد کے لئے انھوں نے اپنے افسانے وقف کر رکھے ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس باب میں اظہارِ حقیقت نوجوانوں کے لئے کہاں تک مفید ہو سکتا ہے۔ یا یہ مقصد کہاں تک قابلِ حصول ہے لیکن بہرحال مجنوں صاحب کے افسانے دلچسپ اور ان کا اندازِ بیان دلکش ہوتا ہے۔ سوگوارِ شباب ۱۴۶ صفحات کا ایک المیہ ناول ہے جو ہارڈی سے متأثر ہو کر لکھا گیا ہے قیمت مجلد ۱؎ غیر مجلد عہ

پتہ:۔ ایوانِ اشاعت گورکھپور

اسمٰعیل بیگ محمد ہائی سکول میگزین:۔ بمبئی کے اسمٰعیل بیگ محمد ہائی سکول کا رسالہ ہے۔ اس کا ایک حصہ اردو اور ایک حصہ انگریزی مضامین کے لئے وقف ہے طلبہ کے مضامین اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں قابلِ تعریف ہیں۔ کاغذ کتابت اور تصاویر دلکش ہیں سکول کے پتے سے طلب کیجئے

حور:۔ عورتوں کے لئے یہ رسالہ ایک عرصے سے شائع ہو رہا ہے۔ محترمہ جہاں بانو بیگم نقوی ایم۔ اے اور زینب عثمانیہ صاحبہ لدھیانوی اس کی اعزازی ایڈیٹر ہیں۔ رسالے کا معیار اچھا ہے جس کے لئے محترمہ امۃ اللہ قریشی مدیرِ مسئول اور دونوں ایڈیٹر مستحق مبارکباد ہیں۔ چندہ سالانہ چار روپے۔ پتہ:۔ دفتر حور لاہور

فہرستِ مضامین

جلد ۳۹ — ہمایوں بابت ماہِ جون ۱۹۴۱ء — نمبر ۶

تصویر:- بہ امیدِ آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

چندہ سالانہ صہ ششماہی سے (مع محصول) — قیمت فی پرچہ ۸/

جہاں نما

ممالکِ عالم پر ایک سرسری نظر

سطورِ ذیل میں دنیا کے مختلف ملکوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ اگرچہ موجودہ جنگ نے بعض ملکوں کی سیاسی و جغرافیائی حالت بہت کچھ بدل دی ہے۔ مگر ممالکِ عالم کی آئندہ مستقل حیثیت کا فیصلہ اس جنگ کے خاتمہ پر ہوگا۔ سطورِ ذیل جنگ سے پہلے کی حالت کا نقشہ پیش کرتی ہیں لیکن کہیں کہیں موجودہ اہم سیاسی انقلابات کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے۔

حبشہ۔ شمالی و شرقی افریقہ کی ایک سلطنت۔ رقبہ تین لاکھ پچاس ہزار مربع میل۔ آبادی ایک کروڑ دس لاکھ۔ صدر مقام عدیس ابابا۔ اٹلی نے ۱۹۳۶ء میں اسے فتح کر لیا تھا۔ اور حبشی بادشاہ یہاں سے بھاگ گیا تھا مگر اب پھر انگریزوں کی مدد سے حبشہ میں داخل ہو کر سلطنت کی فکر کر رہا ہے۔

افغانستان ہندوستان کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ رقبہ دو لاکھ پینتالیس ہزار مربع میل۔ آبادی ایک کروڑ ۲۰ لاکھ۔ صدر مقام کابل۔ حکومت بادشاہی ہے۔ وضعِ قوانین کی ذمہ دار پارلیمنٹ ہے جو بادشاہ کے علاوہ چالیس ارکان کی ایک سینیٹ اور ایک سو بیس ارکان کی ایک منتخب قومی مجلس پر مشتمل ہے۔

البانیہ۔ یہ ایک بلقانی ریاست ہے۔ رقبہ دس ہزار چھ سو مربع میل۔ آبادی دس لاکھ تین ہزار اڑسٹھ۔ یہاں پہلے شاہ زوغو کی حکومت تھی ۱۹۳۹ء میں اٹلی نے اس پر قبضہ کر لیا۔

ارجنٹائنا جنوبی امریکا کی جمہوریہ۔ رقبہ دس لاکھ اٹھتر ہزار دو سو اٹھہتر مربع میل۔ آبادی ایک کروڑ پچیس لاکھ اکسٹھ ہزار تین سو اکسٹھ مربع میل۔ صدر مقام بوئنس ایرز۔

آسٹریلیا سلطنت برطانیہ کی نوآبادی دولتِ متحدہ۔ رقبہ تیس لاکھ مربع میل۔ آبادی چھیاسٹھ لاکھ تیس ہزار تین سو دو۔ یہ پانچواں براعظم ہے۔

آسٹریا۔ یہ یورپی جمہوریت اب جرمنی سے ملحق ہو چکی ہے۔ رقبہ ۳۲ ہزار مربع میل۔ آبادی پینسٹھ لاکھ تیس ہزار۔ صدر مقام ویئنا۔

بلجیم۔ جنگ سے پہلے یہاں انگریزی سیاست نے ایک بادشاہی قائم کر رکھی تھی اب اسے جرمنی نے فتح کر لیا ہے۔ رقبہ گیارہ ہزار سات سو باون مربع میل۔ آبادی بیاسی لاکھ تیرہ ہزار چار سو تینتالیس یہاں فی مربع میل چھ سو ستاون افراد آباد ہیں۔ یورپ کے کسی اور ملک میں اتنی گھنی آبادی نہیں۔

بھوٹان۔ یہ ایک نیم آزاد ہندوستانی ریاست ہے جس کو اندرونی معاملات میں کچھ اختیارات حاصل ہیں۔ رقبہ اٹھارہ ہزار سات سو پچاس مربع میل

صدرمقام بیناکھا۔

بولیویا۔جنوبی امریکائی جمہوریت۔رقبہ پانچ لاکھ چھ ہزار مربع میل۔آبادی اُنتیس لاکھ چوہتر ہزار نوسو۔

برازیل۔جنوبی امریکا کی سب سے بڑی ریاست۔رقبہ بتیس لاکھ پچاسی ہزار مربع میل۔آبادی چار کروڑ پندرہ لاکھ ساٹھ ہزار ایک سو سینتالیس صدر مقام ریو ڈی جنیرو۔

بلغاریہ۔بلقانی ریاست۔رقبہ انتالیس ہزار آٹھ سو اسی مربع میل۔آبادی پچپن لاکھ۔اب یہ ملک جرمنی کے ماتحت ہے۔

برما۔یہ پہلے ہندوستان میں شامل تھا لیکن گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت ۱۹۳۷ء میں ہندوستان سے الگ کردیا گیا۔اب اس کی حکومت کا ایک الگ دستورالعمل ہے۔رقبہ دولاکھ اکسٹھ ہزار چھ سودس مربع میل۔صدر مقام رنگون

کینیڈا۔شمالی امریکا کی برطانی نوآبادی۔رقبہ چھتیس لاکھ اڑتالیس ہزار پانسو مربع میل۔آبادی تناسی لاکھ اٹھاسی ہزار پانسو صدر مقام اوٹاوا۔

چلی۔شمالی امریکائی جمہوریہ۔رقبہ دو لاکھ چھیاسی ہزار تین سو بائیس مربع میل۔آبادی چالیس لاکھ گیارہ ہزار۔صدر مقام ساوانا۔

چیکوسلوویکیا۔وسطی یورپ کی وہ جمہوریہ جو گذشتہ جنگِ عظیم کے بعد پیدا ہوئی۔اس میں بعض ایسے رقبے بھی شامل کئے گئے جو پہلے آسٹریا ہنگری کی ملکیت تھے۔موجودہ جنگ میں اس ملک پر جرمنی کا قبضہ ہوگیا ہے۔رقبہ چوّن ہزار مربع میل آبادی ایک کروڑ چھیالیس لاکھ۔

ڈینزگ۔یہ شہر پرشیا کو جرمنی کے دوسرے حصوں سے ملاتا ہے۔جمعیت اقوام نے اس کو آزاد شہر قرار دے دیا تھا۔اب جرمنی نے اپنا جائز حق سمجھ کر اس پر قبضہ کرلیا ہے۔رقبہ سات سو چوّن مربع میل۔آبادی چار لاکھ دس ہزار۔

مصر۔شمالی مشرقی افریقہ کی سلطنت۔رقبہ تین لاکھ پچاسی ہزار مربع میل۔آبادی ایک کروڑ اُنسٹھ لاکھ چار ہزار پانسو پچیس۔ صدرمقام قاہرہ ۱۹۱۴ء میں برطانیہ نے مصر پر قبضہ کرلیا تھا۔۱۹۲۲ء تک یہی حالت رہی ۱۹۲۲ء میں مصریوں کی لگاتار کوششوں کے طفیل برطانیہ نے یہاں ایک بادشاہت قائم کردی لیکن پھر بھی یہاں برطانیہ کا اقتدار قائم رہا۔آجکل مصر کے انگریزی مقبوضات اٹلی اور جرمنی کے حملوں کا ہدف بن رہے ہیں۔

ڈنمارک۔شمالی یورپ کی ایک ریاست۔رقبہ سولہ ہزار پانسو ستر مربع میل۔آبادی پینتیس لاکھ۔صدر مقام کوپن ہیگن۔اس ملک پر اب جرمنی قابض ہے

ایکویڈور۔جنوبی امریکا کی جمہوریہ۔رقبہ ایک لاکھ اٹھارہ ہزار چھ سو پچیس مربع میل آبادی سولہ لاکھ۔صدر مقام کوئیٹو۔

انگلستان۔برطانیہ کلاں کا جنوبی حصہ۔رقبہ پچاس ہزار آٹھ سو چوہتر مربع میل۔آبادی تین کروڑ ستانوے لاکھ سینتالیس ہزار نوسو اکتیس صدر مقام لندن۔

ایستھونیا۔فن لینڈ کی ایک ریاست۔رقبہ اٹھارہ ہزار پانسو مربع میل۔آبادی گیارہ لاکھ سولہ ہزار پانسو صدر مقام ٹالن۔

فن لینڈ۔شمالی یورپ کی جمہوریہ۔۱۸ جولائی ۱۹۱۹ء کو اسکی آزادی کا اعلان کیا گیا۔اور اسی سال ۱۷ اکتوبر کو یہاں جمہوری حکومت قائم ہوئی۔اب روس نے اس پر قبضہ کرلیا ہے۔رقبہ ایک لاکھ چوالیس ہزار تین سو مربع میل آبادی پینتیس لاکھ اسی ہزار۔صدر مقام ہیلسنکی۔

فرانس۔مغربی یورپ کی جمہوریہ۔رقبہ دو لاکھ بارہ ہزار چھ سو ساٹھ مربع میل۔آبادی چار کروڑ اٹھارہ لاکھ چھتیس ہزار نو سو تئیس صدر مقام

پیرس۔ موجودہ جنگ میں جرمنی نے فرانس کو شکست دی ہے اور حسب منشا اس کے بیشتر حصے پر قابض ہے اب فرانس اور جرمنی میں اتحاد ہو رہا ہے۔

جرمنی۔ وسطی یورپی آمریت۔ رقبہ دو لاکھ پچیس ہزار مربع میل۔ آبادی سات کروڑ اٹھاسی لاکھ۔ آسٹریا اور سوڈیٹن لینڈ وغیرہ کے الحاق سے حال ہی میں یہ سلطنت وسیع کی گئی ہے۔ موجودہ جنگ میں جرمنی کو حیرت انگیز فتوحات حاصل ہوئی ہیں تقریباً تمام یورپ اسکی سیادت تسلیم کر چکا ہے اب صرف برطانیہ باقی رہ گیا ہے۔

یونان۔ جنوبی یورپ میں واقع ہے۔ اسے جرمنی نے فتح کر لیا ہے۔ رقبہ پچاس ہزار مربع میل۔ آبادی باسٹھ لاکھ پانچ ہزار۔

ہنگری پہلے یہ آسٹریا ہنگری کا ایک حصہ تھا اب جرمنی کے زیر نگیں ہے رقبہ پینتیس ہزار نو سو مربع میل۔ آبادی پچاسی لاکھ۔ صدر مقام بڈاپسٹ۔

آئس لینڈ شمالی بحراوقیانوس میں ایک جزیرہ ہے۔ اس پر ڈنمارک کی سیادت تھی کہا جاتا ہے اب اس پر جرمنی کا قبضہ ہے۔ رقبہ انتالیس ہزار سات سو مربع میل۔ آبادی ایک لاکھ تین ہزار دو سو سترہ۔ صدر مقام ریکجاویک۔

ہندوستان۔ یہ غلام ملک برطانی سلطنت کا اہم ترین حصہ ہے رقبہ سترہ لاکھ مربع میل سے زائد۔ آبادی پینتیس کروڑ انتیس لاکھ چھیاسی ہزار آٹھ سو چھہتر۔ دارالحکومت دہلی۔

ایران۔ رقبہ چھ لاکھ اٹھائیس ہزار مربع میل۔ آبادی ایک کروڑ۔ صدر مقام طہران۔

عراق۔ یورپین پہلے اسے میسوپوٹیمیا کہتے تھے۔ یہ عرب اور ایران کی درمیانی ریاستوں میں سے ہے۔ یہ ریاست بھی جنگ عظیم کے بعد انگریزوں نے پیدا کی۔ اب یہاں جرمنی کی مدد سے بغاوت ہو رہی ہے۔ رقبہ ایک لاکھ سولہ ہزار چھ سو مربع میل۔ آبادی تیس لاکھ۔ صدر مقام بغداد۔

اٹلی۔ رقبہ ایک لاکھ انیس ہزار مربع میل۔ آبادی چار کروڑ پچیس لاکھ ستائیس ہزار پانسو اکسٹھ۔ یہاں کی حکومت میں بادشاہ بھی موجود ہے اور ڈکٹیٹر بھی جسے عملاً بادشاہ پر فوقیت حاصل ہے۔

جاپان۔ ایشائی جزیروں کی سلطنت۔ چین اور سائبیریا کے کناروں سے پرے شمالی بحرالکاہل میں واقع ہے۔ رقبہ دو لاکھ ساٹھ ہزار مربع میل۔ آبادی چار کروڑ پچیس لاکھ ستائیس ہزار پانسو اکسٹھ صدر مقام ٹوکیو۔ شہنشاہ قانونی اور انتظامی معاملات میں اپنے وزرا اور عوام اور امرا کے نمائندوں کے مشورے سے حکومت کرتا ہے اس ملک کو موجودہ جنگ سے قبل انگریزوں کی دوستی حاصل تھی۔ اب یہ خوش قسمتی سے اس نعمت سے محروم ہے۔

لیٹویا۔ بالٹک کی جمہوریہ۔ رقبہ چالیس ہزار آٹھ سو پچاس مربع میل۔ صدر مقام ریگا۔

لکسمبرگ یہ ایک گرینڈ ڈچی تھی۔ اب جرمنی کے زیر نگیں ہے۔ اس کا رقبہ نو سو ننانوے مربع میل ہے۔

لتھوانیا۔ یہ بالٹک کی ایک ریاست ہے۔ رقبہ بیس ہزار پانسو مربع میل۔ آبادی بائیس لاکھ نوے ہزار صدر مقام کو دو نو۔

لبنان ۱۹۲۰ء میں فرانس کے ماتحت یہ "آزاد" ریاست قائم ہوئی تھی۔ صدر مقام بیروت ہے۔

مانچوکوؤ۔ رقبہ چار لاکھ ساٹھ ہزار تین سو نواسی مربع میل۔ آبادی دو کروڑ چھیانوے لاکھ چھ ہزار ایک سو ستر۔ صدر مقام سنکنگ۔

۱۹۳۲ء میں جاپان کے ماتحت یہ ریاست قائم ہوئی۔

میکسیکو۔ شمالی اور جنوبی امریکا کی جمہوریہ۔ رقبہ سات لاکھ ساٹھ ہزار تین سو مربع میل۔ آبادی ایک کروڑ نبتالیس لاکھ دس ہزار۔ صدر مقام میکسیکو شہر۔

مراکو۔ شمالی افریقہ کی اسلامی سلطنت جس پر فرانس قابض ہو چکا ہے۔ رقبہ دو لاکھ اکتیس ہزار پانسو مربع میل۔ آبادی پچاس لاکھ صدر مقام فیض۔

ہالینڈ (نیدرلینڈز) شمالی و مغربی یورپ کی یہ ریاست جرمنی کے قبضے میں آچکی ہے۔ رقبہ بارہ ہزار پانسو نوے مربع میل۔ آبادی ۸۱۲۲۲۷۰ صدر مقام اسٹرڈم

نیوفاؤنڈلینڈ۔ شمالی امریکا کی برطانوی نوآبادی۔ رقبہ بیالیس ہزار سات سو چونتیس مربع میل آبادی دو لاکھ پینسٹھ ہزار۔

نیوزیلینڈ۔ جنوبی بحر الکاہل میں برطانوی نوآبادی۔ رقبہ ایک لاکھ چار ہزار مربع میل۔ آبادی چودہ لاکھ دس ہزار۔ صدر مقام واشنگٹن۔

ناردرن آئرلینڈ۔ یہ السٹر کے نو ملکوں پر مشتمل ہے۔ اس کی ایک الگ پارلیمنٹ ہے۔ رقبہ پانچ ہزار دو سو سینتیس مربع میل صدر مقام بلفاسٹ

ناروے۔ شمالی یورپ کی مملکت۔ رقبہ ایک لاکھ چوبیس ہزار نو سو چوسٹھ مربع میل۔ آبادی اٹھائیس لاکھ۔ صدر مقام اوسلو۔ اب اس پر جرمنی کا قبضہ ہے۔

فلسطین۔ پہلے اس پر ٹرکی کی حکومت تھی جنگِ عظیم کے بعد برطانیہ اس پر قابض ہو گیا۔ رقبہ دس ہزار مربع میل۔ آبادی دس لاکھ پینتیس ہزار صدر مقام یروشلم۔

جمہوریۂ پانامہ۔ رقبہ تینتیس ہزار چھ سو ستر مربع میل۔ صدر مقام پاناما۔

پیرو۔ جنوبی امریکا کی جمہوریہ۔ رقبہ پچپن ہزار مربع میل۔ آبادی پچپن لاکھ۔ صدر مقام لیما۔

نیپال۔ ہمالیہ کے جنوبی نشیب پر واقع ایک آزاد ریاست۔ یہ ہندوؤں کی تنہا خود مختار مملکت ہے۔ رقبہ چوّن ہزار مربع میل۔ آبادی چپّن لاکھ انتالیس ہزار بانوے۔ صدر مقام کھٹمنڈو۔ اگرچہ یہاں بادشاہ ہے مگر حقیقی حاکم کمانڈر انچیف ہے۔

پولینڈ۔ موجودہ جنگ سے پہلے مشرقی یورپ کا آزاد ملک سمجھا جاتا تھا۔ اب اس پر جرمنی اور روس کا قبضہ ہے۔ رقبہ ایک لاکھ پچاس ہزار مربع میل۔ آبادی تین کروڑ تیس لاکھ سینتالیس ہزار تین سو۔ صدر مقام وارسا۔

پرتگال۔ جنوبی مغربی یورپ کی جمہوریہ۔ رقبہ پینتالیس ہزار چار سو نوے مربع میل۔ آبادی ایک کروڑ پچاس لاکھ۔ صدر مقام لزبن۔

رومانیہ۔ جنوبی و مغربی یورپ کی خود مختار مملکت۔ اب یہ جرمنی کے زیرِ اثر ہے۔ رقبہ ایک لاکھ بائیس ہزار دو سو بیاسی مربع میل۔ آبادی ایک کروڑ چوہتر لاکھ۔ صدر مقام بخارسٹ۔

سوویٹ روس۔ یہ مختلف روسی جمہوریتوں کے اتحاد سے بنا ہے۔ اس کا صدر مقام ماسکو ہے رقبہ اکیاسی لاکھ پچاس ہزار مربع میل۔ آبادی سولہ کروڑ اسی لاکھ۔

سیلویڈار۔ وسطی امریکا کی جمہوریت۔ رقبہ تیرہ ہزار ایک سو تراسی مربع میل۔ آبادی سترہ لاکھ۔ صدر مقام سان سیلویڈار۔

سان میرینو۔ یہ اڑتیس مربع میل کے رقبہ کی ایک جمہوریت ہے۔ آبادی تیرہ ہزار نو سو اڑتالیس مربع میل۔ یہ ایپے نائنز (اٹلی) میں واقع ہے اسے یورپ کی سب سے قدیم سلطنت ہونیکا دعویٰ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد چوتھی صدی عیسوی میں پڑی تھی۔

سکاٹ لینڈ۔ یہ برطانیہ کلاں کا شمالی حصہ ہے۔ رقبہ تیس ہزار چار سو ساٹھ مربع میل۔ آبادی اڑتالیس لاکھ سینتالیس ہزار پانسو چون۔ صدر مقام ایڈنبرا۔

سیام۔ جنوبی مشرقی ایشیائی سلطنت۔ رقبہ دو لاکھ ایک سو پچاس مربع میل۔ آبادی ایک کروڑ۔ صدر مقام بینکوک ۱۹۳۲ء میں یہاں آئینی بادشاہت اور پارلیمنٹ قائم ہوئی۔ اب اسے تھائی لینڈ کہتے ہیں۔

جنوبی افریقہ کی یونین۔ یہ برطانی نو آبادی ہے۔ رقبہ چار لاکھ بہتر ہزار تین سو پچاس مربع میل۔ آبادی بہتر لاکھ۔ صدر مقام کیپ ٹاؤن اور پریٹوریا۔

سپین۔ جنوبی مغربی یورپ کی جمہوریت۔ رقبہ ایک لاکھ چورانوے ہزار مربع میل۔ آبادی دو کروڑ اٹھائیس لاکھ۔ صدر مقام میڈرڈ۔ پہلے یہاں بادشاہی حکومت تھی ۱۹۳۱ء میں جمہوریت بنی۔

سعودی عرب۔ اس میں حجاز اور نجد شامل ہے۔ یہ انگریزوں کے زیر اثر ایک خود مختار سلطنت ہے۔ صدر مقام مکہ اور ریاض۔

سویڈن۔ شمالی یورپ کی ایک مملکت۔ رقبہ ایک لاکھ تہتر ہزار ایک سو پچاس مربع میل۔ آبادی ساٹھ لاکھ۔ صدر مقام سٹاک ہالم۔ بادشاہت آئینی ہے۔

شام اور لبنان۔ فرانسیسی قبضہ میں ہیں۔ رقبہ ستاون ہزار نو سو مربع میل شام کا صدر مقام دمشق۔ لبنان کا صدر مقام بیروت۔ جنگ عظیم سے پہلے یہاں ترکی کی حکومت تھی۔ اتحادیوں نے معاہدہ سیورے کی رو سے ۱۹۲۰ء میں انہیں خود مختار قرار دیکر فرانس کے حوالے کر دیا۔

سوئٹزرلینڈ۔ یورپ وفاقی ریاست۔ رقبہ پندرہ ہزار نو سو اسی مربع میل۔ آبادی چالیس لاکھ۔ صدر مقام برن۔

ٹرکی۔ یورپ اور ایشیا کی جمہوریت۔ رقبہ دو لاکھ چورانے ہزار چار سو بانوے مربع میل۔ آبادی ایک کروڑ اکسٹھ لاکھ اٹھاون ہزار دس۔ صدر مقام انقرہ۔

ریاستہائے متحدہ امریکا۔ شمالی امریکا کی وفاقی جمہوریت۔ رقبہ تینتیس لاکھ پچاس ہزار مربع میل۔ آبادی بارہ کروڑ ستائیس لاکھ چھہتر ہزار۔ صدر مقام نیویارک۔

یوروگوئے۔ جنوبی امریکا کی جمہوریت۔ رقبہ بہتر ہزار ایک سو پچاس مربع میل۔ آبادی اٹھارہ لاکھ۔ صدر مقام مونٹی وڈیو۔ یہ جنوبی امریکا کی سب سے چھوٹی جمہوریت ہے۔

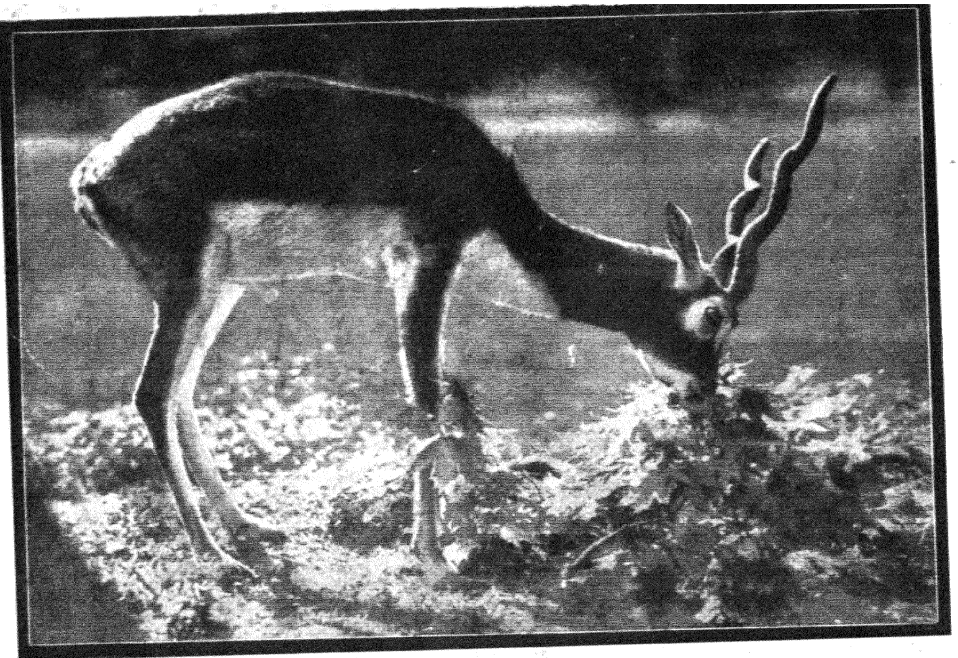
ویٹیکن سٹی۔ روم میں ایک نئی ریاست جس پر پوپ کو پورے اختیارات حاصل ہیں۔ رقبہ ایک سو آٹھ ایکڑ آبادی آٹھ سو۔

وینزویلا۔ جنوبی امریکا کی جمہوریہ۔ رقبہ چار لاکھ مربع میل۔ آبادی تیس لاکھ پچپن ہزار۔ صدر مقام کاراکاس۔

ویلز۔ برطانیہ کلاں کا ایک حصہ۔ رقبہ سات ہزار چار سو پچاس مربع میل۔

یوگوسلافیا۔ گذشتہ جنگ عظیم کے بعد آسٹریا اور بلغاریہ سے کچھ علاقے لے کر یہ سلطنت بنائی گئی تھی۔ اب اس پر جرمنی کا قبضہ ہے۔ رقبہ چھیانوے ہزار ایک سو پچاس مربع میل آبادی ایک کروڑ بیس لاکھ۔ صدر مقام بلغراد۔

(ماخوذ) حامد علی خاں



بہ اُمید آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

غزل

والاشان شہزادہ نوّاب معظم جاہ بہادر شجیع حیدرآباد (دکن)

دے کے دل جان دیئے جاتے ہیں
ہم تو اپنی سی کئے جاتے ہیں

دل جو روتا ہے محبّت میں کبھی
خون کے گھونٹ پیئے جاتے ہیں

زندگی کٹ گئی آہیں کرتے
زخمِ دل آج سئے جاتے ہیں

تم بھی انجام وفا کو رولو
آج ہم ساتھ لئے جاتے ہیں

یہ خلاصہ ہے محبّت کا شجیع
زندگی ہے تو جئے جاتے ہیں

دیال باغ

اس[1] ماہ کے آغاز میں بھوپال کے مشہور نوخیز اور اعلیٰ تعلیم یافتہ درویش۔ اعلیٰ حضرت شہزادہ قدسی مدظلہٗ العالی کی خدمت میں حاضری دینے کے لئے میں دہلی گیا تھا جہاں ممدوح بیمار تھے اور خواجہ حسن نظامی صاحب کے ایمان خانے میں فروکش۔ ممدوح کا خیال ایک عرصۂ دراز سے یہ رہا ہے کہ ایک اسلامی نوآبادی قائم کی جائے جس میں ایک جامعۂ اسلامیہ بھی ہو جو عثمانیہ یونیورسٹی سے ملحق رہے لیکن شہروں کی مصنوعی زندگی سے دور کسی خوش منظر صحرا میں اس کا قیام عمل میں آئے۔ لیکن اب تک یہ خیال شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا کیونکہ اکناف ہند کی سیاحت فرمانے کے بعد اب آنحضرت آپ صوبجاتِ متوسط کا دورہ فرمانے والے ہیں اور بعد ازاں موزوں مقام پر اپنی جامعہ اور اپنی نوآبادی کا سنگِ بنیاد رکھیں گے۔ اسی سلسلے میں مجھے حکم ہوا تھا کہ واپسی کے وقت آگرہ اتروں اور دیال باغ کو بنظرِ غائر دیکھوں چنانچہ واپس آتے وقت آگرہ اتر کر دیال باغ دیکھنے گیا تھا +

دیال باغ کے بانی

صبح سویرے ان کے ہفتہ وار اخبار پریم پرچارک کے ایڈیٹر پروفیسر ہرچرن لال ایم۔ اے کے مکان پر میں نے حاضری دی۔ ایک سادگی پسند دبلا پتلا انسان جو سادہ لباس پہنے ہوئے تھا سادہ مگر صاف ستھرے مکان سے برآمد ہوا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر مسکراتے ہوئے سلام کیا۔ یہی تھے پروفیسر ہرچرن لال۔ پندرہ منٹ تک ہم دونوں ایک سادہ چارپائی پر بیٹھ کر بات چیت کرتے رہے پھر وہ اندر گئے اور اپنا کوٹ پہنکر میرے ہمراہ روانہ ہوئے۔ وہ ایک نہ تھکنے والے آدمی کی طرح مستعدی سے تین گھنٹے تک میرے ساتھ رہے۔ جتنی دلچسپی اور مستعدی سے میں سوال کرتا تھا اتنی ہی وضاحت سے وہ بلا اکراہ مجھے جواب دیتے۔ وہاں کی ایک ایک عمارت، ایک ایک ادارہ، کارخانے، ڈیری فارم، عبادت گاہ گودام، نہر، باغات۔ سب دکھاتے اور سمجھاتے تھے۔ وہاں کے ہر ایک کارخانہ اور ادارے کے منتظمین سے میرا تعارف کراتے تھے اور ان سے اجازت حاصل کرنے کے بعد اندر کی سیر کراتے تھے۔ اس موقع پر خود مہتمم صاحبان یا ان کے اسٹاف کا ذمہ دار رکن سمجھانے اور صراحت کرنے کے لئے موجود رہتا تھا۔

تسلیم کرنا چاہیئے کہ دیال باغ ایسی نوآبادی ہے جس کی نظیر ہندوستان کیا تمام ایشیا میں نہیں ملے گی۔ اس کے بانی ان کے سب سے پہلے گرو رادھا سوامی تھے جنہیں ان کے ہاں عرفِ عام میں سرکار صاحب کہتے ہیں۔ یہ غازی پور کے رہنے والے تھے۔ ان کے معتقد حضور مہاراج تھے جو پوسٹ ماسٹر جنرل رہ چکے تھے اور اپنے گرو کی پالکی کو اپنے کندھوں پر رکھ کر جا بجا لئے پھرتے تھے۔ وہ سب سے پہلی مرتبہ اپنے حضور مہاراج کو ان کے ایما کے مطابق اس جگہ لائے تھے جہاں آج دیال باغ کی جدید

[1] فروری ۱۹۴۱ء

نمونے کی صنعتی اور روحانی بستی بسی ہے، جس میں چھ ہزار آدمی نمونے کی سادہ، پاک، روحانی اور صنعتی اور عملی زندگی گزار رہے ہیں جمنا ندی کے کنارے پر جہاں پہلے گھنا جنگل تھا۔ چیتے اور جنگلی جانور رہتے تھے وہاں آج انجن ہیں، کلیں ہیں، صاف ستھری سڑکیں ہیں، باغات ہیں۔ مکانات ہیں، اور چھ ہزار ہم خیال، ہم عقیدہ آدمی ہیں۔

اس دن جب کہ میں وہاں موجود تھا شہتوت کے اس درخت پر برقی قمقموں کو آویزاں کیا جا رہا تھا جس کے نیچے بیٹھ کر ان کے سرکار صاحب نے اطمینان کا سانس لیا تھا اور اسی کے نیچے بیٹھ کر پاس کی ایک قدیم ترین باؤلی سے پانی منگا کر پیا تھا جو شہنشاہ اکبر سے منسوب کی جاتی ہے اور پھر اپنے ارادت مند پوسٹ ماسٹر جنرل کو ہدایت کی تھی کہ اسی جگہ ہماری سادھی بنا دو۔ اسی جگہ تم دیکھو گے کہ زبردست آبادی ہو جائے گی، کارخانوں کی چمنیوں سے دھوئیں کے بادل اٹھا کریں گے، کلیں جاری ہوں گی صنعتیں زندہ کی جائیں گی اور پھر تمام ہندوستان اسی خاص جگہ کے سامنے عقیدت اور احترام سے اپنی گردن خم کر دے گا۔ یہ تھی پیشینگوئی جو اس فرقے کے رب سے پہلے گرونے کی تھی۔ ان میں روحانیت تھی۔ اور پیش بینی کی قوت۔

ان کا عقیدہ

میں نے پروفیسر ہرچرن لال سے کہا کہ آپ کی تحریک اشتراکیت کا پہلو لئے ہوئے ہے اور بولشویت کے بالکل قریب ہے کیونکہ آپ لوگ ہیئت اجتماعیہ کو ایک ہی سرحد پر کھڑا کرنا چاہتے ہیں اور دولت کی مساویانہ تقسیم کے اصول پر کاربند ہیں۔ دبلے پروفیسر نے احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ ہم اشتراکی اور بولشویک نہیں ہیں، نہ ہم دولت کی مساویانہ تقسیم پر کاربند ہیں جو لوگ یہاں آباد ہیں ان کے لئے میدانِ عمل موجود ہے، وہ اپنی سرگرمی اور جدو جہد سے جتنا رزق کما سکتے ہوں کمائیں۔ البتہ ان کی سہولت کے لئے ہم نے مصنوعات کی فروخت اور ان کی محنتوں کا ثمرہ انہیں تقسیم کر دینے کا کام اپنے ہاتھوں میں لے رکھا ہے ہم ان کی عبادت گاہ دیکھنے گئے جو ایک وسیع ہال کی شکل میں ہے اسے دو حصّوں میں تقسیم کرنے کے لئے بیچ میں پردہ جو قدِ آدم سے کچھ زیادہ ہے ایستادہ کیا گیا ہے۔ پردے دار حصّے میں خواتین قریبہ جمع ہو جاتی ہیں اور کھلے حصّے میں مرد۔ ان کے موجودہ گرو صبح اور شام کو چند گیتوں کے بعد اپنی تقریر کرتے ہیں پروفیسر صاحب نے مجھے بتایا کہ نہ یہاں مسجد ہے نہ مندر ہے، نہ گرجا، نہ شوالہ بس یہی ایک ہال ہے جسے آپ عبادت گاہ سے تعبیر کیجئے اور یہاں دن نکلنے کے وقت سب کا آجانا لازمی ہے۔ اور دن ختم کر کے یہاں آنا لازمی ہے، وہ کہنے لگے کہ اس طرح ہم خدا کے نام کے ساتھ اپنا دن نکالتے ہیں خدا کے نام کے ساتھ دن ختم ہے۔

ان کے عقائد میں (۱) رادھا سوامی ایک خاص طاقت ہے اسے ماننا چاہیئے (۲) تمام مسکرات سے پرہیز رکھنا چاہیئے (۳) گوشت سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ حق حلال کی روزی اپنے ہاتھوں کو کام میں لا کر حاصل کر کے اس پر قناعت کرنا چاہیئے۔

مسکرات اور گوشت کی نسبت پروفیسر ہرچرن لال صاحب نے بتایا کہ ممکن ہے کہ یہ چیزیں جسمانی طاقت پیدا کر دیں۔ لیکن چونکہ ہمارا مطمحِ نظر خالص روحانیات ہے لہذا روحانی ارتقا کے لئے غیر مفید ہیں چنانچہ خود آپ کے ہاں چلّہ کشی کے وقت ترکِ حیوانات کی ہدایت کی جاتی ہے۔ میں نے مناسب نہ سمجھا کہ اس پر ان سے بحث کروں اور انہیں سمجھاؤں کہ لوگ جو دودھ، دہی اور گھی کھاتے ہیں، سائنس کے جدید نظریات کے اعتبار سے وہ خون اور گوشت ہی سے بنتے ہیں بہرحال ہمیں ان کے عقائد سے بحث نہیں ہے۔ پروفیسر ہرچرن لال نے یہ بھی بتایا کہ ہمارا عقیدہ تمام عالم کے اکابر اور بزرگوں کی عظمت کا اعتراف ہے اور ان کے اقوال سے ہم فائدہ اٹھاتے ہیں چنانچہ دیوانِ حافظ، مثنوی مولانا روم، اور صوفی سرمد کا کلام بھی ہمارے پروگرام میں ہمیشہ بہترین جگہ پاتا ہے۔

لیگ آف سروس

مجھے تعجب تھا کہ پروفیسر ہرچرن لال، کالج میں درس دینے کے ساتھ ہی ساتھ اخبار پریم پرچارک کے تین ایڈیشن یعنی اُردو، ہندی، اور انگریزی کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ دیال باغ والوں کی ایک لیگ آف سروس (انجمنِ خدام) ہے۔ وہ بھی اس لیگ کے ممبر ہیں۔ ہر ممبر کے لئے لازم ہے کہ جہاں بھیجا جائے وہ جائے اور اسے جو کام کہا جائے بطیبِ خاطر انجام دے۔ اس لیگ کے ممبر اگر ادائے فرض کے دوران میں مر جائیں تو ان کے ورثا کو پنشن ملا کرتی ہے۔ وہاں کے سب کارکن لیگ آف سروس کے رکن ہیں اور ان سے اس لیگ کے اغراض کی نسبت پہلے ہی حلف نامہ لے لیا جاتا ہے۔ لیگ آف سروس کے ممبروں کی زیادہ سے زیادہ تنخواہ ڈیڑھ سو روپے ماہانہ ہوتی ہے۔ چنانچہ وہاں کے پروفیسر، پرنسپل، منیجر، انسپکٹر، کلرک، پولیسین، پوسٹ ماسٹر، انجینئر، وغیرہ سب اس لیگ کے ممبر ہیں، اور اس کے اقتدار کے ماتحت کام کرتے ہیں۔

کوتوالی اور جرائم

ان کی نجی کوتوالی، ڈاک خانہ، اور میونسپلٹی ہے۔ پولیس کی وردی یو۔پی میں خاکی یونیفارم اور سرخ صافہ ہوتی ہے۔ دیال باغ کی نجی پولیس کا خاکی یونیفارم اور خاکی صافہ ہے۔ جب میں نے جرائم کی نسبت وہاں جا کر چارٹ دیکھے اور استفسار کیا تو حیرت ہوئی کہ نہ وہاں قتل ہوتے ہیں نہ ڈکیتی، نہ مار پیٹ، نہ دست اندازی پولیس کے دیگر جرائم فہرست میں ہر جگہ ہر سال کی نسبت صفر ہی لگا رہتا ہے، البتہ باہر کے جو خانگی ملازم رکھے جاتے ہیں وہ کبھی کبھی معمولی سرقے کے جرم کا ارتکاب کر کے فرار ہو جاتے ہیں جرائم کو پوشیدہ نہیں رکھا جاتا۔ بلکہ بقول ہرچرن لال صاحب چونکہ تمام آبادی ہم خیال، ہم مشرب، فارغ البال اور باکار ہے اس لئے جرائم سرے سے معرضِ ظہور ہی میں نہیں آتے۔ اس معاملے میں خاص کر دیال باغ قابلِ تحسین ہے۔

وہاں کے پولیس والے باقاعدہ ڈریس لگائے رہتے ہیں مستعدی سے اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف نظر آتے ہیں۔ یہ پولیس چوکیوں پر باقاعدہ گھنٹہ بھی بجتا ہے۔

دیال باغ بینک

اس بینک میں وہاں کے تمام رہنے والوں کو اپنا حساب رکھنا پڑتا ہے۔ اور بینک کی حالت بہت اچھی ہے۔ کیونکہ ایک خاص تحریک اور وہاں شروع کی گئی ہے کہ مختلف حصص ہند میں ان کے ایک سو اسٹور کھل چکے ہیں اور کھلنے جا رہے ہیں۔ ان اسٹوروں میں دیال باغ کی ساختہ مصنوعات فروخت ہوتی ہیں، نہ محض یہ بلکہ ملکی صنعتوں کو اپنانے کا کام بھی بڑی سرگرمی سے اس بینک کے ذریعہ جاری ہے چنانچہ فیروز آباد چوڑیاں بنانے کا مرکز ہے، دیال باغ بینک نے وہاں کے کارخانوں اور وہاں کے صناعوں کو زرِ امداد دے کر چوڑیوں کے کاروبار پر اپنا تصرف جما لیا ہے اور اپنے مقامی اسٹور کے ذریعہ چوڑیاں بنا کر اور بنوا کر تمام دیگر اسٹوروں کے ذریعہ بیچنا شروع کیا ہے اور اس طریقے سے فیروز آباد کی چوڑیوں کی صنعت پر قبضہ کر لیا ہے۔ ان کا منتہائے مقصود ہے کہ آئندہ بتدریج وہ تمام ہندوستانی صنعتوں پر اپنا اقتدار قائم کر لیں۔

مکانات و دفاتر

آبادی کئی محلوں میں تقسیم ہے۔ اور ہر محلے کو نگر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے مثلاً "پریم نگر" وغیرہ ہر نگر میں مقررہ رقم لگا کر مکان بنوا دیئے جاتے ہیں۔ مکانات کا نقشہ ان کی "پلاننگ کمیٹی" تجویز و منظور کرتی ہے جتنے دن تک صاحبِ مکان رہنا چاہیں رہیں ورنہ اپنے مکان کی لاگت کی رقم لے کر بحقِ صاحب جی مہاراج اس سے دست بردار ہو جانا پڑتا ہے۔

ہر مکان میں برقی روشنی کا انتظام ہے۔ ٹیلیفون ان کا نجی ہے، جو ہر جگہ موجود ہے۔ تمام دفاتر اور مکانات میں جو دیوار گیر گھڑیاں لگی ہیں وہ سب برق کی حکمبردار ہیں اور برق کے ذریعہ چلتی ہیں۔ نہ انہیں چابی دینے کی ضرورت ہے، نہ کانٹے گھمانے کی حاجت۔ اچھی قسم کے مکانات کے ساتھ چھوٹے چھوٹے چمن بھی ہیں ؛

مکانات کے علاوہ ان کے دفاتر بہت عالی شان ہیں، سکرٹریٹ آفس ہے۔ کابینہ کے مہتمم کا دفتر ہے، انتظامیہ کمیٹی کا دفتر ہے، اور اسی طرح تمام صیغوں کے افسروں کے دفاتر ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیال کے رقبے میں ایک چھوٹی سی ہم خیال انسانوں کی حکومت قائم ہے، جہاں اسی کا راج ہے، جہاں انسان اس زریں مقولے کو عملی طور پر برتتا ہے اور دنیا کو سبق دیتا ہے کہ "بنی آدم اعضائے یک دیگر اند"

تعلیمی ادارے

دیال باغ میں درجۂ دوم تک کنڈر گارٹن کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے بعد پرائمری، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے بندوبست ہے۔ اس کے علاوہ لیگ آف سروس کے ارکان کا ایک ٹکنیکل کالج ہے جہاں حرفتی تعلیم دی جاتی ہے بلکہ نئی درسگاہ اور قائم ہوئی ہے جسے انسپکٹرز ٹریننگ اسکول کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ان مختلف اسٹوروں کے لئے جن کی تعداد سو تک پہنچ چکی ہے اور جو اطرافِ ہند میں پھیلے ہیں قابل کارکن، کنوسیر اور

فرنیچر تیار کیے جائیں۔ نیز مزید اسٹور جہاں جہاں کھلیں ان کے لئے امیدوار تیار رہوں ۔

ایڈ منسٹریٹر صاحب نے مجھے بتایا کہ اب ہم لوگوں کو مکانات کے متعلق بڑی مشکلات پیش آ رہی ہیں کیونکہ یہاں کی تعلیمی حیثیت کو ملحوظ رکھکر بڑے بڑے لوگ اپنے بچوں کے مستقبل کے فکر میں یہاں مکان بنا کر رہنا چاہتے ہیں اور تعلیمی سہولتوں سے مستفید ہونا چاہتے ہیں ۔

صبح کے وقت جب میں وہاں پہنچ رہا تھا دیال باغ کے نظر آنے والے حدود میں طلبہ اور چھوٹی طالبات اپنے اپنے حلقوں میں مختلف قسم کی ورزشوں اور کھیل کود میں مصروف تھیں۔ وہ سب بے حد خوش دل تھے اور ان کی جسمانی صحت عمدہ نظر آتی تھی ۔

وہاں کا ایک وسیع ہال جسے ایجوکیشن انسٹی ٹیوٹ ہال کہتے ہیں بالکل سادہ عمارت ہے۔ اس میں فرش بچھا ہے۔ اور ڈیسک بھی رکھے ہیں۔ دیواروں پر اس نوآبادی کے بانیوں کی مقدس تصاویر آویزاں ہیں۔ دیواروں پر ایک جانب مشہور فلسفی رسکن کے اقوال لکھے ہیں۔ اور ان کے مقابلے میں دیال باغ کے بانی کے اقوال درج ہیں چنانچہ یہ تقابل خالی از دلچسپی

رسکن	سوامی جی
وفاداری	انصاف
انکسار	حوصلہ
حسن	اعتدال
فرض	خردمندی

ممکن ہے کہ سوامی جی کے اقوال ایک قسم کی ایزادیوں مثلاً جہاں رسکن کہتا ہے وفاداری تو سوامی جی نے کہا ہو۔ وفاداری انصاف کے ساتھ" وقس علی ہذا بہر حال وہاں کے علمی ادارے درس و تدریس کے کارہائے اہم کے ساتھ ایک نئی امت بنا رہے ہیں جو ہندوستان کی تعمیر جدید میں کارآمد ثابت ہو گی ۔

صنعتیں اور کارخانے

وہاں لوہے کی فاؤنڈری ہے فولاد اور لوہے کے چمکدار سائنٹیفک اور طبی آلات بنانے کے کارخانے ہیں۔ گراموفون اور دیگر مشینری بنانے کے کارخانے، اور بٹن، پنسل ہولڈر، اور اسٹیشنری کا سامان بنانے کے کارخانے ہیں۔ ایڈمنسٹریٹر صاحب پریم پرچارک نے بیان کیا کہ جنگ عظیم کے دوران ہیں ہمیں چمڑے کے بٹن بنانے کا زبردست فوجی آرڈر ملا تھا جس کے طفیل ہم نے پچاس ہزار روپے کا منافع حاصل کیا تھا۔ اور اس وقت سے ہماری ترقی کے دروازے مفتوح

ہوئے۔ انہوں نے منجملہ اور کارخانوں کے فاؤنٹین پن بنانے کے کارخانے کا ذکر بھی کیا۔ مگر اسے بتانے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ ان لوگوں کی پوشیدہ صنعت ہے۔ اسی طرح چمڑے کی ٹینری میں دباغت کا کام ہوتا ہے، پھر اعلیٰ قسم کا چرمی سامان اور جوتے۔ سوٹ کیس اور طرح طرح کے بکس تیار ہوتے ہیں جو کاریگری کے بے مثال نمونے کہلانے کے مستحق ہیں۔ ریشمی اور اونی پارچہ بافی، سوتی پارچے ساڑھیاں اور اچھی قسم کے کپڑے کے کارخانے اگرچہ بہت چھوٹی چھوٹی عمارتوں میں قائم ہیں لیکن قابلِ دید ہیں۔ اور ان میں بننے والا کپڑا ہماری تعریف کا استحقاق رکھتا ہے۔ ان کارخانوں کا نام اور ان کا کام ماڈل انڈسٹریز لمیٹیڈ کے نام سے موسوم ہے۔ موزے اور بنیان بننے کا کام بھی بہت اچھا ہوتا ہے، اور جب پروفیسر ہرچرن لال مجھے ان مصنوعات کے شوروم میں لے گئے جہاں تمام ساختہ اشیاء کے نمونے باقاعدہ کانچ کی الماریوں اور کیسوں میں لگے ہیں تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں یورپ کے کسی بڑے شہر کے کسی بڑے تاجر کی دکان میں مختلف چیزوں کی زیبائش کا مشاہدہ کر رہا ہوں۔ چونکہ انہوں نے فاؤنٹین پن کا کارخانہ دکھانے سے انکار کیا تھا اس لئے قدرۃً مجھے سب سے پہلے ان کے ہاں کے فاؤنٹین پن دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ میں نے ان کی اس مرموز صنعت کاری کو دیکھ کر بے حد تعریف کی یعنی یقین نہیں ہوتا تھا کہ ہم اس وقت دیال باغ میں ہیں جو آگرہ جیسی غلیظ، تنگ راستوں اور سڑکوں پر گندے اور خنازیر اور غلاظت کے انبار والی سرزمین میں واقع ہے وہ شہر جہاں عام گزرگاہوں پر بھی بوسیدگی اس پھوس کے جھونپڑے نظر آتے ہیں، جہاں قدم قدم پر افلاس اپنی بھیانک صورت میں نظر آتا ہے، جسے اگر فردوس بریں کہہ کر عزیز لکھنوی نے یاد کیا ہے تو محض تاج محل، اور اعتماد الدولہ اور سکندرہ اور فتح پور سیکری، اور قلعۂ اکبری کے سبب سے یاد کیا ہوگا۔ مجھ سے جیسے نو وارد کو جو نئی دہلی کی باعظمت اور جدید آبادی سے لوٹ کر آ دھمکا ہو، آگرہ کبھی نہیں جچ سکتا۔ اسی آگرے سے صرف چار میل کے فاصلے پر صاف اور جدید نمونے کے گاؤں کے باشندوں نے پارکر، سوان، راجا، اور ٹرانسو ٹینک، والوں کے ہم پلہ تین روپے سے لے کر تیس روپے تک کے نہایت دیدہ زیب، کارآمد، فاؤنٹین پن بنائے ہیں۔

ایڈیٹر پریم پرچارک نے یہ بھی بتایا کہ آج کل چونکہ ہمیں فوجی ضروریات کے لئے موزہ بافی کا بہت بڑا آرڈر ملا ہے اس لئے تمام آبادی کا نصفِ بہتر بالخصوص اس کی تکمیل میں مصروفِ عمل ہے چنانچہ خواتین ایک جگہ جمع ہو کر اس کام کو انجام دے رہی ہیں، اور بچے والیاں اپنے اپنے گھروں میں کام کر رہی ہیں، انہیں دس سے لے کر بیس روپے ماہانہ کی آمدنی ہونے لگی ہے اس واسطے وہ گھر کے کام دھندوں، اور پکانے ریندھنے کے لئے نوکر رکھ لینا پسند کرتی ہیں، اور خود موزہ بافی سے پیسہ کما رہی ہیں۔

دیال باغ میں مسلمانوں کے پچاس خاندان آباد ہیں اور وہ سب صنعتی اداروں سے اپنا رزق کماتے ہیں۔

ڈیری فارم

یہ وہی ڈیری فارم ہے جس کا افتتاح ملک کے سربرآوردہ اصحاب کی موجودگی میں کئی سال ہوئے سر مالکم ہیلی اس زمانے کے گورنر صوبجاتِ متحدہ نے ایک سو فٹ طویل اور پچاس فٹ عریض حوض میں جو صرف دودھ ہی دودھ سے بھرا گیا تھا اور

جس میں طلائی و نقرئی فوّارہ لگایا گیا تھا۔ فوارے کو سونے کی کنجی سے کھول کر کیا تھا اور کہا تھا کہ ایشیا بھر میں اتنا بڑا دودھ اور مکھن کا کارخانہ نہیں ہے، وہ حوض اب بھی موجود ہے، مگر اسے لڑکوں کے تیرنے کا مصنوعی تالاب بنا دیا گیا ہے۔ امریکہ کا ایک سانڈ ہم نے دیکھا جس کا کوہان ایک طرف لٹک گیا تھا اور یہ سیاہ فام عجیب و غریب جانور اپنی نوعیت میں یکتا پایا۔ ایڈیٹر پریم پرچارک نے کہا کہ ہم نے اس سانڈ کے ذریعے سے جو نسل کشی کی ہے وہ ایک جدید نسل ہے، اور اس نسل کی گائیں بیس سیر یومیہ دودھ دیتی ہیں یہ کارخانہ کنٹی میل کے احاطے میں ہے، جس طویل سائبان میں مویشی باندھے جاتے ہیں، اس کے بالکل بیچ میں ریل کی پٹری بچھائی گئی ہے۔ اور چھوٹی سی ریل گاڑی مویشیوں کے واسطے چارہ دانہ اور پانی لاکر ان کے برتنوں میں بھرتی ہے اور گوبر وغیرہ صاف کرکے لے جاتی ہے جمنا کی سرکاری نہر سے ایک شاخ لے کر اپنی خاص نہر نکالی گئی ہے اس کا جال میلوں تک پھیلایا گیا ہے جہاں مویشیوں کے واسطے اناج، سبزیاں اور گھاس اُگائی جاتی ہے۔ انہوں نے ایک گھاس دکھائی جس کا تخم افریقہ سے منگایا گیا ہے کالے افریقہ کی یہ سیاہی مائل گھاس سال بھر برابر سرسبز و شاداب رہتی ہے اور جانور اسے بڑی رغبت سے کھاتے ہیں ۔

فی الحال ساٹھ من دودھ روزانہ ہوتا ہے۔ دودھ کی مشینری ایک عظیم الشان عمارت میں واقع ہے، اسی عمارت میں اربابِ انتظام اور عملے کے خوبصورت، کشادہ اور شفاف فرش والے دفاتر ہیں بجلی کے ذریعہ سب کام ہوتا ہے، اور مشہور فقرہ "ہاتھ سے چھوا نہیں گیا" وہاں صادق آتا ہے۔ سفید اینیمل کی بہت بڑی بڑی ٹنکیوں میں دودھ ڈالا جاتا ہے۔ نلوں کے ذریعہ چھن چھن کر دوسری ٹنکیوں میں پہنچتا ہے، وہاں سے منتقل ہو کر گرم ٹنکیوں میں جاتا ہے جہاں اندر کچھ ایسے پرزے لگے ہیں کہ گرم ہونے کے دوران میں دودھ ہلتا رہے تاکہ اس پر بالائی نہ جمنے پائے نہ اندر بالائی کے ذرّات دودھ سے الگ ہوسکیں اس کے بعد نلوں ہی کے توسط سے بالاخانے پر دودھ جاتا ہے اور ریفریجیٹر ٹینکوں میں سرد کیا جاتا ہے، پھر دوسرے کمروں میں منتقل ہو کر یا تو کریم الگ ہوتی ہے یا ان بوتلوں میں دودھ خود بخود بھر جاتا ہے جو طول طویل پٹے پر قطار در قطار رکھی رہتی ہیں، اور سر بمہر ہو جاتی ہیں۔ اس دودھ خانے میں صفائی کا معقول بندوبست ہے۔ کیا مجال ایک کیڑا ایک مکھی وہاں نظر آئے ۔

قومی لباس

آخر میں ہم پریم پرچارک کے چھوٹے سے دفتر میں واپس آئے۔ ایڈیٹر صاحب نے "کچھ جل پان کئے بغیر جانے نہ دوں گا" کہہ کر پستے کی قلاقند، برفی، حلوا، اور دال موٹ منگائی اور مسکرا کر فرمانے لگے کہ "لکھنوی نزاکت کی امید نہیں رکھتا ہوں" جس پر ان کے ایک نوجوان معاون مدیر صاحبزادے، اور لکھنؤ کے باشندے ان کے کاتب مسکرانے لگے میں نے کہا آپ اطمینان رکھئے لکھنؤ ہمارے جبل پور سے بمقابلہ آگرہ نزدیک نہیں ہے۔

اس اثنا میں میں نے ان سے اظہار رائے کیا کہ آپ کے دیال باغ میں ایک بات کی کمی ہے اور امید ہے کہ یہ پوری ہو جائیگی آپ ہندوستان میں صنعتی اور معاشرتی انقلاب پیدا کرنے کے درپے ہیں اس لئے قومی لباس کی طرف بھی آپ کو متوجہ ہونا چاہیئے۔ آپکے

دیال باغ میں کم ازکم ایک قومی لباس ہونا چاہیئے جو سر دست نہیں ہے۔ وہ پوچھنے لگے کہ قومی لباس کیا ہونا چاہیئے۔ میں نے بتایا کہ ساری اور بلاؤز کو ہماری خواتین نے اپنا لیا ہے۔ اور یہ ہر مذہب و ملت کے ہندوستانی گھروں میں برتا جاتا ہے۔ اس لئے عورتوں کا قومی لباس یہی ہونا چاہیئے اور مردوں کے لئے تنگ مُہری کا پاجامہ، شیروانی اور رنگین صافہ قومی لباس بنایا جائے، کیونکہ مشرق کی قدیم روایات کے حامل ابھی ہمارے والیان ریاست ہیں اور وہ سب اسی لباس کو پسند کرتے ہیں اور بھلے لگتے ہیں۔ لہٰذا یہی ہمارا بھی قومی لباس بنا چاہیئے۔ خود فرنگی ہمیں اس شیروانی اور صافے والے لباس میں دیکھ کر پسند کرتے ہیں۔ پروفیسر صاحب یہ سن کر بہت محظوظ ہوئے اور نہایت پسند کیا۔ پھر یہ وعدہ کیا کہ حسن عزیز کی اس تجویز کو اپنے اخبار پریم پرچارک میں شائع کریں گے اور ساتھ ہی دیال باغ کی مجلس شوریٰ میں پیش کرکے منظور کرائیں گے۔

ان سے رخصت ہونے کے بعد میں تانگے میں اپنے ہوٹل واپس آنے لگا اور جب دیال باغ کی آخری حد نظر آئی پھر نظر سے غائب ہونے لگی تو میں نے کہا:-

"اے دیال باغ! اپنے دل کی سچی عقیدت کے ساتھ میں تمہیں الوداع کہتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ تم کو کبھی نہ بھولوں گا۔ کیونکہ ہمارے پسماندہ وطن کی تم لاج رکھ رہے ہو۔"

حسن عزیز جاوید

محبت

محبت کے ترانے گونجتے ہیں کوہساروں میں
محبت نغمہ زن ہے وادیوں میں آبشاروں میں

محبت چاندنی راتوں میں سایوں سے لپٹتی ہے
محبت پردۂ ظلمت میں تاروں سے جھمکتی ہے

محبت تتلیوں کا روپ بھر کر گل کترتی ہے
محبت جگنوؤں کی شکل پا کر رقص کرتی ہے

محبت طفلک بے لوث کی معصوم باتوں میں
محبت شاہد بیدرد کی رنگین گھاتوں میں

محبت کو جہاں کی نعمتوں سے بے نیازی ہے
محبت کے لئے پامال رہنا سرفرازی ہے

محبت ملگجی چادر میں خوش ہو ہو کے سوتی ہے
محبت مخملیں قالین کو اشکوں سے دھوتی ہے

محبت جھونپڑوں میں کیف سے مخمور رہتی ہے
محبت اونچے اونچے مندروں سے دور رہتی ہے

پرشوتم لال ضیاء

فلاسفر

آخر اُس گرم سی شام کو میں نے گھر میں کہہ ہی دیا کہ مجھ سے ایسی تپش میں نہیں پڑھا جاتا۔ کچھ ایسی گرمیاں بھی نہیں شروع ہوئی تھیں۔ بات کچھ یہ بھی تھی کہ امتحان نزدیک تھا اور تیاری اچھی طرح نہ ہوئی تھی اور یہ ایک قسم کا بہانہ تھا۔ گھر بھر میں صرف مجھے ہی امتحان دینا تھا حامد میاں امتحان سے فرنٹ ہو چکے تھے کہ اگلے سال دیں گے۔ ننھی عفّت کو خواہ مخواہ زبردستی اگلی جماعت میں چڑھا دیا گیا تھا۔ باقی جو تھے وہ سب کے سب امتحان دے کر پاس فیل ہو چکے تھے ؛

لازمی طور پر میری ناز برداریاں سب سے زیادہ ہوتیں۔ طرح طرح کے ناشتے، منٹ منٹ کے بعد پینے کی سرد چیزیں، اور اِدھر اُدھر کے کمروں میں مکمّل خاموشی! بچوں کو ڈرایا جاتا۔ خبردار جوان سے بات کی ہے تو، خبردار جوان کے کمرے کے نزدیک سے گزرے، خبردار جو یہ کیا۔ جو وہ کیا۔ بھیّا امتحان دے رہے ہیں۔

اُدھر امتحان کمبخت ایسا عظیم الشان سا تھا کہ کسی طرح کتابیں قابو ہی میں نہ آتی تھیں۔

خیر! تو میں کہہ رہا تھا کہ تنگ آکر میں نے کہہ ہی دیا کہ مجھ سے یہاں نہیں پڑھا جاتا، مطلب صاف ظاہر تھا کہ پہاڑ پر جاؤں گا۔ کئی دنوں تک گھر میں یہی ذکر ہوتا رہا۔ پہاڑ پر سارا کنبہ جا رہا تھا لیکن ابّا کی چھٹیوں میں ابھی ڈیڑھ دو مہینے باقی تھے اور زائد چھٹیاں محض میری وجہ سے لی بھی نہیں جا سکتی تھیں۔ ویسے ابھی پہاڑوں پر جانے کا موسم بھی نہیں آیا تھا۔

آخر ایک دن مجھ سے تیار رہنے کو کہا گیا۔ ابّا کے کوئی خاں صاحب یا خان بہادر، کی قسم کے عزیز دوست ایک مہینے سے پہاڑ پر جا چکے تھے، وہاں تار دیا گیا اور انہوں نے مجھے بلا لیا۔ گھر میں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہاں میری ہم عمر ایک لڑکی بھی ہے، اس پر میرے کان کھڑے ہوئے۔ چنانچہ تقریباً سارے گرم سوٹ ڈرائی کلین کرانے کے لئے دے دیئے گئے لیکن دوسرے دن ہی پتہ چلا کہ وہ فلسفہ پڑھتی ہیں اور عینک لگاتی ہیں۔ لاحول ولا قوۃ! چلو یہ بات بھی ختم ہوئی۔ اب مزے سے پڑھیں گے لیکن عجیب بدمزگی سی پیدا ہو گئی۔ فلسفی لڑکی! اس پر طرّہ یہ کہ عینک لگاتی ہے۔

میں وہاں پہنچا، ایک صاحب مجھے لینے آئے، میری ہی عمر کے ہونگے بولے "بھئی میں ہوں توفیق لیکن مجھے رفّو کہا جاتا ہے" وہ جگہ آٹھ دس میل تھی۔ ساتھ کار لائے تھے۔ ہم نے کار بھیج دی اور کہا کہ مزے مزے سے پیدل جائیں گے۔ راستے میں خوب باتیں ہوئیں۔ پتہ چلا کہ وہ بھی کسی امتحان کے پھیر میں ہیں۔ وہ خان صاحب (یا خان بہادر) کے کچھ چچا کے ماموں کی بھتیجی کی خالہ کے پوتے کے چچا زاد بھائی کی قسم کے عزیز تھے۔ کافی دیر حساب لگانے کے بعد پتہ چلا کہ وہ تقریباً اُن کے بھتیجے تھے پھر اُن فلاسفر

صاحبہ کا ذکر ہوا شکیلہ نام تھا اور ہم دونوں سے عمر میں دو تین سال بڑی تھیں اور فلسفے کی کوئی بڑی سی ڈگری لینے کی فکر میں تھیں۔
ہمیں چلتے چلتے کافی دیر ہوگئی تھی رفو ہاتھ سے اشارہ کرکے بولے "بس یہ موڑ اور رہ گیا ہے۔"

ہمارے سامنے بادل ہی بادل چھائے ہوئے تھے۔ آگے راستہ نظر نہ آتا تھا۔ رفو بولے "ایک عجیب بات ہے یہاں ہمیشہ یا تو بادل ہوتے ہیں یا دھند۔" ہم دھند میں سے گزر رہے تھے، آہستہ آہستہ دھند صاف ہوئی اور ہم نے آخری موڑ کو طے کیا ہی تھا کہ ان کی کوٹھی یکلخت سامنے آگئی۔ بس ایک گہرا سا کھڈ تھا بیچ میں، لیکن ابھی آدھ میل کا چکر اور تھا۔ ہم نے دیکھا کہ کوٹھی کے ساتھ ہی باغ میں ایک پتھر پر کوئی خاتون کھڑی تھیں ہم سے بالکل نزدیک۔ لمبا چھریرا قد، لہراتے ہوئے پریشان بال، ہلکا ہلکا گلابی چہرہ، اور ناک پر کالے فریم کی ایک عینک۔

"یہی ہیں شکیلہ۔" رفو بولے ——— میں نے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا، انہوں نے سر کی جنبش سے جواب دیا۔ اتنی بری نہیں تھیں جتنا میں تصوّر کئے بیٹھا تھا، اگر وہ موٹی سی عینک نہ ہوتی تو شاید حسین کہہ سکتے تھے، یا کم از کم وہ بھدّا سا سیاہ فریم نہ ہوتا۔

میں کنبے میں بہت جلد گھل مل گیا۔ رفو اور میں تو بالکل بے تکلف ہوگئے، لیکن شکیلہ تھیں کہ پلے نہ پڑتی تھیں نہ کبھی ہماری باتوں میں دلچسپی لیتیں نہ کبھی شریک ہوتیں، ہم دونوں ان کے سامنے بہتیرے ٹامک ٹوئیے مارتے، اوّل جلول باتیں کرتے خوشامدیں کرتے، لیکن ان کی ناک ہمیشہ چڑھی رہتی۔

اور ان کا کام کیا تھا۔ صبح سے شام تک دس دس پندرہ پندرہ سیر کی کتابیں پڑھ رہی ہیں۔ رات کو انگیٹھی کے سامنے بیٹھی سوچ رہی ہیں۔ اتنی سنجیدگی سے جیسے دنیا کے نظام کا دارومدار ان ہی کے سوچ بچار پر ہے، کبھی انگلیوں سے ہوا میں لکھنے لگتی ہیں، کبھی کرسی پر طبلہ بجنے لگتا ہے، کبھی جھنجھلا جھنجھلا پڑتی ہیں، پھر یکلخت ایک مسکراہٹ لبوں پر دوڑ جاتی ہے اور سر ہلنے لگتا ہے جیسے سب کچھ سمجھ میں آگیا، دفعتہً مٹھیاں بھینچ لی جاتی ہیں اور غریب صوفے کو دو تین مکّے رسید کئے جاتے ہیں۔ اِدھر ہم انہیں دیکھ کر جھنجھلا اٹھتے۔ یہ تو نیم پاگل ہیں بالکل!

خان صاحب (یا خان بہادر) اور بیگم صاحبہ کا تو معاملہ ہی اور تھا۔ وہ باتیں سیاسیات، معاشیات، نسادیات، اور نہ جانے کیا کیا "یات" کی کرتے، جن میں ہمیں ذرّہ بھر دلچسپی نہ ہوتی۔ باقی تھے بچے" وہ پہلے ہی احمق تھے یا خاص طور پر احمق بنائے گئے تھے، اب بھلا ہم کس سے باتیں کرتے۔ لے دے کر یہی ایک ہم عمر تھیں۔ ویسے تھیں کچھ بڑی ہی، یہی بے حد تنہائی پسند اور خشک مزاج واقع ہوئی تھیں اور ماشاءاللہ اپنی ہی دنیا میں بستی تھیں۔

کبھی منّت سے کہا "ہمارے ساتھ بیڈمنٹن کھیل لیجئے" جواب ملا "عینک ہے! عینک پر چڑیا لگے گی"۔
کہا "نہیں، ہم نہیں لگنے دیں گے، شاٹ نہیں ماریں گے، بس اچھال اچھال کر کھیلیں گے"۔

کہنے لگیں "تو پھر وہ کھیل ہی کیا ہوا جو بے دلی سے کھیلا جائے۔ ویسے آپ دونوں تو سنگل بھی کھیل سکتے ہیں بھلا میں تیسری کیا کروں گی؟"۔

پھر کسی دن خوشامد کے لہجے میں کہا "ہمارے ساتھ سیر کو چلئے" ــــــ بولیں "ابھی تو مجھے فرصت نہیں۔ بالکل فرصت نہیں۔ جب تک میں یہ تھیوری نہیں سمجھ لیتی"

پُوچھا "تو کب تک سمجھ لیں گی آپ یہ تھیوری"؟ ــــــ جواب ملا "کیا پتہ ۔ شاید پانچ منٹ میں سمجھ لوں ۔ اور سمجھ میں نہ آئے تو مہینے تک نہ آئے"۔

اور جو کسی دن بہت خوش ہوئیں تو بولیں "بس ابھی چلتے ہیں سیر کو ۔ ذرا بچوں سے کہہ دیجئے کہ تیار ہو جائیں"۔ بچوں کے نام پر ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ اور بات یہیں ختم ہو جاتی۔ اور عموماً میں اور رفو دونوں ہی سیر کو جایا کرتے۔ کچھ دنوں تک تو یونہی ہوتا رہا۔ پھر ایک دن ہم نے تنگ آ کر بغاوت کر دی، آخر کیوں نہیں شریک ہوتیں یہ ہمارے ساتھ۔ جب ایک ہم عمر موجود ہیں تو پھر ہم اُن کی شرکت سے کیوں محروم کئے جائیں۔ آئیں بڑی فلاسفر کہیں سے رہ ہمارے پروگرام کا ستیاناس کر رکھا ہے۔

پہلے تو طے ہؤا کہ ایک رات چپکے سے ان کی ساری کتابیں جلا دی جائیں یا کسی ندی میں پھینک دی جائیں، لیکن پھر سوچا کہ دو تین روز تک اور کتابیں آ جائیں گی، کافی دیر کے سوچ بچار کے بعد ایک تجویز رفو کے دماغ میں آئی۔ بولے "تو تمہیں سزا ہی دینا ہے نہ انہیں؟" ــــــ "یقیناً!" میں نے سر ہلا کر کہا۔

"تو کیوں نہ ان سے محبت کی جائے!" وہ میرے کان میں بولے۔

آہا ہا! ــــ میں چونک پڑا کتنی اچھی تجویز تھی۔ محبت کے آگے تو بھوت بھی ناچتے ہیں۔ یہ تو ہیں محض فلاسفر! ہم دونوں نے ہاتھ ملائے۔ یہ بہترین تجویز تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہؤا کہ محبت کون کرے؟ ہم میں سے کوئی بھی اس ذمّہ داری کو سر لینا نہیں چاہتا تھا۔ ایسی ویسی محبت ہوتی تو کر بھی لیتے۔ فلاسفر سے محبت کرنا تھی۔ معاملہ خطرناک تھا۔

میں نے رفو سے بڑی عاجزی سے کہا "بھئی اب تم ہی کرلو" کیونکہ وہ ذرا دُبلے پتلے سے تھے اور ان کی صحت محبت کرنے کے لئے بہترین تھی۔ وہ قریب قریب گڑگڑا کر بولے "نہیں بھئی! مجھے تو معاف ہی کردو تو بہتر ہوگا، اول تو میں نے ابھی تک کچھ پڑھا نہیں اور دوسرے یہ کہ مجھے کچھ زکام سا رہتا ہے ہر وقت پھر ایمان کی بات تو یہ ہے کہ مجھے عینک سے بھی ڈر لگتا ہے۔"!

میں نے بھی بڑے بڑے بہانے پیش کئے۔ مگر ایک نہ چلی۔ آخر فیصلہ ہؤا کہ "میں اسی اتوار سے محبت شروع کر دوں پروگرام اکٹھے بنائے جائیں۔ اور ریہرسل بھی باقاعدہ کئے جائیں"۔

اسی دن میں اپنا ایک چھوٹا سا مزاحیہ افسانہ شکیلہ کو سنانے گیا۔ پہلے تو وہ سنتی ہی نہ تھیں۔ بڑی مشکل سے انہوں نے مجھے دس منٹ دیئے۔
میں نے افسانہ شروع کیا کہ کس طرح چلتی ریل میں سے ایک لڑکی دریا میں گر پڑی جو نیچے بہہ رہا تھا۔ پُل کے نیچے ہیرو نے۔ جو کشتی چلا رہا تھا اور ایک خوبصورت نوجوان بھی تھا اور کرکٹ کا زبردست کھلاڑی تھا۔ لپک کر لڑکی کو کرکٹ کی گیند کی طرح "کیچ" کر لیا۔ اور چیخ کر بولا "ہاؤ زاٹ!"
ریل کے گارڈ نے جو خوش قسمتی سے یہ سارا کھیل دیکھ رہا تھا، امپائر کی طرح انگلی اٹھائی اور چلّا کر کہا۔ "آؤٹ!"۔ پھر ہیرو اور ہیروئن کی آنکھیں چار ہوئیں۔!

"آنکھیں چار ہوئیں۔!" انہوں نے چونک کر پوچھا۔

"جی نہیں! معاف کیجئے۔ آنکھیں چھ ہوئیں!" میں نے اُن کی عینک کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "اور اگر ہیرو نے بھی کہیں سیاہ چشمہ لگا رکھا ہو تو۔ تو پھر آنکھیں آٹھ ہوئیں (میری ناک پر سیاہ چشمہ رکھا تھا)۔ اور نگاہیں شیشوں کو آر پار کر کے ایک دوسرے سے لڑ گئیں۔ اور۔!"
"بھئی تم تو یونہی نفضول باتیں کرتے ہو۔" وہ اُٹھتے ہوئے بولیں "جاؤ ہم نہیں سنتے!"

سہ پہر کو وہ کوٹھی کے پرے ایک چھوٹے سے جھرنے کے پاس بیٹھی فلاسفی کی ایک فربہ اور تندرست کتاب پڑھ رہی تھیں۔ عینک اُتار رکھی تھی۔ میں بھی ایک مریل سی کتاب لے کر پاس بیٹھ گیا۔ وہ بدستور چپ بیٹھی رہیں۔

جلدی سے میں نے ایک دُور کی ننھی سی جھیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "آہاہا! کیا نظّارہ ہے؟ جھیل کا پانی یوں چمک رہا ہے۔ جیسے چاندی کا۔ یعنی چاندی کا۔ چاندی کا شیشہ اور اس پر پیاری پیاری اصلی مُرغابیوں کا عکس کیسا بھلا لگتا ہے"

"کیا۔؟" انہوں نے جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ عینک کے لئے، جو غالباً وہاں نہ تھی۔

"آہاہا۔ ہاہا!" میں نے پھر کہا۔

"تو خوبصورت نظّارہ ہے۔ اچھا۔" وہ کوٹ کی جیبیں تلاش کر رہی تھیں۔ "ابھی دیکھتی ہوں۔ یہ کمبخت عینک کہاں مر گئی۔ تو گویا مُرغابیاں بھی ہیں۔ اچھا۔!"

وہ بدستور عینک ڈھونڈ رہی تھیں۔ "ارے! وہاں رہ گئی۔!" انہوں نے ایک دُور پڑے ہوئے پتھر کی طرف اشارہ کیا "ذرا لا دیجئے گا وہاں سے عینک۔!"

میں عینک لے آیا، انہوں نے صاف کر کے لگائی۔ "بہت خوب!۔ بہت اچھّا نظارہ ہے!۔ لیکن وہ مرغابیاں کہاں ہیں؟"
"بھلا وہ آپ کی عینک کا انتظار کرتیں۔ کبھی کی اُڑ گئیں۔!" در اصل وہاں مرغابیاں تھیں ہی نہیں!
"اچھا تو اُڑ گئیں۔ پھر دیکھ لیں گے کبھی۔!" انہوں نے پھر پڑھنا شروع کر دیا۔

اگلے روز شام کو میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "ذرا آج میرے ساتھ سیر کو چلئے۔!"
بولیں "کیوں آج کوئی خاص بات ہے؟"

تھی نہیں۔" وہ اُس طرف اشارہ کرتے ہیں "میں نے ایک نیا راستہ دیکھا ہے جو پہاڑ کی دوسری طرف لہراتا ہُوا اُترتا ہے۔ وہاں اتنے دلفریب نظارے ہیں کہ کیا کہوں۔ وہاں چلیں گے؟"

"بھئی! ایک تو تمہارے ان دلفریب نظاروں نے تنگ کر دیا۔ خیر!" وہ سوچنے لگیں "تو گویا نیا راستہ ہے۔ نظارے بھی ہیں۔ اور وہ بھی دلفریب۔ اچھا۔ چلتے ہیں۔" ——— اب اگلا سوال اُن کا بچوں کے متعلق ہوتا۔ میں نے بادل۔ "بے پائش بندی کر دی۔ پتہ نہیں یہ بچے کہاں چلے گئے۔ بڑی دیر تلاش کی لیکن ایک بھی تو نہیں ملا۔"

اسی دوپہر کو میں نے اُن کی عینک کہیں چھپا دی تھی چنانچہ وہ بغیر عینک کے تھیں۔ جو راستہ پہاڑ کے دوسری طرف اُترتا تھا وہ بالکل خشک اور فضول سا تھا۔ ہم دونوں کالے کالے پتھروں اور اُلجھے ہوئے جھاڑ جھنکاڑ میں سے گزر رہے تھے "ذرا دیکھئے تو۔ کیسے رنگ برنگ کے پھول کھلے ہیں۔ اور پھر تختے کے تختے دُور تک پھیلتے چلے گئے ہیں۔ جیسے قالین بچھے ہوں۔" میں نے چند اُکھڑے ہوئے درختوں کی طرف اشارہ کیا۔

"کہاں ہیں؟ اُس طرف۔ ہاں! بڑے پیارے پھول ہیں! اتنا تو مجھے عینک کے بغیر بھی نظر آجاتا ہے۔" وہ اپنی کمزوری چھپا رہی تھیں۔

"اور یہ اس طرف تو آپ نے دیکھا ہی نہیں۔ اس وقت کیمرہ ہوتا تو تصویر لیتے۔ ایک پتلی سی جھلمل جھلمل کرتی ہوئی آبشار ہے پہاڑ کی چوٹی پر۔ موتیوں جیسے چمکیلے قطرے پتھروں پر ناچ رہے ہیں۔" میں نے ایک بھدّے سے پہاڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"واقعی بہت ہی پیاری آبشار ہے۔ اور آواز بھی تو بڑی مدّھم اور بھلی ہے۔" ——— یہ آواز انہوں نے خواہ مخواہ سننا شروع کر دی "ارے!" میں جیسے چونک کر بولا "یہ قوس و قزح! یہ قوسِ قزح اس پہاڑی سے اُس پہاڑی تک چلی گئی ہے۔ ایک چھوٹا سا پُل بن گیا ہے۔" "اور پھر رنگ کیسے نمایاں ہیں۔ خاص کر سبز رنگ۔ کل میں ضرور یہاں عینک لگا کر آؤں گی۔ تاکہ ذرا اچھی طرح ——— نہیں نہیں۔ بس یونہی عینک لگاؤں گی۔ اور اگر نہ بھی لگاؤں تو کون سا فرق پڑتا ہے۔ ویسے دیکھنے کو تو مجھے اب بھی سب کچھ نظر آرہا ہے!"

اور دوسرے روز وہ اکیلی عینک لگا کر اُسی راستے سے گئیں جب واپس آئیں تو بُرا سا منہ بنا ہُوا تھا اور مجھ سے اگلے دن تک بات نہ کی۔ اتوار کی صبح آئی جس دن مجھے محبّت شروع کرنا تھی سارا دن موقع ہی نہ ملا۔ رات ہوئی اور چاندنی کھلی۔ پہاڑوں کا چمکیلا چاند تاباں تھا۔ میں ان کے کمرے میں گیا۔ کچھ دیر تمہید باندھی۔ چاندنی رات کے رومانی فضا کی تعریفیں کیں، فوائد بتلائے پھر کہا "کاش آپ اس وقت میرے ساتھ سیر کو چلتیں۔"

وہ کچھ دیر سوچتی رہیں پھر پنسل سے ناک کھجا کر بولیں "آپ نے ایک بے معنی سی بات کہی ہے۔ بالکل بے معنی فقروں میں۔ آپ جانتے کیا ہیں؟ چاندنی رات کی سیر یا مجھ سے باتیں کرنا۔ اگر پھرنا ہی ہے تو اکیلے پھرنا بہتر ہوگا کیونکہ جہاں تک چاندنی رات کی لطافت اور رومانیت

کا تعلق ہے وہاں میری کوئی ضرورت نہیں۔ اگر میں ساتھ ہوئی تو آپ کبھی مجھ سے باتیں کریں گے اور کبھی فضا کی طرف دیکھیں گے۔ اگر آپ مجھ سے باتیں کرنا چاہتے ہیں تو میرے پاس بیس منٹ سے زیادہ فالتو وقت نہیں۔ اس دوران میں آپ جلدی جلدی باتیں کر لیجئے۔ اور پھر خواہ چاندنی میں پھریئے یا اندھیرے میں۔"

میں مُنہ بنائے چلا آیا۔ بسم اللہ ہی غلط نکلی۔

پھر ایک دفعہ میں نے اُن کی اُنگلیاں چھو کر کہا "کتنی پیاری اُنگلیاں ہیں؟"

"آپ کا فقرہ سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ انگلیاں ہیں ہی پیاری، یا صرف آپ کو پیاری لگتی ہیں؟" انہوں نے بہت سوچ بچار کے بعد کہا۔ "مجھے پیاری لگتی ہیں!" میں ذرا سہم کر بولا۔

"بھلا پیارا لگنے کی بات ہی کون سی ہے، ایک لمبی سی پتلی چیز، اُوپر معمولی کھال، نیچے گوشت اور ہڈی۔ بس! اسی قسم اور بالکل اسی بناوٹ کی اُنگلیاں آپ کو ہر ایک کی ملیں گی۔ آپ کی اُنگلیاں بھی ایسی ہی ہیں۔ آپ انہیں بھی تو پیارا کہہ سکتے ہیں۔"

میں جھلّا اُٹھا۔ بات بات میں فلسفہ! کیا مصیبت ہے! رفّو سے مشورہ لیا گیا وہ بولے "گھبرانے کی کوئی بات نہیں، آج ایک چھوٹی سی تقریر بناؤں گا، تم اس کی ریہرسل کر لینا۔ میں تمہیں خوب مشق کرا دوں گا۔ میں کالج میں ڈراما کرتا رہا ہوں۔"

پورا ایک دن ریہرسل میں ضائع ہو گیا۔

میں نے انہیں باغ میں جا پکڑا۔ وہ بدستور اکیلی بیٹھی پڑھ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے کتاب بند کر دی، اور گھورنے لگیں۔ گویا کہتی تھیں کہ خواہ مخواہ وقت ضائع کرو گے اب۔ ——— میں نے تقریر شروع کر دی کہ کس طرح کوئی کسی کے دل میں آ کر بس جاتا ہے اور پھر نکلنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ ہر دم اُسی کا خیال ستانے لگتا ہے۔

"خوب! تو یوں بھی ہو جاتا ہے کبھی۔" وہ مسکرا کر بولیں۔

"جی ہاں! کئی مرتبہ ہُوا۔ ہوتا رہا ہے۔ ہُوا کرتا ہے۔ اور۔ اور ابھی ہُوا بھی ہے۔"

"مثلاً ——!"

"مثلاً یہی کہ مجھے ۔ (دلیر بن کر) یعنی میرے دل میں ہر وقت آپ کا خیال رہتا ہے۔" میں جرأت کر کے کہہ ہی گیا، لیکن اُن پر کوئی اثر نہ ہُوا وہ بدستور مسکرا رہی تھیں۔

"غلط! بالکل غلط! ــ دل میں کسی کا خیال رہ ہی نہیں سکتا۔ جو کچھ ہم دیکھتے ہیں وہ اعصابی نظام کے مطابق دماغ میں جاتا ہے، جب ہم سوچتے ہیں تو دماغ ہی میں سوچتے ہیں۔ دل کا سوچنے سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ دل میں خیال وبال کے لئے کوئی جگہ ہی ہے۔ وہاں تو بمشکل خون سما سکتا ہے۔"

"اچھا تو یوں سہی۔ کہ دماغ میں ہر وقت آپ کا خیال رہتا ہے۔" ——— میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔

"اگر یہ بات ہے تو یہ آپ کی دماغی کمزوری ہے کہ ایک معمولی سی چیز کا اثر دماغ کے مختلف حصّوں پر اس قدر حاوی ہو جائے کہ کسی وقت پیچھا نہ چھوڑے۔"

"کمزوری ہی سہی۔ لیکن مجھے ہر وقت"۔

"آپ ہر وقت، نہیں استعمال کرسکتے۔ کیونکہ جب آپ سوتے ہونگے تو یقیناً بھول جاتے ہونگے، لہٰذا آپ نیند کے گھنٹوں کو چوبیس گھنٹے سے نکال کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ مجھے اتنے گھنٹے آپ کا خیال رہتا ہے۔ مگر یہ بھی اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب آپ سارا دن ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ایک ہی بات سوچتے رہیں!"

"خیر کچھ بھی ہو۔" میں نے جھلا کر کہا (میں تقریر کے الفاظ بھولتا جا رہا تھا)، "میں سوچتا ہوں، خواہ دل میں سوچوں، یا بھسم طور میں یا جگر میں، دن بھر سوچوں یا رات بھر۔ مگر میں سوچتا ہوں اور خوب سوچوں گا، کبھی باز نہیں آؤں گا۔ آپ کی فلاسفی مجھے متاثر نہیں کر سکتی۔ میں آپ کے لئے سب کچھ کر سکتا ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو میں نہ جانے کیا کیا کر بیٹھوں۔ (میں پھر بھول گیا)۔ آپ چاہیں تو میں سر کے بل اس ندی میں چھلانگ لگا دوں۔ اور (پر جوش لہجے میں)، آپ چاہیں تو یہ بھاری پتھر وہاں رکھ آؤں۔ اور (ذرا بلند آواز سے)، اگر آپ کہیں تو میں اس پودے کو جڑ سے اکھیڑ دوں۔ اور۔۔"

"پھر آپ کی دماغی کمزوری ظاہر ہو رہی ہے۔ بھلا مجھے کیا پڑی جو درخت اکھڑواتی پھروں یا پتھروں کو ان کی جگہ سے ہلواؤں، ایسے خیالات محض آپ کے دماغ کا اختراع ہیں اور ظاہر ہے کہ اس قسم کے خیالات تندرست دماغ میں کبھی نہیں آسکتے"۔

انہوں نے اپنی عینک اُتار دی اور صاف کرنے لگیں۔ میں تقریباً ساری تقریر بھول چکا تھا۔ یکایک مجھے ایک دورہ سا اٹھا۔ "دیکھئے اگر آپ چاہیں تو میں پل بھر میں عینک کے دونوں شیشے صاف کر دوں، یا اس عینک کو توڑ کر ایک نئی عینک لا دوں"۔

"چ۔ چ۔ اُفوہ! دماغی کمزوری کے مزید ثبوت مل رہے ہیں، عینک کے شیشے صاف کرنا ایک معمولی سا کام ہے۔ اور پھر ایک ثابت چیز کو ضائع کر کے ویسی ہی نئی لانے میں کہاں کی عقلمندی ہے۔ یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ اس وقت آپ کے دماغ میں کسی عجیب جذبے کے ماتحت عجیب خیالات کا عجیب طوفان بپا ہے"۔

اور میں نے رفو سے آ کر کہدیا کہ بھئی مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ قیامت تک نہیں ہو سکتا۔ بات بات میں مین میخ نکلتی ہے ایک ایک فقرے کا پوسٹ مارٹم ہوتا ہے۔ بات کچھ کہنے جاؤ اور سن کے آؤ کچھ! میں ان فلاسفر صاحبہ سے کبھی نہیں جیت سکتا۔

مگر رفو تھے کہ برابر کہہ رہے تھے "گھبراؤ مت! آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا" ایک تو ان کی اس آہستہ آہستہ نے مار رکھا تھا، جب جا کر شکایت کرو۔ یہی جواب ملتا کہ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ دراصل ناامید دہ بھی ہو چلے تھے۔

لافو کے بار بار مجبور کرنے پر میں ہر روز دو چار باتیں سلیقے سے ایسی کر جاتا جن پر مجھے دیر تک فلسفیانہ لیکچر سننے پڑتے۔ مگر ایک تبدیلی اُن میں آتی جا رہی تھی۔ پریشاں بال اب سنوارے جاتے تھے۔ کپڑوں کا خاص خیال رکھا جاتا۔ عینک بھی بدل دی گئی تھی۔

اب بغیر فریم کی نازک سی سنہری عینک آ گئی تھی جس سے اُن کے چہرے کی خوبصورتی میں کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ ایک بات مجھے رفّو نے بتائی وہ یہ کہ اب اُن کے ملبوس کا رنگ عموماً میرے سوٹوں کے رنگ کے مطابق ہوتا۔ مگر اُن کی باتیں بدستور ویسی ہی تھیں۔

"آخر ایک دن میں نے پھر ہمّت کی اور سر پر کفن باندھ کر اظہارِ محبت کے لئے تیار ہو گیا، جو کچھ ہو گا دیکھا جائیگا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا نا کہ ایک ڈانٹ مل جائے گی۔ بڑی محنت اور مختلف کتابوں کی مدد سے ایک رومانی تقریر تیار کی گئی۔ کئی دنوں ریہرسل کرنے کے بعد میں آخری حملے کے لئے تیار ہو گیا۔ اظہار کے لئے شام کا دلفریب وقت چُنا گیا جب شفق سے سارا آسمان جگمگا رہا ہو اور ٹھنڈی معطّر ہوا کے جھونکوں سے شکیلہ کے بال لہرا رہے ہوں۔

پہلے دن تو شام کو بارش ہو گئی۔ اس لئے سب کچھ ملتوی کرنا پڑا۔ دوسرے دن صبح سے رفّو نے مجھے طرح طرح کی چیزیں لا کر دیں۔ میں پیتے پیتے تنگ آ گیا، ہارلکس کا دودھ۔ سیناٹوجن۔ بادی رول۔ لوہے کا ٹانک۔ چند چمچے مچھلی کا تیل۔ دوپہر کو ماء اللحم پلایا گیا۔ سارا دن وہ مجھے تسلی دیتے رہے کہ شاباش گھبرانا مت، معمولی سی بات ہے اور پھر کوئی روز روز تھوڑا ہی ہو گی۔ خیر شام ہوئی، میں نے شکیلہ کو حسبِ معمول باغ میں ایک پتھر پر پڑھتے پایا۔ بغیر کسی تمہید کے میں نے تقریر شروع کر دی۔

"آج کی باتیں شاید آپ کو بُری لگیں۔ اگر لگتی ہیں تو لگا کریں۔ لیکن میں کہوں گا۔ ضرور کہوں گا۔" میں ایک گھٹنے کے بل جھکا اور ایک ہاتھ بڑھا کر بولا۔

"آپ نہیں جانتیں کہ میری زندگی کس قدر اُداس اور تنہا ہے۔" انھوں نے نفی میں سر ہلایا۔ جیسے کہتی ہوں کہ نہیں جانتی۔ "میں اندھیرے میں بھٹکتا رہا ہوں۔ میں نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائی ہیں۔ لیکن اب زندگی کے اس بے پایاں سمندر میں میری تنہا کشتی کا کوئی بادباں بن گیا۔ تاریک اُفق پر ایک روشن ستارہ طلوع ہوا۔ اور۔۔۔ اُ۔"

"یہ تو واقعی بڑی خوشی کی بات ہے۔" وہ پنسل کو بالوں میں پھیرتے ہوئے بولیں۔

"اور۔ اور میرے مُرجھائے ہوئے پژمردہ دل میں۔ اُ"

غالباً مُرجھائے ہوئے اور پژمردہ کا ایک ہی مطلب ہے۔ ہے نا؟ بہتر ہوتا اگر آپ ان میں سے ایک ہی استعمال کرتے۔ اُ"

"اچھا! چلئے پژمردہ ہی۔ تو میرے پژمردہ دل میں پھر زندہ رہنے کی تمنّا پیدا ہوئی۔ اُ"

"یہ کب کا ذکر ہے۔؟"

"ابھی کا ذکر ہے۔ حال ہی کا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں یاد کئے ہوئے فقرے نہ بھول جاؤں۔ "جی۔ اور یوں لگتا ہے جیسے کسی نے میرا ہاتھ تھام لیا ہو۔ اُ"

"یہ آپ کس سے کہہ رہے ہیں ؟ ۔آپ نے نیا مضمون لکھا ہے کیا ؟"

"آپ سے کہہ رہا ہوں ۔ لا حول ولا قوۃ! آپ سنتی رہیئے ۔ ٹوکئے مت ۔۔! ۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا بھلا ؟"

"جیسے آپ نے کسی کا ہاتھ تھام لیا ہے ۔!" اُنھوں نے لقمہ دیا ۔

" شکریہ! ۔ میں نے نہیں بلکہ کسی نے میرا ہاتھ تھام لیا ہے ۔ اور میں بھٹکتے بھٹکتے پھر راستے پر آ گیا ہوں ۔ !

" لیکن جہاں آپ بھٹک رہے تھے اُسے بھی تو ہم راستہ کہہ سکتے ہیں کیونکہ راستہ وہ جگہ ہے جہاں سے گزرا جائے ۔ بھٹکنے وٹکنے کی کوئی شرط نہیں ہے بیچ میں ۔ آپ کا فقرہ غلط ہے ۔ اسے یوں کہئے کہ آپ بھٹکتے بھٹکتے راہِ راست پر آ گئے ہیں ۔!"

"خیر! یوں ہی سہی ۔ میں راہِ راست پر آ گیا ہوں ۔ اور اب میری زندگی ۔!"

"مگر وہ ہے کون جس نے یہ سب حرکتیں آپ کے ساتھ کی ہیں ؟"

"نہیں بتاتے ۔" انھیں نے بچوں کی طرح مُنہ بنا کر کہا ۔

"ہم تو ضرور سُنیں گے کہ وہ کون ہے !" وہ بولیں ۔

"وہ کون ہیں ؟ ۔ آپ سچ مچ نہیں جانتیں کیا ؟ وہ یہاں ہیں (میں نے اپنے دل پر ہاتھ رکھدیا) ۔ وہ یہاں بستی ہیں ۔

نہیں نہیں ، میرا مطلب ہے وہ (سر پکڑ کر) یہاں بستی ہیں ۔۔!"

"بھئی کچھ اتا پتا بھی تو معلوم ہو اُن کا ۔!"

میں گھبرا گیا ۔ میرا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا ۔ حلق خشک تھا ۔ میں نے سو گز کی دوڑ لگانے کی تیاری کی اور چھلانگ لگاتے ہوئے بولا ۔ "وہ ۔ آپ ۔ ہیں ۔!" اور فلانچ مار کر بھاگا ۔ کچھ دُور جا کر مجھے چند الفاظ یاد آ گئے جنہیں میں بھول گیا تھا ۔ میں بھاگتے بھاگتے رُک گیا اور پیچھے مُڑ کر زور سے بولا "ذرا سن لیجئے ۔ آپ بالکل شگفتہ درخت ۔ نہیں نہیں ، شگفتہ پودے کی طرح لگتی ہیں ۔ آپ کا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح ہے ۔ اور ۔۔" میں آگے بھول گیا ۔

واپس آتے ہی میرے سر میں سخت درد شروع ہو گیا ۔ نہ جانے دن میں رؔفو نے کیا کیا الا بلا کھلا دی تھی ۔ اُس کا نتیجہ یہ نکلا ۔ اتنا شدید درد تھا کہ کمبخت اسپرین وغیرہ سے بھی قابو میں نہ آیا ۔ رات کے گیارہ بجے تھے ۔ سب کے سب میری مزاج پرسی کر کے جا چکے تھے ۔ رؔفو میاں کو اُن کے کسی دوست نے باہر مدعو کر رکھا تھا اور وہ وہیں تھے ۔ میں کمرے میں اکیلا لیٹا کھڑکی میں سے پہاڑی کی چوٹی کو دیکھ رہا تھا جس کے پیچھے اُجلی اُجلی روشنی اس بات کی شاہد تھی کہ ابھی ابھی چاند نکلے گا ۔ یکایک دروازہ کھلا ۔ خوشبو کا ایک جھونکا آیا اور کپڑوں کی سرسراہٹ سُنائی دی ۔ ایک خوبصورت ساکوٹ پہنے شکیلہ داخل ہوئیں ۔ اور میرے سر میں دُگنا درد شروع ہو گیا ۔۔ اب یہ خوب دھمکائیں گی ۔ میں نے آنکھیں موندلیں اور دبک سا گیا

لیکن انہوں نے دھمکایا نہیں۔ چپکے سے میرے سرہانے بیٹھ گئیں اور ملائم ہاتھوں سے میرے سر کو آہستہ آہستہ دبانے لگیں میں نے سوچا کہ یہ تمہید باندھی جا رہی ہے، یہی ملائم ہاتھ ذرا سی دیر میں کانوں تک پہنچا چاہتے ہیں۔ ذرا آنکھ کھولی اور شامت آجائے گی۔

انہوں نے میرے ماتھے پر ہاتھ پھیرا اور بولیں "کیا واقعی بہت درد ہے؟"

میں نے ڈرتے ڈرتے دیکھا۔ گویا نگاہوں میں پوچھ رہا تھا کہ "کہیں خفا تو نہیں ہوئیں آپ؟"

وہ مسکرا کر بولیں ـــ "خیر کہیں کے ـــ اب بھگتو شرارتوں کے نتیجے!" ـــــ میں نے پھر سہمے سہمے دیکھا

در اصل مجھے اعتبار اب بھی نہ آیا تھا۔ انہوں نے چپکے سے میری انگلی میں کچھ پہنا دیا۔ ایک سنہری انگوٹھی ہلکی پھلکی سی!۔ میں چونک پڑا۔

"مگر ـــ یہ انگوٹھی ـــ ذرا وہ ـــ دیکھئے نا ـــ!" میں انہیں واپس دینے لگا۔

"چپ!" وہ میرے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بولیں "جب سر میں درد ہو تو بولا نہیں کرتے۔"

میں چپ ہو گیا۔ وہ بدستور بیٹھی میرا سر دبا رہی تھیں۔ چاند نکل آیا تھا، کچھ شعاعیں کھڑکی میں سے گزرتی ہوئی ان کے چہرے سے کھیلنے لگیں۔ ان کا چہرہ جگمگانے لگا۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا، ان کی بڑی بڑی آنکھیں جھلملا رہی تھیں شیشوں کا چمکارا ہو گا! میں نے دل میں سوچا اور جب وہ شب بخیر کہہ کر چلی گئیں تو دفعتہً مجھے یوں لگا جیسے سر کا درد جو کچھ دیر کے لئے غائب ہو چکا تھا پھر سے شروع ہو گیا دیر تک میں انگوٹھی کے سفید جگمگاتے ہوئے نگ کو دیکھتا رہا۔

اگلے روز صبح صبح گھر سے تار آ گیا۔ ایک مہربان پروفیسر صاحب نے مجھے دو ہفتے پہلے ہی واپس آنے کی تاکید کی تھی ـــ امتحان کی مدد کے لئے نہایت ضروری کام تھا۔ شام تک تیاری کرنا پڑی۔ دوسرے دن علی الصباح جانا تھا۔

اگلی صبح میں اور رفو پیدل جا رہے تھے۔ نیچے اترتی ہوئی سڑک مڑتی تڑتی شکیلہ کی کوٹھی کے بالکل پاس سے گزرتی تھی۔ ابھی ہم اس موڑ سے ذرا دور تھے جہاں سے ان کا باغ بالکل سامنے آ جاتا تھا۔

میں یہی سوچ رہا تھا کہ کہیں میری ان لگاتار حماقتوں پر وہ برا نہ مان گئی ہوں، مگر ان کے پتھریلے فلسفی دل پر کیا اثر ہوا ہو گا؟ لیکن وہ بغیر فریم کی عینک! ـــ میرے سوٹوں کے ہم رنگ ملبوس! ـــ اور یہ انگوٹھی! ـــ کیا ان کا مطلب کچھ نہیں؟ نہیں غالباً کوئی مطلب نہیں! اور پھر میں ہی کون سا سچ مچ کہا کرتا، جو رفو بتاتے وہی کہہ دیتا۔ یونہی تفریح تھی۔ اچھا خاصا وقت گزر گیا۔

"بھئی ہم دونوں عجب احمق بنے رہے" رفو بولے "مجھے تو ہر دم یہی ڈر رہا کرتا کہ کہیں تمہیں دھمکا نہ دیا جائے بعض اوقات تو ہم نے بہت زیادتی کی ـــ!"

میں چونک پڑا — "ایں! — کیا؟"

اور پھر جس دن تم نے وہ اظہارِ محبت والا ریہرسل کیا، اُس دن تو میں بہت ڈرا — یہ فلاسفی بھی عجیب مصیبت ہے — اگر شکیلہ کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو یا تو اچھی طرح تمہارے کان کھینچتی یا تم سے محبت کرنے لگتی — لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوا — !

"بس خیریت یہی رہی کہ کان نہیں مروڑے گئے، ورنہ وقت بڑا ہی گزرتا — " میں بولا

"مگر بھئی — کچھ اندیشہ سا ہے میرے دل میں" وہ کچھ سوچ کر بولے "اور جو انہیں تم سے محبت ہو گئی ہو — تو — ؟"

"ہشت! محبت! اونہیں! — لاحول ولاقوۃ! — بھلا فلاسفر بھی محبت کرتے ہیں کہیں؟ — اور پھر عینک والی فلاسفر!"

ہم دونوں ہنس دیئے۔ انہوں نے جیب سے اخبار نکالا اور پڑھنے لگے۔

ہم دونوں اسی موڑ سے گزر رہے تھے۔ ہمارے سامنے اُن کا باغ تھا۔ بالکل نزدیک — بس بیچ میں ایک کھڈ تھا!

یکایک میری نگاہ سامنے کے پتھر پر گئی جہاں شکیلہ کھڑی تھی۔ سبزی مائل ملبوس میں، میں بھی سبز سوٹ پہنے ہوئے تھا، وہ بالکل ایک شاداب پودے کی طرح لگ رہی تھیں، اُن کا گلابی چہرہ پھول کی طرح چمک رہا تھا۔ بغیر فریم کی عینک کے شیشوں سے دو بڑی بڑی آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ وہ کتنی اچھی دکھائی دے رہی تھیں۔

رفو بدستور اخبار میں مصروف تھے۔ میں نے شکیلہ کو سلام کیا۔ انہوں نے سر کی جنبش سے جواب دیا۔ نہ جانے اُن کے چہرے پر اتنی افسردگی کیوں تھی — میں نے دیکھا کہ شیشوں کے پیچھے اُن کی آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔

کہیں یہ آنسو تو نہیں؟ — نہیں! — ویسے ہی شیشوں کا چمکارا ہوگا — یونہی دھوکا ہوا — لیکن یہ دھوکا نہیں تھا۔

میرے دیکھتے دیکھتے موتی جیسے قطرے اُن کی پلکوں سے پھسلے اور رخساروں پر بہنے لگے۔

اب ہم موڑ کو طے کر رہے تھے — دھند بڑھتی جا رہی تھی۔ دو چار اُجلے اُجلے بادلوں کے ٹکڑے ہماری طرف بھاگے آ رہے تھے۔ میں شکیلہ کو دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے آنسو پونچھے نہیں یونہی رہنے دیئے۔ دھند بڑھتی گئی۔ بادل کے ٹکڑے ہمارے سامنے آ گئے اور سب کچھ میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

"کیا تھا — ؟" رفو چونک کر بولے۔

"کچھ نہیں —" میں نے یونہی جواب دیا۔

پھر راستے میں ہم نے ایک قوسِ قزح دیکھی جو نیچے وادی میں ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی تک چلی گئی تھی۔ بادلوں سے چند شعاعیں جھانکنے لگیں۔ اور قوسِ قزح میں بے شمار پانی کے قطرے موتیوں کی طرح چمکنے لگے۔ ہم ایک آبشار کے پاس سے گزرے۔ پانی کی پھوار دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ پتھروں پر ہم نے ننھے ننھے قطرے دیکھے جو بڑی مسرت سے ناچ رہے تھے۔

ایک تنگ سے راستے میں سے گزرتے ہوئے میری کہنی ایک جنگلی گلاب کو چھو گئی ——————
ٹپ — ٹپ — ٹپ ۔! شبنم کے چند قطرے میرے کوٹ پر آگرے ۔ گلاب کے پھول پر شبنم کے قطرے جمع تھے ۔ جن سے پھول کچھ اُداس سا لگتا تھا ۔ میں نے قطروں کو کوٹ سے جھاڑا نہیں ۔ یونہی رہنے دیا ۔ پھر میری نگاہ اپنی انگلی کی انگوٹھی پر جا پڑی جو شکیلہ نے مجھے دی تھی ۔ اُس کا جگمگ جگمگ کرتا ہوا اسفید نگ ! مجھے یوں لگا جیسے کسی کا آنسو جم گیا ہو ۔! مجھے نگ کی جھلملاہٹ میں آنسو کی لرزش دکھائی دی ——————— میں نے جلدی سے ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈال لئے ۔

شاید رفو کا اخبار ختم ہو چکا تھا ——— انہوں نے پھر باتیں شروع کر دیں ۔

شفیق الرحمٰن

تاریخ وفات مہاراجہ رنجیت سنگھ

کچھ دن ہوئے اپنے پرانے فارسی کتب خانے میں ایک قدیم قلمی نسخے کی ورق گردانی کرتے ہوئے مجھے اتفاقاً ایک صفحہ پر اپنے دادا صاحب مرحوم جناب رائے بھاگ سنگھ صاحب بھنڈاری رئیس اعظم و آنریری مجسٹریٹ بٹالہ سابق وکیل دربارِ لاہور کا بقلم خود لکھا ہوا مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ وفات سرکار حضور مہاراجہ رنجیت سنگھ صاحب بہادر سابق والئے پنجاب ۔ نظر پڑا ۔ چونکہ یہ ایک تاریخی حیثیت کی چیز ہے ۔ لہٰذا فارسی دان اربابِ ذوق کی ضیافتِ طبع کی خاطر اسے "ہمایوں" میں شائع کرا رہا ہوں یہ اُس زمانے کی یادگار ہے جب زبان کے جھگڑے پیدا نہ ہوئے تھے ۔

مادّہ تاریخ انتقال مہاراجہ رنجیت سنگھ بہادر

چوں مہاراجہ بہادر شیر دل رنجیت سنگھ — کوچ کرد از مُلکِ دُنیا جانبِ دارالبقا
سال و تاریخش عطا از راہ و رسم نغمہٗ — زد رقم بر تختۂ اندوہ یا درد و عنا

بے سرو پا گشت آہ از مرگِ او در روزگار
فضل و خیرات و شجاعت ثروت و مہر و سخا

سمت ۱۸۹۶ بکرمی

واضح رہے کہ دادا صاحب مرحوم کا اپنا سالِ وفات سمت ۱۹۴۱ بکرمی مطابق ۱۸۸۴ء ہے ۔ سمت ۱۸۹۶ بکرمی میں اُن کی اپنی عمر صرف اُنیس ۱۹ برس کی تھی ۔ اور اسی سن و سال میں وہ سرکارِ لاہور کی طرف سے بمقام لدھیانہ اپنے والد رائے کشن چند صاحب بہادر بھنڈاری وکیلِ دربارِ لاہور کی غیر حاضری میں بطور قائم مقام وکیل تقریباً ایک سال تک کام کرتے رہے تھے

رائے بھوانی سنگھ بھنڈاری

ٹھنڈی آگ

اب دید کی حسرت کا وہ انداز نہیں ہے
پرواز بجز حسرتِ پرواز نہیں ہے

یہ ہجرِ مسلسل ہے کہ ہے تلخیٔ انجام
اب روح میں وہ آتشِ آغاز نہیں ہے

آشفتگیٔ ہیبتِ شاہینِ خرد سے
اب مرغِ جنوں زمزمہ پرداز نہیں ہے

اللہ رے افسردگیٔ شوقِ حقائق
اب آرزوئے خلوتِ راز نہیں ہے

کل جس سے رگ و پے میں خروشاں تھا تلاطم
گونجی ہوئی اب دل میں وہ آواز نہیں ہے

بایں ہمہ دل میں خلشِ درد ہے باقی
کیا جوشِ محبت کا یہ اعجاز نہیں ہے

جوش ملیح آبادی

حسیات

میری نوائیں سن اسرارِ کائنات نہ پوچھ
کلام دیکھ مرا معنیٔ حیات نہ پوچھ

تو آکے سامنے دل کے تاثرات نہ پوچھ
جو ہو سکے نہ زباں سے ادا وہ بات نہ پوچھ

مری نوا سے محبت کا سوز حاصل کر
نجوم و حکمت و قانون کے نکات نہ پوچھ

دلِ حزیں کے لئے دردِ عشق پیدا کر
جو یہ نہیں تو علاجِ غمِ حیات نہ پوچھ

شبابِ حسنِ دل افزا کا اعتبار نہ کر
کمالِ مہرِ جہاں تاب کا ثبات نہ پوچھ

ضرور دیکھ تماشائے ہاؤ ہو دن بھر
مگر فقیہ کے عشرت کدہ کی رات نہ پوچھ

نہ پوچھ رسمِ وفا سے ہے کون کون آگاہ
دیارِ عشق میں اے دل کسی کی ذات نہ پوچھ

کسی کو راہگذر میں تو بیٹھ جانے دے
تو پوچھتا نہیں گر بے نوا کی بات نہ پوچھ

یہ دیکھ دردِ سکوں بخش مل گیا کس کو
ہے کون بزم میں محرومِ التفات نہ پوچھ

یہی سبب ہے باعثِ آرامِ جاوداں مجھ کو
نظیرؔ لطفِ غمِ کشتۂ فراق نہ پوچھ

اصغر حسین خاں نظیرؔ

لندنی دوست کے نام خط

تمہارا تقاضا درست لیکن میں اگر لاکھ بار بھی تمہیں سمجھانے کی کوشش کروں تو تم اس کو نہیں سمجھ سکو گے، کیونکہ یہ یہاں کی سیاست ہے تم کو گلہ ہے کہ ہمارے قومی پیشوا اور سیاست دان کبھی کچھ کہتے ہیں اور کبھی کچھ لیکن لندن میں بیٹھے ہوئے تم اس ڈرامے کا آخری منظر تو بالکل نہیں دیکھ سکتے تمہیں تو ہمارے پیشواؤں اور رہنماؤں کی دو روئی کی شکایت ہے۔ اور یہاں یہ رونا ہے کہ یہ حضرات کبھی کچھ کہنے اور کبھی کچھ اور کہنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ جب کرنے پر آتے ہیں تو کچھ اور ہی کر ڈالتے ہیں۔ اور جب قوم کی طرف سے صدائے احتجاج بلند ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم نے تو کچھ کہا ہی نہیں تھا۔ اور اگر اُن کی حرکات کا عملی ثبوت پیش کر دیا جائے تو اپنے کئے ہوئے سے بھی منکر ہو جاتے ہیں تم کہ رہے ہوگے کہ ایسے رہنماؤں کو عہدِ بربریت کی سزائیں دے کر مار دینا چاہیئے یعنی یا تو اُبلتے ہوئے تیل کے کڑھاؤ میں زندہ پھینک دینا چاہیئے یا بیل کی کھال میں زندہ بند کر کے پہاڑ کی چوٹی سے لڑھکا دینا چاہیئے لیکن تمہارے تخیل کی مقصد آفرینی سے کیا ہوتا ہے یہاں اِن رہنماؤں کے حاشیہ بردار چھوٹے چھوٹے لاتعداد رہنما ہیں جو دن رات اپنی دُون ہمتی کی وجہ سے اور اپنی زلّہ رُبائی کے پیشِ نظر اِن رہنماؤں سے خود تو لڑتے رہتے ہیں لیکن جہاں قوم کی طرف سے بڑے رہنما کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی وہیں یہ سب چھوٹے بڑے رہنما ایک ہو کر قوم پر پل پڑتے ہیں۔ تمہیں یاد ہے تم ایک دفعہ یہاں ہمارے گاؤں میں ہم سے ملنے آئے تھے اور گاؤں کی چار دیواری کے باہر جنگلی کتوں نے تمہارا کتنا شاندار استقبال کیا تھا یہاں تک کہ تم اپنی چھڑی کھیتوں ہی میں چھوڑ آئے تھے۔ اور پھٹی ہوئی شلوار کو سیتے ہوئے تم نے ہمارے گاؤں کے تاثرات میں سے سب سے پہلے جس چیز کا ذکر کیا تھا وہ ہمارے گاؤں کے کتوں کے قومی اتحاد کا مظاہرہ تھا۔ لیکن شام کو صحن میں بیٹھے ہوئے جب ہم نے کھانا کھانے کے بعد ہڈیاں چند کتوں کی طرف پھینکیں تو یہ دیکھ کر تمہاری حیرت کی انتہا نہ تھی کہ وہ کتے جو دن کو تمہیں اجنبی سمجھتے ہوئے یک جان ہو کر تمہاری تکا بوٹی کرنے پر آمادہ ہو رہے تھے وہی کتے رات کو چچوڑی ہوئی ہڈیوں کو تقسیم کرنے کے لئے ایک دوسرے کے گلے پر لپک رہے تھے۔ میں جب اپنی قوم اور اپنے رہنماؤں کو دیکھتا ہوں تو معاً مجھے تمہارا اپنے گاؤں میں آنا یاد آ جاتا ہے۔ اور اُس منظر کی تمام جزئیات ایک مستقل حقیقت بن کر ایک عرصے تک میری آنکھوں کے سامنے ناچتی رہتی ہیں۔ وہی اجنبی قوم ہے جس سے رہنما اتنے ہی بیگانہ ہیں جتنے ہمارے گاؤں کے کتے تم سے تھے پھر یہ قوم تمہاری طرح اپنے قدم اپنی منزلِ نجات کی طرف بڑھانا چاہتی ہے لیکن قومی رہنما یک جان ہو کر اس کے جیب و دامن سے حرص و آز کے دانت کھول کر لپٹ جاتے ہیں تمہارے پاس چھڑی تھی۔ قوم کے پاس چھڑی بھی نہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر بار جب قوم پر رہنماؤں کا حملہ ہوتا ہے تو قوم زخموں سے چُور چُور ہو کر نڈھال ہو جاتی ہے۔ اور قوم کے لئے آسودگی کا زمانہ صرف وہی ہوتا ہے جب رہنماؤں کا آقا کوئی چچوڑی ہوئی ہڈی اُن کے سامنے

پھینک دیتا ہے اور وہ تمہیں خوش آمدید کہنے والے حیوانوں کی طرح پھر ایک دوسرے کے گلے پر لپکتے ہیں۔ لیکن اُن کی اس دھینگا مشتی سے قوم کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس کے زخموں سے جو خون کی ندیاں بہ رہی ہوتی ہیں اُن کا اندمال اس سے ممکن نہیں۔ تم کہہ دو گے قوم کیوں اپنے آپ میں یہ طاقت پیدا نہیں کرتی کہ ان بھیڑیوں سے نجات پائے لیکن ذرا اُس بیچارگی اور بے بسی کا بھی تصور کرو جو اس وقت قوم پر مستولی ہے۔ اس قوم کا ایک رہنما بازار میں کھڑا ہوا قوم کے سامنے کہ رہا تھا "مجھے قوم صرف چند ہزار روپے ماہوار دیتی ہے اور یہ حقیقت بالکل نظر انداز کر دیتی ہے کہ میرے پانچ بچے ہیں میں اُن کے مصارف کس طرح پورے کر سکتا ہوں" لیکن قوم کے اسی مجمع میں ایک فاقہ کش انسان پیٹ پر پتھر باندھ کر کھڑا ہوا یہ سب کچھ سن رہا تھا اور جی میں کہ رہا تھا کاش کہ مجھے چند پیسے ہی روز مل جایا کریں جن سے میں اُن درجنوں بچوں اور عورتوں کا پیٹ پال سکوں جن کا بوجھ میرے کندھوں پر پڑا ہوا ہے اس انسان کی آرزو ہزاروں روپے ماہوار کمانے کی نہ تھی۔ اُسے صرف چند ہزار پیسے بھی ماہوار درکار نہ تھے لیکن مصیبت تو یہ تھی کہ اُسے چند سو پیسے ماہوار بھی میسّر نہ آرہے تھے۔ غور کرو ایسا آدمی کس بل بوتے پر اپنی بیچارگی کو قومی رہنما کی گرسنگی سے لڑا سکتا تھا۔ اُسے غصّہ بھی آتا تھا تو وہ یہ کہ کر اپنے دل کو تسکین دے رہا تھا کہ وہ قومی رہنما کا یہ بیان قبر میں اپنے ساتھ لے جائے گا اور خدا کو جا کر دکھائے گا کہ دیکھ :۔

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے؟ بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے؟
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم! بخیلی ہے، یہ رزّاقی نہیں ہے!

تم کہو گے میں اقبالی ہونے کی وجہ سے ایسے خیالات کی اشاعت کرتا رہتا ہوں لیکن تم بھی حقیقت کو کیسے پس پشت ڈال سکتے ہو؟ حقیقت تلخ سہی لیکن اُس کے وجود سے کیسے منکر ہو سکتے ہو؟ اقبال نے اسی قوم اور انہی لیڈروں کو دیکھ کر کہا تھا :۔

مسلم ایں کشور از خود نا اُمید قرن ہا شد با خدا مردے ندید
بندۂ رد کردۂ مولا ست او مفلس و قلاش و بے پرواست او
نے بکف مالے کہ سلطانے بَرَد نے بدل نُورے کہ شیطانے بَرَد
شیخ او لُرد فرنگی را مرید گرچہ گوید از مقام بایزید

گفت دیں را رونق از محکومی است
زندگانی از خودی محرومی است

کون سا دل ہے جو یہ بات سُن کر قوم کی حالت پر آٹھ آٹھ آنسو نہ روئیگا لیکن تم پھر کہہ دو گے کہ اس سے کیا ہوتا ہے۔ ضرورت عمل اور قوتِ عمل پیدا کرنے کی ہے مگر تم یہ نہیں سوچتے کہ یہاں لندن کی آزاد سیاسی فضا میں پلا پوسا ہوا فرد یہ ضمیر بھی گھٹ گھٹ کر نحیف ترین حالت تک پہنچ جاتا ہے میں کل ڈیلی ٹیلیگراف کا ورق دیکھ رہا تھا جس میں اُن دو آزاد دنیاؤں کی تصویر چھپی ہوئی ہے

جو ایک ریڈیو کے کھمبے پر چڑھ کر چیمبرلین آنجہانی کے خلاف نعرے لگا رہے ہیں یاد ہے اس واقعہ کی تفصیل اخبار میں دیکھ کر ہم تم دونوں مقدمے کا فیصلہ سننے گئے تھے تو یہ دیکھ کر حیران ہوئے تھے کہ وزیر اعظم پر پھبتیاں کسنے والوں کو پانچ پانچ شلنگ جرمانہ ہو گیا تھا۔ اور ہم نے جب فلس سے اس کا ذکر کیا تھا تو وہ کہتی تھی "ہم انصاف پسند لوگ ہیں۔ اگر ہم میں سے کسی کو وزیر اعظم کا چہرہ بھلا معلوم نہیں ہوتا تو ہم کیوں نہ اس کے متعلق اظہار خیالات کریں"۔ اور تم نے فوراً ہی طنز کے طور پر اُس سے کہہ دیا تھا "ہاں ہاں تمہاری کیا بات ہے نہیں تو بادشاہ پسند نہ ہو تو تم اُس کو بھی ملک سے نکال دیتے ہو۔ وزیر بیچارہ کس کھیت کی مولی ہے"۔ اور پھر ایک لمبا قہقہہ ہم سب نے لگایا تھا یعنی یہ سب باتیں فلس کے ملک میں ہی مبارک ہیں۔ یہاں ان خیالات کا تصوّر کرنا بھی سیاسی گناہ اور تصوّر کرنے والا گردن زدنی سمجھا جاتا ہے۔

خیر یہ قصہ چھوڑو نہیں ایک بات سناتے ہیں میں اور بیگم موچی دروازے سے گھر جا رہے تھے جب اُس دکان کے قریب پہنچے جہاں ہم تم دونوں کباب کھانے جایا کرتے تھے تو اُس کے قریب ہی مچھلی فروش کی دوکان پر نظر پڑی۔ نیچے گری ہوئی غلاظت سے ایک نوجوان لڑکی کچھ چن چن کر ایک برتن میں ڈال رہی تھی بیگم اور میں معیارِ زندگی پر گفتگو کر رہے تھے۔ میری رائے یہ تھی کہ غلام ملک میں غلام زادوں کو کوئی معیارِ زندگی رکھنے کا حق ہی نہیں۔ بیگم مسز نارافن بوڑھی تھیں میں نے اُس لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "آپ اس ملک میں معیارِ زندگی قائم رکھنا چاہتی ہیں جہاں ایسے مناظر بھی کثرت سے آپ کے مشاہدے میں آتے ہیں"۔ بیگم کہنے لگیں "آپ کو کیا معلوم یہ لڑکی مچھلیوں کے غلیظ ٹکڑے کس لئے چن رہی ہے؟" میں نے کہا "ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے"۔ اتنے میں ہم دکان کے سامنے پہنچ چکے تھے میں نے بڑھ کر لڑکی سے پوچھا:-

"کیوں بہن اسے کیا کرو گی؟"

"مچھلی والا لال لال بنا چہرے سے بدستور مچھلی صاف کر رہا تھا۔ لڑکی اور لڑکی کا فعل اور ہمارا استعجاب اُس کے لئے سب کچھ بے معنی تھا۔ لڑکی مچھلی کی دو موٹی موٹی آنکھیں ہاتھوں میں مسلتی ہوئی اپنے کام سے رُک گئی۔ وہ حیران ہو کر سوچ رہی تھی کہ ان کو کیا جواب دوں۔ یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں کہ میں یہ غلاظت کیوں چھان رہی ہوں لیکن یہ سمجھتے ہوئے بھی سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ بالآخر اُس نے کہا:-

"آپ مچھلی کو کیا کرتے ہیں؟"

"ہم تو پکاتے ہیں"

"میں اس کو پکاؤں گی"

"اس میں پکانے والی کون سی چیز ہے؟" بیگم نے پوچھا۔

"بی بی جی۔ ہم مچھلی تو نہیں خرید سکتے۔ یہی چند ٹکڑے میں کبھی کبھی جمع کر کے لے جاتی ہوں اور پکا لیتی ہوں۔ میری ماں اور بھائی سب خوش ہو کر کھا لیتے ہیں"۔

ہم آگے چل دیئے۔ وہ بدستور مچھلی کی دو موٹی آنکھیں انگلیوں میں دبا رہی تھی بیگم خاموش ہو گئی حیرت یا صدمے سے۔ یہ میں

معلوم نہیں کرسکا۔ بہرحال میرا دعویٰ صحیح ثابت ہوچکا تھا۔ اس لئے میں نے پھر اُسی موضوع کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہا:۔
"کیا ایسی قوم معیارِ زندگی کا ذکر کرتے ہوئے دوسرے ملکوں کا مُنہ نہیں چڑاتی تھا اور کیا کرتی ہے"۔

اب بیگم نے اپنا نظریہ تبدیل کرلیا تھا۔ کہنے لگیں "ممکن ہے آپ درست کہہ رہے ہوں لیکن میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ آپ نے جس قوم کے معیارِ زندگی پر بحث چھیڑی ہے وہ قوم کہیں ہے بھی یا نہیں؟"۔

میں نے کہا "قوم تو ہے"

بیگم بولیں "آپ کے تخیل میں ہوگی لیکن حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ قوم کے مختلف عناصر میں ایک یگانگی ایک ہم آہنگی ہوتی ہے۔ آپ کے ہاں یہ بالکل مفقود ہے۔ نہ صرف قوم کے مختلف افراد ایک دوسرے سے ہر لحاظ سے بالکل مختلف ہیں بلکہ اُن کا قومیت کا تصور بھی مختلف ہے۔ اور پُر لطف بات یہ ہے کہ وہ اپنے تصور کو بھی حقیقت میں تبدیل کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے۔ ایک آدمی کہتا ہے کہ اس کا مذہب اُس کی قومیت ہے۔ دوسرا چلاّتا ہے اُس کا وطن اُس کی قومیت ہے لیکن نہ یہ کسی مذہب کا پابند ہے نہ وہ کسی وطن کا مالک ہے۔ کہیئے اِن حالات میں قوم کہاں موجود ہے۔ اگر قوم موجود ہوتی تو اُس کے مختلف افراد کم از کم یہ دیکھتے کہ جہاں چند آدمیوں کی میز پر پانچ چھ قسم کے کھانے ہر کھانے کے وقت موجود ہوتے ہیں، وہاں اس غریب لڑکی کی ہنڈیا میں ہر وقت ایک کھانے کا سامان تو پہنچ جایا کرتا۔ آپ کو یاد ہوگا خالدہ ادیب خانم نے جامعہ ملیہ کے ایک لیکچر میں کہا تھا سچ ہے کہ انسان صرف پیٹ کا بندہ نہیں ہے مگر جب تک پیٹ نہ بھرے وہ زندہ ہی نہیں رہ سکتا اور زندگی کی ضروریات میں پیٹ کی روٹی کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی داخل ہیں۔ ایک خاص معیارِ زندگی سے نیچے اتر کر انسان کولھو کا بیل بن کر رہ جاتا ہے۔ وہ زندگی کا چکر کسی نہ کسی طرح اس اُمید پر کاٹتا رہتا ہے کہ دوسری دنیا میں اُسے آرام ملے گا لیکن ایسے شخص کو یہ سمجھانا مشکل ہے کہ کوئی خاص سرزمین اس کا وطن ہے"۔

بیگم خاموش ہوگئیں میں گہرے سوچ میں پڑ گیا خالدہ کے الفاظ مجھے بار بار یہ محسوس کرا رہے تھے کہ میرا کوئی وطن نہیں میری کوئی قوم نہیں۔ قوم اور وطن کے تصور کے ساتھ جو آسودگیاں اور تحفظ دوسرے ممالک میں انسان محسوس کرتا ہے وہ یہاں بالکل مفقود تھے۔ میں سوچنے کے باوجود کوئی دو آدمی ایسے جمع نہ کرسکا جو اپنے آپ کو ہم قوم کہتے ہوئے اپنے سامنے ایک ہی مقصدِ زندگی بھی رکھتے ہوں مقصدِ زندگی تو خیر بڑی بات تھی کوئی دو ایسے آدمی بھی ذہن میں نہ آئے جو ایک ہی طرح کی زندگی بسر کر رہے ہوں۔ قومیت کی بنیادیں مذہب، نسل اور زبان پر رکھی جاتی ہیں۔ دوسرے لوگوں کے حالات تو میں اچھی طرح جانتا نہیں لیکن نو کروڑ کلمہ گو اور اسلام نام پر بظاہر جان دے دینے والے ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کرسکے کہ اُن کا مذہب اسلام ہے یا وہ سنی اور شیعہ ہیں۔ اور مسلمان ہونا زیادہ اہم ہے یا سنی اور شیعہ ہونا۔ یہ مذہب کی کیفیت ہے نسلی امتیاز کی حدود تو کسی اندازے میں نہیں سما سکتیں۔ خدا نے ایک مرتبہ نہیں بار بار قرآن میں کہا کہ گورے کو کالے پر کوئی فوقیت نہیں لیکن یہاں کئی کئی ہزار صفحوں کی ضخامت کی کتابیں ہر سال قانون اور گوتوں پر

شائع ہوتی ہیں۔ اوران کو پڑھنے والے جب اپنی ذات کی تعریف ان کتابوں میں دیکھتے ہیں تو اپنا غلام ہونا تک فراموش کردیتے ہیں۔ تم ہی کہو غلام ابنِ غلام اگر سیّد بھی ہو تو کس بات پر ناز کرسکتا ہے۔ اور زبان کے سلسلے میں تو ہم نے کمال ہی کردیا ہے مینار بابل پر شاید اتنی مختلف آوازیں سنائی نہیں دیتی ہونگی جتنی ہندوستان کا مسلمان بول رہا ہے۔ پھر ایک قوم ہونے کا شور مچاتا ہے تو نہ جانے کیا سمجھ کر ایک وطن بنانے کی فکر میں بھی ڈوب ڈوب جاتا ہے۔ پاکستان کے تمام لیڈر جب ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو فرنگی کی زبان کے سوا اور کسی زبان میں گفتگو نہیں کرسکتے۔ کہو اُن مسلمانوں کا کیا ہوگا جو ہندوستان میں ۹۵ فیصدی سے زیادہ تعداد میں فرنگی کی زبان کے کبھی قریب بھی نہیں آئے۔ ان بے زبانوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے جب ان کی زبان ہی نہیں سمجھتے تو اس پراگندہ مجمع کو وہ ایک قوم بنا کر کیسے ایک جگہ لا کھڑا کریں گے، اور جب تک یہ نہیں ہوگا وہ پاکستان کی تحصیل کہاں سے کریں گے یقینی میں جب یہ سوچتا ہوں تو میرا ذہن معمّوں کے دریا میں تیرنے لگتا ہے اور عقل اُلجھنوں کے سمندر میں کھو جاتی ہے۔ شاید تم وہاں سے ان مسائل کا کوئی حل تجویز کرسکو۔

محمد باقر

میری محبت

اُس گھاس کی طرح ہے۔
جو اونچے پہاڑوں کی گہری گھاٹیوں میں اُگتی ہے۔
اور روز بروز بڑھتی چلی جاتی ہے
مگر جس کا کسی کو علم نہیں۔

جاپانی — انور خاں انور

---

*

جوانی کا گیت

اے خدا اے ابنِ آدم کی تمنّاؤں کے خواب
آج ملنا چاہیئے شاعر کی باتوں کا جواب

میں نے مانا تو نے بخشا مجھ کو وہ قلبِ حزیں
کانپتا ہے جس کی سرحد میں دلِ روح الامیں!!

میں نے مانا تو نے دی مجھ کو وہ روحِ بیقرار
جس کی ہر جنبش سے پیدا نغمۂ سازِ بہار!

میں نے مانا آنکھ کو اشکوں کی شادابی بھی دی
میں نے مانا دل دیا اور دل کو بیتابی بھی دی!!

میں نے مانا تو نے دی مجھ کو جوانی کی بہار
جس کی ہر لغزش حریفِ گردشِ لیل و نہار!

میں نے مانا نطق کو بخشا وہ حُسنِ لاجواب
جس کی ہر دلکش ادا آئینہ دارِ انقلاب!

اور مجھ کو جوہرِ قابل بنانے کے لئے
آسمانی گیت دنیا کو سنانے کے لئے

میرے نغموں میں سمو دیں رات کی رنگینیاں
بربطِ ناہید کی خاموش لرزش کا سماں!

مُشتری کو حکم، سازِ دل کو میرے چھیڑ دے!
چاند کا یہ فرض، مجھ کو رات بھر تکتا رہے!!

اور پھر موجِ صبا کا اوّلیں یہ کام ہے
مجھ سے کہدے کتنا دلکش صبح کا ہنگام ہے

سب بجا۔ یہ "التفاتِ خاص" لیکر کیا کروں؟
سچ بتا، اس سے ملا کرتا ہے کیا دل کا سکوں؟

وہ مسرت کیا جو یوں آٹھوں پہر بیتاب ہو!
اے خدا وہ ساز کیا جو تشنۂ مضراب ہو!

کوئی بھی میری صدا پر جھومنے والا نہیں
صحنِ دل میں چپکے چپکے گھومنے والا نہیں

کوئی بھی معصوم بیچینی سے گھونگھٹ کھولکر
مجھ سے کہتا ہی نہیں کیوں چپ ہو آج اتنے نظرؔ

کوئی بھی ایسا نہیں میں جس کو دِل نذر دوں
کوئی بھی ایسا نہیں میں پاؤں جس کے چوم لوں

کوئی بھی سہمے ہوئے اب باغ میں آتا نہیں
پتیوں کی کھڑکھڑاہٹ سے بھی گھبراتا نہیں

کوئی بھی ندی کنارے مجھ کو تڑپاتا نہیں
چاندکی بیباک نظروں سے بھی شرماتا نہیں

آہ کیسا ظلم ہے اے رحمتِ پروردگار
تیرا بندہ اور یوں بے چینیوں کا ہو شکار

کیا نہیں ممکن کہ میرے گیت سننے کیلئے
میرے اشکوں کے انوکھے پھول چننے کے لئے

کوئی البیلی کرے پنگھٹ پہ میرا انتظار
جس کے سینے میں مچلتے ہوں محبت کے شرار

کوئی سلمیٰ میرے باغِ زندگی میں مسکرائے
کوئی عذرا میرے غم میں اپنا دل آنکھوں میں لائے

کوئی شیریں دے مجھے چھپ چھپ کے الفت کا پیام
کوئی لیلیٰ ہو مری دیوانگی سے ہمکلام

کوئی رادھا بانسری کی لے میں کھو جایا کرے
شیام کی خود رو جواں سالی کو بہلایا کرے

یہ نہیں ممکن تو مجھ سے نوجوانی چھین لے!
نوجوانی کیا، مذاقِ زندگانی چھین لے!!

نظرؔ حیدرآبادی

ناشر

کردار

محمود — ناشر

جمیل — مصنف

اختر — ایک دوسرا مصنف

عقیل — جمیل کا بیٹا

ظفر — مطبع کا منیجر

محمود کا کمرہ — ایرانی قالین بچھا ہوا ہے۔ دیواروں پر زیادہ تر عورتوں کی تصویریں آویزاں ہیں میز، کرسیاں، صوفے اور بنچیں پڑی ہوئی ہیں۔ دیوار پر لگی ہوئی گھڑی اپنی مخصوص زبان میں ٹک ٹک کر رہی ہے۔ برقی پنکھا اپنی پوری رفتار سے چل رہا ہے۔ ایک طرف کچھ نیچے ریڈیو پر گانا سن رہے ہیں۔ محمود آرام کرسی پر دراز ہے، اسی وقت ملازم کسی کے آنے کی خبر دیتا ہے۔ محمود کی اجازت سے اجنبی داخل ہوتا ہے۔

اجنبی (دبلا پتلا، پھٹے پرانے کپڑے، ادب سے سلام کرتا ہے) ناشر صاحب کئی بار حاضر ہوا تھا لیکن بدقسمتی سے نیاز حاصل نہ ہو سکا۔

محمود۔ آپ کہاں سے آئے ہیں؟ کیا کام ہے؟

اجنبی۔ مجھے جمیل کہتے ہیں۔ میں نے علیگڑھ یونیورسٹی سے بی۔اے پاس کیا ہے اردو ادب سے خاص دلچسپی ہے۔ دو ایک کتابیں بھی لکھی ہیں۔ آپ اس صوبے کے بہت بڑے ناشر ہیں میری التجا ہے کہ آپ مجھے بھی کچھ کام دیدیں۔

محمود۔ (اکڑ کے ساتھ ٹانگ پھیلاتے ہوئے) او ..... آپ کتاب وتاب لکھا کرتے ہیں! مصنف ہیں! مصنفوں نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے۔ خیر۔ بیٹھئے (بنچ کی طرف اشارہ کرتا ہے)

جمیل۔ (بنچ کے ایک کونے پر بیٹھ جاتا ہے۔ اور بڑی ہی لجاجت سے کہتا ہے) کیا کیا جائے۔ نوکری تو ملتی ہی نہیں۔ تجارت کے لئے روپیہ چاہیئے۔ بغیر ٹکوں کے تو گھر میں چوہے ڈنڈ پیلتے ہیں۔ بال بچے والے آدمی کریں تو کیا کریں۔ بڑی تباہی ہے آپ پچاسوں مصنفین کو کام دیتے ہیں مجھے بھی ممنون فرمایئے۔

محمود۔ (غرور سے) ارے صاحب۔ کس کس کو کام دیں؟ آخر ہم نے کوئی یتیم خانہ تو کھول نہیں رکھا۔ جانے آپ جیسے کتنے مصنف آتے رہتے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے۔

جمیل۔ (گڑگڑا کر) ہاں۔ آپ ٹھیک فرماتے ہیں۔ جو کوئی آتا ہے تو آپ کو بڑا سمجھ کر ہی آتا ہے۔ میں بھی حاضر ہوا ہوں۔ مایوس نہ کیجئے۔

محمود۔ (فخر سے) اجی حضرت۔ آپ کیا پوچھتے ہیں میری اشاعت بہت پھیل گئی ہے ہر سال نئی نئی کتابیں چھپواتا رہتا ہوں۔ نہ جانے اس گھر کی بدولت کتنوں کی زندگی بسر ہو رہی ہے۔

جمیل۔ ہاں صاحب۔ اس میں کیا شک ہے۔ اسی لئے تو میں نے آپ کا دامن تھاما ہے۔

(اسی وقت نوکر ناشتہ اور کچھ پھل لے کر آتا ہے اور محمود کے آگے چھوٹی میز پر رکھ دیتا ہے محمود مزے لے لے کر کھانا شروع کر دیتا ہے۔ ساتھ ہی بڑی بے پروائی سے باتیں بھی کرتا ہے)

محمود۔ ہاں تو آپ کس قسم کی کتابیں لکھتے ہیں؟

جمیل۔ مجھے تاریخ سے اچھا لگاؤ ہے۔ بی۔ اے میں یہ میرا مضمون بھی تھا۔ اسی لئے میں تاریخی کتابیں اچھی لکھ سکوں گا۔

(اختر کا ورود۔ عمر تقریباً ۲۵ سال۔ سفید شیروانی، پاؤں میں چپل اور ایک معمولی رومی ٹوپی پہنے ہوئے ہے)

محمود۔ (اختر کی طرف دیکھ کر بڑے ہی تپاک سے) اخاہ۔ آپ تو عید کا چاند ہو گئے۔ بڑی مدت سے دید نہ ہوئی۔ تشریف رکھئے (اختر کرسی پر بیٹھنا چاہتا ہے لیکن محمود اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر والے صوفے پر بٹھا لیتا ہے) کہئے اور تو سب خیریت؟

اختر۔ (بڑی اداسی سے) خدا کا فضل ہے۔ کھانے کو روکھی سوکھی مل ہی جاتی ہے لیکن آج کل گھر چلانا بڑا ہی مشکل کام ہے۔ (خوشامد کے لہجہ میں) سچ تو یہ ہے صاحب آپ نے اردو ادب کی جیسی خدمت کی ہے ویسی نہ تو مولوی عبدالحق صاحب نے کی اور نہ اقبال ہی نے چھوٹے موٹے لوگوں کا ذکر ہی کیا۔ ایک دو نہیں پچاسوں اردو کی کتابیں شائع کرانا کیا کوئی بچوں کا کھیل ہے؟

محمود۔ (خوش ہو کر) پچاسوں نہیں جناب، سیکڑوں کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں۔ ابھی کیا ہے۔ خدا چاہے تو یہ تعداد بڑھتی ہی جائیگی۔

اختر۔ ہاں۔ ہاں میں نے کہا تا کہ آپ کی زندگی ہی ادبی خدمت کے لئے ہے۔ آپ جیسے لوگ ڈھونڈے نہیں ملیں گے جب تک آپ

جیسے سچے ادبی محسن زندہ ہیں ہمارا ادب برابر ترقی کرتا رہیگا۔ دنیا آپ کی سچی اور پُرخلوص خدمت کی قدر کریگی۔ ہاں۔ باتوں باتوں میں بات مجھے ایک بات یاد آ گئی کچھ دن پہلے۔ یہی کوئی چار چھ مہینے ہوئے ہونگے۔ آپ نے سائنس اور تجارت پر ایک کتاب لکھنے کے لئے مجھ سے کہا تھا مگر اُس وقت میں ذرا عدیم الفرصت تھا۔ اب آپ جس قسم کی کتاب چاہیں میں لکھ سکتا ہوں۔

محمود۔ آپ تو بڑے قابل آدمی ہیں! غالباً اب تو آپ ہر شعبہ کی کتاب لکھ سکیں گے۔

اختر۔ (بڑے اطمینان سے) ریاضی، قواعد، فلسفہ، منطق، جغرافیہ، تاریخ جس پر بھی آپ فرمائیں بہت جلد کتابیں تیار کر لوں گا۔

جمیل۔ (حیرت سے اختر کی طرف منہ کر کے) اوہو! آپ اتنے شعبوں پر حاوی ہیں، تب تو ......

اختر۔ (محمود کی طرف دیکھتے ہوئے) ارے صاحب۔ آپ ہیں کون؟ ان کا اس طرح ہماری باتوں میں مخل ہونا ٹھیک نہیں۔ آخر ان کی تعریف؟

محمود۔ (بڑی بے پروائی سے) کوئی نہیں۔ ویسے ہی چلے آئے ہیں۔ کتاب وتاب لکھا کرتے ہیں۔

اختر۔ (جمیل کی طرف منہ کر کے) ارے بھئی۔ تم ابھی بچے ہو تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔ کبھی جنرل مرچنٹ کی دکان پر گئے ہو؟ اُسے الپین سے لے کر ریڈیو تک بھی رکھنا پڑتا ہے

جمیل۔ معاف فرمایئے۔ آنقر (مصنف) اور جنرل مرچنٹ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ چہ نسبت! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟۔

اختر۔ جناب آپ کو اس شعبہ کی ذرا بھی معلومات نہیں۔ ورنہ آپ ہرگز ایسا نہ کہتے۔ "لٹریری جنرل مرچنٹ" یا "ادبی عطار"

بغیر کسی قسم کا کام نہیں چلتا۔ بُرا ماننے کی بات نہیں۔ اچھا آپ......

محمود۔ جانے بھی دیجئے۔ (جمیل کی طرف مخاطب ہو کر) ہاں جناب ضرورت تو نہ تھی مگر جب آپ کئی بار آئے ہیں۔ جیسا آپنے خود کہا ہے، تو ہم آپ کو ایک کام دیئے دیتے ہیں۔ ٹھیک ٹھیک انجام دینا ہوگا۔ گڑبڑ نہ ہونے پائے۔

جمیل۔ (تشویش سے) بڑی مہربانی ہوگی میں بڑے اہتمام سے انجام دوں گا۔ آپ بہت خوش ہوں گے۔

محمود۔ ہاں تو آپ برار کی قدیم تاریخ لکھ لائیے۔ ڈھائی سو صفحے سے زیادہ نہ ہو۔ پسند آنے پر پینتیس روپے معاوضہ دیا جائیگا۔

جمیل۔ (تعجب سے) اتنے بڑے کام کے لئے صرف پینتیس روپے! جناب تین مہینے سے کم میں یہ تاریخ مکمل نہ ہو سکیگی۔ ذرا محنت کا تو اندازہ لگایا ہوتا۔

(تین مہینے سن کر اختر بڑے زور کا قہقہہ لگاتا ہے اور محمود بھی مسکراتا ہے)

محمود۔ بھئی آپ نئے آدمی ہیں۔ اتنے معمولی کام کے لئے کوئی پینتیس روپے نہیں دیگا۔ میں نے تو آپ کی سادہ لوحی پر ترس کھا کر اتنی رقم کہدی ہے۔

جمیل۔ (لجاجت سے) میں غریب آدمی ہوں کئی بچے ہیں۔ بیوی ہے۔ مہربانی فرما کر کچھ اور بڑھا دیجئے۔

محمود۔ خیر جب آپ اتنا کہہ رہے ہیں تو پندرہ روپے اور سہی کل پچاس روپے ملیں گے۔ پندرہ کتاب چھپنے کے بعد پینتیس فروخت ہونے پر۔ اس سے قبل ایک پائی بھی نہیں دی جائیگی۔ اگر منظور ہے تو لکھئے ورنہ جانے دیجئے۔

جمیل۔ (دل ہی دل میں) چلو ایسا ہی سہی ایک بڑی کتاب تو شائع ہو جائیگی ایک مؤرخ کی حیثیت سے روشناس ہو جاؤنگا۔ (جمیل) آپ کی مرضی میری استدعا ہے کہ پینتیس روپے کتاب لکھنے پر دلا دیئے اور ۱۵ چھپ چکنے پر۔ اس سے میرا بہت کام چل جائیگا بڑا احسان ہوگا۔

محمود۔ (جھڑک کر) آپ بکواس بہت کرتے ہیں۔ آپ جیسے مصنفوں سے روز پالا پڑے تو ناک میں دم ہو جائے۔ اچھا اب مجھے دوسرا کام کرنے ہیں۔ آپ جا سکتے ہیں۔

(جمیل محمود کے کمرے سے باہر آتا ہے۔ اور دروازہ پر کھڑے کھڑے بڑے ہی انہماک سے کچھ سوچنے لگتا ہے)

اختر۔ (محمود سے) اجازت دیجئے میں بھی چلوں۔ کہئے۔ کس کتاب کے لئے فرماتے ہیں۔ اب کی بار میں "رامائن" کو گیتا پسند کروں گا۔

محمود۔ آپ کے لئے کیا بتاؤں! جو لکھ دیں وہی کام کی چیز ہوگی اچھا یہ تو فرمایئے۔ کوئی منظوم کتاب لکھ سکیں گے۔

اختر۔ (ہنستے ہوئے) یہ بھی خوب کہی! شاعری تو میرے گھر کی لونڈی ہے۔ آپ کہیں تو مہینے میں بیس دیوان تیار کر سکتا ہوں عرش سے فرش تک ساری چیزوں پر ہر صنف میں طبع آزمائی کر سکتا ہوں۔

محمود۔ اوہو! آپ تو واقعی بڑے لائق ہیں۔ اچھا تو آپ ایک "مرثیہ کربلا" لکھ لایئے۔ تین سو صفحوں سے زیادہ نہ ہو۔

اختر۔ بس ایک ہی کتاب۔ اور کچھ نہیں؟

محمود۔ یہ تو میں نے اپنی طرف سے کہا ہے۔ اور جو بھی دو چار کتابیں آپ لکھ لائیں گے انہیں بھی خوشی سے چھپوا دونگا۔ اور دوسری کتابیں تو جب آپ چاہیں دیجئے لیکن "مرثیہ" والی کتاب دو ڈھائی مہینوں میں مل جانی چاہیئے۔

اختر (حیرت سے) دو ڈھائی مہینے! تو کیا آپ نے مجھے قتنا بودم سمجھ رکھا ہے۔ جو اس معمولی سی کتاب کے لئے دو ڈھائی مہینے لگا دوں گا؟ ....

اجی حضرت! وہ تو یہی احمق ہے جو اتنی سی معمولی بات کے لئے تین مہینے کا وقت مانگ رہا تھا! مجھ سے کہیں تو اتنے دنوں میں تیرہ تاریخیں مرتب کر ڈالوں۔ خیر۔ میرے اس مرثیہ پر آپ رائلٹی کیا دیں گے؟

محمود۔ دوسروں کو اٹھارہ لیکن آپ کو بائیس فیصد۔ اتنی رائلٹی بہت کم کتابوں پر دی جاتی ہے لیکن آپ سے تو ہمارے خاص تعلقات ہیں۔

اختر۔ نہیں صاحب پچیس[25] فیصد دیجئے پھر دیکھئے کیا لاجواب کتاب لکھتا ہوں۔ بولنے لگیگی ۔ بولنے۔

محمود۔ خیر لکھ تو ڈالئے۔ آپ سے پچیس[25] روپے کچھ بڑھ کر نہیں۔

(معمولی سوچ بچار کے بعد اختر اپنے گھر جاتا ہے۔ اور محمود آرام کرسی سے اٹھ کر دونوں ہاتھ پیچھے باندھ کر انگڑائیاں لیتا ہوا زنانخانے کی طرف بڑھتا ہے)

(۲)

(اختر مکان کے باہر آتا ہے۔ دروازہ پر جمیل گہرے سوچ میں کھڑا ملتا ہے)

اختر۔ کہئے جمیل صاحب۔ آپ ابھی یہیں کھڑے ہیں کس سوچ میں پڑ گئے؟

جمیل۔ کیا بتاؤں حضرت تاریخ مرتب کرنے کا کام تو لے لیا ہے لیکن اس کے لئے واقعات کیسے فراہم کروں۔ مختلف کتابوں کی مدد کے بغیر کیسے مرتب ہو سکیگی۔ اسی فکر میں ہوں۔

اختر۔ آپ بالکل ناتجربہ کار معلوم ہوتے ہیں۔ ان ناشروں کی رگ تو میں خوب پہچانتا ہوں۔ یہ لوگ بڑے عیار ہوتے ہیں۔ مصنفوں کی چندیا گھوسنا انہیں خوب آتا ہے۔ آخر ان کے سارے ٹھاٹ باٹ ہمارے دم قدم سے تو ہیں۔ ہم لوگ اپنے دماغ کا سیروں خون خشک کر کے کوئی کتاب لکھتے ہیں اور یہ اسے کوڑیوں میں ٹھگ لیتے ہیں۔ پہلے میں بھی کتابوں پر بڑی محنت کرتا تھا لیکن اب تو یوں ہی ٹرخا دیتا ہوں۔

جمیل۔ مولانا میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ میں ابھی رنگروٹ ہوں کہیں کوئی کتاب اوٹ پٹانگ لکھ دی تو میری بدنامی ہوگی۔ پھر کوئی کوڑیوں کا بھی کام نہ دیگا۔

اختر۔ ارے بھائی۔ اگر تم نے ان ناشروں کی کتابیں اس طرح لکھیں تو بس پال لیا اپنا کنبہ۔ یہ لوگ دیتے ہی کیا ہیں جو اتنا سر کھپائیں آج کل تو وہی مصنف اچھے ہیں جو ایک ہفتہ میں دو دو کتابیں لکھ دیتے ہیں۔ تم لکھو گے تین مہینے میں ایک تاریخ ملیں گے کل پچاس۔ پینتیس پہلے اور کتاب کے ختم ہونے پر پندرہ۔ بھلا سوچو تو ایسی حالت میں خود کیا کھاؤ گے اور بال بچوں کو کیا کھلاؤ گے۔

(اختر ناشر کے دروازہ پر سے چلنے کا ارادہ کرتا ہے اور دونوں مل کر باتیں کرتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہیں)

جمیل۔ تو آپ ہی بتائیے۔ کیا کیا جائے؟ اتنی جلدی کوئی کتاب لکھنا تو مجھے آتا نہیں۔

اختر۔ ارے اس میں رکھا ہی کیا ہے۔ لال پنسل قینچی اور گوند پاس رکھو بیسیوں چھپیاں جمع ہو جائیں گی۔

جمیل۔ (تعجب سے) یہ کیا بات بتائی آپ نے کتاب کی تصنیف سے اسے کیا تعلق؟ ذرا ٹھیک ٹھیک کوئی مناسب تدبیر بتائیے۔

اختر۔ بات بالکل سیدھی سادھی ہے۔ اب تک ہزار کی کتنی تاریخیں لکھی جا چکی ہوں گی اور مختلف رسالوں میں کافی مضامین بھی نکل چکے ہوں گے۔ ان میں سے جو اچھے معلوم ہوں انہیں سرخ پنسل سے نشان کر کے قینچی سے کاٹ لو اور ایک کاغذ پر چپکا دو بس بن گئی کتاب۔ کوئی چٹپٹا سا چلتا ہوا نام رکھ دینا۔

جمیل۔ بات کاٹ کر، ایسی چھپی ہوئی چیپیاں دیکھ کر تو ناشر اعتراض کرے گا کہ یہ تم نے نہیں لکھی تب کیا کیا جائے؟

اختر۔ بھئی تم بیچ میں ہی بول اُٹھتے ہو۔ پہلے بات تو سن لی ہوتی۔ جب ساری چیپیاں چپکا لو۔ تو اپنے ہاتھ سے ان کی نقل کر کے ناشر کے حوالے کر دینا ناشر کیا جانچ پڑتال کرتا پھرے گا کہ تم نے کہاں سے کونسا مواد لیا ہے؟

جمیل۔ یہ تو آپ نے بڑی اچھی ترکیب سمجھائی! اس طرح تو دس پانچ ہی دن میں کتاب تیار ہو سکے گی۔ لیکن میں اپنی پہلی کتاب کے لئے ایسا نہیں کروں گا۔ اسے تو خود ہی لکھنے کا خیال ہے۔

اختر۔ خیر جب چاہو اس ترکیب سے کام لے سکتے ہو۔ کتاب کے شروع میں بڑے بڑے مورخین کے حوالے ضرور دے دینا۔ اس سے ناشر پر تمہاری قابلیت کی دھاک بیٹھ جائیگی۔

جمیل۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ آپ جیسے محسن کہاں ملتے ہیں۔

اختر۔ اس میں کیا احسان ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے تمہاری سادگی اور غربت دیکھ کر یہ ترکیب بتائی ہے۔ ورنہ ہم ایسے سربستہ رازوں کا انکشاف تھوڑی ہی کرتے ہیں؟ تم نے سنا ہے۔ ہم اپنے ان ہی ہتھکنڈوں کی بدولت اتنے شعبوں کے استاد مانے جاتے ہیں ورنہ یہ خود غرض مغرور ناشر کسے پوچھتے۔ اپنی غرض و غایت اور بگڑے تگڑے یہ خدا کی بھی پروا نہیں کرتے۔ میاں تم نے ابھی دیکھا کیا ہے!

(جمیل بڑے ہی تپاک سے اختر سے مصافحہ کرتا ہے اور پھر دونوں اپنے اپنے گھروں کو جاتے ہیں)

(۱۲)

(محمود کا خاص کمرہ۔ وہی آرائش اور ویسے ہی ٹھاٹ باٹ حمیدیہ پریس کے منیجر ظفر کی آمد۔ منیجر کا حلیہ۔ معمولی ٹوپی۔ کھدر کا پاجامہ سفید شیروانی۔ گلے میں مفلر۔ ناک کے سرے پر چشمہ۔ عمر پچاس کے قریب)

محمود۔ (آرام کرسی پر لیٹے ہوئے) آئیے منیجر صاحب، آپ نے تو دونوں کتابوں کا بڑا لمبا چوڑا بل بنایا۔ اس میں کافی کانٹ چھانٹ کی جائیگی۔ آپ بہت اجرت لینے لگے ہیں۔

ظفر۔ ارے صاحب، کیا پوچھتے ہو، جنگ نے ساری چیزیں گراں کر دی ہیں۔ لیکن ہم تو وہی چھپائی لیتے ہیں جو دس سال پہلے لی جاتی تھی۔ آپ فرماتے ہیں بہت ہے۔

محمود۔ (بے پروائی سے) بہت نہیں بالکل بیجا۔ اب اتنے زیادہ چھاپے خانے ہو گئے ہیں کہ انہیں کام ملنا مشکل ہو گیا ہے۔ ظفر صاحب پچھلے دس سال میں چھپائی کی اجرت پچیس ۲۵ فیصد گھٹ گئی ہے لیکن آپ تو وہی پرانی لکیر کے فقیر۔ جس نرخ سے میں اور چھاپے خانوں کو دیتا ہوں اُسی حساب سے آپ کو بھی دیا جائیگا۔

ظفر۔ (گھبراہٹ سے) نہیں صاحب۔ آپ چاہیں تو بل میں دو چار روپے کم کر سکتے ہیں۔ پچیس ۲۵ فیصد کی کمی سے تو سارا معاملہ چوپٹ ہو جائے گا۔

محمود۔ خیر۔ اب کی دفعہ تو ہم کوئی خاص کانٹ چھانٹ نہیں کرتے لیکن آئندہ نرخ مقرر کر کے کام دیا کریں گے چھپائی کا کام اس

قدر بڑھ گیا ہے کہ فوراً ہی اپنا ذاتی چھاپہ خانہ کھولنا پڑیگا۔

ظفر۔ ابھی جناب، آپ چھاپہ خانے کے جھنجھٹ میں کاہے کو پڑتے ہیں؟ اب چھپائی رہ کیا گئی ہے؟ یہ بھی آپ ہی کا چھاپخانہ ہے۔ جی چاہے سو دیجئے۔ نہ دیجئے۔ بھلا ذرا سی بات پر کیا ہم اپنی اتنی بڑی اسامی کو ناراض کر دیں گے؟ پھر آپ نے تو ہماری ہمیشہ ہی مدد کی ہے۔

محمود۔ (بل میں پچیس تیس روپے کی کانٹ چھانٹ کر کے باقی کا چک دے کر) لیجئے ظفر صاحب۔ اس کا روپیہ ڈیڑھ مہینہ بعد ملے گا۔ اس سے پہلے بنک نہ بھیجئے۔ ارے ہاں ایک ضروری بات یاد آگئی۔ تاریخ زرا آپ نے بل میں تین ہزار لکھا ہے اسے ایک ہزار کیجئے۔ مرثیہ کی چار ہزار کاپیوں کے بدلے ایک ہزار ہی لکھیے۔

ظفر۔ (حیرت سے) یہ کیوں ناشر صاحب جتنی کتابیں چھپی ہیں اتنی ہی بل میں بھی لکھی ہیں۔ کم کیوں لکھاتے ہیں؟

محمود۔ (ناراضی سے) نہ جانے آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ بات بات پر بحث کرتے ہیں۔ دوسرے مطبع والے تو اشارہ پر ہی سارے کام کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ابھی کل ہی میں نے ایک مطبع سے دس ہزار کاپیوں کا ایک ہزار کا بل بنوایا ہے۔ ظفر صاحب جب آپ کو آپ کی پوری چھپائی مل گئی ہے تو ایسا کرنے پر آپ کو اعتراض کیا ہے؟ ہم کس مقصد سے کیا کرتے ہیں یہ آپ کو کیسے بتایا جائے۔ سچ ہے ایسی الجھنیں تو اپنا ذاتی چھاپہ خانہ کھولنے پر ہی دور ہونگی۔ آپ تو بال کی کھال نکالتے ہیں۔

ظفر۔ (گھبرا کر) ناشر صاحب، بھلا میں آپ سے اختلاف کر سکتا ہوں۔ میں تو آپ کی دکان کی بکری ہوں۔ مجھے کیا عذر ہے جتنی کتابیں آپ فرمائیں درج کر دوں۔ ہماری خوشی تو آپ کی خوشی پر ہے۔ ہم تو آپ کے سہارے ہی جی رہے ہیں۔ آپ اور چھاپہ خانہ کھول کر کیا کریں گے؟ کیا یہ پریس آپ کا نہیں؟

(ظفر محمود کے حکم کے مطابق دوسرا بل بنا کر دیتا ہے اور سلام کر کے واپس جاتا ہے۔)

(۴)

(محمود کی دکان۔ کتابیں الماریوں میں بند ہیں۔ دو تین منشی بیٹھے حساب کتاب لکھ رہے ہیں۔ نوکر بڑی مستعدی سے کتابیں نکال کر گاہکوں کو دے رہا ہے۔ اختر کی آمد)

محمود۔ (اختر کو دیکھ کر سلام کرتا ہے) آیئے حضرتِ اختر بہت دنوں میں قدم رنجہ فرمایا۔ کیا کچھ خفگی ہے۔

اختر۔ (متفکرانہ لہجہ میں) کیا بتائیں صاحب، گھر کے جھنجھٹوں سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ آمدنی کم ہوتی جا رہی ہے اور خرچ کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں۔

محمود۔ ہاں جناب۔ اس میں کیا شک ہے۔ وقت ہی کچھ ایسا آ گیا ہے لیکن خدا سب ٹھیک کر دیگا۔ آپ کے منافع کا حساب تیار ہے

اختر۔ ہاں صاحب۔ اس وقت کچھ مل جائے تو اچھا ہے۔ کام چل جائے۔ یہی سوچ کر میں آج آیا ہوں۔

محمود۔ (اختر کی طرف منہ کر کے) ہاں تو ادیب صاحب آپ نے ہمیں چھ کتابیں دی تھیں۔ اس وقت مرثیہ چھپ چکا ہے۔ اور بہت جلد دوسری کتابیں بھی چھپ جائیں گی۔ سچ مچ اتنی جلدی میں ایسی کتابیں لکھنا تو آپ ہی کا حق ہے۔

اختر۔ (کچھ مایوسی سے) کیا اب تک صرف مرثیہ ہی چھپ سکا؟ میں تو سمجھتا تھا کہ سب کتابیں شائع ہو گئی ہونگی اور فروخت بھی خوب ہوئی ہونگی۔ خیر "مرثیہ" کی کتنی جلدیں چھپی تھیں تین ہزار یا کچھ

زیادہ؟ وہ تو بکنے والی چیز ہے نا۔

محمود۔ اجی مولانا۔ اس گرانی کے زمانے میں تین ہزار کی شاعت کا کس میں دم ہے؟ پھر بکتی بھی تو نہیں۔ ورنہ ہم تو تیس ہزار چھپوالیں۔ مرثیہ کی صرف ایک ہزار جلدیں چھپی تھیں۔ ۹۷ کاپیاں تبصرہ و تنقید کی گئیں۔ ۱۲۱ مختلف تحفہ تحائف میں اور ۱۵۰ نمونہ کی بھیجیں۔ ۱۷۵ کاپیوں کو دیمک چاٹ گئی۔ باقی رہیں ۳۹۷ ان میں سے ۴۱ تو ابھی باقی ہیں۔ کُل ۳۵۶ کتابیں فروخت ہوئیں۔ ان پر ۲۵ فیصد خریداروں کو کمیشن دیا گیا۔ ایک روپیہ کتاب کی قیمت ہے۔ اس حساب سے آپ کو ۶۶ روپے آٹھ آنے منافع کے ملنے چاہئیں۔ ۶۶ روپے جلد ہی آپ کی خدمت میں بھیجدیئے جائیں گے۔ اس وقت ادائی ذرا مشکل ہے۔

اختر۔ (بڑی اداسی سے) یہ تو کچھ بھی نہ ہوا! میں تو سمجھتا تھا کہ پانچ سات سو روپے مل جائیں گے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے چار ہزار جلدیں چھپائی ہیں۔ یہ تو آپ بہت تھوڑا حساب بتا رہے ہیں۔

محمود۔ (تیز ہو کر) تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟ حضرت سارا حساب آپ کے سامنے ہے۔ یہ دیکھئے حمیدیہ پریس کا بل (بل دکھاتا ہے) اس میں ایک ہی ہزار کاپیاں لکھی ہیں نا؟ تین چار ہزار تو نہیں۔ بل میں نے تو نہیں بنایا۔

اختر۔ (بل دیکھ کر چپ ہو جاتا ہے اور بڑی مایوسی سے کہتا ہے) خیر جو آپ کا حساب ہے وہی دلا دیجئے۔ مجھے تو بڑی مایوسی ہو رہی ہے۔ میں نے سنا تو تھا کہ مرثیہ کی چار ہزار جلدیں شائع ہوئی ہیں لیکن پریس کا بل دیکھ کر چپ ہونا پڑا۔ خیر جو بھی ہو لا دیجئے۔ دلا دیجئے۔

محمود۔ میں نے تو کہا نا کہ ابھی پوری رقم نہیں مل سکتی۔ میرے بھانجے کے سالے کی پھوپھی زاد بہن کا نکاح ہے۔ وہاں جانا ہے۔ وہاں سے لوٹنے پر آپ کی کچھ رقم بھیجنے کا انتظام کروں گا۔ اطمینان رکھیئے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ رشتہ داری کا معاملہ ہے۔

اختر۔ (لمحہ بھر آپ ہی آپ کچھ سوچتا اور جھنجھلا کر کہتا ہے) آخر کب تک دیجئے گا۔ معلوم بھی تو ہو۔ اچھی کتابیں لکھیں! اس سے تو گھاس کاٹنے اور سڑک کوٹنے والے مزدور ہی بھلے۔ انہیں روپے پیسے کے لئے تو دوسروں کے منشاء و مرضی کی ضرورت نہیں۔ کھری مزدوری۔ چوکھا کام۔

محمود۔ (سنجیدگی سے) جناب آپ کو یقین نہیں آتا۔ میری بدقسمتی! اور کیا کہوں۔ دیکھئے جمیل نامی ایک مؤرخ نے برار کی تاریخ لکھی ہے۔ اس کی بھی ایک ہزار جلدیں چھپائی گئی ہیں (مطبع کا بل دکھاتا ہے) ادیب صاحب کیا کیا جائے۔ ہمیں سارا حساب ٹھیک ٹھیک رکھنا پڑتا ہے۔ پہلے مصنفوں کو حساب سمجھانا اور پھر انکم ٹیکس والوں کو پائی پائی چکانا۔ بڑی مصیبت میں جان ہے۔ پھر لوگ سمجھتے ہیں کہ ناشروں کو نہ جانے کتنی اناپ شناپ آمدنی ہے! اجی حضرت ہم تو اُردو کے خدمت گزار ہیں۔ اردو کو پھیلانا ہی ہمارا مسلک ہے۔ اس کام میں جو کچھ روپیہ دو روپیہ مل جاتا ہے اسی سے اپنا اور اہل و عیال کا پیٹ پالتے ہیں۔ اشاعت کا کام بڑا کٹھن ہے۔

اختر۔ (طنز سے) رہنے بھی دیجئے ناشر صاحب میں آپ کا وعظ سننے نہیں آیا۔ اگر آپ لوگ دنیا میں "روپیہ دو روپیہ" سے پیٹ بھر رہے ہیں تو پھر میں نہیں سمجھتا کہ دنیا میں اسراف کس چڑیا کا نام ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ غریب مصنفوں کی گاڑھی کمائی کا ثمر آپ لوگ لوٹ رہے ہیں۔ ان بیچاروں کو ٹکڑے بھی مشکل سے نصیب

ہوتے ہیں۔ بار بار مانگنے اور لجاجت کرنے پر بھی محنت
کی اجرت نہیں ملتی اور آپ لوگ راج کرتے ہیں (بڑبڑاتا
ہُوا اندر چلا گیا)

(جمیل کے بیٹے عقیل کی آمد۔ چودہ پندرہ برس کا لڑکا۔
نیم آستین کی قمیص اور پاجامہ پہنے ہوئے، پاؤں میں چپل
سر ننگا۔ گھبرایا ہُوا)

محمود۔ (عقیل کی طرف مخاطب ہو کر ترش روئی سے) تم سے تو
پہلے ہی کہدیا تھا کہ ابھی تاریخ کی لکھائی کا معاوضہ نہیں
دیا جائیگا۔ پھر کیسے آئے؟ چکر کاٹنے سے فائدہ؟ کبھی جمیل
چلے آتے ہیں اور کبھی تم، کبھی چٹھی بھیجتے رہیں۔ آخر ہمیں کوئی
اور کام نہیں ہے، تمہاری باتیں سنتے رہیں۔ کتاب کیا لکھائی
آفت مول لی۔ واقعی یہ مصنف ذرا بھی احسان کے قابل
نہیں۔ جاؤ کہدینا اس وقت ایک پیسہ بھی نہیں۔ مہینوں میں
کتاب مرتب کی اور پھر لاؤ، لاؤ! بھلا کوئی بات ہے۔

عقیل (بڑے ستیاپانہ لہجہ میں) جناب، میرے والد سخت بیمار
ہیں۔ انہیں ڈبل نمونیا ہوگیا ہے۔ بیہوشی طاری ہے۔ آپ
ناراض نہ ہوں۔ یہ غصہ کا وقت نہیں ہماری تو جان پر بنی ہے
آپ پھٹکار رہے ہیں؟ امی نے کہا ہے کہ ناشر صاحب نے آج
تک ایک پائی بھی نہیں دی ہے۔ اگر معاوضہ نہیں دینا چاہتے
تو خیرات سمجھ کر ہی کچھ دیدو کسی طرح دوا پانی کا خرچ تو چلے۔
ہمارے پاس زہر کھانے تک کے لئے کوڑی نہیں ہے ناشر
صاحب، رحم کیجئے، مہربانی فرمایئے۔ بڑا احسان ہوگا میں آپ
سے بھیک مانگتا ہوں۔ بُرا وقت ہمیشہ نہیں رہتا۔ (عقیل
روتا ہے۔

محمود۔ (آپے سے باہر ہو کر) جاؤ فضول بکواس مت کرو۔ تم بہت
منہ پھٹ معلوم ہوتے ہو۔ تمہارے والد بیمار ہیں تو ہم کیا
کریں؟ اُن کی دوا دارو کا کیا ہم نے کوئی ٹھیکہ لے رکھا
ہے؟ یا ان کا ہم پر کوئی قرض ہے؟ کتاب شائع کرا دی۔
یہ کیا کم ہے۔ آج کل مصنفوں کو پوچھتا کون ہے؟ صبح
سے شام تک پچاسوں ادیب جھک مارتے رہتے ہیں۔
خبردار ایسی باتیں کیں تو! جاؤ میری دکان پر رونے دھونے
کا کام نہیں۔

(لڑکا انتہائی مغموم و محزون گھر لوٹتا ہے)

(۵)

(محمود کا خاص کمرہ۔ محمود صوفہ پر دراز اخبار پڑھ رہا ہے
اسی وقت اس کا ایک کلرک آتا ہے)

کلرک۔ (فرشی سلام کے بعد) صاحب، معاف فرمایئے! آج
آنے میں کچھ دیر ہوگئی ہے۔ وجہ یہ ہوئی کہ رات ہمارے پڑوس
میں جمیل نامی ایک گریجویٹ کا انتقال ہوگیا ہے۔ یہ بڑے
اچھے آدمی تھے، بیچارے۔ ان کی بیوی اور چھوٹے چھوٹے
بچے رات بھر روتے رہے۔ ان کی آہ و بکا سن کر کلیجہ منہ کو
آتا ہے۔ ایک اور بڑی مصیبت ہوئی۔

محمود۔ (تشویش سے) وہ کیا؟

کلرک۔ (بڑے ہی درد سے) ان کے پاس کفن تک کے لئے
کچھ نہ نکلا۔ محلے والوں کو ہی سارا انتظام کرنا پڑا۔ ہم دس
بارہ آدمی صبح کے کوئی چار بجے اس کی تجہیز و تکفین کرکے
آئے ہیں۔ نہ جانے اب ان کے ستم رسیدہ بیوی بچوں کا کیا حال
ہوگا۔ چھوٹے بچوں کو دیکھ کر بڑا ہی ترس آتا ہے

محمود۔ (ظاہری رنج و افسوس کے ساتھ) اچھا جمیل صاحب
رحلت کر گئے! نہیں تو ہم بھی جانتے ہیں۔ کوئی چار پانچ دن

ہوئے ان کا لڑکا آیا تھا اُس نے تو کوئی ایسی بات نہیں بتائی تھی۔ مگر اس سے کیا۔ یہ تو دنیا ہے۔ حیات کا مقصد ہی موت ہے۔ پیدائش کا لازمی انجام مرنا ہے۔ خوب یاد آیا۔ جمیل صاحب کی ایک تاریخ بھی تو ہے۔ ایسے میں کیوں نہ اشتہار دیدیں۔ خوب فروخت ہوگی۔ ابھی ایک مسودہ تیار کرو میں کہتا ہوں تم لکھو۔ یہ اشتہار آج ہی سب بڑے بڑے اخباروں میں دیدو اور شہر میں بھی ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کراؤ۔

کلرک۔ (کاغذ، قلم اور دوات لے کر بیٹھتا ہے) فرمائیے صاحب۔ کیا مضمون ہوگا۔ آج ہی چھاپ کر سب جگہ بھیجدیا جائیگا۔

محمود۔ ہاں۔ لکھو۔ پہلے عنوان لکھو:۔

قلمروئے عادل شاہی

"اُردو کے مایۂ ناز ادیب اور مشہور مورخ جناب مولانا جمیل احمد صاحب بی اے کو ہم نے بیش قرار معاوضہ دے کر خاص طور پر عادل شاہی دور کی تاریخ مرتب کرائی ہے۔ اس کے دو ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو چکے۔ یہ تیسرا ایڈیشن ہے۔ افسوس صد افسوس کل ہی ہی مولانا جمیل احمد صاحب رحلت کر گئے۔ انکے اہل و عیال کی امداد ہمارا عین فریضہ ہے۔ ناشر کی حیثیت سے ہم ان کے مظلوم خاندان کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ جمیل صاحب کی نادر تاریخ جتنی زیادہ فروخت ہوگی اتنا ہی ہم ان کے ورثاء کی زیادہ خدمت کرسکیں گے۔ اس تاریخ کا خریدنا مرحوم کی روح کو خوش کرنا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ثواب ہو سکتا ہے۔ امید ہے کہ دردمند اور اہلِ ذوق حضرات خاص توجہ فرمائیں گے۔ اس کتاب پر کسی قسم کا کمیشن نہیں دیا جائے گا۔ کیونکہ اس کی فروخت تجارت کی خاطر نہیں ہو رہی ہے بلکہ مرحوم کی خوشنودی اور اُن کے ورثاء کی امداد مطلوب ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ۔ عہ

پتہ:۔ کتبۂ محمودیہ رام نگر۔ ضلع جبل پور

محمد عبدالقادر فاروقی (حمایت نگر)

رات

آؤ تمہیں سنائیں بات ۔۔۔ رات ہے اور آدھی رات
سوتی ہے ساری کائنات ۔۔۔ جاگتی ہے فقط وہ ذات
کیسی حسین رات ہے

چھٹکی ہے صاف چاندنی ۔۔۔ لگتی ہے کیا بھلی بھلی
چار طرف ہے خامشی ۔۔۔ صبح ہو جیسے سو رہی
کیسی حسین رات ہے

صحن فلک پہ جلوہ گر ۔۔۔ چودھویں رات کا قمر
تارے اِدھر ہیں اور اُدھر ۔۔۔ کوئی سجا ہے چرخ پر
کیسی حسین رات ہے

نرم و سبک ہے کیا ہوا ۔۔۔ چال ہے اس کی دلربا
جھونکے نسیم کے ہیں یا ۔۔۔ در ہے بہشت کا کھلا
کیسی حسین رات ہے

وقت یہ ہے نماز کا ۔۔۔ عجز کا اور نیاز کا
سوز کا اور ساز کا ۔۔۔ خلوتیانِ راز کا
کیسی حسین رات ہے

تخت نشیں ہے ذوالجلال ۔۔۔ دیکھئے ہر طرف جمال
کر لے جو کرنا ہو سوال ۔۔۔ لطف سے اس کے ہو نہال
کیسی حسین رات ہے

کھول دے اپنے دل کا در ۔۔۔ اب تو نکال بال و پر
بیٹھے ہی بیٹھے کر سفر ۔۔۔ آتا ہے دیکھ کیا نظر
کیسی حسین رات ہے

کون و مکاں کا وہ حسیں ۔۔۔ روح و روانِ عاشقیں
خانۂ دل کا وہ مکیں ۔۔۔ ڈھونڈ لے ہے یہیں کہیں
کیسی حسین رات ہے

سید نذیر حسین ناشاد

غزل

رہ و رسمِ عاشقی سے جو وہ بدگماں نہیں ہے
تو مری یہ جاں فروشی کبھی رائیگاں نہیں ہے
دمِ تازہ لے کے میں نے جو نظر شجر پہ ڈالی
سرِ شاخ آہ دیکھا۔ مرا آشیاں نہیں ہے
مرے تن میں جان آئی۔ میرے جی کو چین آیا
مرے حق میں ہے یہ جنّت ترا آستاں نہیں ہے
چلو بلبلو، چمن میں، کریں شور مل کے باہم
ہیں شگفتہ پھول ہر سُو، کوئی باغباں نہیں ہے
تجھے کیا خبر ہے ناصح، کہ خیالِ زلفِ شبگوں،
ہے رفیقِ شامِ ہجراں، یہ بلائے جاں نہیں ہے
سرِ بزم میرا قصہ کوئی کیا سمجھ سکے گا
مری گفتگو نئی ہے کوئی ترجماں نہیں ہے
جو نہ دل ہوا اس کا جُویا، اُسے ڈھونڈنا ہے بے جا
وہ کہیں نہیں ہے لیکن یہ کہو کہاں نہیں ہے
یہ نہال، آرزو کے تجھے ٹھنڈی چھاؤں دینگے
کہ ترے چمن پہ مخفیؔ ستمِ خزاں نہیں ہے

صالحہ بیگم مخفیؔ از کلکتہ

کھلونے

"ننھا بیمار ہے"۔

"ننھا بیمار ہے" بوڑھے ڈپٹی صاحب چونکے۔ "ننھا بیمار ہے۔ وہ کرسی سے اُچھل کر کھڑے ہو گئے۔ خدا جانے اُن میں پھرتی کہاں سے آگئی اور وہ فوراً زنانے میں جا پہنچے۔

"بہو! ننھے کو کیا ہو گیا ہے"؟ انہوں نے ایک دم پوچھا۔

"ابا جان! نہ جانے اس کا رنگ کیوں زرد ہو گیا ہے"؟ بہو کی آنکھیں پُرنم تھیں۔

گھر میں ایک ہلچل مچ گئی خادم، مامائیں اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھیں۔ ڈپٹی صاحب اپنی پیرانہ سالی کے باوجود جوانوں سے زیادہ تیز تھے اُن کی بے تابی نے سارے گھر کو اور پریشان کر دیا۔ دم بھر میں ڈاکٹر اور نرس حاضر ہو گئے۔

ڈاکٹر نے بچے کو دیکھا نسخہ تجویز کیا اور نرس کو ضروری ہدایات دیکر چلا گیا۔ دو دن یہی حال رہا تیسرے دن ننھے کو کچھ افاقہ ہوا اور سب کی جان میں جان آئی۔

ڈپٹی صاحب آج پھر برآمدہ میں آرام کرسی پر دراز اخبار پڑھ رہے تھے پنشن یافتہ بوڑھوں کا سب سے اہم کام اخبار پڑھنا ہی ہوتا ہے۔ ایک صفحہ پر کھلونوں کا اشتہار تھا۔ اُن کی نگاہیں وہیں جم گئیں لیکن دماغ کہیں اور چکر لگا رہا تھا۔

"شریر نے مجھے دیوانہ بنا دیا ہے" وہ سوچ رہے تھے "گھر میں بچہ نہ تھا میں نے جانا خدا نے مجھ بوڑھے کے کھیلنے کے لئے کھلونا دے دیا ہے لیکن شریر نے مجھے کھیلنے کی بجائے الٹا تنگ کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور اس کا باپ رشید وہ بھی تو شریر تھا میرا پہلا کھلونا۔ اس وقت وہ تو انسپکٹر پولیس بنا امنِ عامہ کا نگہبان ہے اس کا ایک ایک حکم کتنا رعب دار ہوتا ہے۔ لیکن کسی زمانے میں اس کی باتیں میرے لئے کتنی روح افزا تھیں"۔

پڑوس میں بچے گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے کہ گلی آ کر ڈپٹی صاحب کے قریب برآمدے میں گری۔ آواز سے اُن کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ایک شوخ و شریر لڑکا گلی اٹھانے کے لئے اُن کے بنگلے میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ مگر برآمدہ میں انہیں بیٹھا دیکھ کر واپس کھسکنے لگا۔ بالکل رشید کی طرح انہیں وہ بچہ بالکل رشید دکھائی دیا۔ آواز دیکر اُسے بلایا اور گلی لے جانے کو کہا۔ اب بھی لوگ اُن سے ڈرتے تھے۔ گزری ہوئی جوانی کے دن پھر اُن کے سامنے آ گئے۔ اُن کا سینہ خود بخود تن گیا۔

"میں جوانی میں کتنا سخت دل مشہور تھا۔ جہاں میں گیا بدمعاشوں اور چوروں نے میرا علاقہ چھوڑ دیا۔ بڑے بڑے خطرناک مجرموں سے میرا مقابلہ ہوا لیکن میں کبھی نہ ہارا۔ جوانی میں میری حالت اس شیر کے بچے کی طرح تھی جسے شکار کو دبوچنے کی بجائے اس پر جھپٹنے میں زیادہ لطف آتا ہے۔

میں افسر ہونے کے لحاظ سے تو بڑا کامیاب تھا لیکن گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ کوتوالی کی ہاؤ ہو کے بعد جب گھر پہنچتا تو وہ بالکل سونا سونا نظر آتا کوئی دل بہلانے کا سامان نہ تھا۔ آخر خدا نے میری سن لی اور مجھے بھی ایک پیارا بچہ عطا کیا، کھلونا، ایک تھانیدار بھی انسان ہو سکتا ہے، میرے دل میں بھی محبت کا چشمہ پھوٹ پڑا۔

میں باہر سے آتا تو ننھا رشید ہماری بوٹوں کی چاپ سن کر میری

طرف تکنے لگتا۔ میری وردی جہاں ایک دنیا کے لئے ہیبت کا نشان تھی میرے بچے کے لئے کھیل تھی، مذاق۔ سیٹی کی روپہلی زنجیر اس کی دلچسپی کا سامان تھی۔ میرا چڑھا ہوا ماتھا کشادہ ہو جاتا، میرا دل ـــ یکایک محبت کا چشمہ بن کر ابلنے لگتا اور اس کا ننھا منا ہاتھ ہمیشہ میری مونچھوں پر پڑتا۔

تھانے میں ایک شخص کے دل میں پیار رہتا تھا۔ وہ بچے کو اٹھا کر لے جاتا اور دن بھر اُسے کھلاتا رہتا، اس کے لئے میرے دل میں کس قدر عزت تھی، میں نے ہمیشہ اُسے عزت کی نگاہ سے دیکھا۔ اس کی لغزشوں کو نظر انداز کیا۔ حالانکہ یہ میرے اصول کے خلاف تھا۔ اس کی محبت کا اثر بچے پر بھی تھا۔ جب اُس نے بولنا سیکھا تو وہ دو الفاظ تھے جنہیں وہ بار بار دہراتا تھا۔ "ابا" اور "کان" (میرے سپاہی کا نام خان محمد تھا) جب وہ یہ الفاظ توتلی زبان میں کہتا تو مجھے ایسا معلوم ہوتا گویا دونوں جہان کی دولت مجھے مل گئی ہے"۔

"حضور کھانا تیار ہے"۔ خادم نے آکر اطلاع کی۔ ڈپٹی صاحب ذرا چونکے۔ "آتا ہوں" انہوں نے جواب دیا۔ اچانک اُن کی نگاہ سامنے ٹنگی ہوئی تصویر پر جا پڑی۔ وہ اس موقع کی تصویر تھی۔ جب انہیں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدہ پر ترقی ملی تھی۔ نگاہیں اٹھیں لیکن پھر اخبار پہ لوٹ آئیں۔ کھلونوں کے اشتہار میں ایک ننھا سا بچہ باپ کو انگلی سے بتا رہا تھا کہ وہ فلاں کھلونا لیگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ مچل رہا ہے

رشید بھی تو اکثر مچل جایا کرتا تھا۔ جب مجھے کنگز پولیس میڈل ملا۔ تو میں اُسے لگائے گھر پہنچا۔ گھر میں مہمان مبارکباد دینے کے لئے جمع تھے۔ خدا نے مجھے موت کے منہ سے بچا لیا تھا اور اس بہادری کے صلے میں مجھے سب سے بہترین تمغہ دیا گیا۔ ننھا رشید بھی سوٹ پہنے ادھر اُدھر کلیلیں کر رہا تھا۔ میرے بعض بے تکلف دوست بار بار میرے سینے پر تمغے کو دیکھ رہے تھے۔ رشید مچل گیا اور اس کا وہ مچلنا اب تک مجھے یاد ہے

اُس نے اس وقت تک مجھے نہ چھوڑا جب تک میں نے تمغے کو اس کے سینے پر آویزاں نہ کر دیا۔ پھر وہ خوش ہو کر میری نقل اتارنے لگا۔ اور کمرے میں لفٹ رائٹ، لفٹ رائٹ کرتا کبھی ادھر جاتا کبھی اُدھر۔

ساری تقریب کا مزہ رشید کی اس معصوم اور دلآویز شرارت کے سامنے ہیچ تھا۔ میں نے فرطِ مسرت سے اُسے اٹھا کر کلیجے سے لگا لیا۔ میں کتنا خوش تھا۔ شاید اگر میرا سینہ ایسے تمغوں سے بھر دیا جاتا اور تمام دنیا کی حکومت مجھے دے دی جاتی تو اس قدر خوشی نہ ہوتی جتنی رشید کی معصوم شرارتیں مجھے خوش کرتی تھیں۔ مہمانوں کے چہروں پر خوشی کے آثار تھے اور ہاں۔ میری دوستی کا معیار میرا رشید تھا۔

کھلونوں کا بیاہ بھی تو ہوتا ہے۔ بچے اکثر یہ کھیل کھیلتے ہیں۔ ایک بار انہوں نے بھی رشید سے پوچھا تھا کہ وہ کس سے بیاہ کریگا۔ رشید نے کہا امی جان سے، اور پھر وہ دوڑ کر ماں کے گلے سے چمٹ گیا تھا۔

"نا بیٹا نا" انہوں نے اس سے کہا تھا "تم گڑیا سے بیاہ کرنا"

مگر وہ پھر مچل گیا۔ اُسے تو امی جان سے بیاہ کرنا تھا۔ ماں سے اُسے کس قدر پیار تھا۔

اور ماں، اس کے لئے رشید جوان ہو کر بھی بچہ ہی تھا۔

وہ جب بھی رشید کا نام لیتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا گویا وہ دس بارہ سال کے بچے کا ذکر کر رہی ہے۔ میں اب بوڑھا ہوں، میری زندگی کا سہارا ابھی تو یہی کھلونے ہیں۔ زندگی ایک مسلسل دکھ کا نام ہے۔ مگر یہ کھلونے اسی دکھ کو راحت میں تبدیل کر دیتے ہیں محبت کا رشتہ انہیں کھلونوں سے قائم ہے ورنہ اُن کے بغیر دنیا شب و روز کا ایک بے کیف چکر بن جائے۔

رشید کی ماں کو ہر وقت اس کی شادی کا خیال رہتا تھا۔ جہاں کہیں محلے میں ڈھولک بجی یا کہیں سے باجے کی آواز سنائی دی تو وہ مجھ

سے تقاضا کرنے لگی کہ رشید کا بیاہ کب کرو گے۔ میں خاموش رہتا۔
مجھے خود اس کی فکر تھی۔ اس کی شادی کتنا نازک مسئلہ تھا۔ اپنے
کھلونے کے لئے ایک گڑیا کی تلاش کرنی تھی۔ میں نے تلاش کی
ایک ایسے باپ کی بیٹی جو خود اولاد کے حق میں فرشتہ رحمت تھا۔
جس کی ماں بچوں پر جان دیتی تھی۔ یہی میرا معیار تھا۔ میں چاہتا
تھا کہ رشید ایسے گھر میں جائے جہاں محبت اور پیار کے سمندر
موجیں مارتے ہوں۔ جن کے نزدیک داماد ایک کاٹھ کا اُلّو نہ ہو۔
بلکہ ایک بیٹا ہو۔ جو داماد کو دولت پیدا کرنے والی مشین کے بجائے
اپنا لختِ جگر سمجھیں۔ جو اس ندی کو جو میرے دل سے پھوٹ کر
نکلی تھی اپنی املاک میں جاری دیکھنا چاہتے ہوں۔"

ڈپٹی صاحب کو بھوک لگ رہی تھی۔ مگر وہ ابھی تک تخیلی
دنیا میں تھے۔ دوسری بار اندر سے خادمہ نے پکارا۔

"حضور کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے"

"ہوں" کہہ کر وہ پھر چپ ہو گئے۔ انہیں خادمہ کی آواز
کچھ غیر مانوس سی معلوم ہوئی۔ وہ دو تین سال سے برابر "ابا جان
کھانا تیار ہے" یہ الفاظ سنا کرتے تھے۔ ان الفاظ میں انہیں تسکین
ملتی تھی۔ اب وہ بہو کے بارے میں سوچنے لگے۔

رشید کی رفیقۂ حیات امینہ جہاں ظاہری شکل و صورت میں
قابلِ تعریف تھی وہاں حسنِ سیرت میں بھی میری دعاؤں کا نتیجہ
ثابت ہوئی۔ میں اس بچی کو اپنے گھر لا کر کس قدر خوش ہوں۔ رشید
اکثر دورہ پر رہتا ہے۔ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اب میرا سہارا امینہ ہی
ہے۔ جب صبح ناشتہ کے لئے وہ خود چائے لے کر میرے کمرے کے
باہر سے پوچھتی "ابا جان! چائے پی لیجئے" مجھے ان الفاظ سے کس قدر
راحت ہوتی۔ "ابا جان" کے الفاظ سے رشید کی ساری زندگی میرے
سامنے آ جاتی میں فوراً کانپتا ہوا اٹھتا۔ اور دروازہ کھول دیتا

"میری پیاری بچی۔"

مجھے اب اور کام ہی کیا ہے۔ بس برآمدے میں بیٹھا زندگی
کے گزرے ہوئے دنوں کی یاد میں کھویا رہتا ہوں۔ امینہ کی شیریں
آواز "ابا جان! کھانا تیار ہے" مجھے ان تاریکیوں سے باہر نکال لاتی
ہے۔ بوڑھا ڈپٹی، جسے اب بھی لوگ پتھر دل سمجھتے ہیں انہیں
کیا خبر کہ اس کا دل کتنا نازک ہے۔ اس کے دل میں محبت ہے۔
وہ ہمیشہ دشمن رہا اُن لوگوں کا جو سوسائٹی کے لئے لعنت تھے۔
شریفوں کے لئے اس کا دل ہمیشہ احترام سے لبریز رہا۔"

بھوک انہیں ستا رہی تھی مگر اُن کا دل کھلونوں کے
اشتہار سے نگاہیں ہٹانے کو نہیں چاہتا تھا۔ باپ اور بیٹے کی
تصویر اُن کے دل میں کھچی جا رہی تھی۔ رشید کی شادی کے بعد
وہ پوتے کے آرزومند رہے۔ وہ اب نئے کھلونے سے کھیلنا
چاہتے تھے۔ سارا دن بیکار بیٹھے رہنے سے وہ اکتا جاتے
تھے۔ دل بہلاوے کے لئے ایک بچہ ۔ اور ایک دن انہیں
خوشخبری مل ہی گئی۔ اُن کا گھر ایک کھلونے کا منتظر تھا۔ اخبار
کی تصویر اور نمایاں ہو گئی۔ بچہ مسکرا رہا تھا۔ انہیں رشید کا
مسکراتا ہوا چہرہ دکھائی دینے لگا۔ لیکن اس کے نقوش آہستہ
آہستہ پوتے کے چہرے میں تبدیل ہوتے گئے۔ کھلونوں میں گھرا ہوا بچہ خود
ایک کھلونا دکھائی دے رہا تھا۔

اور جب وہ کھلونا انہیں مل گیا تو وہ کس قدر مسرور تھے۔
انہیں خود احساس تھا کہ وہ خوشی سے بچوں کی طرح حرکات
کر رہے ہیں۔ انہوں نے گھر بھر کو تنگ کر دیا۔ لیڈی ڈاکٹر کو بلاؤ۔
نرس کہاں ہے؟ ذرا احتیاط سے بچے کو دیکھنا۔ ہاں ہاں
رویا ہے۔ لڑکا! مبارک۔ مبارک۔ شکریہ۔ شکریہ۔
ڈاکٹر صاحبہ بچے اور بہو کی حالت ہے۔ خدا کا شکر ہے۔ شکر

ہے۔ اُن کا دل مسرت و شادمانی سے لبریز تھا۔ خدا نے انہیں ایک اور کھلونا دیا۔

"لیکن اگر۔ اُف خدایا! امینہ نے جب بچے کو بیمار دیکھ کر مجھ سے کہا تھا۔ ابا جان نہ جانے اس کا رنگ کیوں زرد ہو گیا ہے" تو اس کی آنکھیں پُرنم تھیں۔ اُن میں ایک خطرہ تھا۔ میں اس کی تاب نہ لا سکا۔

تین دن اور تین راتیں میں نے خدا سے دعائیں مانگیں نمازوں کے سجدوں میں رگڑ رگڑ کر نیم شب کو بیدار ہو کر میں بھول گیا تھا کہ میں بوڑھا ہوں۔ مجھ میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔ مجھے دوڑتے ہوئے نوکر سست دکھائی دیتے تھے۔ ڈاکٹر کو لانے کے لئے میری کار بھی زیادہ تیزی سے چلتی ہوئی معلوم نہ ہوتی تھی

میرا کھلونا۔ اگر۔ او خدایا پھر کیا ہوتا۔ میرے رشید کے دل میں جو چشمہ ابلنے والا تھا وہ خشک ہو جاتا۔"

اچانک ڈپٹی صاحب کے ہاتھ سے اخبار گر پڑا۔ اُن کی آنکھیں پُرنم ہو گئی تھیں۔ اندر سے انہیں آمینہ کی نحیف آواز سنائی دے رہی تھی۔ "ابا جان سے کہو کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

(مرسلہ سکرٹری "حلقۂ اربابِ ذوق")

شیر محمد اختر

تری دنیا جہانِ مرغ و ماہی
مری دنیا فغانِ صبحگاہی
تری دنیا میں میں محکوم و مجبور
مری دنیا میں تیری بادشاہی

اقبال

اصغر کا روزنامچہ

اتوار ۔ ۸ ؍ جنوری ۱۹۳۹ء

جیسا اتوار کا معمول ہوتا ہے دوپہر تک میں نے سستی میں وقت گزار دیا اور دو بجے تک کپڑے بھی نہ بدلے ۔ دن بھر مجھ پر سستی سی چھائی رہی اور گویا ابد تک چھائی رہتی اگر میں ایک اعلیٰ درجے کے کانسرٹ (محفلِ سرود) میں چلا نہ جاتا ۔ بیچم والا گیت خوب تھا ، ٹان ہاؤزر والا افتتاحی نغمہ اتنا اچھا نہ تھا جتنا میرے ریکارڈ میں ہے لیکن بیٹھووَن کی دوسری سمفنی (نغمہ) پر تو میں بالکل مست ہو گیا ۔ اور میں نے خیال کیا کہ اس کی دوسری "حرکت" واقعی شاندار ہے ۔ ویلاں اور واگنر کے دو چھوٹے افتتاحی نغمے خوب ادا کئے گئے ۔ خاص طور پر پہلا ۔ بیچم نے نغمہ سازوں کے خیال کو خوب قلم بند کیا ہے ۔ اس کے بعد بیٹھووَن کی ساتویں سمفنی تھی جو بلا شبہ اپنے فن کی ایک بے نظیر چیز ہے ۔ اس کا آخری حصّہ انتہا درجہ دلفریب تھا ۔ یہ سہ پہر نہایت لطف سے کٹی ۔ کاش میں ٹرم شروع ہونے سے پہلے چند اور ایسی محفلوں میں شریک ہو سکوں لیکن اب تو میرے لئے صرف تین دن رہ گئے ہیں ۔

رات میں بہت دیر میں سویا کہ میں موسیقی پر ایک اعلیٰ درجے کی کتاب کا مطالعہ کرتا رہا ۔ جتنے بھی زیادہ "پکے" اور گہرے راگ میں سنتا ہوں مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں کسی اور دنیا میں جا نکلتا ہوں ایک حسین اور پاک و صاف دنیا ، دنیا "جیسی کہ ہونی چاہیئے" بالمقابل اُس کے "جیسی کہ ہے" ۔ رشید کا مجھے ایک خط ملا وہ سکواش کے کھیل سے خوب دلچسپی لینے لگا ہے اور یہ باوجود اپنے قد کے !

(ترجمہ ب ا) اصغر بشیر

محفلِ ادب

تو اگر واپس نہ آتی

(۱)

تو اگر واپس نہ آتی بحرِ ہیبت ناک سے
حشر کے دن تک دھواں اُٹھتا بطونِ خاک سے

ہاتھ آجاتا اگر تیرا نہ میرے ہاتھ میں
دل پہ کیا کچھ بیت جاتی اس اندھیری رات میں

اُف وہ طوفاں، وہ بھیانک تیرگی، وہ ابر و باد
وہ ہوائے تند باراں، وہ خروشِ برق رعد

دفعتہً وہ روشنی کے سلسلے کا ٹوٹنا
وہ گھٹاؤں کی گرج سے نبضِ ساحل چھوٹنا

وہ اُبا لو کے کلیجے کو مچلتی "مان سون"
وہ سمندر کے تھپیڑے، وہ ہواؤں کا جنوں

اور اس طوفان میں اے زندگی کی روشنی!
کود پڑنا وہ سمندر میں ترا ایک بارگی

(۲)

تو اگر واپس نہ آتی بحرِ ہیبت ناک سے
حشر تک دن تک دھواں اُٹھتا بطونِ خاک سے

اس دلِ سوزاں میں آتے اس بلا کے زلزلے
آسماں روتا، زمیں ہلتی، ستارے کانپتے

موت اور پھر موت تیری، الحفیظ الاماں!
ہڈیوں سے آنچ اُٹھتی اور بالوں سے دھواں

لیکن اک لمحے کے بعد اے پیکرِ حسن و حیات
جوش کو بھی کاوشِ ہستی سے مل جاتی نجات

پہلے ہوتا اک تلاطم ایک طوفاں، ایک جوش
بعد ازاں تو اور میں اور بحر و باراں کا خروش

اتّصالِ روح ہوتا موت کے گرداب میں
آتشِ غم سرد ہو جاتی کنارِ آب میں

(۳)

بحر کے سینے کو جب طوفان میں لاتی ہوا
پے بہ پے آتی ہمارے گنگنانے کی صدا

جب گھٹائیں رقص کرتیں اور پپیہے کوکتے
نور میں لپٹے ہوئے دونوں اُبھرتے بحر سے

رات جب کچھ بھیگ جاتی اور جھک جاتا قمر
سیر کرتے رہ ہم باہیں گلوں میں ڈال کر

کوئلیں جب کوکنے لگتیں اندھیری رات میں
صبح تک دھومیں مچاتے ہم بھری برسات میں

چھیڑتا جب کوئی ساحل پر ہماری داستاں
پڑنے لگتیں بحر پر ہلکی سی دو پرچھائیاں

زندہ رہتے حشر تک غم کے پرستاروں میں ہم — سانس لیتے سازِ حسن و عشق کے تاروں میں ہم
وقف ہو جاتے محبت کے فسانے کے لئے — سرد ہو کر آگ بن جاتے زمانے کے لئے

جوش ملیح آبادی

جوش کی اس نظم کی کیفیت ایک تیرہ و تار خلا کی سی ہے۔ یہ خلا، ہماری نظروں کے سامنے نہیں۔ ہمارے قدموں کے نیچے ہے اس خلاء کو دیکھتے ہوئے سب سے پہلے ہمیں شبہ سا ہوتا ہے کہ مفہوم کا اجالا دکھائی دینے کو ہے۔ اور پھر جوں جوں ہم مصرعوں کے زینے طے کرتے جاتے ہیں اور قصے کی گہرائی میں اُترتے جاتے ہیں، مفہوم کا وہ چمکتا ہوا جوہر جو نظم میں نہایت باقاعدگی کے ساتھ ساتھ رکھا ہوا ہے ہمیں پہلے جھلملاتا اور پھر جگمگاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ ہمیں زینوں کا احساس نہیں رہتا۔ یوں محسوس ہوتا ہے گویا ہم فضا میں معلّق ہیں اور نیچے گرتے چلے جا رہے ہیں، بلندو پستی کا احساس ہے نہ گردوپیش کا، خون کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ متضاد کیفیت بھی قائم ہے کہ ہر سمت کا شعور بیدار ہو رہا ہے، یوں سمجھئے کہ اس نظم کے الفاظ سے مفہوم تک پہنچنے کی کیفیت اس ہوا باز کے احساس سے ملتی جلتی ہے جو طیّارے سے چھتری لے کر کود پڑا ہو اُسی کی طرح زمین پر پہنچ کر قصہ قائم ہوتا ہے قصہ یوں ہے:-

شاعر ساحلِ بحر پر ایک عورت کو ڈوبنے سے بچا لیتا ہے۔ بس لیکن اس مختصر سی بات سے بھی کئی باتیں نکلتی ہیں۔ سب سے پہلے تو اسی کا تعیّن کیجئے کہ شاعر کون ہے؟ وہ عورت کون ہے۔ کئی مفروضے قائم کئے جا سکتے ہیں۔ ساحل پر ایک شاعر، اس نظم کا شاعر بیٹھا ہوا ہے۔ اچانک وہ سنتا ہے کہ نہاتے ہوئے کوئی عورت ڈوب گئی۔ شاعر کو اس خبر سے تحریکِ شعری ہوتی ہے۔ یا وہ سنتا ہے کہ کسی عورت نے خودکشی کے ارادے سے اپنے جسم کو سمندر کی لہروں کے سپرد کر دیا، لیکن بچالی گئی۔ شاعر کو اس خبر سے تحریکِ شعری ہوتی ہے یا شاعر بھی ساحل پر نہانے والوں میں سے ایک تھا۔ نہاتے ہوئے اچانک اس کے ہاتھ میں کسی عورت کا ہاتھ آ گیا اور اُسے صرف یہ خیال آیا۔ شاید کوئی لہر اس کے ہاتھ سے یوں چھو گئی گویا کسی ڈوبتی ہوئی عورت کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں آ گیا ہے۔ تحریکِ شعری کی صورت تو آخر کے مختلف نقشوں میں سے معیّن کی جا سکتی ہے لیکن ہمارا استفسار ابھی تک قائم ہے۔ شاعر کون ہے؟ — وہ عورت کون ہے؟ — شاعر ایک عاشق ہے اور وہ عورت اس کی محبوبہ اب ایک اور ہی رنگ میں قصہ قائم ہو جاتا ہے۔ شاعر اور اس کی محبوبہ اپالو کے ساحل پر بیٹھے ہیں۔ ہوا تندو تیز ہے، خروشِ برق و رعد ہے۔ بارش کا سلسلہ جاری ہے سمندر کے تھپیڑے ایک وحشیانہ انداز میں ساحل سے ٹکرا رہے ہیں۔ اس ہیبت ناک ماحول میں یہ دونوں ساحل کے کنارے پر کیوں بیٹھے ہوئے ہیں۔ نہ جانے کس طرح کس مشکل سے یہ لمحہ یکجائی کا حاصل ہوا ہے۔ "اتصالِ روح ہو یا موت کے گرداب میں" — "ابھی اتصالِ روح نہیں ہو پایا۔ آتشِ غم سرد ہو جاتی کنارِ آب میں"— کوئی غم نہیں لاحق ہے مستقل طور پر ہم آہنگ نہ ہو سکنے کا غم "نہ میسر ہے بنا میں مرنے کے بعد سیر کرنے"۔ "اودھو میں مچاتے" وغیرہ بھی دبی ہوئی خواہشات کی صورت میں اس بات کا اشارہ کر رہی ہیں کہ اس جوڑے کو مکمل ملاپ حاصل نہیں ہے۔ شاید عورت زندگی کی اس ناسازی سے زیادہ برگشتہ خاطر ہے۔ وہ موقع سے متاثر ہو کر مکمل ملاپ سے نا اُمید ہو کر اچانک سمندر میں کود پڑتی ہے۔ گھٹا گرج اٹھتی ہے اور اس گرج کے ساتھ

ہی شاعر بھی اپنی محبوبہ کو بچانے کیلئے اس کے پیچھے کودپڑتا ہے لیکن اچانک بجلی چمکتی ہے اور اس روشنی کے سلسلے میں محبوبہ کا ہاتھ شاعر کے ہاتھ میں آجاتا ہے اور وہ اُسے ڈوبنے سے بچا کر کنارے پر لے آتا ہے اب اُسے تحریکِ شعری ہوتی ہے۔ ابھی اس کے اعصاب اس ہنگامے، اس حادثے اس المناک واقعے کے اثرات سے رہائی نہیں پا سکے، ڈھیلے نہیں ہوئے کسی حد تک تنے ہوئے ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ اگر وہ اپنی محبوبہ کو بچا نہ سکتا تو کیا ہوتا۔ ہونا کیا تھا؟ وہ بھی اپنے آپ کو سمندر کی لہروں کے سپرد کر دیتا اور پھر اتصالِ روح ہوتا موت کے گرداب میں۔ اور یوں مرنے کے بعد اُن کی داستان ہی ساحل پر باقی رہ جاتی اور غم کے پرستار محبت کے اس افسانے کو مزے لے لے کر بیان کرتے۔ اور یوں "سرد ہو کر یہ دونوں عاشق زمانے کے لئے آگ بن جاتے"۔

لیکن کیا یہ نظم فراق کے بعد محبوبہ سے دوبارہ ملنے کا استعارہ تو نہیں ہے۔ کیا فراق کی کیفیت ایک بحرِ ہیبت ناک نہیں ہو سکتی؟ اس صورت میں قصّہ یوں ہو جائے گا کہ کچھ مدّت جدا رہنے کے بعد شاعر کو اپنی محبوبہ سے ملنا میسّر ہوتا ہے۔ وہ ایک تسکین کے ساتھ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیتا ہے۔ اس لمحے میں اُسے یوں محسوس ہوتا ہے گویا اس نے کسی بحرِ ہیبت ناک کے قہر و غضب سے رہائی پائی ہے۔ اور پھر اس کا تخیّل باقی تمام نظم کھڑی کر دیتا ہے۔

قصّے کی اشارتی کیفیتوں کا ذکر تو ہو چکا۔ اس کے علاوہ جس فن کارانہ بانکپن سے جوش نے اس نظم میں ہیرو کی ذہنی کیفیت کی مطابقت میں ماحول قائم کیا ہے۔ وہ بھی لائقِ تحسین ہے۔ ذاتی طور پر میرے ذہن میں اسے پڑھ کر ایک ویسی اجاڑ، المناک اور سنجیدہ کیفیت طاری ہو گئی تھی جو مغربی ناول نویس اور شاعرہ ایملی برونٹی کی بعض نظموں سے پیدا ہوتی ہے اور خصوصاً اس کے مشہور ناول "وُدرنگ ہائٹس" کے جذبۂ محبت کا گھنا، گرم جادو تو اس تاثر سے بہت ہی ملتا جلتا ہے

"میراجی" "ادبی دنیا"

اقبال کے آخری چوبیس گھنٹے

اقبالؒ کے انتقال کو آج پورے تین سال ہوتے ہیں۔

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کو پانچ بجنے میں ابھی چار پانچ منٹ تھے کہ حضرت علّامہ نے فرمایا مجھے فروٹ سالٹ دو۔ میں نے فروٹ سالٹ کا گلاس بنا کر ان کی خدمت میں پیش کیا۔ بھرا ہوا گلاس دیکھ کر فرمایا۔ "لیکن میں یہ سارا کیسے پی سکتا ہوں" پھر خود ہی ایک لمحے کے توقف کے بعد فرمایا "پھاپہ ابال ہے اور جلدی بیٹھ جائے گا" اس کے بعد آپ فروٹ سالٹ پی گئے۔

ابھی دو ایک منٹ بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ آپ نے اپنے دل کے نزدیک ہاتھ رکھ کر "ہائے" کہا۔ علی بخش نے انہیں اپنے بازوؤں میں تھام کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ لمحہ بھر سکون ہونے پر آپ نے کہا "مجھے ایسا محسوس ہوا تھا۔ جیسے کسی نے میرے دل میں چھری بھونک دی ہو" پھر آنکھیں اٹھا کر چھت کی طرف دیکھا اُن کی زبان پر آخری لفظ "اللہ" تھا۔

علی بخش نے اپنے زانو اٹھا لئے اور حضرت علّامہ قبلہ رُخ ہو کر لیٹ گئے۔ ابھی اُن کا سر تکیہ سے لگا ہی تھا کہ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

اس طرح ۶۳ سال کی عمر میں اس انسان کی ارضی زندگی کی مسافت

ختم ہوئی جس کے متعلق دوست دشمن سب کا اتفاق ہے کہ وہ عالمِ اسلام ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے مفکرین کی صفِ اول میں جگہ پانے کے قابل ہے اور جس کو امیر شکیب ارسلان نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ گزشتہ پانچسو برس میں اسلامی دنیا میں آپ کے پایہ کا کوئی واقفِ اسرارِ دین نہیں پیدا ہوا ۔

---

۲۰ اپریل کی صبح کو انہوں نے حسبِ عادت چائے کی ایک پیالی نوش کی پھر اخبارات پڑھوا کر سُنے اور حجام کو بلوا کر حجامت بنوائی ۔

ان کی ظاہری شکل و صورت میں کوئی غیر معمولی تبدیلی آج بھی نہیں تھی لیکن میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں سُرخ سُرخ ڈورے پڑ گئے تھے اور آنکھوں کے گرد کچھ سُوجن بھی نمودار ہو رہی تھی ۔

جاوید منزل کے ڈرائنگ روم سے ملحقہ کمرہ میں وہ ایک چارپائی پر گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھے تھے ۔ گاؤ تکیہ کو کبھی کبھی آگے رکھ کر اس پر سر بھی ٹیک دیتے ۔ تھے ۔ خادم باری باری ان کے جسم کو دباتے تھے ۔

ڈاکٹر صاحب کو کھانسی بہت شدید ہوتی تھی ۔ آج تو کھانستے کھانستے وہ ہلکان ہی ہو جاتے تھے ۔ ایک دفعہ جو انہیں کھانسی آئی اور انہوں نے بلغم تھوکا تو اس میں خون بھی شامل تھا ۔ اس کے بعد وہ جب بھی بلغم تھوکتے تھے اُس میں خون کی آمیزش ہوتی تھی ۔

۱۲ بجے کے قریب ڈاک آئی ۔ اس میں نٹال کے ایک انگریزی اخبار کا تراشہ بھی موصول ہوا جس کا مضمون یہ تھا کہ نٹال کے مسلمانوں نے نمازِ جمعہ کے بعد کمال اتاترک ، مسٹر محمد علی جناح اور سر محمد اقبال کی درازیٔ عمر کے لئے دعا کی ۔ میں نے انہیں یہ خبر پڑھ کر سنائی تو فرمایا یہ مسلمانوں کی مہربانی ہے کہ وہ مجھے بھی اپنی دعاؤں کا مستحق سمجھتے ہیں ۔ کچھ عرصہ کے توقف کے بعد فرمایا : ۔

"میری عمر کے لئے تو اب انہیں دعا نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ میں تو اپنی زندگی کا کام ختم کر چکا ہوں ۔ اب تو مسلمانوں کو کمال اور جناح کی ضرورت ہے ۔ اس لئے انہیں ان کے لئے دعا کرنی چاہیئے ۔"

ساڑھے چار بجے کے قریب ڈاکٹر صاحب کے ایک پرانے جرمن دوست بیرن فان والتھیم ملنے کے لئے آئے ۔ یہ گاؤ تکیہ پر سر ٹیکے بیٹھے تھے ۔ جونہی اُن کے دوست نے کمرہ میں قدم رکھا ۔ انہوں نے اس شیر کی طرح جو بڑھاپے میں بھی اپنا وقار قائم رکھتا ہے گردن اُٹھائی اور استفہامیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا ۔ بیرن نے اپنا تعارف کرایا کہ ہم طالب علمی میں میونخ یونیورسٹی میں دوست ہوا کرتے تھے ۔ یہ سنتے ہی ڈاکٹر صاحب کے چہرہ پر بشاشت کی لہر دوڑ گئی ۔ اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے ۔ اور ان سے اپنی لینڈ لیڈی ، اس کی بیٹی اس زمانے کے دوستوں اور رفیقوں کے متعلق سوالات کرتے رہے ۔ ان کی اس گفتگو سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ نووارد جرمنی کے بہت بڑے " نواب " ہیں ۔ اور اب مشرقی ممالک کی سیاحت کی غرض سے گھر سے نکلے ہیں ۔

ڈاکٹر صاحب میں یہ بات بڑی تعجب انگیز تھی کہ ادھر تو وہ ابھی درد کی شدّت سے تلملا رہے تھے ۔ اُدھر جونہی کوئی ایسا ملاقاتی آتا جو اپنی باتوں سے ان کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ سکتا ۔ آپ گفتگو میں ایسے محو ہو جاتے گویا انہیں کوئی تکلیف تھی ہی نہیں ۔

اب بھی وہ اسی انہماک سے بیرن سے محوِ گفتگو تھے ۔ افغانستان میں موسم کیسا ہوتا ہے ۔ وہاں کس قسم کے پھل ملتے ہیں ۔ وہاں گوشت کیسا ہوتا ہے ۔ افغانستان میں شکار کے کون کونسے جانور ہیں ۔ وغیرہ وغیرہ ایسے ہی بیسیوں عنوانات پر ڈاکٹر صاحب گفتگو کرتے رہے

جن لوگوں کو ڈاکٹر صاحب سے گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے یا جنہوں نے انہیں گفتگو کرتے سنا ہے ۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ بے مثل گفتگو کرنے

والے تھے۔ وہ ہر مذاق اور ہر عمر کے آدمیوں سے بہت دلچسپ باتیں کیا کرتے تھے۔ اس وقت بھی اگرچہ انہیں بولنے میں دقت ہوتی تھی۔ تاہم وہ بڑی گرم جوشی سے باتیں کئے جاتے تھے۔ موسم اور آب و ہوا کا موضوع بدلا تو جرمن فلاسفروں پر گفتگو شروع ہوگئی۔ جرمن فلاسفی کے تازہ ترین رجحانات پر بھی انہوں نے اظہار خیال فرمایا۔

بین الاقوامی سیاسیات کا ذکر آنے پر آپ نے یہ فقرہ کہا:۔

These things are not to be talked of openly.

میں محسوس کر رہا تھا کہ بیرن بوڑھے شاعر کی نازک صحت کے پیش نظر گفتگو کو طول نہیں دینا چاہتا۔ اس نے کہا بھی کہ میری موجودگی سے شاید آپ کو تکلیف ہو رہی ہے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:۔

It is just the other way. Your breath is like balm to me.

بالآخر کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد بیرن والتھیم صاحب نے اجازت طلب کی۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے اپنا ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھایا۔

یہاں میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں، کہ ڈاکٹر صاحب آنے جانے والوں سے شاذونادر ہی ہاتھ ملایا کرتے تھے۔ صرف زبان سے سلام کا جواب دے دیا کرتے تھے۔ مگر انتقال سے چار پانچ روز پہلے میں نے قدرے حیرت سے دیکھا کہ جب کوئی آدمی اُن کے پاس سے اٹھ کر جاتا تھا تو یہ آپ ہی اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیتے تھے۔ شاید انہیں معلوم ہو چکا تھا۔ کہ اب چند دنوں میں مجھے یہاں سے رخت سفر اٹھانا ہے۔

اس افسردہ اور غمناک شام کا سب سے زیادہ درد انگیز منظر یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی کمسن صاحبزادی منیرہ بانو بار بار اُن کے کمرہ میں آتی تھی اور خاموشی سے اُن کے پہلو میں بیٹھ جاتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی قوت بینائی بہت کمزور ہو چکی تھی اس لئے وہ آواز سن کر ہی دوسروں کو پہچان سکتے تھے۔ منیرہ بانو جب اُن کے پاس بیٹھ جاتی تھی تو یہ شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتے تھے۔ تو بانو ہے۔

ایک بار جب وہ اُٹھ کر گئی تو انہوں نے انگریزی میں فرمایا:۔

She instinctively realises that father's death is near at hand.

منیرہ بانو عام طور پر ڈاکٹر صاحب کے پاس دن میں صرف دو تین مرتبہ ہی آیا کرتی تھی۔ ایک دفعہ سکول جانے سے پہلے پھر سکول سے واپس آنے پر اور شام کو سونے سے پہلے جب بھی وہ اُنکے پاس آتی تھی تو یہ بلا ناغہ اس سے پوچھتے تھے کہ آج کیا کھایا ہے؟ کتنا کھایا ہے؟ وہ معصومانہ انداز سے ہاتھوں کے اشارہ سے بتایا کرتی تھی کہ آج میں نے اتنے چاول کھائے یا اتنی روٹیاں کھائیں۔ یہ سن کر آپ کہتے کہ بس صرف اتنا ہی کھایا۔ ڈاکٹر صاحب فرمایا کرتے تھے کہ بچوں کو صرف کھانے پینے کا شوق ہوتا ہے۔ اس لئے اُن سے صرف کھانے پینے کی باتیں کرنی چاہئیں۔ اسی سے وہ خوش ہوتے ہیں۔ ایسی باتیں کرنے کے بعد وہ خود ہی اُٹھ کر کھیلنے یا پڑھنے چلی جاتی تھی۔ مگر آج وہ ڈاکٹر صاحب کے پاس سے اُس وقت تک نہ اُٹھتی تھی جب تک وہ خود اس سے نہ کہتے تھے کہ بانو ایسا کر اپنی مُنّی جان (منیرہ اپنی جرمن گورنس کو مُنّی جان کہہ کر پکارتی تھی) کے پاس جاؤ۔

اب سورج غروب ہو چکا تھا اور ان کی چارپائی ڈرائنگ روم میں ڈال دی گئی۔ اسی وقت فاطمہ بیگم صاحبہ پرنسپل جناح اسلامیہ کالج ان سے ملنے آئیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ان سے دریافت کیا کہ اُن کے کالج میں لڑکیوں کو قرآن پڑھانے کا کیا انتظام ہے۔ اس کے

بعد انہوں نے ان سے مُنّو کو قرآن پڑھانے کے لئے ایک اچھا ٹیوٹر مہیا کرنے کے لئے کہا۔

ڈاکٹر صاحب کے عقیدتمندوں میں سے اس وقت چودھری محمد حسین، سید نذیر نیازی، سید سلامت اللہ شاہ، حکیم محمد حسن قرشی اور راجہ حسن اختر موجود تھے۔ ان کے ایک رشتہ دار ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب بھی موجود تھے۔

یہ سب اصحاب محسوس کر رہے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کی صحت کی حالت نازک ہو چکی ہے اور وہ اس کے متعلق آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب غصّہ میں آ گئے اور فرمایا تم اونچی آواز میں گفتگو کیوں نہیں کرتے۔ اسی وقت کمرہ میں ڈاکٹر صاحب کا چھوٹا صاحبزادہ جاوید داخل ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے آنکھ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا "یہ کون ہے؟" اس نے کہا "میں جاوید ہوں" اس پر انہوں نے فرمایا "ادھر آؤ اور میرے پاس آ کر بیٹھو" پھر کہا "میں یہی چاہتا ہوں کہ تم جاوید بن سکو۔ اور اس کا ایک گُر یہ ہے کہ تم میری آنکھوں کے سامنے رہا کرو۔" اس کے بعد چودھری محمد حسین کو مخاطب کر کے فرمایا "آپ کو یاد ہوگا کہ میں اس کی پیدائش پر اسے مجدّد صاحب کے مزار میں لے گیا تھا اور وہاں اس کے حق میں یہ دعا کی تھی کہ اللہ اسے موجودہ دور کی مادّیت اور دہریت سے محفوظ رکھے۔"

اب انکی چارپائی کوٹھی کے باہر میدان میں ڈال دی گئی اور کرنل امیر چند، میجر الٰہی بخش اور ڈاکٹر جمعیت سنگھ نے ان کا معائنہ کیا۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ رات گزر جانے کے بعد وہ علی الصباح ٹیکے لگائیں گے۔

ساڑھے دس بجے ڈاکٹر صاحبان تشریف لے گئے۔

اب ہوا میں کچھ خنکی آ گئی تھی اور چارپائی کو دوبارہ ڈرائنگ روم میں لا دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے علی بخش کو جو بہت مغموم تھا اپنے پاس بلایا وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا آپ نے اسے تسلّی دیتے ہوئے چودھری محمد حسین سے کہا "دیکھئے نا چودھری صاحب یہ چالیس سال کی رفاقت کا معاملہ ہے۔"

ساڑھے گیارہ بجے انہیں کھانسی کی دوا دی گئی جس سے انہیں متلی شروع ہو گئی اور فرمانے لگے۔ کہ ڈاکٹروں کی دوائیاں (Human) نہیں ہوتیں۔ گزشتہ چار پانچ روز میں ڈاکٹر صاحب کا علاج کئی بار بدلا گیا تھا۔ پہلے شفاء الملک حکیم محمد حسن صاحب قرشی کا علاج ہو رہا تھا۔ مگر ڈاکٹر صاحب کے منع کرنے کے باوجود حکیم صاحب کے دوست انہیں طبّی بورڈ کے سلسلہ میں راولپنڈی کھینچ کر لے گئے تھے۔ جس کا ڈاکٹر صاحب کو بہت صدمہ تھا۔ اور ناچار انہیں ایلوپیتھی طریق علاج اختیار کرنا پڑا۔

متلی بند کرنے کے لئے انہیں الائچی اور کوزہ مصری دی گئی۔ اس سے ان کی طبیعت میں قدرے سکون پیدا ہو گیا۔ ان کی عادت تھی کہ ہر موقع اور موضوع کو (Humorous) کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اپنے علاج کے متعلق بھی فرمایا کہ ہمیں تو یہی پتہ ہے کہ جو نسخہ ڈاکٹر یار محمد نے تجویز کیا تھا اُسے کپتان (اب میجر) الٰہی بخش نے منسوخ کر دیا اور جو نسخہ کپتان الٰہی بخش نے تجویز کیا اُسے کرنل امیر چند نے منسوخ کر دیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ چونکہ ابھی تک انسانی زندگی کے متعلق حکما کو پوری واقفیت نہیں ہوئی۔ اس لئے وہ سائنس بھی جو انسانی امراض کا دفعیہ کرے لازمی طور پر مکمل نہیں ہو سکتی۔

ڈاکٹر صاحب کے دوستوں نے بڑی کوشش کی کہ وہ خواب آور دوا کی ایک خوراک پی لیں۔ ان کا اصرار بڑھتے دیکھ کر انہوں نے کہا کہ اچھا چکھ کر مجھے دوائی کا ذائقہ بتاؤ۔ ذائقہ نمکین بتایا گیا تو آپ نے دوا پینے سے قطعاً انکار کر دیا۔

اب رات کے بارہ بج چکے تھے اور سب دوست شب بخیر کہتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ اس وقت آپ کی آنکھ لگ گئی اور آپ

ایک گھنٹہ تک سوتے رہے۔ آنکھ کھلنے پر پھر آپ کو متلی شروع ہو گئی۔ شانوں کے درمیان شدید درد کی شکایت کرتے تھے۔

بار بار پوچھتے تھے۔ اب کیا کیا جائے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب نے دوا کی ایک خوراک پینے کا مشورہ دیا۔ میں نے بھی عرض کیا کہ آپ پی لیں۔ تاکہ نیند آجائے۔ اس پر وہ ناراض ہو گئے اور غصہ سے کہا۔ جب میں تم سے ایک دفعہ کہہ چکا ہوں کہ میں یہ دوا نہیں پیوں گا پھر تم اصرار کیوں کرتے ہو؟

اس کے بعد نرم لہجہ میں فرمایا "بات یہ ہے کہ اس دوا میں افیون کا جزو ہے اور میں بے ہوشی میں مرنے کو تیار نہیں ہوں"۔

رات ڈھلتی چلی جا رہی تھی۔ کبھی ان کی طبیعت زیادہ بے چین ہو جاتی تھی اور کبھی قدرے سکون پذیر۔ اس کے بعد پھر درد کا دورہ شروع ہو جاتا تھا۔ اس رات انہوں نے حقّہ بالکل نہیں پیا۔ بار بار وقفوں کے بعد پوچھتے تھے کہ اب کیا وقت ہے؟ سب سے یہی تقاضا کرتے تھے کہ میرے پاس ہو کر بیٹھو اور اگر کوئی سونے کا ارادہ کرتا تھا تو فرماتے تھے کہ آج کی رات اور جاگ لو۔

ہوشیارپور کا ایک شخص دیوان علی ان کا ملازم تھا۔ وہ گانے کا شوقین بھی تھا۔ مگر پنجابی کے چند دوہوں اور ایک گھٹیا اردو غزلوں کے سوا اُسے اور کچھ یاد نہ تھا۔ اردو الفاظ کا تلفظ اس طرح بگاڑتا تھا کہ ذوقِ سلیم کو سخت گراں گزرتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اسے پنجابی کے دوہے گانے کے لئے کہا کرتے تھے۔ آج رات بھی انہوں نے اُسے گانے کے لئے کہا۔ اس نے بلھے شاہ کی یہ کافی گا کر سنائی جس کا ایک بیت ہے ؎

بلھیا دل دا کی سمجھانا ؞ اِدھروں پٹنا اُدھر لانا

یہ بیت سن کر ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور رقت آمیز لہجہ میں کہا۔ "کتنی سچی بات ہے"۔

ہم پانچوں یعنی ڈاکٹر عبدالقیوم، علی بخش، دیوان علی، رحمٰن اور میں انہیں باری باری دباتے رہتے ؛

تین بجے کے قریب اُن کی تکلیف بہت بڑھ گئی۔ اور مجھ سے فرمایا کہ جا کر حکیم محمد حسن قرشی کو بلا لاؤ۔ راجہ حسن اختر صاحب جو اب شیخوپورہ میں افسر مال ہیں کوٹھی کے باہر صحن میں سو رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ انہیں میرے پاس بھیج دو تاکہ وہ مجھ سے باتیں کریں۔

میں نے حکیم صاحب کے دروازہ پر جا کر آوازیں دیں مگر وہ اوپر کی منزل میں سو رہے تھے۔ اور میری آواز اُن تک پہنچ نہ سکتی تھی۔ اُن کے مکان کے سامنے ایک آدمی سو رہا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ اُن کا ملازم تھا۔ اور اُس کے پاس دروازہ کی کنجی تھی لیکن آہ! میری لاعلمی میں ناکام واپس لوٹ آیا۔ جب میں نے ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا کہ حکیم صاحب مجھے نہیں مل سکے تو انہوں نے فرمایا۔ "دیکھئے! قرشی صاحب بھی نہیں آسکتے۔ اب کیا ہوگا"۔

آپ نے ڈاکٹر عبدالقیوم سے پوچھا کہ ایلوپیتھی طب میں میری بیماری کی موجودہ کیفیت کا کیا نام ہے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم نے کہا کہ اسے Restlessness اور Insomnia کہتے ہیں اور اس کا علاج (Morphia افیم) کا ٹیکا ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ ایسے علاج سے میں یہ تکلیف برداشت کرنا پسند کرتا ہوں۔

اب پھر انہیں قدرے سکون ہو گیا تھا۔ راجہ صاحب کو جو ساتھ والے کمرے میں جا کر لیٹ رہے تھے بلا بھیجا۔ اس وقت انہوں نے ارمغانِ حجاز کی یہ مشہور رباعی سوز و گداز سے ٹھہر ٹھہر کر پڑھی۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید ؞ نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے ؞ دگر دانائے راز آید کہ ناید

تھوڑی دیر بعد طبیعت پھر خراب ہونا شروع ہو گئی اور انہوں نے راجہ حسن اختر سے حکیم محمد حسن قرشی کو بلانے کے لئے کہا۔ اس وقت پَو پھٹ چکی تھی اور اُجالا نمودار ہو رہا تھا۔ راجہ صاحب کو گئے ابھی چار پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا میری چارپائی اُٹھا کر دوسرے کمرہ میں لے چلو۔ اس کے بعد انہوں نے فروٹ سالٹ پیا اور جیسا میں اوپر بیان کر چکا ہوں اللہ کا نام ان کی زبان پر تھا جب انہوں نے فرشتۂ اجل کو لبیک کہا۔

انتقال سے ایک ہفتہ پہلے انہوں نے اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد صاحب سے جن کا حال ہی انتقال ہُوا ہے کہا تھا کہ میں موت کو متبسم ہو کر خوش آمدید کہوں گا اور پھر انہیں اپنا یہ شعر پڑھ کر سنایا تھا ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم چو مرگ آید تبسم برلبِ اوست

ان کی موت اس شعر کی تفسیر تھی۔ جن لوگوں نے ڈاکٹر صاحب کا آخری دیدار کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کے لبوں پر تبسم رقصاں تھا۔

آج اس جانکاہ حادثہ کو تین سال ہوتے ہیں مگر مجھے یہ کل کا واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگرچہ موت اقبال کے جسم کو مٹانے میں کامیاب ہو گئی مگر اس کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ اُس کی خودی کو تباہ کر سکتی۔

انہوں نے مجھ سے فرمایا تھا کہ میں دوائیں اس لئے استعمال نہیں کرتا کہ میں اس دنیا میں زیادہ عرصے کے لئے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ بلکہ محض اس لئے کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ میرا ego بیماری کے حملہ سے کمزور ہو جائے۔ اگر اس مرحلہ پر میرا انا ego کمزور ہو گیا تو مرنے کے بعد مجھے دوبارہ جی اُٹھنے میں بہت وقت لگے گا۔ لیکن اگر میں نے اس کو اسی طرح مضبوط رکھا تو مرنے کے بعد جلد ہی اُٹھوں گا۔

خدا جانے وہ اس وقت کس زمان و مکان اور کس صورت میں ہیں لیکن میرا ایمان ہے کہ اقبال کہیں بھی ہو وہ مصروفِ تخلیق ہو گا۔ ارمغانِ حجاز کا آخری شعر اس ضمن میں بہت نمایاں ہے ؎

اگر مقصودِ کل میں ہوں تو مجھ سے ماورا کیا ہے مرے ہنگامہ ہائے نو بنو کی انتہا کیا ہے

محمد شفیع ایم۔اے (نوائے وقت لاہور)

صحت الفاظ

اس عنوان سے حال ہی میں ایک مضمون رسالہ "زمانہ" میں شائع ہوا ہے جس میں الزام کے طور پر یہ بیان کیا گیا ہے کہ "فارسی عربی جانے بغیر اُردو نہیں آسکتی با الفاظ دیگر عربی فارسی کی مدد کے بغیر صحیح اُردو بولنا، لکھنا ناممکن ہے" یہ الزام نہیں بہتان ہے ہزاروں کی تعداد میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو بہت اچھی اُردو بولتے اور لکھتے ہیں حالانکہ وہ فارسی عربی مطلق نہیں جانتے۔ اس کے خلاف بہت سے ایسے لوگ ملیں گے جو عربی فارسی کے فاضل ہیں اُردو نہیں لکھ سکتے۔ بات یہ ہے کہ جو زبانیں ابھی کامل و مکمل نہیں ہوئیں انہیں دوسری زبانوں کی احتیاج رہتی ہے اور جب وہ خود درجۂ کمال کو پہنچ جاتی ہیں تو دوسری زبانوں کی محتاج نہیں رہتیں۔ اگر اُردو کا کوئی ادیب عربی فارسی یا ہندی سنسکرت یا انگریزی جانتا ہے تو یہ خوبی کی بات ہے۔ وہ اپنی زبان کو ان زبانوں کے علم سے بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتا ہے لیکن یہ ضرور نہیں کہ اُردو کے لئے وہ دوسری زبانیں لازمی طور پر حاصل کرے لیکن اگر وہ جانتا ہے تو یہ اس کے لئے فوقیت کی بات ہے۔ اسی طرح اگر ہندی کا ادیب اُردو فارسی یا سنسکرت یا انگریزی کا بھی عالم ہے تو یہ موجبِ فضیلت ہے چنانچہ ہندی کے اچھے ادیب اکثر وہی ہوئے ہیں جو اُردو یا فارسی بھی جانتے تھے۔ مولانا حالی نے اُردو کے اچھے شاعر کے لئے ہندی بھاشا کا جاننا بھی ایسا ہی ضروری قرار دیا ہے جیسا فارسی عربی کا چنانچہ فرماتے ہیں۔

"اُردو زبان کا شاعر جو ہندی بھاشا کو مطلق نہیں جانتا اور محض فارسی عربی کے تان گاڑی چلاتا ہے وہ گویا اپنی گاڑی بغیر پہیوں کے منزلِ مقصود تک پہنچانی چاہتا ہے۔"

ہندوستان کے سوا دنیا میں اور ملک بھی ہیں اور ہندی اُردو کے سوا دنیا میں اور زبانیں بھی ہیں۔ شائستہ ملکوں کے ادیبوں اور شاعروں کو دیکھیے کہ کتنی کتنی زبانیں جانتے ہیں اور اپنے اس علم سے کیسے کیسے فائدے اٹھاتے ہیں۔

اس مضمون میں ایک دوسری بات ایک صاحب کے حوالے سے یہ لکھی ہے کہ الفاظ کی صحت اور ان کے زیر و زبر کے معاملات اُردو میں بھی ایرانی ہائیکورٹ سے طے ہوں گے اور ہمیں زیر کو زبر کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ جس کسی نے بھی یہ لکھا ہے غلط لکھا ہے۔ اس معاملے میں اُردو ہرگز فارسی یا عربی کی محتاج نہیں بلکہ جو لفظ خواہ وہ کسی زبان کا ہو جو اردو میں آگیا اور جس طرح وہ بولا اور لکھا جاتا ہے۔ خواہ اصل زبان میں اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، وہی صحیح ہے۔ اس بارے میں میر انشاء اللہ خاں کا قول ناطق ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"یاد رہے کہ ہر لفظ جو اُردو میں مشہور ہوگیا اُردو ہوگیا خواہ وہ عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا پوربی از روئے اصل غلط ہو یا صحیح، وہ لفظ اُردو کا لفظ ہے اور اگر اصل کے خلاف مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے۔ اس کی صحت اور غلطی اُردو میں اس کے استعمال میں آنے پر منحصر ہے کیونکہ جو اُردو کے خلاف ہے غلط ہے خواہ وہ اصل زبان میں صحیح ہو۔ اور جو اُردو کے موافق ہے صحیح ہے خواہ وہ اصل میں صحیح نہ بھی ہو" (ملاحظہ ہو دریائے لطافت صفحہ ۱۴۲)

اور اسی پر اُردو دانوں اور اُردو ادیبوں کا عمل رہا ہے۔ ہزاروں عربی فارسی کے ایسے لفظ ہیں جن کا تلفظ اُردو میں کچھ ہے اور اصل زبان میں کچھ اور۔ اور سینکڑوں عربی فارسی ایسے لفظ ہیں جن کے معنے اُردو میں کچھ ہیں اور عربی فارسی میں دوسرے۔ مثال کے طور پر چند لفظ جو اس وقت خیال میں ہیں لکھے جاتے ہیں۔

اُردو	عربی	اُردو	عربی	اُردو	عربی
زیادتی	زیادت	غش	غشی	نشا یا نشہ	نشاۃ
سیّد	سیِّد	رَدّی	رَدی	سلامتی	سلامت
جہل	جُہل	موسِم	موسم	میّت	میِّت
وغیرہ وغیرہ		جیب	جَیب	غلطی	غَلَطی

اسی طرح لفظوں کے معنے بھی بدل گئے ہیں۔ مثلاً کسر کے معنے عربی میں توڑنے کے ہیں لیکن اُردو میں کمی یا نقصان کے ہیں۔ غریب کے معنے عربی میں نادر یا مسافر کے ہیں اُردو میں مفلس کے ہیں۔ فی کے معنی عربی میں بیچ یا میں کے ہیں۔ اُردو میں آکر اس کے معنے کچھ اور ہی ہوگئے ہیں۔ مرزا داغ فرماتے ہیں ؎

سمجھنے والے سمجھتے ہیں پیچ کی تقریر ✧ کہیں نہ کچھ تری باتوں میں فی نکلتی ہے

افراط تفریط بگڑ کر افراتفری ہوگیا اور معنے کچھ کے کچھ ہوگئے

اُردو اس معاملے میں بہت روادار ہے۔ اس کی رواداری اُن مرکبات سے معلوم ہوتی ہے جو عربی ہندی، فارسی عربی یا فارسی ہندی جوڑ سے بنائے گئے ہیں اور جن کو دیکھ کر بعض ناواقف سخت مآب ناک بھوں چڑھاتے ہیں مثلاً اچار، ناچار کے معنے دوسرے ہیں، اُگالدان، پیچوان، پھولدار، مرہٹہ گردی، ہمہ گشت، اُٹھائی گیرا، دلدار، گلے باز، چانڈو خانہ، کمبل پوش، کنبہ پرور، گولنداز، گاڑی خانہ، جوئے خانہ۔ ڈھٹ بنسی، دماغ چٹ، تل نظرا، گھر داماد، نیک چلن، حجامت اُستاد، کوڑھ مغز، عجائب گھر، گل تکیہ، کفن چور وغیرہ وغیرہ بیشمار لفظ ہیں۔ اسی طرح انگریزی اُردو لفظوں کے مرکبات بھی استعمال میں آگئے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اُردو زبان میں ایک دور ایسا آیا تھا جب کہ ناسخ اور اُن کے شاگردوں اور پیروؤں نے صحتِ الفاظ کے خبط میں ہر فارسی عربی لفظ کو اصل کی طرف رجوع کرنا شروع کیا لیکن چونکہ یہ زبان کی فطرت کے خلاف تھا اس لئے یہ اصول چل نہ سکا۔ سر سید احمد خاں مرحوم کے وقت سے اُردو میں سادہ نویسی کا عام رواج ہوگیا ہے

برخلاف اس کے جدید ہندی میں مشکل پسندی بڑھتی گئی۔ اس لئے کہ جدید ہندی والوں نے صرف مروجہ عربی فارسی لفظ ہی ترک نہیں کئے بلکہ آسان ہندی الفاظ (اپ بھرنش) کو بھی زبان سے خارج کردیا اور ان کی بجائے اصل سنسکرت لفظ استعمال کرنے شروع کردیئے۔ اردو بول چال کی زبان سے بنی اور اب تک بول چال کے لفظ اس میں داخل ہوتے رہتے ہیں اسی لئے اس میں زیادہ وسعت پیدا ہوگئی اور اس کے مقبول ہونے کی بھی یہی وجہ ہوئی۔

اُردو میں سینکڑوں عربی فارسی سنسکرت کے ایسے لفظ ہیں جن کی صورت کچھ سے کچھ ہوگئی ہے اور بہت سوں کے معنے تک بدل گئے ہیں اب چونکہ وہ اسی صورت سے استعمال میں آگئے ہیں اور عام و خاص اسی طرح بولتے اور لکھتے ہیں اس لیے یہی مستند خیال کئے جاتے ہیں اگرچہ وہ اصل کے خلاف ہیں۔ ایک بار سرسیدؒ نے مشکورؔ کا لفظ ممنون کے معنوں میں لکھ دیا تھا مولانا شررؔ مرحوم نے اعتراض کیا۔ اس پر سرسیدؒ نے فرمایا کہ شرر صاحب کو اعتراض کرنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ میرے لکھے سے انہیں سند لینی چاہئے تھی۔ غرض یہ کہ اُردو کے کسی علی ادیب یا ماہر لسانیات نے کبھی ایسا خیال ظاہر نہیں کیا کہ اُردو کے فارسی عربی لفظ جن کی صورت شکل بدل گئی ہے اصل زبان کے الفاظ کی طرح لکھے اور بولے جائیں۔ یہ خیال بعض اُن مشیخت مآبوں کا ہے جو لسانیات کے اصول سے واقف نہیں۔ اس بارے میں ہم مولانا حالی کا قول نقل کرتے ہیں جسے قول فیصل سمجھنا چاہیئے۔

"فی الحقیقت یہ ایک غلطی ہے جو اکثر ہمارے عربی دانوں کو علم لسان کی ناواقفیت سے پیش آتی ہے۔ ان کو یہ معلوم نہیں کہ ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان میں منتقل ہوکر کبھی اپنی اصلی صورت پر قائم نہیں رہ سکتے، الاماشاءاللہ، دور کیوں جاؤ ہماری اُردو ہی میں ہزاروں لفظ سنسکرت پراکرت اور بھاشا کے داخل ہیں۔ باوجود اسکے شاذونادر ہی ایسے الفاظ نکلینگے جو اپنی اصلی صورت پر قائم ہوں"۔ اسکے بعد مولانا نے مثال میں ہندی لفظ دیکر انکی اصل بتائی ہے۔ پھر لکھتے ہیں "اسی طرح پراکرت اور بھاشا کے صدہا لفظ اپنی اصل کے خلاف ہماری زبان میں مستعمل ہیں مگر چونکہ انکی اصلیت سے واقف نہیں اس لئے انکو صحیح سمجھ کر بے تکلف بولتے اور برتتے ہیں لیکن عربی یا فارسی جس سے انکو فی الجملہ واقفیت ہے جہاں اس کا کوئی لفظ اصل زبان کے خلاف کسی کی اُردو نظم یا نثر میں دیکھا اور فوراً ناک چڑھائی، حالانکہ خود عربی کے بہت سے الفاظ اصل وضع کے خلاف استعمال کرتے ہیں"۔ اسکے بعد لکھا ہے کہ "علی ہذا القیاس فارسی کے الفاظ بھی اکثر اُردو میں غلط بولے جاتے ہیں۔ اہل ایران عربی کے صدہا لفظ غلط تلفظ کے ساتھ یا غلط معنوں میں استعمال کرتے ہیں مثلاً حضور بجائے حضور احضوری بجائے حضور وغیرہ انگریزی میں تمام دنیا کی زبانوں سے الفاظ لئے گئے ہیں مگر کسی لفظ کو اصلی صورت میں قائم نہیں رکھا۔ مثلاً گیلف: خلیفہ، میگزین: مخزن، وغیرہ۔

اسی طرح جہاں تک استقرا کیا جاتا ہے کسی زبان کے الفاظ دوسری زبان میں جاکر اپنی اصلی وضع پر قائم نہیں رہتے پس جبکہ موسم یا میّت یا نشاو غیرہ الفاظ ہمارے خاص و عام سب کی زبان پر جاری ہیں تو اُردو نظم و نثر میں کیوں نہ استعمال کئے جائیں۔ بات یہ ہے کہ ایسے لفظوں کو جو عربی یا فارسی یا انگریزی سے اُردو میں لئے گئے ہیں اور اصل وضع کے خلاف عموماً مستعمل ہوتے ہیں یہ سمجھنا ہی غلطی ہے کہ وہ موجودہ صورت میں عربی یا فارسی یا انگریزی کے الفاظ ہیں نہیں بلکہ اُن کو اُردو کے الفاظ سمجھنا چاہیئے جو اصل کے لحاظ سے عربی یا فارسی یا انگریزی سے ماخوذ ہیں ایسے لفظوں کو غلط سمجھ کر ترک کرنا یا انکو اصل کے موافق استعمال کرنے پر مجبور کرنا بعینہ ایسی بات ہے کہ لالٹین کے بولنے سے لوگوں کو منع کیا جائے اور لینٹرن بولنے پر مجبور کیا جائے یا گھرام بولنے سے روکا جائے اور گمٹ بولنے کی تاکید کی جائے۔

یہ قول پچاس برس پہلے کا ہے اور انشا کا قول تو اور بھی قدیم ہے۔ اب کسی اخبار نویس یا کسی مدعی ادب کے لکھنے پر برہم ہوکر ان فرسودہ چیزوں پر خامہ فرسائی کرنا اور تمام اُردو کے ادیبوں کو ملزم ٹھہرانا یا تو ناواقفیت پر دلالت کرتا ہے یا اسکی تہ میں کوئی خاص مصلحت پوشیدہ ہے۔" ہماری زبان"

ایک ۱۰۰ سو

برس کی عمر کا راز

جو ۱۸۳۹ء سے ۱۹۳۹ء تک پہنچ کر

کارخانہ

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ

نے

حاصل کیا

مال کی عمدگی، دیانتداری اور خوش معاملگی

ہے

اشتہار

باجلاس جناب سید تفضل حسین شاہ صاحب منصف درجہ اوّل چشتیاں

رجسٹرڈ فرم موسومہ دہرم پال برہم دت واقعہ منڈی چشتیاں بنام مالکان فرم کیشور چند ولد گوجرمل ایسر داس و بھمن مل منوہر چند ولد سکھ رام دہرم پال ولد مکند لال برہم دت ولد پربھدیال اگروال بانیہ ساکنہ منڈی چشتیاں بذریعہ ایشر داس مدعی

خادم حسین ولد سردار محمد قوم جٹ ساکنہ چک ۲۷ نہر گجیانی رلیا رام تلسی رام پسران ہرگوپال مل و آسا رام سدا رام پسران تلسی رام اگروال ساکنان منڈی چشتیاں کندن لعل تنویسین امدسین پسران متر چند اقوام اگروال ساکنان منڈی چشتیاں مدعا علیہ

دعوٰے دلا پانے مبلغ سا عہ اصل معہ سود بربنائے بیعانہ

اندریں مقدمہ مسمی خادم حسین ولد سردار محمد جٹ ساکنہ چک ۲۷ نہر گجیانی مدعا علیہم عمداً تعمیل سمن سے گریز کرتا ہے۔ اور پوشیدہ رہتا ہے۔ لہٰذا بذریعہ اشتہار ہذا مشتہر کیا جاتا ہے۔ کہ مدعا علیہ بقرار پیشی ۱۲ جون ۱۹۴۱ء کو حاضر عدالت ہذا ہو کر جوابدہی مقدمہ مذکورہ کرے۔ ورنہ اس کے خلاف کارروائی یکطرفہ عمل میں لائی جائے گی۔ تحریر ۳ مئی ۱۹۴۱ء۔

مہر عدالت — دستخط حاکم

اعلےٰ ادب!! اعلےٰ سیاست!!! اعلےٰ صحافت!!!

"نوائے وقت" شمالی ہند میں اردو زبان کا واحد سیاسی و ادبی اخبار ہے جو لاہور سے خواجہ شبیر حسن اور حضرت حمید نظامی کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ یہ اخبار ایک خاص مشن اور نصب العین کے ماتحت جاری ہے۔ اس کے دو بڑے مقاصد اقبال کے پیغام کی اشاعت اور زبان کی ترقی ہیں اپنی بیباکی اور آزادانہ پالیسی کے لئے "نوائے وقت" کو اردو صحافت میں ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ "ہمایوں" لکھتا ہے "ہر پرچہ مضامین اور حسن ترتیب کے لحاظ سے سابقہ پرچے کے مقابلے میں بہتر نظر آتا ہے"۔ "نوائے وقت" کے صفحات پر ادب سیاست کی خوشگوار آمیزش نظر آتی ہے "وکیل" لکھتا ہے "جن جرائد و رسائل نے اردو ادب میں انقلاب پیدا کر دیا ہے "نوائے وقت" ان میں سے ایک ہے۔ درحقیقت نوائے وقت کی تدوین و ترتیب اردو کے دیگر پرچوں کے لئے بجائے خود ایک دعوت تقلید ہے"۔

ہندوستان کے صفِ اوّل کے ادباء مثلاً سر عبد القادر۔ خواجہ غلام السیدین۔ میاں بشیر احمد۔ پروفیسر حمید احمد خاں۔ پروفیسر آل احمد سرور۔ ڈاکٹر چکرورتی۔ ڈاکٹر محمد باقر۔ حضرت احسان دانش۔ مسٹر محمد شفیع ایم۔ اے اس کے مستقل قلمی معاونوں میں شامل ہیں۔ چندہ سالانہ دو روپے نمونہ کے لئے پانچ پیسے کے ٹکٹ بھیجیں۔ نمونہ مفت نہیں بھیجا جائے گا۔

مینیجر "نوائے وقت"۔ لاہور

سائنس

انجمن ترقی اُردو (ہند) کا ماہانہ رسالہ

اپریل سنہ ۱۹۴۱ء کے چند مضامین

۱- انسان نما بندر
۲- کیا دنیا پر چھت ہے؟
۳- اضافیت (خاص نظریہ)
۴- دم دار تارے
۵- نیا دم دار تارہ

مئی سنہ ۱۹۴۱ء کے چند مضامین

۱- حیدرآباد میں شکر سازی
۲- تمباکو۔ اس کا استعمال اور نقائص
۳- پودے میں بالیدگی کے ہارمون
۴- پودوں کے امراض
۵- حیوانات کی تربیت

یہ رسالہ ملکی زبان میں سائنس کا واحد رسالہ ہے جس میں مختلف مضامین کے علاوہ ہر ماہ دلچسپ معلومات، سائنس سے متعلق سوال و جواب، سائنس اور صنعت سے متعلق تازہ ترین خبریں اور نئی کتابوں پر تبصرے شائع ہوتے ہیں۔ رسالہ میں متعدد بلاک بھی شائع ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ علم کے شائقین اور اُردو زبان کے بہی خواہ سرپرستی فرمائیں گے۔ اشتہارات کے نرخ طلب کئے جا سکتے ہیں۔

چندہ سالانہ پانچ روپیہ سکۂ انگریزی — نمونہ کا پرچہ - آٹھ آنہ

المشتہر: معتمد مجلس ادارت رسالہ سائنس جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

اردو انسائیکلوپیڈیا

ادارہ ادبیات اردو جس کو ملک کے ذی علم حضرات کی قلمی اعانت اور ذی مرتبہ امرا کی سرپرستی کا شرف حاصل ہے کم و بیش دس سال سے زبان اور ادب کی مسلسل خدمت کر رہا ہے اس کا کام مختلف علوم و فنون کے بارہ شعبوں میں پھیلا ہوا ہے جس کے زیر نگرانی اب تک بہتر (۷۲) کتابیں شائع ہو کر مقبول ہوئیں۔

بہت غور اور متعدد صاحبان علم و فضل سے تبادلہ خیال کے بعد اس نے گذشتہ سال اردو انسائیکلوپیڈیا شائع کرنے کا تصفیہ کیا چونکہ اس کی ترتیب و تالیف متعدد علوم و فنون کے ماہرین کے اشتراک کی ضرورت تھی اس لئے سب سے پہلے اس نے ہندوستان کے متعدد ماہرین علوم و فنون کو قلمی اعانت پر آمادہ کیا۔

انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب و تالیف میں اس کا خاص طور پر خیال رکھا جا رہا ہے کہ مختلف علوم و فنون کے الفاظ ماہرین ہی سے لکھوائے جائیں۔ اس سلسلہ میں ساری انسائیکلوپیڈیا کو مختلف علوم و فنون کے متعدد شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ہر شعبہ کی نگرانی ایک ماہر کے تفویض کر دی گئی ہے جو معاونین کی مدد اور مجلس انتظامی کی عام نگرانی میں اس شعبے کے جملہ الفاظ پر نوٹ مرتب کر رہا ہے۔

فی الوقت حسب ذیل ماہرین اور علماء اپنی نگرانی میں مضامین متعلقہ کا کام شروع کر چکے ہیں:۔

معاشیات	پروفیسر ڈاکٹر نور اقبال قریشی ایم اے پی ایچ ڈی صدر معاشیات جامعہ عثمانیہ	تاریخ	پروفیسر ہارون خاں صاحب شیروانی ایم اے (آکسن) بارایٹ لا صدر شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ
تہذیب و ثقافت	ڈاکٹر ایشور ناتھ صاحب ٹوپا ایم اے پی ایچ ڈی پروفیسر انٹرمیڈیٹ کالج جامعہ عثمانیہ	ریاضی	ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی
		السنہ قدیمہ و جدیدہ	ڈاکٹر رحمت اللہ خاں صاحب ایم اے پی ایچ ڈی مہتمم کتب خانہ آصفیہ
فلسفہ	ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی		
تعلیمات و نفسیات	مولوی سجاد مرزا صاحب ایم اے پرنسپل ٹریننگ کالج	طب	ڈاکٹر محمد علی صاحب بیگ ایم آر سی ایس و ڈاکٹر قاسم حسین صاحب ایم آر سی ایس ایل آر سی پی (لندن) کارونر بلدہ
نسائیات	مس ... سندی بی اے آنرز (آکسن)	کھیل	ایس ایم ہادی بی اے (کیمبرج)
اردو زبان و ادب	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم اے پی ایچ ڈی و پروفیسر عبدالقادر سروری ایم اے ایل ایل بی۔		

انڈکس کی ترتیب و مقالے لکھوائے جانے کا کام تیزی کے ساتھ جاری ہے ان کے علاوہ بہت سے ماہرین علماء و فضلائے ہندوستان کے گوشے گوشے سے دوسرے علوم و فنون کے ضمن میں قلمی اعانت فرما رہے ہیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

ڈاکٹر محمد باقر ایم اے پی ایچ ڈی لاہور، احمد شاہ پطرس بخاری ایم اے دہلی، پروفیسر مسعود حسن رضوی ایم اے لکھنؤ، ڈاکٹر عبدالحمید غنانی پونہ، وغیرہ وغیرہ۔

ترتیب و تالیف کی نوعیت اور معیار کا صحیح اندازہ پیش کرنے کے لئے ہم زیر اشاعت انسائیکلوپیڈیا کے چند اوراق بطور نمونہ شائع کرتے ہیں۔ صاحبان ذوق و نظر کی خدمت میں بغرض تبصرہ روانہ کریں گے۔ اردو انسائیکلوپیڈیا جیسی علوم و فنون کی ضخیم کتاب کی ترتیب و تدوین میں ہمیں ماہرین کی قلمی اعانت درکار ہے اس لئے ہم بے حد ممنون ہوں گے اگر علماء و فضلاء جن کا ... ہمیں تعاون حاصل ہو ... ہمیں لکھیں کہ ان کو کن خاص علوم و فنون سے دلچسپی ہے تاکہ ہم ان کی قابلیتوں سے استفادہ کر سکیں۔

مہتمم انسائیکلوپیڈیا۔ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن

دس ہزار (10000) روپیہ کی گھڑیاں بالکل مفت

ہماری فارمیسی نے اپنی تین چمتکاری دواؤں کی مشہوری کے لئے ہر شیشی کے خریدار کو ایک عدد فینسی رسٹ واچ مفت دینے کا فیصلہ کیا ہے جلدی کیجئے اور فائدہ اٹھایئے۔

بال عمر بھر نہیں اُگتے ۔ ہماری مشہور دوا جوہر حسن اصلی (رجسٹرڈ) کے استعمال سے ہر جگہ کے بال بغیر کسی تکلیف کے ہمیشہ کے لئے دور ہو جاتے ہیں اور پھر زندگی بھر اس جگہ بال کبھی پیدا نہیں ہوتے جگہ ریشم کی طرح ملائم نرم اور خوبصورت نکل آتی ہے قیمت فی شیشی ایک روپیہ پندرہ آنہ ۔ ڈاک خرچ الگ ہر ایک شیشی کے خریدار کو ایک فینسی رسٹ واچ مفت انعام میں دی جاتی ہے جس کی خوبصورتی اور مضبوطی کی گارنٹی دس سال ہے ۔ گارنٹی کا اقرار نامہ ہر گھڑی کے ساتھ بھیجا جاتا ہے۔

کالا تیل (رجسٹرڈ) یہ بار بار لگانیوالا خضاب نہیں۔ ایک آزمودہ چمتکاری تیل ہے معمولی تیلوں کی طرح استعمال کیا جاتا ہے اور اس کی خوبی یہ ہے کہ اس کا استعمال کرنیوالے دنگ رہ گئے ہیں۔ اس سے سفید بال ایک دم کالے ہو جاتے ہیں اور پھر ہمیشہ کالے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ہمارے گروجی سوامی جی کی ایک پیٹنٹ ہے جو دماغ کو ہر طرح کی طاقت پہنچاتا ہے۔ آنکھوں کی روشنی بڑھ جاتی ہے اور سر کو ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ گویا بالوں کی یہ خوراک ہے قیمت فی شیشی ایک روپیہ پندرہ آنہ۔ ڈاک خرچ الگ ہر ایک شیشی کے خریدار کو ایک فینسی رسٹ واچ مفت انعام میں دی جاتی ہے جس کی خوبصورتی اور مضبوطی کی گارنٹی دس سال ہے۔ گارنٹی کا اقرار نامہ ہر گھڑی کے ساتھ بھیجا جاتا ہے۔

کالے بھی گورے کر دکھائے ۔ اگر آپ کے شریر اور منہ کا رنگ کالا پڑ گیا ہے تو اس دوا کا استعمال کیجئے۔ اس سے چہرے کی چھائیاں۔ کالے داغ کیل پھنسیاں چیچک کے داغ مٹ کر چہرے کا رنگ پھول کی طرح نکھر آتا ہے۔ ہماری **بیرس بوٹی** ایک آزمودہ دوائی ہے جو شریر کا رنگ پلٹ کر دکھا دیتی ہے قیمت فی شیشی ایک روپیہ پندرہ آنے۔ ڈاک خرچ الگ ہر ایک شیشی کے خریدار کو ایک فینسی رسٹ واچ مفت انعام میں دی جاتی ہے جس کی خوبصورتی اور مضبوطی کی گارنٹی دس سال کی ہے۔ گارنٹی کا اقرار نامہ ہر گھڑی کے ساتھ بھیجا جاتا ہے۔

نوٹ: ایک ساتھ تین شیشی منگوانے والے کو تین گھڑیاں مفت اور ڈاک خرچ معاف قیمت پانچ روپے سال پسند ہونے پر قیمت واپس دی جاتی ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ **سنیاسی آیورویدک فارمیسی (H.N.L) کے سی۔ امرتسر**

ساٹھ برس کی عمر کے تندرست اصحاب کے حالات زندگی

اس سال میری ناچیز زندگی کے ساٹھ برس پورے ہو جانے پر میرے عزیزوں اور دوستوں نے یہ رائے دی کہ میری جوبلی بڑی دھوم سے منائی جائے۔ مجھے یہ پسند نہ ہوئی۔ ماتر دھارا کی جوبلی منانی اور اپنی جوبلی منانا میں ان جلسوں میں اپنی تعریف سننے میں مجھے شرم محسوس ہوئی اس واسطے میں نے اس کی اجازت نہیں دی۔ اس موقع پر ایک بات کا مجھے خیال ہوا ہے کہ ایسے شخص مرد یا عورت جن کی عمر ۶۰ برس سے اوپر ہو اور تندرستی و طاقت کو قائم رکھے ہوئے ہیں ان کی طرز زندگی اور ان کی صحت قائم رکھنے کے راز معلوم کر کے دوسروں کو بتائے جاویں۔ اسی میں میں نے اپنے طریق زندگی اور صحت و طاقت کے راز لکھنے ہیں۔ اس سے ملک کو بہت فائدہ ہوگا کیونکہ یہ تجربہ سب کے لئے راہنما ہو۔ ایسے سوالات بنائے جائیں گے جن سے ان کی پوشاک۔ خوراک۔ غسل ورزش۔ کام کاج سب باتوں کا پتہ لگیگا۔ ان کی جسمانی حالت آنکھ۔ دل۔ کان۔ اندرونی و بیرونی اعضاء کی صحت کا پورا علم ہو سکے گا۔ پڑھنے والے جان سکیں گے کہ ایسی قیام صحت میں کیا راز پوشیدہ ہے۔ یہ کام تب ہو سکیگا اگر نیک کام میں سب بھائی امداد کریں۔ اس کے واسطے بذریعہ اشتہار ہذا کے سب بھائی بہنوں کو جن کی عمر ۶۰ سال سے اوپر ہو چکی ہے اور عام طور پر انہوں نے اپنی صحت کو قائم رکھا ہے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ مجھے ایک کارڈ پر صرف اتنا لکھ کر بھیج دیں کہ میری عمر ساٹھ سے اوپر ہے۔ میں آپ کے سوالات کا جواب دونگا۔ یاد رکھئے سادہ لوح بھی بھیجدی جاویگی۔ پورا نام و پتہ ہو۔ بھائیوں کی مشکوری سے ان کی خدمت میں بھیجا جائیگا۔ جواب ان کو کتابی صورت میں چھاپ دیا جائیگا۔ ہم سب قوم کے ہمدردوں کو حصہ لینا چاہئے۔

ٹھاکر دت شرما ویدیہ موجد امرت دھارا لاہور

گراموفون کے ریکارڈ

اگر آپ کے پاس ہوں تو نہیں مت پھینکئے۔ سائنسدانوں نے ایک مصالحہ حال ہی میں ایجاد کیا ہے جس کو زیڈ ZED زیڈ کہتے ہیں اس کے لگانے سے ریکارڈوں میں گھسی ہوئی لکیریں گہری ہو جاتی ہیں اور آواز بہت تیز ہو جاتی ہے۔ وہی دلکش نغمے جو بہت بھلے لگتے ہیں از سر نو عود کرتے ہیں۔ گھر گھراہٹ بالکل مٹ جاتی ہے۔ نئے ریکارڈوں پر زیڈ لگانے سے عمر بڑھ جاتی ہے اور وہ عرصہ تک نہیں گھستے۔ خوب بک رہا ہے آپ بھی خرید لیجئے قیمت ایک شیشی دو روپے

ملنے کا پتہ

گرین فیلڈز (انڈیا) کمپنی پنڈری (سی۔پی)

عشق و محبت کے پامال راستے سے ہٹ کر

ایک نیا راستہ

ہندوستان کے واحد ترقی پسند فلم ڈائرکٹر

شانتارام

نے
چنا ہے

اور

پڑوسی

تیار کیا ہے
جو کہ

دو بڈھے مردوں کی جوان دوستی کی داستان ہے

اداکار: مظہر۔ انیس۔ جاگیردار۔ بلونت۔ شانتا۔ معظم دار وغیرہ

بہت جلد آپ کے شہر میں اس کی نمائش
شروع ہوگی

نمائش کار: فیمس پکچرز لمیٹڈ دہلی۔ مدراس۔ بمبئی

فہرستِ مضامین

جلد ۴۱ — نمبر ۱

"ہمایوں" بابت ماہِ جولائی ۱۹۴۲ء

چندہ سالانہ ۵ روپے ۶ آنے، ششماہی ۳ روپے (مع محصول) — قیمت فی پرچہ ۸ آنے

جہاں نما

پرنسپل رام پرشاد ناشاد کی رحلت

یہ خبر تمام تعلیمی و ادبی حلقوں میں انتہائی رنج سے سُنی جائے گی کہ پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ ۱۳ر جون ۱۹۴۲ء کو اس جہانِ فانی سے انتقال فرما گئے مرحوم ناشاد تخلص کرتے تھے اور مدت سے "ہمایوں" اور اُردو کے دوسرے ادبی رسائل میں ان کا کلام شائع ہوتا رہا۔ سادگی صداقت پسندی اور واقعیت نگاری اُن کے خیالات و کلام کی خصوصیات تھیں۔ اُن کی تصنیف "مغل بادشاہت اور اُمرا" ہندوستان کی تاریخ کے سلسلے میں ایک اعلیٰ حیثیت رکھتی ہے۔ شاید کسی اور ہندو مصنف نے ایسے انصاف اور بلند نظری کے ساتھ مغلوں کے کارناموں کا اعتراف نہیں کیا جیسا مسٹر کھوسلہ نے۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں "ہندوستان کے مغلیہ شاہنشاہوں کے حق میں ہمیں یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ وہ عام طور پر اُس وسیع طاقت کا جو انہیں حاصل تھی غلط استعمال نہ کرتے تھے۔ اُنھوں نے ہندوستان کو کبھی ایک مسلم مملکت نہیں بنایا۔ اُنھوں نے سیاسی طور پر ہندوؤں کو مسلمانوں کے ساتھ برابری کا درجہ عطا کیا۔ اُنھوں نے اپنے آپ کو اور اپنے سیاسی خیالات کو یہاں کے حالات کے سانچے میں ڈھال لیا اور یہی اُن کی طاقت کا راز تھا۔ مغل قومی بادشاہ تھے۔" پھر ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں "عدل کے بارے میں اورنگ زیب اپنے سب بزرگوں سے سبقت لے گیا۔"

مسٹر کھوسلہ ایک نہایت ہوشیار طالب علم، ایک نہایت قابل پروفیسر اور ایک نہایت ہمدرد انسان تھے۔ وہ پنجاب یونیورسٹی میں بی۔ اے اور ایم۔ اے میں اوّل رہے اور آکسفورڈ میں جا کر اُنھوں نے اپنے علمی کام میں خاص امتیاز حاصل کیا۔ اُن کے انگریز معلّم کا قول تھا کہ وہ ان تمام ہندوستانی طلبا میں جن سے مجھے واسطہ پڑا سب سے زیادہ لائق تھے۔ وہ پہلے گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر ہوئے پھر مختلف تعلیمی اداروں میں کام کرتے ہوئے اخیر میں پٹنہ کالج کے پرنسپل ہو گئے پنجاب اور بہار دونوں صوبوں میں اُنہیں "غریبوں کا دوست" سمجھا جاتا تھا۔ وہ ہر غریب طالب علم کو ہمیشہ مفت پڑھانے پر تیار رہتے تھے۔

پبلک حیثیت سے قطعِ نظر مجھے مسٹر کھوسلہ سے ایک خاص ذاتی تعلق تھا۔ پہلے پہل میرا اُن سے واسطہ پڑا جب گورنمنٹ کالج لاہور میں ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۱۰ء تک پروفیسر رام پرشاد تاریخ کے پروفیسر تھے اور میں ایف۔ اے کی جماعت میں دو سال تک اُن سے پڑھتا رہا۔ پھر جب میں آکسفورڈ گیا تو وہ بھی بعد میں وہاں بطور طالب علم کے مجھ سے آ کر ملے بہار سے پنشن لے کر جب وہ پھر لاہور واپس آئے تو کبھی کبھی اُن سے دوستانہ ملاقات ہوتی رہی۔ مسٹر کھوسلہ کی سلجھی ہوئی طبیعت کا ایک وصف میں کبھی نہ بھولوں گا یہ تھا اُن کا سچا انکسار۔ باوجود مسلّمہ قابلیت کے غرور ان میں نام کو نہ تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جن دنوں وہ گورنمنٹ کالج میں لیکچر دیا کرتے تھے ان کی نگاہ ہمیشہ اپنی میز پر جمی رہتی تھی۔ اُن میں جھجک نہ تھی لیکن وہ انتہا درجہ منکسر المزاج اور بردبار تھے۔ بڑے آدمیوں سے عموماً بچ کر رہتے اور دنیا سے الگ تھلگ ایک مرنجاں مرنج زندگی گزارنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے حالات سے پورے مطمئن تھے اور کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتے تھے لیکن اپنی انتہائی حساسیت کی بنا پر صرف شاعرانہ طور پر نہیں بلکہ فلسفیانہ طور پر بھی ایک "ناشاد" شخصیت کے مالک تھے۔ "ناشاد" لیکن [illegible] اور بلند نظر اور بلند [illegible]! وہ نیچی نگاہیں اور وہ شفقت بھرا چہرہ اب ہمیشہ کے لئے چھپ گیا لیکن اُس قابلیت اور محبت کی یاد جلد نہیں مٹ سکتی!

ب

بعض مشہور تصانیف کے مسوّدوں کی قیمت

اولیور گولڈ سمتھ [illegible] اپنے [illegible] ناول "وکار آف ویکفیلڈ" کا مسودہ ساٹھ پاؤنڈ میں فروخت کیا۔

لائڈ جارج نے اپنی خود نوشتہ سرگذشتِ زندگی کے مسودے کی قیمت ایک لاکھ پاؤنڈ وصول کی۔

شیکسپیر اپنے ڈراموں سے تقریباً تیس پاؤنڈ سالانہ کماتا تھا۔

ہال کین کی "لائف آف کرائسٹ" کا مسودہ ساٹھ ہزار پاؤنڈ میں بکا۔

شوبرٹ کو اپنے ایک گیت کے معاوضے میں پانچ پاؤنڈ وصول ہوئے۔

کانن ڈائل کو "روڈنی سٹون" کے معاوضے میں سات ہزار پاؤنڈ حاصل ہوئے۔

اے۔ ایس۔ ایم۔ ہچنسن نے "اف ونٹر کمز" کے معاوضے میں تیس ہزار پاؤنڈ وصول کئے۔

ایڈم سمتھ کو "ویلتھ آف نیشنز" کے معاوضے میں پانسو پاؤنڈ ملے۔

مارلے نے "لائف آف گلیڈسٹن" کا مسودہ دس ہزار پاؤنڈ میں فروخت کیا۔

لیڈی آکسفورڈ کو اپنی سوانحعمری کے معاوضے میں تیرہ ہزار پاؤنڈ ملے۔

ٹامس گرے کو اپنی مشہور نظم Elegy written in a Country Churchyard کے معاوضے میں کچھ وصول نہ ہوا۔

ہندوستان کے عام مصنّف اور شاعر ٹامس گرے کے ہم قسمت ہیں۔

ٹراونکور کی تعلیمی ترّقی

تازہ اعداد و شمار سے معلوم ہوا ہے کہ ٹراونکور تعلیمی ترقی کے لحاظ سے ہندوستان میں سب سے آگے ہے۔ ہندوستان کے سینسس کمشنر نے ہندوستانی صوبوں اور ریاستوں کی آبادی اور تعلیم کے اعداد و شمار ٹراونکور کی حکومت کو بھیجے ہیں۔ بڑی بڑی ریاستوں کی آبادی حسب ذیل ہے:

	آبادی
حیدرآباد	۱۶۰۰۰۰۰۰
میسور	۶۵۰۰۰۰۰
ٹراونکور	۶۰۰۰۰۰۰
کشمیر	۴۰۰۰۰۰۰
گوالیار	۴۰۰۰۰۰۰
بڑودہ	۳۰۰۰۰۰۰
کوچین	۱۵۰۰۰۰۰

تعلیم کے نقطۂ نظر سے ٹراونکور کا درجہ ہندوستان میں سب سے ممتاز ہے۔ اس ریاست میں ۴۷٫۸۱ فیصدی آبادی تعلیم یافتہ ہے۔ کوچین تعلیم کے لحاظ سے دوسرے درجے پر ہے۔ یہاں ۳۵٫۴۲ فیصدی آبادی تعلیم یافتہ ہے۔ دہلی میں تعلیم یافتہ آبادی ۲۵ فی صدی اور بڑودہ میں ۲۳٫۰۱ فی صدی ہے۔

صوبوں میں مدراس، بمبئی اور بنگال میں علی الترتیب ۱۳٫۰۱، ۱۵ [illegible] اور ۱۲٫۶۱ فی صدی لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔

عورتوں کی تعلیمی ترقی کے لحاظ سے ٹراونکور اور زیادہ قابل ذکر ہے۔ یہاں کی ۳۶ فی صدی عورتیں تعلیم یافتہ ہیں۔ دوسری ریاستیں اور صوبے اپنے مردوں کی تعلیمی حالت سے بھی یہاں کی عورتوں کی تعلیمی ترقی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

وٹامن سی

اگر جسم کے کسی حصے پر عمل جراحی کیا جائے تو زخم آہستہ آہستہ بھرتا ہے لیکن اگر جسم میں وٹامن سی کی کمی ہو تو زخم کے اچھا ہونے کی رفتار بے حد سست ہو جاتی ہے بلکہ زخم بگڑ بھی جاتا ہے۔ وٹامن سی ٹماٹر، سنگترے، مالٹے اور دوسرے پھلوں اور سبزیوں میں پائی جاتی ہے۔

پیشوں کی بنیاد پر جمہوری نمائندگی

معاشری حالات کی تبدیلی کے ساتھ جمہوری اداروں کی ساخت اور اُن کے طریق کار میں تبدیلی پیدا ہونا لازم ہے۔ موجودہ صدی کی ابتدا میں بالخصوص ۱۸-۱۹۱۴ء کے بعد جمہور کے نمائندہ اداروں کے نظام پر بہت ناقدانہ غور و فکر کی گئی۔ اس غور و فکر کے نتیجے کے طور پر جمہوری اداروں کے نظام میں کچھ ایسی تبدیلیوں کی ضرورت محسوس کی گئی جن سے اُن میں عوام کی بہتر نمائندگی کا انتظام ہو سکے۔

ان تبدیلیوں میں سے اہم ترین تبدیلی جو ضروری سمجھی گئی یہ تھی کہ جمہور کی نمائندگی کی بنیاد شہری و ملکی حدود کے بجائے ان کے مختلف پیشوں پر قائم کی جائے برطانیہ میں گلڈ سوشلسٹوں کی تحریک کا مقصد بھی یہی تھا۔ صحیح نمائندگی کا اصول یہی ہے کہ جمہور کی نمائندگی بہ اعتبار عام افراد کے نہ ہو بلکہ اُن کے خاص خاص مشترک مقاصد کے اعتبار سے ہو۔ مثلاً ڈاکٹروں، زمینداروں، سُناروں اور خانگی ملازموں وغیرہ کی الگ الگ نمائندگی کا انتظام ضروری ہے۔

ہندوستان کے مختلف پیشہ وروں کے متعلق ذیل کا نقشۂ اعداد و شمار جو ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ سے لیا گیا ہے اس سلسلے میں دلچسپی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

مختلف ذاتیں	کل تعداد جس میں عورتیں، کمانے والے مرد اور ماتحت کارندے شامل ہیں	اُن لوگوں کی تعداد جن کے روزگار کا بڑا ذریعہ اُن کا آبائی پیشہ ہے	اُن لوگوں کی تعداد جو اپنے دوسرے کام کے ساتھ زائد آمدنی کے لئے اپنے آبائی پیشے پر بھی قائم ہیں
برھئی	۷۶۰۰۶۰	۳۳۶۱۷۶ یا ۴۴ فی صدی	۶۸۹۲۰ یا ۹ فی صدی
بھنگی	۵۵۵۸۲۹	۳۱۰۹۸۳ یا ۶۰ فی صدی	۱۰۳۳۵ یا ۱ء۸ فی صدی
چمار	۵۰۷۵۳۰۷	۳۸۶۱۹۷ یا ۷ء۶ فی صدی	۸۹۸۷۷ یا ۲ فی صدی
درزی	۲۱۲۳۵۹	۱۲۳۶۸۷ یا ۵۸ فی صدی	۱۵۹۷۵ یا ۷ فی صدی
دھوبی	۹۵۱۰۵۸	۴۳۶۶۹۹ یا ۴۶ فی صدی	۹۳۶۳۱ یا ۹ فی صدی
گوجر	۷۱۲۰۶۶	۲۶۹۱۳۰ یا ۳۸ فی صدی	۱۲۳۶۲ یا ۱ء۷ فی صدی
جاٹ (کاشتکار)	۲۶۸۷۹۹۱	۱۷۵۳۴۸۸ یا ۵۵ فی صدی	۷۷۰۰۲ یا ۳ فی صدی
کھتری	۱۸۵۱۷۳	۹۲۹۹۲ یا ۵۰ فی صدی	۲۴۶۸ یا ۱ء۳ فی صدی
کرمی (کاشتکار)	۲۰۵۸۵۸۰	۱۳۳۵۹۹۷ یا ۶۵ فی صدی	۳۳۶۹۳ یا ۱ء۶ فی صدی
کمھار	۳۶۹۹۰۲۳	۹۹۵۳۰۰ یا ۲۷ فی صدی	۱۰۳۰۹۱ یا ۱۰ء۳ فی صدی
لوہار	۷۶۳۵۸۲	۲۷۴۵۳ یا ۳۵ء۴ فی صدی	۶۵۱۶۸ یا ۸ء۵ فی صدی
نائی	۱۰۷۹۲۲۹	۵۲۰۵۲۲ یا ۴۶ء۵ فی صدی	۱۰۶۳۵۱ یا ۹ء۸ فی صدی
سُنار	۲۷۴۱۳۴	۱۶۶۲۵۶ یا ۶۰ء۶ فی صدی	۱۶۶۱۹ یا ۶ فی صدی

حامد علی خاں

نیرنگِ خیال کے متعلق چند تازہ انکشافات

اگر نیرنگِ خیال کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آزاد اسے لکھتے وقت ایک سخت ذہنی اُلجھن میں مبتلا تھے۔ یہ کشمکش کچھ اُسی قسم کی ہے جو ہارڈی کے اکثر کردار اپنی زندگی کی اُن پُر آزمائش گھڑیوں میں محسوس کرتے ہیں جب مدت العمر کی بدنصیبی کے بعد انہیں اپنی زندگی میں امید کی ایک ہلکی سی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس وقت ان کی عقلِ سلیم اور فطری انصاف پسندی اس امر کی متقاضی ہوتی ہے کہ وہ اپنی گذشتہ زندگی کی تمام روداد جس کا بیشتر حصہ صنفی کمزوریوں سے متعلق ہوتا ہے کہہ سنائیں۔ لیکن ان کے بڑھتے ہوئے جذبات اور زندگی کی خواہش یا تو انہیں ان واقعات کو چھپانے پر مجبور کرتی ہے یا وہ انہیں ایسے ادھورے اور مبہم طریقے سے بیان کرتے ہیں جس سے اُن کا مفہوم اچھی طرح ظاہر نہیں ہوتا۔ بعد میں جب یہ واقعات آشکار ہوتے ہیں تو اُن کا اثر طرفین کے لئے نہایت ناخوش گوار ثابت ہوتا ہے۔ بعینہٖ یہ حالت آزاد کی ہے وہ نیرنگِ خیال کے ماخذوں پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ وہ بہت کچھ کہہ بھی گئے ہیں لیکن ایسے انداز میں کہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے پھر بھی کوئی شخص اب تک ان کے اصلی مفہوم سے آگاہ نہیں ہو سکا۔

نیرنگِ خیال مصنف کی طبعزاد تصنیف خیال کی جاتی ہے بجز اس کے کہ اس کا مواد غالباً ڈاکٹر لائٹینر نے بہم پہنچایا۔ یہ رائے شیخ عبدالقادر نے جو بعد میں سر کے خطاب سے مفتخر ہوئے آزاد کے متعلق اپنے ایک خطبہ میں ظاہر کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "میں نے بعض لوگوں کی زبانی سُنا ہے اور غالباً اس میں کچھ نہ کچھ حقیقت بھی ہے کہ مصنف کو اس کتاب کا ڈھانچ ڈاکٹر لائٹنر سے ہاتھ آیا جو بذاتِ خود یونانی اور انگریزی ادبیات کا عالم تھا۔ اس نے آزاد کو اپنے خزانۂ معلومات سے معتدبہ طور پر بہرہ مند کیا اور مولانا مرحوم نے اسی مواد کی بنا پر نیرنگِ خیال کی عمارت تعمیر کی۔"

اس کتاب کے متعلق آزاد کے اپنے بیان تین ہیں اور وہ سب کے سب برسبیلِ تذکرہ اور مبہم ہیں۔ پروفیسر مرحوم مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

"یہ چند مضمون جو لکھے گئے ہیں، نہیں کہہ سکتا کہ ترجمہ کئے گئے ہیں۔ ہاں جو کچھ کانوں نے سُنا اور فکرِ مناسب نے زبان کے حوالے کیا۔ ہاتھوں نے اُسے لکھ دیا۔"

اگر اس طولانی اور پیچیدہ عبارت کو سیدھی سادھی نثر میں ادا کیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جو باتیں مجھے سمجھائی گئی ہیں، میں نے انہیں قلمبند کر لیا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر آپ نے ان مضامین کو ترجمہ نہیں کیا بلکہ محض اُس مواد پر حاشیہ آرائی کی ہے جو انہیں مہیا کیا گیا۔ اسی مقدمے میں وہ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

"انگریزی میں یونان اور روما کے مضامین کے ساتھ وہاں کے مذہب اور رسومِ قدیم کی باتیں اب تک انشا پردازی کا جزو ہیں۔ رومی اور یونانی ستارہ ہائے فلکی اور اکثر قوائے رُوحانی کے دیوتا جانتے تھے۔ چنانچہ انگریزی میں بڑے بڑے انشا پرداز وہی کہلاتے ہیں جن کی چشمِ سخن ہر بات میں ان کے قصّوں پر اشارے کرتی جائے مگر اُردو کے باغ نے فارسی و عربی کے چشموں سے پانی پایا ہے۔ وہاں دیوی دیوتا کا گذر نہیں۔ اور یہ سخت دشواری ہے کیوں کہ لکھنے میں اگر تصرّف کریں تو ترجمہ نہ رہا اور اگر اصل کی رعایت کی تو کتاب معمائے دقیق ہوگئی نہ کہ رفیقِ تفریح۔" ظاہر ہے کہ یہاں آزاد ان دشواریوں کا ذکر کر رہے ہیں جو انگریزی عبارات و خیالات کو اُردو میں منتقل کرتے وقت پیش آتی ہیں۔ یہاں قابلِ غور امر یہ ہے کہ آزاد ذاتی مشکلات کا ذکر نہیں کر رہے ہیں بلکہ اُن تکالیف کا جو یونانی علم الاصنام کی بھرمار کی وجہ سے انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرتے وقت پیش آتی ہیں۔

تیسرا بیان طبیعت اور ذکاوت کے مقابلے" کے فُٹ نوٹ میں دیا گیا ہے جو ان الفاظ پر مشتمل ہے۔

"انگریزی میں وِٹ اور زننگ کا مباحثہ تھا۔ میں نے وِٹ کے واسطے بہت خیال کیا۔ کوئی لفظ نہ ملا، ناچار ذکاوت لکھ دیا۔"

مجھے ان مضامین کے انگریزی سے ماخوذ ہونے کا شبہہ اُس صریح مشابہت سے پیدا ہوا جو آزاد کے مضمون "سیرِ زندگی" اور جانسن کے "دی وائیج آف لائف" میں دکھائی دیتی ہے۔ جب میں نے ان کا موازنہ کیا تو آزاد کا مضمون انگریزی مضمون کا آزاد ترجمہ ثابت ہوا۔ اٹھارھویں صدی عیسوی وہ زمانہ ہے جب انگریزی زبان میں تمثیلی موضوعات پر مضمون لکھنے کا مشغلہ اپنے پورے زور پر تھا۔ چنانچہ جب میں نے اس صدی کی نثر کا مطالعہ کیا تو میرا شک یقین کے درجہ تک پہنچ گیا۔ مجھے یہ معلوم ہوا کہ نیرنگِ خیال کے تمام مضامین انگریزی مضامین کا ترجمہ ہیں۔ ان میں اصل سے جس حد تک استفادہ کیا گیا ہے، اس کا درجہ مختلف ہے۔ ان میں سے اکثر لفظی تراجم ہیں۔ اگرچہ بعض جگہوں میں کسی قدر حاشیہ آرائی سے بھی کام لیا گیا ہے اور لیک

یا دو مقامات پر اصل سے قصداً انحراف کیا گیا ہے مثلاً سیرِ زندگی کا آخری حصّہ یا شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار کا پہلا اور تیسرا پیرا آزاد نے اصل پر اضافہ کئے ہیں۔ شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار اور ایڈیسن کے مضمون میں جس سے وہ ماخوذ ہے صرف یہ فرق ہے کہ ایڈیسن اپنے مضمون میں مشاہیرِ یورپ کا ذکر کرتا ہے اس کے برعکس آزاد کا مضمون ہندوستانی مشاہیر پر مشتمل ہے دوسرے لفظوں میں مضمون کا درمیانی حصّہ آزاد کا اپنا ہے اور باقی حصّے ایڈیسن سے ماخوذ ہیں۔

اب میں آپ کی خدمت میں ایک ایک کر کے آزاد کے مضامین اور انگریزی مضامین کے نام پیش کرتا ہوں جن سے وہ ترجمہ کئے گئے ہیں

۱۔ آغازِ آفرینش میں باغِ عالم کا کیا رنگ تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہو گیا۔	1 An Allegorical History of Rest and Labour (JOHNSON)
۲۔ سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ۔	2. Truth, Falsehood and Fiction, an allegory (JOHNSON)
۳۔ گلشنِ امید کی بہار	3. The Garden of Hope (JOHNSON)
۴۔ سیرِ زندگی	4 The Voyage of Life (JOHNSON)
۵۔ انسان کسی حالت میں خوش نہیں رہتا۔	5 The Endeavour of Mankind to get Rid of Their Burdens (Addison)
۶۔ علوم کی بدنصیبی۔	6. The Conduct of Patronage (JOHNSON)
۷۔ علمیت اور ذکاوت کے مقابلے	7. The Allegory of Wit and Learning (JOHNSON)
۸۔ جنت الحمقا۔	8. Paradise of Fools (PARNELL)(Spectator)
۹۔ خوش طبعی۔	9. False Wit and Humour The Spectator no. 35 (Addison)
۱۰۔ نکتہ چینی	10 Allegory of Criticism (JOHNSON)
۱۱۔ مرقعِ خوش بیانی	11 Allegory of Several Schemes of Wit Spectator, No 63 May 12, 1711
۱۲۔ سیرِ عدم	12. The Spetator: No: 501, oct 4, 1712
۱۳۔ شہرتِ عام و بقائے دوام کا دربار	13 The Vision of The Table of Fame. Addison, Tatler: No: 81 Oct 15, 1709.

آپ پوچھیں گے کہ جب اکثر لوگوں کی رائے میں مولانا انگریزی زبان سے ناآشنا تھے یا انہیں کم از کم انگریزی زبان پر اس قدر عبور نہ تھا کہ وہ اس کی عبارت کا اپنی زبان میں ترجمہ کر سکتے تھے تو پھر انہوں نے ان مضامین کا ترجمہ کیسے کیا؟ مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں۔ اگر آزاد کی تصانیف کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انہیں انگریزی زبان پر اپنے معاصرین کے اندازے سے کہیں زیادہ قدرت حاصل تھی۔ یہ درست ہے کہ ہمارے پاس آزاد کے انگریزی زبان سے اچھی طرح واقف ہونے کی کوئی بلا واسطہ اور قطعی شہادت نہیں۔ مولوی خلیل الرحمٰن کا بیان ہے کہ آزاد انگریزی سمجھ تو سکتے تھے لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے انہیں اس پر زیادہ عبور نہ تھا۔ چونکہ اس مسئلے کے متعلق ہمارے پاس کوئی معاصرانہ شہادت نہیں۔ اس لئے ہمیں چار و ناچار ان کی تصانیف اور ادبی سرگرمیوں ہی سے بالواسطہ شہادت تلاش کرنی پڑتی ہے۔

یہ امر کہ آزاد انگریزی زبان سے کافی واقفیت رکھتے تھے نیرنگِ خیال کے ان اقتباسات سے ظاہر ہے جنہیں میں اس سے پہلے پیش کر آیا ہوں۔ اس رائے کی تائید میں ہمیں اس کتاب سے اور بھی شہادت ہاتھ آتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

"میں نے انگریزی انشا پردازوں کے خیالات سے اکثر چراغِ شوق روشن کیا ہے۔ بڑی بڑی کتابیں ان مطالب پر مشتمل ہیں جنہیں (Essays) کہتے ہیں:

اِس خیال کی مندرجۂ ذیل امور سے مزید تائید ہوتی ہے۔

۱۔ آزاد نے انگریزی سے چھ یا اس سے زیادہ نظمیں اُردو میں ترجمہ کی ہیں۔

۲۔ جیساکہ آبِ حیات اور سخندانِ پارس کے مباحث سے ظاہر ہے آپ کو لسانیات کی تاریخ کا پورا پورا علم تھا۔ مولانا حالی کا بیان ہے کہ آپ نے اس کا تمام مواد انگریزی کتابوں سے حاصل کیا۔ وہ آبِ حیات پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مصنف نے اس تذکرہ کے اوّل میں دو مضمون زبان اُردو اور نظمِ اُردو کی تاریخ پر لکھے ہیں۔ پہلا جو زبانِ اُردو سے متعلق ہے اُس نے انگریزی مورخوں کی کتابوں سے نہایت کوشش کے ساتھ چھان بین کرکے مدد لی ہے۔۔۔۔۔"

۳۔ سخن دانِ پارس کے پہلے حصّے کا وہ جزو جس کا تعلق تقابلی لسانیات اور ہند ایرانی صوتیات سے ہے انگریزی کتابوں سے حاصل کیا گیا ہے۔ اسی طرح سخن دانِ پارس حصہ دوم سے صاف ظاہر ہے کہ آزاد نے ژند، پاژند اور اوستا کے متعلق اپنی بیشتر معلومات انگریزی گرامروں اور ڈکشنریوں سے حاصل کی ہیں پاژند کے سلسلے میں وہ نہ صرف ولیسٹ صاحب (West) کے مینو ئے خرد کے ترجمہ کا ذکر کرتے ہیں بلکہ اس سے بعض کوائف اور اقتباسات بھی درج کرتے ہیں۔

۴۔ وہ اپنے ایک مکتوب میں ڈاکٹر لائٹنر کو لکھتے ہیں:

میں کئی دن سے سُنتا ہوں کہ سنینِ اسلام میں کسی عالم نے بہت غلطیاں نکالی ہیں۔ آج ایک بات سُنی کہ سنینِ اسلام کی ترکیب ہی غلط ہے۔ مجھے ضبط کی طاقت نہ رہی۔ چنانچہ اس ضرورت نے مضطرب کر دیا اور یہ مختصر عرضداشت انگریزی میں لکھتا ہوں۔

میری رائے میں اکثر خود آموز لوگوں کی طرح آزاد مرحوم انگریزی زبان اچھی طرح سمجھ سکتے تھے۔ اگرچہ اس میں بول یا لکھ نہ سکتے تھے۔ آج بھی ہندوستان میں ہزاروں لوگ موجود ہیں جو جرمانی۔ فرانسیسی اور ہسپانوی زبانوں سے اچھا خاصا ترجمہ کر سکتے ہیں۔ اگرچہ ان میں بول یا لکھ نہیں سکتے مضمون کے آخر میں آپ کے سامنے میں انگریزی مضامین اور نیرنگِ خیال کے دو متوازی اقتباسات پیش کرتا ہوں تاکہ آپ پر بخوبی واضح ہو جائے کہ ان میں کس قدر مشابہت ہے۔

There are two kinds of immortality; that which the soul really enjoys after this life, and that imaginary existence by which men live in their fame and reputation. The best and the greatest actions have proceeded from the prospect of the one or the other of these; but my design is to treat only of those which have chiefly proposed to themselves the latter as the principal reward of their labours. It was for this reason that I excluded from my tables of fame all the great founders and votaries of religion, and it is for this reason also that I am more than ordinarily anxious to do justice to the persons of whom I am now going to speak; for since fame was the only end of their enterprises and studies, a man cannot be too scrupulous in allotting them their due proportion of it.

بقائے دوام دو طرح کی ہے۔ ایک تو وہی جس طرح روح فی الحقیقت بعد مرنے کے رہ جائے گی کہ اُس کے لئے فنا نہیں۔ دوسری وہ عالمِ یادگار کی بقا جس کی بدولت لوگ نام کی عمر سے جیتے ہیں اور شہرتِ دوام کی عمر پاتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اچھے سے اچھے اور بڑے سے بڑے کام جن جن سے ہوئے یا تو ثواب آخرت کے لئے یا دنیا کی ناموری اور شہرت کے۔ لئے ہوئے۔ لیکن میں اس دربار میں اُنہیں لوگوں کو لاؤں گا جنھوں نے اپنی محنت ہائے عرق فشاں کا صلہ اور عزم ہائے عظیمہ کا ثواب فقط دنیا کی شہرت اور ناموری کو سمجھا۔ اسی واسطے جو لوگ دین کے بانی اور مذہب کے رہنما تھے اُن کے نام شہرت

کی فہرست سے نکال ڈالتا ہوں مگر بڑا فکر یہ ہے کہ جن لوگوں کا ذکر کرتا ہوں اُن کی حق تلفی نہ ہو جائے کیوں کہ ان بے چاروں نے اتنی جاں فشانی اور عمر بھر کی محنتوں کا اجر فقط نام کو سمجھا اُن کے حصے میں کسی طرح کا نقص ڈالنا سخت ستم ہے۔

It is a celebrated thought of Socrates that if all the misfortunes of mankind were put into a public stock, in order to be publicly distributed among the whole species, those who now think themselves to be most unhappy would prefer the share they are already possessed of, before that which would fall to them by such a division. Horace has carried this thought a great deal further in the motto of my paper which implies that the hardships and misfortunes we lie under are more easy to us than those of any other person would be, in case we change condition with them. As I was ruminating upon these remarks in my elbow-chair, I insensibly fell asleep; when on a sudden, methought there was a proclamation made by Jupiter that every mortal should bring his griefs and calamities and throw them together in a heap.

سقراط حکیم نے کیا خوب لطیفہ کہا ہے کہ اگر تمام اہلِ دنیا کی مصیبتیں ایک جگہ لاکر ڈھیر کردیں اور پھر سب کو برابر بانٹ دیں تو جو لوگ اب اپنے تئیں بدنصیب سمجھ رہے ہیں وہ اس تقسیم کو مصیبت اور پہلی مصیبت کو غنیمت سمجھیں گے۔

ایک اور حکیم اس لطیفہ کے مضمون کو اور بھی بالاتر لے گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہم اپنی اپنی مصیبتوں کو آپس میں بدل بھی سکتے تو پھر ہر شخص اپنی پہلی ہی مصیبت کو اچھا سمجھتا۔ میں ان دونوں خیالوں کو وسعت دے رہا تھا اور بے فکری کے تکیئے سے لگا بیٹھا تھا کہ نیند آگئی۔ خواب میں دیکھتا ہوں کہ سلطان الافلاک کے دربار سے ایک اشتہار جاری ہوا ہے۔ خلاصہ جس کا یہ ہے کہ تمام اہلِ عالم اپنے رنج و الم اور مصائب و تکالیف کو لائیں اور ایک جگہ ڈھیر لگائیں۔

محمد صادق

خودی کو نہ دے سیم و زر کے عوض
نہیں شعلہ دیتے شرر کے عوض

اقبالؒ

برسات کی بہار

(بہ تقلید محسن کاکوروی مرحوم)

سمتِ مشرق سے عجب شان سے اٹھا بادل — اب کوئی روز میں بھر جائیں گے سارے جل تھل
پتی پتی پہ چمن کی ہے یہ جوبن آیا — کھل گئی فرطِ مسرت سے ہے کونپل کونپل
کھیت سرسبز ہیں نالوں سے مچی ہے اک دھوم — واہ ری شان کہ جنگل میں ہوا ہے منگل
در و دیوار پہ سبزے کی بہار آئی ہے — پہلے ویراں تھے اب آباد ہوئے دشت و جبل
قطرے پانی کے ہیں پھولوں پہ کہ یہ موتی ہیں — فرشِ سبزہ ہے زمیں پر کہ بچھی ہے مخمل
چال ہے بادِ بہاری کی فضا میں ایسی — چل رہی باغ میں ہو جیسے پری اک چنچل
کوندتی پھرتی ہے یہ ابرِ سیہ میں بجلی — کہ اندھیرے میں دکھا دی ہے کسی نے مشعل
دیکھ کر ابرِ سیہ شور مچاتے ہیں مور — ان کی آواز نے تو سر پہ اٹھایا جنگل
تو کہاں ہے مرے ساقی مرے اچھے ساقی — مدتیں ہوگئیں یار۔ اب تو پلا دے بوتل
ہائے یہ فصلِ بہار اور یہ جنوں کا موسم — کہیں آجائے نہ ان باتوں سے ایماں میں خلل
مرے مولا۔ مری رہتی ہے طبیعت بیکل — عمر آخر ہوئی جاتی ہے کمیں میں ہے اجل
جانتا ہوں کہ مرا ساتھ نہ دے گی دنیا — چھوڑنا چاہتا ہوں چھوڑے بھی لیکن کمّل
دل علائق کی طرف سے ہے پریشاں میرا — مجھ سے کہتا ہے کہ سب چھوڑ کے جنگل کو نکل
موت کے نام سے ہوتا ہے طبیعت کو ہراس — دیکھتا ہوں تو نہیں پاس ہے کچھ حسنِ عمل
تو مرا مالک و مولا ہے میں بندہ ہوں ترا — تیری رحمت کا بھروسا ہے مجھے عزّ و جل
نفسِ امارہ نے مولا نہ کہیں کا رکھا — مار ڈالا مجھے اس موذی نے دے اس کو کچل

وہ کرم حال پہ میرے ہو کہ دکھ دور ہوں سب
وہ عنایت ہو کہ کھل جائے مرے دل کا کنول

سید نذیر حسین ناشاد

برسات کا ترانہ

پلائے جاؤ بے درنگ ۔۔۔ پلائے جاؤ بے درنگ

مچل رہی ہیں بدلیاں
برس رہی ہیں خنکیاں
چھلک رہا ہے آسماں
کھنک رہی ہیں بوندیاں

چھڑا ہوا ہے جلترنگ
پلائے جاؤ بے درنگ!!

(۲)

پلائے جاؤ بے درنگ ۔۔۔ پلائے جاؤ بے درنگ

گھٹاؤں پر شباب ہے
ہواؤں میں شراب ہے
گناہ بھی ثواب ہے
فضول اجتناب ہے

سنو نہ کوئی عذر لنگ
پلائے جاؤ بے درنگ!!

(۳)

پلائے جاؤ بے درنگ ۔۔۔ پلائے جاؤ بے درنگ

گھٹا برس کے کھل گئی
نظر بہ جام و مل گئی

نمی ہوا میں گھل گئی
چمن کی گرد دُھل گئی
نکھر گیا گلوں کا رنگ
پلائے جاؤ بے درنگ

(۴)

پلائے جاؤ بے درنگ ~ پلائے جاؤ بے درنگ
عجیب آب و رنگ ہے
نگاہِ شوق دنگ ہے
خرد کا پاؤں لنگ ہے
جنوں میں بھی ترنگ ہے
نفس نفس میں ہے اُمنگ
پلائے جاؤ بے درنگ !!

(۵)

پلائے جاؤ بے درنگ ~ پلائے جاؤ بے درنگ
یہ دِل فروز آبشار !
مزے مزے کی یہ پھوار !
یہ بھیگے بھیگے سبزہ زار !
دُھلے دُھلائے کوہسار !
یہ جوئبارِ شوخ و شنگ
پلائے جاؤ بے درنگ !!

ذوقی

بچوں کا کہنا مانو

میرے بچے کچھ ایسی بُری طرح پڑے ہیں کہ کسی وقت افسوس ہی نہیں کرتے۔ سو دفعہ سمجھا چکا ہوں کہ قوم کی حالت پر غور کرو بہتری کی تدبیریں سوچو قومی کاموں میں حصّہ لو مگر کیا مجال کہ ان خود پسند بڑھاکوؤں پر کچھ اثر ہو۔

چھوٹی کی تو ایسی زبان چلی ہے کہ ہیں تو خیر کس گنتی میں ہوں ماں کو جواب دینے سے نہیں ٹلتی۔ اگلے دن میری بیگم لیگ کا ذکر کرتے ہوئے قومی شعار کو برقرار رکھنے کا لکچر سنا رہی تھی کہ چھوٹی بولی۔

چھوٹی۔ امّی۔ آپ کی زبردستی سے ہم بچارے کڑوی زہر دوائی اندر انڈیل لیتے ہیں۔ یہ لکچر بھی آپ پلا دیجئے مگر اثر کچھ نہ ہوگا۔ قوم ہم ہیں آپ نہیں ہیں جو ہم اپنے لئے پسند کریں گے وہ ہوگا۔ آپ کیوں خواہ مخواہ ان بڈھے بڈھے لیڈروں کے کہنے میں آتی ہیں؟ انہیں کیا پتا کہ ہم لوگ کیا کرنے والے ہیں۔

بیگم بچاری دم بخود رہ گئی۔ اسے اپنا زمانہ یاد آیا۔ ان کے ابّا قوم کا ذکر کرتے، ٹھنڈی آہیں بھرتے قومی ترقی کا رلز تلاش کرتے، قومی نوحے سنتے، شاعروں کو داد دیتے، اور بچے یہ ڈراما بصد ادب دیکھتے اور اب یہ حالت کہ ماں باپ کو گویا قوم ہی سے جواب ہے

مجھے الگ کر کے کہنے لگی "میں ہاری۔ تم جانو تمہارے بچے جانیں"۔

میں۔ میں پہلے ہی ہار مان چکا ہوں۔ تم جانو تمہارے بچے جانیں۔

بیگم۔ (خفا ہوکر) وہی پرانی بیہودہ عادت کہ میرا جملہ دہرا دیا۔ آخر کچھ کرو گے بھی یا یُونہی مُنہ تکا کرو گے؟

میں۔ مُنہ تکتے رہنا بھی پرانی عادت ہے اور جس کی طرف تکتا ہوں وہ کچھ ایسے بُرے مُنہ والی بھی نہیں۔

بیگم۔ (خوش ہوکر) فقرے بازی چھوڑو کبھی تو عقل سے کام لو۔ میں تمہیں صاف صاف کہتی ہوں کہ ان بچوں میں ادب قواعد نام کو نہیں۔ اس چھٹکی کی گز بھر کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہی رہتی ہے۔ اتفاق سے میں نے سُن لیا اگلے دن بڑی سے کہہ رہی تھی "ابّا میں اور ہم میں کیا فرق ہے؟ انہیں افسوس کرنے میں مزہ ملتا ہے ہمیں خوش رہنے میں لطف آتا ہے۔ قومی قصّے وہ دِل بہلانے کی خاطر کرتے ہیں"۔

میں۔ کسی حد تک تو چڑیل نے خوب ہماری نبض پہچانی۔ یہ واقعہ ہے کہ ہم میں سے اکثر قومی داستان محض اپنے ضمیر کو سلا دینے کی خاطر چھیڑ دیتے ہیں۔ مدّعا یہ ہوتا ہے کہ کام کوئی اور کرے عیب ہم نکال دیں۔

بیگم۔ جھٹ تم بچوں کی طرف داری کرنے لگتے ہو۔ تو یہ بھی سچ ہے کہ قوم وہ ہیں ہم نہیں؟

میں۔ اس میں کیا شک ہے۔ ہمارے لئے تو اب باقاعدہ پسپا ہونے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔

بیگم۔ بندی ایسی بودی نہیں کہ کل کی چھوکریوں سے جواب سنے اور کچھ نہ کہے۔

میں۔ [illegible] جنگی پر مبارکباد عرض کرتا ہوں۔

بیگم۔ کچھ نہ کہوں گی مگر یہ تو بتاؤ کہ یہ لوگ آخر کریں گے کیا؟

میں۔ ہم نے تم نے کون سا امّاں باوا کا کہنا مانا کہ یہ ہمارا کہنا مانیں گے۔ اولاد ہمیشہ سے ناکہا مان چلی آتی ہے اور ہمیشہ ناکہا مان رہے گی۔ چُپکے سے سہتی چلی جاؤ۔ یہ لین دین پشتینی ہے۔ دادا کا حساب پوتا چکاتا ہے۔ جو رنج میں نے باوا کو دیا اس کا بدلہ میرے باوا کا پوتا مجھ سے لے گا۔ نانی کا بدلہ نواسی لے گی۔

بیگم۔ رہنے بھی دو یہ خرافات بچوں کو ادب قواعد سکھانا ہمارا فرض ہے۔

میں۔ جی ہاں۔ قطعی۔ جب سے دنیا چلی ہے ماں باپ کا شکنجہ جاری ہے مگر نتائج آپ کے سامنے ہیں۔ ہمیں کیوں نہ بچوں کا کہنا مان لیں؟ آخر کوئی بُری بات تو نہیں کہتے۔

"فلک پیما"

گلاب

کیا بھلا دیا تو نے

وہ گلاب کا پودا
اک گروہ پھولوں کا
زیبِ گوشۂ بستاں
اک حسیں دُلھن گویا
موتیوں سے پُر جس کا
سبز مخملیں داماں

جس کی اوٹ میں اکثر
باندھتے تھے ہنس ہنس کر
عمر بھر کے ہم پیماں
آہ! وہ ملاقاتیں
شہد سی تری باتیں
تتلیاں مرے ارماں

لیکن آج وہ پودا
میں نے اس طرح دیکھا
شاخ شاخ تھی ویراں
سبزہ زار تھے سُونے
کیا بھلا دیا تو نے

سید ضیا جالندھری

جبر اور مجبوری

سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت ہی تھوڑی سی عقل دے کر دنیا میں بھیجا ہے۔ یہ غنیمت ہے کیوں کہ اگر زیادہ مل جاتی تو خدا جانے کیا کرتا۔

جس روز جبرو نے سراغ رساں افسر کو گولی ماری' اسی روز اخباروں میں یہ خبر نکلی تھی کہ ایک بنگالی ڈاکٹر ایک عجیب قسم کے تجربے میں کامیاب ہوا ہے یعنی یہ کہ مرے ہوئے کتے کا دماغ' اس کے دل کی حرکت کو بجلی کی مشین کے ذریعے جاری رکھنے سے زندہ رہ سکتا ہے۔ صرف اسی قدر تھا' تفصیل نہ تھی۔ لیکن سراغ رساں کے قتل کی خبر کے مقابلے میں یہ اس قدر چھوٹی سی بات تھی کہ کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی اور تمام اخباروں میں جبرو کا یہ آخری کارنامہ بڑی شدومد سے بیان کیا گیا۔

جبرو بڑا مشہور' کئی دفعہ کا سزا یافتہ ڈاکو تھا۔ دو مرتبہ جیل سے بھاگ چکا تھا۔ اس دفعہ شراب کے نشے میں اپنی ایک آشنا کے مکان پر قابو میں آگیا تھا لیکن پکڑے جانے سے پہلے اس نے سراغ رساں افسر کو جس نے مہینوں پیچھا کرنے کے بعد اسے گرفتار کیا تھا پستول کی گولی سے ہلاک کر دیا تھا۔ اس کے دو ساتھی بھاگ گئے تھے۔

رب نواز خاں کپتان پولیس زنجیروں سے بندھے ہوئے ڈاکو کے سامنے جیل کے کمرے میں ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ٹہل رہا تھا۔ دو روز سے کوشش کی جا رہی تھی' اور ہر ممکن طریقہ عمل میں لایا جا چکا تھا کہ جبرو اپنے ساتھیوں کے نام بتا دے لیکن وہ کچھ نہ کہتا تھا آخر کار کپتان قیدی کے پاس کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا اور رازدارانہ انداز میں کہنے لگا۔

"دیکھو جبرو۔ اس معاملے کو اتنا آسان نہ سمجھو۔ اس واقعے سے پہلے تو جو کچھ ہو چکا۔ ہو چکا۔ لیکن اس دفعہ تم نے جسے مارا ہے وہ میرا پرانا دوست تھا ہم نے اکٹھے تعلیم پائی تھی اور ملازم ہونے کے بعد بھی سگے بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ مجھے تمہارے ساتھیوں کا سراغ لگانا ہے خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ اب آخری مرتبہ پوچھتا ہوں بتاؤ گے یا نہیں؟"

جبرو نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "مجھے معلوم نہیں"۔

کپتان نے کہا۔ "پھر سوچ لو۔ ایسا نہ ہو پچھتانا پڑے —" ڈاکو خاموش رہا اور بدستور جیل میں بند کر دیا گیا۔ اس کا مقدمہ باضابطہ چالان ہوا اور مجسٹریٹ نے پھانسی کی سزا کا حکم سنا دیا۔ ڈاکو اب بھی خاموش تھا۔

سراغ رساں کے قتل کو تقریباً تین ماہ کا عرصہ گذر چکا تھا کہ ایک بنگالی ڈاکٹر شہر میں آیا۔ اس کی ہیئت عجیب قسم کی تھی۔ پرانے فیشن کا کوٹ اور دھوتی پہنتا تھا اور سوائے اس مکان کے جو اس نے شہر سے باہر کرایہ پر لے رکھا تھا کسی جگہ آتا جاتا نہ تھا اس کا نوکر شہر سے کھانے پینے کا معمولی سامان خرید کر لے جاتا اور چونکہ وہ بھی بنگالی تھا اور کسی سے ملتا جلتا نہ تھا کسی کو ٹھیک طور پر معلوم نہ تھا کہ ڈاکٹر کیا کام کرتا ہے وہ مریض نہیں دیکھتا تھا اور اس کے پاس آنے جانے والا بھی سوائے رب نواز خاں کپتان پولیس اور کالج کے ایک دو پروفیسروں کے اور کوئی نہ تھا۔

ایک روز کپتان پولیس ڈاکٹر کے پاس آیا تو ڈاکٹر نے کہا "دیکھئے کپتان صاحب۔ میری عمر کا مقصد سائنس کی تحقیقات ہے اور سائنس کے لئے میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن فقط علم کے لئے۔ اگر یہ مقصد مدِنظر نہ ہو تو میں کچھ نہیں کروں گا۔ میرا صاف انکار ہے"

کپتان نے جواب دیا۔ "ڈاکٹر صاحب میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ آپ جو کچھ کریں گے سائنسدانوں کے سامنے کریں گے"——

ڈاکٹر نے کہا "ہاں! اور صرف تجربہ کی صحت کو ثابت کرنے کے لئے ——"

چنانچہ تیاری شروع کر دی گئی۔ بازار سے تین چار چھوٹے چھوٹے موٹر خریدے گئے۔ یعنی اس قسم کے جن سے بجلی کے پنکھے چلتے ہیں۔ شیشے کے بہت سے آلات۔ ربڑ کی نلیاں۔ وغیرہ۔ ہسپتال کا ایک آپریشن کرنے کا کمرہ خالی کر دیا گیا اور اس میں ڈاکٹر اپنا سامان لگا کر صبح شام کام کرنے لگا۔

جبرو ڈاکو کو پھانسی دئے جانے کی تاریخ سے کچھ دن پہلے کپتان پولیس ایک دفعہ پھر اس کے پاس گیا اور کہنے لگا "دیکھو جبرو۔ اب بھی مان جاؤ۔ میں تمہیں آخری موقع دیتا ہوں۔ اپنے ساتھیوں کے نام بتا دو تو تمہیں نہایت سہولت کے ساتھ پھانسی دے دی جائے گی ورنہ ——!"

جبرو مسکرایا: "جب پھانسی ہی دینا ہے تو دے ڈالو۔ اس سے زیادہ میرا کیا کر لوگے ——؟"

کپتان نے کہا "میں پھر کہے دیتا ہوں کہ تم بتاؤ گے۔ ضرور بتاؤ گے"۔

جبرو نے کہا "بہت اچھا۔ دیکھا جائے گا"۔

پھانسی دینے کا وقت صبح چھ بجے مقرر تھا۔ چند اخبار والے اور جیل کے افسر موجود تھے۔ چند منٹ میں سب کام ہو گیا۔ جیل کے ڈاکٹر نے دل کی حرکت دیکھ کر بتا دیا کہ اب جسم میں جان باقی نہیں۔ سب لوگ چلے گئے۔ لاش کو فوراً ایک لاری میں ڈال کر ہسپتال پہنچا دیا گیا۔

ہسپتال کے جس حصے میں بنگالی ڈاکٹر کا آپریشن کا کمرہ تھا' اس طرف کسی کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ قفل پڑے ہوئے تھے یا پہرہ لگا دیا گیا تھا۔ تمام دن اور تمام رات ڈاکٹر اور اس کا نائب کمرے سے نہ نکلے۔ دوسری صبح کو۔ یعنی پھانسی دینے سے ٹھیک چوبیس گھنٹے بعد ڈاکٹر نے کپتان پولیس کو ٹیلیفون پر بلایا اور کہا "سب کچھ تیار ہے"۔

رب نواز خاں نے اٹھ کر کپڑے پہنے۔ یونیورسٹی کے تین پروفیسروں سے جن سے پہلے بات چیت ہو چکی تھی ٹیلیفون کے ذریعے کہہ دیا کہ تیار ہو جائیں' اور خود موٹر لے کر راستے میں سے ان سب کو ساتھ لیتا ہوا گھنٹے بھر کے اندر ہسپتال پہنچ گیا۔

آپریشن کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ جب کپتان پولیس نے آہستہ سے دستک دی تو آواز آئی "کون ہے ؟"

"رب نواز خاں!"

"آپ کے ساتھ کون ہے ؟"

"یونیورسٹی کے تین پروفیسر۔ اور کوئی نہیں۔"

اس پر دروازہ کھلا اور سب اندر چلے گئے۔ دروازے کو اندر کی طرف سے مقفل کر دیا گیا۔

ایک میز پر جس کے اوپر کا تختہ موٹے شیشے کا تھا ایک شیشے کا گول برتن رکھا تھا۔ اس میں شفاف موم کے اندر دو انچ تک ڈوبا ہوا ایک انسانی سر تھا جس کی گردن کی رگوں کے ساتھ کئی ایک ربڑ اور شیشے کی نلیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ان نلیوں کے دوسرے سرے مختلف قسم کے آلات اور مشینوں کے اندر جاتے تھے۔ ان میں سے ایک مشین ایسی تھی جو خون کو ایک مقررہ حرارت پر قائم رکھتی تھی۔ دوسری چھوٹے سے موٹر کے ساتھ چل رہی تھی اور خون کے دوران کو سر میں جاری رکھنے کا کام کرتی تھی۔ کئی بجلی کے تار تھے جو خدا جانے کہاں سے آتے تھے اور کدھر کو جاتے تھے۔ لاش کا جسم ایک طرف چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔ اسے ایک سفید چادر سے ڈھک دیا گیا۔

ڈاکٹر نے ایک بے داغ سفید کوٹ پہن رکھا تھا۔ اور سر پر سفید رومال باندھے تھا۔ کپتان پولیس اور پروفیسروں کے ساتھ معمولی سلام کے بعد اس نے ایک طرف سلفچی میں برش سے رگڑ رگڑ کر صابن سے ہاتھ دھوئے اور ایک بوتل میں سے دوائی ہاتھوں پر ڈلوا کر انہیں سکھایا۔ پھر چند فقرے سائنس کی اصطلاح میں پروفیسروں کو سمجھانے کے لئے کہے اور بتایا کہ بجلی کے ذریعہ سے دل کی حرکت مصنوعی طور پر جاری رکھی گئی ہے۔ یعنی بجلی کا دل خون کو متواتر دماغ میں دورہ کرا رہا ہے اور نبض باقاعدہ چل رہی ہے "یہ کہہ کر اس نے کٹے ہوئے سر کے جبڑے کی ہڈی پر جبڑے کے نزدیک ایک انچ ٹھوڑی کی طرف انگلی رکھی اور گھڑی نکال کر پندرہ سیکنڈ دیکھے۔ اس کے بعد کالج کے ایک پروفیسر نے اسی جگہ انگلی رکھ کر نبض دیکھی تو ڈاکٹر نے کہا" ہلکا ہاتھ رکھئے گا۔ موم ابھی نرم ہے آپ دنیا میں پہلے آدمی ہیں پروفیسر صاحب جن کو یہ تجربہ دکھایا گیا ہے اور جو کچھ میں نے کیا ہے اس کی پوری تفصیل میرے چھپے ہوئے مضامین میں موجود ہے۔ گو یہ بھی پہلی مرتبہ ہے کہ یہ تجربہ انسان کے ساتھ کیا گیا ہے"۔

کٹے ہوئے سر کا چہرہ اصلی صحت کے رنگ سے قدرے نیلا پڑ گیا تھا۔ ہونٹ سوجے ہوئے تھے۔ منہ تھوڑا سا کھلا تھا اور آنکھیں بھی کچھ کھلی تھیں لیکن سانس نہیں چل رہا تھا۔ پھر بھی سر مردہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر نے کپتان پولیس سے کہا" اب آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں"۔ رب نواز خاں نے آگے بڑھ کر سوال کیا ــــ

"جبرو! کیا تم میری آواز سن رہے ہو ــ ؟"

ڈاکٹر نے کہا" اور قریب ہو جائیے۔ اور ذرا بلند آواز سے بات کیجے"۔

کپتان قریب ہو گیا اور بلند آواز سے پکارا "جبرو۔ کیا سنتے ہو ــــ ؟"

ہونٹ آہستہ آہستہ ہلے۔ اور آواز سے تو نہیں لیکن جس طرح کوئی کان میں بات کہتا ہے سر نے کہا "مجھے مر جانے دو!"

"ہاں تمہیں مر جانے دوں گا جبرو" کپتان نے کہا "لیکن کیا تمہیں دکھائی دیتا ہے ــ ؟"

جواب بلا۔ "ہاں۔ کچھ کچھ —— مجھے مرجانے دو!"

"تم مرجانا چاہتے ہو —— ؟"

"ہاں۔!"

"تمہیں زندہ رکھنے کے لئے میرا دو ہزار روپیہ خرچ ہوگیا ہے۔"

"خدا کے واسطے مجھے مرجانے دو۔!"

"اچھا تو یہ بتاؤ کہ تمہارے ساتھی کون کون تھے۔؟"

"مجھے مرجانے دو۔!"

"جب تک نہیں بتاؤ گے میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔ ہمارے پاس تمہیں کئی ہفتے تک زندہ رکھنے کے لئے کافی خون موجود ہے"

تقریباً سیاہ رنگ کے خون کے چند قطرے منہ میں سے نکل کر موم میں گر گئے۔ کچھ عرصے تک خاموشی رہی۔ پھر سر نے کہا "مجھے مرجانے دو۔!"

"بہت اچھا!" کپتان نے جواب دیا "ساتھیوں کے نام بتاؤ۔"

پھر کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ گویا سر کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ اس کے بعد ہونٹوں میں سے سنائی دیا —— "لہنا سنگھ!"

"اور —— ؟"

"برکت —— "

"اور —— ؟"

"کوئی نہیں۔"

"سچ کہتے ہو؟ جھوٹ نہ ہو —— "

"سچ ہے۔"

کپتان نے کہا۔ "اچھا۔ ابھی ایک گھنٹے میں تصدیق ہوئی جاتی ہے۔"

ٹیلیفون چلے۔ لہنا سنگھ ایک شراب خانے میں گرفتار کرلیا گیا۔ وہ نیم مدہوش تھا اور پولیس سے بار بار کہتا تھا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا۔ مجھے کیوں پکڑتے ہو —— ؟"

لیکن جب اسے کمرے میں لایا گیا جہاں جبرو کا سر تھا اور کپتان پولیس نے سر سے پوچھا۔ "جبرو۔ ایک بات اور بتادو۔ میں تمہیں ابھی آزاد کئے دیتا ہوں۔ اِدھر دیکھو —!"

آنکھوں کی پلکیں ہلتی ہوئی معلوم ہوئیں۔

"یہی لہنا سنگھ ہے —؟"

سر نے جواب دیا۔ "ہاں۔! مجھے مرجانے دو —!"

لہنا سنگھ کا تمام نشہ یہ الفاظ جبرو کے کٹے ہوئے سر سے سُن کر ہرن ہوگیا۔ رنگ سفید پڑ گیا۔ اور کمرے سے باہر نکلتے ہی اس نے جُرم کا اقبال کرلیا۔

عطاء الرحمٰن

ایک سال

(۱)

سنو، یہ چیت ہے اور تُم سفر کو جانے والے ہو
بہار اپنی جوانی پر ہے
دیکھو کیسا منظر ہے
چلو تم بھی کہ میں کچھ پھول مندر میں چڑھاؤں گی
چلو اک بات اُن برگد کے سایوں میں بتاؤں گی
چلو وہ گیت جو تم کہہ رہے تھے آج گاؤں گی
یہ کیوں آنکھوں میں مستی ہے
شرارت کیوں ٹپکتی ہے
تو سمجھی، مجھ سے کچھ کہہ کر، مجھے شرمانے والے ہو!!

(۲)

سنو، بیساکھ ہے اور تم یہ کہتے ہو کہ جائیں گے
ہوا گلشن میں گاتی ہے
چنبیلی مُسکراتی ہے
چنبیلی کے انہیں پھولوں میں ہم تم کیوں نہ کھو جائیں
ہوا کی بانسری کی لے میں ہم کیوں گم نہ ہو جائیں
سویرا ہے، دوبارہ آؤ، پھلواری میں سو جائیں
سراپا حسرت و غم ہو
بتاؤ مجھ سے برہم ہو
قسم ہے، باغ میں ایسے نظارے پھر نہ آئیں گے

(۳)

سنو، یہ جیٹھ ہے کیوں گاؤں سے رخصت کی ٹھانی ہے
یہ رنگوں کا مہینہ ہے
کہ اک نازک حسینہ ہے
ذرا قوس قزح کے رنگ میں ساری ڈبوؤں گی
میں اس دیوی کے قدموں پر حسیں کلیاں پروؤں گی
شفق کی وادیٔ رنگیں میں تھوڑی دیر سوؤں گی
محبت ہر طرف خنداں
فضا میں دھوپ کی رقصاں
وہاں اک نقرئی جذبات کی دلکش کہانی ہے

(۴)

سنو، پاوس* ہے یہ اور تم نے بستر باندھ رکھا ہے
فضا میں آگ مدغم ہے
کوئی دوشیزہ برہم ہے
چلو دوشیزۂ برہم کو برہم اور کر آئیں
پسینوں کی حسیں بوندوں کی افشاں نوچ کر لائیں
اور ان کو گھر میں ساون کی طرح ہم خوب برسائیں
تو گرمی سے پریشاں ہو
بڑے نازک ہو، ناداں ہو

* اساڑھ

یہ جو چھپر کھٹ کے اُس دالان کو میں نے سجایا ہے۔

(۵)

سنو، ساون ہے اور تم آج کل بھی گھر سے جاؤ گے
پھواروں کا زمانہ ہے
بہاروں کا زمانہ ہے
چلو باغوں کے جھرمٹ میں یہاں سے دُور چھپ جائیں
چلو ندی کنارے دھان کے کھیتوں میں کچھ گائیں
چلو مندر سے ہم گوپال کا جھولا چُرا لائیں
فضا میں کام دیوتا نے
بہا رکھے ہیں مے خانے
قدم کے سائے میں بتلاؤ جھولا کب جھلاؤ گے؟

(۶)

سنو بھادوں کے دن ہیں اور تم کہتے ہو جانا ہے
صدا بنسی کی آتی ہے
کہ جمنا گیت گاتی ہے
یہ بارش اور یہ رُت عشق کا پیغام دیتے ہیں
انہیں رنگیں دنوں میں کرشن دیوتا جنم لیتے ہیں
وہ لَے میں بانسری کی دو دلوں کی ناؤ کھیتے ہیں
چلو مندر میں ہو آئیں
دُعائیں ہم بھی پا جائیں

ہماری الفتوں پر بھی دعاؤں کا زمانہ ہے

(۷)

سنو، یہ کوار ہے اور ان دنوں گھر سے روانہ ہو
مسرت ہے نہ برکت ہے
بڑی منحوس ساعت ہے
میں کیسے برہمن کو آج اکیلے ہی کھلاؤں گی
میں اب پُوجا بھی کرتے وقت شاید خوف کھاؤں گی
قسم ہے موت کی تخئیل سے میں کانپ جاؤں گی
بہاروں میں سنورتی ہوں
اُداسی سے میں ڈرتی ہوں
مجھے تو تم ہو، ساون رُت ہو اور کوئی فسانہ ہو!

(۸)

سنو، کاتک ہے اور جانے کو تم تیار بیٹھے ہو
چراغوں کا زمانا ہے
مجھے پُوجا کو جانا ہے
چلو دیکھیں گے جا کر لکشمی کس طرح آتی ہیں
چلو دیکھیں وہ کیا ہر شمع میں جلوہ دکھاتی ہیں
چلو دیکھیں وہ کیسے ہر طرف سونا لٹاتی ہیں
اگر دیوی کو گھیریں گے
تو پھر سونا بکھیریں گے

آخری پتّی

کسم کو تصویر کشی سے بچپن ہی سے بہت دل چسپی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کالج میں جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بجائے وہ مصوری کے اسکول میں داخل ہوئی اور پھر اس کی تکمیل کے لئے بمبئی گئی۔ بمبئی میں اس کی ملاقات شانتا سے ہوئی۔ کسم اور شانتا میں مختلف حیثیتوں سے بہت کچھ فرق تھا، مثلاً ایک برہمن کی لڑکی تھی، دوسری راجپوت کی۔ ایک دہلی کی رہنے والی دوسری گجرات کی۔ مگر مصوری کا مذاق اور اس سے دل چسپی دونوں میں یکساں تھی اور اسی ہم مذاقی کا نتیجہ تھا کہ رفتہ رفتہ دونوں میں اتنا میل جول بڑھا اور دونوں ایک دوسرے پر اس طرح مٹنے لگیں کہ لوگ ان کو سگی بہنیں سمجھتے تھے۔

مصوری کی تعلیم کی تکمیل کے بعد شانتا اور کسم دونوں نے مل کر بمبئی ہی میں اپنا نگار خانہ بنایا۔ ان کی تصویریں ملک میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں اور ان کے فن کے قدر داں ہندوستان جیسے قدر ناشناس ملک میں بھی سینکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں پیدا ہو گئے۔

نومبر کا مہینہ تھا کہ بمبئی میں نمونیا کی وبا پھیلی۔ کسم بھی اس کا شکار ہوئی۔ علاج ہوتا رہا لیکن فائدہ کیا معنی الٹی روز بروز حالت خراب ہوتی گئی۔ شانتا نے علاج اور تیمارداری میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، لیکن اس کی حالت نہ جانے کیوں خراب سے خراب تر ہی ہوتی گئی۔ جس مکان میں شانتا اور کسم کا قیام تھا اسی میں ایک فلیٹ میں چند بنگالی مصور بھی رہتے تھے۔ ان میں ایک بوڑھا مصور نرنجن کسم سے بہت محبت کرتا تھا۔ وہ اس کو اپنی بیٹی کی طرح مانتا تھا اور باپ کی طرح اس کی تیمارداری کر رہا تھا۔

نرنجن کہنے کو تو ایک مصور تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ کبھی تصویر کشی کے ذریعہ پیٹ پالنا نصیب نہ ہوا۔ چالیس برس کی لگاتار کوششوں کے بعد بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ اس کو ہمیشہ یہی کہتے سنا گیا کہ "میں عنقریب اپنا شاہکار پیش کرنے والا ہوں" بہرحال نرنجن کی انتہا یہ تھی کہ اس نے صرف اسی پر اکتفا کی کہ دوسرے مصوروں کا چھوٹا موٹا کام کر دیا کرے۔ آدمی قناعت پسند تھا جو کچھ تھوڑا بہت مل جاتا اسی میں مگن رہتا لیکن باوجود تمام ناکامیوں کے وہ ہمیشہ لوگوں سے یہ کہا کرتا کہ میں بہت جلد اپنا شاہکار پبلک کے سامنے پیش کرنے والا ہوں۔ لوگ یہ سن کر مسکرا دیتے۔

کسم کے مکان کے پچھلے حصہ میں ایک چھوٹا سا صحن تھا جس کی چہار دیواری پر پھولوں کی کچھ بیلیں چڑھی ہوئی تھیں جو کافی پرانی ہو چکی تھیں۔ پت جھڑ کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ ان بیلوں کی پتیاں بھی ایک ایک کر کے جھڑتی جا رہی تھیں۔ کسم اپنے بستر پر لیٹی لیٹی انہی پتیوں کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھا کرتی۔ ایک دن یکایک اس کے دل میں یہ خیال گذرا کہ یہ پتیاں ایک ایک کر کے جھڑتی جا رہی ہیں جس دن آخری پتی گر جائے گی اس کی زندگی کی بیل بھی ہمیشہ کے لئے سوکھ جائے گی۔ کسم یوں تو بہت روشن خیال عورت تھی لیکن بیماری میں انسانی عقل کی پرواز ذرا کم ہو جاتی ہے۔ اگر یہی خیال کسی اور کے دل میں آیا ہوتا اور وہ کسم کو معلوم ہو جاتا تو وہ اس کا مذاق اڑاتی اور اسے وہمی اور نہ جانے اور کیا کیا کہتی۔ لیکن بیماری نے نحیف جسم کے ساتھ اس کے دماغ کو بھی نحیف اور کمزور بنا دیا تھا اور کمزور دماغ ہمیشہ توہمات کا گہوارہ بن جاتا ہے۔

جیسے جیسے پتیاں زیادہ گرتی جاتی تھیں کسم کا یہ خیال پختہ ہوتا جاتا تھا کہ جس دن آخری پتی گر جائے گی اسی دن اس کی زندگی کا چراغ گل ہو جائے گا۔ اب اس نے ادھر ادھر دیکھنا بالکل چھوڑ دیا۔ ہمیشہ انہی پتیوں کی طرف دیکھا کرتی۔ شانتا اس کے پاس آ کر بیٹھتی، اس سے باتیں کرنا چاہتی لیکن وہ ان پتیوں کی طرف سے نظر بالکل نہ ہٹاتی۔ شانتا تنگ آ گئی۔ کہنے لگی "تم نے یہ عادت بنا رکھی ہے، ہر وقت کھڑکی میں سے دیکھتی رہتی ہو!"

کسم نے شانتا کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اپنے خیال میں محو بولی "وہ لو ایک اور گر گئی"

شانتا۔ کیا؟ کیا ایک اور گر پڑی؟

کسم (بغیر شانتا کی طرف متوجہ ہوئے) اب تو بہت کم باقی رہ گئی ہیں۔ ہاں بس اب دن دو دن کی اور بات ہے۔

شانتا۔ آخر تم کیا کہہ رہی ہو، میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔

کسم (بغیر شانتا کی طرف متوجہ ہوئے) بس اب دن دو دن کی اور بات ہے

شانتا۔ دن، دو دن کی اور بات ہے!

کسم۔ ہاں دن، دو دن!

شانتا نے ہاتھ پکڑ کر کسم کا رُخ بدل دیا، اور بولی "میری بہن ذرا کھل کر کہو، آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟

کسم۔ وہ دیکھو، وہ سامنے بیلوں کی پتیاں ایک ایک کر کے گرتی جا رہی ہیں۔ پانچ چھ دن پہلے تو سینکڑوں تھیں، گننا دشوار تھا۔ لیکن اب تو مشکل سے پندرہ بیس ہوں گی۔ وہ دیکھو ایک اور گر گئی۔

شانتا تو ان پتیوں کے گرنے سے تمہیں کیا؟

کسم۔ شانتا، جس دن آخری پتّی گر جائے گی اسی دن میرا بھی خاتمہ سمجھو۔

شانتا کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ نرنجن آگیا۔ شانتا نے اس سے کہا "نرنجن بابو کسم کی بات تم نے سُنی، وہ دیکھو، وہ بیلیں ہیں نا، ان کی پتیاں ایک ایک کر کے گرتی جا رہی ہیں۔ یہ کہتی ہیں کہ جس دن آخری پتّی گر جائے گی میں بھی ختم ہو جاؤں گی۔

نرنجن یہ سُن کر ہنس پڑا، لیکن ساتھ ہی اس کے چہرہ سے صاف پتا چلتا تھا کہ اس کو یہ بات سُن کر بڑا دکھ ہو رہا ہے۔ وہ چپ چاپ ایک کُرسی پر بیٹھ گیا اور کسی گہرے سوچ میں پڑ گیا۔

دوسرے دن صبح کو کسم کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ بیل میں صرف دو پتیاں باقی ہیں۔ شانتا بھی وہاں جا پہنچی۔ اس کو دیکھ کر کسم بولی "بس اب تو صرف دو پتیاں اور رہ گئی ہیں، دو پتیوں کے گرنے میں کتنی دیر" شانتا نے اس کو پیار کیا اور بولی "بہن تم نے اپنے دل میں یہ جھوٹا خیال کیسے بٹھا دیا۔ تم تو ایسی وہمی نہ تھیں"

کسم۔ وہم کی کوئی بات نہیں شانتا، مجھے یقین ہے کہ آخری پتّی کے گرتے ہی میری زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔

شانتا۔ تم کیوں بے کار پاگلوں کی سی باتیں کر رہی ہو، پتّی کے گرنے سے بھلا کسی کو آج تک موت آئی ہے؟

کسم۔ کسی کو آئی ہو یا نہ آئی ہو، لیکن مجھے تو ضرور آئے گی۔

شانتا۔ ارے نہیں پگلی! ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیوں بلا وجہ اپنا دماغ خراب کر رہی ہے۔

کسم۔ میری اچھی بہن، تم میرا کہنا مان لو، اس پتّی کے ساتھ میری روح ہے۔ اُدھر وہ پتّی گری اِدھر میری روح بدن سے نکلی۔

شانتا دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ وہ یہ جانتی تھی کہ یہ کسم کا وہم ہے۔ جو آج تک کبھی نہیں ہوا ہے وہ اب کیسے ہوگا۔ لیکن محبّت بحث کی قائل نہیں، بلا چون وچرا ہر بات کو مان لینے کے لئے تیار رہتی ہے۔ باوجودیکہ عقل تسلیم نہیں کرتی تھی لیکن دل نے مان لیا کہ ہاں کسم کا کہنا سچ ہو سکتا ہے۔ کیا شانتا اس پتّی کو گرنے سے کسی طرح روک سکتی تھی؟ لیکن قدرت کے کاموں میں انسان کو کہاں دخل۔ ایک معمولی سی پتّی کو گرنے سے روک لینا کتنا مشکل بلکہ ناممکن کام! آہ، انسان کی بے چارگی و مجبوری!

شانتا کسم سے کچھ کہنا چاہتی تھی کہ ہوا کا ایک معمولی سا جھونکا آیا اور ان دو پتیوں میں سے ایک کو اڑا کر اپنے ساتھ لیتا گیا۔ شانتا کلیجہ پکڑ کر رہ گئی۔ اب بیل میں صرف ایک ہی پتّی باقی تھی۔

دن ختم ہو گیا مگر وہ آخری پتّی اپنی جگہ پر موجود تھی۔ سورج ڈوب گیا، رات کی تاریکی نے چاروں طرف پردے ڈال دیئے۔ وہ رات شانتا کے لئے کتنی غم انگیز اور اندوہناک رات تھی اور کسم کے لئے؛ اس سے تو دنیا ہی چھوٹ رہی تھی۔

رات بھی خدا خدا کر کے ختم ہو گئی۔ صبح کو دیکھا گیا تو پتّی اپنی جگہ پر موجود۔ شانتا نے انتہائی محبّت سے کسم کی پیشانی کو بوسہ دیا۔

دوسرا دن بھی ختم ہو گیا اور وہ پتّی اپنی جگہ پر موجود۔ رات آئی اور وہ بھی چلی گئی لیکن پتّی اپنی جگہ پر موجود۔ غرض اسی طرح تین دن اور تین راتیں گذر گئیں اور آخری پتّی اپنی جگہ پر موجود۔ اب تو کسم کو بھی یقین ہو گیا کہ اس کی زندگی کے دن باقی ہیں۔ اس میں پھر سے جینے کی خواہش پیدا ہو گئی۔

ایک ہفتے کے اندر اندر کسم میں صحت کے کامل آثار ظاہر ہو گئے۔ ڈاکٹر نے بھی یقین دلا دیا کہ اب خطرے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی۔ آخری پتّی اپنی جگہ پر موجود تھی۔ اِدھر تو کسم کو صحت ہونے لگی اور اُدھر نرنجن دفعتہً نمونیا میں مبتلا ہو کر چل بسا۔

دن گذرتے گئے اور کسم کی حالت روز بروز بہتر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ بالآخر وہ دن بھی آیا کہ اس نے غسلِ صحت کیا۔ اس خوشی میں شانتا نے مختلف احباب کو جن میں زیادہ تر مصوّر تھے، ایک پارٹی دی۔ دورانِ گفتگو میں نرنجن کا بھی ذکر آگیا۔ ایک نوجوان مصوّر کے ہونٹوں پر ایک عجیب معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی لیکن ساتھ ہی اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور اس کے ہزار چھپانے پر بھی تاڑنے والی نگاہوں نے تاڑ لیا کہ کوئی بات ضرور ہے اور اس سے اصرار کر کے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔ یہ نوجوان مصوّر، نرنجن کا بھتیجا تھا اور نرنجن اس کو بہت مانتا تھا۔

نوجوان مصوّر نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے زمین پر گر پڑے۔ لوگوں کو یہ دیکھ کر اور زیادہ حیرت ہوئی۔ اور انہوں نے اور زیادہ اصرار کے ساتھ اس سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟

آخر مصوّر مجبور ہو کر بولا "اگر آپ لوگ اصرار کر رہے ہیں تو پھر سنئے، نرنجن بابو میرے تو چچا ہی تھے لیکن مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ لوگوں کو بھی ان سے بہت محبت تھی اس لئے جو راز میں جانتا ہوں اس کا بتا دینا ہی بہتر ہے۔"

تمام لوگ گوش بر آواز ہو گئے۔

مصوّر نے کہا "آج ہم بہن کسم کے غسلِ صحت کے جشن میں جمع ہوئے ہیں، آپ۔ لوگوں کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ نرنجن بابو کی موت کسم بہن کی صحت کا باعث ہوئی۔"

تمام لوگ، بالخصوص شانتا اور کسم یہ جملہ سُن کر متعجب بلکہ ششدر رہ گئے اور سب کے سب اور زیادہ توجہ سے سننے لگے۔ مصوّر نے اپنا سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا،

"آپ لوگوں کو تو اس بات کا علم ہے کہ ہماری بہن نفسیاتی اثر کے تحت اپنی مُوت کا یقین کر چکی تھیں اور نفسیاتی اثر کو دور کرنا کسی دوا یا ڈاکٹر کے بس کی بات نہیں"

چند مصوّروں نے گردن ہلائی۔

"نرنجن بابو کو بھی یہ بات معلوم ہوئی۔ وہ ایک ناکام مصوّر ضرور تھے لیکن انسانی نفسیات کو وہ خوب سمجھتے تھے اور آپ سب لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ کسم بہن کو اپنی بیٹی کی طرح چاہتے اور مانتے تھے۔"

شانتا اور کسم دونوں بیک وقت بول اٹھیں "بالکل صحیح"

کسم۔ واقعی وہ مجھے بہت مانتے تھے۔

مصوّر۔ خیر، تو نرنجن بابو نے کسم بہن کو بچانے کی تدبیر سوچی۔ یہ اُس دن کی بات ہے جب صرف دس پندرہ پتّیاں باقی رہ گئی تھیں۔ جب رات ہوئی اور سب لوگ بے خبری کے عالم میں پڑے آرام کی نیند سو رہے تھے تو نرنجن بابو اپنے برش، رنگوں کا ڈبّا، ایک لالٹین اور ایک سیڑھی لے کر گھر سے نکلے۔

شانتا۔ رات کے وقت؟

مصوّر۔ جی ہاں، رات کے وقت، تقریباً آدھی رات کا وقت تھا۔ دسمبر کا مہینہ، اور اس پر ستم یہ ہوا کہ بارش ہونے لگی۔ لیکن انہوں نے کسی چیز کی پروا نہ کی۔ وہ اس دیوار کے پاس گئے جس پر کی آخری پتّی کے ساتھ ہماری بہن کی زندگی بندھی ہوئی تھی۔

شانتا اور کسم دونوں کے دل کی حرکت تیز ہو گئی۔ مجلس پر بھی ایک سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔

"انہوں نے اس دیوار پر برش سے ایک پتّی بنائی۔ گو وہ عمر بھر ایک ناکام مصوّر رہے لیکن یہ پتّی انہوں نے اتنی لاجواب بنائی کہ دُور سے کسی کو یہ تمیز نہ ہو سکی کہ وہ اصلی پتّی ہے یا بناوٹی۔"

نہ صرف شانتا اور کسم بلکہ پارٹی کے اکثر ممبر بیک وقت بول اُٹھے "اچھا تو وہ پتّی مصنوعی ہے؟"

مصوّر۔ جی ہاں، وہ پتّی مصنوعی ہے، اس کو رنگ اس خوبی سے دیا گیا ہے اور اتنی اچھی بنائی گئی ہے کہ دُور سے بالکل اصلی معلوم ہوتی ہے۔ آپ لوگ چاہیں تو ابھی چل کر دیکھ لیں۔"

کسم۔ لیکن اُن کی مَوت کا سبب آخر یہ پتّی کیسے بن گئی؟

مصوّر۔ میں ابھی بتا چکا ہوں کہ سردی کا موسم تھا اور اس پر بارش ہو رہی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ نرنجن بابو پانی میں شرابور ہو گئے۔ بڑھاپے کا بدن بھلا اس

میں مقابلہ کی تاب کہاں! صبح ہوتے ہوتے اچھا خاصا بخار تھا۔ دو دن بعد بخار نے نمونیا کی شکل اختیار کرلی اور آخر کار یہی بیماری ان کی موت کا سبب بنی۔

تمام لوگ اس واقعہ کو سُن کر حیران و ششدر رہ گئے۔ مجلس پر ایک سناٹا چھا گیا۔ کسم اور شانتا کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

ایک معتور نے مجلس کے سکوت کو یہ کہہ کر توڑا: "ایسا ایثار اور ایسی قربانی کم دیکھنے میں آتی ہے"۔

ایک دوسرے معتور نے کہا "نرنجن بابو نے آخر اپنا شاہکار بناکر ہی چھوڑا"۔

کسم کی آنکھوں سے اب بھی آنسو جاری تھے۔

(ماخوذ از او ہنری)

عبدالرزّاق قریشی

وہی اصلِ مکان و لامکاں ہے
مکاں کیا شے ہے اندازِ بیاں ہے
خضر کیوں کر بتائے کیا بتائے
اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے؟

اقبالؔ رح

غــزل

جوش کھا اور کہ سودا ہے ترا خام ابھی   عشق شورش ہے مگر شورشِ بے نام ابھی
جان بھی نذر کروں گا دلِ بے تاب ٹھہر   لوٹ لینے دے ذرا لذتِ پیغام ابھی
دل میں وہ شور ہے برپا کہ الٰہی توبہ   تم نے چپکے سے لیا کیا تھا مرا نام ابھی؟
جو کہا تھا تری آنکھوں نے دھڑکتے دل سے   گونجتا ہے مرے کانوں میں وہ پیغام ابھی
صورتِ شاہدِ مقصود نظر کیا آئے   ذوقِ دیدار میں حائل ہیں در و بام ابھی
کتنے ہی قیدِ علائق سے بھی آزاد ہوئے   تو ہے مصروفِ پرستارئ اوہام ابھی
ذرّے ذرّے نے سنا، وجد کیا، رقص کیا   تجھ کو ہے شکوۂ محرومئ پیغام ابھی
صبحِ عشرت سے ہم آغوش ہو گیا شامِ الم   تو نے توڑا نہیں پیمانۂ ایام ابھی
دیکھ سرمایۂ تسکیں نہ جراحت ہو جائے   رہنے دے کچھ خلشِ حسرتِ انجام ابھی
ایک صورت جسے ترتیب ستاروں سے دیں   میرے اشکوں میں جھلکتی ہے سرِ شام ابھی
دل سلامت ہے اکثر یہ گماں ہوتا ہے   میرے پہلو میں ہے اک شاہدِ خود کام ابھی
تیری تنویر سے آراستہ ہے میری سحر   تیری خوشبو سے مہکتی ہے مری شام ابھی
تم نے انسان کی فطرت پہ کبھی غور کیا؟   مئے سر جوش ابھی، دُردِ تہِ جام ابھی!
دیکھنا ہے تو نہیں فکر میں شاعر کی دیکھ   سینۂ سنگ میں سوتے ہیں جو اصنام ابھی
ہم ہیں وہ رند کہ مستی میں اگر "ہو" کر دیں   ایک مرکز پہ کھنچ آئیں سحر و شام ابھی

کہہ کے یہ کھینچ لیا ہاتھ اثرؔ ساقی نے
تیرے دل سے نہیں نکلی ہوسِ جام ابھی؟!

جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی

حکایتِ عشق

میر کی مثنوی

میر تقی میرؔ دِلی والے شاعر نے جو اُردو زبان کے مجددِ اعظم تھے، اُردو زبان میں صاف، شُستہ، پُردرد اور پُر اثر تخلیقی مثنوی کی بنیاد رکھی، معلوم نہیں میر کی طبیعت میں سوز و گداز فطری تھا یا حالات اور ماحول کے زیر اثر اُن کی مسلسل محرومی اور ناکامی نے انہیں متشائم (Pessimist) بنا دیا تھا اور دِل میں وہ چیز پیدا ہوگئی تھی، جسے شیفتہ "صداء آہ دردناک"، اثرؔ "خستگی و بہ شستگی" اور مجنوںؔ گورکھپوری "دل خراشی و جگر سوزی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ چیز اِن میں کچھ اس طرح رَس بس گئی تھی کہ ہم اسے، ان کی فطرت ہی قرار دے دیں تو بے جا نہ ہوگا۔ مِل (Mill) کا یہ قول اگر صحیح ہے کہ:۔

"دراصل شاعری عزلت گزینی اور گوشہ نشینی کا نتیجہ ہے"

تو ماننا پڑتا ہے کہ اسی چیز نے میرؔ کو وہاں پہنچا دیا تھا جہاں کا تصور بھی تخیل کی دسترس سے باہر ہے مگر یہ چیز ان کے کلام کی ہر صنف میں داخل نہیں بلکہ صرف "غزل" میں کار فرما ہے یا زیادہ سے زیادہ عشقیہ مثنویوں میں۔ ایسا ہونا ناگزیر تھا اس لئے کہ جذباتِ انسانی میں سب سے زیادہ ہمہ گیر اور با اثر جذبہ "عشق" کا ہے اور تاثراتِ عشق یا وارداتِ قلب کو بیان کرنے، دل کی حقیقی کیفیتوں کا جائزہ لے کر قلم سے اس کی تصویر کاغذ پر اُتارنے یا نفسیاتِ عشق کو الفاظ میں ظاہر کرنے کا جیسا سلیقہ اور ڈھنگ میرؔ کو تھا ویسا کسی کو نہ تھا۔ انگریزی زبان میں میرؔ کی اس خصوصیت کا مقابلہ کرنے والا بجز "سر فلپ سڈنی" کے اور کوئی نظر نہیں آتا۔

میر نے عشقیہ مثنویاں چھ لکھی ہیں مگر مجھے اُن چھ میں سے یہاں صرف ایک مثنوی کا ذکر مقصود ہے جس کا عنوان "حکایتِ عشق" ہے۔ اس میں ایک "افغاں پسر" کی داستانِ عشق نظم کی گئی ہے۔ ذرا اس "افغاں پسر" کی داستان "حسن و ایماں" ملاحظہ ہو۔ میر صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

جواں خوش تھا پُر کار و پرہیزگار — بہت حسن کا اس کے واں اشتہار
تناسب بہت اس کے اعضا کے خُوب — سراپا میں دیکھو تو ہر جا سے خُوب
خوش اندام و خوش رو و پاکیزہ خُو — کسی وقت رہتا نہ تھا بے وضو
رہے محو پاکیزگی و صلوات — نہ ہو ترک سہواً کبھی واجبات
اگر ہو وے حورِ بہشتی دو چار — وہ در پئے حسن اُس کے ڈھونڈے کنار
وگر آگے سے ہو پری کا گذر — حیا سے نہ اس پر کرے ٹک نظر
جوانی کا ہنگام طاعت کا صرف — لبِ سرخ پر دلبروں کا نہ حرف

مگر با ایں ہمہ زہد و اتقا آخر کار وہ اپنا دامن عشق سے نہ بچا سکا۔ خود تو کسی کا گرویدہ نہ ہوا مگر ایک شوہر دار حسین عورت اس کو اپنا دِل دے بیٹھی۔

یہ مثنوی اگر آج کل پیش ہوتی تو کہہ دیا جاتا کہ میرؔ نے اس کا پلاٹ روسی فسانہ نگار ٹالسٹائی کے فسانے سے چرایا ہے۔ دونوں فسانوں کی بنیاد ملتی جلتی سی ہے۔ جس طرح میرؔ کی مثنوی کی ہیروئن "شادی شدہ خاتون" ہے اسی طرح ٹالسٹائی کی ہیروئن "اینا کرینینا" بیاہی ہوئی عورت ہے۔ جس طرح میرؔ کا ہیرو "افغاں پسر" جذبۂ حسن و عشق سے بے خبر ہے اسی طرح ٹالسٹائی کا ہیرو "وارنسکی" الھڑ ہے۔ جس طرح میرؔ کی ہیروئن خاموش عشق کرتی ہے مگر آخر میں بے چین ہوکر کھُل جاتی ہے اسی طرح ٹالسٹائی کی ہیروئن چپکے چپکے آتشِ عشق میں جلتی ہے مگر آخر میں بے قرار ہوکر باؤلی ہو جاتی ہے۔

میں "عشقِ حقیقی" کا قائل نہیں یعنی میں ایسے عشق کا وجود تسلیم نہیں کرتا جس میں جسدی تلذذ اور جسمانی مزے داریوں کا جذبہ موجود نہ ہو مگر یہ دونوں افسانے کچھ ایسے انداز میں پیش کئے گئے ہیں جو صریحاً میرے اس نظریہ کی تکذیب کرتا ہے ان دونوں فسانوں میں اُسی "خاموش عشق" کو پیش کیا گیا ہے۔ جس کے متعلق غالبؔ کہہ گیا ہے کہ:۔

ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم — باوجودیکہ جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں

ان دونوں فسانوں میں جہاں عشق کی سچی کرامتیں دکھائی دیتی ہیں وہاں عاشق و معشوق دونوں کی عصمت مآبی، پاکیزگی اور وفاداری کے جوہر آتے ہیں۔ ان دونوں افسانوں کے پڑھنے سے ماننا پڑتا ہے کہ عشق "ہوس" کا نام نہیں اور عشق "اضطرابِ وصل" کو نہیں کہتے بلکہ یہ وہ جذبہ ہے جو ایک متقی اور ایک عصمت مآب شوہر دار خاتون کو ایک زنجیر میں جکڑ دینے کے بعد بھی ان کے دامن کو ہر طرح کی آلودگیوں سے پاک رکھتا اور رکھ سکتا ہے۔ انہیں دونوں افسانوں میں سچ پوچھئے تو غالب کے اس شعر کی بھی حقیقت نمایاں ہوتی ہے کہ: ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب — کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

"ورانسکی" کو چھوڑ دیئے کہ وہ میرا موضوع نہیں ہے۔ صرف "افغان پسر" کو لیجئے۔ وہ محبت کی جاذبیتوں سے بے پروا تھا، صوفی پاکباز تھا، حسن و عشق کے جھگڑوں سے آزاد تھا مگر پھر بھی آدمی ہی تھا اس لئے "عشق" کا شکار ہو گیا۔ اس کے سینے میں بھی دل تھا پتھر نہ تھا۔ وہ نارسی سس[1] نہ تھا جو اپنی جگہ اٹل رہتا لہذا جب عشق نے گرمی دکھائی تو یہ لوہا بھی پگھل ہی گیا مگر ہو کیا سکتا تھا۔ عورت شوہر دار تھی نفس کی مغلوب نہ تھی جو محبت کی باتیں اور وصل کی گھاتیں ہوتیں۔ دونوں بے لوث اور پاکباز تھے لہذا اپنی اپنی جگہ مجبور اور بے بس اس آگ میں پڑے جل رہے تھے۔ آخر کار قدرت نے اس کا فیصلہ کر دیا۔ عورت کا شوہر اتفاقاً مر گیا۔ جذبۂ شوہر پرستی کہئے یا سماجی پابندیاں۔ عشق کی دل خراشیوں سے گلو خلاصی کا طریقہ کہئے یا رسم و رواج کا نباہ۔ عورت "ستی" ہونے کے لئے شوہر کی لاش کے ساتھ چلی مگر مڑ مڑ کر پیچھے دیکھ لیتی تھی کہ شاید اس آخری وقت میں دیدارِ یار بھی میسر آجائے۔ اتفاقاً "افغان پسر" کو بھی اس کی خبر ہو گئی وہ اس خبر کو سن کر تاب نہ لاسکا۔ اور جذبۂ الفت سے بے بس ہو کر افتاں و خیزاں دریا کنارے پہنچ گیا مگر آہ آگ مردہ اور زندہ دونوں کو اپنی آغوش میں لے چکی تھی۔ اچانک عورت کی نظر "افغان پسر" پر پڑ گئی اور جب دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو عورت نے ایک دل فریب مسکراہٹ کے ساتھ: ؎

کہا آئے ہو تو چلے آؤ تم — شتابی کرو جو ہمیں پاؤ تم

"افغان پسر" بھی عشق کا مارا تھا لہذا تڑپ اٹھا اور: ؎

یہ بے تاب ہو آگ پر جھپڑا — پتنگا سا اس آگ پر گر پڑا

مگر چوں کہ: ؎

چلے آئے تھے کتنے انصار ساتھ — وہیں کھینچ لائے اُسے ہاتھوں ہاتھ

اور ایک درخت کے نیچے لٹا دیا۔ یہ اِدھر تڑپنے لگا اور وہ اُدھر جل کے خاک ہو گئی۔ مگر کچھ دیر کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ راکھ کے ڈھیر سے "عورت" نکل کر "افغان پسر" کے پاس پہنچ گئی اور بے ہوش نوجواں کو: ؎

اُسی ناز و انداز و خوبی کے ساتھ — اُٹھایا اُسے ہاتھ میں لے کے ہاتھ
گئے اس طرف لے جدھر تھی چلی — نظر کرتے تھے واقعی یہ سبھی
ہوئے جاتے جاتے نظر سے نہاں — گیا عشق کیا جانے لے کر کہاں

میر کی عشقیہ مثنویوں میں درد اور کسک کا یقیناً ایک بے پناہ طوفان پنہاں ہے۔ جو اثر کئے بغیر نہیں رہتا اور نہیں رہ سکتا لیکن ان کا ایسا اختتام افسوس ہے کہ تمام پیدا شدہ اثرات کو اپنے خلافِ عقل ہونے کی وجہ سے کھو بیٹھتا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ اُس وقت کی داستان گوئی اور فسانہ نگاری ایسی ڈگر پر چل رہی تھی اور ممکن ہے کہ میر اس سے الگ رہتے تو لوگ ان کی مثنویوں کو اپنی ٹھوکروں میں رکھ لیتے مگر پھر بھی میر ایسا کرنے پر مجبور نہ تھے۔ آخر کس بات میں انہوں نے عوام کا لحاظ کیا؟ نیز انہوں نے اپنی آپ بیتی مثنویوں میں اس طرح کی خلافِ عقل چیزیں کہاں داخل کی ہیں؟ بہرکیف اس نقص کے باوجود میرا خیال ہے کہ میر کی عشقیہ مثنویاں سب ہی قابلِ تعریف ہیں اور ان سب میں بہتر یہ مثنوی ہے۔ صرف ان سب میں نہیں بلکہ اس کی داخلی حیثیت اسے اُردو کی ہزاروں مثنویوں سے علیحدہ اور بلند تر کرتی ہے۔

---

[1] نارسی سس ایک خوش رو یونانی نوجوان تھا جس پر ایک پری عاشق ہو گئی تھی مگر چوں کہ وہ عشق سے قطعاً غیر متاثر تھا لہذا اس نے پری کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ پری اس غم میں گھل گھل کر مر گئی۔ یونانیوں کے عقیدے کے مطابق انتقام کی دیوی نے اس بے توجہی کی سزا نوجوان کو یہ دی کہ اس کو ایک چشمے میں اپنی شکل دیکھنے پر مجبور کیا۔ نارسی سس چشمۂ آب میں اپنی حسین شکل دیکھ کر آپ اپنا فریفتہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ اپنی جان تک گنوا بیٹھا اور اس صورت سے پری کی بے تاب روح نے تسکین پائی۔

عطاء اللہ پالوی

محبّت کی موت

بجھ چلی شمعِ شبستانِ حیات

آخری بار سنبھالا بھی لیا تھا اس نے

ہو چلی تھی مرے احساس میں شدّت پیدا

میرے کچلے ہوئے روندے ہوئے ارمانوں سے

اور جذبات کے ڈھائے ہوئے ایوانوں سے

کوئی آتا ہوا معلوم سا ہوتا تھا مجھے

دھیمی دھیمی سی میں سنتا تھا کسی کی آہٹ

نُور سا دُور افق پر نظر آتا تھا مجھے

اور تصوّر کے جھروکے سے کبھی

آس کی کوئی لرزتی ہوئی دھُندلی سی کرن

زیست کے کلبۂ تاریک میں آجاتی تھی

اب مگر

بجھ چکی شمعِ شبستانِ حیات

م۔ا۔ کلیم

اصغر کی یادمیں

آج اُداسی کا دن ہے!
دو سال ہوئے آج کے دن
آہ آج کے دن!
وہ ہمارا چاند!
ہم سے ہزاروں کوس دُور، پردیس میں
ایک دریا کی لہروں کے اندر
ڈوب گیا!
ہماری مطمئن زندگی پر،
ناشکری مطمئن زندگی پہ
بجلی گری!
ہمیں معلوم ہوا کہ دُنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے!
پردے ہماری نگاہوں سے اُٹھ گئے،
ہم نے ایک جھلک سی دیکھی!
پھر دن آئے اور راتیں،
روشن دن اور تاریک راتیں،
صبح ہوئی اور شام
اور عمر یونہی تمام ہوتی گئی!
ایک برس گذر گیا اور وہی دن آیا
سمندر کے کنارے،
سمندر جس کے ہاتھ سونپا تھا اُسے،
سمندر پر ایک کرن سی چمکی!
پھر دن آئے اور راتیں:
کام اور آرام دُکھ اور سُکھ،
آئے اور چلے گئے، آئے اور چلے گئے!
دو سال ہو گئے، پھر وہی دن آیا کشمیر میں،
وہی دن اُداس، پاکیزہ، کشمیر کی طرح حسین، دل گیر!
اُس کی صبح سوتوں کو جگانے والی، شام جاگتوں کو سُلانے والی،
لیکن شام ہوئی کہ دل میں ایک بھونچال سا آیا! ——
دو سال!!

۲۴ مئی ۴۲ء
سنوار باغ، سری نگر

ب ل

محفلِ ادب

مرزا غالبؔ کے دو غیر مطبوعہ خط

[ذیل میں ہم مرزا غالبؔ کے دو غیر مطبوعہ خط نقل کرتے ہیں جو ہمیں حال میں دستیاب ہوئے ہیں۔ پہلا خط ایک خط کے جواب میں ہے جس کے لکھنے والے کوئی صاحب عبدالحق ہیں۔ پہلے ہم وہ خط لکھتے ہیں اور اس کے بعد مرزا صاحب کا جواب۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ درخواست ملکۂ معظمہ کے نام ہے اور اس لئے بحث تذکیر و تانیث کی آپڑی ہے۔ دوسرا خط کسی شہزادے کی شادی کے متعلق ہے۔ ممکن ہے کہ شہزادہ جواں بخت کی شادی سے تعلق رکھتا ہو جس کے لئے مرزا صاحب نے سہرا لکھا تھا۔ یہ دونوں خط ہنگامۂ ۱۸۵۷ء سے پہلے کے معلوم ہوتے ہیں۔ ایڈیٹر]

بنام مرزا صاحب

قبلہ و کعبہ۔ جو حکم حضور کا۔ دو تین دن میں دے دیں گے۔ اے حضرت وہ سطر تو کاغذ افشاں پر لکھ چکے اب کیا ہوگا۔ عجب کی بات ہے کہ جو دیکھے گا ہنسے گا اور دوسری بات یہ ہے سلطانہا یا سلطانہ کے کیا معنی۔ چاہیے سلطنتہا یا سلطنتہ، خوب غور فرمائیے میری عرض پر اور جواب اس کا عنایت فرمائیے۔ والتسلیم۔ عبدالحق۔

جواب مرزا صاحب کا

نہ عیانی یہ نہ مجہول سلطان بمعنی مصدر آتا ہے سلطنت اگرچہ من حیث القیاس صحیح ہے لیکن ٹکسال باہر ہے خلد اللہ ملکہ و سلطانہ لکھتے ہیں منشیانِ ایران و روم و ہند سب یوں ہی لکھتے آئے ہیں۔ ضمان بھی بمعنی ضامن اور بھی بمعنی ضمانت، سلطان بھی بمعنی بادشاہ اور بھی بمعنی سلطنت، اس میں کچھ تامل نہ کرو کس کی مجال ہے جو اس پر ہنس سکے لیکن ملکہ و سلطانہ نہ علامت تذکیر ہے اگر ملکہا و سلطانہا بن جائے تو بہتر ہے ورنہ خیر یوں ہی رہنے دو ہم سے کوئی پوچھے گا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ بہ رعایتِ شکوہِ سلطنت ہم نے تانیث کی رعایت نہ کی۔ اور سچ تو یوں ہے کہ اگر کاتب سگھڑ ہو تو ہائے ہوز کا شوشہ مٹا دینا اور الف بنا دینا دشوار نہیں ہے بن سکے تو بنوا دو اور سلطانہا کو خدا کے واسطے مت بدلنا یہ بلغائے عرب و عجم کا قرار داد ہے۔ بعد اس سب تقریر کے یہ عرض ہے کہ پرسوں پنجشنبہ کو عرضی لکھی ہوئی میرے پاس آجائے ۱۲

غالبؔ ۱۲

دوسرا خط

جناب عالی یہ خط فتح پور سے آپ کے نام آیا ہے۔ میں اس وقت حاضر نہ ہو سکا خط پہنچتا ہے اس کو ملاحظہ کر کے جب اس کا جواب مجھ کو دیجئے گا تو میں فتح پور کو روانہ کروں گا۔

شادی بادشاہ کے فرزند ارجمند کی اور بزم گاہ دیوانِ خاص۔ رقعے لکھے جائیں گے صمصام الدولہ کی طرف سے۔ صمصام الدولہ امیر ہیں اور امرا باہم اگر طریقۂ فروتنی کا سلوک رکھتے ہیں یعنی تشریف لائیے اور ہم کو ممنون کیجئے۔ پس اب میں رقعے کی عبارت میں کیا الفاظ صرف کروں۔ تشریف شریف اور قدومِ میمنت لزوم کو دیوانِ خاص سے مباعدتِ محض اور بہر دائی صمصام الدولہ اگر شہزادے اور دیوانِ خاص کے لائق الفاظ لکھے جاویں تو حضرتِ مکتوب الیہ بُرا مانیں گے کہ ہم کو صمصام الدولہ نے کیا لکھا ہے اور اگر متواضعانہ عبارت لکھی جاوے تو کسرِ شانِ سلطنت ہے اب آپ مجھ کو ہدایت کیجئے کہ نگارش کا کیا انداز ہو۔ والسلام اسد اللہ

"اردو"

آہِ صبح گاہی

تری زندگی پہ جب تک نہ لہو سے ہو گواہی — نہ ہے سود تاج شاہی نہ زیاں نمد کلاہی
تری زیست سر بہ زانو مری زیست سر بہ خنجر — ترا کیش خانقاہی مرا ذوق بادشاہی

اسی شبنم و صبا سے یہ چمن ہرا بھرا ہے — کوئی گریۂ شبانہ، کوئی آہِ صبح گاہی
ملی شیخ کو کہاں سے رہ و رسمِ فرقہ سازی — نہ یہ سنّتِ الٰہی، نہ طریقِ خانقاہی
ہے خودی بجز خدا کے نہ جھکے کسی کے آگے — نہ نیاز و گلہ پوشی، نہ طرازِ کج کلاہی
تری بخششوں کے صدقے مجھے کیا بھلا ملا ہے — کہیں رنجِ مرگِ ناگہ، کہیں دردِ زیست کاہی
کوئی پوچھے قضا سے کہ فرنگ کیوں ہے باقی — نہ یہ سایۂ الٰہی، نہ زہی جہاں پناہی
صفیں لشکرِ بلا کی نظر آئیں کیوں نہ برہم — اُٹھے دردمند دل سے اگر آہِ صبح گاہی

تری رحمتوں کے بادل کبھی کھل کے کیوں نہ برسے
ابھی تشنہ لب پڑی ہے مری کشتِ پُر گناہی

غلام رسول مہر — "حمایتِ اسلام"

ایک بہرے کا روزنامچہ

صبح پانچ بجے آنکھ کھلی۔ کوئٹہ میں سردی کافی ہے۔ اس لئے اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ مگر کیا کروں۔ غلامی آخر غلامی ہی ہے۔ صاحب کو صبح ساڑھے پانچ بجے چائے چاہیئے۔ یہ کم بخت آٹھ بجے تک تو پلنگ نہیں چھوڑتا۔ سویا رہتا ہے۔ مگر ہماری مصیبت کہ صبح ٹھیک ساڑھے پانچ بجے چائے دو۔ میں نے چائے تیار کی۔ دو ٹوسٹ ایک سنگترہ۔ اور انگریزی کا اخبار۔ جو صبح پانچ بجے ہماری کوٹھی پر پہنچ جاتا ہے لے کر صاحب کے کمرے میں گیا وہاں جا کر آہستہ سے دروازہ کو کھٹکھٹایا۔ پہلے تو صاحب بولے نہیں۔ پھر دوبارہ کھٹکھٹایا تو صاحب نے جواب دیا "کم اِن" اس جواب کے بعد میں اندر گیا۔ اندر جاتے ہی "حضور سلام" کہا اور چائے و اخبار چھوٹی میز پر رکھ کر واپس چلا آیا۔ اس کے بعد اسی طرح سے چائے ٹوسٹ سنگترہ اور اخبار لے کر میم صاحبہ کے کمرہ پر گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ میم صاحبہ جاگ رہی تھیں "کم اِن" کہا۔ اندر گیا "حضور سلام" کہا۔ چائے اور اخبار رکھا اور واپس چلا آیا۔

چائے دینے کے بعد گرم پانی کے لئے ٹین آگ پر رکھے کیوں کہ صاحب آٹھ بجے غسل کریں گے۔ غسل کیا خاک کریں گے۔ صابن سے ہاتھ۔ منہ۔ گردن وغیرہ دھو لیتے ہیں اور شام کو نہاتے ہیں۔ جب کہ ڈنر کی تیاری ہو۔

پانی کے ٹین چولھے پر رکھنے کے بعد میں بازار گیا وہاں سے کوئلہ۔ سبزی۔ گوشت۔ مچھلی۔ انڈے اور مرغی لایا۔ تمام سامان ساڑھے چار روپے کا ہے اس میں سے ایک روپیہ مجھے کمیشن ملا۔ یہ کمیشن میں نے دکاندار سے ٹھہرا رکھا ہے اس میں سے آٹھ آنے خانساماں کو دوں گا۔ کیوں کہ وہ سامان خریدے تو کمیشن میں سے مجھے بھی حصہ دیتا ہے۔

کوٹھی پر پہنچ کر آٹھ آنے خانساماں کو دئے۔ بل میم صاحب کے پاس لے گیا جو دکاندار سے لایا ہوں میم صاحب نے بل دیکھ کر رکھ لیا۔ اور کہا کہ "ولی آج ٹماٹر کل سے زیادہ پیسہ کا ہے"۔ میں نے جواب دیا "حضور۔ برف پڑنے کے باعث ٹماٹر کا فصل خراب ہوگیا اور مارکیٹ میں باہر سے آتا نہیں۔

آٹھ بجے صاحب اور میم صاحبہ کے لئے غسل تیار کیا۔ پہننے کے کپڑے نکالے۔ بوٹ پالش کئے۔ غسل خانہ سے فارغ ہوا تھا۔ کہ درزی آیا۔ جو میم صاحبہ کے کپڑے تیار کرتا ہے اس کا اڑتالیس روپے کا بل ہے۔ اس سے چار روپیہ کمیشن کا فیصلہ ہوا۔ میم صاحبہ جب غسل کر چکیں اور آیا نے کپڑے پہنا دئے تو میں نے بل لے کر میم صاحبہ کے پاس گیا اور کہا۔ کہ حضور۔ یہ درزی کئی بار آچکا ہے۔ حضور مصروف تھیں۔ میں نے حضور کو اطلاع نہیں کی۔ یہ بل لایا ہے۔ میم صاحبہ ناراض ہو کر بولیں کہ کیوں اطلاع نہیں کی۔ درزی کو خواہ مخواہ اتنی بار آنا پڑا۔ میم صاحبہ نے فوراً اڑتالیس روپیہ کا چیک کاٹ دیا۔ میں یہ چیک لے کر درزی کے پاس گیا۔ جو باورچی خانہ کے برآمدہ میں بیٹھا تھا چیک دے دیا اور چار روپے اس سے لے لئے۔ اگر یہ مجھے کمیشن کے چار روپے نہ دیتا تو ایک ماہ تک اس کو میم صاحبہ کے سامنے پیش نہ ہونے دیتا اور کپڑوں میں نقائص نکال کر بل میں سے کئی روپے کٹوا دیتا۔

ٹھیک نو بجے صاحب اور میم صاحبہ کھانے کے کمرہ میں آئے۔ میں نے پہلے پارج یعنی دلیا دیا۔ پھر مچھلی دی۔ پھر فرائی انڈے اور بیکن دیا۔ اور چائے۔ ہمارے صاحب اس وقت صرف یہی کھاتے ہیں۔ ساڑھے نو بجے کھانے سے فارغ ہو گئے۔ چند منٹ ڈرائنگ روم میں بیٹھے۔ پھر موٹر میں دفتر تشریف لے گئے ہمارے صاحب ملٹری میں میجر ہیں۔ اور ایک ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے ہیں۔

دس بجے ایک دوسرے بہرہ احمد علی ملنے کے لئے آئے۔ میرے کئی برس کے دوست ہیں۔ ہم دونوں کرنل مارشل کے پاس اکٹھے تھے۔ اس نے پوچھا کہ میں آج کل یہاں کیا تنخواہ پاتا ہوں۔ میں نے جواب دیا بیس روپیہ خشک۔ اس نے کہا۔ ایک ہندوستانی انجینئر ابھی بدل کر کوئٹہ آئے ہیں۔ ان کو ایک بہرہ کی ضرورت ہے۔ پچیس روپیہ اور کھانا دیں گے۔ اگر میں چاہوں تو وہاں نوکری کر لوں میں نے جواب دیا۔ ہندوستانی صاحب تو اگر مجھے پچاس روپیہ اور کھانا دے۔ تو میں پھر بھی نہ کروں یہ لوگ ایک پیسہ کمیشن نہیں کھانے دیتے۔ ان کی میم صاحبہ تمام دن باورچی خانہ میں سر پر سوار رہتی ہیں۔ گھی کہاں گیا اور مرغی کے اتنے پیسے کیوں خرچ کئے اور کوئلہ اتنا مہنگا کیوں ہے۔ دو سال ہوئے میں مسٹر راما سول سرجن کے ہاں ملازم تھا۔ ان کی میم صاحبہ ہندوستانی تھیں۔ کمیشن کا ایک پیسہ حرام جو لینے دیتیں۔ دن بھر باورچی خانہ کی نگرانی۔ سامان لینے ساتھ جاتیں۔ چار جگہ سے پوچھ کر خریدتیں۔ میں تو ایک مہینہ میں ہی تنگ آ گیا۔ اور نوکری چھوڑ دی۔ تم تو پچیس روپیہ اور کھانا کہتے ہو۔ یہاں مجھے بیشک بیس روپیہ خشک ملتے ہیں۔ مگر دو روپیہ روزانہ کمیشن میں نہیں چھوڑتا۔ میم صاحبہ ایسی اچھی ہیں کہ ایک ایک مہینہ باورچی خانہ میں نہیں جاتیں۔ ہندوستانی صاحب کے ہاں نوکری کرو تو کھانے کو صرف چار روٹیاں اور دال ملے۔ یہاں ہم لوگوں کا کھانا مقرر نہیں۔ مگر مچھلی۔ گوشت۔ کٹلس چائے۔ ٹوسٹ۔ مکھن سب چیز کھاتے ہیں۔ صاحب کو یا میم صاحبہ کو کیا پتہ ہے۔ کہ ہم کیا کرتے ہیں۔

گیارہ بجے نعیمن آیا مجھ سے ملنے کے لئے آئیں۔ یہ میری دوست ہیں۔ ہم دونوں اکٹھے میجر ٹامسن کے ہاں ملازم تھے۔ اس نے بتایا۔ کہ یہ آج کل خالی ہے۔ کیوں کہ اس کے صاحب اور میم ولایت چلے گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں اس کی ملازمت کا انتظام کر دوں گا۔ خانساماں تو کھانا پکانے میں مصروف ہے میں اس سے باتیں کرتا رہا۔

بارہ بجے میم صاحبہ نے مجھے چند خطوط دیئے۔ جن کو لے کر میں ڈاک خانہ میں پوسٹ کرنے گیا۔ راستہ میں شبراتی ہوٹل والے کے ہاں کچھ دیر ٹھہرا۔ یہ بھی میرا پرانا دوست ہے۔ اس نے بتایا۔ کہ اس کا زلزلہ میں سب کچھ تباہ ہو گیا تھا۔ اب اس کا کام پھر اچھا ہے اس نے پنجاب کی ایک عورت سے شادی بھی کر لی ہے جس سے ایک بچہ ہے۔ ایک بجے واپس آیا۔ آنے کے بعد کھانے کی میز تیار کی۔ کیوں کہ صاحب ڈیڑھ بجے لنچ کے لئے آتے ہیں۔ ڈیڑھ بجے صاحب آئے میم صاحبہ اور صاحب نے کھانا کھایا۔ کھانے میں شوربہ۔ کٹلس مچھلی۔ چاول۔ کری اور پڈنگ ہے۔ ایک پلیٹ صاف نہ تھی۔ صاحب بہت بگڑے۔ میں نے کہا حضور میں ابھی دوسری صاف لاتا ہوں۔ بھاگا ہوا باورچی خانہ میں گیا۔ تو تمام پلیٹیں گندی تھیں۔ اور وہاں پانی بھی نہ تھا۔ کیوں کہ نل بند ہو چکا ہے۔ اب صاف کروں تو کیوں کر۔ میں نے جلدی سے پلیٹ میں تھوکا۔ اور اس گیلی گیلی کو جھاڑن سے رگڑا۔ بالکل صاف ہو گئی۔ بھاگ کر کھانے کے کمرہ میں آیا اور صاحب کے سامنے رکھی۔ صاحب کھانا کھا کر پھر دفتر چلے گئے۔ میم صاحبہ نے اپنے کمرہ میں جا کر پھر سلائی کا کام شروع کر دیا۔ یہ عورت دن رات بُنتی رہتی ہے۔ نہ معلوم اس کو اس سے کیا لطف آتا ہے۔ ہمارے ہاں کی عورتوں کو جب کام نہ ہو۔ آرام سے سو جاتی ہیں۔

صاحب شام کے چار بجے دفتر سے واپس آئے۔ چائے پی۔ صاحب کے چائے پینے کے بعد میں نے اور خانساماں نے چائے پی۔ دوپہر کو لنچ کے وقت جو کٹلس بنے تھے۔ بہت لذیذ تھے۔ یہ چائے والے سینڈوچ بھی اچھے تھے۔ مگر ہندوستانی پکوڑوں کی کیا بات ہے۔ صاحب کے لئے بھی کبھی کبھی بنواتا ہوں۔ مگر یہ کم بخت مرچوں کو پسند نہیں کرتا۔ حالانکہ مرچیں کھانے کی جان ہوتی ہیں۔

چائے پینے کے بعد صاحب شکار کے لئے چلے گئے چھ بجے واپس آئے۔ صاحب نے سات بجے غسل کیا۔ آٹھ بجے کھانے پر بیٹھے۔ آج ہمارے ہاں چھ مہمانوں کا ڈنر تھا۔ وسکی کی ڈیڑھ بوتل ختم ہو گئی۔ رات کے ساڑھے نو بجے تک یہ لوگ کھانے کی میز پر بیٹھے رہے۔ کھانے سے فارغ ہو کر بائیسکوپ گئے۔ میں آدھی بوتل وسکی کی جو بچی تھی باورچی خانہ میں لے آیا۔ میں اور خانساماں دونوں نے پی۔ اور کھانا کھایا۔ مچھلی بہت لذیذ ہے رات کو بارہ بجے صاحب اور میم صاحبہ آگئے۔ ان کو سونے کے کپڑے پہنائے اور "حضور سلام" کہہ کر واپس اپنے سرونٹ کوارٹر میں آ گیا۔ اب سوتا ہوں۔ صبح جاگنا ہوگا۔

"ریاست"

من مندر کی دیوی

وہ مست نظر، چال وہ اٹھلائی ہوئی سی — آنکھوں میں محبت کی چمک آئی ہوئی سی
بجلی وہ چمکتی ہوئی لہرائی ہوئی سی

لپٹا ہوا اک سُرمئی ساڑی میں بدن سب — جس طرح چھپا ہو کسی بادل میں چمن سب
جس طرح کلی کُنج میں شرمائی ہوئی سی

مندر میں وہ اُس کے رُخِ روشن سے اُجالا　　یا نُور کا چمکا ہے شوالے میں شوالا
اِک شمع ہے چمکی ہوئی چمکائی ہوئی سی۔

ملتے ہی نظر مجھ سے وہ چونکی ہوئی تصویر　　جس طرح اچانک ملے اِک خواب کی تعبیر
آنکھوں میں لگاوٹ لئے گھبرائی ہوئی سی

مندر کی فضاؤں میں ہے اِک برق سی مضطر　　محجوب اداؤں میں ہے اِک برق سی مضطر
لپٹی ہوئی، سمٹی ہوئی، تھرّائی ہوئی سی

ہنگامِ طوافِ آہوئے رَم خوردہ کا انداز　　بھٹکی ہوئی نظروں کا وہ بھٹکا ہوا انداز
وحشت پہ وہ شوخی کی ادا چھائی ہوئی سی

اندازِ پذیرائیِ اُلفت ہے حسیں اور　　پڑتا ہے کہیں پاؤں تو نظریں ہیں کہیں اور
کچھ کھوئی ہوئی چیز ہے کچھ پائی ہوئی سی

وہ چاند سے ٹکڑے پہ بکھرتے ہوئے گیسو　　قامت میں جوانی کا وہ چلتا ہوا جادو
ہر گام پہ جھومی ہوئی لہرائی ہوئی سی

پیغام نگاہوں کا مری غور سے پڑھنا　　افسانۂ ارمانِ دلی غور سے پڑھنا
ہونٹوں پہ کوئی راز کی بات آئی ہوئی سی

وہ کیفِ مسلسل ہے نہ وہ جلوۂ بے تاب　　اِک خواب تھا اِک خواب تھا اِک خواب تھا اِک خواب
تعبیر ہے تقدیر سے شرمائی ہوئی سی

پھرتی ہے نگاہوں میں مگر اب بھی وہ تصویر　　ہے دل میں ترازو ترا چھوڑا ہوا ہر تیر
سینے میں تمنائیں ہیں اترائی ہوئی سی

اب محوِ پرستش کبھی مندر میں کہاں تو　　مندر وہ ترا من میں ہے رہتی ہے جہاں تو
ہر صبحِ تخیّل پہ مرے چھائی ہوئی سی

"دین دنیا"　　فیاض الدین احمد خاں

دہلی کی جامع مسجد

(جو ۲۹ مئی جمعہ کی شام کو خواجہ صاحب نے سُنائی)

ہندوستان کا دل دلی ہے۔ اور دلی کا دل گوری گوری۔ لال لال جامع مسجد ہے۔ دیکھنا وہ جمنا دریا کے کنارے لال قلعہ گردن اونچی کر کے کس کو دیکھ رہا ہے کیا دلی کی پیاری جامع مسجد کو دیکھ رہا ہے لال قلعہ کو معلوم ہے کہ جب شہنشاہ شاہ جہاں نے ترکوں اور افغانوں کی دہلی کے سامنے ایک نئی دلی بسانی چاہی تو اس نے جمنا دریا کے کنارے ایک بڑی فصیل بنائی اور پھر لال قلعہ بنایا اور ایک جامع مسجد بھی بنائی جس زمانے میں جامع مسجد بن رہی تھی شاہ جہاں مٹیا محل میں رہتا تھا اور اس کے مصاحب کوچہ چیلاں میں رہتے تھے۔ چوں کہ مغل بادشاہوں کو مرشد اور گرو بھی کہا جاتا تھا اس لئے ان کے ذاتی نوکروں کو چیلہ کہا جاتا تھا۔ اور شاہ جہاں کے ذاتی نوکر یعنی چیلے جس جگہ رہتے تھے اس کو کوچہ چیلاں کہتے تھے اور مٹیا محل کو مٹیا محل اس واسطے کہا جاتا تھا کہ یہاں کچے اور مٹی کے بنے ہوئے مکانات تھے۔ جہاں بادشاہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ جب لال قلعہ تیار ہو گیا تو بادشاہ مٹیا محل سے اٹھ کر قلعہ میں چلے گئے اور اپنے میر عمارت کو حکم دیا کہ جامع مسجد جتنی جلدی ممکن ہو تیار ہو جانی چاہئے۔ میر عمارت ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑا ہوا اور ادب سے گردن جھکا کر کہا جہاں پناہ آپ کے اقبال سے جامع مسجد بالکل تیار ہو چکی ہے۔ اب تو پاڑ کھولنے کا کام باقی رہ گیا ہے جو ایک مہینہ میں کھلے گی۔ بادشاہ سلامت نے میر عمارت کی طرف دیکھا اور پھر اپنے وزیر کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا یہ کہتا ہے پاڑ ایک مہینہ میں کھلے گی۔ پاڑ باندھنے میں دیر لگتی ہے اس کا کھولنا تو بہت آسان ہے۔ وزیر نے ہاتھ جوڑ کر گذارش

کی پیرو مرشد نے بجا ارشاد فرمایا میر عمارت بہت جلد پاڑ کھلوا دیں گے۔ چوں کہ مسجد کے صحن میں بچے ہوئے ہزاروں پتھر رکھے ہیں اور ایک لاکھ بلیوں کی پاڑ ہے۔ جامع مسجد کی پشت پر سو قدم تک پاڑ بندھی ہوئی ہے اور اسی طرح شمال اور جنوب اور شرق میں بھی بہت دور تک بلیاں بندھی ہوئی ہیں ان کا کھولنا اور بلیوں کو وہاں سے ہٹانا اور صحن کے پتھروں کا باہر لے جانا یہ کام یقیناً بہت دیر کا ہے۔

مگر مثل مشہور ہے کہ راج ہٹ۔ تریا ہٹ۔ بالک ہٹ۔ یعنی بچوں میں بھی ضد ہوتی ہے عورتوں میں بھی ضد ہوتی ہے اور بادشاہ بھی ضد کیا کرتے ہیں۔ اس واسطے شاہ جہاں بادشاہ کو وزیر کی بات سن کر ضد پیدا ہوئی اور انہوں نے غصے کے لہجے میں فرمایا دیکھو آج بدھ ہے۔ پرسوں جمعہ کی نماز ہم نئی جامع مسجد میں پڑھیں گے وزیر نے بادشاہ کے تیور بگڑے ہوئے دیکھے تو وہ قدموں کی طرف جھکا اور اس نے ادب کے ساتھ عرض کی خدا حضور کے اقبال کو سلامت رکھے۔ فدوی ابھی انتظام کرتا ہے۔ جہاں پناہ پرسوں جمعہ کی نماز جامع مسجد میں ادا فرماسکیں گے۔ وزیر کی یہ بات سن کر ہنسی آگئی اور انہوں نے وزیر سے کہا ابھی تو کہتا تھا کہ مسجد کے چاروں طرف سو سو قدم تک ایک لاکھ بلیوں کی پاڑ بندھی ہوئی ہے اور سارا صحن پتھروں سے بھرا ہوا ہے اور ایک مہینہ سے پہلے صفائی نہیں ہوسکتی پھر تو کیوں کر پرسوں تک اس کو صاف کرا دے گا؟ وزیر نے بادشاہ کو خوش دیکھا تو یوں عرض کرنے لگا۔

از ہیبت شاہ جہاں لرزد زمین و آسماں

شاہ جہاں بادشاہ کی ہیبت سے زمین آسمان لرزتے ہیں۔

ظلِ سبحانی نے جو حکم دیا ہے اس حکم کی اتنی بڑی ہیبت ہے کہ پرسوں تک پاڑ کھل جائی اور پتھر صاف ہو جانے کچھ مشکل نہیں ہیں۔ بادشاہ نے فرمایا۔ اچھا۔ سارے شہر میں ہندو مسلمان رعایا کو اور ہماری فوج کے ہندو مسلمانوں کو اطلاع دے دو کہ ہم نے پاڑ کی بلیاں اور رسیاں اور بانس بچے ہوئے پتھران کو انعام میں بخش دیئے وہ آئیں اور جو چیز لے جا سکتے ہیں لے جائیں۔ یہ حکم سنتے ہی وزیر اور میر عمارت دونوں جھک گئے اور انہوں نے ادب کی زمین چومی اور عرض کی کہ بادشاہوں کی داد و دہش کے بہت سے قصے سنے ہیں مگر جو عطا اس وقت جہاں پناہ نے ظاہر فرمائی ہے اس کی مثال نہ پہلے کبھی سنی نہ آئندہ سننے میں آئے گی۔

چنانچہ سارے دلی شہر کے ہندو مسلمانوں اور فوج کے ہندو مسلمانوں میں ڈھنڈورے کے ذریعے شاہی فرمان پہنچا دیا گیا اور چھوٹے بڑے جوان عورت مرد جوق جوق آنے لگے۔ بدھ کی شام سے یہ لوٹ شروع ہوئی تھی۔ ساری رات جاری رہی اور جمعرات کی شام تک جاری رہی جمعرات کی شام کو میر عمارت نے اور وزیر نے جا کر دیکھا تو نہ کوئی پتھر باقی تھا نہ کوئی بلی باقی تھی نہ کوئی بانس باقی تھا۔ سب چیزیں رعایا کے ہندو مسلمان اپنے اپنے گھروں کو لے گئے تھے۔

جمعرات کی شام سے میر عمارت نے مسجد کو دھلوانا شروع کیا اور صبح تک دھلائی ختم ہوگئی۔ اور صبح سے جمعہ کی نماز کے وقت تک مسجد میں دریوں اور قالینوں کا فرش بچھ گیا اور صحن میں شامیانے لگ گئے اور بادشاہ سلامت نے مسجد میں آکر جمعہ کی نماز ادا فرمائی اور اس طرح دہلی کی جامع مسجد میں نماز کا افتتاح ہوا۔

پس دلی کے سب ہندو مسلمان اس جامع مسجد سے دلی محبت رکھتے ہیں اور اس کی حفاظت کو اپنا فرض سمجھتے ہیں اور اگر خدانخواستہ کسی دشمن نے اس کو نقصان پہنچانے کا ارادہ کیا تو سب ہندو مسلمان اس کی حفاظت کے لئے ایسے ہی ایک دل ہو جائیں گے جیسے کہ شاہ جہاں کے زمانے میں ایک دل ہو گئے تھے۔

"منادی" خواجہ حسن نظامی

رُباعیاتِ صہبائی

مرے قلب و نظر کو آگہی دے
جو تجھ کو پا سکے وہ بے خودی دے
اندھیرے پر اندھیرا چھا رہا ہے
الٰہی! روشنی دے! روشنی دے!!

مری آنکھوں کا تارا ہے ترا نام
مرے دل کا سہارا ہے ترا نام
جدا ہوتے نہیں اک دوسرے سے
لبوں کو اتنا پیارا ہے ترا نام

"ہماری زبان" اختر صہبائی

مطبوعات

نشریات یہ پروفیسر ہارون خاں شروانی (عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن) کی اُن تقریروں کا مجموعہ ہے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً حیدر آباد کی نشرگاہ سے نشر کیں۔

بعض تقریروں کے عنوان یہ ہیں۔ چین کا تمدن، بین الاقوامی سیاسیات، زلزلۂ اناطولیہ، روزہ، اڈریانوپل اور ترکی، عالمی وفاق کا مسئلہ، سیاسیات اور اُردو زبان وغیرہ مضامین پُر از معلومات ہیں اور زبان اور اندازِ بیان اچھا ہے۔ قیمت عہ

پتا:- سید عبدالقادر اینڈ سنز تاجران کتب چارمینار حیدر آباد دکن۔

جواہر العلوم علامہ طنطاوی جوہری مصری کی عربی کتاب جواہر العلوم کا سلیس اور بامحاورہ ترجمہ از مولانا عبدالرحیم صاحب مولوی فاضل پروفیسر عربی اسلامیہ کالج پشاور۔ کتاب مشہور ہے اور ترجمہ بہت اچھا ہے۔ حجم ۲۱۱ صفحات۔ بڑی تقطیع۔ قیمت ع

پتا:- کتابستان۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۶۴ بمبئی نمبر ۳

۱۔ شانِ خدا
۲۔ محمد رسول اللہ
پہلی کتاب میں وجودِ خالق کے تمام نظریوں پر جدید علم کلام اور سائنس کی روشنی میں بحث کی گئی ہے اور خدا کی ہستی کو ثابت کیا گیا ہے۔ دوسری کتاب کارلائل کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ کارلائل کی جس کتاب سے یہ ترجمہ لیا گیا ہے بہت مشہور ہے۔ اوپر کی دونوں کتابوں کے مؤلف اور مترجم مولانا عبیدالرحمان عاقل رحمانی ہیں۔ ہر مسلمان کو ان کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

پتا: کتابستان۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۶۴ بمبئی نمبر ۳

کشمش نانی ادارہ ادبیاتِ اُردو نے بچوں کی کہانیوں کے سلسلے میں یہ دل چسپ اور مفید کتاب شائع کی ہے۔ بچوں کی دل چسپی کی بہت اچھی کہانیاں ہیں۔ کہانیوں کے اس سلسلے کی نگراں محترمہ رقیہ بیگم صاحبہ بی۔ اے (کینٹب) پرنسپل کلیۂ اناث جامعہ عثمانیہ ہیں۔ اس کتاب کی قیمت دس آنے اور حجم ۸۷ صفحات ہے۔ پتا:- ادارۂ ادبیاتِ اُردو۔ حیدر آباد دکن

گارساں دتاسی اور اس کے ہمعصر بہی خواہانِ اُردو اُردو کے پہلے پروفیسر اور فرانس کے مشہور مستشرق گارساں دتاسی کے علمی و ادبی کارناموں، طریقۂ تعلیم، تلامذہ، کتب خانے، اُردو کی حمایت و تبلیغ کی کوشش، اُس کے عہد کی یورپی درسگاہوں اور اردو کے پروفیسروں اور بہی خواہوں پر اجمالی تبصرہ از ڈاکٹر محی الدین قادری زور ایم۔ اے پی ایچ۔ ڈی (لنڈن) کتاب پڑھنے کے قابل ہے۔ قیمت عہ

پتا:- سب رس کتاب گھر۔ حیدر آباد دکن۔

ادارۂ ادبیاتِ اُردو سنہ ۱۹۴۱ء میں یہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو حیدر آباد دکن کے کام کی سالانہ رپورٹ ہے۔ ارکانِ ادارہ جس جوش اور سچے انہماک سے اُردو زبان کی عملی خدمت کر رہے ہیں وہ اس بات کی متقاضی ہے کہ اہلِ اُردو اس ادارہ کی بیش از بیش سرپرستی کریں اور اس کی مفید کتابوں کی خریداری اور اُن کی نشر و اشاعت میں خاص حصہ لیں۔

گلچیں یہ حکیم نور احمد خاں گلچیں کا مجموعۂ کلام ہے۔ زیادہ تر نظمیں قومی اور ملی ہیں۔ حکیم صاحب کے اشعار میں جوش اور درد کی کمی نہیں۔ قیمت ۸ر

پتا:- اُردو اکیڈمی۔ لاہور

شیخ و برہمن اور دوسرے افسانے یہ مشہور افسانہ نگار ڈاکٹر اعظم کریوی کے سولہ دلکش افسانوں کا مجموعہ ہے جو ۱۳۱ صفحے کی ایک دیدہ زیب کتاب کی صورت میں مجلد شائع ہوا ہے۔ "یہ کہانیاں دہات کے ہندو مسلمانوں کی اس یکجہتی کا آئینہ دار ہیں جو اب تک شیخ و برہمن کی آویزشوں سے آلودہ نہیں ہو سکی"

پتا:- کتب خانہ دانش محل۔ امین آباد پارک لکھنؤ۔

تسہیل الترتیل تلاوتِ قرآن کے متعلق ترتیل کی عام فہم تشریح مؤلفہ الحاج سراج الدین محمد الیاس برنی صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل بی (علیگ)

یہ کتاب بہت ضروری معلومات پر مشتمل ہے۔ مسلمانوں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی جو کے مسائل سے دلچسپی رکھتے ہیں اس کتاب سے بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ مسلمانوں کے لئے اس کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ حجم ۶۸ صفحات قیمت ۱۲ر

پتا:- پروفیسر محمد الیاس برنی صاحب عثمانیہ یونیورسٹی (شعبۂ اقتصادیات) حیدرآباد دکن۔

دُرِ دانہ یہ آنسہ محمودہ صاحبہ رضویہ کے مختصر لطیف مضامین کا مجموعہ ہے جسے ایس جی کاروانی صاحب ایم۔اے نے مرتب کیا ہے۔ حجم ۴۹ صفحات قیمت ۴ر

پتا:- انجمن ترقی اُردو رام باغ کراچی۔

مشغلے از سید وقار احسن صاحب۔ یہ کتاب نوجوان تعلیم یافتہ لڑکوں کے لئے اس خیال سے لکھی گئی ہے کہ وہ دورانِ تعلیم میں یہ طے کریں کہ تعلیم کے بعد انہیں کون سا مشغلہ اختیار کرنا ہے۔ اس کتاب میں حسبِ ذیل مشاغل کے متعلق نہایت دلچسپ انداز میں معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں:- سول سروس، کونسل کی ممبری، جہازرانی، تجارت، وکالت، ڈاکٹری، انجنیئری، صحافت، معلمی، قومی خدمت، زمینداری اور ہوابازی۔ احسن صاحب کی یہ جدت بہت قابلِ قدر ہے۔ انہوں نے یہ کتاب لکھ کر قوم کے نوجوانوں کی بہترین خدمت انجام دی ہے۔ قیمت ۱۲ر

پتا:- جعفری برادرز الہ آباد (یو۔پی)

ہندوستانیوں کی مختصر تاریخ مصنفہ ایچ۔ جی۔ رالنسن، سی۔ آئی۔ ای۔ ایم۔اے۔ فیلو آف ہسٹاریکل سوسائٹی۔ آئی۔ ای۔ ایس (ریٹائرڈ) مترجمہ و مرتبہ مسٹر پولچند ایم۔اے۔ پی ایچ۔ ڈی (لنڈن) پروفیسر سیاسیات بنارس ہندو یونیورسٹی۔

عام تاریخوں میں ملک کے لوگوں کی تاریخ بہت کم بیان کی جاتی ہے اس کتاب میں یہ خوبی ہے کہ اس میں جہاں سلطنتوں اور بادشاہوں کے حالات ملتے ہیں وہاں ہندوستان میں رہنے والوں کے تہذیب و تمدن اور دیگر حالات پر بھی قابلِ قدر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ تاریخ اس قابل ہے کہ مدارس کے نصابِ تعلیم میں شامل کی جائے۔ حجم ۷۶۴ صفحات سے زائد۔ قیمت مجلد ۶ر

پتا:- آکسفورڈ یونیورسٹی پریس بمبئی۔

لائبریری اور اس کی تنظیم مصنفہ سید سجاد حسین صاحب رضوی ڈی۔ ایل۔ ایس۔ سی۔ لائبریرین میرٹھ کالج۔ اس کتاب میں کتابوں کی فہرستیں تیار کرنے کے مختلف طریقے، طریقۂ تقسیمِ کتب، طریقۂ انتخابِ کتب اور اجرا و واپسیٔ کتب کے متعلق مفید ہدایات درج ہیں۔ امید ہے کہ اس کتاب کی قدر کی جائے گی

حجم ۱۹۰ صفحات۔ کاغذ دبیز۔ قیمت مجلد ۸ر

پتا:- رستوگی اینڈ کمپنی۔ پبلشرز میرٹھ

گنجہائے گرانمایہ از پروفیسر رشید احمد صدیقی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ ملک کی بعض مشہور شخصیتوں مثلاً مولانا محمد علی، علامہ اقبال، ڈاکٹر انصاری وغیرہ کے حالات جن سے پروفیسر صاحب کے ذاتی تعلقات رہے ہیں دلچسپ اور مؤثر انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ کردار نگاری کا اچھا نمونہ ہے۔ قیمت فی جلد ایک روپیہ آٹھ آنے (مجلد)

ملنے کا پتہ:- اُردو اکاڈمی۔ لوہاری دروازہ۔ لاہور

ب

دھڑکنیں احمد ندیم قاسمی صاحب کے قطعات کا مجموعہ ہے۔ بعض قطعات میں جواں فکر شاعر کی دیہاتی زندگی سے وابستگی کا نہایت کامیاب طور پر اظہار کیا گیا ہے۔ مختصر نظموں اور قطعات و رباعیات کی طرف ہمارے جواں سال شاعروں کا رجحان اُردو ادب کے لئے مفید ہے۔ ڈاکٹر تاثیر صاحب نے اس کتاب پر دیباچہ لکھا ہے۔ قیمت فی جلد ایک روپیہ چار آنے (مجلد)

اُردو اکاڈمی۔ لوہاری دروازہ۔ لاہور سے طلب کیجئے۔

ب

تعلیمی کھیلوں کی کتاب یہ کتاب ریورنڈ ڈبلیو۔ ایم۔ راتھبرن اور پنڈت ہنسراج نے لکھی ہے۔ اس میں بچوں کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے بہت سے دلچسپ کھیل تجویز کئے گئے ہیں۔ ہماری رائے میں اس کتاب سے والدین اور معلموں کو ضرور فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ قیمت ۶ر

پتا:- پنڈت ہنسراج سینئر ورنیکلر ٹیچر۔ کرسچین ہائی سکول کھرڑ۔ ضلع انبالہ

فہرست مضامین

جلد ۴۲ — نمبر ۲

"ہمایوں" ماہ اگست ۱۹۴۲ء

چندہ

سالانہ صہ ۵ ششماہی سے (مع محصول)

قیمت فی پرچہ

۸؍

جہاں نما

ہندوستانی آرٹ

"نیو ریویو" کے ایک مضمون نگار نے ہندوستان کے آرٹ کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آرٹ کے متعلق یہ بحث فضول ہے کہ ہمیں اس میں اپنی قدیم روایات کی پیروی کرنی چاہئے یا جدید مغربی آرٹ کے اصول پر عمل پیرا ہونا چاہئے۔ اس قسم کی بحث ایسی ہی بے سُود ہے جیسی ہمارے آرٹ کے بعض مؤرخوں کی یہ بحث کہ قدیم ہندوستانی آرٹ خالص ملکی تھا یا اس پر بیرونی اثرات بھی ہوئے۔

چونکہ آرٹ تخلیق ہے اس لئے اسے ماضی کی طرف نہیں، مستقبل کی طرف نظر رکھنی چاہئے اور چونکہ یہ اظہارِ نفس کا ذریعہ ہے اس لئے اسے عہدِ گذشتہ کا نہیں اپنے عہد کی روح کا مظہر ہونا چاہئے۔ لیکن یہ بات بھی مدِ نظر رکھنی چاہئے کہ جتنا کوئی آرٹ غیر ملکی تہذیبوں کی زبان کو ذریعۂ اظہار بنانے سے بچنا چاہے اُتنا ہی اُسے اپنے عہدِ گذشتہ کی روایات سے کام لینا پڑتا ہے۔ یہ بات زیادہ وضاحت سے یوں کہی جاسکتی ہے کہ کوئی آرٹ خالصتہً صرف اپنے ہی عہد کا مظہر اور صرف اپنے ہی ملک کی پیداوار نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آرٹسٹ کا تخیّل صرف اپنے عہد اور اپنے ہی ملک تک محدود نہیں رہ سکتا بلکہ وہ اپنی قدیم روایات اور بیرونی دنیاؤں کے خواب بھی دیکھتا رہتا ہے۔ یہ خواب ہر آرٹ کا ایک جزو ہوتے ہیں۔ یہی اُس ماضی سے اس کا تعلق ظاہر کرتے ہیں جس کا دودھ پی کر نیا آرٹ پلتا ہے اور یہی مستقبل کے آرٹ کی اُس ہنوز نامکمل صورت کی ایک جھلک دکھاتے ہیں جو موجودہ آرٹ کا مطمحِ نظر ہوتی ہے۔

لیکن صحت مند آرٹ میں اس قسم کے خوابوں کا تناسب اُس خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا جسے ایک ذمہ دار زندگی برداشت کرسکتی ہے۔ یہ خواب کسی طرح زندگی کا بدل نہیں بن سکتے بلکہ محض زندگی کو اجاگر کرنے والا پس منظر بن سکتے ہیں یا اُسے ایک نئی تحریک دے سکتے ہیں۔ جہاں ایسے خواب کسی آرٹ کا جزوِ غالب بن جائیں وہاں ضرور کسی قسم کا بُحران موجود ہوتا ہے ایسی حالت میں یہ سمجھنا چاہئے کہ اس آرٹ کو کسی قسم کے تباہ کن بیرونی اثرات کا ردِّ عمل درکار ہے۔ مثلاً اس صنعتی مادّیت کے دَور میں مغربی رومنٹک آرٹ نے قرونِ وسطیٰ کی سادگی اور مثالیت میں پناہ ڈھونڈی ہے اور موجودہ بنگالی آرٹ نے بھی دیہاتی زندگی کی سادگی، اپنی قدیم روایتی روحانیت اور اپنے پرانے رشیوں کے صوفیانہ خیالات میں ایسی ہی جائے پناہ تلاش کی ہے۔ لیکن جوں جوں نئی زندگی کا تجزیہ ہوگا جوں جوں اس کے مسائل جرح و نقد کا نشانہ بنیں گے۔ آرٹ ماضی کا دامن چھوڑ کر مستقبل کی طرف متوجہ ہوگا۔

ہندوستان جس قدر اپنے اقتصادی، معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی مسائل کے حل کی طرف توجہ کرے گا اُسی قدر وہ "تحفظ" کے بجائے "تعمیر" اور "تقلید" کے بجائے "تخلیق" کی طرف متوجہ ہوگا۔ ہندوستان کے یہ جدید رُجحانات جن کا اوپر ذکر ہوا ہے مستقبل کی طرف پہلے قدم کا درجہ رکھتے ہیں۔

گذشتہ دو سال میں سلطنتِ برطانیہ کا نقصانِ جان

حال ہی میں برطانیہ کے نائب وزیرِ اعظم مسٹر اٹیلی نے دارالعوام میں ابتدائے جنگ سے لے کر ۲ ستمبر ۱۹۴۱ء تک کے اپنے فوجی مقتولین، مجروحین اور اسیرانِ جنگ کی حسبِ ذیل فہرست پیش کی:۔

سلطنتِ متحدہ

مقتول ۴۲۲۶۷ — مجروح ۳۲۹۰۳ — قیدی ۵۳۶۳۴

گم شدہ ۱۶۲۰۸

نوآبادیاں

مقتول ۴۶۵۶ — مجروح ۷۲۷۹ — قیدی ۳۱۰۴

گم شدہ ۸۷۸۵

ہندوستان اور برما

مقتول ۱۴۳۹ — مجروح ۵۳۷۴ — قیدی ۱۷۱۴

گم شدہ ۶۴

دیگر نوآباد علاقے

مقتول ۶۱۱ — مجروح ۸۳۷ — قیدی ۶

گم شدہ ۴۶۹۹

امریکہ میں اوسطِ عمر

امریکہ کے سفید باشندوں کا موجودہ اوسطِ عمر ۶۲٫۵ سال ہے۔ گویا گزشتہ دس سال کے مقابلے میں ۳٫۲ کا اضافہ ہوا ہے اس صدی کی ابتدا سے لے کر اب تک سفید امریکیوں کی عمر کے اوسط میں کل اضافہ تقریباً ۱۳ سال کا ہے

اس اضافے میں زیادہ حصہ وہاں کی عورتوں کا ہے۔ چنانچہ عورتوں کا اوسطِ عمر ۶۴٫۵ اور مردوں کا ۶۰٫۶ سال ہے۔

نازی عورتوں کی پولیس

چونکہ میدانِ جنگ میں زیادہ سے زیادہ جرمن فوجوں کی ضرورت ہے۔ اس لئے گ بو کے افسرِ اعلیٰ کے حکم کے مطابق بہت اعلیٰ عہدوں کے سوا پولیس کے تمام دفتری عہدے عورتوں کے سپرد کر دیئے گئے ہیں۔ اس طرح پولیس کے جو عہدہ دار فارغ ہوئے ہیں وہ فرانس اور دیگر مقبوضہ یورپی ممالک کی جرمن فوج میں شامل ہو جائیں گے کیوں کہ ان ممالک میں سے زائد جرمن فوجیں میدانِ جنگ میں چلی گئی ہیں۔

دنیا کی بڑی بڑی ہوائی طاقتیں

نازیوں کی لفٹ وافے میں ۱۲۵۰۰۰۰- آدمی ہیں۔

انگریزوں کے آر۔ اے۔ ایف میں دس لاکھ آدمی ہیں۔

امریکنوں نے اعلان کیا تھا کہ وہ امریکہ کو دنیا کی سب سے بڑی ہوائی طاقت بنانا چاہتے ہیں اور ان کا ارادہ ہے کہ اس میں بیس لاکھ آدمی شامل ہوں۔ امریکہ کے محکمۂ فوج کو امید ہے کہ وہاں ۱۹۴۲ء میں دس لاکھ آدمیوں کی ہوائی طاقت بن جائے گی۔

پرل ہاربر کی لڑائی سے پہلے جاپان کے متعلق یہ اندازہ کیا گیا تھا کہ اس کی ہوائی فوج ۵۵۰۰ آدمیوں پر مشتمل ہے۔

تارپیڈو

تارپیڈو جنگ کے مہلک ترین اسلحہ میں سے ہے۔ اس کی رفتار ۵۰ میل فی گھنٹہ اور مار پانچ میل تک ہوتی ہے۔

تارپیڈو کا طول ۲۲ فٹ اور قطر صرف ۲۱ انچ ہوتا ہے اس کی مشینری میں ۶ ہزار پُرزے شامل ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر پُرزہ اُسی احتیاط اور باقاعدگی سے بنایا جاتا ہے جس سے کلائی کی نازک گھڑی کا ننھّے سے ننھّا پُرزہ۔

اگرچہ ایک تارپیڈو بنانے پر دو ہزار پاؤنڈ صرف ہوتے ہیں لیکن اس جنگ میں سب سے زیادہ نقصان اِسی حربے سے ہُوا ہے۔

امریکہ میں ایک ہندوستانی فلم ایکٹر کی ترقی

ہندوستان کے نوعمر فلم ایکٹر سابو سے کیلیفورنیا کی ایک فلم کمپنی نے معاہدہ کیا ہے کہ وہ اسے آئندہ سات سال کی خدمات کا کم ازکم ۲۳۰۰۰۰ ڈالر معاوضہ ادا کرے گی۔ عدالت نے اس عہدنامے کی اجازت دے دی ہے کیوں کہ کیلیفورنیا کے قانون کے مطابق ایسے معاہدوں کے لئے عدالت کی اجازت لینی پڑتی ہے جن میں کوئی نوعمر فرد شامل ہو۔

سابو کی عمر اس وقت ۱۸ سال کے قریب ہے۔ وہ اب تک حسب ذیل مشہور فلموں میں کام کر چکا ہے :-

(۱) ایلیفنٹ بوائے۔

(۲) تھیف آف بغداد۔

(۳) جنگل بُک۔

یونیورسل پکچرز سے اُس کا یہ معاہدہ تھا کہ اُسے کام کے ایک ہزار ڈالر ہفتہ وار ملا کریں گے اور سال کے کم ازکم ۴۰ ہفتے ضرور شمار ہوں گے۔

برطانیہ زمانۂ جنگ میں

برطانیہ میں آج کل ہر شخص کی ذات، روپیہ اور جائداد حکومت کے قبضۂ اختیار میں ہے کہ وہ جس طرح چاہے اُسے استعمال کرے۔

حکومت جس شخص کو جہاں چاہے بھیج سکتی ہے اور جو کام چاہے اُس سے لے سکتی ہے۔

حکومت بنکوں کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے اور جب چاہے روپے کا ادا کرنا روک سکتی ہے یا اُسے محدود کر سکتی ہے۔

حکومت شخصی جائداد اور زمین پر حسب مرضی قابض ہو سکتی ہے۔ اور اس سے جو کام مناسب سمجھے لے سکتی ہے۔

ضرورت ہو تو حکومت کسی کی جائداد کو تباہ بھی کر سکتی ہے۔

حامد علی خاں

ہندوستان کی تاریخ پر ایک سرسری نظر

کچھ عرصہ ہوا میں نے ہندوستان کی تاریخ اور اس کے موجودہ مسائل کو سمجھنے کے لئے بہت سی کتابوں اور رسالوں وغیرہ کا مطالعہ کیا اور پھر کئی سو صفحات میں اُن کا ایک خلاصہ تیار کر لیا جسے میں کبھی کبھی ایک طالب علم کی طرح بار بار پڑھا کرتا۔ آخر ایک دن جی میں آیا کہ ایک مختصر سا مضمون لکھ دوں جسے پڑھ کر ایک کم فرصت آدمی ہندوستان کے گزرے ہوئے اور موجودہ حالات سے ضروری واقفیت حاصل کر لے۔ پہلے ۳۶ صفحات میں مختصر تاریخ ہے اور پھر ۱۶ صفحات میں موجودہ حالات۔ یہ مضمون اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔

باب

کسی ملک یا کسی قوم کی موجودہ حالت یا آئندہ کے امکانات کو بخوبی سمجھنے کے لئے اس ملک کی جغرافی کیفیت اور باشندوں کے تاریخی حالات پر ایک سرسری نظر ڈالنا ضروری ہے۔ جس طرح ایک بڑی سے بڑی عمارت بھی اپنی بنیادوں پر قائم ہوتی ہے اسی طرح ہر قوم کا حال اس کے ماضی پر مبنی ہوتا ہے۔ درخت کے لئے اُس کی جڑوں کی اہمیت ٹیگور نے اپنے شاعرانہ رنگ میں یوں ادا کی ہے کہ جڑیں شاخیں ہیں زمین میں چھپی ہوئی اور شاخیں جڑیں ہیں ہوا میں پھیلی ہوئی۔ موجودہ زمانہ درخت ہے گزرا ہوا زمانہ اُس کی جڑ ہے۔ کسی فرد یا قوم کی زندگی اس کی سیرت پر منحصر ہوتی ہے اور سیرت زیادہ تر ورثے اور ماحول سے رنگ پکڑتی ہے۔ اس لئے موجودہ ہندوستان کو سمجھنے کے لئے اُس کی جغرافی و تاریخی کیفیتوں کا جاننا بہت ضروری ہے۔

ہندوستان ایک نہایت وسیع ملک ہے اتنا وسیع کہ اُسے ایک نیم برّاعظم کہا جاتا ہے۔ اس کا رقبہ یورپ کے برابر ہے اگر یورپ میں سے روس کا ملک نکال دیا جائے۔ شمال سے جنوب تک دو ہزار میل اور مشرق سے مغرب تک دو ہزار پانچ سو میل۔ یہ ہے ہندوستان اُس کا سمندر کا ساحل پانچ ہزار میل اور خشکی کی سرحد چھ ہزار میل ہے۔ ہمالیہ کا کوہستانی سلسلہ جس کی چوڑائی کم و بیش دو سو میل ہے شمال کی طرف ایک سدِ سکندری کی طرح پندرہ سو میل تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ ملک کے تین بڑے حصے ہیں شمال میں کوہ ہمالیہ اور اس کے عین نیچے سندھ اور گنگا اور ان کے معاون دریاؤں سے سیراب ہونے والے وسیع میدان۔ اس کے جنوب کی طرف دکن کا مرتفع میدان اور سب سے نیچے جنوبی ہند کا علاقہ۔ دکن کو بندھیاچل کے سلسلے نے شمالی ہندوستان سے اس طرح پہاڑ اوجھل کر دیا ہے کہ مدتوں تک آریا لوگ وہاں دخل نہ پا سکے۔ ہندوستان کی آب و ہوا خوش گوار ہے لیکن زیادہ تر گرم جس کی وجہ سے آہستہ آہستہ یہاں کے لوگ چستی کی بجائے سستی اور عمل کی بجائے غور و فکر کے عادی ہو گئے۔ بڑے بڑے پہاڑوں اور دریاؤں کی عظمت اور موسمی تبدیلیوں کے تلوّن نے اُنہیں فطرت کا پجاری اور قسمت کا معتقد بنا دیا۔ ملک کی قدرتی پیداوار نے باشندوں کو مالامال کر دیا جس سے اجنبی قوموں کے دل میں لالچ اور لُوٹ مار کی خواہش پیدا ہوئی اور صدیوں تک ہمالیہ پار کی قومیں یہاں حملے پر حملے کرتی رہیں۔

ان حملوں اور انسانی طوفانوں کا نتیجہ عارضی طور پر بُرا لیکن آخر کار ایک حد تک مفید ثابت ہوا۔ ہندوستان میں طرح طرح کی قوموں اور رنگ رنگ کے تمدنوں کا ایک مجموعہ تیار ہو گیا۔ یہ اختلافات کبھی رحمت اور کبھی مصیبت کا باعث ہوئے۔ آج دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ اس عظیم الشان خطّے میں آباد ہے۔ اور ان چالیس کروڑ انسانوں کی زندگی میں ایسے قسم قسم کے اور عجیب و غریب مسئلے درپیش ہیں کہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے مسائل فی الحقیقت دنیا کے مسائل ہیں۔ دنیا کے نئے حالات نے اب اس ملک کو پہاڑوں سے گھرا ہوا اور سمندروں سے بچا بچایا ہوا نہیں رہنے دیا۔ لیکن اس سے پیشتر کہ ہم اس کی موجودہ حالت پر تبصرہ کریں ہم اس کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالیں گے۔

ہندوؤں کا عہد

ہندوستان کے سب سے پہلے باشندے آریا نہ تھے۔ اُن سے ہزاروں سال پہلے اس ملک میں مختلف قوموں کی آبادیاں بھی تھیں اور مختلف قسم کی تہذیبیں بھی کبھی کہا جاتا تھا کہ ملک کے اصلی باشندے دراوڑی لوگ تھے لیکن اب ثابت ہوا ہے کہ ان سے بھی بہت پہلے نئے پتھر کے زمانے میں ۸۰۰۰ سال قبل مسیح اور ۲۵۰۰ سال ق م کے درمیان یہاں وہ لوگ بستے تھے جن کی یادگار مدراس کی نیلگری پہاڑیوں کی ٹوڈا قوم ہے۔ اس کے بعد وہ لوگ آئے جن کی اولاد چھوٹا ناگ پور کے کول اور وسط ہند کے بھیل ہیں۔ دراوڑی قومیں اس کے بعد آئیں۔ وہ زیادہ تر جنوبی ہند میں آباد ہوئیں اگرچہ بعض اور حصوں کے رہنے والے مثلاً اڑیسہ کے گونڈ اور بلوچستان کے براہوئی لوگ بھی انہیں کی نسل سے ہیں۔ پہلے سمجھا جاتا تھا کہ اس کے بعد شمال مشرق میں آسام اور برہما پتر کی وادی سے ہوتے ہوئے منگولی قومیں آئیں اور شمال مغرب میں پہاڑی دروں سے طوفان کی طرح اُمنڈتا آریائی قوموں کا ریلا آیا۔ لیکن تھوڑا عرصہ ہوا پنجاب اور سندھ میں نئی نئی کھدائیوں سے ہڑپا اور موہن جداڑو کے قدیمی سومیری نما تمدن کے وہ وہ انکشاف ہوئے کہ دنیا حیرت میں رہ گئی۔ ان لوگوں کا تمدن آریاؤں کے تمدن سے بالکل مختلف اور شروع شروع کے آریائی تمدن سے یقیناً بڑھ چڑھ کر تھا ایک باقاعدہ شہری تمدن تھا۔ پنجاب میں بسنے والے آریاؤں کا تمدن ایک سادہ دیہاتی سا تمدن تھا۔ موہن جداڑی تمدن کی ترقی کا اس وقت کے عمدہ مکانات، زیورات اور سنگتراشی سے پتہ چلتا ہے۔ اس تہذیب کا زمانہ ۳۰۰۰ سال قبل مسیح بتایا جاتا ہے۔ کسی قسم کی تلوار یا زرہ بکتر برآمد نہ ہونے کی وجہ سے بعض مورخین کا خیال ہے کہ یہ لوگ آپس میں بہت کم لڑتے جھگڑتے تھے بلکہ انہوں نے بقول جیرلڈ ہرڈ بعض ایسے منصوبانہ طریقے دریافت کر لئے تھے جن سے اُن کا تمدن ہمارے تمدن کے برخلاف امن اور سلامتی کا تمدن بن گیا تھا اور ان میں بعد کی قوموں کا سا جنگ و جدل کبھی ہوتا ہی نہ تھا۔

لیکن یہ قبل آریائی قومیں کچھ مٹ مٹا گئیں کچھ اجاڑ علاقوں میں تتر بتر ہو گئیں۔ ان میں سے اگر کوئی بچیں اور باقی رہیں جن کے تمدن کا تھوڑا بہت اثر آریاؤں پر بھی پڑا تو وہ جنوبی ہند کی دراوڑی قومیں ہیں چنانچہ کالی یا درگا کی خوفناک دیوی ہندو دیومالا میں انہیں دراوڑی قوموں سے آئی جنوب کی آبادی کا بیشتر حصہ آج بھی دراوڑی نسل کا ہے۔ پھر بھی یہ عموماً مانا گیا ہے کہ ہندوستان کی تہذیب پر سب سے زیادہ اثر آریائی طرزِ زندگی اور آریائی تمدن کا ہوا۔

آریا ہندوستان میں شمال مغرب کی طرف سے دو ہزار سال ق م سے لے کر ۱۲۰۰ ق م تک امڈے چلے آئے۔ کئی صدیوں تک انہوں نے اصلی باشندوں سے جنگ و جدل جاری رکھا۔ اکثر کو تہ تیغ کیا بعض کو بھگا دیا اور بعض کو غلام بنا کر شودروں کا درجہ بخش دیا یعنی مسیح سے تقریباً ہزار سال پہلے شمالی ہندوستان ہر طرح آریائی رنگ میں رنگا جا چکا تھا۔ امن و امان کے ساتھ بس جانے کے بعد یہ زراعت پیشہ دیہاتی لوگ ایک مدت تک سادہ خاندانی طرز کی زندگی بسر کرتے رہے۔ دودھ مکھن گھی پھل پات ان کی خوراک تھی۔ یہ گھوڑے اور مویشی رکھتے تھے۔ ان کے بادشاہ مطلق العنان نہ تھے پروہت ان کے مذہبی پیشوا تھے جن کا اقتدار سماجی زندگی کے پھیلنے کے ساتھ روز بروز بڑھتا گیا۔ یہ سمندر سے ناواقف تھے پہلے ان کے لئے پنجاب کے بڑے دریا ہی "سمندر" تھے۔ جب یہ آگے بڑھے تو گنگا اور جمنا کی وادیوں میں وہ ہندوانی تمدن پھولا پھلا جسے ہزاروں سال تک ہندوستان پر چھائے رہنا تھا۔ سب سے پرانے وید رگ وید کا زمانہ تقریباً ۱۲۰۰ ق م کا ہے۔ اس کے بعد پہلی سی سادہ زندگی اور اُس کی فطری اُن گھڑ سرگرمیاں ذرا ٹھنڈی پڑ گئیں۔ تہذیب نے اپنا رنگ دکھایا، ذات پات کی تفریق ظاہر ہوئی۔ عالم و فاضل برہمنوں نے ہندو مت کو اپنے سانچے میں ڈھالا۔ وہ مذہبی کتابیں جو گویا ویدوں کی تفسیریں ہیں اور جنہیں برہمنا اور اُپنشد پکارتے ہیں اسی عہد کی پیداوار ہیں۔ کہیں ریاستیں اور کہیں چھوٹی چھوٹی آزاد جمہوری آبادیاں بن گئیں جس وقت تاریخ کا پردہ اٹھتا ہے اُس وقت ہند میں علاوہ مذہب کے فلسفہ ادب سنگتراشی نقاشی تعمیر تعلیم اور سیاسی تنظیم ان میں سے بعض کی ابتدا اور بعض میں خاصی ترقی ہو چکی تھی یعنی پیشتر اس کے کہ تاریخ اپنی کہانی سنائے ہندوستان ایک مہذب و متمدن ملک بن چکا تھا۔

ہندوستان کی قدیم سیاسی تاریخ کٹے گزرے زمانوں کی دُھند میں لپٹی پڑی ہے اس لئے اس میں قیاسات کو بہت کچھ دخل ہے ہندوؤں کو عموماً دنیا سے اتنی دلچسپی نہ تھی کہ وہ تاریخ لکھنے بیٹھتے جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ غیر ملکی سیاحوں اور مختلف کتبوں اور سکوں ورنہ مذہبی اور دوسری کتابوں اور روایتوں سے معلوم ہو سکا ہے۔ ہندوؤں کے عہد کی باقاعدہ تاریخ کا مختصر نقشہ یہ ہے کہ پہلے ۶۵۰ سال ق م میں بہار کے علاقہ

میں ایک بڑی ریاست مگدھ نمودار ہوئی جو سیسوناگ خاندان اور نوننداحکمرانوں کے بعد چندر گپت موریا کے ہاتھوں ۳۲۲ ق م میں ایک عظیم الشان سلطنت میں تبدیل ہوگئی اور جس کا پھیلاؤ مشہور شاہنشاہ اشوک (المتوفی ۲۳۲ ق م) کے زمانے میں ہندوستان کی حدود سے گزر کر افغانستان تک تھا۔ چندر گپت کے عہد (۳۲۲ تا ۲۹۷ ق م) میں مشہور غیر ملکی سفیر میگیستھنیز نے ۳۰۰ ق م کے قریب ہند کی سیر کی۔ اس کے بیان کے مطابق یہ سلطنت خوب منظم تھی۔ بادشاہ مطلق العنان تھا اس کی فوج چھ سات لاکھ کے قریب تھی۔ دارالسلطنت پاٹلی پترا (جو آج کل پٹنہ ہے) میلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ شہر کے انتظام کے لئے چھ مختلف بورڈ تھے مجرموں کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ آب پاشی مالگذاری اور محصولات کے محکمے الگ الگ تھے۔ لوگ دولت مند اور خوش حال تھے اور مضبوط اور صحت مند۔ علم کا اتنا شوق تھا کہ پاٹلی پترا میں ہندوستان کے ہر حصے سے طالب علم کھنچے چلے آتے تھے۔ چندر گپت کے وزیر چانکیہ نے جو کتاب ارتھ شاستر چھوڑی ہے وہ ہندوستان کی سب سے پہلی تصنیف ہے۔ اس میں حکومت کے فن اور سیاسی چال بازیوں پر تبصرہ کیا گیا ہے اور اس سے ظاہر ہے کہ اُن وقتوں میں مطلق العنان بادشاہت ہی باقاعدہ حکومت کی عام شکل تھی۔ اس تصنیف کے متعلق جو ۱۹۰۵ء میں جنوبی ہند میں دستیاب ہوئی یہ یاد رکھنا چاہئے کہ تازہ ترین تحقیقات کے مطابق تیسری صدی کا چانکیہ محض اس کا فرضی مصنف تھا اور یہ پُرانوں اور بعض اور ضخیم ہندو تصنیفات کی طرح دراصل تیسری یا چوتھی صدی عیسوی کی یادگار ہے جب کہ گزرے ہوئے وقتوں کے علوم کی باقاعدہ ترتیب و تدوین کی گئی۔

مگدھ کی سلطنت کے زمانے میں پانچویں صدی ق م میں بدھ اور مہاویرا کا ظہور ہوا۔ رامائن جس میں آریوں کے وندھیاچل سے آگے بڑھنے کا ذکر ہے لکھی گئی اور مہابھارت کی ابتدا ہوئی۔ گیتا جو مہابھارت کا ایک جزو سمجھا جاتا ہے غالباً کئی سو سال بعد لکھی گئی۔

۳۲۷ ق م میں سکندر اعظم شمالی ہندوستان پر حملہ آور ہوا جہاں ایک عرصے کے لئے یونانی حکومت قائم ہوگئی۔

لیکن ہند پر عام طور پر اس کا کوئی دیرپا اثر نہ ہوا اگرچہ آرٹ سکہ سازی ہیئت اور ڈراما میں کچھ نہ کچھ یونانی اثرات پائے گئے ہیں۔ ہند کا تمدنی مرکز ابھی پاٹلی پترا ہی تھا جہاں ۲۷۴ ق م میں اشوک تخت پر بیٹھا۔ اشوک نے بدھ مت اختیار کر کے ہندوستان کو امن کی جنت بنا دینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ پہاڑوں کی چٹانوں پر اور میناروں پر اس نے ملک میں جا بجا اپنے مذہبی اور اخلاقی فرمان کندہ کرائے۔ دوسروں کی جان خصوصاً جانوروں کی جان کا لحاظ، ماں باپ کی اطاعت، نوکروں پر شفقت دوسروں سے محبت سچ بولنا خیرات دینا۔ ان اخلاق پر زور دیا گیا اور بتایا گیا کہ نیکی کی زندگی کو سب چیزوں پر فوقیت حاصل ہے۔ اس نے سڑکوں کے گرد درخت لگوائے کوئیں کھدوائے سرائیں بنوائیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے مختلف فرقوں اور مذہبوں کے ساتھ پوری رواداری برتی۔ دنیا کی تاریخ میں بہت کم حکمران گذرے ہیں جنھوں نے اپنے کاموں میں خدمت خلق اور امن پسندی کا ایسا عملی ثبوت دیا جیسا کہ اشوک نے۔

موریا سلطنت کے بعد پانچ چھ سو سال تک ہندوستان میں کوئی مضبوط مرکزی حکومت قائم نہ ہو سکی۔

یہ بدامنی کا زمانہ تقریباً ۲۷۴ ق م سے ۳۲۰ء تک جاری رہا۔ اس دوران میں ساکا اور یوشی قوموں کی وہ نقل مکانی ہوئی جسے سدی اور تاتاری حملے بھی کہا جاتا ہے۔ ان کا ایک مشہور بادشاہ کنشک اسی زمانے (۱۲۰ء) میں پشاور کا حکمران ہوا اور اس نے اپنی سلطنت کاشغر اور بلخ سے پرے جھیل ارال تک پھیلا دی۔

بدھ مت اور برہمنیت کے درمیان انہیں وقتوں میں کشاکش شروع ہو چکی تھی۔ منو کا دھرم شاستر غالباً ۲۰۰ء میں تکمیل کو پہنچا یہ خالص ہندو مت کی شریعت ہے۔ ذات پات کی بندشیں اور زیادہ مضبوط کر دی گئیں۔ پُران کچھ زیادہ پُرانے نہیں وہ ۴۰۰ء سے شروع ہو کر ۱۰۰۰ء تک مرتب ہوئے۔

چوتھی صدی میں گپتا سلطنت قائم ہوئی جو دور دور تک پھیلی۔ اس کا زمانہ ۳۲۰ء سے ۴۸۰ء تک کا ہے اس کا دارالسلطنت اجین تھا۔ گپتا حکمرانوں کا زمانہ ہندو مت کے سب سے زیادہ عروج کا زمانہ ہے۔

سمدر گپتہ (المتوفی ۳۷۵ء) اس خاندان کا سب سے زبردست اور سب سے قابل فرماں روا تھا۔ اسے ہند کے عظیم ترین بادشاہوں میں

شامل کیا جاسکتا ہے "سرو راجو چھیتہ" (یعنی بادشاہوں کا تباہ کرنے والا) اس کا لقب تھا۔ اس کی حیرت انگیز فتوحات سے موریاؤں کے بعد ہند پہلی بار ایک حکومت کے زیرِ نگین آیا۔ علاوہ ایک فاتح ہونے کے وہ خود ایک شاعر اور ماہر موسیقی داں بھی تھا۔ اسی زمانے میں بدھ مت کا زوال شروع ہوا اور برہمنیت کا جھنڈا بلند ہوا۔ بکرماجیت کے نورتن اور بالخصوص کالیداس (۴۰۰ء) سے کون سا ہندوستانی واقف نہیں۔ چینی سیاح فاہیان بیان کرتا ہے کہ اُس کے زمانے میں پاٹلی پتر میں بہت سے خیراتی ادارے تھے اور مالوہ میں لوگوں کو خاصی شہری آزادی حاصل تھی، ہیئت، ریاضی وغیرہ علوم کو خوب ترقی ہوئی۔ مغرب کی طرف رومی سلطنت کے ساتھ تجارت کا سلسلہ قائم ہوا اور بڑھا اور مشرق کی طرف ہندوؤں نے جاوا سماٹرا وغیرہ میں اپنی نو آبادیاں قائم کیں۔

اس کے بعد کم از کم سو سال تک بیرونی حملہ آوروں نے ہند کو تہ و بالا کیا۔ یہ ہونا یا ہن لوگ تھے جن کے دو مشہور ظالم بادشاہوں تورامانا اور مہرگلہ کے ناموں ہی سے ان کی ہیبت کا پتہ چلتا ہے۔ ہمارے راجپوتوں اور گوجروں کے یہی بزرگ ہیں۔

۶۰۶ء میں پھر ہندوستان کو ایک زبردست حکمران نصیب ہوا۔ یہ راجہ ہرشہ تھا۔ چینی سیاح ہیون سانگ اس کے عہد میں ہندوستان میں آیا اس کا بیان ہے کہ بادشاہ ہر محکمے کی خود نگرانی کرتا تھا۔ اور گو حکومت مضبوط تھی لیکن فوجداری قوانین گپتا عہد کی نسبت زیادہ سخت تھے جس سے ظاہر ہے کہ بتدریج ملک میں بدامنی زیادہ پھیل رہی تھی۔ تعلیم عام تھی۔ نالندہ کی یونیورسٹی اپنے عروج پر تھی لوگ عام طور پر نیک اور صداقت شعار تھے۔ عورتوں میں پردہ نہ تھا لیکن ستی کی رسم عام تھی۔ ہرشہ کا خود اگرچہ بدھ مت کی طرف میلان تھا اور وہ سب مذہبوں پر نظرِ عنایت رکھتا تھا مگر یہ ظاہر ہے کہ بدھ مت روز بروز ملک میں کمزور اور ہندو مت طاقتور ہو رہا تھا

ہرشہ ۶۴۸ء میں وفات پاگیا۔ اس کے بعد ہندوستان میں کوئی ہندو حکمران ایسا نہ ہوا جس نے ملک کے اکثر حصے کو تسخیر کر کے ایک مضبوط مرکزی حکومت قائم کی ہو۔

یہ بات غور کے قابل ہے کہ اسی زمانے میں (۶۱۰ء سے ۶۳۲ء تک) عرب میں اُس زبردست ہستی یعنی پیغمبرِ اسلامؐ کا ظہور ہوا۔ جس کے پیرو ہندوستان میں ایک نئی تہذیب کا عَلَم نصب کرنے والے تھے۔ خلیفہ عمرؓ کے زمانے میں (۶۳۶ء) میں ابوالعاص عامل یمن نے ہند پر پہلی بار ہند پر چڑھائی کی۔

ہرشہ کے بعد ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ایسے کہ اس کے بعد انہیں اسلام ہی کے شیشہ گروں نے آکر جوڑا۔

ہرشہ کے بعد دسویں صدی عیسوی میں شمالی ہند میں یہ مشہور ہندو ریاستیں تھیں۔ بھٹنڈا کا راجہ جے پال جسے سبکتگین غزنوی نے شکست دی۔ قنوج (۸۱۶ء تا ۱۱۹۴ء) جس کے راجہ بھوج پریہار نے دور دور تک اپنی حکومت پھیلائی۔ بنگال میں پالوں کی ریاست (۷۳۰ء تا ۱۲۰۰ء) بندھیل کھنڈ میں چندیلوں کی ریاست جس کا قلعہ کالنجر مشہور ہوا۔ دھار یعنی مالوہ جہاں کا راجہ بھوج (۱۰۱۸ء تا ۱۰۶۰ء) ایک اعلیٰ درجے کا ہندو حکمران سمجھا جاتا تھا۔ یہ زیادہ تر راجپوت ریاستیں تھیں۔ راجپوت لوگ بالعموم نئے حملہ آوروں کی اولاد سے تھے اور ان کے دشمن بھی ان کی جفاکشی اور بہادری اور جانبازی کا لوہا مانتے تھے۔

دکن میں اندھرا (۲۴۰ء ق م تا ۲۳۶ء)۔ چلوکیہ (۶۰۸ء سے ۷۵۰ء تک) جس کے ایک حکمران نے ہرشہ کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکا۔ راشٹرکٹ (۷۵۰ء تا ۹۷۳ء) جس کے ایک راجہ موگھ ورشا کی بابت کہا گیا کہ وہ دنیا کے چار بڑے حکمرانوں میں سے ایک ہے اور جہاں کا ایلورا کا مندر (جو آٹھویں صدی میں بنا) مشہور ہے۔ یہ بڑی ریاستیں تھیں۔

پرے جنوبی ہند میں جو باقی ہندوستان سے الگ تھلگ ایک تامل یا خاص دراوڑی علاقہ تھا پانڈیوں کرالوں اور چولوں کی حکومتیں تھیں۔ چولا خاندان کا ایک مشہور راجہ رام راج (۹۸۵ء تا ۱۰۱۲ء) گزرا ہے۔ چولا راجاؤں کے پاس ایک طاقتور بحری فوج بھی تھی۔ ان کی نہروں اور سڑکوں کی اچھی حالت تھی اور پنچایتوں کا نظام ملک میں پھیلا ہوا تھا۔

یہ دسویں صدی کی ریاستیں تھیں۔ بارھویں صدی میں شمالی ہند میں مسلمانوں کی آمد کے وقت یہ ریاستیں تھیں۔ قنوج جس کے

راجہ جے چند کو محمد غوری نے شکست دی۔ دہلی کے تومارے، اجمیر کے چوہان جن کے راجہ پرتھی راج نے بڑی دلیری سے مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ بنگال اور بہار کے پالے (تا ۱۱۹۷ء) جو بدھ مت کے معاون تھے۔ مشرقی بنگال کے سینے جو ہندو مت کے مددگار تھے۔ گجرات کے بھاگلے اور کشمیر کی سلطنت (۶۵۰ء تا ۱۳۳۹ء) اُدھر دکن میں یادووں اور ہوسالوں اور جنوبی ہند میں پانڈیوں اور چولوں کی حکومتیں تھیں۔

جیسا غیر دلچسپ یہ بیان ہے ایسا ہی غیر دلچسپ اور زوال آمادہ زمانہ تھا جس میں ہندوؤں میں نہ سیاسی اتحاد باقی رہا تھا اور نہ مذہبی قومت۔

غرض قدیم ہند کی سیاسی تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ ۲۰۰۰ یا ۱۵۰۰ ق م کے قریب آریائی حملے ہونے شروع ہوئے۔ ۶۵۰ ق م سے چار سو سال تک پہلے شیوناگ اور نندا اور پھر موریا سلطنت قائم رہی۔ دوسری صدی ق م سے تیسری صدی عیسوی تک ساکی اور تاتاری حملے ہوتے رہے ۷۸ء میں شمالی ہند میں کنشک کی حکومت تھی۔ ۳۲۰ء سے ۴۸۰ء تک گپتا سلطنت قائم رہی۔ اس کے بعد سو سال تک ہن لوگوں کا ریلا آیا۔ ساتویں صدی کے شروع میں ہرشہ نے اپنا اقتدار جمایا۔ اور اس کے بعد شمالی اور جنوبی ہندوستان میں بیسیوں چھوٹی چھوٹی راجپوت اور دوسری سلطنتوں نے اپنا اپنا ڈیڑھ ڈیڑھ اینٹ کا مندر بنالیا۔ یہ ریاستیں شمال میں بارھویں صدی تک اور جنوب میں بعض چودھویں اور بعض سولھویں صدی تک قائم رہیں۔ اس کے بعد ان کی جگہ اسلامی سلطنتیں قائم ہوگئیں۔ جیسا کہ اُوپر بیان ہو چکا ہے پہلے پہل آریاؤں کی زندگی بالکل سادہ تھی۔ ان کا مذہب مظاہر پرستی تھا۔ اندر گرج چمک کا دیوتا تھا۔ ورونا آسمان کا۔ اوشا صبح کی چمکتی دیوی تھی اور سرسوتی دریا کی دیوی عقل کی دیوی۔ آہستہ آہستہ مذہب کی نشو ونما ہوئی اور اس میں عوام اور خواص کے لئے جدا جدا مسلک کم از کم ایک ہی مذہب کی جدا جدا تاویلیں کی گئیں۔ قدیم آریوں کی فطرت پرستی کی بجائے اب دیوتاؤں کی پوجا کا رواج ہوا۔ وید آسمانی کتابیں مانی گئیں۔ برہمنہ اور اُپنشد دیدوں ہی سے متعلق تھے۔ برہمنہ برہمنوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کی نشانی ہیں اور اُپنشد مذہب پر فلسفے کے اثر اور تصوف کے خیالات کا نتیجہ ہیں۔ جن میں بعض نہایت لطیف اور خوبصورت خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان میں سانکھ شاستر میں دہریت کے خیالات ہیں۔ ویدانت ہمہ اُوست کا حامل ہے۔ یوگ ترکِ دنیا کا طریقہ ہے۔ کہا گیا ہے کہ ہندو مت کی چار متفق علیہ باتیں ہیں۔ (۱) رُوح انسانی باقی رہنے والی ہے (۲) ہر شخص کے اعمال زندہ رہتے ہیں اور اپنے مخفی اثرات رکھتے ہیں اس کو کرم کہتے ہیں۔ کرم کے مطابق ہر مخلوق کا موجودہ جنم اس کے پچھلے جنموں کی اچھائیوں اور برائیوں کے مطابق معین ہوتا ہے۔ ان اعمال اور ان کے نتائج کی بے رحمانہ تکرار کا نام سنسار ہے (۳) تناسخ یا آواگون یعنی روح مختلف جنم اس دنیا میں لیتی رہتی ہے (۴) دنیا رنج وعذاب ہے۔ جس سے نجات پانا ضروری ہے اس کا ذریعہ ویدانت ہے۔

پانچویں صدی ق م تک ذاتوں کا نظام خراب ہو چکا تھا۔ ذات شروع میں کالے گورے یعنی آریاؤں اور دراوڑی قوموں کے امتیاز کا نتیجہ تھی۔ آریا کے معنی ہیں شریف النسل۔ اصلی باشندوں کو آریاؤں نے دسیو یا داس یعنی کالے رنگ والوں کا نام دیا۔ اسی لئے داس کے معنی غلام کے ہوگئے۔ ذاتیں ورن تھیں، ورن کا مفہوم رنگ ہے پس ذات کی ابتدا رنگ کے فرق سے ہوئی اور گو یہ درست ہے کہ ذات ہی سے تقسیم عمل کے اصولوں پر ہندوؤں کے چار حصے ہو کر ان میں مختلف کاموں کی مہارت اور تنظیم پیدا ہوئی اور اس سے ترقی بھی ہوئی لیکن آخر کار ذات چند صدیوں کے بعد نوعِ انسان کے لئے بے انصافی اور ظلم وستم کا ذریعہ بن گئی۔ اونچی ذاتیں ہمیشہ کے لئے ممتاز اور نیچی ذاتیں ہمیشہ کے لئے ذلیل ہوگئیں۔

چھٹی صدی ق م میں مہاویرا اور گوتم بدھ پیدا ہوئے اور جین مت اور بدھ مت کی بنا پڑی۔ جین مت اور بدھ مت جن کی اشاعت بھکشوؤں کے سنگھوں یعنی منظم مذہبی جماعتوں سے ہوئی ویدوں کے تقدس اور برہمنوں کے اقتدار کے مخالف تھے۔ اُن کے نزدیک قربانیاں بے معنی تھیں اور وہ دونوں اہمسا یعنی کسی جاندار کو دکھ نہ دینے کے پابند اور "ترِرتن" یعنی تین جوہروں کے قائل تھے۔ بدھیوں کا ترِرتن بدھ دھرم اور سنگھ ہے۔ بدھ نے اپنے مذہب کی بنیاد کرم کے ہندوانہ عقیدے پر رکھی اور کہا کہ اچھے کرموں کے ذریعے سے آواگون سے نجات مل کر انسان زندگی سے جو محض دکھ ہی دکھ ہے رہائی پا سکتا ہے۔ نِروان ہے اور یہی انسان کے لئے حصول کمال ہے۔ خالق کائنات کے مسئلے سے بدھ نے منہ پھیر لیا اور اپنے عام پیروؤں کے لئے اعتدال کا اصول قائم کر کے انہیں آٹھ نیکیوں پر کاربند رہنے کی تاکید کی یعنی اچھا عقیدہ اچھا خیال اچھا قول اچھا عمل اچھی روزی اچھی محنت اچھا دھیان اور اچھا گیان۔

بدھ سب سے بڑا آدمی ہے جو ہندوستان نے پیدا کیا۔ اس کا شمار دُنیا کی عظیم ترین شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ اُس نے برہمنوں کے اقتدار اور بے معنی رسوم و توہمات کے خلاف اپنی آواز بلند کی اور راستبازی اور نیکی کا ایک نہایت اعلیٰ معیار دنیا کے سامنے پیش کیا۔ ہندومت اپنے اصلی معیار سے اس قدر گر چکا تھا کہ ہزاروں لاکھوں نے بدھ کی آواز کو شوق سے سُنا۔ اُس کے سادہ پیغام کو سمجھا اور اس پر ایمان لے آئے۔ بدھ مت ملک میں ہر جگہ پھیل گیا اور کئی صدیوں تک یہاں اس کا دور دورہ رہا لیکن رفتہ رفتہ اس میں خرابی آ گئی بُدھ کے پیرو عموماً اسے ایک اوتار مان کر اس کی مورت کی پوجا کرنے لگے۔ برہمنوں نے پھر زور پکڑا اور بدھ مت کے کچھ حصے کو ہندومت میں جذب کر کے انہوں نے ہندویت کے نظام کو نئے سرے سے مضبوط بنا دیا۔ منو کے دھرم شاستر اور پُرانوں کے ذریعے سے ہندو معاشرت کی تنظیم کی گئی اور گیتا نے آ کر اُن کی سوئی ہوئی زندگی میں پھر عمل کی لہر دوڑا دی۔

نویں صدی کے شروع میں شنکر اچاریہ (۷۸۹ء تا ۸۲۰ء) اور بارھویں صدی میں راما نوجہ چاریہ اور مادھواچاریہ نے ہندومت کے عقائد کی اصلاح کی اور وشنو کی عبادت کو رواج دیا۔ شنکر اچاریہ نے بودھی نروان کی مخالفت کی اور سمجھایا کہ اگر دنیا مایا ہے اگر زندگی سمجھ میں نہیں آ سکتی اور وہ ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہے تو ہمیں اُس سے کنارہ نہ کرنا چاہئے بلکہ ہمیں زندگی کے معمے کا ایک جزو بن کر اُس میں حصہ لینا چاہئے۔ نفس اور مادے کی حقیقت ایک ہے یہ ایک ہی تجربۂ انسانی کے دو پہلو ہیں۔ اور حقیقت جو دونوں پر چھائی ہوئی ہے وہ برہما ہے۔

یہ ہندومت کا عقیدہ تھا اور شاندار عقیدہ تھا۔ ہاں عملاً ہندومت کے معنی تھے ذات پات کا نظام۔ اس عقیدے اور اس عملی زندگی ہی سے ہندوؤں کی زبردست خاندانی زندگی کی بنا پڑی۔ ہر کنبے نے ایک چھوٹی سی حکومت کی شکل اختیار کر لی۔ بزرگوں کا احترام پرستش کی حد تک پہنچ گیا۔ ہندو گھرانوں میں ماں محبت کا مرکز تھی لیکن عورت کا مرتبہ بتدریج کم سے کم تر ہوتا گیا بہت سی بندشوں نے فرد کی فطری آزادی کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں۔

عملی زندگی کے لئے جو تعلیم دی گئی وہ غم و یاس سے بھری ہوئی تھی کہ "دُنیا ایک عذاب ہے اور کرم کا ہاتھ سخت ہے۔ دنیا کے اثباتی پہلو کی نسبت ہندوؤں نے دنیا کے منفی پہلو پر زیادہ زور دیا" جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آگے چل کر زندگی طرح طرح کی بندشوں میں جکڑ دی گئی اور مذہب بے عملی کا دوسرا نام ہو کر رہ گیا۔

مسلمانوں کے آنے سے ہندومت میں پھر حرکت پیدا ہوئی۔ راما نند (چودھویں صدی) چیتنیہ (۱۴۸۵ء تا ۱۵۳۴ء) تلسی داس (۱۵۳۲ء تا ۱۶۲۴ء) کبیر (۱۴۴۰ء تا ۱۵۱۸ء) اور نانک (۱۴۶۹ء تا ۱۵۳۸ء) اور بعد میں دوسرے مصلح اور رہنما پیدا ہوئے جنہوں نے اُدھر ہندویت کے بہترین اصولوں کو پھر زندہ کیا اور اِدھر اکثر دانسلام سے متاثر ہو کر ہندویت کی ایک نئی روش کی بنیاد ڈالی۔

یہ مذہب کا حال تھا۔ باقی رہے علوم و فنون ان میں سے اکثر کا سرچشمہ بھی مذہبی احساس اور مذہبی ضروریات تھیں۔ ہندوؤں کا عظیم الشان فلسفہ زندگی کا مفہوم سمجھنے اور اس کے مقصد کے حصول کے لئے وقف تھا۔ ہندوؤں کے نزدیک کائنات کی حقیقت روحانی ہے اور ہر شے میں ظاہر ہے۔ سچّا انسان وہی ہے جو حقیقت سے متحد ہو جائے اور اس میں گھل مل جائے۔ زندگی ایک خاص مفہوم اور ایک خاص مقصد رکھتی ہے۔ گیتا نے عوام کے لئے اِس گہرے فلسفے کی عملی تشریح پیش کی اور سمجھایا کہ خدا انسان کا ہمدرد دوست ہے اور انسان اپنے کام اور اپنی خدمت کے ذریعے سے خدا تک پہنچ سکتا ہے۔ ہندوؤں کے اخلاق میں رواداری اور خدمت کا جذبہ اور حیات کا احترام بدرجۂ اتم موجود تھا۔ ان کا آرٹ حقیقت کے انکشاف کی تشریح تھا اور اس لئے مذہبی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ ادب میں علاوہ ویدوں اُپ ویدوں اور رامائن اور مہابھارت اور گیتا کے سکنتلا اور میگھ دوت کے سے اعلیٰ ناٹک بھی شامل تھے۔ تعلیم کے سلسلے میں ہندوؤں کے ہاں بڑے بڑے دارالعلوم تھے جن میں شمال میں ٹیکسلا، وسط میں بنارس اور بہار میں نالندہ کے شہرۂ آفاق علمی مرکز تھے۔ بعض راجا علم کے بڑے قدر دان تھے اور شاعروں فلسفیوں وغیرہ کو بلوا کر کھلے دربار میں اُن کے بحث مباحثہ کراتے تھے۔ فنِ تعمیر میں کئی عظیم الشان مندر، سنگتراشی میں کئی خوبصورت بُت اور مینا کاری و نقاشی

میں کئی انوکھی تصویریں اُن کی یادگار ہیں۔ اور ہندو تہذیب محض ہندوستان تک محدود نہ تھی۔ بدھ مت کے ذریعے سے تو اس کا اثر تبت چین اور جاپان وغیرہ تک پہنچا، لیکن اس مذہبی اثر کے ساتھ ساتھ ہندوؤں نے سیام سماٹرا جاوا وغیرہ میں اپنی نوآبادیاں قائم کیں اور وہاں آج تک ہندو تہذیب کے اثرات پائے جاتے ہیں۔

مُسلمانوں کی آمد کے وقت ہندوستان کی کیا حالت تھی؟

ہندوؤں کی سماج اُن کے مذہب کا ڈھانچ ہے۔ پہلے پہل اُن میں چار بڑی ذاتیں تھیں۔ جو زیادہ تر سماجی ضرورتوں اور پیشوں کے فرق کے لحاظ سے قائم ہوئیں۔ اس وقت اس کی پابندی نہ تھی کہ ایک ذات والا کبھی دوسری ذات کا پیشہ اختیار نہ کرے یا دوسروں سے شادی بیاہ نہ کرے لیکن آگے چل کر ایک تو یہ باتیں پیدا ہوگئیں دوسرے سینکڑوں بلکہ ہزاروں الگ الگ ذاتیں بن گئیں۔ بدھ کی کوشش تھی کہ ذات پات کے اختلافات مٹ جائیں چنانچہ آٹھ نو سو سال تک ذات کا زور کم رہا۔ لیکن جب گپتا سلطنت کے زمانے میں ہندو مذہب کو پھر فروغ حاصل ہوا تو یہ اختلافات پھر نمایاں ہوگئے اور مسلمانوں کی آمد پر ذاتیں ایک دوسرے سے الگ ہو کر قطعاً علیحدہ جماعتیں بن چکی تھیں جن کا نہ آپس میں کھانا پینا تھا نہ شادی بیاہ۔

ہندوؤں کے سیاسی نظام کا یہ حال تھا کہ ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا جن کے حکمران کبھی کسی حملہ آور کے خلاف مل جاتے کبھی علیحدہ علیحدہ ہو کر آپس میں لڑنے لگتے اور کبھی کبھی کسی زبردست فاتح اور اس کے جانشینوں کے تحت میں ایک متحد حکومت کچھ عرصے کے لئے قائم ہو جاتی۔ ایسی مرکزی حکومت اکثر اپنی ماتحت ریاستوں کو خاصی آزادی دے دیتی اور مقامی حکومت تو عموماً شہر یا گاؤں کی سمیتوں سبھاؤں اور بالخصوص پنچائتوں کے ہاتھوں میں رہتی تھی جن پر راجاؤں کے بدلنے یا حملہ آوروں کے آنے جانے کا بہت کم اثر پڑتا تھا۔ ریاست زیادہ تر گاؤں کے مجموعے کا نام تھا۔ راجہ ریاست کا بادشاہ ہوتا تھا اور وہ عموماً اپنے وزیروں سے مشورہ لیتا تھا۔ لیکن قانون عموماً مذہبی حیثیت رکھتے تھے اور ہندو دھرم شاستر پر مبنی ہوتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی جمہوری ریاستوں کو گپتا سلطنت کے قیام سے بہت صدمہ پہنچا۔ اس کے بعد ہندوستان میں صرف شاہی قسم کی حکومت باقی رہ گئی۔ ہرش کے بعد ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گیا جن میں یہ صلاحیت بھی نہ رہی کہ خطرے کے وقت غنیم کے مقابلے میں مضبوطی کے ساتھ متحد ہو سکیں۔ دراصل فوجی قوت کمزور ہو چکی تھی اور گو راجپوتوں میں خودداری کی چنگاریاں موجود تھیں لیکن ملک میں قومی یگانگت کا احساس مطلق نہ تھا۔ مذہب کے سلسلے میں بدھ مت کی طاقت گھٹتی گئی۔ برہمنیت کا زور بڑھا۔ رفتہ رفتہ مورتوں کی پوجا عام ہوگئی بہت سے نئے فرقے شومت وشنومت وغیرہ قائم ہوگئے اور پرانی رسمیں اور قربانیاں پھر پرانی اور نئی شکلوں میں نمودار ہوگئیں۔

غرض مسلمانوں کی آمد کے وقت ہندوستان میں ہندو تمدن ابھی قائم تھا۔ پرانی تہذیب کی نشانیاں ابھی آنکھوں کے سامنے موجود تھیں یعنی ایک مضبوط قدیم سماجی نظام ضرور موجود تھا اور ہزاروں سال کی مذہبی و معاشرتی روایات اُس میں جڑی ہوئی تھیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جسم باقی تھا اور روح پرواز کر چکی تھی۔ زندگی کہنے کو زندگی تھی مگر دراصل وہ نیم مُردہ ہو چکی تھی۔ بدھ اور اشوک کا وہ زندہ پاکیزہ وطن، سمدرا گپتا اور بکرماجیت کا وہ منظم متمدن ملک اب کہاں باقی تھا؟ اب بھی یہاں ایک تمدن ضرور تھا مگر ٹھہرا ہوا!

(۲)

مُسلمانوں کا عہد

ہندوستان میں مُسلمانوں کی آمد ہندوستان کی تاریخ کا ایک بالکل نیا باب ہے۔ بعض متعصب مؤرخین نے اسے محض نیم وحشی

حملہ آوروں کی لوٹ مار اور ناشائستہ فاتحوں کی حکومت سے تعبیر کیا ہے۔ علاوہ مبالغہ آمیزی اور غلط بیانی کے پرلے درجے کی تنگ نظری ہے۔ یہ درست ہے کہ مسلمانوں میں خالص حملہ آور بھی تھے لوٹ مار کرنے والے بھی شامل تھے اُن میں بعض نیم شائستہ ہی تھے وہ سب کے سب اسلام کی رواداری کے نام لیوا نہ تھے لیکن تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسی مثال ہو جس میں ایک نئی حملہ آور قوم نے بڑے پیار محبت سے مفتوح قوم پر اپنا اقتدار جمایا ہو۔ شروع شروع میں اور کبھی کبھی بعد میں بھی اس اقتدار میں ہمیشہ سختی اور خشونت کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں۔ دو قوموں یا دو نسلوں کا تصادم ہوتا ہے۔ ایک حکومت کی باگ ڈور سنبھالتی ہے دوسری اُس کے پاؤں تلے چیختی چلاتی ہے عموماً دو تہذیبوں کی ٹکر ہوتی ہے نئے خیال نئے رسم و رواج آتے ہیں پھر اس سے پرانے خیالوں اور پرانے تمدن میں کیوں کر ہلکورے بلکہ جاں کنی تک کی کیفیتیں پیدا نہ ہو جائیں۔ شکر ہے کہ آریائی حملوں کی ساری تفصیلی تاریخ ہمارے سامنے موجود نہیں ورنہ کیا کیا ظلم و ستم کی داستانیں ہمارے سامنے نہ آجائیں، رونگٹے کھڑے ہو جائیں کہ کس طرح ہند کے اصلی باشندوں کی لوٹ کھسوٹ اور مار پیٹ ہوئی پھر اگر بعض مسلمان حملہ آوروں اور بادشاہوں نے بھی ایسا ہی کیا تو کیا عجب ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آٹھویں دسویں صدی کے اُس ہندوستان میں جس میں ذات پات نے پڑوسی کو پڑوسی کا غلام بنا دیا تھا غلامی کا احساس تک مٹا دیا تھا جس میں سیاسی اتحاد نام کو باقی نہ تھا زیادہ سے زیادہ چند نیک دل عالموں میں غور و فکر کا زبردست مادہ موجود تھا لیکن اکثر لوگ مذہبی رسوم و توہمات میں دھنس کر عمل کی سرگرمیوں کے ناقابل ہو گئے تھے اس ہندوستان میں جب مسلمان فاتحین کا قدم آیا تو یہ سویا ہوا ملک بیدار ہو گیا ذرا گھبرایا کانپا لیکن جاگ اٹھا اور ایک نئی زندگی سے دوچار ہوا۔ ملک کی ابتری سے لوگ اس قدر بیزار تھے کہ جب (۷۱۲ء میں) محمد بن قاسم سندھ پر حملہ آور ہوا تو برہمنوں تک نے اُس کی آؤ بھگت کی۔ اور یہ آؤ بھگت درست بھی تھی کیوں کہ حملہ آور نے تھوڑی ہی دیر میں دکھا دیا کہ وہ ایک روادار نظام کا علم بردار ہے جس کے سائے تلے وہ ہزاروں لاکھوں عیسائی اور یہودی پناہ لئے ہوئے ہیں جنہیں اپنے ہی ہم مذہبوں کی کسی سلطنت میں بھی اتنی مذہبی و معاشری آزادی نصیب نہیں ہوتی۔ "محمد بن قاسم نے خلیفۂ وقت کی منظوری عرب سے منگا کر یہ اعلان کر دیا کہ برہمن دان پن وکشنا بھینٹ جس طرح پہلے دیتے تھے اب بھی دیا کریں اور وہ اپنے مندروں میں آزادانہ پوجا پاٹ کیا کریں اور سرکاری مال گذاری میں سے تین روپیہ فی صدی برہمنوں کے لئے الگ خزانے میں جمع کیا جائے۔ برہمن اس روپیہ کو جس وقت چاہیں اپنے مندروں کی مرمت اور ضروری سامان کے لئے خزانے سے برآمد کر لیا کریں۔ پھر سب سے بڑے پنڈت کو رانا کا خطاب دے کر اُن کو امور مذہبی کا مہتمم اور افسر مقرر کر دیا"[1]۔ اس کے بعد بھی اکثر مسلمان بادشاہ اپنی رعایا سے ایسی ہی رواداری کا سلوک کرتے رہے"[2] یہاں تک کہ اورنگ زیب کی نسبت جسے متعصب بادشاہ کہا جاتا ہے سب کو معلوم ہے کہ اُس نے بعض مندروں کے لئے جائدادیں وقف کیں اُس کا ایک فرمان مورخہ ۱۵ رجمادی الثانی ۱۰۲۹ھ۔ بعض کتابوں میں نقل ہوا ہے جو الحسن گورنر بنارس کے نام سے جاری ہوا تھا اور جس میں حکم تھا کہ کوئی شخص تمہارے علاقے کے برہمنوں کے ساتھ جو قدیم بُت خانوں کے پروہت ہیں اور نیز دوسرے ہندوؤں کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہ کرے"۔ اور بعض اور مسلمان بادشاہوں نے تو فراخ دلی اور فراخ حوصلگی کے ایسے ایسے ثبوت دیئے کہ ہندو رعایا اُن کی گرویدہ اور کئی مسلمان اُن سے مایوس اور ناراض تک ہو گئے۔ سچ یہ ہے کہ ہندوستان کی اکثر موجودہ درسی تاریخیں ایک خاص ذہنیت کے ماتحت لکھی گئی ہیں اور اُن کا ایک خاص ناپاک مقصد ہے جو بہت حد تک پورا ہو چکا ہے۔ پروفیسر جی۔ ایم سین لکھتے ہیں کہ ہندوستان کی تاریخ کو از سرِ نو لکھنے اور اس میں سے دِل آزار باتوں کے نکال دینے کی اشد ضرورت ہے۔

قصہ کوتاہ مسلمان فاتحین جب ملک کو فتح کر چکے تو وہ عموماً نہایت رواداری کے ساتھ حکومت کرتے رہے اور حقیقت یہ ہے

---

[1] تاریخ "آئینۂ حقیقت نما" از اکبر شاہ خاں نجیب آبادی (منقول در "مسلمانوں کا روشن مستقبل" از سید طفیل احمد)

[2] "تاریخ کا روشن پہلو" از محمد دین فوق (" " " " ")

کہ اتنے بڑے ملک پر مسلسل طور پر صدیوں تک محض ایک تلوار کے ذریعے سے حکومت کرنا ممکن بھی نہ تھا۔ گو مسلمان فاتحین میں بعض خالص حملہ آور تھے اور اسلامی نصب العین کا بہترین نمونہ نہ تھے تاہم اسلام کا پیغام اسلامی سلطنت کے قیام کے ساتھ ہر کہ و مہ کے کانوں تک پہنچ گیا۔ اسلام ایک نئے تمدن کا علم بردار تھا۔ آریاؤں کے زمانے سے لے کر اب تک ڈھائی تین ہزار سال سے ہندوستان کو بجز آریائی خیالات کے کسی اور تمدن سے واسطہ نہ پڑا تھا۔ مسلمانوں سے پہلے جو حملہ آور آئے وہ اکثر غیر مہذب تھے اگر بعض مسلمان عارضی طور پر خونخوار حملہ آور بھی تھے تو وہ ایک نئی طرز زندگی کے پیغام بر ضرور تھے۔ برابری بھائی بندی، آزادی، یہ خیال کہ صرف ایک اَن دیکھا خدا ہی عبادت کے لائق ہے اور خدا کے سامنے سب انسان برابر ہیں کوئی پروہت نہیں، کوئی شودر نہیں، کوئی اونچا نہیں کوئی نیچا نہیں۔ عقائد میں وحدانیت اور رسالت اور اعمال میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج اور قرآن کے صریح احکام کے مطابق ان معاشری فرائض کی انجام دہی بس یہ تھا سادہ اسلام! نہ مورتیوں کا پوجنا نہ بھینٹ چڑھانا، نہ برہمنوں کا واسطہ نہ آواگون کی مسلسل زنجیریں بلکہ صرف آسمان پر ایک خدا اور زمین پر اس کے بندے سب ایک دوسرے کے برابر۔ ان خیالات نے بہت سے لوگوں اور خصوصاً نیچ ذاتوں میں ایک بجلی کی سی رَو دوڑا دی۔ تلوار کے ذریعے سے ہندوؤں کو مسلمان بنانا عموماً بازاری قصے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اگر ایک مسلمان بادشاہ نے کچھ ہندوانہ رسمیں جاری کر دیں تو دوسرے نے آکر بعض دفعہ سختی سے ان کی روک تھام کی اور بعض سخت گیر حکمرانوں نے بعض ہندو سرداروں کی بغاوت پر اُن کی سرکوبی کی اور اس کی پاداش میں بعض اوقات اُن کے مکانوں، مندروں کو بھی مسمار کر دیا لیکن اسلام کی اشاعت کا اصلی ذریعہ وہ سینکڑوں ہزاروں مسلمان علما اور صوفیا تھے جنہوں نے ہند میں صدیوں تک اس اشاعت کو اپنی زندگی کا مقصد بنائے رکھا۔ مسلمانوں کے آنے سے ہندوستان کے باشندوں کا ایک غیر ملکی نظام سے تعلق پیدا ہوا۔ ہندوستان اب دنیا سے الگ تھلگ نہ رہا پہلی بار دنیا سے اس کا ایک گہرا رشتہ قائم ہو گیا مسلمانوں میں جوش اور ولولہ اور جہاں گیری اور جہاں بانی کے جو اوصاف تھے ہندوستان کے باشندوں کی غم پسندی اور عزلت گزینی میں ان سے ایک حرکت پیدا ہوئی۔ بعض کو نری عداوت یا نفرت ہی نے بیدار کر دیا۔ غرض ہندوستان وہ ہندوستان نہ رہا۔ موجودہ ہندوستان میں مسلمانوں کا خاصا حصہ ہے۔ ہندوستان کا نام بھی مسلمانوں ہی کا دیا ہوا ہے اور یہ نام اس حقیقت کا صریح اعتراف ہے کہ یہ زیادہ تر ہندوؤں کا ملک ہے۔

مسلمانوں کی فتوحات کے اسباب ظاہر ہیں۔ ہند میں بہت سی ریاستیں قائم تھیں جن کے حکمران ایک دوسرے سے عناد اور حسد رکھتے تھے۔ اہمسا اور آرام پسندی نے حکمرانوں اور رعایا دونوں کو نرم دل سُست اور ناکارہ بنا دیا تھا۔ مذہب کی روح رخصت ہو چکی تھی۔ توہمات کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ ذاتوں کے نظام نے خدا کی مخلوق کو ٹکڑے ٹکڑے کر رکھا تھا۔ اُدھر ایک نئے مذہب نے وسط ایشیا کی مضبوط تازہ دم قوموں میں زندگی کی لہر دوڑا دی تھی۔ وہ بڑھنے اور لڑنے اور ایک نئی دنیا بسانے کی مشتاق تھیں۔ اُن میں مساوات کا جادو اپنا کام کر رہا تھا لا الٰہ الا اللہ کا اتحادی نعرہ ان کو آپس میں مربوط و متحد کئے ہوئے تھا یہ لوگ ہندوؤں سے زیادہ مضبوط تھے اور زرہ بکتر اور بعض اور نئے آلات سے واقف تھے۔ ان کے پاس بہتر گھوڑے تھے اور بابر کے وقت سے توپوں کے استعمال پر بھی قادر ہو گئے۔ اس نئے سیلاب کے آگے سویا ہوا ہندوستان کیا ٹھہر سکتا۔ یکے بعد دیگرے شہر فتح ہوئے سلطنتیں مٹ گئیں، لوگ جوق در جوق فاتحین کے آگے اپنا سر جھکانے لگے۔

مسٹر ایم این رائے نے اپنی کتاب "اسلام کا تاریخی کارنامہ" میں اسلامی فتح و نصرت کے متعدد اسباب بیان کئے ہیں۔ بدھ مت کے زوال سے ہندوستان کی معاشی اور سیاسی حالت بد سے بدتر ہو گئی تھی۔ اسلام ایک سادہ مذہب تھا اس لئے عوام خود بخود اس کی طرف کھچے چلے آتے تھے۔ ہیول بھی جو مسلمانوں کے خلاف تعصب کا دم بھرتا ہے کہتا ہے کہ "اسلام کا فلسفہ نہیں بلکہ اس کا معاشری

پروگرام تھا جس کی وجہ سے ہندوستان کے باشندوں کی اتنی کثیر تعداد مسلمان ہوگئی "کیوں کہ اسلام کا مسلک عوام الناس کے لئے جو دنیا کو جیسی وہ ہے ویسی سمجھتے ہیں بالکل کافی تھا اور تسلی بخش تھا" محمود غزنوی کی بُت شکنی نے بھی بت پرستی کو سخت صدمہ پہنچایا۔ مسٹر رائے کا قول ہے کہ اسلام نے ہندو سوسائٹی کو ابتری کی حالت سے نکالا۔ علاوہ اس کے کہ لاکھوں شودر مسلمان ہوکر آزاد انسان بن گئے خود ہندو مت پر اسلام کا براہِ راست اثر پڑا۔ کبیر نانک تکارام چیتینیہ وغیرہ اِن سب کے وجود اور خیالات کی اشاعت کا موجب اسلام ہی ہوا۔ وحدانیت کی تلوار نے کثرت کی گتھیوں کو کاٹ کر رکھ دیا اور ہندوؤں میں ایک نئی مذہبی تحریک شروع ہوئی۔

مسلمانوں کا عہد شروع ہوتے ہی تاریخ کا رخ بدل جاتا ہے۔ ایک دلیر فاتح قوم کا سیلاب آتا ہے جو صد ہی ڈیڑھ صدی میں سینکڑوں ہزاروں میل کی مسافت طے کر جاتا ہے۔ ۱۱۹۳ء سے شروع ہوکر ۱۵۲۶ء تک پانچ تُرکی اور غوری اور افغان نسل کے شاہی خاندان — خاندانِ غلاماں خلجی، تغلق، سادات، لودھی یکے بعد دیگرے دہلی میں برسرِ اقتدار ہوئے۔ قطب الدین ایبک نے دہلی میں قوت اسلام کا سر بفلک قطب مینار تعمیر کیا تو علاء الدین خلجی نے دُور دراز دکن کے بند دروازے دُنیا کے سامنے کھول دئے اور ملک کافور نے راس کماری تک پہنچ کر ہندوستان کے آخری کونے پر اسلام کا جھنڈا نصب کر دیا۔ محمود غزنوی غزنی سے چلتا ہے اور لق و دق صحرا طے کرتا ہوا سینکڑوں میل کے فاصلے پر سومناتھ کے سر پر جا دھمکتا ہے۔ خلجی حملہ آور وندھیاچل کو پھاند کر دہلی سے ہزار میل کے فاصلے پر بے دھڑک بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اِن لوگوں میں کتنا ولولہ اور جوش تھا اور ہندوستان کے باشندے کس قدر پراگندہ دل اور تتر بتر ہو چکے تھے۔

ہندوستان پر مسلمانوں کا پہلا باقاعدہ حملہ ۷۱۲ء میں ہوا۔ اس سے کئی سال پہلے عرب مبلغ ملابار اور سراندیپ (یعنی لنکا) میں اسلام کا پیغام پہنچا چکے تھے (ایک صحابی تمیم انصاری کا مزار مدراس کے قریب موجود ہے) چنانچہ اِن علاقوں کے بہت سے لوگ مسلمان ہو چکے تھے۔ خود لنکا کا راجہ مسلمان تھا۔ اس راجہ نے چند جہازوں میں حاجیوں کے ہمراہ مسلمان گورنر حجاج بن یوسف کے لئے بیش بہا تحائف بھیجے۔ سندھ کے راجہ داہر نے اِن جہازوں کو لوٹ لیا اور عرب مرد عورتوں کو قید کر لیا۔ اس ظلم پر حجاج نے ایک فوج محمد بن قاسم کی قیادت میں سندھ کی طرف بھیجی۔ محمد بن قاسم کی عمر اس وقت صرف سترہ سال کی تھی۔ یہ نوجوان عرب مسلمان سندھ کے راجہ اور ٹھاکروں کو شکستِ فاش دے کر سندھ کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک فتح کرتا چلا گیا اور یوں سندھ عربوں کی سلطنت میں شامل ہوگیا۔

محمود غزنوی ہندوستان کا دوسرا مشہور مسلمان حملہ آور ہے۔ عام درسی کتابوں میں اُسے ایک لٹیرا دکھایا گیا ہے جس نے امن پسند ہندوستان پر خواہ مخواہ حملے پر حملے کر دیئے لیکن ایک ہندو[1] مؤرخ منشی المناشی سجان رائے بھنڈاری بٹالوی کی تاریخ محررہ ۱۱۰۷ھ کی رو سے یہ امر اب تحقیق کو پہنچ چکا ہے کہ لاہور اور بھٹنڈا کے راجہ جے پال نے پہلا حملہ خود سبکتگین پر ۳۸۵ھ یعنی ۹۹۵ء میں کیا اور شہر غزنوی کے قریب جنوب کی طرف لڑائی ہوئی جس میں جے پال کو شکست ہوئی اور صلح کر کے وہ کچھ تاوان دینے کا اقرار کر کے لاہور کو روانہ ہوگیا۔ یہاں پہنچ کر اُس نے خلافِ وعدہ ہندوستان کے اور راجاؤں کو اپنے ساتھ ملایا اور اگلے سال پھر غزنی پر حملہ آور ہوا اور دوسری لڑائی لمغان کے قریب جو غزنی کے وسطی علاقے میں ہے لڑی گئی۔ جے پال کو پھر شکست ہوئی اور وہ سندھ پار کر کے بھاگ گیا۔

۹۹۷ء میں سبکتگین مر گیا۔ اور اُس کی جگہ اس کا بیٹا محمود تخت نشین ہوا۔ سبکتگین کی طرح محمود کی توجہ بھی اوّل اوّل ترکستان اور ایران کی طرف منعطف تھی اور اسے عالم اسلامی میں اپنی طاقت بڑھانے اور شہرت حاصل کرنے کے بہت موقع حاصل تھے مگر بد قسمتی سے جے پال نے دوبارہ شکست کھا کر تیسری بار پھر قسمت آزمائی کی ٹھانی تھی اور اس کی ترغیب پر کئی راجاؤں اور برہمنوں نے سارے شمالی ہندوستان میں سنگٹھن کی تحریک شروع کر کے غزنی کی تسخیر کے لئے ہندوؤں کا ایک جرار لشکر تیار کیا جو ۱۰۰۱ء میں دریائے سندھ کے کنارے جمع ہوگیا۔ مجبوراً محمود کو اپنی فوجیں بڑھانی پڑیں۔ پشاور کے قریب دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا اور جے پال کو تیسری بار فاش شکست ہوئی اور وہ قید

---

[1] دیکھو "آئینۂ حقیقت نما" از مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی جلد اوّل صفحہ ۱۵۱

کر لیا گیا۔ قید سے رہا ہو کر لاہور پہنچ کر وہ ندامت کے مارے آگ میں جل مرا۔ اور اس کی جگہ اس کے بیٹے انندپال نے اپنے باپ کی شکست و شرمندگی کا داغ مٹانے کے لئے پھر محمود سے لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔

اس سے کم از کم یہ صاف ظاہر ہے کہ زیادتی کی ابتدا کس کی طرف سے ہوئی۔[1] اس کے بعد محمود نے ۱۰۲۷ء تک ہندوستان پر پے در پے سولہ حملے کئے۔ ہندوستان کو لوٹا بتوں کو توڑا ملک کو تاخت و تاراج کیا۔ اور ۱۰۲۱ء میں لاہور کے صوبے کو غزنی کی سلطنت میں شامل کر لیا۔

۱۱۹۲ء میں محمد غوری نے تھانیسر کے قریب ترائن کے میدان میں پرتھی راج کو شکست دی اور ۱۱۹۳ء میں اس کے نائب قطب الدین ایبک نے دہلی پر قبضہ کر لیا۔ یہ ہندوستان میں اسلامی حکومت کی ابتدا تھی۔ اس لئے ہم محمد غوری کو ہندوستان کی اسلامی سلطنت کا بانی کہہ سکتے ہیں۔ ادھر ایبک وسط ہند کو فتح کرنے میں مصروف تھا اُدھر اس کا سپہ سالار بختیار خلجی بہار اور بنگال پر قبضہ کر رہا تھا۔ ایبک کے بعد التمش دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ ایبک محمد غوری کا غلام تھا التمش ایبک کا غلام تھا۔ اسی لئے دہلی کا یہ پہلا اسلامی شاہی خاندان **خاندانِ غلاماں** کہلاتا ہے۔ اسلام نے غلام کا مرتبہ اتنا بڑھا دیا تھا کہ غلام سپہ سالار اور نائبِ سلطنت اور بادشاہ تک بن رہے تھے۔ التمش اور بلبن اس عہد کے سب سے بڑے بادشاہ تھے انہوں نے سلطنت کو مستحکم کیا اور نظم و نسق کے دستور اور ضابطے مقرر کئے۔ مشہور شاعر امیر خسرو بلبن کے دربار کا ایک رکن تھا۔

اس زمانے میں غلام بادشاہوں نے اپنی طاقت سے ہندوستان کو چنگیز خانی مغلوں کے وحشیانہ مظالم سے جنہوں نے بخارا اور سمرقند اور خیوا کو تاراج کر کے بغداد میں اسلامی تمدن تہ و بالا کر دیا بچائے رکھا۔

خاندانِ غلاماں کے بعد سنہ ۱۲۹۰ء میں خلجی ترکوں کی حکومت دہلی میں قائم ہوئی۔ **خلجی خاندان** کا سب سے نامور بادشاہ علاء الدین گذرا ہے۔ علاء الدین جب کسی کام کا ارادہ کر لیتا تو اُسے کوئی چیز نہ روک سکتی تھی۔ اس نے سکندر کی طرح دنیا کو فتح کرنے کا منصوبہ باندھا جو پہلے وہ سارے ہندوستان کو مغلوب کرنے کے لئے نکلا۔ اس نے ایک زبردست فوج تیار کی اور سلطنت کو خوب مستحکم کیا۔ وہ پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس نے بندھیاچل کو پار کر کے دکن کے نامعلوم علاقے کو فتح کرنا چاہا۔ اس کے منچلے سپہ سالار ملک کافور نے ہزاروں میل طے کر کے راس کماری تک پہنچ کر وہاں ایک مسجد تعمیر کی۔ علاء الدین کو توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ مغلوں کا خطرہ دور ہو گیا اُمرا کی طاقت ٹوٹ گئی اور ہندو رعایا مطیع ہو گئی۔ اس نے پہلے پہل مذہب کو سیاست کے تابع کیا لیکن چونکہ سارا نظامِ سلطنت اُس کی ذات سے وابستہ تھا سو اس کی سلطنت کی عظمت اُس کی ذات کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔

خلجیوں کے بعد سنہ ۱۳۲۰ء میں **تغلق خاندان** کی حکومت شروع ہوئی۔ اس خاندان کا سب سے بڑا بادشاہ محمد تغلق تھا جسے غلط طور پر ایک دیوانہ بادشاہ کہا گیا ہے۔ حال کی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ اس غلط خیال کی بنا اس کے ہم عصر متعصب مؤرخ ضیاء الدین برنی کے بیان سے پڑی۔ محمد تغلق کی جدت پسندی اس کے ہر منصوبے میں عیاں تھی۔ پائے تخت بدلنے کی تجویز زراعت کے ایک خاص محکمے کا قیام اور مالیاتی تجربے اسی نوع کے منصوبے تھے۔ بدقسمتی سے زمانہ اس کا ساتھ نہ دے سکا اور وہ اپنے اکثر منصوبوں میں ناکام رہا۔ فیروز تغلق اس کے مقابل میں ایک کمزور فرماں روا تھا۔ لیکن فیروز نے اپنے عہد میں رفاہ عام کے بہت سے کام سرانجام دیئے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے عہد میں چھوٹی بڑی ۵۰ نہریں، ۲۰۰ سرائیں، ۵ شفاخانے ۱۰۰ پل ۳۰ شہر اور بیسیوں قسم کے اور مفید ادارے قائم ہوئے۔ فیروز آباد میں اس نے ایک بڑا گھنٹہ گھر بنوایا جو ہندوستان میں غالباً سب سے پہلا گھنٹہ گھر تھا۔[2] کاشتکار مالامال اور رعایا خوش حال رہی کئی قسم کے ٹیکس منسوخ کر دیئے گئے مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح کی طرف توجہ کی گئی مثلاً عورتوں کا مزاروں پر جانا بند کیا گیا۔

فیروز تغلق کے بعد تغلق خاندان کی حکومت دیر تک قائم نہ رہی۔ سلطنت کا زوال بغاوت، خانہ جنگی، جاگیری نظام غلاموں کی جمعیت

---

[1] آئینۂ حقیقت نما جلد اول صفحات ۱۵۶ تا ۱۸۲ [2] مختصر تاریخ ہند از سید ابوظفر ندوی صفحہ ۶۹۔

اور بعد کے حکمرانوں کی نااہلی سے ہوا۔

اس پر ۱۳۹۸ء میں تیمور کے ہولناک حملے نے آکر حکومت کی رہی سہی طاقت کو سلب کرلیا۔ ملک میں ہر طرف بدامنی پھیل گئی اور سارا سیاسی اور معاشرتی نظام درہم برہم ہوگیا۔

تغلقوں کے بعد **خاندانِ سادات** (۱۴۱۴ء تا ۱۴۵۰ء) اور اس کے بعد **خاندانِ لودھی** (۱۴۵۰ء تا ۱۵۲۶ء) کی حکومت رہی۔ خاندانِ لودھی میں بہلول لودھی ایک زبردست حکمران گزرا ہے۔ اس نے سختی سے سرکش سرداروں کی سرکوبی کرکے اپنی طاقت کو مستحکم کیا اور ملک کو ایک مضبوط حکومت کی نعمت بخشی۔ لیکن آخری بادشاہ ابراہیم لودھی کے عہد میں بعض اُمرا نے سلطنت کا رنگ بگڑتے دیکھ کر بابر کو ہندوستان آنے اور حکومت سنبھالنے کی دعوت دی۔ ۱۵۲۶ء میں بابر آیا۔ پانی پت کی پہلی لڑائی ہوئی اور مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔

تیمور کے حملے کے بعد ملک میں جابجا **خودمختار اسلامی ریاستیں** قائم ہونی شروع ہوگئیں۔ بنگال، جون پور، گجرات، مالوہ، خاندیش بہمنی سلطنت یہ سب یکے بعد دیگرے دہلی سے خودمختار ہوگئیں۔ جون پور کو بہلول لودھی نے فتح کیا، باقیوں نے اکبر کے آگے ہتھیار ڈال دیئے یہ **بہمنی سلطنت** (۱۳۴۷ء تا ۱۵۲۵ء) تقریباً دو صدیوں تک دکن میں ایک سمندر سے دوسرے سمندر تک پھیلی رہی۔ اس کے زوال پر رفتہ رفتہ پانچ چھوٹی چھوٹی خودمختار ریاستیں بیجاپور احمد نگر گول کنڈہ برار اور بیدر قائم ہوئیں۔ ان ریاستوں نے مل کر وجیانگر کی عظیم الشان ہندو ریاست کا تلی کوٹ کے میدان میں (۱۵۶۵ء میں) خاتمہ کردیا۔ اس کے علاوہ دو اور ہندو ریاستیں تھیں اڑیسہ جسے اکبر نے فتح کیا اور میواڑ جسے اکبر بھی زیرنگین نہ کرسکا۔

یہ امر قابلِ غور ہے کہ ان چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں شائستگی کے دلکش مرکز قائم ہوگئے اور انہوں نے ایک ہندوستانی تمدن کے ارتقا میں بڑا حصہ لیا۔ جون پور ہندوستان کا شیراز کہلاتا تھا۔ اس کا مشہور بادشاہ ابراہیم (۱۴۰۱ء تا ۱۴۴۰ء) عربی فارسی علم ادب کے مُربّی ہونے کے علاوہ خود موسیقی کا ماہر تھا۔ گجرات کا دارالسلطنت احمد آباد ہندوستان کا سب سے خوبصورت شہر سمجھا جاتا تھا اس کی عمارتیں اور مسجدیں دور دور تک مشہور تھیں گجرات کے بادشاہ نے پرتگالیوں سے بحری لڑائی بھی لڑی لیکن شکست کھائی ہندوستان کے دروازے پر ایک نئی طاقت دستک دے رہی تھی جس کا صحیح اندازہ بعد میں جاکر ہونے والا تھا۔ مالوہ کے ہوش مند بادشاہ ہوشنگ شاہ کا شہر مانڈو احمد آباد سے مقابلہ رکھتا تھا۔ بیجاپور کی مسجدیں اور مقبرے اور گول کنڈہ کا عظیم الشان کوہستانی قلعہ گزری ہوئی عظمت کی یادگار ہیں۔ وہ گول کنڈہ کے قطب شاہی ہی تھے۔ جنہوں نے ۱۵۹۱ء میں حیدرآباد کا شہر آباد کیا۔ وجیانگر کی ہندو ریاست جس کی بنیاد ۱۳۳۶ء میں ایک منچلے تلنگے سردار کے ہاتھوں پڑی۔ اس قدر ترقی یافتہ تھی کہ ۱۴۴۳ء میں جب ایرانی سفیر عبدالرزاق نے اس کی سیر کی تو اس نے لکھا کہ ایسا شہر میری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا۔ شہر کے سات برج ہیں اور سات دیواریں جو ایک دوسری کے اردگرد بنائی گئی ہیں۔ بازار خوب چوڑے اور بہت لمبے ہیں۔ ہر جگہ پھول بکتے ہیں۔ یہ لوگ پھولوں کے بغیر جی نہیں سکتے۔ اُن کے لئے یہ ایسے ہی ضروری ہیں جیسے خوراک۔ بازاروں میں ہیرے موتی اور جواہرات بکتے ہیں اور شہر کے اندر پختہ نہریں لہریں لیتی ہوئی بہتی ہیں۔ بادشاہ کا محل عالیشان ہے اس کا تخت بہت بڑا ہے وہ سونے کا بنا ہوا ہے اور اس میں جابجا جواہرات جڑے ہوتے ہیں"۔ ایک پرتگالی کا بیان ہے کہ وجیانگر کی حکومت ایک پوری مطلق العنان حکومت تھی۔ وہاں کے لوگ گائے کے گوشت سے تو پرہیز کرتے تھے لیکن باقی ہر قسم کے جانوروں اور پرندوں کا گوشت یہاں تک کہ چڑیوں، چوہوں بلیوں اور چھپکلیوں کا گوشت بھی کھا جاتے تھے۔ سلطنت کے دو سو ضلعے تھے اور دس لاکھ فوج تھی کیمبرج کی تاریخ ہند کے مطابق غریب کسانوں کا نہ بہمنی سلطنت کے سلطانوں کو دھیان تھا نہ وجیانگر کے راجاؤں کو۔

یہ مختلف ریاستیں تھیں جو مغلوں کے ہندوستان میں آنے کے وقت موجود تھیں۔ ملک سیاسی طور پر متحد نہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے حکمران ایک دوسرے سے لڑتے بھڑتے تھے۔ اس حال میں بابر کی کشورکشائی کامیاب ہوئی۔ افغانوں اور راجپوتوں کا زور ٹوٹ گیا اور ہندوستان میں ایک مضبوط اور متمدن حکومت کی بنیاد رکھی گئی۔

بابر (۱۵۲۶ء تا ۱۵۳۰ء) ایک منچلا فاتح تھا۔ اس نے چند سالوں میں ایک وسیع سلطنت قائم کرلی جو کابل سے لے کر گوالیار اور پنجاب سے بنگال تک پھیلی ہوئی تھی۔ فتوحات کے ساتھ ساتھ اس نے ملک کی عام حالت کی درستی کی طرف بھی توجہ کی۔

ہمایوں (۱۵۳۰ء تا ۱۵۵۶ء) فیاض اور رحم دل تھا لیکن اس میں عمل اور استقلال کی کمی تھی۔ ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ نے موقع پاکر دہلی کے تخت پر قبضہ کرلیا اور سولہ سال تک سوری خاندان کی حکومت قائم رہی۔

شیر شاہ (۱۵۴۰ء تا ۱۵۴۵ء) نے افغانوں کی عظمت کو دوبارہ ہندوستان میں زندہ کردیا۔ اُس کی قابلیت اور شجاعت کی وجہ سے اُس کا شمار ہندوستان کے سب سے بڑے بادشاہوں میں ہوتا ہے۔ اس نے صرف پانچ سال حکومت کی لیکن اُس کی انتظامی اصلاحات نے فی الحقیقت مغلیہ سلطنت کی عظمت کی بنیاد قائم کی۔ اس نے ملکی تنظیم دیہات سے شروع کی اور گاؤں کو انتظامی حلقہ بنایا۔ پیداوار کا تیسرا حصہ لگان قرار دیا۔ رشوت ستانی کا انسداد کیا۔ فوج کو ترتیب دیا۔ عدل وانصاف کی راہیں آسان کردیں۔ لمبی لمبی سڑکیں اور سرائیں بنوائیں ڈاک کا انتظام کیا۔ غرض رفاہِ عام کے کئی بڑے اور چھوٹے کاموں کی داغ بیل ڈالی۔

مغلیہ حکومت کی توسیع واستحکام اکبر (۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء) کا کارنامہ ہے۔ مالوہ پنجاب، گجرات بہار کشمیر سندھ، اڑیسہ بلوچستان قندھار، احمد نگر اور خاندیش فتح ہوئے یعنی اکبر کی سلطنت کابل سے لے کر دریائے گوداوری کے کناروں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسے پندرہ صوبوں میں منقسم کیا گیا اور صوبہ دار سے لے کر مقدم اور پٹواری تک حکومت کا ایک باقاعدہ نظام قائم کردیا گیا جس کی نشانیاں آج تک ہندوستان کے نظم ونسق میں ظاہر ہیں۔ فوج کا منصب داری نظام اور علیحدہ شعبے بحری محکمہ جس کا سرکردہ ایک امیرالبحر تھا۔ مال میں ٹوڈر مل کا مشہور بندوبست، عدالت میں صدرِ صدور اور قاضی اور میرِ عدل کے عہدے، تعلیم، ڈاک، آمد ورفت، ٹکسال، پولیس یہ سب انتظامات ایسی مضبوطی کے ساتھ قائم کردیئے گئے کہ پھر کم ازکم ڈیڑھ سو سال تک ان میں ذرا خلل نہ آنے پایا۔ مگر اکبر کا سب سے عجیب وغریب کارنامہ اُس کی مذہبی وسیاسی پالیسی تھا۔ اُس نے راجپوتوں کو تسخیر کرنے کے لئے ان سے شادی بیاہ کے تعلقات بڑھائے، ہندوؤں کو سلطنت کے بڑے سے بڑے عہدے دیئے۔ بڑی سے بڑی فوجی مہمیں راجہ بھگوان داس اور راجہ مان سنگھ وغیرہ کے زیرِ قیادت روانہ کیں۔ جاتریوں کا محصول اور جزیہ معاف کردیا اور نکاحِ بیوگان ستی اور ذات پات کے معاملے میں ہندو معاشرت کی اصلاح کی کوشش کی۔ اکبر کا نصب العین ہندوستان کی تمام قوموں کا مکمل اتحاد تھا۔ اس غرض سے اُس نے (۱۵۸۲ء میں) اپنا "دینِ الٰہی" جاری کیا جس کے ذریعے سے ملک کے تمام مذاہب کو ملانے اور گویا ایک مشترک مذہب بنادینے کی کوشش کی گئی۔ اکبر کے اس منصوبے پر مختلف خیالات کا اظہار کیا گیا ہے کوئی اسے مذہبی وروحانی جذبے سے تعبیر کرتا ہے کوئی اسے سیاسی فریب دہی پکارتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ ایک گہرا سیاسی منصوبہ تھا جو بظاہر مضحکہ خیز لیکن فی الحقیقت نیک نیتی پر مبنی اور نتیجہ خیز تھا۔ غیر مسلم جو اس کے معتقد نہ بھی ہوئے اس سے خوش ہوگئے۔ مسلمانوں کا ایک خاصا گروہ قدرتی طور پر اس سے ناراض تھا وہ اسے اسلام کی توہین سمجھتا تھا۔ رواداری کی اس حکمتِ عملی سے ایک طرف مغلیہ حکومت کی بنیادیں مضبوط ہوگئیں، ہندو رعایا کے دل میں یہ حکومت گھر کرگئی اور اُس مشترک ہندوستانی تہذیب کو جو مغلوں کے آنے سے پہلے ہی ہندوستان کے اطراف میں نشو ونما پارہی تھی بڑی تقویت پہنچی۔ اور دوسری طرف بہت سے مسلمانوں کے دل میں وہ شکایات پیدا ہوئیں جن کا آگے چل کر اورنگ کے عہد میں سدِ باب کرنا ضروری سمجھا گیا۔

اکبر کی پالیسی سے کسی کو اتفاق ہو نہ ہو اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ اکبر گوناگوں اوصاف کا مالک تھا۔ وہ ایک بہادر سپاہی، ایک عقلمند سپہ سالار، ایک زبردست حکمران، ایک دوراندیش مدبر، ایک نیک نیت مصلح اور ایک ہمدرد انسان تھا۔ اس کا شمار بلاشبہ ہندوستان کی عظیم ترین شخصیتوں میں ہے۔

اکبر کی بدقسمتی تھی کہ اُس کی اولاد میں اس کے اوصاف موجود نہ تھے۔ جہانگیر (۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۷ء) کی شخصیت اور اس کا عہدِ حکومت اگر دل کش ہے تو زیادہ تر نور جہاں کی وجہ سے۔ اُسے ادب تاریخ جغرافیہ سے دل چسپی تھی نقاشی نے اس کے عہد میں ترقی پائی۔ اُس کا زمانہ

شاہ جہان کے زمانے کی طرح ایک امن وامان کا زمانہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ امن اور عدل وانصاف کی نعمتیں پاکر رعایا اپنے حکمرانوں کی طرف سے دلی اطمینان رکھتی ہے۔

شاہ جہان (۱۶۲۷ء تا ۱۶۵۸ء) کے پُرامن عہد میں ملکی نظم ونسق نے فروغ پایا۔ لوگوں کی خوش حالی حکومت کی آمدنی اور ملک کی عام ترقی سب میں قابل قدر اضافہ ہوا۔ نقاشی ادب موسیقی اور بالخصوص فنِ تعمیر کو چار چاند لگ گئے۔ شاہ جہان کی شخصیت شائستگی کا آئینہ تھی اُس کا دربار شان وشوکت کا نمونہ تھا۔ ہندوستان بجا طور پر اپنی حالت پر ناز کر سکتا تھا۔

اورنگ زیب (۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء) سب سے زبردست مغل شاہنشاہ تھا۔ اورنگ زیب کے عہد میں مغلیہ سلطنت اپنی معراج کمال پر پہنچ گئی۔ سرحد اور افغانستان پر مضبوطی سے قبضہ کرلیا گیا۔ چٹاگانگ فتح ہوا۔ راجپوت اٹھے جاٹ اٹھے سکھوں نے شورش کی سیواجی نے قتل وغارت کا بازار گرم کیا۔ اِن سب باغیوں کی سرکوبی ضروری تھی اور کی گئی۔ دکن کی شیعہ ریاستوں بیجاپور اور گول کنڈہ کو فتح کرکے سلطنت میں شامل کرلیا گیا۔ چنانچہ ۱۶۹۰ء میں مغلیہ سلطنت کا پھیلاؤ کشمیر سے راس کماری اور کابل سے چٹاگانگ تک تھا۔

اورنگ زیب کی بابت بہت اختلاف رائے ہے اکثر مسلمانوں نے اُسے بہترین حکمران اور ہندوؤں اور انگریزوں نے عموماً اُسے بدترین حکمران کہا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اورنگ زیب بعض معاملات میں بلند نظر نہ تھا مصلحت بینی اس کے اوصاف میں داخل نہ تھی اور بے اعتمادی اُس کی فطرت کا ایک جزو بن گئی تھی لیکن پہلے حکمرانوں کو بھی دیکھو کہ اُن میں کیا کیا کمزوریاں تھیں پھر اس کے حالات کو دیکھو کہ کیا کیا پیچیدگیاں پیدا ہوچکی تھیں اور پھر اُس پر حکم لگاؤ کہ وہ ایسا تھا اور ایسا نہ تھا۔ اس نے کیا کیا اور کیا وہ نہ کرسکا۔ اس نے بھائیوں کو قتل کیا اور باپ کو قید کر رکھا لیکن ہم بھول جاتے ہیں کہ خود اس کے باپ نے تخت پر بیٹھتے ہی اکبر کی نسل کے تقریباً سارے شہزادوں کو بیک وقت قتل کرادیا۔ بدقسمتی سے مغلیہ سلطنت میں جانشینی کا مسئلہ عموماً تلوار ہی کے ذریعہ سے طے ہوتا تھا۔

عام تاریخوں کے پڑھنے سے خیال آتا ہے کہ اس نے ہندوؤں پر بہ حیثیت ہندو ہونے کے ظلم کئے اور اُن کو زبردستی مسلمان کیا۔ یہ محض لغو اور ایک غلط بہتان ہے۔ وہ راجپوتوں سے لڑا لیکن صلح ہونے پر انھوں نے مرہٹوں کے خلاف اس کی مدد کی۔ مشہور بنگالی عالم سرسی پی رائے لکھتے ہیں کہ "اورنگ زیب کے عہد میں بنگال کے ہندوؤں کو منصب داری اور بڑی بڑی جاگیریں عطا کی گئیں۔ اورنگ زیب نے ہندوؤں کو گورنر بنایا گورنر جنرل بنایا وائسرائے بنایا یہاں تک کہ اس نے خاص اسلامی صوبے افغانستان پر بھی جو نائب دار السلطنت مقرر کیا وہ ہندو راجپوت ہی تھا[1]۔ اورنگ زیب نے بعض مندروں کے لئے جائدادیں وقف کیں[2]"۔ جس بادشاہ نے مندروں اور برہمنوں اور عام ہندوؤں کی حفاظت کے لئے فرمان جاری کئے وہ ساتھ ہی اُن کو گرانے اور مٹانے کا حکم کیسے جاری کرسکتا تھا؟ واقعہ یہ ہے کہ اکبر اور خصوصاً جہانگیر اور شاہ جہان کے عہد میں بعض مفسدہ پرداز ہندوؤں نے مسلمانوں پر ظلم وتعدّی شروع کردی تھی جیسا کہ شاہ جہان نامہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہندو مسلمان عورتوں سے بہ جبر شادی کرتے تھے اور ان کو گھروں میں ڈال لیتے تھے اس سے بڑھ کر یہ کہ مسجدوں کو توڑ کر اپنی عمارتوں میں داخل کرتے تھے یا اُن کی جگہ مندر بنا لیتے تھے[3]۔ مسلمان اِن باتوں سے بہت آزردہ ہو رہے تھے۔ خود دارا شکوہ علانیہ ہندوپن کا اظہار کرتا تھا چنانچہ ایک جگہ اس نے لکھا ہے کہ "قرآن مجید اصل میں اُپنشد میں ہے"۔ جب اورنگ زیب تخت نشین ہوا تو اس نے مسلمانوں کی شکایات کو رفع کرنے کی طرف توجہ کی۔ اس سے پہلے شاہ جہان نے تخت نشین ہوتے ہی تمام وہ مندر جو ابھی تکمیل کو نہ پہنچے تھے گروا دیئے اب اورنگ زیب نے بعض ایسے مندروں کو جو مسجدوں کی جگہ بنائے گئے تھے گروا دیا یا بعض مندروں کو محض بغاوت برپا کرنے کی پاداش میں گرایا۔ مذہب کو ان باتوں سے کوئی تعلق نہ تھا یہ محض سیاسی کارروائیاں تھیں۔

اس نے جزیہ کو ضرور پھر جاری کیا۔ اور مصلحۃً ایسا نہ کیا جاتا تو بہتر ہوتا لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ جزیہ کوئی ہندوؤں کو مسلمان کرنے کا ذریعہ

---

[1] "مسلمانوں کا روشن مستقبل" صفحہ ۲۰۷ (۲) ایضاً صفحہ ۲۳ (۳) "اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر" از شبلی صفحہ ۶۵

نہ تھا بلکہ محض ایک ٹیکس تھا جو تمام اُن غیر مسلموں پر عائد کیا جاتا تھا جو فوجی خدمت ادا نہ کرتے تھے اور ان میں جو لوگ بھی مسلمانوں کی طرح فوجی خدمت میں حصہ لیتے تھے اُن سے یہ ٹیکس وصول نہ کیا جاتا تھا۔

سلطنت کا نظم و نسق بدستورِ سابق قائم تھا۔ صرف سلطنت کی توسیع کے باعث بجائے پندرہ کے اب اٹھارہ صوبے بنا دیئے گئے۔ اورنگ زیب ایک پکا مسلمان تھا۔ لہٰذا اُس نے قرآن کے احکام کے مطابق بعض باتوں میں تبدیلیاں کیں۔ اکبر کا سنہ الٰہی منسوخ کر دیا گیا کم از کم اسّی ناجائز محصولات کو جن کی آمدنی کروڑوں سے زیادہ تھی اورنگ زیب نے یک قلم موقوف کر دیا۔ مال گذاری کا ایک جدید دستور العمل بنایا گیا۔ بقول لین پول اکبر کے عہد میں سلطنت کی آمدنی ایک کروڑ نوّے لاکھ پونڈ شاہ جہان کے عہد میں ۲ کروڑ ۲۷ لاکھ ۵۰ ہزار اور اورنگ زیب کے عہد میں ۴ کروڑ پونڈ یعنی ۶۰ کروڑ روپیہ تھی۔ یہ اضافہ زیادہ تر بندوبست کی خوبی اور ملک کی آبادی کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔ اورنگ زیب نے تعلیم کو جس قدر ترقی دی ہندوستان میں غالباً کسی عہد میں نہیں ہوئی تھی۔ علماء کے لئے روزینے اور طلبا کے لئے وظائف مقرر تھے، ہملٹن کہتا ہے کہ صرف ٹھٹھہ کے شہر میں ۴۰۰ مدارس تھے۔ پیشکش اور نذرانہ کی رسم، بادشاہ کے درشن کا طریقہ۔ بادشاہ کو سجدہ کرنا اور بادشاہ پرستی کی بیسیوں اور رسموں کو اُس نے منسوخ کر دیا۔ وہ دن میں دو دفعہ دربارِ عام کرتا تھا جہاں مطلق کسی کو روک ٹوک نہ تھی۔ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی جو چاہتا تھا کہتا تھا اور اورنگ زیب نہایت توجہ سے سنتا تھا۔ بادشاہ کی جیب خرچ کے لئے جو کروڑوں روپے کی آمدنی کے علاقے مخصوص تھے اورنگ زیب نے اُن میں سے چند گاؤں اپنے مصارف کے لئے مخصوص کر کے باقی سب کو بیت المال قرار دیا۔ وہ اپنے ہاتھ کی محنت سے اپنی خوراک بہم پہنچاتا تھا۔عہ

یہ ضرور ہے کہ وہ ایک سیدھا سادھا روکھا پھیکا مذہبی آدمی تھا۔ دربار میں گانا بجانا بند ہو گیا، شراب نوشی کی ممانعت کر دی گئی، قحبہ خانے توڑ دیئے گئے۔ اُس کے مزاج میں سخت کفایت شعاری تھی، وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا، اس نے مرہٹوں کے تعاقب میں ضرورت سے زیادہ کوشش اور روپیہ صرف کیا۔ اور اپنی سلطنت کو ضرورت سے زیادہ وسعت دے دی۔ کہا گیا ہے کہ اس نے مغلیہ سلطنت کی قبر دکن میں اپنے ہاتھوں کھودی اور خواہ مخواہ مسلمان ریاستوں کو برباد کیا اس کے متعلق اختلاف رائے ممکن ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اوّل تو دکن کی مہمیں گویا اس نے وراثت میں پائی تھیں اور اب دکن کی مسلمان ریاستوں میں زیادہ جان باقی نہ رہی تھی اور دوسرے سیواجی کی باکمال شخصیت نے ہندوستان میں ایک زبردست ہندو طاقت کی بنیاد ڈال دی تھی۔ سیواجی کے "سوراج" میں ہندوؤں کی ایک خود اختیاری حکومت کی خواہش تڑپ رہی تھی اور مغل شاہنشاہ نے اپنی زندگی میں باغیوں پر فتح پالی لیکن وہ زمانے کے میلانات کو ہمیشہ کے لئے کس طرح روک سکتا تھا۔ اورنگ زیب کی ہمت، شجاعت معاملہ فہمی و مردم شناسی، صبر و استقلال اور بیسیوں اور اوصاف کا اُس کے دشمنوں کو بھی اعتراف ہے۔ اگر اس کے جانشین نکمّے نہ ثابت ہوتے اور مسلمان امراء اس قدر سست اور خود غرض نہ ہو گئے ہوتے تو غالباً مغل سلطنت کو اس قدر جلد زوال نہ ہوتا۔ حقیقتہً باوجود اپنے نقائص کے وہ دنیائے اسلام اور ہندوستان کا آخری بڑا حکمران تھا۔

(باقی) بشیر احمد

عہ اورنگ زیب پر ایک نظر (شبلی) صفحہ ۱۲۷

گھریلو مشاعرہ

۲۵ جون ۱۹۴۲ء کو مدیر ہمایوں کی عارضی سکونت گاہ واقعہ سنوار باغ سری نگر (کشمیر) میں ایک مختصر سا "گھریلو مشاعرہ" ہوا۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی۔ خان بہادر مرزا جعفر علی خان آثر ہوم منسٹر کشمیر، ڈاکٹر محمد دین تاثیر پرنسپل سری نگر کالج، راجہ نرندر ناتھ صاحب اور چند اور احباب شریکِ مجلس تھے۔ حضرت اثر نے کشمیر پر اپنی دل کش نظمیں پیش کیں۔ تاثیر صاحب نے اپنی نظم "جل رہا ہے چراغ مندر میں" سنائی۔ مدیر ہمایوں نے مہمانوں کے خیر مقدم میں ایک مزاحیہ نظم پڑھی اور کیفی صاحب نے اپنے تازہ ترین کلام سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ کیفی صاحب کی رُباعی اور غزل شکریے کے ساتھ ذیل میں درج کی جاتی ہے:—

رُباعی

آج کل زُبدۂ اکنافِ جہاں ہے کشمیر — کیوں نہ دِل چسپ کھنچے حُسنِ سخن کی تصویر
راجہ صاحب ہیں اثر اور ہیں تاثیر یہاں — اور وہ محسنِ اُردو جسے کہتے ہیں بشیر

غزل

زمانے سے مہر و وفا چاہتا ہوں — ذرا دیکھنا کس سے کیا چاہتا ہوں
سُنے دِل سے دِل کی کہوں جس سے باتیں — وہ مونس وہ دردِ آشنا چاہتا ہوں
نہیں شوخ چشمی۔ یہ جوشِ فنا ہے — کہ تجھ سے تجھے اے خدا چاہتا ہوں
منوّر منوّر، درخشاں درخشاں — دل و دیدہ طور آشنا چاہتا ہوں
ہر اک شے میں حُسنِ ازل گو ہے پنہاں — اُسی جلوہ کو برملا چاہتا ہوں
کہیں مَیں، کہیں دل، تو پھر کون جانے — وہ کیا چاہتا ہے، میں کیا چاہتا ہوں
خودی جذب ہونے کو ہے بےخودی میں — کہ اپنے ہی میں گم ہوا چاہتا ہوں
مرے ذوق میں ہے لطافت پسندی — نہیں حسن، حسنِ ادا چاہتا ہوں

زباں سے زمانے کی بچنے کو کیفی
میں اک کفرِ ایماں نما چاہتا ہوں

کیفی دہلوی

تنگدستی کا علاج

ڈاکٹر یزدانی حسبِ معمول اپنے دواخانے میں انگیٹھی کے قریب بیٹھے خیالات کی بھول بھلیاں میں چکر لگا رہے تھے۔ انہوں نے کمبل اوڑھ رکھا تھا اور اخبار ہاتھ سے گر کر فرش پر بکھرا پڑا تھا۔ وہ عموماً صبح کی بجائے شام کے وقت اخبار خریدتے تھے۔ اس طرح دو پیسے کی بچت ہو جاتی تھی۔ اخبار بیچنے والا لڑکا انہیں شام کو اخبار دے جاتا اور ایک آنے کی جگہ دو پیسے لے لیتا تھا۔ اس وقت بھی بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اخبار پڑھتے پڑھتے اُکتا گئے ہیں اور کوئی دلچسپ خبر نہ پاکر خیالی دنیا میں گھومنے چلے گئے ہیں۔

ڈاکٹر یزدانی ہومیو پیتھک ڈاکٹر تھے۔ اس کے علاوہ ایک مقامی اسکول میں مدرس بھی تھے اور ساتھ ساتھ بھیڑ بکری کی کھال کا کاروبار بھی کرتے تھے۔ ان تمام پیشوں کو اگرچہ ایک دوسرے سے کوئی مناسبت نہ تھی لیکن ڈاکٹر یزدانی کی ہر فن مولا طبیعت کا یہ ادنیٰ کرشمہ تھا کہ وہ سب کو یکساں نبھائے چلے جا رہے تھے۔ اس سلسلے میں حیرانی کی بات یہ ہے کہ تمام پاپڑ بیلنے کے باوجود ڈاکٹر صاحب کی زبان پر ہمیشہ مفلسی اور تنگدستی کا گلہ رہتا تھا۔ وہ جب دوستوں میں بیٹھتے یہی شکایت کرتے تھے کہ خرچ اور آمدنی کی رفتار برابر نہیں ہے۔ زندگی کی ضروریات بڑھتی جا رہی ہیں۔ ہزار کفایت شعاری کرو پھر بھی گذارہ نہیں ہوتا۔ میں تو ہر روز مقروض ہوتا جا رہا ہوں۔ خدا جانے حالات کب بہتر ہوں گے۔"

ڈاکٹر صاحب کی عادت تھی کہ پہلی تاریخ کو مہینے بھر کے خرچ کا پروگرام بنا لیتے اور اس میں ذرہ بھر فرق نہیں آنے دیتے تھے۔ یہ فیصلہ ہو جاتا تھا کہ اتنا گوشت آئے گا۔ اتنا گھی آئے گا۔ اتنی شکر آئے گی۔ اتنا دودھ آئے گا۔ بجٹ بن جانے کے بعد کیا مجال تھی کہ ڈاکٹر صاحب ایک پیسہ کم وبیش خرچ کر دیں۔ اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر تھے بہت خُلق کے آدمی۔ کوئی دوست اُن کے ہاں چلا جائے۔ دو پان، شربت، چائے سے ضرور تواضع کرتے تھے لیکن یہ راز اب تک سمجھ میں نہیں آیا کہ خاطر تواضع کی مقررہ رقم ختم ہو جانے کے بعد اگر شومئی قسمت سے کوئی دوست ان کے ہاں جا نکلتا تھا تو اس کا کیا حشر ہوتا ہوگا۔ بعض دوست ڈاکٹر صاحب کو دِق کرنے اور اُن کی گھبراہٹ سے لطف اٹھانے کے لئے اُن کے مطب میں جاکر دو دو گھنٹے بیٹھے رہتے تھے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب ایسے لوگوں کو اشتہار کے طور پر استعمال کرنے کے گُر سے ناواقف نہیں تھے۔ وہ اُن کے لئے اپنی دکان کے اگلے حصے پر کرسیاں بچھا دیتے تھے تاکہ راہ چلتے لوگ دیکھ کر متاثر ہوں کہ ڈاکٹر یزدانی کے مطب میں مریضوں کی کس قدر بھیڑ ہے۔

دکان کی بالائی منزل میں ڈاکٹر یزدانی اپنے بال بچوں سمیت رہتے تھے اور نیچے بازار کے رُخ ایک کمرے میں انہوں نے دواخانہ کھول رکھا تھا۔ کمرہ بہت چھوٹا سا تھا بمشکل سے ایک میز، ایک الماری، ایک ہاتھ دھونے کی بالٹی اور دو کرسیوں کی گنجائش تھی۔ گرمیوں میں وہ چونکہ علی الصباح اسکول چلے جاتے تھے اس لئے مطب کا وقت شام کو مقرر تھا۔ سردیوں میں صبح اسکول جانے سے پہلے بھی وہ ایک گھنٹہ مطب لگا لیتے تھے اور شام کو چار بجے اسکول سے واپس آکر چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر وہ پھر مطب میں آبیٹھتے تھے اور رات کو نو دس بجے تک یہیں جمے رہتے تھے۔ اسکول کے دو لڑکے اُن سے گھر پر پڑھنے آتے تھے۔ اس لئے سرِ شام وہ لڑکے بھی اسی دواخانے کے ایک گوشے میں دبک کر بیٹھ جاتے تھے۔ ان مقررہ اوقات کے علاوہ اگر آدھی رات کو بھی کوئی مریض ڈاکٹر صاحب کو آجگاتا تھا تو اٹھ کر دوا دینے یا مریض کو مکان پر جاکر دیکھ آنے میں انہیں کوئی عذر نہ ہوتا تھا۔

اس دوران میں ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب کا اسکول کی انتظامیہ کمیٹی سے کچھ جھگڑا ہو گیا تھا۔ انتظامیہ کمیٹی نے فیصلہ کر دیا تھا کہ اسکول کے ملازم پرائیویٹ طور پر کوئی کاروبار نہیں کر سکتے۔ اس فیصلہ کی زد کسی اور پر پڑتی تھی یا نہیں لیکن ڈاکٹر صاحب تو سیدھے اس کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کئی دن نہایت غور سے سوچتے رہے کہ ملازمت سے مستعفی ہو کر صرف مطلب کا کام اختیار کر لیا جائے۔ اُن کا خیال تھا کہ پوری توجہ کوشش اور تن دہی سے اس کام میں بہت زیادہ ترقی ہو سکتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی انہیں اُس بندھی بندھائی رقم کا خیال آتا تھا جو ہر مہینے اُن کی جیب میں آپہنچتی تھی۔ دوستوں نے یہی مشورہ دیا کہ سرِ دست اسکول کی ملازمت ترک کرنا مناسب نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی انتظامیہ کمیٹی

کے ممبروں کی خوشامد کرکے یہ ترمیم کرائی کہ جو ٹیچر دو سال پہلے سے کسی قسم کا ذاتی کاروبار کر رہے ہیں اُنہیں اس فیصلے کی پابندی سے مستثنےٰ رکھا جائے گا۔ اِس طرح ڈاکٹر صاحب کی پریکٹس تو محفوظ ہو گئی لیکن اب وہ انتظامیہ کمیٹی کے ممبروں کے ہاں دوسرے تیسرے روز پھیرا ضرور کرآتے تھے کمیٹی کا کوئی ممبر بیمار پڑتا یا کسی ممبر کا بچہ علیل ہو جاتا تو ڈاکٹر صاحب دن میں کم از کم ایک دفعہ ضرور اسے دیکھنے جاتے تھے اور دوا بھی مُفت دیتے تھے۔

ڈاکٹر یزدانی کو اس واقعہ کے بعد یہ احساس ہو گیا تھا کہ ایک نہ ایک دن ایسی صورت پیش آنے والی ہے کہ ملازمت اور مطب میں سے ایک کو خدا حافظ کہنا پڑے گا۔ چنانچہ اب وہ اسی فکر میں تھے کہ کسی طرح دواخانے کو ترقی دے کر اپنا مطب لاہور کے کسی اچھے حصے میں لے جائیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ قانون کی پریکٹس ہو یا طب کی پریکٹس دونوں صورتوں میں کامیابی کا مدار زیادہ تر ظاہری ٹیپ ٹاپ پر ہے۔ اگر وکیل ہے تو اچھی سڑک پر دفتر ہو۔ مکان شاندار ہو۔ فرنیچر اعلیٰ ہو۔ کتابوں سے بھری ہوئی الماریاں ہوں۔ سواری کے لئے موٹر اور خدمت کے لئے ملازم ہوں تو خود بخود لوگ مرعوب ہو جاتے ہیں اور کام آنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہی حال ڈاکٹر کا ہے۔ اُسے بھی یہ سب چیزیں میسّر ہوں تو خواہ مخواہ لیاقت کی دھاک بیٹھ جاتی ہے اور مریضوں کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ ڈاکٹر یزدانی کے خیال میں انار کلی اور نسبت روڈ ہومیو پیتھک ڈسپنسری کے لئے بہترین مقامات تھے۔ وہ جب بھی کسی کام سے انار کلی جاتے یا کبھی کبھار اُنہیں نسبت روڈ پر سے گذرنے کا اتفاق ہوتا تو وہ نہایت غور سے ہر عمارت کو دیکھا کرتے تھے کہ اندر کتنے کمرے ہوں گے۔ غسل خانہ کہاں ہے۔ صحن کتنا بڑا ہے۔ کمروں کا طول و عرض کیا ہے۔ دواخانے کے لئے کون سا کمرہ موزوں رہے گا۔ غرض کہ باہر کھڑے کھڑے وہ عالم خیال ہی میں عمارت کے اندرونی نقشے کا جائزہ لے لیتے تھے۔ کبھی کبھی تو یہاں تک ہوا کہ ڈاکٹر صاحب نے تالا کھلوا کر مکان بھی دیکھ لیا اور پھر اِدھر اُدھر کے چند نقص نکال کر آگے بڑھ گئے۔

ڈاکٹر یزدانی کو یقین تھا کہ اگر اُن کو نسبت روڈ پر مطب کرنے کا موقع مل گیا اور ظاہری شان و شوکت بڑھانے کے لئے اُنہوں نے پانچ سات سَو روپے کا سامان بھی فراہم کر لیا تو اُن کی پریکٹس دِنوں میں چمک جائے گی۔ وہ آئے دِن نئی نئی تجویز سوچا کرتے تھے۔ اسکول کی ملازمت سے تو اُن کی طبیعت اُچاٹ ہوتی جا رہی تھی۔ وہ سوچتے تھے کہ کم از کم سات گھنٹے روزانہ اسکول میں ضائع ہوتے ہیں اور مہینے کے بعد پچپن روپے تنخواہ ملتی ہے۔ اگر ہر روز اِتنا ہی وقت وہ اپنے مطب کو فروغ دینے میں صرف کریں تو ماہوار آمدنی کئی سَو تک پہونچ سکتی ہے۔ ڈاکٹر یزدانی کے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ کہیں سے ڈیڑھ دو ہزار روپیہ مِل جائے تو وہ نوکری کے جھنجھٹ سے آزاد ہو کر نہایت فراغت اور اطمینان سے بیٹھ کر پریکٹس کریں۔ اُن کے دِل میں آئندہ کے متعلق بہت سے ارادے چکر لگا رہے تھے لیکن اُن ارادوں کی تکمیل روپے کے بغیر ناممکن تھی۔ ڈاکٹر یزدانی ایک زمانے میں ہر مہینے ایک روپیہ خرچ کرکے لاٹری کا ٹکٹ خرید اکرتے تھے اور تیس دن شیخ چلی کے سے خیالی پلاؤ پکانے میں مصروف رہتے تھے۔ سال بھر انہوں نے یہ شغل جاری رکھا اور آخر مایوس ہو کر اسے بھی ترک کر دیا۔ وہ دِن رات کسی دستِ غیب کے منتظر رہتے تھے۔ روزگار کی جس اُلجھن میں وہ گرفتار تھے وہاں ہزار دو ہزار تو خیر بڑی چیز ہے سَو دو سَو کی رقم کا یک لخت مِل جانا بھی محال نظر آتا تھا۔ اس لئے وہ بچارے جب حال کی بے بسی سے گھبرا کر نگاہ اوپر اُٹھاتے تھے تو مستقبل کی تاریکی سے اُن کے دِل میں اور زیادہ ہول اٹھنے لگتا تھا۔ ڈاکٹر یزدانی کے بعض بے تکلف اور زندہ دِل دوست اُنہیں چھیڑنے کے لئے مسیحائے زماں۔ افلاطونِ دوراں اور جالینوسِ وقت کے نام سے پکارتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب جواب میں کچھ ہنس کر کچھ چہرے پر افسردگی لا کر گویا دِل ہی دِل میں اپنی حالت پر سخت رنجیدہ ہیں، غالب کا ایک شعر پڑھ دیا کرتے تھے ؎

ہم بھی تمہیں دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

ڈاکٹر یزدانی کو اپنے متعلق حُسنِ ظن تھا کہ قُدرت نے اُنہیں دستِ شفا عطا کیا ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں کی محفل میں بیٹھ کر وہ نہایت وثوق کے ساتھ دعویٰ کرتے تھے کہ دقیق اور پیچیدہ امراض کے علاج کا جیسا سلیقہ انہیں ہے بہت کم طبیبوں کو ہو گا۔ عرصہ ہوا ڈاکٹر صاحب نے

پھوڑے پھنسیوں کے لئے ایک مرہم تیار کیا تھا جسے وہ مرہم بے نظیر کے نام سے رجسٹر بھی کرا چکے تھے۔ کسی قدر مبالغہ کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کہتے تھے کہ مانگ اتنی ہے کہ ایک لاکھ ٹکیاں آسانی سے بک سکتی ہیں۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ ایک لاکھ ٹکیاں تیار کرنے کے لئے جتنے سرمایہ کی ضرورت ہے وہ یہاں مفقود تھا۔ اُن کے پڑوس میں ایک شخص بھیڑ بکری کی کھال کا کاروبار کرتا تھا۔ وہ کبھی کبھی ڈاکٹر صاحب کے مطب میں آ بیٹھتا تھا اور ڈاکٹر صاحب اکثر اُس سے اِس کاروبار کے متعلق باتیں کرتے تھے۔ اُس شخص نے بہت سی ایسی مثالیں یاد کر رکھی تھیں کہ معمولی غریب آدمیوں نے تھوڑے سے روپے سے کھال کا کام شروع کیا اور آہستہ آہستہ لکھ پتی بن گئے۔ ڈاکٹر صاحب ایسے واقعات کو بہت غور سے سنتے تھے اور پیہم سوال کرتے تھے کہ اچھے پیمانے پر کام چلانے کے لئے کم از کم کتنا روپیہ درکار ہے۔ گودام الگ ہونا چاہئے یا گھر کے ایک ایسے حصے ہی کو گودام کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اچھی اور سستی کھالیں کب اور کہاں ملتی ہیں۔ مال باہر کس طرح بھیجا جاتا ہے۔ کھالوں کو محفوظ رکھنے کے لئے کیا مسالہ تیار ہوتا ہے۔ غرض کہ ڈاکٹر صاحب بال کی کھال نکالتے اور کاروبار کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے میں اچھی خاصی دماغ سوزی کرتے تھے۔ وہ سوچتے تھے کہ تجارت بھی عجب چیز ہے۔ ایک ہی سودے میں انسان فقیر سے بادشاہ بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک دِن سوچا کہ اگر وہ اپنے پڑوسی کے ساتھ اس کام میں شرکت کر لیں تو شاید آہستہ آہستہ ان کی قسمت چمک اُٹھے۔ بڑے غور و فکر کے بعد انہوں نے اپنے پڑوسی سے اس کا ذکر کیا۔ وہ فوراً رضامند ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اُسے پچاس روپے دیئے۔ سٹامپ لکھا گیا۔ فریقین کے دستخط ہو گئے اور ڈاکٹر صاحب باقاعدہ شریکِ کار بن گئے۔ اب ڈاکٹر صاحب کے خوشگوار خوابوں میں ایک اور خواب کا اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ اس مبارک دِن کا انتظار کرنے لگے جب طلوعِ آفتاب کے ساتھ ہی وہ رئیس التجار بن جائیں گے۔

جس دن کا میں ذکر کر رہا ہوں ڈاکٹر یزدانی صبح سے کچھ فکرمند نظر آ رہے تھے۔ بڑے دن کی چھٹیوں کی وجہ سے اسکول جانے کا ناغہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب تمام وقت گھر ہی پر بسر کرتے تھے۔ بے کاری کی وجہ سے تخیل کی جولانی بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ شہر میں ہر طرف نمائش کی دھوم تھی۔ لوگ کہتے تھے لاہور میں ایسی شاندار نمائش پہلے کبھی نہیں لگی۔ ڈاکٹر یزدانی کو بھی نمائش دیکھنے کا ایک آدھ مرتبہ شوق چرّایا۔ لیکن اُن کی طبیعت کچھ ایسی گریز پا ہو گئی تھی کہ وہ گھر سے نکلتے ہی نہ تھے۔ دواخانے میں انگیٹھی کے قریب کرسی پر لیٹے لیٹے اُنہیں ایک گھنٹہ گذر گیا تھا۔ کھانا انہوں نے سرِ شام ہی کھا لیا تھا۔ اِس لئے زنان خانے سے طلبی کا امکان بھی نہیں رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی مختلف تجویزیں خاطر خواہ نتائج پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھیں۔ اِس لئے وہ کچھ متفکر و مغموم سے رہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب یہی کچھ سوچ رہے تھے کہ اتنے میں ان کا پڑوسی آ گیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد وہ بھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ ڈاکٹر صاحب کے پڑوسی نے کہا "آج ایک عجیب واقعہ سننے میں آیا ہے"۔

ڈاکٹر یزدانی نے بغیر کسی دل چسپی کا اظہار کئے پوچھا "کیا؟"

پڑوسی نے کہا۔ "سُنا ہے لاہور میں ایک سادھو آیا ہے جو نوٹ دُگنے کر دیتا ہے"

ڈاکٹر یزدانی فوراً سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور کسی قدر اضطراب کے ساتھ پوچھنے لگے۔ "کس سے سُنا ہے آپ نے؟"

پڑوسی نے جواب دیا۔ "مجھ سے علی محمد نے ذکر کیا ہے کہ اس کے ایک دوست احمد خاں کے دس دس روپے کے بیس نوٹ سادھو نے دُگنے کر دیئے ہیں۔ اُس نے یہ بھی بتایا تھا کہ سادھو کہیں راج گڑھ کی طرف رہتا ہے اور صرف چند روز ہی ٹھہرے گا"۔

ڈاکٹر صاحب کا اضطراب ایک لمحے میں اس قدر بڑھ گیا کہ انہوں نے مختلف قسم کے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ پڑوسی بھی واقعہ کا عینی شاہد تھوڑا ہی تھا۔ اس لئے وہ اِن سوالوں کا جواب نہ دے سکا۔ ڈاکٹر صاحب نے اُسی وقت مطب کو قفل لگایا اور پڑوسی کو ساتھ لے کر علی محمد کے ہاں پہونچے۔ علی محمد اُنہیں احمد خاں کے پاس لے گیا۔ احمد خاں نے اس بات کی تو تردید کر دی کہ اُس نے نوٹ دُگنے کرائے ہیں۔ ہاں اِس واقعہ کی اُس نے تصدیق کی کہ ایسا سادھو لاہور میں ہے مزنگ اور راج گڑھ میں مقیم ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے وہ رات بستر پر لیٹے لیٹے جاگ کر گذار دی۔ سینکڑوں خیالات ان کے دماغ میں سینما کی متحرک تصاویر کی طرح آ آ کر غائب ہو جاتے تھے۔ امیدیں اپنا سر اٹھا اٹھا کر ڈاکٹر یزدانی کے مستقبل کو درخشاں بنا رہی تھیں اور وہ حیران تھے کہ اگر سادھو نے ان کے حال پر نظرِ کرم فرمائی تو کیا سے کیا ہو جائے گا۔ صبح ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے تانگہ

لیا اور احمد خاں کو ہمراہ لے کر راج گڑھ کی دُور اُفتادہ آبادی کا چپہ چپہ چھان مارا۔ اصل آبادی سے ہٹ کر ایک چھوٹے سے مکان میں سادھوجی کے درشن ہوئے۔ دو آدمی اور بھی موجود تھے۔ ڈاکٹر یزدانی ادب سے سر جھکا کر ایک طرف بیٹھ گئے۔ سادھو نے پوچھا "آپ لوگ کیوں کر آئے ہیں؟"

ڈاکٹر یزدانی نے بہت عاجزی سے دانت نکال کر کہا "آپ کے درشنوں کو"

سادھو نے مسکرا کر جواب دیا "فقیروں کے پاس کیا رکھا ہے؟"

تو ڈاکٹر یزدانی نے جرأت کر کے کہا "ہم غریبوں پر آپ عنایت کی ایک نظر ڈال دیں تو اور کیا چاہئے؟"

سادھو پھر دوسرے آدمیوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سادھو اُن میں سے ایک شخص کو برابر والے کمرے میں لے گیا۔ بیس پچیس منٹ کے بعد وہ آدمی ہشاش بشاش اندر سے نکلا۔ خوشی سے اُس کی باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ اِس کے بعد سادھو نے دوسرے آدمی کو اندر بلایا۔ وہ بھی اُتنی ہی دیر کے بعد باہر آیا تو خوشی سے اُس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ اس تمام عرصے میں ڈاکٹر یزدانی کا دل امید و بیم کی لہروں میں کشتی کی طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔ اب سادھو نے ڈاکٹر یزدانی کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ابھی اپنی داستان شروع ہی کی تھی کہ سادھو نے بے تکلفی سے کہا "چھوڑیئے اِس قصّے کو۔ میں پوچھتا ہوں آپ کی جیب میں کچھ ہے؟"

ڈاکٹر یزدانی نے فوراً دس روپے کا نوٹ نکال کر دے دیا۔ ڈاکٹر صاحب گھر سے صرف یہی نوٹ لائے تھے۔ سادھو نے ایک شیشے پر اس نوٹ کو چپکا دیا اور شیشے کے دوسری طرف اسی سائز کا ایک سفید کاغذ چسپاں کر دیا۔ پھر کمرے کے ایک کونے میں جا کر اس نے شیشے کو بہت ہلکی ہلکی آنچ کے اوپر رکھ دیا۔ پندرہ منٹ کے بعد سادھو نے دس دس روپے کے دو نوٹ ڈاکٹر یزدانی کے ہاتھ میں دے دیئے۔ ڈاکٹر یزدانی کی حالت یہ تھی کہ حیرت اور مسرت کے جوش سے اُن کا دل سینے سے باہر نکلا جا رہا تھا۔ بے اختیار انہوں نے اپنا سر سادھو کے پاؤں پر رکھ دیا سادھو نے بڑی ہمدردی سے ان کا سر اُٹھایا اور کہا کہ "اگر اور مال ہو تو کل شام کو لے آنا"

ڈاکٹر یزدانی گھر پہنچے تو فریبِ اُمید نے ایک ایسی خوبصورت دنیا ان کی نظروں کے سامنے تعمیر کر دی تھی کہ اُس کا موجودہ تلخ زندگی سے دُور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس نقد روپیہ صرف دو سَو تھا۔ لیکن انہوں نے تہیّہ کر لیا تھا کہ کل تک جس قدر روپیہ بھی مل سکا وہ اکٹھا کر لیں گے۔ چنانچہ آتے ہی اُنہوں نے اپنی بیوی کا سارا زیور جمع کیا۔ بازار میں فروخت کرنے پر صرف ہزار روپیہ ملا۔ اگلے روز وہ سَو سَو روپے کے بارہ نوٹ لے کر سادھو کے پاس پہنچے۔ اُن کا دل جذبات کی شدت سے دھڑک رہا تھا۔

سادھو نے کہا "سَو سَو کے نوٹ پر عمل بہت لمبا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے وقت زیادہ خرچ ہوگا؟"

اس نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ لگایا۔ شیشے کے ایک مربع بکس میں اس نے بارہ نوٹ اور اسی طول و عرض کے بارہ سفید کاغذ بند کر دیئے۔ اور بکس کو ڈاکٹر یزدانی کے حوالے کر کے تاکید کی کہ دوسرے دن صبح اُسے کھولا جائے۔ اگلے روز علی الصباح ڈاکٹر یزدانی نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بکس کھولا تو اُن کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ بکس خالی پڑا تھا۔ صرف سفید کاغذ کے بارہ ٹکڑے موجود تھے۔ ڈاکٹر یزدانی بکس ہاتھ میں لئے تانگے میں سوار ہو کر بجلی کی طرح سادھو کے مکان پر پہونچے۔ آگے دیکھا کہ مکان خالی ہے اور سادھو غائب۔

عاشق حسین بٹالوی

آخری سجدہ

مری زندگی ترے ساتھ تھی، مری زندگی ترے ہات تھی
مری روح میں ترا نور تھا مرے ہونٹ پر تری بات تھی
مرے قلب میں ترا عکس تھا۔ مری سانس میں تری باس تھی
ترے بس میں میرا شباب تھا مری آس بھی ترے پاس تھی
ترے گیت گاتی تھی جب بھی میں مجھے چھیڑتی تھیں سہیلیاں
مگر اُن پہ کھل نہ سکیں کبھی مری زندگی کی پہیلیاں
میں ترے جمال میں محو تھی میں ترے خیال میں مست تھی
مجھے کیا سمجھتیں وہ لڑکیاں کہ میں اپنے حال میں مست تھی
تری شان میں مری شان تھی ترا دبدبہ مرا ناز تھا
تری دلبری مری جان تھی تری عاشقی مرا راز تھا
مگر اب شباب گزر گیا تو ترا نیاز بھی مر گیا
مرے رُخ پہ جھرّیاں دیکھ کر تو پلٹ کے جانے کدھر گیا
میں تری تلاش کروں مگر، مرا پستیوں میں مقام ہے
تو امیر ہے تو بلند ہے تو فلک پہ محوِ خرام ہے
اگر ایک پل کے لئے کبھی تو بلندیوں سے اُتر سکے
مرے اجڑے بچھڑے دیار سے اگر ایک بار گزر سکے
تو مرے خلوص کا واسطہ، مری آرزو مری آس، آ
مری بات سُن مری بات سُن، مرے پاس آ مرے پاس آ
نہ طلب کروں گی کرم ترا کوئی دوش بھی نہ دھروں گی میں
ترے پائے ناز پہ سر رگڑ کے بس ایک سجدہ کروں گی

(احمد ندیم قاسمی)

آرٹ؟

روس کا مفکرِ اعظم لیو طالسطائے ستمبر ۱۸۲۸ء میں پیدا ہوا اور نومبر ۱۹۱۰ء میں اس کا انتقال ہوا تھا۔ اس طرح اُس نے ۸۰ سال کی عمر پائی۔ اس نے مختلف اوقات میں متعدد و متنوع مضامین میں گہری دلچسپی لی تھی مگر آرٹ کا موضوع اُسے ہمیشہ عزیز رہا۔ اس کے سوا کسی اور مضمون میں اُس نے اتنی طویل مدّت تک اور متواتر کاوش نہیں کی ـــــ اس کا اپنا بیان ہے کہ "آرٹ کیا ہے؟ والے مضمون میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اُن کی ترتیب و تہذیب میں مجھے کامل پندرہ برس تک غور و خوض کرنا پڑا"۔ اس نہج پر اُس کے افکار اُس کی تمام دیگر فلسفیانہ تصانیف پر فائق ہیں۔

اس امر کی تحقیق باعثِ دلچسپی ہو سکتی ہے کہ "جنگ اور صلح" (WAR AND PEACE) "اینا کیرینینا" (ANNA KARÉNINA) اور "تئیس کہانیاں" (TWENTY THREE TALES) وغیرہ ڈراموں کے مصنّف طالسطائے نے آرٹ کے کس نظریے سے اپنی تسکین کا سامان بہم پہنچایا تھا۔ اُس کا قول ہے کہ "آرٹ ایک ایسی تحریک ہے جس کے ذریعے سے ایک شخص اپنے جذبات و حسّیات کو ارادۃً دوسروں تک پہنچاتا ہے"۔ جارج برنارڈ شا نے روس کے اس مفکرِ اعظم کے اس قول کی تصدیق کی ہے۔

آرٹ کے ہر کام میں اثر انگیزی سب سے پہلی اور اہم ترین چیز ہے اور اس امر کا انحصار کہ فلاں چیز 'آرٹ' کہلانے کی مستحق ہے یا نہیں، اُس چیز کی صورت پر ہے۔ طالسطائے نے اُن خیالات کو مسلسل، مشرح و مکمّل کیا جن کا اظہار پہلے فلیچر (FLETCHER) اور گرے (GRAY) نے کیا تھا۔ طالسطائے نے اِن خیالات کو ایسا مدوّن کیا کہ ادب میں بالکل پہلی مرتبہ دیگر انسانی تحریکات اور زندگی کے عام حالات سے آرٹ کے تعلق کا ایک معقول و موثق و مکمل نظریہ قائم ہو گیا۔

سنجیدگی سے غور و فکر کرنے کے لئے اخلاق اور آرٹ کے مختلف مسائل کو جدا جدا رکھنا چاہئے۔ خلطِ مبحث سے مفید نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔ اِن دونوں میں سے ایک مضمون کو ایک وقت میں لینا چاہئے یعنی اخلاق کی اہمیت کے باعث آرٹ کے اثرات کی فہم و تفہیم میں کوئی رکاوٹ نہ ہونی چاہئے۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ آرٹ اخلاق کے منافی ثابت ہو۔

طالسطائے کہتا ہے کہ "میں آرٹ کی ہر شے کو تین زاویہ ہائے نگاہ سے جانچتا ہوں۔ پہلے تو میں اس کے مضمون یا نفس پر غور کرتا ہوں، یعنی یہ دیکھتا ہوں کہ مصنّف نے کس حد تک بنی نوعِ انسان کے مفاد کے لئے اپنی تصنیف میں کوئی جدید اور اہم شاہراہ کھولی ہے۔ کیوں کہ میرے خیال میں ایک تصنیف محض اُسی حالت میں آرٹ کی ایک چیز کہی جا سکتی ہے جب کہ وہ انسانی زندگی کے لئے فلاح کی ایک نئی راہ کھولے ـــــ دوسرے میں یہ دیکھتا ہوں کہ کس حد تک اُس تصنیف کی ظاہری صورت اچھی، دلکش اور اپنے مضمون سے متوازی ہے۔ اور تیسرے میں یہ تلاش کرتا ہوں کہ فن کار [آرٹسٹ] کا اپنے مضمون سے تعلق کس حد تک صادق و مخلصانہ ہے، یعنی وہ جو کچھ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے اُس میں خود اُس کا اعتقاد و یقین کس قدر ہے۔ یہ آخری صنف میرے نزدیک ہمیشہ فن کارانہ [آرٹسٹک] اشیاء کی جان رہی ہے۔ یہ صفت آرٹ کی ہر شے میں زندگی کی ایک لہر دوڑا دیتی ہے اور اُس کو بے حد اثر انگیز بنا دیتی ہے۔ یعنی یہی چیز ہر ناظر، سامع یا قاری کے دل میں اُنہیں محسوسات کو زندہ کرتی ہے جو خود فن کار کے تجربے میں آئے ہیں"۔

گویا فنّی شعور کے علاوہ دیگر تین مخصوص شرائط جو آرٹ کے ایک حقیقی کام کے لئے لازمی ہیں حسبِ ذیل ہیں:ـــ اوّلاً مصنّف کا اپنے مضمون سے ایک صحیح یعنی اخلاقی رشتہ۔ ثانیاً صفائی و حُسنِ بیان۔ یہ ہر دو متشابہ ہیں۔ اور ثالثاً صداقت یعنی فن کار کا اُس چیز کے ساتھ محبت یا نفرت کے جذبے کا مخلصانہ اور سچّا احساس جس کو وہ بیان کرتا ہو۔

موپاساں (MAUPASSANT) کے متعلق مشہور ہے کہ وہ فنّی شعور تو کافی رکھتا تھا مگر تذکرۂ صدر ہر سہ خصوصیات میں سے وہ

صرف آخری دو کا حامل تھا۔ پہلی خصوصیت اس کی تصانیف میں موجود نہیں ہے موپاساں فنی شعور رکھتا تھا اور فنی شعور سے مراد انسانی زندگی کے اُن پہلوؤں کو اُجاگر کرنا ہے جن تک دوسروں کی نظر نہیں پہنچی۔ موپاساں ایک دل کش طرزِ ادا کا بھی مالک تھا۔ جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا صفائی، سادگی اور جادوبیانی سے ادا کر دیتا تھا۔ وہ اس سچی فنی پیداوار یعنی 'صداقت' کا بھی مالک تھا جس کے بغیر آرٹ کی کوئی چیز اثر پذیر نہیں ہوسکتی۔ یعنی وہ جو کچھ بیان کرتا تھا اس سے وہ درحقیقت محبت یا نفرت کرتا تھا۔ فرضی طور سے ایسا نہیں کرتا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے پہلی اور نہایت ضروری خصوصیت سے وہ بے بہرہ تھا۔ جو کچھ وہ بیان کرتا تھا اُس سے صحیح اخلاقی رشتہ وہ کوئی نہ رکھتا تھا یعنی اچھی اور بری چیز کے درمیان تمیز کرنے کا مادہ اس میں نہ تھا۔ وہ ایسی چیزوں سے محبت کرتا اور اس محبت کا اظہار کیا کرتا تھا جن سے اُسے محبت یا اس کا اظہار نہ کرنا چاہئے تھا۔ علاوہ ازیں اکثر جدید فرانسیسی مصنفین کی، جن میں موپاساں بھی شامل ہے، تصانیف میں ایک بڑا اور اہم نقص یہ ہے کہ وہ مزدور طبقے کی زندگی و مفاد کو صحیح طور پر سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔ بلکہ انہوں نے اس طبقے کو نیم وحشیوں کی مانند پیش کیا ہے جو شہوت، انتقام اور حرص کے سوا دیگر اعلیٰ انسانی جذبات و خصوصیات سے معرا ہیں۔ موپاساں کے متعلق متذکرۂ بالا خیالات اُس کی تصنیفات لامیزوں تلیئے (LA MAISON TELLIER) کے مطالعے سے قائم ہوتے ہیں۔ لیکن 'اُون وی' (UNE VIE) کے مطالعہ سے، جو موپاساں کا بہترین ناول ہے بلکہ غالباً وکٹر ہیوگو کے ناول لے مزرابل (LES MISERABLES) کے بعد بہترین فرانسیسی ناول ہے، موپاساں کی عظمت میں شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس ناول میں متذکرۂ بالا ہر سہ فنی خصوصیات جن پر یقینی آرٹ کی ہر چیز کا دارومدار ہے بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

موپاساں کا دوسرا ناول 'بیل آمی' (BEL AMI) ہر چند ایک نہایت کثیف و مکروہ کتاب ہے مگر مجموعی حیثیت سے 'اُون وی' کی طرح اس کی بنیاد بھی ایک سنجیدہ خیال و جذبہ پر قائم ہے۔ 'اون وی' میں بنیادی خیال ایک نیک عورت کی مصیبت ناک زندگی اور اس کی سراسیمگی ہے جس کو ایک بدقماش مرد کی وحشیانہ شہوت رانی اور بے رحمانہ سرد مہری نے تباہ کر دیا۔ لیکن 'بیل امی' میں محض یہ سراسیمگی ہی نہیں بلکہ جذبۂ تحقیر بھی ہے اُس شہوت پرست جابر و ظالم کی خوش حالی و کامرانی کے خلاف جو اپنی اسی شہوت پرستی کے توسّل سے سوسائٹی میں ایک بلند مرتبہ حاصل کرتا ہے ——— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ناول میں مصنف سوال کرتا ہے کہ

"ایک عمدہ و پاکباز شخصیت کیوں تباہ و برباد کی گئی؟ ایسا کیوں ہوا؟"

اور دوسرے ناول میں اس نے اپنے اسی سوال کا خود جواب دیا ہے کہ "ہماری سوسائٹی پاک، صاف اور عمدہ خصائل کو تباہ کر رہی ہے کیوں کہ یہ سوسائٹی مائل بہ تنزّل، بے حس اور خوفناک ہے۔"

موپاساں کے اس کے بعد کے ناولوں میں زندگی کے ساتھ یہ اخلاقی رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ زندگی کے ماحول کا اندازہ مبہم ہو گیا ہے۔ مونت اوریول (MONT ORIOL) نامی ناول میں موپاساں نے اپنے ہر دو سابقہ ناولوں کے مقاصد کو تحلیل کرنے کی کوشش کی ہے۔ خیالات وہی ہیں لیکن مصنف کا اپنے نفس مضمون سے اخلاقی رشتہ بہت پست ہو گیا ہے۔ اس کا اچھائی اور برائی کے درمیان تمیز و توازن کا تخمینہ غیر متیقن ہو گیا ہے۔ اور بعض اوقات تو پڑھنے والے کو یہ سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے کہ مصنف کیا کہنا چاہتا ہے۔ اس کے بعد کے ناولوں پیئر دی اے ژان (PIERRE ET JEAN) فور کم لامور (FORT COMME LA MORT) اور نوتر کر (NOTRE COEUR) میں مصنف کا اپنے کرداروں سے اخلاقی رشتہ اور بھی غیر واضح ہو گیا ہے۔ یہ تمام ناول بے توجہی، عجلت اور غیر اصلیت کے آماجگاہ ہیں۔ ان میں زندگی کے ساتھ مصنف کے اس حقیقی صحیح رشتے کا فقدان ہے جو اس کی ابتدائی بلکہ درمیانی تصانیف میں موجود تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ پیرس میں موپاساں کی شہرت، وقعت ایک فیشن ایبل مصنف کی حیثیت سے قائم ہو چکی تھی۔ سوسائٹی عورتوں کی صحبت، پریس کی چاپلوسی، عوام کی وارفتگی و فریفتگی اور فارغ البالی نے موپاساں کا سر پھرا دیا تھا۔ وہ اس نشاط انگیز فضا میں زندگی کے نشیب و فراز کو بے معنی سمجھنے لگا یا شاید غور و فکر کی صلاحیت اُس میں باقی نہ رہی تھی۔ اس کے بعد سے موپاساں کے قلم نے وہ حقیقت نگاری نہیں کی جو اس کے ابتدائی مذکورۂ بالا ہر دو ناولوں کا طرۂ امتیاز ہے۔

تقریباً تمام فرانسیسی ناولوں میں خاوندوں کو ہمیشہ احمق دکھایا گیا اور عشاق کو ہمیشہ زیرک و دلیر بتایا گیا ہے۔ فرانسیسی رومانی ادب میں یہ

یک کلیہ سا نظر آتا ہے حالانکہ یہی عشاق آگے چل کر خاوند ہو جاتے ہیں ـــــ تمام عورتیں کس طرح بدچلن اور تمام مائیں کیوں کر عصمت مآب ہو سکتی ہیں؟ پیئیر اے ژاں' اور فورکم لا مور' میں یہی کچھ ہے اور انہیں غیر فطری اور خلافِ حقیقت امور کے باعث وہ ناکام ہیں۔ آخری ناول تو تر کران دونوں سے بھی بدتر ہے عریاں اور جنسی علایق سے بھرپور ہے۔

"یہ نظریہ" کہ آرٹ کے ایک کام کے لئے نہ صرف یہ امر غیر ضروری ہے کہ صحیح اور غلط کا صاف طور سے امتیاز کیا جائے بلکہ، اس کے برعکس، ایک فن کار کو چاہئے کہ وہ تمام اخلاقی پابندیوں کو مکمل طور پر نظر انداز کر دے" موپاساں کے اس زمانے کے حلقۂ ادبا ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ یہ اب فن کاروں کے درمیان ہر جگہ مسلط نظر آتا ہے، اور ایسا کرنے اور سمجھنے میں وہ ایک نوع کا فنی افتخار محسوس کرتے ہیں ــــ اس نظریے کے بموجب فن کار کو وہ چیز دکھانی چاہئے جو زندگی سے مطابقت رکھتی ہے، حقیقت پر مبنی ہے، خوبصورت ہے اور چنانچہ مسرور و محظوظ کرنی ہے، لیکن یہ امر کہ اخلاقی یا غیر اخلاقی چیز کیا ہے صحیح یا غلط کیا ہے، ایک فن کار سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ 'بیل امی' کے بعد موپاساں کے تمام ناولوں میں (مختصر افسانوں سے قطع نظر کہ وہ اُس کی تصانیف کے شاہکار ہیں) یہی نظریہ کار فرما ہے۔

اُس حلقہ میں جس میں کہ موپاساں نقل و حرکت کرتا تھا، حسن کی، جس کی آرٹ کے ذریعہ سے خدمت کی جاتی تھی، مترادف عورت تھی بلکہ اب تک ہے۔ جوان، خوبصورت، بیشتر عریاں اور نفسانی خواہشات کی حامل عورت ـــــ یہ نظریہ نہ صرف موپاساں کے ہمعصر و ہمخیال فنانوں، نقاشوں، مصوروں، مجسمہ سازوں، ناول نویسوں اور شاعروں کا تھا بلکہ اُن فلسفیوں کا بھی تھا جو نوجوان نسل کے اُستاد تھے ــــــ مشہور و معروف ریناں (RENAN) اپنی تصنیف مارک اُوریل (MARC-AURÈLE) کے صفحۂ ۵۵۵ پر عیسائیت کو ملزم گردانتے ہوئے کہ وہ نسوانی حسن کی قدر داں نہیں ہے کہتا ہے :ـــ

"عیسائیت کا نقص اس میں واضح طور سے نظر آتا ہے کہ وہ حد سے زیادہ اخلاقی ہے اور حُسن کو اخلاق پر بالکل قربان کر دیتی ہے لیکن ایک مکمّل فلسفے کے ماتحت حسن ایک فاضل سہولت، ایک خطرہ، ایک دقّت نہیں بلکہ اس کے برعکس خدا کا ایک تحفہ ہے پاکیزگی کے مانند ـــ حُسن پاکیزگی کے برابر مرتبہ رکھتا ہے۔ حسین عورت مقصدِ الٰہی کی مظہر ہے۔ حسین عورت بھی پاک باز عورت یا فرزانہ مرد کی طرح ایک مقصدِ ایزدی ہے۔ حسین عورت اس حقیقت کو محسوس کرتی ہے اور یہی وجہ اس کے فخر و افتخار کی ہے۔ وہ اُس گراں قدر خزانہ کے وجود سے بخوبی آگاہ ہے جو وہ اپنے لطیف جسم میں لئے پھرتی ہے۔ وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ ذکاوت، ذہانت، عصمت کے بغیر بھی اُس کا شمار خدا کے خاص مظاہر میں ہوتا ہے۔ اُسے اُس عطیۂ فطرت سے کیوں نہ پورے طور سے فائدہ اٹھانا چاہئے جس سے وہ بہرہ ور ہے۔ اُسے اپنے اس نگینہ کو کیوں نہ جِلا دینا چاہئے جو اس کے جسم میں قدرت نے جڑ دیا ہے۔ عورت اپنی آرائش کر کے ایک فرضِ الٰہی ادا کرتی ہے۔ وہ بہترین آرٹ کا نمونہ اور خدا کا لطیف ترین کارنامہ ہے۔"

اِس طرح گویا نئی نسل کے اِس رہنما کی رائے میں پیرس، لندن، نیویارک اور دوسرے عظیم الشان شہروں میں آرائشِ جمال کی اشیائے فروختنی کے تاجروں نے اب اُس غلطی کی اصلاح کر دی ہے جو عیسائیت سے سرزد ہوئی تھی اور حُسن کو اس کے اس حقیقی اعلیٰ درجے پر پہنچا دیا ہے جس کا کہ وہ مستحق تھا۔

اپنے ناول 'پیئیر اے ژاں' کے مقدّمہ میں موپاساں لکھتا ہے کہ "لوگ ایک مصنّف سے توقع کرتے ہیں کہ وہ ہمیں تسکین دے، ہمارا جی بہلائے، ہمیں غمگین و اداس کرے، ہمیں تڑپائے، لرزائے، رُلائے، ہنسائے اور بشاش کرے، ہمیں خوابوں کی عجیب و غریب دنیا میں پہنچا دے، ہمیں غور و فکر کرنا سکھائے"۔ غرض کہ جس ماحول میں موپاساں نے تعلیم و تربیت، نشو و نما پائی اُس میں نسوانی حسن اور جنسی تعلقات کی نمائندگی کو ملک کے بڑے بڑے مفکّرین اور علما و فضلا بلند ترین آرٹ کا حقیقی مظہر سمجھتے تھے اور یہی وہ خطرناک اور احمقانہ نظریہ ہے جس پر موپاساں، ایک فیشن ایبل مصنّف و انشا پرداز کی حیثیت سے، عامل رہا۔ اسی چھوٹے مطمحِ نظر نے اس کے ناولوں کو حقیر سے حقیر تر بنا دیا۔ مگر اس کے مختصر افسانے آرٹ کا سچّا نمونہ ہیں۔

ایک ادیب جس کو دنیا اور روزمرّہ انسانی زندگی کی قدر کا صحیح، اور صاف طور پر اندازہ نہیں ہے وہ آرٹ کی کوئی چیز پیش نہیں کر سکتا۔ اگر موپاساں محض اپنے ناول ہی بطورِ یادگار چھوڑ جاتا تو آج فنی دنیا میں اس کی وہ قدر و منزلت نہ ہوتی جو اب ہو رہی ہے۔ اِس امتیاز کے ذمّہ دار اُس کے مختصر

افسانے ہیں جنہوں نے اُسے فنّی دنیا کی بلندیوں پر پہنچا دیا، ورنہ "اُون وی" کے سوا اس کا کوئی ناول قابلِ قدر نہیں۔

ایک آرٹسٹ اس لئے آرٹسٹ کہلاتا ہے کہ وہ اشیاء کو اس طرح دیکھتا ہے جس طرح کہ وہ فی الحقیقت نظر آتی ہیں نہ اس طرح جس طرح کہ وہ اُنہیں دیکھنا پسند کرتا ہے۔ بالام (BALAAM) کی طرح موپاساں چاہتا تھا دعا دینا مگر کوستا تھا، چاہتا تھا کوسنا مگر دعا دیتا تھا۔ آج تک شکل سے سوائے موپاساں کے ایسا کوئی اور افسانہ نویس ہوا ہوگا۔ جس نے موپاساں کے مانند انتہائی خلوص سے یہ خیال کیا ہو کہ زندگانی کا تابناک ترین پہلو صرف عورت اور اس کی محبت ہیں۔ موپاساں کے سوائے شاید ہی کسی اور نے اس قدر جوش و شدّت سے عورت اور اُس کی محبت کو ہر ممکن انداز سے نمایاں کیا ہوگا اور شاید ہی کوئی اور مصنّف ہو جس نے ایسی بے باکی و عُریانی سے جنسی تعلقات کے تمام شرمناک پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہو جیسے کہ موپاساں نے کیا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس نے نہایت خلوص سے ان کو انسانی زندگی کی عظیم ترین و اعلیٰ ترین نعمتیں سمجھ کر کیا۔

موپاساں کی وہ بہترین کتاب جس میں یہ خرافات بہت کم ہیں۔ سیورلو (SUR L'EAU) ہے۔ موپاساں کی زندگی کا نہایت الم ناک حزنیہ یہ ہے کہ وہ ایک بے حد مخرّبِ اخلاق، معصیت آلود اور ناپاک دائرے میں رہ کر اپنے فنّی شعور کی عظمت و طاقت سے خود کو محفوظ رکھنے کی کشمکش کرتا رہا اور جب وہ آزادی اور رہائی کے قریب آیا تو اُس وقت تک جدوجہد کرتے کرتے اُس کی آخری قوّتِ مدافعت بھی ختم ہو چکی تھی اور چونکہ وہ اس آخری کوشش کی تاب نہ رکھتا تھا لہٰذا وہ بدقسمتی سے مکمل آزادی پانے سے قبل ہی تباہ ہو گیا —— موپاساں کی ادبی و فنّی زندگی کی عبرتناک تباہی اُس بربادی کی ایک مثال ہے جو ہمارے عہد کے اکثر و بیشتر فن کاروں کو عارض ہوتی ہے۔ ہمیشہ اور ہر جگہ وہ افراد جنہیں فطرت کی جانب سے عام انسانوں کے مقابلے میں غیر معمولی ذہانت و فراست ودیعت ہوئی ہے قوموں کے پیغمبر کہلائے ہیں اور انہوں نے انسانوں کو ان کی زندگی کی غرض و غایت اور اس کے معنی بتائے ہیں۔ ہمیشہ اوسط درجے کے معمولی انسان نے، جسے ان معانی کے اظہار کرنے کی خود قدرت نہ تھی، ان پیغمبروں کے بیان کردہ مطالبِ زندگی پر عمل کیا —— موپاساں اِن اوسط درجے کے عام انسانوں میں نہ تھا جو کورانہ تقلید کے عادی ہوتے ہیں۔ اس کی آنکھیں تھیں اور وہ ہر شئے کو خود دیکھتا تھا۔ اُس میں بصیرت تھی اور وہ زندگی کے معنی خود سمجھنے کی سعی کرتا تھا۔ اس کے پاس ایک ذکی الحس دل تھا اور وہ ہر کیفیت سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ وہ ایک زود فہم دماغ رکھتا تھا اور اُس پر زور ڈال کر جدّت طرازی کا خوگر تھا۔ موپاساں اگر کچھ روز اور زندہ رہتا تو یقیناً وہ ہمارے لئے ادب کے بیش بہا جواہر چھوڑ جاتا۔ بایں ہمہ اپنی ادبی زندگی کی اس کشمکش میں وہ جو کچھ بھی ہمارے لئے چھوڑ گیا، لبا غنیمت ہے۔

ادنیٰ قسم کی نقّاشی و مصوّری، بھدّی موسیقی، جو فی زمانہ ہمارے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مہذّب گھرانوں میں محبوب ہے، ناقص افسانے اور متشاعرانہ نظمیں جو آئے دن اخبارات و رسائل کی زینت ہوتی رہتی ہیں عمدہ فنّی تحریکات نہیں کہی جا سکتیں۔ ایسی نقّاشی و مصوری جس کا مدار عریانی پر ہو اور جس سے شہوت ناک احساسات بیدار ہوتے ہوں اور اسی قبیل کی شاعری اور افسانے وغیرہ، ہرچند کہ ان میں فنّی خوبیاں موجود ہوں، قابلِ تحسین تحریکات نہیں ہیں۔ یہ سوال کہ آرٹ کو غیر آرٹ سے ممیّز کرنے کے لئے کیسے اور کس جگہ حدِّ فاصل قائم کرنی چاہئے اور مفید و غیر مفید، اہم اور لایعنی کو کس طرح اور کہاں جدا کرنا چاہئے، انسانی زندگی کے لئے بے حد ضروری ہے۔ ہماری زندگی میں اکثر غلط کاریاں اس امر کا نتیجہ ہوتی ہیں کہ ہم غیر آرٹ کو آرٹ سمجھتے ہیں۔

نظریۂ تادیبی کی رو سے حقیقی آرٹ کا جوہر اُس کے مضمون کی اہمیت و عمل پذیری میں مضمر ہے ایسے آرٹ کا مضمون انسانی زندگی کے لئے اہم، مفید، اخلاقی، تہذیبی و تادیبی ہونا چاہئے۔

دوسرے نظریۂ جمالیاتی کی بنا "آرٹ برائے آرٹ" پر قائم ہے۔ اس نظریہ کے مطابق سچّے آرٹ کا جوہر اس کی شبیہہ کی دلکشی و حُسن میں مستور ہے۔ تیسرے نظریۂ صداقت کے لحاظ سے آرٹ کا مقصد اصلیت و صداقت کی صحیح و موزوں پیش کش میں پنہاں ہے۔ اس نظریہ کے پیشِ نظر حیات و کارنامہ ہائے حیات کو پورے خلوص اور حقیقت کے ساتھ ظاہر کرنا چاہئے۔

لیکن یہ تمام نظریات ناقص اور غیر اطمینان بخش ہیں۔ آرٹ کی بہت عام اور مشہور تعریف یہ ہے کہ:-

"آرٹ ایک ایسی مخصوص تحریک ہے جو، مادّی فائدے سے قطعِ نظر، وہ سامانِ نشاط بہم پہنچاتی ہے جو روحِ انسانی کو بامِ رفعت

کی انتہائی بلندیوں تک لے جاتا ہے"۔

لیکن یہ تعریف بھی مبہم ونا کافی ہے۔ آرٹ کی تشریح وتوضیح کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس تحریک کی خصوصیات بیان کی جائیں، اور فن کار کی کارآگہی کے روحانی تاثر اور عوام کی اثر پذیری کی صلاحیت پر غور کیا جائے۔ آرٹ کا کوئی کارنامہ دراصل اُس وقت مکمل ہوتا ہے جب کہ وہ اس قدر واضح کردیا جائے کہ خودبخود دوسروں کے دل ودماغ میں جاگزیں ہوجائے اور ان کے اندر وہی جذبات ومحسوسات بیدار کردے جو اُس آرٹ کی ایجاد و اختراع کے وقت خود فن کار نے محسوس کئے تھے۔ آرٹ کی اہمیت اور قدر اس لئے ہے کہ وہ انسان کے مطمح نظر کو وسیع اور روحانی دولت کو جو انسانیت کی پونجی ہے المضاعف کردیتا ہے۔ اس لئے اگرچہ آرٹ کے ہر کام میں ہمیشہ کوئی جدت ضرور ہونی چاہئے لیکن ہر جدت ہمیشہ آرٹ کا کارنامہ نہیں ہوسکتی — آرٹ کے کارنامہ کے لئے حسب ذیل خصوصیات درکار ہیں:—

(۱) آرٹ کا تخیل، جدت وندرت بنی نوع انسان کے لئے اہم ومفید ہونی چاہئے،

(۲) آرٹ کی پیداوار کی پیش کش اس قدر صاف اور واضح ہو کہ عوام اسے سمجھ سکیں، اور

(۳) جو کچھ فن کار پیش کرے اس کی دلی کیفیات کا مظہر ہو نہ کہ بیرونی وخارجی اثرات سے صورت پذیر ہوا ہو۔ دراصل آرٹ کا کارنامہ وہی ہے جس میں کوئی جدت وندرت موجود ہو اور اسی کے ساتھ وہ حسب ذیل تین شرائط پر پورا اترے یعنی صداقت، حُسنِ صورت اور خوبیٔ مضمون —— خوب سیرتی وخوش اخلاقی ہمیشہ بنی نوع انسان کے لئے ضروری ہیں۔ کچھ عرصے سے تعلیم یافتہ طبقے میں غیر ضروری تجسس، تنقید بلکہ تنقیص، کُرید، ہر بات پر سوال کرنے، ہر چیز پر شک کرنے اور ہر مسئلہ کو جھٹلانے کی عادت عام ہوچلی ہے۔ چنانچہ ممکن ہے کہ کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ 'خوب سیرتی وخوش اخلاقی' سے کیا مراد ہے؟ چنانچہ:—

"وہ شے جو انسانوں کو باہم دگر جبر وتعدی سے نہیں بلکہ اخوت اور بھائی چارے کے زور سے متحد کردیتی ہے، وہ شے جس سے اتحادِ انسانی کی مشترکہ مسرت کے مظاہرے میں مدد ملتی ہے 'اہم' ہے اور خوب سیرتی وخوش اخلاقی کی حامل۔ زشت واخلاق سوز وہ تحریک ہے جو انسانوں میں نفاق اور پھوٹ ڈالتی ہے اور جو ان کو افتراق کی مصیبتوں سے دوچار کرتی ہے۔ 'اہم' سے مراد وہ شے ہے جس سے لوگ اُن اُمور سے واقف ہوجائیں اور محبت کریں جن سے کہ وہ پیشتر ناواقف تھے اور نفرت کرتے تھے۔"

ایک فن کار کے اپنے مضمون سے تعلق کی انتہائی مخلصانہ حد وہ ہوتی ہے جب کہ وہ لوگوں کے دلوں میں خلوص، صداقت واصلیت کا اثر پیدا کردیتا ہے۔ وہ اصلیت جو اگرچہ یہ بات صاف طور سے نہ بتا سکے کہ اس کا وجود کیا ہے مگر یہ امر واضح طور سے آشکار کردے کہ آرٹسٹ کے دل میں کیا گزر رہا ہے۔ اصلیت کا یہ اثر محض صداقت سے پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ اپنے مضمون سے ایک فن کار کے تعلق کی معراج خلوص ہے اس کے برعکس وہ حالت ہوگی جب کہ اپنے مضمون سے مصنف کا رشتہ اصلی نہیں بلکہ نقلی اور جھوٹا ہوگا۔ آرٹ کے تمام کارنامے انہیں دو حدود کے بین بین ہیں۔ آرٹ کی تین بنیادی شرائط کے بموجب آرٹ کے کارنامے حسبِ ذیل تین خاص اقسام میں منقسم کئے جاتے ہیں:—

(۱) وہ جو اپنے مضامین کی اہمیت کے باعث ممتاز ہیں،

(۲) وہ جو اپنی پیش کش کے حسن ودل کشی کی وجہ سے ممتاز ہیں اور

(۳) وہ جو فن کار کے خلوص، صداقت واصلیت کی نمائندگی کے باعث ممتاز ہیں۔

یہ ہر سہ اقسام حقیقی ومکمل آرٹ کے اعلیٰ ترین نمونے ہوتے ہیں۔

دیکھا جاتا ہے کہ نوجوان فن کاروں میں مذکورۂ بالا ہر سہ خصوصیات میں سے تیسری اور آخری خصوصیت عام طور پر پائی جاتی ہے۔ دوسری خصوصیت بھی کم وبیش نظر آتی ہے مگر پہلی خصوصیت کا مکمل فقدان ہوتا ہے یعنی مضمون کا ابہام افسوسناک ہوتا ہے۔ عمر رسیدہ وآزمودہ کار فن کاروں کے کارناموں میں حُسن وخلوص کی نسبت مضمون کی اہمیت زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ محنتی وجفاکش فن کاروں کے یہاں حسن ودل کشی، مضمون کی اہمیت اور خلوص پر غالب نظر آتی ہے۔ کلاسی زمانوں میں، مضمون کی معنویت پر جتنا زور دیا جاتا تھا اتنا صفائی اور خلوص پر

نہیں دیا جاتا تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ میں حُسن و دل کشی پر مبنی توجہ صرف کی جاتی تھی اُتنی معنویت وخلوص پر نہیں کی جاتی تھی۔ اور عہدِ حاضر میں خلوص وصداقت کی زیادہ مانگ ہے مگر افسوس کہ حُسن اور خصوصاً معنویت کا معیار بے حد پست ہوگیا ہے۔

بعض فن کار صرف مضمون کی اہمیت پر نظر رکھتے ہیں، بعض محض حسن و دل کشی کا لحاظ کرتے ہیں اور بعض خلوص وصداقت کو پیش کرتے ہیں۔ یہی حال عوام کا ہے۔ ہر شخص کی اپنی انفرادی پسند علیحدہ ہے اور جو کچھ وہ دیکھتا ہے اس کے مطابق وہ آرٹ کی نوعیت کی تعریف بیان کرتا ہے آرٹ کے نظریات قائم کرتا ہے اور اُن فن کاروں کی بھی ہمت افزائی اور تعریف کرتا ہے جو خود اس کی طرح یہ نہ سمجھتے ہوئے کہ کس شئے میں حقیقی آرٹ مضمر ہے ہماری دنیا کو تمام اقسام کی حماقت آمیز چیزوں سے پُر کرتے رہتے ہیں اور اُن کو آرٹ کے کارنامے کہتے ہیں۔

نہ تو محض اہمیت، نہ حسن، اور نہ خلوص آرٹ کے کارناموں میں کسی مصرف کا ہو سکتا ہے۔ بلکہ ایسے کارناموں کی پیداوار کی بنیادی شرط یہ ہے کہ فن کار کوئی جدید اور اہم چیز پیش کرے اور اس جدت و اہمیت کا اسے خود احساس بھی ہو۔ لہٰذا ایک حقیقی واصلی آرٹسٹ کے لئے ضروری ہے کہ وہ جدت واہمیت پر نظر رکھنے کی اہلیت وصلاحیت رکھتا ہو۔ وہ غور وفکر کا عادی ہو اور اپنی زندگی لہو ولعب میں نہ گذارتا ہو تاکہ زندگی کے ماحول اور اس کی اندرونی کیفیات میں صعود کر سکے۔ اس غرض کے لئے کہ وہ جدید اشیاء جنہیں وہ دیکھتا ہے 'اہم' ہوں، فن کار کا اخلاقی اعتبار سے ایک شائستہ انسان ہونا نہایت ضروری ہے۔ اُسے خود غرضی کی زندگی گزارنا نہ چاہئے بلکہ بنی نوع انسان کے ساتھ ایک عام ہمدردانہ زندگی کا شریک ہونا چاہئے۔

فن کار کو فخر وغرور و خود بینی و خود رائی کے عیوب سے محترز رہنا چاہئے۔ اُس کو محض اپنے مضمون کی سادگی وصفائی سے سروکار رکھنا چاہئے اور اس مضمون کو اس طرح پیش کرنا چاہئے کہ وہ عام فہم ہو۔ فن کار کو بیرونی اثرات سے بچ کر اپنی اندرونی کیفیات وواردات کی تشفی کرنی چاہئے اور تنگ نظری اور اس قسم کی کوتاہیوں سے بلند ہونا چاہئے۔ اس کو خود اپنے دل سے محبت ہونی چاہئے نہ کہ دوسروں کے دل سے۔ نہ اُس کو اس غلط فہمی وغلط بیانی کا شکار ہونا چاہئے کہ وہ ہر اس چیز سے محبت کرتا ہے جس کو دوسرے چاہتے یا محبت کرنے کے قابل سمجھتے ہیں۔ اُس کو ہر حال میں اپنا ذاتی نقطۂ نظر پیش کرنا چاہئے جو حُسن، خلوص، صداقت مضمون کی سلاست ومعنویت کے ساتھ جدت، ندرت اور انسانیت کے لئے کسی اہم اخلاقی سبق کا بھی حامل ہو۔ لوگوں نے غیر آرٹ کے آرٹ نما کارنامے اتنی کثیر تعداد میں تیار کر دئے ہیں کہ اب عوام، نقادوں بلکہ خود انہیں خود ساختہ فن کاروں کے لئے یہ بتانا دشوار ہوگیا ہے کہ وہ کس شئے کو "آرٹ" سمجھتے ہیں۔

محمود بریلوی

(خیالات ماخوذ)

ولولے

آسماں پر چھا رہی ہیں بدلیاں
کاکلوں کی طرح لہراتی ہوئی
راگ میں ڈوبی ہوئی پرچھائیاں
آنچلوں کی طرح بل کھاتی ہوئی
چھا رہی ہیں جھومتی گاتی ہوئی

(۲)

خون کھولا جا رہا ہے کیا کروں؟
پیچ و خم کھاتا ہوا نیلا دھؤاں
روح پر منڈلا رہا ہے کیا کروں؟
ولولوں کے ساز پر دل میں نہاں
کوئی پیہم گا رہا ہے کیا کروں؟
گا رہا ہے گیت بے چنگ و نوا
جس طرح زلفوں کو پھیلائے کوئی
جس طرح چپکے سے آجائے کوئی
جیسے آنکھوں کو نظر آئے کوئی
ایسے ہی کانوں میں آتی ہے صدا
جیسے لہراتی ہو لہروں پر ہوا
اور یوں محسوس ہوتا ہے مجھے کوئی لہروں میں ڈبوتا ہے مجھے
ہر طرف ہے ایک محرابوں کا جال
دور تک پھیلا ہؤا اک سلسلہ
جس طرح صحرا میں کوئی قافلہ
چھوڑ جاتا ہے نقوشِ پائمال

(۳)

اس طرح محسوس ہوتا ہے مجھے کوئی لہروں میں ڈبوتا ہے مجھے
ہانپتی لہریں ہیں دل کے آس پاس
گھومتے گرداب میرے پاس پاس
دائرے پھیلے ہوئے ہیں دور تک جس طرح لو دوڑتی ہے نوک تک
حل ہوا جاتا ہوں میں گرداب میں
جل رہا ہے دل کے ایوانوں میں عود
گیت ہیں یوں ذہن کے سیلاب میں
جس طرح گاتا ہو کوئی خواب میں
بے صدا، بے لفظ، بے ساز و سرود

(۴)

رفتہ رفتہ ولولوں کا کارواں
چھوڑتا جاتا ہے قدموں کے نشاں
راستے کے پیچ و خم کے ساتھ ساتھ
جھومتا جاتا ہے صحرا کا غبار
ہر قدم پر، ہر قدم کے ساتھ ساتھ
جس طرح ناچے کوئی دیوانہ وار
نغمہ ہائے زیر و بم کے ساتھ ساتھ

یوسف ظفر

اوتی ای

(ایک جاپانی کہانی)

اگلے وقتوں کی بات ہے، جاپان کے صوبے ایشی زن کے ایک قصبے نی گاتا میں ایک آدمی رہتا تھا۔ اُس کا نام ناگاؤ کوشی تھا۔ ناگاؤ کا باپ خود بھی ڈاکٹر تھا اور اُس نے ناگاؤ کو بھی ڈاکٹری ہی کی تعلیم دلوائی تھی۔ لڑکپن ہی میں ناگاؤ کی منگنی ایک لڑکی اوتی ای سے کر دی گئی تھی۔ یہ لڑکی اُس کے باپ کے ایک دوست کی بیٹی تھی۔ دونوں گھروں کے درمیان یہ بات طے پا چکی تھی کہ ناگاؤ کے تعلیم سے فارغ ہوتے ہی اوتی ای سے اُس کا بیاہ کر دیا جائے گا۔ لیکن اوتی ای کی صحت اچھی نہ رہی اور اپنی عمر کے پندرھویں سال میں وہ سِل کے مہلک مرض میں مبتلا ہو گئی۔ جب لڑکی کو یہ محسوس ہوا کہ اُس کی زندگی ختم ہونے والی ہے تو اُس نے ناگاؤ کو آخری ملاقات کے لئے بلایا۔

جس وقت ناگاؤ اُس کے پلنگ کے قریب آکر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا تو اوتی ای نے کہا:

"ناگاؤ پیارے! میرے منگیتر! بچپن ہی سے ہم دونوں ایک رشتے میں باندھ دیئے گئے تھے اور اِس سال کے خاتمے پر ہمارا بیاہ بھی ہو جاتا لیکن اب میں مر رہی ہوں ـــــــ دیوتاؤں ہی کو معلوم ہے کہ ہماری بہتری کس بات میں ہے۔ اگر میں چند سال اور زندہ رہ بھی سکتی تو بھی میں دوسروں کے لئے دُکھ اور تکلیف کا سبب ہی ہوتی۔ اِس نحیف جسم کے ساتھ میں ایک اچھی بیوی نہ بن سکتی تھی اس لئے اگر میں تمہاری خاطر زندہ رہنے کی خواہش بھی کرتی تو یہ بڑی خود غرضی ہوتی۔ میں موت کے لئے بالکل تیار ہوں اور چاہتی ہوں کہ تم مجھ سے وعدہ کرو کہ میرے لئے غم نہ کھاؤ گے ...... اس کے علاوہ میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میرا خیال ہے کہ ہم دونوں دوبارہ ملیں گے ......"

ناگاؤ نے گرم جوشی سے جواب دیا "یقیناً ہم پھر ملیں گے اور اُس "پاک مسکن" میں پھر کبھی جدائی کا دُکھ نہ سہنا پڑے گا۔"

لڑکی نے نرمی سے جواب دیا "نہیں نہیں! میری مراد "پاک مسکن" سے نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگرچہ میں کل دفن کر دی جاؤں گی مگر ہم پھر اسی دنیا میں ملیں گے۔"

ناگاؤ نے اُس کی طرف تعجب کی نگاہوں سے دیکھا وہ اُس کے تعجب پر مسکرائی اور اپنی نرم دھیمی اور خوابناک آواز میں بولی:

"ہاں میرا یہی مطلب ہے۔ اِسی دنیا میں ـــــ تمہاری اِسی زندگی میں ناگاؤ پیارے ...... مگر شرط یہ ہے کہ تمہارے دل میں بھی مجھ سے ملنے کی خواہش موجود ہو۔ صرف اِس واقعے کے پیش آنے کے لئے میں پھر پیدا ہوں گی اور بڑھ کر جوان لڑکی بنوں گی۔ لیکن تمہیں انتظار کرنا پڑے گا ـــــ پندرہ ...... سولہ سال: یہ ایک لمبی مدت ہے .... لیکن میرے موعودہ شوہر تمہاری عمر ابھی صرف انیس ہی سال کی ہے" ......

ناگاؤ اُسے مرتے وقت تسلّی دینے کے لئے بیتاب ہو گیا۔ اُس نے محبت بھرے الفاظ میں کہا:

"میری منگیتر! تمہارا انتظار کرنا میں اپنا فرض سمجھوں گا اور میرے لئے یہ سراسر باعثِ راحت ہو گا۔ اب ہم سات جُونوں کی مدت کے لئے ایک دوسرے کے ہو چکے ہیں ـــــ"

لیکن وہ ناگاؤ کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولی "تمہیں کچھ شک معلوم ہوتا ہے"

ناگاؤ نے کہا "میری پیاری مجھے صرف یہ شک ہے کہ تمہیں کسی اور جسم میں کسی اور نام کے ساتھ میں پہچان بھی سکوں گا یا نہیں۔ تم کوئی نشان یا علامت بتا دو؟"

اوتی ای نے جواب دیا "یہ میرے بس کی بات نہیں۔ صرف دیوتا یا بُدھ ہی کو یہ معلوم ہے کہ کس طرح اور کہاں ہم ملیں گے لیکن مجھے یقین ہے ـــــ پورا پورا یقین ـــــ کہ اگر تم مجھ سے ملنے کی خواہش مند رہے تو میں کسی نہ کسی طرح تم تک پہنچ جاؤں گی ...... میرے یہ الفاظ یاد

رکھنا......یہ کہتے کہتے اوتی ای خاموش ہوگئی اور اس کی آنکھیں بند ہوگئیں وہ مر چکی تھی۔

ناگاؤ کو اوتی ای سے سچی محبت تھی۔ اس لئے اُس کے دل کو بہت گہرا صدمہ پہنچا۔ اس نے پتھر کی ایک لوح پر اوتی ای کا نام کھدوایا اور اُسے اپنی خانگی عبادت گاہ میں رکھ دیا۔ اس لوح پر وہ روز چڑھاوے چڑھاتا تھا۔ اوتی ای نے اپنی موت سے پہلے جو عجیب باتیں کہی تھیں وہ اُن کے متعلق پہروں سوچتا رہتا اور اس کی روح کو خوش کرنے کے خیال سے اس نے سچے دل سے ایک عہد نامہ لکھا کہ اگر وہ دوبارہ پیدا ہو کر اس سے ملی تو وہ اُس سے بیاہ کرے گا۔ اس عہدنامے کو اُس نے اپنی مہر لگا کر بند کیا اور اُسے بھی اوتی ای کے نام کی لوح کے پاس اپنی عبادت گاہ میں رکھ دیا۔

لیکن چونکہ ناگاؤ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اس لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ اس کا بیاہ کر دیا جائے۔ اُسے اپنے بزرگوں کی خواہش کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا پڑا چنانچہ اس نے اپنے باپ کی تجویز کی ہوئی دُلہن قبول کر لی۔ بیاہ کے بعد بھی وہ اوتی ای کے نام کی لوح پر چڑھاوے چڑھاتا رہا اور برابر اسے محبت سے یاد کرتا رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ ایک ایسے خواب کی طرح جس کو یاد کرنا دشوار ہو اس کے حافظے میں اوتی ای کا تصور مدھم پڑتا گیا اور دنوں کے مہینے اور مہینوں کے سال بن بن کر گزرتے رہے۔

اس عرصے میں اُس پر کئی مصیبتیں نازل ہوئیں۔ اُس کے ماں باپ مر گئے۔ پھر اُس کی بیوی اور اس کا اکلوتا بچہ بھی مر گیا۔ اب وہ دنیا میں اپنے آپ کو بالکل تنہا پاتا تھا۔ اُس نے اپنے ویران گھر کو چھوڑ دیا اور اپنے غموں کو بھولنے کی خاطر ایک طویل سفر اختیار کیا۔

اس سفر کے دوران میں ایک دن وہ ایکاؤ پہنچا۔ یہ ایک پہاڑی گاؤں ہے جو اب تک اپنے گرم چشموں اور آس پاس کے خوبصورت نظاروں کے لئے مشہور ہے۔ گاؤں کی سرائے میں جہاں وہ ٹھہرا ایک نوجوان لڑکی اس کی خدمت کے لئے آئی۔ اُس پر نظر پڑتے ہی اُسے یوں محسوس ہوا کہ اُس کا دل بے طرح اچھلنے لگا ہے۔ پہلے اُسے کبھی اس قسم کا احساس نہ ہوا تھا۔ اس لڑکی کی صورت اوتی ای سے اس قدر ملتی تھی کہ اسے اپنی بیداری پر خواب کا دھوکا ہونے لگا۔ چنانچہ اس نے اپنی بیداری کی تصدیق کے لئے اپنی چٹکیاں بھی لیں۔ جب وہ اُس کے لئے آگ یا کھانا وغیرہ لے کر آتی جاتی یا اس کے لئے کمرہ درست کرتی تو اس کا ہر انداز اور ہر حرکت اُس کے دل میں اُسی لڑکی کی محبت بھری یاد کو تازہ کر دیتی جس سے نوعمری میں اس کا قول و قرار ہوا تھا۔ جب ناگاؤ اس سے مخاطب ہوا اور لڑکی نے صاف اور نرم آواز میں اس کی بات کا جواب دیا تو اس کی آواز کی شیرینی نے اس کے دل میں گزرے ہوئے زمانے کی غمناک یاد تازہ کر دی۔

پھر اس نے سخت تعجب کی حالت میں اُس سے کہا: "بڑی بہن! تمہاری صورت کسی سے جس کو مجھ سے جدا ہوئے مدتیں گزر چکی ہیں، اتنی ملتی ہے کہ جب تم پہلے کمرے میں داخل ہوئیں تو میں تعجب سے چونک گیا تھا۔ اس لئے اگر میں تمہارا نام اور وطن دریافت کرنا چاہتا ہوں تو مجھے معذور سمجھنا"۔ لڑکی نے فوراً مرنے والی کی نہ بھولنے والی آواز میں جواب دیا:

"میرا نام اوتی ای ہے اور تم ایشی ذن کے رہنے والے ناگاؤ کو شی میرے موعودہ شوہر ہو، سترہ سال گذرے میں نی گاتا میں مری تھی اور تم نے ایک عہد نامہ لکھا تھا کہ اگر میں کبھی دوبارہ عورت کا روپ لے کر اس دنیا میں آئی تو تم مجھ سے بیاہ کرو گے۔ اس عہدنامے پر تم نے اپنی مہر لگائی تھی اور اُسے میرے نام کی لوح کے ساتھ اپنی عبادت گاہ میں رکھ دیا تھا۔ اسی لئے میں واپس آئی ہوں......

یہ الفاظ کہہ چکنے کے بعد وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

ناگاؤ نے اُس سے بیاہ کر لیا اور وہ ہنسی خوشی رہنے لگے۔ لیکن اس کے بعد یہ بات لڑکی کے ذہن سے بالکل اتر گئی کہ اس نے ایکاؤ میں ناگاؤ کے سوال کے جواب میں کیا کہا تھا۔ اُسے اپنی پہلی زندگی کی بھی کوئی بات یاد نہ تھی۔

گزشتہ زندگی کی جو یاد اُس ملاقات کے وقت پر اسرار طور پر دفعتہً اُس کے ذہن میں چمک اٹھی تھی پھر ہمیشہ کے لئے بالکل دھندلا گئی۔

حامد علی خاں

(اے۔ آئی۔ آر۔ لاہور)

"یہ کیا؟"

بجتا ہو کہیں باجا، جاڑوں کی مہاوٹ میں
اُس وقت اگر آؤ تم ہلکی سی آہٹ میں
دزدیدہ تبسّم کے جادو کو جگاؤں گا
مخصوص ترنّم سے اک نظم سناؤں گا
تاریک شب سرما ہو مست جسے سُن کے
اور ابر بھی پھٹ جائے اُس گیت پہ سر دُھن کے
وہ بادلوں کی یورش ہو جائے جو یوں برہم
اور پھول جھڑیں تاروں سے چاند ہنسے یک دم
تب دیکھ کے یہ منظر تم کہنے لگو "یہ کیا!؟"

اک دوسرا گانا تب ——————— جو دُکھ سے بھرا ہو گا
آہستہ سے گاؤں گا ——————— پہلے نہ سُنا ہو گا
بادل میں گرج ہو گی اُس گیت کے گاتے ہی
برسے گی گھٹا گھم گھم، وہ گیت سُناتے ہی
بارش کی جھڑی اُس دم اشکوں کی جھڑی ہو گی
جوگن سی بنی دنیا خاموش کھڑی ہو گی
ٹکرائے گا جب نغمہ اُس رات کی آہوں سے
تب دیکھ کے تم مجھ کو مخصوص نگاہوں سے
دہراؤ گے حیرت سے گھبرا کے وہی "یہ کیا!؟"

مقبول احمد پوری

سولھویں صدی کی ایک فرانسیسی نظم سے متاثر ہو کر لکھی گئی

اصغر کی یاد میں

مصوری کا پہاڑ، اُس کا وہ خوبصورت جنگل، ایک روشن دن کی اصغر! وہ دوپہر تھی یا سہ پہر تجھے یاد ہے؟

* * *

کس قدر خوبصورت نظّارہ تھا نیچے سامنے دہرہ دُون کی وادی پھیلی ہوئی اور اِدھر اُدھر اُوپر تنہا جنگل اور سنہری دُھوپ اور صرف میں اور تُو! تجھے یاد ہے؟ میرے پیارے!

* * *

اُس دن کو گذرے آج تقریباً گیارہ سال ہوتے ہیں۔ تیری عمر اُس وقت گیارہ سال کی تھی اور یہ تجویز ہوئی تھی کہ بجائے لاہور کے شملے کے سکول میں تو تعلیم پائے۔ تجھے گھر سے رخصت کرنا تھا۔ لیکن میرا جی نہ چاہتا تھا کہ تو مجھ سے جدا ہو۔ میں نے اپنی تیری ایک تصویر اُتروائی اور پھر تجھ سے کچھ باتیں کرنے کچھ کہنے سننے میں گھر سے دُور تجھے اُس موہنے جنگل میں لے گیا۔ تجھے یاد ہے؟

* * *

میری آنکھوں کے سامنے وہ نظارہ ہے۔ تُو صرف گیارہ سال کا ہے مگر کتنی ذہانت تیری پیشانی پر برستی تھی کتنی دل کشی تیرے چہرے میں کھیلتی تھی اور پھر وہ بڑی بڑی آنکھیں جن میں تیزی بھی تھی اور گہرائی بھی! تو ہمہ تن توجہ تھا، مجھے یاد ہے!

* * *

ہم ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔ میں نے کہا سکول میں یہ کرنا یہ نہ کرنا۔ تُو نے کہا ہاں میں جانتا ہوں ابّاجی! میں نے کہا اور خط لکھتے رہنا اور اُداس نہ ہونا۔ اصل میں اداس مَیں خود تھا، میں نہ چاہتا تھا تُو جائے مگر تیرا جانا طے ہو چکا تھا، مجھے خوب یاد ہے وہ دن اور وہ سب باتیں!

* * *

کس قدر خوبصورت تھا وہ دن اور وہ نظارہ اور کس قدر حسین تھا تُو اور کتنی پاکیزہ و دل کش تھی وہ صحبت! کیا میں کبھی بھول سکتا ہوں؟ اور تُو...!؟

ب

محفلِ ادب

آنریبل سرولیم میور کی ایک اُردو تقریر

[آنریبل سرولیم میور کے۔سی۔ایس۔آئی صوبۂ شمالی و مغربی (صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ) میں لفٹنٹ گورنر تھے۔ ممدوح کو علوم مشرقی اور ہندوستان کی زبانوں بالخصوص اُردو سے بڑی دلچسپی تھی۔ خود بھی اس زمانے کے موافق اُردو بولتے تھے۔ یہ وہی زمانہ ہے کہ اُردو ہندی کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی۔ اسی زمانے میں دیسی زبانوں کو فروغ دینے اور ذریعۂ تعلیم بنانے کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ اخبار "سائنٹیفک سوسائٹی علی گڈھ" کے اس زمانے کے ایک پرچے سے ہم ایک تقریر نقل کرتے ہیں جو صاحب ممدوح (سرولیم میور لفٹنٹ گورنر صوبہ شمالی و مغربی) نے اپریل ۱۸۶۸ء میں بنارس میں فرمائی۔ ایڈیٹر]

"خطاب"

(جو بتاریخ ۱۳۔اپریل ۱۸۶۸ء بروقت تقسیم انعام امتحان کے جناب لفٹنٹ گورنر بہادر نے حاضرین وقت اور طلبا مدرسۂ بنارس کی طرف فرمایا)

یہ موقع ہمارے واسطے معمولی سے زیادہ خوشی کا ہے کیوں کہ جب سے کہ ہم ان ممالک مغربی و شمالی میں آئے یہی پہلا موقع ہے کہ ہم ایسی تقریب میں جیسی کہ یہ ہے صدر نشین مجلس ہوئے ہیں اور اس ایوان وسیع میں کہ صاحبانِ انگریز اور رؤسائے ہندوستانی اور طلبائے مدرسہ سے بھرا ہوا ہے نظر کرنے سے ہم کو یاد ایک اسی طرح کی تقریب کی آتی ہے جس میں پندرہ برس گذرے کہ ایک عالی منش جن کا نام تم سب لوگوں میں معزز و معظم ہے یعنی طامسن صاحب نے اس عمارت میں مدرسہ پہلی مرتبہ کھولا تھا۔ بعض اشخاص جو اس وقت حاضر تھے اس وقت بھی ہمارے گرد و پیش موجود ہیں چنانچہ ان میں سے مہاراجہ بنارس ہیں اور سر دیو نرائن سنگھ بھی جو اس وقت بہ جلد وئے ایک خدمت نمائی یعنی شہر میں ایک فساد فرو کرنے کے لئے گورنمنٹ کی عنایت خاص سے مورد اعزاز و امتیاز ہوئے تھے ان میں سے ہیں۔ الحق کہ ہمارے ذاتی تعلقات جو اس مدرسے کے ساتھ ہیں ہم کو اس سے بھی پہلے زمانے کی یاد دلاتے ہیں یعنی چوبیس برس ہوئے کہ اس وقت ہمارے بھائی جان میور صاحب اول پرنسپل اس مدرسے کے تھے۔ جو کچھ کہ آج درپیش ہوا باعث خوشنودی کا ہے اور گرفتھ صاحب نے جو کیفیت سنائی اُس سے واضح ہوتا ہے کہ سررشتہ انگریزی میں تحصیل طلبا کی بالاجمال اچھی ہوئی اور ہم خیال کرتے ہیں کہ نتائج بہت پسندیدہ اور حسب دلخواہ ہیں۔

لیکن ہم جو اس عمارت میں کھڑے ہیں اور نظر او پر حالات گزشتہ اس مدرسے کے کرتے ہیں تو ہم آپ سے یہ کہتے ہیں کہ اس مدرسے کی ترقی تعلیم انگریزی کی ترقی پر نہ قیاس کرنی چاہئے بلکہ اندازہ ترقی مدرسہ بنارس کا کہ یہ مدرسہ نوع خاص کا ہے اس کے ان طلبا کی تعلیم کے نتائج سے کرنا چاہئے جو علوم انگریزی اور سنسکرت دونوں پڑھتے ہیں اور اس کی ترقی و تنزل کا مدار اسی امر پر ہے۔ اب ذرا اس مدرسے کی تاریخ زمانہ گزشتہ پر نظر کرنی چاہئے۔ سنسکرت کا مدرسہ جیسا کہ طامسن صاحب نے اس عمارت کے پہلی مرتبہ کھلنے کے وقت اپنی تقریر میں بیان کیا تھا ۱۷۹۱ء میں مقرر ہوا تھا اور ۱۸۳۰ء میں مدرسۂ انگریزی ایک علیحدہ مکان میں قائم کیا گیا۔ ۱۸۴۴ء میں دونوں مدرسے بہ اہتمام جان میور صاحب کے یکجا کئے گئے اور بتاریخ ۱۰۔ جنوری ۱۸۵۳ء طامسن صاحب نے اس عمارتِ عظیم الشان کو ان دونوں مدرسوں کے قائم کرنے سے رونق بخشی۔

یہ ہمارے ہاتھ میں وہ خطاب بزبان ہندی ہے جو اس وقت پڑھا گیا تھا اور انتخاب مندرجہ ذیل سے عیاں ہوگا کہ مدرسۂ بنارس سے کون سا امرِ عظیم مقصود تھا۔ "انتخاب" خیال کرو کہ گو زبانیں مختلف ہوں مگر امر حق اور عام کسی نہج سے اختلاف نہیں رکھ سکتے ہیں اس لئے مناسب ہے کہ اس مدرسۂ سرکاری میں جتنے اشخاص طالب دریافت امر حق کے ہیں گو ان کی زبان مختلف ہو مگر لازم ہے کہ ایک جگہ جمع ہو کر امر حق کی دریافت کے لئے اپنے اپنے طریقے کا دوسرے کے طریقے کے ساتھ مقابلہ کریں اور اس نہج پر باہمدگر مستفید ہوں۔ مثلاً سنسکرت کے مدرسے میں طلبا نیائے شاستر کو مطابق اصول گوتم رشی کے پڑھتے ہیں اور انگریزی مدرسے میں وہی علم حسب مرقومۂ بیکن تحصیل کرتے ہیں پس صریح یہ بات شایاں

ہے کہ جس امر میں درمیان اقوال گوتم رشی اور بیکن کے اتفاق کلی ہو اس میں یہ طالب علم کسی طرح کے اختلاف کا خیال دل میں نہ لائیں۔ بخلاف اس کے جس باب میں کہ درحقیقت اختلاف ہو مقابلہ اور مباحثہ امر حق کی تحقیق کی جاوے اور جو بات قرار پاوے وہ قبول کر لی جاوے۔ اسی طرح دیگر شعبہ ہائے علوم میں بھی تجویز کرنا مناسب ہے کہ کون امر حق ہے اور کون باطل پس جو حق ہو اس کو قبول کر لینا چاہئے۔

جو تقریر کہ ٹامسن صاحب نے بروز مذکورۂ بالا بیان کی اس میں یہ مقصود ظاہر کیا تھا کہ اس عمارت میں تعلیم علم تہذیب اخلاق کی بطریقۂ راست ہوا کرے اور امر حق کو بہ تمام اس کی عظمت کے ترجیح اور فوقیت دی جاوے" فقط۔ بعد ازیں بہ نظر پیش بینی اور قوت انقلابی کے جو اس نہج کی تعلیم سے امر حق میں اور قلوب مردم کے ہوتی ہے اور بہ نظر ترقی آئندہ ملک ہند کے جو بحالت قوت ہے۔ صاحب مرحوم نے یہ فرمایا تھا کہ اس جگہ سے متوقع ہے کہ یہ طریقہ دریافت حق کا چار طرف پھیلے اور یہ بھی خارج از احاطہ امید نہیں ہے کہ یہ عمارت بھی جس میں ہم اس وقت مجتمع ہیں اس انقلاب عظیم کا ایک واسطہ ہو۔

اے صاحبو! ہم اب ایک انتخاب جان میور صاحب کی اس چٹھی کا پڑھتے ہیں جو مدرسۂ بنارس کا اہتمام چھوڑتے وقت انہوں نے طلبائے مدرسہ کے نام لکھی تھی۔ "انتخاب" ہماری تمنا ہے کہ تم تحصیل علم میں مصروف رہو مگر نہ اس قدر واسطے اس کے فوائد ظاہری کے جس قدر کہ واسطے شوق دریافت اس حق کے جس کی طرف علم کو رہنمائی کرنی چاہئے اور نیز اس واسطے کہ تم تعلیم کے نہایت عمدہ نتائج کی کما حقہٗ قدر پہنچانو یعنی واسطے حصول دانش اور توسیع فہم اور ترقی عقل و تمیز اور دیگر قوائے ذہنی اور بغرض واقفیت صناعات نادرہ خالق کائنات کے اور ان اصول کے جن پر حضرت جل شانہ نے عالم کے انتظام کا مدار رکھا ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ تم اسی تعلیم معقول کو موجب تہذیب اخلاق کا جانو۔ بعد ازیں صاحب ممدوح نے علم سنسکرت کی کتب قدیمہ سے اسمائے کثیر اشخاص نامور کی طرف اشارہ کیا جن کے ذکر سے چاہئے کہ تم کو جو ان کی اولاد میں ہو یہ شوق و حوصلہ بڑھے کہ اپنے بزرگوں کی ناموری کے لائق کوئی کار نمایاں کرو اور نسبت ایک اور امر کے یعنی درباب فوائد قائم کرنے بنائے علم دیسی زبان کے جس مضمون پر شنبۂ گذشتہ کی شام کو ہم نے بمقام بنارس انسٹی ٹیوٹ بہت سرگرمی اور ذہانت کی تقریر سنی تھی۔ جناب جان میور صاحب نے مدرسۂ بنارس کی نسبت اپنی امیدوں کو اس نہج پر ظاہر کیا تھا کہ اگرچہ ہم تم کو تاکید کرتے ہیں کہ زبان انگریزی کی تحصیل بہ شوق روزافزوں کرو کیوں کہ یہ عمدہ ترین وسیلہ حصولِ علم اور بہترین طریقہ دریافت حقائق مستحکم اور مفید کا ہے۔ مع ہذا ہم یہ بھی تمہارے ذہن نشین کرتے ہیں کہ تم کو اپنی زبان کی واقفیت صحیح حاصل کرنی پُر ضرور ہے تاکہ جس باب میں تم سعی و کوشش کرو اس میں کامیاب ہو۔

زبان انگریزی کبھی زبان ملک ہند کی نہیں ہو سکتی قریب بہ تمام کاروبار ملکی جس سے تمہارے ہم وطنوں کا بہبود متعلق ہے دیسی زبان میں اجرا پاتا ہے نور دانش کا اس ملک میں جس کے حصول کے لئے ہم کو امید ہے کہ تم سب کسی نہ کسی راہ پر امداد کرنے کی کوشش کر رہے ہو بوسیلہ اسی زبان کے انتشار پائے گا اور تم سب کو اس بات کا شوق دلی ہونا چاہئے کہ رفتہ رفتہ دیسی زبان میں ایسی کتب علوم کی مہیا و موجود ہو جاویں جن میں مطالب معقول اور عمدہ ہوں اور جن کی عبارت بھی فصیح ہو۔ اب اے طالب علموں! ہم تم سے سوال کرتے ہیں کہ یہ عمدہ امیدیں کسی نہج پر پوری ہوئیں یا نہیں! سال بہ سال گروہ گروہ طلبا انگریزی مع سنسکرت کی جماعتوں کے امتحان دے کر اطراف ملک کو چلے گئے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ یادگاری ان بزرگ اشخاص کی جو ہندستان کے علوم قدیمہ سے عیاں ہے تمہارے دلوں پر اس نہج پر کارگر ہوئی یا نہیں جس سے ایسے بزرگانِ نامور کی اولاد کی شان کے لائق کسی شے کے پیدا کرنے کا حوصلہ پایا جاوے جیسی کہ توقع تھی یا بالعکس اس کے ایسا خیال مطلق تمہارے دلوں میں نہیں اور ایک سوال بھی یہ ہے کہ درباب ترقی علوم دیسی زبان کے کچھ بھی تم سے ظہور میں آیا ہے یا نہیں۔

ظاہر ہے کہ تمہارے ذہن میں ذخیرہ علوم درسیہ ممالک یورپ کا جمع ہے اور تم پر واجب ہے کہ جو نعمت تم نے حاصل کی ہے اس سے اپنے ہم وطنوں کو بھی بہرہ پہنچاؤ، مگر تمہاری محنتوں کے نتیجے سے کوئی شے بھی اس قسم کی ہے جس کا ہم اس وقت نشان دے سکیں۔ صورت یہ ہے کہ ہم کوئی چیز ایسی نہیں دیکھتے جسے علم دیسی زبان کا کہہ سکیں اور طلبائے جماعت ہائے انگریزی مع سنسکرت سے اس پھل کے پیدا

ہونے کا جس کی اُمید تھی کچھ نشان نہیں پایا جاتا ہے تاکہ وہ بڑی ضرورت رفع ہو۔

اب آگے سنو کہ ہندستان اور یورپ دونوں کے علوم فلسفہ کے ماہرین سے یہ امید تھی کہ تحقیقات مطالب حکمیہ کے دونوں طریق کو وہ باہم مقابل کر سکیں گے اور رفتہ رفتہ اصول صحیحہ کو اس طرح پر رواج دیں گے جو ہندستان کے عوام کی فہم و ادراک کے لائق ہو بلکہ خود حق کا بیان جس طرح کہ کسی زبان ممالک یورپ میں ہو اس سے زیادہ وضاحت و صراحت کے ایسے طور پر مناسب رتبہ فہم و ادراک اس ملک کے لوگوں کو لکھا جاوے کہ زیادہ سہولت اور مزید رغبت کے ساتھ ان کا ذہن قبول کر لے اور بتنزائد اس امید کے طامسن صاحب مرحوم جو دل سے اس ملک کا بہبود چاہتے تھے بسرگرمی اور بلند نظری یہ توقع رکھتے تھے کہ ایک دن بہتری کا آئے گا جیسا کہ ہم نے ابھی تم کو پڑھ کر سنایا یعنی وہ دن جب یہ مدرسہ اس ملک کے عروج میں مدد دے گا اور اس کے از سر نو درست ہونے میں منجملہ وسائل امداد و اعانت کے گنا جائے گا۔ واضح ہو کہ اور جگہ اس ملک کے لوگوں کے ذہن کو متحرک کرنے میں کوششوں کا کسی قدر عمل ظہور میں آرہا ہے پس تم کیوں پیچھے رہے جاتے ہو۔ شاید تم یہ کہو گے کہ بنگالہ میں مدرسہ یونیورسٹی ہے جس کے فوائد سے تم یہاں محروم ہو اور تم شاید یہ شکایت بھی کرو گے کہ سنسکرت کے علم و ادب اور علوم فلسفہ کی تحصیل کے واسطے خطاب فضیلت نہیں عطا ہوتے ہیں۔ مگر اے طالب علمو اس امر میں ہم تمہارے ساتھ بہ دل اتفاق کرتے ہیں اور ہم اس بات کو دیکھ کر خوش ہوں گے کہ یونیورسٹی کی طرف سے واسطے تحصیل سنسکرت و دیگر علوم ہندستان کے ترغیب عمل میں آئے لیکن بایں ہمہ خیال کرو کہ یہ عذر تمہارا واجبی ہے یا نہیں! بیان کرو کہ خطاب فضیلت علم ادب یا فضیلت زبان سنسکرت کا اگر تم کو عطا بھی ہو تو کون سا حقیقی فائدہ حاصل ہو جائے گا اور کیا قوت پیدا زاید ہوگی۔ اصل قوت علم اور نیکی ہے اور تم کو یاد ہو گا کہ شاعر نے کیا کہا ہے چنانچہ ترجمہ اس کا یہ ہے۔

خطاب انساں کا ہے جو سکّہ زر پر
نہ ہو سکّہ تو انساں پھر بھی ہے زر

پس یہی حال تحصیل زبان انگریزی معہ سنسکرت کا ہے اگر اس میں قوت و زور ہے تو جیسے کہ طامسن صاحب کو توقع تھی محض بوجہ نہ ملنے امتیاز و خطاب متعلقہ مدارس کے قصور واقع نہ ہونا چاہئے۔

پس اے طالب علموں معلوم ہوتا ہے کہ تحصیل انگریزی معہ سنسکرت اب معرض امتحان میں ہے اور اس امتحان کے نتائج عمدہ اور پسندیدہ کا پیدا ہونا تم پر منحصر ہے آیا علم سنسکرت ہمیشہ اسی عمارت کی کوٹھڑیوں میں بند رہے گا یا لوگ اس کو صرف ایسا جانتے رہیں گے کہ وہ رہنمائے جہالت اور مطالب پست جسمانی کا ہی نہیں یہ علم سنسکرت ممالک یورپ کے علوم سے مل کر ان عمدہ مطالب ترقی ملک کے پیدا کرنے میں ممد ہونا چاہئے جن کے ظہور کی آرزو بکمال شوق وہ صاحبان بانی اس قاعدہ آمیزش تعلیم سنسکرت اور انگریزی کے رکھتے تھے۔ مگر ہم پوچھتے ہیں کہ اس نتیجے کے ظہور کا کوئی وعدہ تمہاری طرف سے ہے، کوئی نشان ظاہری ایسا ہے جو علامت حصول اُس مطلب دلخواہ کا ہو جس کی مدت دراز سے امید تھی۔

اے طلبائے زبان انگریزی اور سنسکرت کے ہم ان سوالات کو تمہارے پاس چھوڑتے ہیں اور تمنا رکھتے ہیں کہ یہ سوال تمہارے دل میں وہ شوق اور عزم و ہمت پیدا کریں گے جن سے ان صاحبان عالی منش اور نیک طبع کی عمدہ آرزوئیں جن کے مرکوزات خاطر ہم نے ابھی تم کو پڑھ کر سنائے تمہارے وسیلے سے پورے ہوں۔

اب ہم پھر وہ نہایت خوشی ظاہر کرتے ہیں جو ہم کو اس قدیم شہر کے رؤسا میں سے ایک مجمع کثیر اور رسا کار اشخاص سے اس وقت ملاقات ہونے کے باعث حاصل ہوئی اور جو شوق روز افزوں کہ اس مدرسے اور نیز بنارس انسٹی ٹیوٹ میں در باب ترقی نور علم اور تعلیم و تربیت کے پایا جاتا ہے بہ نظر اس کے امید ہے کہ عمدہ ترین نتیجے پیدا ہوں گے۔

مطبوعات

تاریخ ادب ہندی۔ از سید ظہیر الدین احمد صاحب علوی ایم۔ اے (اُردو) ایم۔ اے (فارسی) ایل ایل۔ بی۔ اُردو اور ہندی کا باہمی تعلق مسلّم ہے اس لحاظ سے اہلِ اُردو کو علوی صاحب کا ممنون ہونا چاہئیے کہ انہوں نے ہندی ادب کی یہ مختصر اور دلچسپ تاریخ لکھ کر اُن کیلئے مفید واقفیت بہم پہنچائی۔ امید ہے کہ یہ کتاب شوق سے پڑھی جائے گی۔

حجم ۲۵۰ صفحات۔ قیمت عہ/ پتا:۔ رام نرائن لال۔ کتب فروش الہ آباد

بگولے۔ دیہاتی افسانوں اور دیہاتی نظموں کے سلسلے میں احمد ندیم صاحب قاسمی نے بہت نام پیدا کیا ہے۔ موجودہ مجموعے میں اُن کے بیس افسانے شامل ہیں۔ احمد ندیم صاحب بہت محنت سے لکھتے ہیں۔ اُن کی زبان اور مہارتِ فن قابلِ تعریف ہے۔

حجم ۲۴۴ صفحات کاغذ اور جلد نفیس ہے۔ قیمت مجلّد عہ/ پتا:۔ مکتبۂ اُردو۔ لاہور

نیرنگیٔ بخت یعنی میری اپنی کہانی از محترمہ وزیر سلطان صاحبہ جالندھری۔ پبلشر سید ذکار اللہ شاہ حسنی جالندھر شہر۔ مجلّد قیمت عہ/ یہ ایک محترم خاتون کی خود نوشت سوانح عمری ہے اور فی الحقیقت دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ ایسی کتابیں کم دیکھنے میں آتی ہیں جن میں ایک مسلمان خاتون نے اپنے سوانح حیات من وعن قلم بند کئے ہوں۔ واقعات فی نفسہٖ غیر معمولی نہیں ہیں لیکن یہی اس کتاب کی خوبی ہے کہ ایک شریف خاندان کی رکن نے ایسے حالات بیان کئے ہیں جو عام طور پر پیش آتے ہیں لیکن اس صورت میں بیان نہیں کئے جاتے کہ وہ بعینہٖ آنکھوں کے سامنے آجائیں۔ مصنفہ نے اپنی تصنیف کو سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب کے نام سے منسوب کیا ہے۔ جو اُن کے پھوپھی زاد بھائی ہیں۔ شمیم جالندھری مدیرۂ الزہرا نے کتاب پر نظر ثانی کی ہے۔ شروع میں مصنفہ نے بیان کیا ہے کہ "مجھے اپنی داستانِ زندگی لکھنے کا خیال کس طرح پیدا ہوا"۔ اس کے بعد جناب لیڈی عبدالقادر صاحبہ رائے زادہ ہنسراج، پروفیسر محمد عبداللہ وغیرہ کے تبصرے اور رائیں ہیں۔ کتاب میں تین تصویریں بھی شامل ہیں۔

ب

ٹوٹے ہوئے تارے۔ از کرشن چندر صاحب ایم۔ اے۔

اس مجموعے میں دس افسانے شامل ہیں۔ مسٹر کرشن چندر کا نام اردو کے افسانہ نویس ادیبوں میں بہت ممتاز ہے۔ اُن کا دلکش اور شاعرانہ اندازِ بیان اور ان کے موضوعات کی حقیقت ترجمانی بارہا خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔ امید ہے کہ یہ مجموعہ بھی بہت مقبول ہوگا۔ یہ کتاب بھی مکتبۂ اردو نے شائع کی ہے۔ یہ مکتبہ اپنی سلیقہ مندی اور نفاست پسندی کے لئے قابلِ تعریف ہے۔ اس مکتبہ کی دوسری کتابوں کی طرح زیرِ نظر کتاب بھی بہت خوبصورت جلد کے ساتھ اچھے کاغذ پر چھپی ہے۔

حجم ۲۰۴ صفحات قیمت عہ/ پتا:۔ مکتبۂ اُردو۔ لاہور

عروج کے سَو شعر یہ حضرتِ عروج زیدی کے سو شعروں کا مجموعہ ہے۔ ابتدا میں اُردو کے مشہور شاعر حضرتِ ماہر القادری کا دیباچہ درج ہے۔ کتاب چھوٹی تقطیع پر اچھی چھپی ہے دو شعر بطور نمونہ بلا انتخاب درج ذیل ہیں:۔

جس جگہ حد سے گزر جاتا ہے جوشِ بے خودی
فرض ہو جاتا ہے اک سجدہ وہیں میرے لئے

جلوے چمن چمن کر نکلتے تھے حجابِ ناز سے
ہلکی ہلکی پڑ رہی تھیں حُسن کی پرچھائیاں

قیمت ۴؍ پتا:۔ عروج صاحب محلہ شہباز پور۔ بدایوں۔ یو۔ پی۔

سید عبداللطیف پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ ہمایوں ۳۴/۲۔ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔ صرف سرورق ہاف ٹون پریس لمیٹڈ میں چھپا

جلد ۴۲ # فہرستِ مضامین نمبر ۳

"ہمایوں" بابت ماہ ستمبر ۱۹۴۲ء

ضروری اطلاع:۔ جواب طلب اُمور کے لئے اپنا پتا لکھ کر جوابی کارڈ اور مضامین کے ساتھ ان کی رسید کی اطلاع یا واپسی کے لئے اپنا پتا لکھ کر ٹکٹ لگا لفافہ بھیجنا بہت ضروری ہے۔ بہ صورتِ دیگر دفتر "ہمایوں" خط و کتابت کا ذمہ دار نہ ہوگا اور ناقابلِ اشاعت مضامین بیرنگ واپس کئے جائیں گے۔

چندہ سالانہ صہ ششماہی سے (مع محصول) — قیمت فی پرچہ ۸ر

جہاں نما

موجودہ مصر

قاہرہ یونیورسٹی کے پروفیسر ادبیات ڈاکٹر طٰحہٰ حسین نے ایشیاٹک ریویو میں موجودہ مصر کے متعلق ایک مضمون لکھا ہے جس میں انہوں نے ذیل کے خیالات کا اظہار کیا ہے :—

ہماری قومی آزادی نے اب زیادہ پائدار صورت اختیار کر لی ہے اور دوسری قوموں سے ہمارے تعلقات روز بروز استوار ہو رہے ہیں۔ مصر کو مدت کے بعد ایسی آزادی، خود مختاری اور خوش حالی نصیب ہوئی ہے۔ اس آزادی و خود مختاری کا اثر ہماری موجودہ ذہنی زندگی میں بھی نمایاں ہے۔ مصر کی تاریخ میں ایسا کوئی دور نہیں آیا جب آج کل کی طرح حکومت نے عوام کی تعلیم کا فرض اپنے ذمے لیا ہو اور لوگ قانوناً اس بات پر مجبور ہوں کہ اپنے بچوں اور بچیوں کو ایک خاص مقررہ معیار تک تعلیم دلوائیں۔ مصر کی تاریخ میں اس سے قبل کوئی ایسا دور بھی نہیں آیا جب تعلیم کا ہر شعبہ عوام کے لئے کھلا ہو اور حکومت کے خرچ سے غریب لوگ بھی امیروں ہی کی طرح تعلیم حاصل کر سکیں۔ مصر کے ہر گاؤں میں اب کم از کم ایک پرائمری سکول اور ہر قصبے میں کم از کم ایک ہائی سکول ضرور موجود ہے۔ قاہرہ میں مشہورِ عالم مذہبی یونیورسٹی ازہر کے علاوہ ایک جدید مصری یونیورسٹی بھی قائم ہے جہاں تمام نئے علوم کی نئے یورپی طریقوں کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ملک میں متعدد صنعتی مدارس بھی کھل گئے ہیں اور جامعۂ ازہر کی شاخیں بھی جا بجا قائم ہیں۔ ایک اور نئی یونیورسٹی سکندریہ میں قائم ہو رہی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قدیم زمانے میں بھی سکندریہ میں ایک عظیم الشان کتب خانہ موجود تھا۔ اس کے علاوہ مصر میں جامعۂ ازہر اور اسلامی سلاطین کے قائم کردہ مدارس بھی موجود تھے لیکن تعلیم کا جو عام چرچا مصر میں آج کل ہے اور اس کے لئے جو وسیع ذرائع مہیا کر دیئے گئے ہیں ان کی مثال پہلے کسی زمانے میں نہیں ملتی۔ موجودہ مدارس کی اہمیت اس لحاظ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ دراصل ایک بہت بڑے تعلیمی منصوبے کا پیش خیمہ ہیں جس کے اثرات بہت وسیع اور دور رس ہوں گے۔

مصر آج کل میدانِ جنگ بنا ہوا ہے لیکن مصریوں نے اس جنگ میں عملی حصہ نہیں لیا۔ وہ خاموشی سے اپنے تعلیمی و تمدنی منصوبوں کو جامۂ عمل پہنا رہے ہیں۔

معاہدۂ مصر و برطانیہ کی تشریح

نحاس پاشا کی حکومت نے موجودہ جنگ میں اتحادیوں کے مقاصد سے اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے مصر کی غیر جانب داری کو برقرار رکھنے کے لئے معاہدۂ مصر و برطانیہ کی تشریح کرتے ہوئے کہا :—

موجودہ جنگ ایک عالمگیر انقلاب ہے اور مصر کے مقاصد کے حصول کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم اس معاہدے پر پورا اعتماد رکھیں جس پر ہم نے اپنی قومی آزادی ...... کو برقرار رکھنے کے لئے بہ رضا و رغبت دستخط ثبت کئے تھے ....

مصر و برطانیہ کا معاہدہ مصر کو برطانیہ کے لئے جنگ کرنے پر مجبور نہیں کرتا۔ معاہدے میں متعلقہ فقرے یہ ہیں: "اگر فریقین میں سے کوئی فریق جنگ میں اُلجھ جائے تو دوسرا فریق ایک اتحادی کی حیثیت سے فوراً اُس کی مدد کرے گا .... اعلیٰ حضرت شاہِ مصر ہز میجسٹی کنگ امپرر کو مصر کی سرزمین پر تمام ممکن امداد اور آسانیاں بہم پہنچائیں گے جن میں بندرگاہوں، ہوائی اڈوں اور

ذرائع رسل و رسائل کا استعمال شامل ہوگا۔"

ظاہر ہے کہ یہ شرط مصر کو اس بات پر مجبور نہیں کرتی کہ وہ برطانیہ کو فوجی امداد دے، اور برطانیہ نے "اسی معاہدے" کی پابندی کی وجہ سے مصر سے فوجی امداد کا مطالبہ کبھی بھی نہیں۔

جزائر فلپائن

جزائر فلپائن تقریباً جزائر برطانیہ کے برابر ہیں۔ ان میں سے دو سب سے بڑے جزیرے آئرلینڈ سے بڑے ہیں۔ جزائر فلپائن کا مجموعی رقبہ ایک لاکھ چودہ ہزار مربع میل ہے اور آبادی ایک کروڑ بیس لاکھ سے زیادہ یعنی تقریباً ریاست حیدرآباد (دکن) کے برابر ہے۔

برطانی اور اتحادی جہازوں کا نقصان

برطانی محکمۂ بحر کی ۱۹۴۱ء کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۴۱ء کے آخری چھ مہینوں میں برطانوی، اتحادی اور غیر جانب دار جہازوں کی غرقابی کا ماہوار اوسط تقریباً ایک لاکھ اسی ہزار ٹن تھا۔

اسی رپورٹ میں یہ بھی لکھا ہے کہ آغازِ جنگ سے لے کر ۱۹۴۱ء کے آخر تک کل تراسی لاکھ ٹن وزنی جہاز غرق ہو چکے ہیں۔ اس کے مقابلے میں فریقِ مخالف کے غرق شدہ جہازوں کے وزن کا اندازہ پچاس اور ساٹھ لاکھ ٹن کے درمیان کیا گیا ہے۔

ڈاک اور ریلوے کے سرکاری محکموں کی وسعت

حکومتِ ہند کے جن دو محکموں میں سب سے زیادہ ملازم کام کرتے ہیں اُن میں سے ایک تار اور ڈاک کا محکمہ ہے اور دوسرا سرکاری ریلوے کا محکمہ۔ تار اور ڈاک کے محکمے میں ایک لاکھ بیس ہزار آدمی کام کرتے ہیں اور سرکاری ریلوے کے محکمے میں تقریباً سات لاکھ ملازم ہیں۔

دوڑنے کی ورزش

"سٹیٹسمین" کے ایک نامہ نگار نے لکھا ہے کہ ہندوستان کا محکمۂ ریلوے ٹرالیوں کو چلانے کے لئے قلیوں سے کام لیتا ہے۔ یہ قلی کسرتی اور اعضا کی بیک وقت ورزش کے حیرت انگیز نمونے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اوسطاً ۔ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ٹرالی کو چلاتے ہیں اور کسی قسم کی تھکن کے بغیر روزانہ تقریباً اُنیس میل کا فاصلہ طے کر لیتے ہیں۔ ٹرالی کو چلاتے وقت دو آدمی اُس کا ہتھا پکڑ کر لائنوں پر دوڑنا شروع کرتے ہیں اور رفتہ رفتہ اپنی رفتار کو ۱۲ میل فی گھنٹہ تک بڑھا لیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اُچک کر ٹرالی پر بیٹھ جاتے ہیں جو کچھ دیر تک اپنے زور میں چلی جاتی ہے۔ جب ٹرالی کی رفتار کم ہوتے ہوتے پانچ میل فی گھنٹہ تک پہنچتی ہے تو قلی پھر اتر کر اسے دھکیلنا شروع کر دیتے ہیں تا آں کہ اُس کی رفتار دوبارہ بارہ میل فی گھنٹہ تک پہنچ جاتی ہے۔"

سٹیٹسمین کے نامہ نگار نے ایک ایسے قلی کا ذکر بھی کیا ہے جو تنہا بارہ سنے پندرہ میل تک ٹرالی کو بہ آسانی دھکیل سکتا تھا۔

شہد کے طبی خواص

آیور وویدک اور یونانی نقطۂ نظر سے شہد کا استعمال بہت سی بیماریوں میں مفید ہے۔ شہد زکام اور کھانسی سے بچاتا ہے۔ اس کا استعمال کرنے والے بخار میں مبتلا نہیں ہوتے۔ دکھتی آنکھوں کے لئے بھی شہد مفید ثابت ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لئے سیسے یا شیشے کی سلائی شہد میں ڈبو کر اُسے سرمے کی طرح آنکھوں میں لگانا چاہئے۔ شہد ملیّن معدہ اور مصفّیٔ خون ہے۔ یوروپین ڈاکٹروں نے بھی شہد کو مختلف بیماریوں میں بہت مفید بتایا ہے۔ ایک ڈاکٹر اسے خرابیٔ غذا کے بدترین مریضوں کے لئے جو دل کی کمزوری میں بھی مبتلا ہوں اپنے تجربے کی بنا پر مفید بتاتا ہے۔ اسی ڈاکٹر نے نمونیا کے ایک مریض پر شہد کا تجربہ کر کے اسے مفید پایا۔ یہی ڈاکٹر کہتا ہے کہ جب جسم میں سے شکر کا ذخیرہ دفعتہً ختم ہو جائے تو عام جسمانی قوت کو بحال کرنے کے لئے اور بالخصوص دل کو تقویت دینے کے لئے شہد کا استعمال کرنا چاہئے۔ دوسرے ڈاکٹروں نے ان باتوں کی تصدیق کی ہے۔ بعض اور ڈاکٹروں نے شہد کو ہاضمے کی خرابی کے لئے مفید بتایا ہے۔ ایک ڈاکٹر کا قول ہے کہ شہد معدے اور آنتوں کے بظاہر ناقابلِ علاج زخموں کے لئے بھی مفید ہے۔

شہد کے متعلق ایک اور بات قابلِ لحاظ ہے۔ اس میں اگر ٹائیفائڈ بخار اور پیچش وغیرہ کے جراثیم داخل کئے جائیں تو وہ فوراً مر جاتے ہیں۔ گویا شہد کو ہم طبی نقطۂ نظر سے محفوظ ترین غذا سمجھ سکتے ہیں۔

ایک ڈاکٹر کے اندازے کے مطابق سات آونس شہد میں اتنی ہی غذائیت ہوتی ہے جتنی :—

دودھ میں	۲½ پاؤنڈ
بالائی کے پنیر میں	۶ ، ۵ آونس
گائے کے گوشت میں	۱۲ آونس
کوڈ مچھلی میں	۱۵ آونس
نارنگیوں میں	۸ عدد
انڈوں میں	۱۰ عدد

ہندوستان کے باشندے جنگی رقبوں میں

"سدرن انڈیا کامرس" کے ایک مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ جو ہندوستانی مختلف جنگی رقبوں میں گھر گئے ہیں اُن کی تعداد کچھ کم نہیں۔ ذیل کے نقشے سے ظاہر ہوگا کہ کس سال کے تخمینے کے مطابق کس علاقے میں کتنی آبادی تھی۔

سال	علاقہ	ہندوستانی آبادی	سال	علاقہ	ہندوستانی آبادی
۱۹۳۱ء	ہانگ کانگ	۴۷۴۵	۱۹۳۲ء	سلطنتِ متحدہ	۷۱۲۸
۱۹۳۷ء	برطانی ملایا	۷۵۴۸۴۹	۱۹۳۳ء	مالٹا	۴۱
۱۹۳۶ء	جزائر فجی	۸۹۳۳۳	۱۹۳۰ء	شرق الہند ولندیزی	۲۷۶۳۸
۱۹۳۳ء	آسٹریلیا	۲۴۰۴	۱۹۳۱ء	تھائی لینڈ	۵۰۰۰
۱۹۳۲ء	نیوزی لینڈ	۱۱۶۱	۱۹۱۱ء	ہند چینی	۶۰۰۰
۱۹۳۴ء	برطانی شمالی بورنیو	۱۲۹۸	۱۹۳۱ء	جاپان	۳۰۰
۱۹۳۷ء	عدن	۸۱۶۸	۱۹۳۲ء	عراق	۲۵۹۶
۱۹۳۱ء	برطانی سومالی لینڈ	۵۲۰			

برما کے ۱۴ لاکھ ہندوستانی اوپر کے نقشے میں شامل نہیں ہیں۔

حامد علی خاں

ہندوستان کی تاریخ پر ایک سرسری نظر

(۲)

(مُسلمانوں کا تمدّن)

(گذشتہ سے پیوستہ)

اب ہم ہندوستان میں مسلمانوں کے تمدن پر ایک نظر دوڑاتے ہیں۔

پہلے نام نہاد پٹھان بادشاہوں کا زمانہ آتا ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے ہندوستان کی کایا پلٹ گئی۔ شمالی ہند کی ہندو حکومتوں کا خاتمہ ہوگیا۔ راجپوتوں کی طاقت ٹوٹ جانے سے برہمنوں کے قدیم علمی مرکز اُجڑ گئے۔ وہ شمال سے جنوبی ہند کی طرف چل دیئے جہاں آریائی اور غیر آریائی تمدن میں ملاپ ہوکر ہندو تہذیب نے فروغ پایا۔ اُدھر مفتوحہ علاقے کے باشندے حملہ آوروں سے منہ پھیر کر ایک عرصہ اُن سے الگ تھلگ رہے۔ ذاتوں کی بندشیں اور زیادہ سخت ہوگئیں عورتوں کے لئے پردے کا دستور عام ہوا۔ لیکن رفتہ رفتہ اسلام کے اثر سے ہندومت میں اصلاح ہونے لگی اور باوجود محکومی کے ہندوؤں کی معاشرتی حالت سدھرنے لگی۔ دونوں تہذیبوں نے ایک دوسرے پر اثر پیدا کیا اور ایک مشترک تہذیب کی ابتدا کے آثار نظر آنے لگے۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں سلاطین دہلی کے اُن پانچ مسلمان خاندانوں میں جنہوں نے ۱۱۹۳ء سے ۱۵۲۶ء تک سوا تین سو سال تک ہند میں حکومت کی نیز اُن چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں جو وسطی و جنوبی ہند میں قائم ہوگئی تھیں بعض نکتہ رس اور روشن خیال حکمران پیدا ہوئے جنہوں نے علاوہ امن وامان قائم کرنے کے ملک میں ایک عمدہ نظم ونسق جاری کیا اور رفاہ عام کے بڑے بڑے کام سرانجام دیئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض سلاطین ظالم اور بے رحم تھے، کئی بار خانہ جنگی کا بازار بھی گرم ہوا مگر بہت سے حکمران حکمرانی کے اہل اور رعایا کے سچے بہی خواہ بھی تھے۔

عام طور پر دہلی کی حکومت ایک فوجی سی مطلق العنان حکومت تھی لیکن جس طرح ہندو ریاستوں میں اکثر برہمنوں کے اثر سے بادشاہ کے استبداد کی روک تھام ہوتی رہی اسی طرح ان مسلمان حکومتوں میں بھی اُمرا اور علما کا اثر عموماً نمایاں ہوتا تھا اور بعض صورتوں میں یہ اثر بہت مفید ثابت ہوا۔ سلطنت کے انتظام کا یہ سلسلہ تھا کہ چھوٹی چھوٹی جاگیروں میں تقسیم تھی ہر جاگیردار امن کی حالت میں اپنے علاقے میں وسیع اختیارات رکھتا تھا اور ضرورت کے وقت بادشاہ کو اپنی فوج سے مدد دیتا تھا۔ جاگیری نظام ایک مضبوط بادشاہ کے وقت میں مفید اور کمزور بادشاہوں کے زمانے میں ملک میں خانہ جنگی اور سرکشی کا ذریعہ بن جاتا تھا۔ دیہات میں گو پنچایتیں کمزور پڑ گئیں پھر بھی وہاں کی زندگی پر حکومتوں کے بننے اور بگڑنے کا چنداں اثر نہ ہوتا تھا۔ اور وہ اپنے ہزاروں سال کے پرانے طریقوں پر بدستور چلتی رہی۔

عدل وانصاف کے سلسلے میں بادشاہ اعلیٰ ترین عدالت کا کام دیتا تھا اور اس کے نیچے قاضیوں اور مفتیوں کی عدالتیں تھیں۔ فوجداری کا قانون سخت تھا لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہندوؤں کے مقابل میں مسلمانوں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جاتی تھی۔ محمد تغلق کی بابت ابن بطوطہ نے بیان کیا ہے کہ ایک بار کسی ہندو امیر نے قاضی کے ہاں نالش کی کہ سلطان نے اس کے بھائی کو بے سبب قتل کرڈالا ہے۔ قاضی نے سلطان کو طلب کیا چنانچہ یہ گیا اور قاضی کو سلام کر کے کھڑا ہوگیا۔ جب قاضی نے بیٹھنے کی اجازت دی تو بیٹھا اور اس وقت تک عدالت سے باہر نہ گیا جب تک مدعی راضی نہیں ہوگیا۔

اسی بادشاہ کے زمانے میں دہلی کا یہ حال تھا کہ یہاں چھوٹے بڑے مدارس ایک ہزار کے قریب تھے اور سَتّر شفا خانے تھے جن میں غربا

کا مفت علاج ہوتا تھا۔ ۲۰۰۰ مسجدیں تھیں اور خانقاہوں اور حماموں کا کوئی شمار نہ تھا۔[1]

سڑکوں کے بننے اور نہروں کے کھدنے سے تجارت اور زراعت کو ترقی ہوئی۔ ہندوؤں کو آہستہ آہستہ معزز عہدے ملنے لگے اور حاکمی محکومی کے امتیاز میں وہ سختی نہ رہی۔

فنِ تعمیر نے ترقی اور وسعت حاصل کی اور "پٹھان طرزِ تعمیر" میں عرب طرز اور ہندو طرز کی خوش نما آمیزش نظر آنے لگی۔ قطب مینار، قصرِ ہزار ستون، علائی دروازہ اس کے نمونے ہیں۔ تغلقوں کے وقت میں آرائش کی جگہ سادگی اور عظمت پر زور دیا جانے لگا جیسا کہ تغلق آباد کے کھنڈروں سے ظاہر ہے۔ چھوٹی ریاستوں میں جون پور کی اٹالا مسجد، بنگال کے بارہ سونا مسجد، بیجاپور کے کتب خانے، گول کنڈہ کا قلعہ اور جہاں گیر کا وٹھل مندر اس زمانے کی خوبصورت یادگاریں ہیں۔ نقاشی کی ترقی اس زمانے میں مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی وجہ سے رُکی رہی۔ علم و ادب کا مسلمانوں کو شوق تھا۔ انہوں نے تاریخیں لکھیں۔ سنسکرت سیکھی اور **دیسی زبانوں کی نشو و نما** میں بڑا حصہ لیا۔ ہندی، بنگالی، مرہٹی، تامل، پنجابی نے ترقی پائی اور ہندو مسلمانوں کی مشترک زبان اُردو کی بنیاد پڑی اور وہ ہندوستان میں جگہ جگہ پھیلنے لگی۔

اسلام اور ہندو مت کا ایک دوسرے پر اثر ہوا۔ باوجود اس کے کہ اسلام مساوات کا مذہب تھا مسلمانوں کی بھی نسل کے اعتبار سے شیخ، سید، مغل، پٹھان چار مختلف ذاتیں بن گئیں اور مذہبی عقیدے کے لحاظ سے وہ سنی شیعہ میں تقسیم ہوگئے۔ اولیاؤں کے مزاروں پر چڑھاوے چڑھانے اور منتیں ماننے کا رواج ہوگیا۔ بعض مسلمان بادشاہوں اور امرا نے جو ہندو عورتوں سے شادیاں کیں اس سے مسلمانوں میں بعض ہندوانہ رسوم کا رواج ہونے لگا۔ اس زمانے میں ادھر مسلمانوں میں صوفیوں اور دوسرے مذہبی پیشواؤں نے اپنے سلسلے قائم کئے اور ہندوستان کے کونے کونے میں اسلام پھیلایا اور ادھر ہندوؤں میں زیادہ تر اسلام کے اثر سے کئی مذہبی مصلح پیدا ہوئے جنہوں نے ہندو مت میں فضول رسمیں دُور کرکے سادگی پیدا کرنے، انسانوں کی ایک عام برادری قائم کرنے اور خدا کا عقیدہ رائج کرنے کی کوشش کی۔ وہ رام یا کرشن کو خدا کا اوتار سمجھتے تھے۔ اُن کا اعتقاد تھا کہ انسان کو صرف خدا کے فضل و کرم سے نجات مل سکتی ہے۔ یہ بھگتی کی تحریک تھی۔ رامانج، رامانند اور چیتنیہ ان خیالات کے نام لیوا تھے۔ نام دیو، کبیر اور نانک وغیرہ کی تعلیم میں اسلام کا اثر صاف نظر آتا ہے۔

ایسی تھی مغلوں سے پہلے مسلمانوں کی حکومت کے زمانے میں ہندوستان کی حالت۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ زمانہ اتنا تاریک نہ تھا جتنا بعض لوگوں نے اسے ظاہر کیا ہے۔ ایک باقاعدہ منظم حکومت تھی جس کے زیر سایہ دو قطعاً مختلف تہذیبیں نشو و نما پا رہی تھیں اور ایک دوسری پر اپنا اثر ڈال رہی تھیں۔ حکمرانوں میں اکثر تبدیلیاں ہوتی تھیں لیکن ان کا اثر لوگوں پر بہت کم ہوتا تھا کیوں کہ ہر حکمران خاندان میں کوئی نہ کوئی زبردست دُور اندیش حاکم نکل آتا تھا جو امن و امان قائم کرکے رفاہِ عام کے امور میں دلچسپی لیتا تھا۔ بیرونی حملہ آوروں سے ملک محفوظ تھا۔ تجارت، زراعت، تعمیر، علوم و فنون وغیرہ یہ زندگی کے وہ شعبے تھے جن میں ہندو و مسلمان مل کر کام کرتے تھے اور اس سے بتدریج **ایک مشترک تمدن کی بنیادیں** قائم ہو رہی تھیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر سر شفاعت احمد خاں نے اپنی کتاب تاریخِ ہند میں لکھا ہے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دہلی سلطنت کے کارناموں نے مغلوں کے شان دار عہد کے لئے راستہ صاف کر دیا۔

مغلوں کے ہندوستان میں آنے سے اس ملک کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلاطینِ دہلی نے وہ بنیادیں کھود دیں جن پر **مغلیہ تہذیب** کا عظیم الشان محل تعمیر ہوا۔

مغل کم و بیش تین سو سال تک ہندوستان پر حکومت کرتے رہے اور اس عرصے میں انہوں نے ہندوستان کے تمدن کو ایک خاص رنگ میں رنگ دیا، وہ رنگ جو ابھی تک کم از کم شمالی ہندوستان کے باشندوں کے دل و دماغ پر چڑھا ہوا ہے۔ لباس، زبان، گفتگو، طرزِ معاشرت ان سب باتوں میں گو ہماری زندگی مغربی تہذیب سے متاثر ہوئی ہے لیکن ان کی بنیاد ابھی تک مغلئی تہذیب میں قائم ہے اور یہی وہ بنیاد ہے

---

[1] اسلامی ہند (رسالہ نگار لکھنؤ جون تا اکتوبر ۱۹۳۸ء)

جو ہمارے مستقبل کے لئے ایک شاندار قومی عمارت تعمیر کرنے کی غرض سے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

مغل بادشاہ مطلق العنان تھے لیکن اُنہوں نے اپنی مرضی سے حکومت کا ایک نظام رائج کر دیا تھا جس پر وہ عموماً کاربند رہتے تھے۔ پروفیسر رام پرشاد کھوسلہ اپنی کتاب "مغل بادشاہت اور امرا"[1] میں لکھتے ہیں کہ "ہندوستان کے مغلیہ شاہنشاہوں کے حق میں ہمیں یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ وہ عام طور پر اُس وسیع طاقت کا جو انہیں حاصل تھی غلط استعمال نہ کرتے تھے۔ اس طاقت سے کبھی ان کا سر پھر نہیں گیا بلکہ عموماً وہ عقلمند شائستہ حکمرانوں کی طرح رہے جن کے پیش نظر ہمیشہ رعایا کا مفاد ہوتا تھا"

مغلوں کی **مضبوط مرکزی حکومت** اُس زمانے کے حالات میں لوگوں کے لئے مفید تھی۔ رعایا اپنے حاکموں سے دل سے مطمئن تھی۔ مغل بادشاہ مطلق العنان ضرور تھے لیکن وہ عموماً اپنے امرا سے صلاح ومشورہ کرکے حکومت کرتے تھے جیسا برنیر نے اپنی کتاب "مغلیہ سلطنت کا سفرنامہ" میں لکھا ہے۔ ایک مجلس مشاورت "غسل خانہ" کے نام سے قائم تھی جس کے اجلاس ہر روز ہوتے تھے۔ اس میں مملکت کے اکثر کاروبار سرانجام پاتے تھے اور بادشاہ باوجود اپنے استبداد کے عموماً اس مجلس کی آراء پر کاربند ہونا پسند کرتا تھا۔ اس کا نام "غسل خانہ" اس طرح پڑا کہ شیر شاہ نے ایک دفعہ اپنے درباریوں کو اپنے غسل خانے ہی میں جہاں وہ اپنے لمبے لمبے بال دھو رہا تھا بلا لیا تاکہ ان کو انتظار کی زحمت گوارا نہ کرنی پڑے۔ اس روز سے یہ مجلس ہر شام کو "غسل خانہ" میں منعقد ہوتی تھی۔ اور صبح کو بادشاہ اپنے امرا کا باقاعدہ دربار کرتا تھا۔

مغلوں کی استبدادی بادشاہت دراصل عوام کی دلی حمایت پر مبنی تھی۔ ایک طرف سرکش امرا اور مذہبی علما تھے دوسری طرف عوام الناس اور ان دونوں کے بیچ میں ملک کا نگہبان اور عام لوگوں کا پاسبان بادشاہ ہوتا تھا۔ اس لئے بادشاہ کو لوگ اپنے جان ومال کا نگہدار سمجھتے تھے اور اُس سے بے حد لگاؤ رکھتے تھے۔

مسٹر کھوسلہ اپنی انگریزی کتاب "مغل بادشاہت اور امرا" میں لکھتے ہیں کہ "بہ حیثیت مجموعی ہم مغلوں کی مذہبی حکمت عملی کی تعریف کرنے پر مجبور ہیں۔ اگرچہ وہ مسلمان تھے لیکن انہوں نے ہندوستان کو کبھی ایک مسلم مملکت نہیں بنایا۔ اُنہوں نے سیاسی طور پر ہندوؤں کو مسلمانوں کے ساتھ برابری کا درجہ عطا کیا۔ اُنہوں نے اپنے آپ کو اور اپنے سیاسی خیالات کو یہاں کے حالات کے سانچے میں ڈھال لیا اور یہی اُن کی طاقت کا راز تھا۔" مغل قومی بادشاہ تھے۔" حکومت بالعموم نرمی اور شفقت سے کام لیتی تھی۔ وہ پٹھانوں کی حکومت کی طرح ایک سخت فوجی حکومت نہ تھی۔ حکومت لوگوں کی روزمرہ کی زندگی اور ان کے رسم ورواج میں مطلق دخل نہ دیتی تھی۔ فتنہ وفساد کو سختی سے دبا دیا جاتا تھا۔ حکومت خاص طور پر **کسانوں کی بہبود** کا خیال رکھتی تھی کیونکہ اُس کی آمدنی کا بیشتر حصہ زمینوں ہی سے حاصل ہوتا تھا۔ عبدالحمید لاہوری نے لکھا ہے کہ ۱۶۳۳ء میں جب شاہ جہان لاہور کی طرف کوچ کر رہا تھا تو اس نے حکم دیا کہ خیال رکھا جائے کہ کھیتیاں شاہی قافلے کے پاؤں تلے نہ روندی جائیں اور اگر کہیں ایسا ہو تو متوسط اور غریب کسانوں کے نقصان کی پوری تلافی کر دی جائے۔ اورنگ زیب اپنے ایک خط میں شاہ جہان کو لکھتا ہے کہ "بادشاہت کے معنی ہیں لوگوں کی حفاظت کرنا نہ کہ نطف اندوزی اور خودسری۔"

مغلیہ بادشاہت یوں تو مسلمانوں کی بادشاہت تھی لیکن اس میں زمانے اور مقامی حالات کے اثر سے جو تبدیلیاں ہو گئی تھیں اُن سے وہ اب ایک خالص اسلامی بادشاہت نہ رہی تھی۔ اسلام کے نزدیک مذہب اور سیاست میں کوئی فرق نہ تھا اور مسلمانوں کے خلیفہ یا حکمران کا انتخاب جمہور کا حق تھا۔ لیکن یہ اسلامی نظام حکومت پہلے چار خلفائے راشدین کے بعد قائم نہ رہا جو اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں وہ عموماً شاہی حکومتیں تھیں۔ اسی طرح مغلیہ بادشاہت بھی ایک مطلق العنان بادشاہت تھی۔ بادشاہ سیاہ وسفید کا مالک تھا اور جو چاہتا تھا کر سکتا تھا۔ اُسے ہر قسم کے اختیارات حاصل تھے۔ لیکن عملاً اُس کی طاقت اتنی خود مختار نہ تھی۔ ایک طرف رعایا کی **خوشنودی** منظور تھی دوسری طرف اُمرا کی اعانت درکار تھی علما کا بھی اتنا لحاظ ضروری تھا کہ وہ سمجھیں کہ بادشاہ شریعت کی خلاف ورزی نہیں کر رہا۔ اکبر سا بادشاہ بھی جس نے ۱۵۸۲ء میں اپنا دین الٰہی

---

[1] ("MUGHAL KINGSHIP & NOBILITY" BY R.P. KHOSLA)

جاری کیا اتنا محتاط تھا کہ اس سے پہلے ۱۵۷۹ء میں اُس نے کامل اختیارات کی بنیاد رکھنے کے طور پر تمام علما سے ایک نہایت اہم دستاویز پر دستخط کرا کے اعلان کرایا کہ اکبر سلطانِ عادل ہے اور سلطانِ عادل کا مرتبہ ہر مجتہد سے بڑا ہے وہ جو کرے ہمیں منظور ہے کیوں کہ اس کا ہر کام فی الحقیقت اسلام کی ترقی کے لئے وقف ہوگا۔

جہانگیر کے بارہ فرمان مشہور ہیں۔ مسٹر کھوسلہ لکھتے ہیں کہ انگلستان میں ۱۲۱۵ء کا منشورِ اعظم شاہ جون سے بڑی دقتوں کے بعد حاصل کیا گیا یہاں یہ منشور جہانگیر نے برضائے خود رعایا کی تشفی کے لئے جاری کر دیا جس میں اُن سب کی جائداد و مکانات اور غریب کسانوں کی اراضیات کے پورے تحفظ کی شاہی ضمانت موجود تھی اور اس کے علاوہ سراؤں مسجدوں شفاخانوں وغیرہ کے تعمیر و انتظام کے متعلق احکام موجود تھے۔

دستورِ حکومت کا کوئی خاص قانون نہ تھا۔ لیکن قوانین کا انحصار قرآن حدیث کے بعد زیادہ تر قیاس اور فتووں اور ملکی رسم و رواج پر اور صرف خاص ضرورت کے وقت شاہی فرامین پر ہوتا تھا۔

اس سے ظاہر ہے کہ ملک میں صرف ایک شاہنشاہ کی اندھا دھند حکومت ہرگز نہ تھی بلکہ شاہی اختیارات پر کئی قسم کی پابندیاں اور رعایا کی آزادی کے لئے کئی قسم کی ضمانتیں تھیں۔ اور ان حدوں سے تجاوز کرنے والے ظالم حکمران کا تخت دیر تک سلامت نہ رہ سکتا تھا۔

جانشینی کا جھگڑا اکثر بادشاہ کے مرنے پر اور بعض دفعہ اس سے پہلے ہی چھڑ جاتا تھا۔ اسلامی حکومتوں میں سب سے بڑا بیٹا تاج کا حقدار نہ سمجھا جاتا تھا بلکہ خاندان کا سب سے لائق رکن۔ اس لیاقت کا فیصلہ مغلوں کے ہاں عموماً تلوار سے ہوتا تھا اور اس میں شبہ نہیں کہ اکثر وہی حکمران تخت نشین ہوتا تھا جو سب سے زیادہ قابل ہو۔

"غسل خانے" کی مجلسِ شوریٰ کا ذکر ہو چکا ہے۔ بادشاہ عام طور پر اپنے وزیروں سے مشورہ کیا کرتا تھا جن میں چار وزیر زیادہ اہمیت رکھتے تھے:۔ وکیل یعنی نائب سلطنت یا مشیرِ اعلیٰ دیوان' یعنی وزیرِ مالیات، بخشی یعنی فوجی وزیر اور صدر یا صدرِ صدور یعنی امورِ مذہبی کا وزیر۔

بادشاہ کے بعض خاص ذاتی اختیارات تھے مثلاً نوبت بجنا، جھروکہ میں درشن دینا، جامع مسجد میں نماز کی امامت۔ بادشاہ کے نام کا خطبہ پڑھا جانا وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ بادشاہ تحفے تحائف قبول کرتا اور انعامات اور خلعتیں تقسیم کرتا جس سے اس کے اور اُمرا کے درمیان یگانگت کا رشتہ قائم رہتا تھا۔ اُمرا مغلیہ حکومت کے اعیانِ سلطنت تھے۔ اُنہیں سے نظم و نسق تھا۔ مسلمان اُمرا ایرانی تورانی اور افغان تھے لیکن ان کے علاوہ ہندو اُمرا بھی تھے۔ ہر مغل امیر ایک فوجی افسر ہوتا تھا۔ اکبر نے منصب داری نظام جاری کیا یعنی سرکاری ملازموں کے مختلف درجے مقرر کئے گئے جو دہ باشی یعنی دس سپاہیوں کی سرداری سے شروع ہو کر دہ ہزاری تک پہنچتے تھے۔ ان میں ہفت سے دہ ہزاری تک کے منصب عموماً شاہی خاندان کے لئے وقف ہوتے تھے۔ ضرورت کے وقت سب منصب دار اور اُمرا اپنی اپنی فوجوں سے بادشاہ کی مدد کرتے تھے۔ فوج کے الگ الگ شعبے قائم تھے سب سے مقدم سواروں کی فوج تھی اس کے بعد توپ خانے اور پیادوں کی باری آتی تھی۔ اکبر خود اپنی نگرانی میں توپیں ڈھلوایا کرتا تھا۔ اُمرا کو جاگیریں دی جاتی تھیں لیکن یہ جاگیریں موروثی نہ ہوتی تھیں۔ کوئی مغل امیر وراثتہً اپنے باپ کے منصب پر فائز نہ ہو سکتا تھا بلکہ اُسے گویا اپنے پسینے سے عزت اور مرتبہ حاصل کرنا پڑتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کا ایک نتیجہ نکلا کہ مغلیہ عظمت کے زمانے میں مغلیہ اُمرا میں ہمت و شجاعت کے اوصاف پائے جاتے تھے اور وہ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر بڑے بڑے کام کر دکھاتے تھے۔ دوسری طرف یہ ہوا کہ اُمرا ہمیشہ بادشاہ کے دست نگر رہے اور یورپ کے اُمرا کی طرح اس کے مقابل میں ایک خاص جماعت نہ بنا سکے۔ بعد کے مغلیہ امرا عیش و عشرت میں پڑ کر ذلیل ہو گئے۔ وہ خود بھی ڈوبے اور سلطنت کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبے۔

مغلوں نے ہندوستان کا خاطر خواہ انتظام کیا۔ اُنہوں نے ملک کو بیرونی حملوں سے بچایا بیرونی ممالک سے تعلقات بڑھائے امن و امان قائم رکھا جرائم کا انسداد کیا اخلاقِ عامہ کو جلا دی۔ جان و مال کی حفاظت کا بندوبست کیا عدل و انصاف کا سکہ جاری کیا اور کاروباری معاہدوں کی نگہداشت کی۔ حکمرانی کے ان بڑے فرائض کے علاوہ سکہ سازی، تجارت، صنعت، ذرائع آمد و رفت، سرائیں، شفا خانے،

قحط کا انسداد اور امداد تعلیم و تدریس، فنون و علم ادب ان میں سے ایک ایک کی طرف انہوں نے توجہ دی اور ان کو فروغ دیا۔

نظم و نسق کے لئے ملک کو پندرہ اور بعد میں اٹھارہ صوبوں میں منقسم کیا گیا۔ ہر صوبے کا حاکم اعلیٰ ایک صوبہ دار ہوتا تھا۔ فوج بھی اسی کے ماتحت ہوتی تھی اور مالیات کا دیوان بھی اُسی کے تحت میں اپنا کام کرتا تھا۔ ان کو مقررہ اوقات پر اپنی کارگذاری کی رپورٹ مرکزی حکومت کو بھیجنی پڑتی تھی۔ اس کے علاوہ بادشاہ کی طرف سے ہر صوبے میں واقعہ نویس اور خفیہ نویس مقرر کئے جاتے تھے جو بادشاہ کو علانیہ اور خفیہ طور پر ہر صوبے کے حالات سے مطلع رکھتے تھے جس سے صوبہ دار بادشاہ کے قابو میں رہتے تھے۔ صوبے دار کے ماتحت ہر ضلع میں ایک فوج دار اور فوج دار کے ماتحت ہر پرگنہ میں قانون گو اور پرگنے کے ہر گاؤں میں ایک مقدم یا پٹواری ہوتا تھا۔ دیہات میں ہر گاؤں میں اپنی اپنی پنچائتیں بدستور قائم تھیں۔

سلطنت کی آمدنی کے ذرائع خالصہ اراضی، مال گذاری، محصولات، خراج، پیشکش وغیرہ تھے۔

عدل و انصاف کا حق جیسے مغلوں نے ادا کیا دنیا میں بہت کم حکمرانوں نے کیا ہوگا۔ اکبر کا قول تھا کہ بادشاہت کا ربانی عنصر عدل ہے۔ ملک کا ادنےٰ سے ادنےٰ آدمی بادشاہ تک رسائی پا سکتا تھا۔ عہدہ داروں کے لئے کوئی الگ قانون نہ تھا۔ حکومت کی نظر میں سب یکساں تھے۔ مسلمانوں نے دنیا میں جہاں جہاں بھی ایک منظم حکومت قائم کی عدل و انصاف کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ بیان کیا گیا ہے کہ ایک دفعہ شیر شاہ سوری کا بیٹا عادل خاں ہاتھی پر سوار ہو کر آگرے کے ایک کوچے میں سے گزرا اور اس نے ایک ہندو کی بیوی پر جو اپنے مکان کے صحن میں برہنہ نہا رہی تھی ایک پان کا بیڑا پھینکا اور اُسے گھورتا ہوا چلا گیا۔ اس پر اس ہندو بقال نے بادشاہ کے پاس پہنچ کر شکایت کی۔ بادشاہ نے معذرت کی اور کہا کہ میری عدالت میں فرزند اور رعایا برابر ہیں اور حکم دیا کہ عادل خان کی بیوی کے ساتھ بقال بھی ایسا ہی سلوک کرنے کا حق دار ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہزادے نے بقال سے معافی مانگ لی۔

عدل و انصاف کے محکمے کا افسر اعلیٰ خود شاہنشاہ تھا۔ اُس کے نیچے دارالسلطنت میں قدرالقدر کی عدالت تھی جو علاوہ اور کاموں کے تمام بڑے بڑے شہروں میں دیوان کے ساتھ مل کر قاضی اور محتسب مقرر کرتا تھا۔ ہر کچہری میں ایک قاضی اور ایک میر عدل ہوتا تھا۔ قاضی مسلمانوں کے اور ہندو افسر ہندوؤں کے دیوانی مقدمات فیصل کرتے تھے۔ چھوٹی عدالت سے صوبے کے قاضی یا صوبے دار کے پاس اور اس سے خود شاہنشاہ کے پاس اپیل ہو سکتی تھی۔

جہاں گیر نے اپنے محل کے باہر زنجیر عدل لٹکا کر ہر کہ و مہ کو شاہنشاہ تک آسانی سے پہنچ سکنے کا رستہ کھول دیا۔ ایک دفعہ ایک ہندو محرّر نے شاہ جہان کے پاس شکایت کی کہ ایک مسلمان سپاہی اس کی باندی کو زبردستی بھگا کر لے گیا ہے اور نہیں چھوڑتا۔ مقدمہ بادشاہ کے پاس منتقل ہوا۔ بادشاہ کچھ لکھتا جاتا تھا اور لڑکی کو دوات میں پانی ڈالنے کے لئے کہے جاتا تھا۔ لڑکی ایسی صفائی سے پانی ڈالتی تھی کہ بادشاہ نے یہ دیکھ کر اپنا فیصلہ صادر کیا کہ یہ لڑکی ضرور کسی محرّر کے ہاں رہی ہے جب ہی یہ کام ایسی صفائی سے کر سکتی ہے۔ اس لئے لڑکی کو ہندو محرّر کے حوالے کر دیا گیا۔

رائے بھارا مل لب التواریخ ہند کا مصنف لکھتا ہے کہ شاہ جہان نے ایک دفعہ میرے سامنے داروغہ عدالت کو بُرا بھلا کہا کہ میرے پاس ہفتے میں ایک ہی بار اور وہ بھی کم مقدمات کیوں آتے ہیں۔ اُس نے عرض کی کہ اس کمی کی سوائے اس کے کوئی وجہ نہیں کہ ملک میں اکثر لوگوں کے ساتھ انصاف کیا جاتا ہے اور انہیں شکایت باقی نہیں رہتی پھر کہا کہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے کسی مستغیث کو بادشاہ کی بارگاہ تک لانے میں کوتاہی کی ہے تو وہ یقیناً سزا کا مستوجب ہوگا۔

مسٹر کھوسلہ کا قول ہے کہ عدل میں اورنگ زیب[1] ان سب بزرگوں سے سبقت لے گیا۔ ایک رقعے میں وہ خود لکھتا ہے کہ معاملات انصاف میں شہزادوں کو میں عام آدمیوں کے برابر سمجھتا ہوں[2]۔ دن میں دو تین بار دربار عام میں مسکراتا ہوا آتا تھا اور لوگ جوق در جوق اُس کے

---

[2] اورنگ زیب پر ایک نظر، شبلی، صفحہ ۱۲۱۔

سامنے پیش ہوکر اپنی اپنی شکایات بڑی دلیری اور بعض دفعہ گستاخی سے بیان کرتے تھے لیکن اورنگ زیب کی پیشانی پر کبھی بل تک نہ پڑتا تھا۔ کریری اطالوی سیاح نے جب دکن کی لڑائیوں کے دوران میں اس سے ملاقات کی تو دیکھا کہ عالمگیر جس کی عمر اُس وقت اسی سال کے لگ بھگ تھی اپنے اُمرا کے حلقے میں عصا ٹیکے ہوئے سائلوں کی عرضیاں خود پڑھتا تھا اور اُن پر دستخط کرتا جاتا تھا۔

عدل و انصاف بغیر پولیس کے ناممکن تھا۔ چنانچہ مغلوں نے اس کا خوب انتظام کیا تھا۔ بڑے شہروں میں کوتوال اور اُس کا عملہ اور دیہات میں فوجدار پولیس کی خدمات انجام دیتا تھا۔ اور زمیندار اپنے اپنے حلقے میں جرائم کی تفتیش کے ذمہ دار تھے۔

خفیہ محکمے کا ذکر ہوچکا ہے۔ ڈاک کا باقاعدہ انتظام تھا۔ ہر شاہی سڑک پر چھ چھ میل کے فاصلے پر ایک چوکی ہوتی تھی جہاں سے ہرکارہ دن ہو کہ رات تیزی کے ساتھ اگلی چوکی تک شاہی ڈاک لئے چلا جاتا تھا۔

ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کے لئے بے شمار مسجدیں، خانقاہیں، پاٹ شالے مکتب اور مدرسے تھے۔ ہندو مسلمان مل کر مدارس میں تعلیم پاتے تھے کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ لڑکیوں کے مکتب مدرسے الگ تھے لیکن عموماً وہ اپنے گھر پر یا اپنے اُستادوں کے گھروں پر تعلیم پاتی تھیں۔ اورنگ زیب کے زمانے میں بقول ہملٹن صرف ٹھٹھہ (سندھ) میں ۴۰۰ مدرسے تھے جہاں دینیات لسانیات اور سیاسیات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ میجر باسو نے میکس مولر کے حوالے سے لکھا ہے کہ بنگال میں انگریزوں کی آمد کے وقت اسی ہزار (۸۰۰۰۰) مدرسے تھے[1]۔ اِن مدارس میں تاریخ جغرافیہ فنِ جنگ وجدل مذاہب سیاسیات مقامی زبانوں وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔

مغلوں نے زراعت کی طرف خاص توجہ دی۔ کسانوں کی حفاظت کی۔ نہریں کھدوائیں کوئیں بنوائے۔ تالاب بنوائے۔ جا بجا سڑکیں بنوائیں۔ ملک میں قسم قسم کی صنعتیں تھیں یہاں کا سوتی اور ریشمی کپڑا، برتن، چاقو، بندوقیں، کاغذ، موتی، مسالے، تمباکو، چمڑا اور بالخصوص کشمیر کی شالیں لاہور اور آگرے کے قالین، ڈھاکہ کی "آبِ رواں" ساری دنیا میں مشہور تھی۔ ہندوستان میں جہاز سازی ہوتی تھی یہاں تک کہ انگریز اور ڈچ لوگوں نے اپنے کچھ جہاز یہاں بنوائے۔ سورت کا ایک تاجر عبدالصمد کئی سو تجارتی جہازوں کا مالک تھا[2]۔ انڈسٹریل کمیشن کے خیال کے مطابق اس وقت ہندوستان کی صنعتی ترقی کی حالت یورپ کے کسی ملک سے کم نہ تھی۔ مغلوں کا سکہ اُس وقت کے تمام یورپی ممالک کے سکوں پر فوقیت رکھتا تھا۔

پروفیسر برج نرائن نے اپنی کتاب "ہندوستان کی معاشی زندگی" میں اندازہ لگایا ہے کہ اُس زمانے کا مزدور اوسطاً آج کل کے مزدور سے زیادہ خوش حال تھا۔ اس وقت ایک روپے کی قیمت آج کل کے مقابلے میں تیرہ گنا زیادہ تھی اور یومیہ مزدوری اوسطاً ڈھائی آنے کے قریب تھی۔ کوریٹ (CORYAT) ایک انگریزی سیاح کا بیان ہے کہ ۲ر یومیہ میں وہ خوب آسانی سے ہندوستان میں اپنے گوشت اور کھانے پینے اور کپڑے کا خرچ چلا سکتا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ایک مزدور ۱۰ر میں کس قدر فراغت سے زندگی گزارتا ہوگا۔

عام لوگوں کی حالت اچھی تھی۔ وہ امن وامان میں زندگی بسر کرتے تھے اور خوش اور مطمئن تھے۔ امیروں کے مکانوں میں عیش و عشرت کا سامان مہیا تھا۔ ہر شہر میں مکتب اور مدرسے علمی و ادبی انجمنیں اقامت خانے شفاخانے حمام اور کوئیں اور رفاہِ عام کی اور سینکڑوں چیزیں مہیا تھیں۔ بازاروں کی ہر روز باقاعدہ صفائی ہوتی تھی۔

اسی زمانے میں اُس مشترک ہندو مسلم تمدن کی بنیاد پڑی جس کے کارناموں پر ہندوستان بجا طور پر فخر کرسکتا ہے۔ مغلِ اعظم کا شہرہ مشرق سے مغرب تک جا پہنچا۔ عہد مغلیہ کے مادّی وعلمی کارنامے آج تک ہندوستان کی معاشری زندگی کا جزو بنے ہوئے ہیں۔ ہندوستانی خوراک، لباس، طرزِ بود و باش، گفتگو، آدابِ مجلس یہ جو کچھ آج ہیں ایک حد تک مغلیہ وقتوں ہی کی یادگار ہیں۔ پھر فنونِ لطیفہ میں مغلیہ نقاشی مغلیہ فنِ تعمیر اور علمِ ادب اور شاعری اور موسیقی کا مذاق یہ سب مغلوں ہی کے زمانے کی تخلیق ہے اور اس تخلیق میں کم وبیش

[1] مسلمانوں کا روشن مستقبل از سید طفیل احمد صفحہ ۱۲۷ [2] مختصر تاریخ ہند از سید ابوظفر ندوی صفحہ ۱۹۱

ہندو مسلمانوں نے مل کر حصہ لیا۔ سرسید لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے لوگوں کو جوتا پہننا انہوں نے سکھایا، کپڑا پہننا انہوں نے بتایا، فرش پر بیٹھنا مختلف طرح کے کھانوں کا پکانا، مکانات کی آراستگی، علم مجلس اور ہزاروں چیزیں تہذیب و شائستگی کی انہیں کی بدولت ہندوؤں میں پھیلیں۔[1]
ڈاکٹر عبدالحمید لکھتے ہیں کہ موسیقی میں ہندو بہت ماہر تھے مگر مسلمانوں نے ان سے سیکھ کر کمال پیدا کیا۔ آج یہ موسیقی مشترک ہے۔ ہندو موسیقی سوز و الم اور جذبات کی گہرائی کی مظہر ہے۔ مسلمانوں نے ہندوستانی موسیقی میں جوش و شدت بے ساختہ پن اور صفائی پیدا کی۔ اس کا اظہار قوالی میں ہوتا ہے جسے خسرو نے ہند میں رائج کیا۔ چنگ و رباب ایران سے آئے۔ ستار خسرو کی ایجاد ہے۔ سارنگی جو انسانی آواز کا سب سے زیادہ ساتھ دینے والا ساز ہے مغلوں ہی کے زمانے کی اختراع ہے۔ اس کے علاوہ برتن سازی پارچہ بافی نجاری کپڑوں کی رنگائی لکڑی کی نقاشی وغیرہ دونوں ملتوں کے مشترک تمدن کا اظہار ہے۔ سیاست مدن کا تصور اور انتظام سلطنت کس قدر مکمل ہوگا کہ اس زمانے میں جب کہ نہ ہوائی جہاز نہ تار نہ ریل نہ موٹر کچھ بھی نہ تھا دور و دراز علاقوں میں پورا امن قائم رہتا تھا۔ میجر باسو نے لکھا ہے کہ دولت، ثروت اور آرام اور چین کا جو نقشہ شاہ جہان کے وقت میں دیکھنے میں آتا ہے بلاشبہ بے مثل و بے نظیر تھا۔[2] ایک انگریز سیاح نے لکھا ہے کہ اس زمانے میں شہر آگرہ شہر لندن سے بڑا تسلیم کیا جاتا تھا۔[3]

مغل آرٹ کے بڑے قدردان تھے۔ بلکہ بعض نے خود بھی اس میں مہارت پیدا کی۔ اکبر نے فتح پور سیکری کے محل میں دیواروں پر تصویریں بنانے کے لئے ایرانیوں کے علاوہ بہت سے ہندوؤں کو بھی ملازم رکھا اس طرح ایک نئے طرز مصوری کی بنیاد پڑ گئی۔ جہاں گیر کے زمانے میں یہ راجپوت یا مغلیہ طرز کی بالخصوص شبیہوں کی مصوری اپنے اوج کمال پر پہنچ گئی۔ یہ تقریباً سب مغل بادشاہوں اور ان کے امرا کی قدر دانی کا نتیجہ تھا۔ داراشکوہ کو بھی مصوری سے بڑی دل چسپی تھی۔

مغلوں کی عظمت کی سب سے بڑی یادگار ان کی خوبصورت و شاندار **عمارات** ہیں جن کو آج تک دنیا حیرت کی نظروں سے دیکھتی ہے اکبر نے آگرے کا لال قلعہ اور فتح پور سیکری کے محلات اور سکندرہ میں اپنا مقبرہ بنوایا۔ محلات میں ہندو اثرات کا پتہ چلتا ہے اور مقبرے کا نقشہ بدھ مت کے "وہار" سے لیا گیا ہے۔ فتح پور کی مسجد کا بلند دروازہ ایک عجیب شان رکھتا ہے۔

شاہ جہان کا نام اپنی شاندار تعمیرات کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔ دہلی کا لال قلعہ اور جامع مسجد اور پھر تاج محل یہ عمارتیں سادگی تناسب، دقت نظر، رفعت تخیل، آرائش اور حسن نزاکت میں آپ اپنی نظیر ہیں۔ صرف اک **تاج محل** اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہے کہ مغلیہ تہذیب دنیا کی عظیم ترین تہذیبوں میں شمار ہونے کے قابل ہے!

مغل شاہنشاہ **علم و ادب** کے دلی قدردان تھے۔ ان کے زمانے میں عربی فارسی اور دیسی زبانوں کے ادب نے بڑی ترقی کی۔ بابر جہاں ایک بڑا فاتح گزرا ہے وہیں ایک شاعر اور مورخ بھی ہوا ہے۔ ہمایوں جہاں جاتا تھا اپنی کتابیں ساتھ لئے جاتا تھا وہ اپنے کتب خانے ہی کی سیڑھیوں سے گر کر مرا۔ اکبر اگرچہ خود ان پڑھ تھا لیکن اس کے عہد میں فارسی ادب کو بہت ترقی ہوئی۔ ابوالفضل کی آئین اکبری اور اکبر نامہ مشہور ہیں۔ سنسکرت کی کئی مشہور کتابوں رامائن مہابھارت وغیرہ کے ترجمے کئے گئے۔ جہاں گیر نے بھی بابر کی طرح اپنی تو زک لکھی۔ عرفی کی ایک نظم پر اُسے ایک لاکھ روپیہ انعام ملا۔ داراشکوہ نے مجمع البحرین میں اسلامی تصوف اور ہندوؤں کے علم باطن کے نکات کو جمع کیا۔ اورنگ زیب کے رقعات کے علاوہ اس کے فتاویٰ مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سی بیش بہا تصنیفات تھیں۔ بعد کے مغل بادشاہ بھی جن کے زمانے میں سلطنت زوال پر تھی اکثر علم و ادب کے قدردان ثابت ہوئے۔ مردوں کے علاوہ عورتوں نے بھی فارسی ادب کی خدمت میں حصہ لیا۔ گلبدن بیگم کی تاریخ ہمایوں نامہ اور زیب النساء کا دیوان مخفی اس کی روشن مثالیں ہیں۔

---

[1] تہذیب الاخلاق جلد اول صفحہ ۲۸۴۔
[2]، [3] "مسلمانوں کا روشن مستقبل" (از سید طفیل احمد) صفحہ ۱۸۔

دیسی زبانوں کی مغلیہ زمانے میں بڑی ترقی ہوئی۔ ملک محمد جائسی نے ہندی میں پدماوت تصنیف کی اور تلسی داس نے رامائن شاہی دربار ہندی شعرا کی سرپرستی کرتا تھا۔

اُردو کی نشو ونما بھی اسی زمانے میں ہوئی۔ ولی دکنی (المتوفی ۱۷۴۴ء) اُردو کا پہلا مشہور شاعر ہے۔ بعد کے مغلیہ بادشاہ خود اُردو میں شعر کہتے تھے۔ محمد شاہ رنگیلے کا شعر ہے :-

پیری میں نہ کیوں کر میں کروں سیرِ جہاں کی دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشا گزری کا

اب یہ مغل بادشاہ صرف سیر کرنے اور ہر با معنی و بے معنی دفتر کو غرقِ مئے ناب کرنے کے قابل ہی رہ گئے تھے۔

مغل بادشاہت کی آخری زمانے میں جو گت بنی اس کی ایک مثال یہ ہے کہ غلام قادر روہیلے نے ۱۹ شہزادوں کو بُلا کر کہا کہ اُس کے سامنے گائیں اور ناچیں۔ شہزادوں کے انکار پر انہیں دھمکی دی گئی کہ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو ان کی ناک کاٹ دی جائے گی۔ مجبوراً اُنہوں نے ظالم کا حکم مانا جس پر اُن کے بھوکے عزیزوں کے لئے اُنہیں پانی اور خوراک بطورِ انعام کے دی گئی۔ ایک دفعہ یہی بدخصال جابر شہزادۂ اکبر کے گھٹنے پر سر رکھ کر سو گیا اور سو کر اٹھا تو اس نے اُس کی گردن پر ایک چپت رسید کی اور کہا کہ کیا بزدل نفوس حکومت کا خیال بھی دل میں لاسکتے ہیں۔ اگر تم میں کچھ جان ہوتی تو تم میرے ہی خنجر سے میرا گلا کاٹ کر رکھ دیتے۔

جیسا بادشاہ ویسے امرا۔ اورنگ زیب کے بعد اگر کوئی اور اورنگ زیب پیدا ہو جاتا تو سلطنت کا یہ بُرا حال نہ ہوتا جو ہوا۔ سلطنت بہت وسیع ہو گئی تھی، کوئی قابل فرماں روا نہ تھا۔ اس زمانے میں اتنی بڑی سلطنت کا انتظام کوئی آسان کام نہ تھا۔ بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہ جہان اور اورنگ زیب ان چھ اور شیر شاہ سمیت سات عظیم الشان شخصیتوں نے ہندوستان میں ایک ایسی مسلسل منظم حکومت قائم کی جس کی مثالیں دنیا کی تاریخ میں زیادہ نہیں مل سکتیں۔ ایک اتنی بڑی اور ایسی باقاعدہ حکومت کا چلانا صرف ایسے ہی بڑے اور بلند نظر حکمرانوں کا کام تھا۔ اُس زمانے میں نہ ریل تھی نہ تار، ملک میں مختلف قومیں تھیں اور مختلف مذہب، کئی زبانیں، طرح طرح کی رسم، عوام بعض نیم مہذّب بعض مہذب، خواص بعض متعصب بعض بزدل بعض عیش پرست ایسے زمانے میں ایسے ملک اور ایسے لوگوں کو منظم کرنا اور مجتمع رکھنا انتہا درجے کا دشوار کام تھا۔ ہندوستان کی خوش قسمتی تھی کہ اُس کے بند پانیوں میں ایک نئی رَو کا سیلاب آیا اور اُسے مغلیہ بادشاہوں سے حکمران ملے جنہوں نے اسے اپنا گھر بنایا اور اُس کی بہتری کے لئے اپنی بہترین مساعی وقف کر دیں۔ کس قدر بلند تھے اُن کے خیال اور کس قدر شان دار تھا اُن کا رویّہ۔ اکبر نے کہا کہ انسان کی عظمت عقل کے جوہر پر مبنی ہے۔ اورنگ زیب کو جب ایک بار ایک عرضی دی گئی کہ تنخواہ تقسیم کرنے والے دونوں افسر آتش پرست پارسی ہیں اُنہیں برخاست کر دیا جائے تو اُس نے جواب دیا کہ سلطنت کے کاروبار میں مذہب کو دخل نہ دینا چاہئے۔ اگر سائل کی بات پر عمل کیا جائے تو تمام راجاؤں اور اُن کی رعایا کا کہاں ٹھکانا ہو۔ شاہی نوکریاں لوگوں کو اُن کی لیاقت اور قابلیت کے موافق ملنی چاہئیں۔" جس شاہی خاندان میں نور جہان اور ممتاز محل اور جہاں آرا بیگم اور زیب النسا جیسی فہیم و روشن خیال شہزادیاں شامل تھیں اُس کی جتنی تعریف بھی کی جائے کم ہے۔

مغلیہ سلطنت اور نظم ونسق کی شان دار تعمیر اس قدر مضبوط تھی اور مغلیہ حکومت لوگوں کے دل میں اتنا گھر کر چکی تھی کہ باوجودیکہ اورنگ زیب کے بعد ایک صدی تک ایک بھی قابل بادشاہ یا اور کوئی بھی ہمدرد اور دور اندیش وزیر پیدا نہ ہوا تاہم اس سلطنت کے زوال اور تباہی میں کم از کم ایک سو سال کا عرصہ لگ گیا۔

لیکن زمانہ دنیا کا "سلطانِ عادل" دیر گیر ہو لیکن بڑا سخت گیر فرماں روا ہے۔ جب کوئی قوم گر جائے جب کسی تہذیب میں گھن لگ جائے تو زمانہ جسے نوعِ انسان کی بہبود مدّ نظر ہے اور محض کسی ایک فرد یا جماعت کی بہتری مقصود نہیں انسان کی ترقی کے نئے اسباب پیدا کرتا ہے۔ وہ ایک نیا انقلاب برپا کر دیتا ہے خواہ اس انقلاب کی تبدیلیاں کس قدر دل شکن بلکہ زلزلہ خیز ہی کیوں نہ ہوں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت اپنا کام کر چکی تھی۔ اب مسلمان نکمے ہو چکے تھے اور ہندو ابھی بیدار نہ ہوئے تھے یہ حال تھا کہ قدرت انگریزوں کی

زمانہ شناس قوم کو ہندوستان کے ساحل کی طرف لے آئی !

اورنگ زیب کے جانشین اس کی وسیع سلطنت کو سنبھالنے کے قابل ثابت نہ ہوئے۔ اصل یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے مختلف اسباب پیدا ہو چکے تھے۔ مغل شہزادے عیش وعشرت کا شکار ہو رہے تھے۔ اُمرا میں بھی عیاشی خود غرضی اور نااتفاقی کا مرض روز بروز بڑھ رہا تھا۔ کئی بڑے بڑے سپہ سالار تہ تیغ ہو چکے تھے۔ فوج کی حالت خراب ہو چکی تھی۔ سیرت کی مضبوطی اور قوم و ملک کی خدمت کا جذبہ مفقود ہو رہا تھا۔ شیعہ اور سنی ایرانی اور ترک ولایتی اور ہندی کے سوال پیدا ہو گئے تھے۔ اسلامی خوبیاں گم ہو رہی تھیں۔ ہندوؤں کے بعض طبقوں میں بیداری اور ہندوانی تنظیم کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ اورنگ زیب کا آنکھیں بند کرنا تھا کہ ہر طرف سے یہ سوئے ہوئے فتنے بیدار ہو گئے۔

جس طرح تیمور کے حملے نے ۱۳۹۸ء میں دہلی کی سلطنت کو پارہ پارہ کر دیا اور شمالی اور جنوبی ہند میں متعدد خود مختار ریاستیں بن گئیں بعینہٖ اسی طرح ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ اور بعد میں احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے مغلیہ سلطنت کی رہی سہی قوت کو سلب کر لیا جس کی وجہ سے مختلف اطرافِ ملک میں خود مختار ریاستیں قائم ہو گئیں۔

۱۷۱۳ء میں سیواجی کے بیٹے ساہو کا فدیہ بالاجی وشوناتھ ایک خود مختار پیشوا بن بیٹھا۔ اُس نے فرخ سیر سے ایک فرمان حاصل کر لیا جس کے ذریعے سے مرہٹے بعض علاقوں میں چوتھ اور سردیش مکھی وصول کرنے اور پونا اور پندرہ اور اضلاع میں اپنا سوراج قائم کرنے کے حق دار ہو گئے۔ دوسرے پیشوا باجی راؤ (سنہ ۱۷۲۰ء تا سنہ ۱۷۴۰ء) نے فتوحات سے اپنے علاقے کو اور وسعت دی اور سندھیا اور ہلکر کو اپنے سپہ سالار مقرر کیا۔ تیسرے پیشوا بالاجی باجی راؤ (سنہ ۱۷۴۰ء تا ۱۷۶۱ء) کے عہد میں گائکواڑ اور بھونسلا کی ریاستیں شروع ہوئیں۔ ۱۷۴۹ء میں ساہو راجہ نے پیشوا کو ساری مرہٹہ سلطنت پر حکمرانی کا اختیار دے دیا۔ اس کے بعد پیشوا کا دارالسلطنت پونا قرار پایا۔ مرہٹوں نے نظام سے اس کا کچھ علاقہ چھینا تنجور اور ترچناپلی پر قبضہ کر لیا اُڑیسہ فتح کیا بنگال سے چوتھ وصول کی اور پھر ۱۷۵۸ء میں پنجاب پر دھاوا بول دیا۔ پنجاب احمد شاہ درانی کا علاقہ تھا۔ مرہٹوں کی بے باکی دیکھ کر اُس نے روہیلوں سے گفت وشنید کی اور پھر پانی پت کی وہ سب سے بڑی تیسری لڑائی لڑی جس کے فیصلہ پر ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ مرہٹوں کے خلاف ہو گیا۔ یہ درست ہے کہ اس کے نو سال بعد مرہٹے پھر دہلی میں آ دھمکے اور (سنہ ۱۷۷۱ء میں) شاہ عالم مادھاجی سندھیا کے ہاتھ میں ایک کٹ پتلی بن گیا اور مادھاجی سندھیا ۱۷۹۴ء تک ایک زبردست طاقت کا مالک بنا رہا لیکن مرہٹہ سلطنت کا قلب کمزور ہو چکا تھا ۱۷۷۳ء میں سلطنت کی جانشینی کے متعلق ایک جھگڑا شروع ہوا جس میں انگریز بھی آ دھمکے۔ ۱۸۰۲ء میں پھر مرہٹوں کی خانہ جنگی کے باعث انگریزوں کو پیشوا کی حکومت میں پورا اقتدار حاصل ہو گیا۔ بھونسلا اور سندھیا اور ہلکر کو پے در پے شکستیں ہوئیں اور آخر ۱۸۱۸ء میں پیشوا کا بیشتر علاقہ انگریزی مملکت میں شامل کر لیا گیا۔

اودھ اور حیدر آباد ۱۷۲۳ء کے بعد دہلی کی سلطنت سے آزاد ہو گئے۔ بنگال میں علی وردی خاں (۱۷۳۹ء میں) خود مختار بن بیٹھا۔ روہیل کھنڈ میں روہیلوں نے اپنی الگ ریاست قائم کر لی۔ اودھ اور حیدر آباد کمزور ریاستیں تھیں ہمیشہ یا یہ کسی نہ کسی کا دامن پکڑے رہتیں یا کوئی نہ کوئی ان پر حملہ آور ہو جاتا اور کچھ لے لوا کر پھر انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیتا۔ لیکن جنوب میں ایک اور مسلمان حکمران اُٹھا جس نے چند سالوں تک سارے جنوبی ہند پر اور مرہٹوں اور انگریزوں تک پر اپنا رعب جمائے رکھا۔ یہ حیدر علی تھا جو ۱۷۶۱ء میں اپنے ہندو راجہ کا علاقہ چھین کر اُس پر قابض ہو بیٹھا۔ اُس نے متعدد بار مرہٹوں اور انگریزوں کو شکستیں دیں۔ اس کا بیٹا ٹیپو سلطان بھی ان طاقتوں سے لڑتا رہا لیکن وہ اپنے باپ کی طرح ایک زبردست مدبر نہ تھا۔ میسور اور انگریزوں کے درمیان چار لڑائیاں ہوئیں۔ چوتھی لڑائی میں (۱۷۹۹ء) میں ٹیپو مارا گیا اور اس کے علاقے کو انگریزوں نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ انیسویں صدی کے شروع میں انگریزوں نے تقریباً سارے ہندوستان پر اپنا اقتدار جما لیا تھا وہ ستمبر ۱۸۰۳ء میں دہلی میں داخل ہوئے۔ البتہ ابھی ایک طاقت باقی تھی، یہ پنجاب کے سکھ تھے۔ ۱۷۹۸ء

میں زمان شاہ نے اپنی طرف سے رنجیت سنگھ کو لاہور کا گورنر بنادیا۔ رنجیت سنگھ تھوڑے ہی عرصے میں خود مختار ہوگیا اور یوں پنجاب میں سکھ سلطنت کی بنیاد پڑی۔

سکھ گرونانک (١٤٦٩ء تا ١٥٣٩ء) کے پیرو تھے۔ گرونانک ایک نہایت بلند نظر صلح کل انسان تھے۔ ہندو مسلمانوں کی تفریق دیکھ کر، اور دونوں مذہبوں کے بہترین اصولوں سے متاثر ہوکر اُنھوں نے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی جس کا عقیدہ وحدت الوجود اور جس کا مسلک صلح کل تھا۔ ادی گرنتھ سکھوں کی مذہبی کتاب نانک کبیر اور رامانند کی تصنیف ہے۔ وہ خاص حصہ جو گرونانک کا لکھا ہوا ہے جپ جی کہلاتا ہے۔ سکھ مت کے نزدیک ترک دنیا مزوری ہے اور تمام ذاتیں برابر ہیں: خدا انسان سے یہ نہ پوچھے گا کہ تو کس کے گھر پیدا ہوا بلکہ یہ کہ تو نے دنیا میں کیسے کام کئے"۔ نانک کا مقصد ہندو مسلمانوں کو ملانا تھا۔ وہ اپنا کوئی علیحدہ فرقہ بنالے کے قطعی مخالف تھے۔ لیکن اُن کے بعد یہ صلح پسند لوگ آہستہ آہستہ ایک جنگجو فرقہ بن گئے جس سے اِن کی مغل بادشاہوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔ گرو گوبند سنگھ (١٦٦٦ء تا ١٧٠٨ء) نے سکھوں کو پہلے پہل ایک علیحدہ سیاسی جتھا کا رنگ دیا خالصہ جماعت قائم کی اور ہر سکھ کے لئے کیس کڑا کرپان اور کنگھا پہننے کی شرط لگادی تاکہ وہ خوب منظم و متحد ہو جائیں۔

١٧٦٣ء میں سکھوں نے اکٹھے ہوکر احمد شاہ ابدالی کے سرہند کے گورنر کو شکست دی۔ اور ١٧٩٨ء میں جب رنجیت سنگھ لاہور کا گورنر مقرر ہوا تو اُس نے سکھوں کے اکثر "مسلوں" یا فرقوں کا جتھا بناکر ایک زبردست فوج تیار کرلی اور ١٨٠١ء کے بعد خود مختار ہوکر اپنے علاقے کو پھیلانا شروع کیا یہاں تک کہ ستلج پار کے علاقے پر ہاتھ صاف کرنا چاہا۔ اس پر لارڈ منٹو نے ١٨٠٩ء میں رنجیت سنگھ سے ایک معاہدہ کیا اور رنجیت سنگھ کو پنجاب کا خود مختار حاکم تسلیم کرلیا۔ رنجیت سنگھ کے بعد سکھوں میں خانہ جنگی کی آگ بھڑکی اور بدامنی پھیلی۔ یہاں تک کہ خالصہ فوج نے ١٨٤٥ء میں ستلج پار کرکے انگریزی علاقہ پر حملہ کردیا۔ سکھوں کو شکستیں ہوئیں اور ١٨٤٦ء میں لاہور کا معاہدہ ہوا جس کی رو سے جالندھر کا دوآبہ انگریزی علاقے میں شامل کرلیا گیا اور سکھ فوج کم کردی گئی۔ ١٨٤٩ء میں مول راج حاکم ملتان کی بغاوت کے بعد سکھوں کے ساتھ دوسری لڑائی ہوئی سکھوں نے شکست کھائی اور اس کے بعد ٢٩ مارچ ١٨٤٩ء کو پنجاب قلمرو انگریزی میں شامل کرلیا گیا۔

پنجاب کو فتح کرنے کے بعد سارا ہندوستان انگریزوں کے ماتحت آگیا۔ برائے نام ایک مغل شاہنشاہ دہلی میں موجود تھا وہ بھی ١٨٥٧ء کے غدر میں سازش کے الزام پر ملک بدر کردیا گیا۔

بشیر احمد

(باقی)

دوپہر

موسم گرما کی تنہا دوپہر ——
جون، جولائی کے سورج کا اثر،
لُو کے محشر خیز جھونکوں کی لپک،
سینۂ کون و مکاں میں برق و آتش کا نزول۔
بھول کر باہر میں آیا گر کبھی
جسم و جاں مرجھا گئے۔

ہر طرف شعلے اگلتی تھی ہوا،
ہر طرف جھلسانے والی آگ تھی،
یعنی دوزخ بن گئی ساری فضا،
ایسی دوزخ میں بھی میں نے بارہا
دل کی گہرائی میں پایا ہے، ندیم!
جنت الفردوس کی اک سرد رَو کا ارتعاش!

رحمٰن مذنب

ہندی غلام

اک زمیں کا بوجھ، ننگِ زیست، بے نام و نمود
بھیس میں انسان کے مایوس و ناکارہ وجود

ہر قدم پر ایک لغزش ہر نفس موجِ سموم
سینہ کینے کا دفینہ دِل میں فکروں کا ہجوم

ایک مسجودِ ملائک جو زوال اندر زوال
بک چکے جس کے ارادے لٹ چکے جس کے خیال

باغ کا وہ پھول جس میں کچھ نہیں باقی مہک
آسماں کا وہ ستارہ جس کی چھن جائے چمک

ایک پیغامِ حقیقت یاس بیز و رنج زا
ایک نغمہ جو سراپا درد میں ڈوبا ہوا

تھی ازل کے دن سے قائم علم کی جس کے اساس
جبر نے پہنا دیا ہے جہل کا جس کو لباس

یہ وہ اک مجبور ہے دنیا میں وہ ناکام ہے
صبح جس کی ہے زمانے میں نہ جس کی شام ہے

جس کے لب پر مُہر، نالوں میں اثر کچھ بھی نہیں
ایک وہ ہستی جو سب کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں

جوہرِ رشد و ہدایت اس سے سب نابود ہیں
عیب ہو سکتے ہیں جتنے وہ سبھی موجود ہیں

زندگی کا اس کی ہر لمحہ پریشانی میں ہے
آج یہ انسان ہو کر شکلِ حیوانی میں ہے

دِل کی کمزوری کچھ اتنی آئی اِس کے بانٹ میں
کہنے لگتا ہے یہ دن کو رات صرف اک ڈانٹ میں

بے شعور و کم خِرد، کج رو، ذلیل و بے وقار
پردۂ دنیا سے اِس کا اٹھ چکا ہے اعتبار

نامِ میدانِ وغا سے ننگ آتی ہے اِسے
ہاں، فقط اپنوں سے کرنی جنگ آتی ہے اِسے

لعنتوں سے اہلِ دنیا کی یہ شرماتا نہیں
جی حضوری کے سوا کچھ کام اِسے آتا نہیں

کس قدر خودداریوں کے راستے سے دُور ہے
تین دن کا گھر میں فاقہ ہے مگر مسرور ہے

اف یہ اِس کی بے حسی افسوس یہ بے عزتی
دل میں سَو سَو ناسور پنہاں اور ہونٹوں پر ہنسی

جو اسے بزدل کہے، جھوٹا ہے گستاخی معاف | اس میں وہ طاقت ہے کام آئے جو اپنوں کے خلاف
الاماں خوشنودیٔ آقا کہ جس کی چاہ میں | یہ بچھا لیتا ہے کانٹے آپ اپنی راہ میں
اِس کے بھائی مخلصی کی کچھ کریں تدبیر اگر | تیز گامی سے یہ کر دیتا ہے آقا کو خبر
اِس کے آگے شکوہ و آہ و بکا کچھ بھی نہیں | خوفِ آقا ہے اِسے خوفِ خدا کچھ بھی نہیں

اِس کے ہاتھوں لاکھوں کمزوروں کا گھر برباد ہے | یہ غریبوں کو ستانے میں بہت اُستاد ہے
دوستوں کا ہے یہ دشمن دشمنوں کا یار بھی | قوم کا یہ چور بھی ہے ملک کا غدّار بھی
اِس کے وعدوں کے فریبوں میں نہ آنا زینہار | جو نہ ہو مختار اس کی بات کا کیا اعتبار
ذِلتوں سے اِس کی غیرت اِس کو شرماتی نہیں | جھوٹ سے عیاریوں سے اِس کو عار آتی نہیں
دیکھنے کی چیز ہے اِس کے تلوّن کی ادا | جیسے بدلے رنگ گرگٹ یا کوئی بہروپیا
کتنی مملوٗ ذلتوں سے اس کی بود و ہست ہے | اِس کا جو بھی قول ہے یا فعل ہے وہ پست ہے
اِس کی ہر خوبی کے ساتھ اس کو بھی غارت کر گئی | یوں غلامی اِس کی رگ رگ میں سرایت کر گئی
اِس کے سائے سے بھی بچ بچ کر گزرنا چاہئے | یہ نہیں ڈرتا خُدا سے اس سے ڈرنا چاہئے
وادیٔ ذلت میں لاکھوں ٹھوکریں کھاتا ہوا | راہِ بہبودی سے وہ جاتا ہے کتراتا ہوا
حیف تیغِ اِس کی نہیں صد حیف تیر اِس کا نہیں | مختصر یہ ہے کہ خود اِس کا ضمیر اس کا نہیں

سرزمینِ ملک کے حق میں غلامی کا پیام
جانتے ہیں آپ کیا اس کو؟ یہ ہے ہندی غلام

ابر احسنی

نوٹ ۔ مختلف ذہنیتوں کے غلاموں کی خصلتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے کون غلام کس قسم کا ہے؟ اُس کے اطوار کا اشعارِ نظم سے تطابق کیجئے اور سمجھ لیجئے۔

احسان

شاعر کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے کہ جس لفظ کو چاہے مسحور (hypnotise) کر کے اُس سے کچھ کا کچھ کہلوا دے حنظل کو شہد، راکھ کو سرمہ، شاعر ہر اَن ہونی چیز کو ممکن کر دکھاتا ہے۔ شاعر کو جب یہ طاقت ہے کہ کم از کم لفظوں لفظوں میں نگاہوں سے تقدیریں بدل دیتا ہے تو باقی کیا رہ گیا۔

لفظوں پر کیا منحصر ہے شاعر کا جادو بعض مقبول انسانی عادتوں کو ردی قرار دے دیتا ہے۔ عرفی خود داری کی دُھن میں یہاں تک لکھ گئے ہے

گر مرد ہمتی زمروت نشاں مخواہ — صد جا شہید شو دیت از دشمناں مخواہ

یہ شعر برسوں وردِ زبان رہا اور چونکہ عرفی کے خاص پرستاروں میں سے ہوں مجھے اب بھی کافی ندامت ہوگی کہ اس شعر کے غلط تخیل پر اعتراض ہو تو میرے قلم سے ہو۔ مبالغہ کی کوئی حد ہوتی ہے۔ خلاف واقعہ دعاوی کی کوئی انتہا ہوتی ہے مگر عرفی صاحب اپنی بات کہہ گئے۔ کوئی حضرت سے پوچھے کہ خون بہا تو مقتول کے وارث مانگا کرتے ہیں خود مقتول کب قبر سے اٹھ کر دیت مانگنے آتا ہے؟ مگر عرفی صاحب نے اُلٹی گنگا بہادی۔ طُرفہ یہ کہ شہید کا لفظ استعمال کر گئے۔ اچھے شہید ہوئے جن کے گذرنے پر خون بہا کا سوال پیدا ہوا۔ شہید تو خوشی سے جان دیتا ہے، بہت بڑا رتبہ پاتا ہے۔ کہاں شہید کہاں خون بہا۔ ایسے وارث کون ہیں جو شہیدوں کی ہڈیاں بیچ کھائیں؟ مگر شاعر کو واقعات اور زندگی سے کیا تعلق؟ نصیحت کرنے پر اُترتے ہیں تو عقل کے زمین آسمان کو تہ کر کے بے تُکی سی ہانک لگا جاتے ہیں۔ اتنا بھی نہ سوچا کہ شہید ہونا صرف ایک جگہ ممکن ہے۔ ایک ہی شخص کے لئے بار بار شہید ہونا قطعی ناممکن ہے مگر عرفی صاحب سو جگہ شہید ہونے کی تلقین فرماتے ہیں۔ کیا وہ اُنگلی میں لہو لگا کر شہید کہلوانے کے شائقین کے قائل تھے؟ اگر حضرت عرفی کے فرمان کے مطابق ہر شخص مردِ ہمت ہو (اور اُن کی یہ دلی خواہش تھی کہ واقعی ہر ذی روح مردِ ہمت ہو) تو دنیا میں کوئی مُروت کر ہی نہ سکے۔ یعنے مُروت کا نام و نشان مِٹ جائے۔ نہ کوئی احسان کر سکے نہ کوئی احسان اُٹھا سکے۔

ذوق صاحب آزادی کی ترنگ میں فرماتے ہیں۔

احسان ناخدا کا اٹھائے مری بلا — کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

احسان اٹھانے کے اتنے دُشمن تھے کہ لنگر توڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ قیاس اور غالباً صحیح قیاس ہے کہ جو کشتیاں ذوق صاحب نے جمنا پر دیکھی ہوں گی وہ تو لنگر کی محتاج نہ تھیں۔ ملاح کنارے پر بانس سے ایک مضبوط رسّا باندھ کر تابع کر لیتے تھے۔ بہت احتیاط ہوئی تو آدھی کشتی کو کنارے کی ریت پر کھینچ لیا۔ لنگر جو اصل لنگر ہوتے ہیں چاہے وہ ہلکے ہی ہوں، وہ تو ذوق صاحب سے برسوں میں نہ ٹوٹتے۔ کبھی لنگر ملاحظہ سے گذرتا تو شاید اتنی سی بات سوجھ جاتی کہ لنگر کو توڑنے کا دعویٰ محض خیالی پلاؤ ہے۔ بات کو بڑھانا مقصود نہیں حضرت ذوق نے کشتی کو خدا پر چھوڑا ہم لنگر کو خدا پر چھوڑتے ہیں مگر اتنا ضرور پوچھنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ جناب والا ناخدا سے آپ کو کد سہی مگر آپ چلے کدھر تھے؟ اگر محض جمنا کے اس پار جانا تھا تو آپ کے زمانے میں معمولی بات تھی کہ مشکیزوں پر بیٹھ کر پار نکل گئے۔ کشتی کا احسان آپ نے کیوں اٹھایا اور کیا وہ کشتی خود ساختہ تھی یا یہ کہ بڑھئی آپ کا دوست تھا اور کشتی بطور پیشکش آپ نے قبول فرمالی۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ حضرت اگر آپ نے کشتی چھوڑی تو پانی پر چھوڑی ریت پر نہیں چھوڑی۔ محض ناخدا کی ضد سے خدا کو آپ بیچ میں لے آئے۔ کہنے کو جو آپ کے جی میں آئے کہئے مگر پانی آپ کی کشتی کو بہا کر لے گیا۔ اچھا تو یہ ہوتا کہ آپ لنگر کو اٹھا کر کشتی میں رکھ لیتے۔ بڑے کنارے کام آتا اب آپ جانیں آپ کی کشتی اور پانی کی لہریں۔ ناخدا غریب کو خدا رزق دے دے گا آپ کے چار پیسے بچ گئے اچھا ہوا مگر احسان کو اپنی بلا کے قابل سمجھا یہ بُرا کیا۔

کیا آپ نے اپنی بلا کو کبھی دیکھا بھی تھا؟

احسان اٹھانے سے ہر شاعر بھاگتا ہے۔ مرزا غالب دس قدم اور آگے نکل گئے۔ آپ ایک لفظ پر ایسے مرنے لگے کہ اسے بھی احسان اٹھانے کی بلا سے بچا گئے۔ فرماتے ہیں ؎

دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

جہاں تک زبان کا لطف ہے یہ شعر بھی اس قابل ہے کہ انسان اسے جھوم جھوم کر پڑھے، بار بار پڑھے، محفلوں میں دہرائے، داد دے اور دنیا پر ثابت کر دے کہ وفا شناس، یا شعر کہنے والا تھا یا شعر پڑھنے والا۔ یہ شعر پڑھا ہی اسی نیت سے جاتا ہے کہ شعر کی بھی قدر ہو اور شعر پڑھنے والے کی نسبت بھی یہ گمان ہو کہ وفا کے علم کے ماہر ہیں۔

مرزا غالب مرحوم نے نقش کے لفظ کو اکثر تصویر کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو اُن کا یہ مصرع

نقشِ نازِ بُتِ طناز بآغوشِ رقیب

اسی طرح ایک اور مشہور مصرع ہے ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا

اس شعر کے پہلے مصرع کے متعلق گمان یہ ہوتا ہے کہ وفا کی تصویر حضرت نے دیکھی پسند نہ آئی۔ بالکل ممکن ہے کہ مرزا مرحوم نے وفا کی تصویروں کو دیکھ کر یہ فیصلہ کر لیا ہو کہ تصویریں اچھی نہیں۔ اس سے کلیہ بنا لیا کہ زمانے بھر میں (یعنی اُن کے وقت تک) وفا کی کوئی تصویر ایسی نہیں بنی جس سے دل کو تسلی ہو یعنے زلیخا نے یوسف سے نہ کی قیس نے لیلیٰ سے نہ کی محمود و ایاز کا قصہ غلط شاہ جہان کا روضہ ممتاز محل بے معنی۔ یہاں تک تو ان کو اپنی رائے پر اختیار تھا۔ دوسرے مصرع میں مرزا مرحوم تصویر کا مضمون تو ہڑپ کر جاتے ہیں محض لفظ وفا کی نسبت ایک اور کلیہ قائم کر جاتے ہیں۔ اگر کسی لفظ کے معنی ہوں تو اس لفظ کو معانی کا احسان اٹھانا پڑتا ہے۔ جو احسان اٹھاتا ہے وہ شرمندہ ہوتا ہے۔ چونکہ وفا شرمندۂ معنی نہیں یعنی بے معنی ہے۔ اس لئے یکتا ہے۔ جس دنیا میں اکثر انسان بے معنی ہیں اگر وہاں ایک لفظ بے معنی ہو گیا تو چنداں مضائقہ نہیں مگر حیرت ہوتی ہے تو اس بات پر کہ احسان اٹھانے کو بُرا تصور کر کے ایک بھولے بھالے لفظ کو مجبور کیا جاتا ہے کہ خود داری کے زعم میں وہ اس دعوے پر فخر کرے کہ میں بے معنی ہوں۔

یہ تو ہے شاعروں کی لفظوں کو مجبور کرنے کی طاقت جس لفظ کو چاہیں اسے مجبور کر کے سفید کو سیاہ کر دکھائیں۔ شاعروں کا نثر لکھنے والوں پر بڑا احسان یہ ہے کہ محنت وہ کرتے ہیں۔ نثر لکھنے والوں کو مضمون سوجھ جاتا ہے۔

جتنی شاعروں کو احسان اُٹھانے سے نفرت ہے اتنی ہی مجھے احسان اٹھانے سے محبت ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ، بہت زیادہ۔

چاند، سورج، تاروں کے، مرغزاروں، کہساروں، آبشاروں کے احسان بہت ہیں مگر انسانوں کے احسان جو انسانوں پر ہیں وہ ان قدرتی نعمتوں سے بہت بالاتر ہیں۔

ماں دودھ نہ دے تو دنیا ختم ہو جائے۔ بچے نہ ہوں تو بھی دنیا ختم ہو جائے۔

زندگی کا دوسرا نام، اسلام کا روحانی نام احسان ہے۔ جو احسان اٹھانے سے بھاگا وہ شہید بنتا پھرے۔ انسان نہیں ہو سکتا، لنگر توڑتا پھرے کہیں پہنچ نہیں سکتا، باتیں بناتا رہے، بامعنی کبھی نہیں ہوگا۔

دوست سے احسان کی توقع کا نام بہشت ہے۔ اس توقع کے اٹھ جانے کا نام دوزخ ہے۔

"فلک پیما"

یہ کنارِ راہ پر آرام لینے کے مزے

موسمِ گرما کی تھی اک دوپہر آتش فشاں؛
تھا زمیں پر دھوپ کی صورت میں جورِ آسماں

کاروبارِ زیست کے ہاتھوں سے مجبورِ سفر،
جا رہا تھا میں اک انگاروں سی تپتی راہ پر،

زندگی کی سخت گیری کا گلہ کرتا ہوا،
اور طلب قسمت سے محنت کا صلہ کرتا ہوا

اس سفر میں مجھ کو درپیش ایک ایسا کام تھا،
معرکہ بیم و رجا کا جس کا سر انجام تھا

سوچتا تھا میں کہیں محنت نہ جائے رائگاں
کیا خبر کیا رنگ لائے انقلابِ آسماں؟

یہ سفر کرنا پڑا اگر مجھ کو بے نیلِ مرام،
وائے میری قسمت! اے میرے دلِ ناشاد کام!—

زندگی لگتی تھی مجھ کو ایک دشتِ بیکراں،
جس میں ہیں آوارہ انساں کارواں در کارواں،

ایک نامعلوم منزل کی طرف گرمِ سفر،
ایک نامعلوم مقصد کو لئے پیشِ نظر

بن کے اک غولِ بیاباں اُن کا ذوقِ جستجو،
ہے لئے جاتا انہیں سوئے سرابِ آرزو

کوئی اس وسعت میں رستے کا نہیں ملتا سُراغ؛
ہے پرے حدِّ افق سے خواہشوں کا سبز باغ

جب نشاں ہی منزلِ مقصود کا نابود ہے،
کس لئے یہ بادیہ پیمائی بے سُود ہے؛ ——

جا رہا تھا محو ان افکارِ یاس انگیز میں،
اس جہنّم کی سی گرمیٔ مصیبت خیز میں

اتنے میں دیکھا کہ اک تنہا درختِ سایہ دار
ہے کنارِ رہ پہ مثلِ رحمتِ پروردگار

اور اس کے سائے میں ہے ایک مجھ سا رہ نورد،
جس کے چہرے پر مرے چہرے سی ہے کلفت کی گرد

گرد کی تہ میں ہے لیکن اک بشاشت کی چمک،
ابر کے پردے سے جیسے ماہِ تاباں کی جھلک

جلوہ گر ہے منہ پہ ایسا ایک روحانی سکوں
پھونک دے جو دیکھنے والے پہ راحت کا فسوں

بند آنکھیں جیسے مصروفِ خیالِ یار ہے،
دل کے آئینے میں محوِ لذتِ دیدار ہے

بانسری منہ سے لگی ہے اور بجانے میں ہے مست،
دل کی باتیں مونسِ دل کو سنانے میں ہے مست،

جیسے آیا ہو یہاں بنسی بجانے کے لئے،
انجمن ایک اپنی خلوت میں بنانے کے لئے

نغمۂ شیریں کا ہے اک چشمہ ننھا سا رواں،
فیض سے جس کے بیاباں میں کھلا ہے گلستاں

چھا رہی تھی جو طبیعت پر مری پژمردگی،
جسم کی درماندگی اور قلب کی آزردگی،

وہ یکایک ایک احساسِ مسرت بن گئی!
زندگی لگتی تھی جو دوزخ وہ جنت بن گئی۔

مجھ کو دامن گیر تھی جس کام کی فکرِ مآل
میرے دل سے یک قلم جاتا رہا اُس کا خیال

جو ٹے موسیقی کی موجوں میں وہ گویا بہ گیا،
عہدِ ماضی کی مٹی سی یا دہو کر رہ گیا

کون تھا اللہ جانے یہ اکیلا نے نواز؟
کوئی بھی ہو، اُس نے ظاہر کر دیا مجھ پر یہ راز:۔

کاروانِ زندگی کی کوئی منزل ہو نہ ہو،
کوئی اپنی دشت پیمائی کا حاصل ہو نہ ہو،

یہ کنارِ راہ پر آرام لینے کے مزے
دل کو ٹھنڈی چھاؤں میں تسکین دینے کے مزے

یہ بجائے خود ہیں اس قابل کہ محض ان کے لئے
زحمتیں برداشت ہستی کے سفر کی کیجئے

محمد ہادی حسین

دیوتاؤں کی چوری

(قدیم یونان کے افسانوں کا افسانہ)

ذیل کے مضمون کے ساتھ میجر عطاء الرحمٰن صاحب ضیا کا یہ خط موصول ہوا تھا جو بجائے خود ایک دلچسپ مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم قارئینِ "ہمایوں" کو اس کے مطالعے کے لطف میں شریک کرتے ہیں:-

محبّی و مکرمی - آداب۔

ایک اور لیجئے --- قدیم یونانی متھالوجی سے ہمارے اُردو دان ہندوستانی بہت کم واقف ہیں اور انہیں یورپ کے ہر قسم کے آرٹ کی اس بنیاد سے روشناس کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس متھالوجی کا یورپ کے شعر، مصوری اور بت تراشی پر کتنا اثر ہے اور اس میں دلچسپ افسانوں کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے جو برسوں تک اردو میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اب تک شاید سوائے کیوپڈ اور سائکی کے افسانے کے جسے نیاز فتح پوری کے جادو نگار قلم نے اُردو میں لکھا ہے اور بہت کم افسانے لکھے گئے ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ اگر حالات سازگار رہے تو کم از کم دو چار افسانے اس سلسلے میں مزید پیش کروں گا۔ کاش "ہمایوں" کی لمبی داڑھی والی مولویت مجھے اجازت دیتی اور میں ہر افسانے کے ساتھ یورپ کی مصوری کا ایک شاہکار اشاعت کے لئے بھیج سکتا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یونانی متھالوجی محض مناظرِ قدرت ہیں اور قدرت فطرتاً عریاں۔ صبح کی دیوی کی اگر تصویر بنائی جائے تو وہ پنجابی شلوار اور انگریزی کاٹ کی لمبی قمیص پہنے ہوئے اچھی معلوم نہ ہوگی۔

جہاں تک انسانی جذبات کا تعلق ہے وہ تو ذرا ذرا سی بات پر برانگیختہ ہو جاتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے ؎ بدلی کو دیکھ کر مری نیت بدل گئی۔

اب کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ چونکہ بدلی کو دیکھ کر کسی شخص کی نیت بگڑ جاتی ہے اس لئے بدلی کی طرف دیکھنا ہی ممنوع قرار دے دیا جائے؟ یا کالی گھٹا آنے لگے تو اسے فوراً SMOKE-SCREEN سے چھپا دیا جائے تاکہ کوئی انسان اسے دیکھ کر شراب نہ پینے لگے؟

مبادا اس قسم کی گفتگو سے یہ سمجھا جائے کہ میں ایڈیٹر صاحب ہمایوں کو گناہ کی طرف راغب کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اس بحث کو یہیں ختم کرتا ہوں۔

آپ نے میرے پہلے افسانوں کو پسند فرمایا۔ قدر دانی کا شکریہ ادا کرتا ہوں معشّیٰ کو داد ملتی رہے تو آواز میں خود بخود مٹھاس بڑھتی جاتی ہے --- زیادہ نیاز ---------- نیاز کیش
عطاء الرحمٰن

بچہ جب ہوش سنبھالتا ہے اور باتیں کرنے کے قابل ہوتا ہے تو اپنے ارد گرد کی چیزوں سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش میں سب سے پہلا سوال کرتا ہے "یہ کیا ہے --؟" تھوڑے عرصے کے بعد اس سوال کی شکل بدل جاتی ہے۔ "یہ کیوں ہے --؟ --" "کس لئے ہے ----؟"

یہی صورت بنی نوعِ انسان کی ہے۔ جب سے انسان دنیا میں آیا ہے ہر قوم نے خواہ وہ برفانی ملک میں پیدا ہوئی یا افریقہ کے جنگل میں سب سے پہلے ان سوالوں کے جوابات کی تلاش کی۔ "کیوں --؟ کس طرح --؟ کس لئے --؟" اس کے بعد۔ "کائنات کا بنانے والا کون ہے --؟" -- "آگ، پانی، ہوا۔ کیا ہیں --؟" -- "میں میں کیوں ہوں --؟" وغیرہ۔

ہر پرانی قوم نے اپنے اپنے حالات اور گرد و نواح کے مطابق زندگی کے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی۔ ان میں قدیم یونانیوں کا نظام کائنات ایک خاص قسم کی دلچسپی لئے ہوئے ہے اور اسی پر مغربی ممالک کے شعر، مصوری اور بت تراشی کا بڑی حد تک انحصار ہے۔

قدیم یونانیوں کے نزدیک پہلے دنیا سنسان تھی۔ سورج یا چاند کا نام و نشان تک نہ تھا۔ دیوتا کے آس[1] یعنی اندھیر کی حکومت تھی جس کی ملکہ رات کی دیوی اور لڑکا اندھیرے کا دیوتا کہلاتا تھا۔ اس لڑکے کے گھر میں اولاد ہوئی تو لڑکی کا نام روشنی اور لڑکے کا دن رکھا گیا۔ ان دونوں کے حسن سے دنیا میں رونق پیدا ہو گئی اور محبت کے دیوتا سے یارانہ ہو جانے پر ان تینوں نے مل کر زمین، سمندر اور آسمان کا نظام قائم کیا۔

وقت پا کر اس میں جنات کی ایک نسل پیدا کی گئی جن کے ذریعے سے دنیا کو آباد کرانے کا بندوبست شروع ہوا۔ یہ لوگ بڑے قد آور، طاقتور اور سمجھ دار تھے۔ ان کے افسر دو بھائی تھے۔ ایک پرامی تھی آس[2] جس کے معنی ہیں "پیش بینی" اور دوسرا ایپی می تھس[3] "یعنی پس نظری"۔ ان دونوں نے مل کر حیوانات، پرندے اور مچھلیاں وغیرہ بنائیں۔ دریا بہائے۔ پھل اور درختوں کی ابتدا

---

[1] کے آس (CHAOS) [2] پرامی تھی آس (PROMETHEUS) [3] ایپی می تھس (EPIMETHUS)

کی۔ اب حکم ہوا کہ ایک ایسی ہستی ایجاد کرو جو دماغی قابلیت اور علم حاصل کرنے میں ان سب سے بڑھ کر ہو۔ دونوں بھائیوں کو یہ حکم سن کر پریشانی سی ہوئی کیوں کہ وہ قدرتی طور پر فیاض طبع واقع ہوئے تھے اور جتنی خوبیاں خیال میں لاسکتے تھے حیوانات پرندوں اور مچھلیوں وغیرہ میں تقسیم کر چکے تھے۔ کچھ باقی نہ تھا۔ لیکن حکم بجالانا بھی ضروری تھا۔ اس لئے پرامی تھیس نے زمین سے تھوڑی سی مٹی لی۔ اسے پانی سے تر کیا اور ایک بت بنایا جس کی صورت دیوتاؤں سے ملتی جلتی تھی۔ اس کے نتھنوں میں محبت کے دیوتا نے زندگی کا احساس پھونک دیا۔ پیلاس ایتھینی[1] یعنی دستکاری کی دیوی نے روح عطا کی اور سب سے پہلے انسان نے اٹھ کر اپنے چاروں طرف اس دنیا پر نظر دوڑائی جو اس کے رہنے کی جگہ قرار دی جانے والی تھی۔

لیکن یہ انسان کمزور ننگا اور دوسرے حیوانات کے مقابلے میں بالکل بے چارہ تھا اور چونکہ روح اور احساس بھی رکھتا تھا اس کی حالت سب سے زیادہ قابل رحم تھی۔ پرامی تھیس نے سوچا کہ ذیوس[2] یعنی دیوتاؤں کے باپ اور ان کی سلطنت کے بادشاہ سے انسان کے لئے کچھ طلب کرے۔ لیکن وہاں باوجود بہت کوشش کے شنوائی نہ ہوئی۔

بہت غور و فکر کے بعد پرامی تھیس کو ایک تجویز سوجھی جس سے اس کے بھائی ایپی میتھس کو اتفاق نہ تھا۔ لیکن پرامی تھیس بہت صاحبِ ہمت تھا۔ وہ چوری چوری نظر بچا کر اولمپس[3] یعنی دیوتاؤں کے رہنے کے پہاڑ پر گیا اور جھاڑیوں میں چھپ رہا۔ جب اپالو[4] یعنی سورج دیوتا کا رتھ اس طرف سے گذرا تو اس نے اس کے پہیوں میں سے نکلتے ہوئے شعلوں سے ایک مشعل روشن کی اور زمین پر واپس آکر یہ مشعل یعنی "آگ" انسان کو دے دی۔

اب انسان کا خوف جاتا رہا۔ جن غاروں میں رہتا تھا ان کا اندھیرا دور ہو گیا۔ سردی سے نجات مل گئی۔ لوہے کے ہتھیار اور اوزار بنا لئے گئے۔ حیوانات اس کے غلام ہو گئے۔ کھیتی باڑی اور دستکاری شروع ہوئی گویا انسان دیوتاؤں کی طرح مارنے اور پیدا کرنے کے قابل ہو گیا۔

ایک روز ذیوس دیوتا کی نگاہ زمین پر پڑی تو دیکھا کہ جا بجا دھواں اٹھ رہا ہے اور کہیں کہیں زرد اور سرخ شعلے ٹمٹماتے ہوئے تاروں کی طرح چمک رہے ہیں۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ شعلے انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ اس نے غصے سے گرج کر دریافت کیا کہ آگ جیسی مقدس چیز جو دیوتاؤں کے لئے مخصوص تھی انسان کو کس نے دے دی؟ فوراً دیوتاؤں کی کونسل طلب کی گئی اور اس امر پر غور کیا جانے لگا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ بعض دیوتا آگ کے بغیر انسان کی کمزوری اور بے چارگی کی وجہ سے اس کے طرفدار بھی تھے۔ آخر بہت کچھ بحث و مباحثہ کے بعد یہ طے ہوا کہ آگ انسان کے پاس رہنے دی جائے لیکن ایک اور شے ایسی پیدا کر دی جائے جو حد درجہ دل فریب بھی ہو اور ہمیشہ کے لئے اس کی تباہی و بربادی کا سامان بھی بن جائے۔

چنانچہ لنگڑے آگ دیوتا ولکن[5] کے نام احکام جاری ہو گئے جس کی حکومت پر گویا انسان نے ڈاکا ڈالا تھا۔ اس نے زمین سے مٹی اور پانی لے کر ایک نہایت خوبصورت بھولی بھالی لڑکی کی شکل بنائی۔ دستکاری کی دیوی نے اسے بے داغ سفید لباس پہنایا اور ایک نہایت باریک جالی دار نقاب اُڑھا دیا۔ پیشانی پر تازہ کھلے ہوئے پھولوں کے حلقے سجا دئے گئے۔ اور ولکن نے ایک سنہری تاج بنا کر سر پر رکھ دیا جس میں تمام دنیا کے جانوروں کی تصویریں اس خوبی سے کھودی گئی تھیں کہ وہ زندہ معلوم ہوتے تھے۔ اس بت کو ولکن اٹھا کر دیوتاؤں کی مجلس میں لے گیا۔

وہاں مختلف دیویوں اور دیوتاؤں نے اسے اپنی اپنی طرف سے تحفے دئے۔ حسن کی دیوی نے حسن عطا کیا۔ اپالو دیوتا نے موسیقی۔ ہرمیز[6] نے جو دیوتاؤں کا نامہ بر تھا میٹھی زبان۔ اور جب سب اپنے اپنے تحفے دے چکے تو اس کی ناک میں روح پھونک کر پینڈورا[7]

---

[1] پیلاس ایتھینی (PALLAS Athene) [2] ذیوس (ZEUS) [3] اولمپس (OLYMPUS) [4] اپالو (APOLLO)
[5] ولکن (VULCAN) [6] ہرمیز (HERMES) [7] پینڈورا (PANDORA)

یعنی "دیوتاؤں کی عنایات سے بنی ہوئی" نام رکھا۔ اور زمین پر بھیج دیا تاکہ دیوتاؤں کی طرف سے پرامی تھیس کو تحفتہً دے دی جائے۔

پرامی تھیس نے جب اُس کی آنکھوں کی طرف دیکھا جن میں دنیا کے ہر رنگ کی جھلک موجود تھی لیکن اس قدر بھولی اور ادر بے لوث معلوم ہوتی تھیں جس طرح دو نرگس کے پھولوں پر شبنم کے قطرے۔ تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اور خیال آیا کہ دیوتاؤں کی طرف سے تحفہ آیا ہے اس میں ضرور کچھ بات ہے۔ اس نے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا اور اپنے بھائی ایپی می تھس سے بھی کہا کہ ہوشیار رہنا۔ لیکن اس کی نگاہ پڑنا تھی کہ ہوش اڑ گئے۔ دنیا کی تمام خوشیاں اور عیش و آرام صرف اس نئی ہستی کے حاصل کر لینے میں دکھائی دینے لگے۔ اس کے آنے سے پھولوں میں خوشبو زیادہ معلوم ہونے لگی۔ فضا کا رنگ بدل گیا اور پرندوں کی آواز میں گویا مٹھاس بڑھ گئی۔ اس نے اپنے بھائی کی بے عقلی پر حیران ہوتے ہوئے تحفہ قبول کر لیا۔

جب دیوتاؤں نے دونوں جنات بھائیوں کو دنیا بنانے اور اس میں مخلوقات پیدا کر کے خوبیاں تقسیم کرنے کا حکم دیا تھا اُس وقت بڑی احتیاط سے چند ایسی چیزوں کو روک لیا تھا جن سے تکلیف پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا یعنی دُکھ، بیماری، فکر، پچھتاوا، خوف، بدگمانی، غصہ، حسد، درد، دل وغیرہ۔ اب یہ تمام چیزیں ایک جواہر نگار بکس میں بند کر کے پینڈورا کے جہیز کے طور پر اس کے ساتھ زمین پر بھیج دی گئیں اور بکس کی چابی ایپی می تھس کے حوالے کر دی گئی۔

پینڈورا کے لئے زمین پر ہر ایک چیز نئی تھی۔ ہر منٹ کسی نئی دریافت اور نئی خوشی کا سامان بنتا تھا۔ ہر طرف اسرار تھے جنہیں کھولنے میں نئی مسرت حاصل ہوتی تھی۔ لیکن سب سے بڑا راز وہ تھا جس کی سنہری چابی اس کے سادہ دل محافظ ایپی می تھس کے قبضے میں تھی۔ جب بھی وہ اس صندوقچے کی طرف دیکھتی وہ ایپی می تھس سے پوچھتی کہ اس میں کیا ہے؟ لیکن وہ کچھ جواب نہ دے سکتا کیوں کہ یہ تو صرف دیوتاؤں ہی کو معلوم تھا۔ روز بروز پینڈورا کے دل میں اس کو کھول کر دیکھنے کی خواہش بڑھتی چلی جاتی تھی۔ دیوتاؤں نے اس پر عنایات کی بارش کر دی تھی اور کوئی چیز ایسی نہ دی تھی جس میں کوئی خوبی نہ ہو۔ اس بکس میں جو خاص طور پر دیا گیا تھا معلوم نہیں کیا کیا کچھ محفوظ ہوگا۔ شاید دیوتا یہ چاہتے ہوں کہ زمین کے رہنے والوں کو راحت اور دلی مسرت حاصل کرنے کے لئے سب قیمتی سامان پینڈورا ہی کے ہاتھ سے ملے ——!

آخر کار پینڈورا نہ رہ سکی اور اسے دنیا اور انسان سے بھلا کرنے کی زبردست خواہش کہئے یا دانا دیوتاؤں کی دور اندیش نظر کے سامنے بھولے انسان کی نادانی۔ کہ اس نے ایپی می تھس کی غیر موجودگی میں چپکے چپکے صندوقچے کو کھول کر دیکھنا چاہا۔ اس کا ڈھکنا اٹھتے ہی مدت سے بند کئے ہوئے قیدی بوکھلا کر نکلے اور فضا میں چاروں طرف پھیل گئے۔ ہوا کی صفائی کثافت میں بدل گئی۔ روشنی دھندلی پڑ گئی۔ پانی کا رنگ جو شفاف تھا نیلا ہو گیا۔ اور عیش اور راحت کے لئے بنی ہوئی زمین "گناہ" سے روشناس ہو گئی۔

پینڈورا نے گھبرا کر جلدی سے بکس کا ڈھکنا بند کر دیا تاکہ اس طوفان بے تمیزی کو روک دے لیکن جو کچھ ہونا تھا ہو چکا تھا۔ ایپی می تھس غصے میں آگ بگولا ہو کر دوڑا ہوا آیا اور ہاتھ اٹھا کر چاہتا تھا کہ پینڈورا کو قتل کر دے کہ پینڈورا خوفزدہ ہو گئی اور بکس اس کے ہاتھ سے زمین پر گر کر کھل گیا۔

اب جہاں دیوتاؤں نے اس بکس میں ہر قسم کا عیب بھر دیا تھا وہاں ایک اور صرف ایک چیز اچھی بھی تھی جو بکس کے ایک کونے میں سمٹی ہوئی پڑی تھی اور اب اس کے کھلنے سے باہر نکل کر گر گئی تھی۔ پہلے جب تک زمین پر امن ہی امن کا دور دورہ تھا اس کی ضرورت نہ تھی، اور یہ بھی دیوتاؤں کی دُور بینی کا گویا ایک ثبوت تھا۔ یہ اُمید تھی۔

اس پر نظر پڑنا تھی کہ ایپی می تھس کا ہاتھ جو پینڈورا کو قتل کرنے کے لئے اٹھا ہوا تھا رُک گیا اور پینڈورا کا خوف آہستہ آہستہ کم ہونے لگا .... دن گذرتے گئے۔ ایپی می تھس او پینڈورا کی اولاد انسانوں میں گھل مل گئی اور دنیا اپنے نئے رنگ پر قائم ہو کر چلنے لگی۔

بنی نوع انسان سے تو ذیوس نے دیوتاؤں کی طاقت حاصل کر لینے کا اس طرح بدلہ لیا اور پرامی تھیس (پیش بینی) کو چوری کی یہ سزا دی کہ تیس ہزار برس کے لئے کوہ قاف کے پہاڑوں میں ایک بہت بڑی چٹان کے ساتھ زنجیروں سے باندھ دیا۔

عطاء الرحمٰن

اِنّی اعلم مالا تعلمون

بیروں از حدِ خویش رفتن ندہند
در وادئ ہولناک خفتن ندہند
چیزے کہ بجہد ہم نیاید در دست
شمعیست، کہ طفل را گرفتن ندہند

عبدیّت

بر ہر قدمے، برائے من صد بند ست
در ہر شکنِ قبائے من صد بند ست
از خود، قدمے نمی توانم رفتن
من بندہ ام و پائے من صد بند ست

سیّد احمد حسین امجد

برسات

بزمِ گردوں میں ساغروں کی کھنک
سازِ باراں کے جھنجھناتے تار
ناچتی بوندیوں کی نرم جھنک

رنگ و بُو کی سنورتی تقدیریں
ابر کے کارواں سبک رفتار
لمحہ لمحہ بدلتی تصویریں

برق، اُمیدوں کا پرتوِ سیمیں
سینۂ گُل پہ جھلملاتے گہر
رقص میں پارہ ہائے بلّوریں

زخمہ زن سازِ بے خودی پہ ہوا
شاہِ خاور نہاں لحافوں میں
زندگی خواب بھیگی راتوں کا

ہر طرف مستیاں برستی ہیں
دل میں آیا ہوا ہے چھپ کے کوئی
آرزوئیں مگر ترستی ہیں

گرتی ہیں ذہن کے دھندلکوں سے
یادِ ماضی کی بجلیاں دل پر
مینہ برستا ہے گرم پلکوں سے

سیّد ضیا جالندھری

جُوا

کردار:—

عورت مرد شیطان

منظر:—

[اندھیری رات ہے۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں۔ بجلی رہ رہ کر چمکتی ہے۔ بادل زوروں سے گرج رہے ہیں۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں تور چپ چاپ لیٹی ہوئی ہے۔ کمرے کے ایک گوشے میں چراغ جل رہا ہے۔ جس کی روشنی عورت کے چہرے پر پڑ رہی ہے۔ عورت جوان اور قبول صورت ہے۔ مگر اُس کے چہرے پر غم والم برس رہا ہے۔ اُس کی آنکھوں کے پپوٹے نیند کے مارے بوجھل ہو رہے ہیں]

[دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز]

عورت۔ کون ہے؟

مرد کی آواز۔ دروازہ کھولو۔ میں ہوں

[عورت اُٹھ کر دروازہ کھولتی ہے۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے کے ساتھ جو اُسے کپکپا دیتا ہے۔ مرد اندر داخل ہوتا ہے۔]

عورت۔ خُدا کا شکر ہے کہ تم آج جلد آگئے۔ اس اندھیری رات میں مجھے اکیلے ڈر لگ رہا تھا۔

مرد۔ بس یہی تمہاری عادت مجھے ناپسند ہے۔

عورت۔ کیا! کیا ہوا؟

مرد۔ ہونا کیا تھا۔ یہ تمہارا خُدا اور اس کا شکر۔ میری سمجھ میں تو آتا نہیں کہ خدا کیا ہے اور اس کا شکر کیوں ادا کیا جاتا ہے۔

عورت۔ (مسکرا کر) معلوم ہوتا ہے آج پھر ہار آئے ہو۔

مرد۔ (برافروختہ ہوکر) اچھا بس چپ رہو میرا سر نہ کھاؤ۔

عورت۔ خیر میں چپ رہتی ہوں۔ مگر ایسی بری بُری باتیں نہ کہا کرو۔

مرد۔ (زہر خند ہوکر) بُری —— دنیا کی بیشتر چیزیں بُری ہیں اور اُن سب میں بدترین عورت کا وجود ہے۔

عورت۔ ہاں مجھ سے تو تم تنگ آچکے ہو۔

[تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے۔ عورت آہستہ آہستہ اس کے قریب جاتی ہے۔ اور اُس کا بازو تھام کر پیار کے شکایت آمیز لہجے میں کہتی ہے۔]

عورت۔ آخر تم اس جوئے سے باز کیوں نہیں آجاتے۔ جب تمہیں یہ عادت نہ تھی تو ہم کتنے خوش حال تھے۔ میں فخر سے محلے بھر میں پھرتی تھی۔ میرے برابر زیورات محلے بھر میں کسی کے پاس نہ تھے۔ ہمارا گھر برتنوں اور کپڑوں سے بھرا ہوا تھا اور پھر نہ جانے وہ کیسی منحوس گھڑی تھی جب تمہیں اس جوئے کا چسکا پڑا کہ گھر کا گھر دا ہو گیا۔ زیور ایک ایک کرکے بک گئے۔ برتن اور کپڑے تک اس شوق سے نہ بچے اور اب تو روٹیوں کو محتاج ہیں۔ گھر میں اناج کا ایک دانہ نہیں۔ مگر تمہیں کیا پروا تم اپنے جوئے میں مگن ہو۔

مرد۔ سچ کہہ رہی ہو، سچ کہہ رہی ہو۔

عورت۔ (تنک کر) کیا خاک سچ کہہ رہی ہوں۔ اگر سچ ہوتا تو تم باز نہ آجاتے۔ یہ تو سب جھوٹ ہے۔ تم سچے اور تمہارا جُوا سچا۔

مرد۔ تو نہیں جانتی اے عورت کہ جُوا کیا ہے اور کیوں کھیلا جاتا ہے اس دنیا میں کوئی متنفس ایسا نہیں جو جُوا نہ کھیلتا ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ اُسے جوا نہ کہا جائے۔ بلکہ کسی اور نام سے پکارا جائے میں بھی اُسی سوسائٹی کا ایک ادنیٰ رُکن ہوں۔ مگر میں بزدل نہیں جو کچھ کرتا ہوں ڈنکے کی چوٹ کرتا ہوں۔ بس فرق صرف اتنا ہے

عورت۔ نہیں نہیں۔ بھلا کہیں یہ بھی سُنا ہے کہ ساری دنیا جُوا کھیلتی ہے۔ جُواریوں کا تو ایک محدود طبقہ ہے۔

مرد۔ جب میں کہتا ہوں کہ تو نہیں جانتی تو تو واقعی اس چیز سے بے خبر

ہوتی ہے کیونکہ میں تیری روح کی انتہائی گہرائیوں سے بھی واقف ہوں۔ تیرا وجود میرے سامنے آئینے کی مانند ہے جس میں کوئی بھید نہ ہو۔ اگر ظاہراً تو نے ہر ایک کو جوا کھیلتے نہیں دیکھا، تو یہ تیرا قصور نہیں کیوں کہ ایسے لوگ اونچی اونچی کرسیوں پر بیٹھ کر دُنیا کو دھوکا دیتے ہیں۔ مگر ہیں سب کے سب جواری۔ انہوں نے آڑ کے لئے مذہب اخلاق قانون انسانیت اور بہت سے نام گھڑ رکھے ہیں۔ سرمائے کا آہنی خول اُنہیں ہر حملے سے محفوظ کئے ہوئے ہوتا ہے اور وہ اطمینان سے اپنا شیطانی کھیل کھیلتے رہتے ہیں۔

عورت۔ نہیں معلوم کیا کہہ رہے ہو اور تو سب لوگ اپنے اپنے کام کاج میں مشغول ہیں۔ جوئے کا کسی کے ہاں نام نہیں آتا۔

مرد۔ ہاں ہاں وہ بڑے لوگ ہیں۔ ہم ان کے کھیل کو جوا نہیں کہہ سکتے۔ اُسے تو تجارت تعلیم اور جنگ وغیرہ کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ اُن میں سے بعض بہت زیادہ چالاک ہیں۔ وہ تجارت کے نام پر دُنیا بھر سے روپیہ بٹورتے ہیں اور اُسے داؤں پر لگا دیتے ہیں۔ ہار جانے پر بھی اُن کے گھر میں نفع ہی نفع ہوتا ہے اور دنیا اُن کے گُن گاتی ہے۔ اگر مجھ جیسا غریب اپنی گرہ کے دام لگا کر ہار جائے تو اس سے زیادہ احمق اور کون ہو سکتا ہے۔ کیوں ہے نا؟

عورت۔ تمہیں تو جب سوجھے گی اوٹ پٹانگ ہی سوجھے گی۔ کیا تم نہیں جانتے کہ خُدا تجارت سے منع نہیں کرتا مگر جوئے کو گناہ ....

مرد۔ (زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے) خُدا ہا ہا ہا ہا خُدا جس نے خود دنیا بنا کر بہت بڑا داؤں لگایا مگر اب پانسہ شیطان کے ہاتھ میں ہے۔

عورت۔ چھی چھی چپ رہو۔ ایسی باتیں نہ کیا کرو۔

مرد۔ (بدستور ہنس رہا ہے) مگر لوگ کہتے ہیں کہ خُدا بڑا زبردست جواری ہے اور شیطان آخر کار اُس سے ہار جائے گا۔

عورت۔ ہاں شیطان ضرور ہار جائے گا۔ جس طرح تم سب کچھ ہار چکے ہو۔ وہ بھی سب کچھ ہار دے گا اور مفلس و قلاش ہو کر رہ جائے گا۔

مرد۔ (بگڑ کر) تو مجھے طعنہ دیتی ہے اے عورت۔ مگر تو نہیں جانتی کہ قمار باز شکست یا فتح سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کا ثبوت یہی ہے کہ وہ کھیلتا رہے کھیلتا رہے اور کھیلتا چلا جائے۔ ہار جیت سے بے پروا ہو کر (پھر ہنستا ہے) جبھی تو شیطان کے لئے یہ اعزاز کیا کم ہے کہ اُس نے دنیا کی بساط پر خُدا سے بازی لگا دی۔

عورت۔ اُونہہ کیا بے سر پیر کی باتیں کر رہے ہو۔ اچھا مان لیا کہ تم ہار جیت سے بے نیاز ہو مگر یہ کیا ضرور ہے کہ ہمیشہ ہارتے ہی رہو۔ ان کئی سالوں کے اندر تم نے ہارنے کے سوا کچھ کیا بھی ہے؟ کیا شانِ بے نیازی ہے۔ میں تو ایسی بے نیازی پر لعنت بھیجتی ہوں۔

مرد۔ ایک نوآموز کی طرح تیری باتوں میں خلوص کی شدت ہے۔ مگر حقائق تک تیری نگاہ نہیں پہنچتی۔ اس دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کا انجام شکست نہ ہو۔ ہمارے نام نہاد مُدعیانِ اخلاق جو عجیب و غریب ناموں سے جُوا کھیلتے ہیں آخر کار شکست کھاتے ہیں۔ اُن کی لاکھوں روپے کے سرمایہ سے جاری کردہ تجارت ایک دن ٹوٹ کر رہ جاتی ہے۔ وہ نئے نئے ذرائع دولت تلاش کرنے کے لئے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ مگر نہ اُن کی پریشانیوں میں اضافہ کئے چلی جاتی ہے۔ وہ داؤں ڈال کر منفعت حاصل کرنے کے لئے فوج کشی کرتے ہیں۔ مگر عارضی فتح پا لینے پر بھی ایک نہ ایک دن اُن کی مملکت پارہ پارہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ نتائج خوش آئند ہوں تو ہوں مگر دوامی نہیں ہو سکتے اور جب مآلِ کار شکست ہی ہوتی ہے تو عارضی فتح کے لئے اتنی بے تابی کیوں؟

[تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے۔ باہر سے بادلوں کی گرج کے ساتھ مینہ کی بوچھاڑ بھی سنائی دیتی ہے۔ ہوا کے جھونکے دیوانہ وار کھڑکیوں سے سر ٹکراتے ہیں اور بار بار ناکام ہونے پر بھی اپنی سعیٔ لاحاصل سے باز آتے نہیں معلوم ہوتے۔ عورت خاموشی سے مرد کو دیکھ رہی ہے جو ایک شانِ بے نیازی سے اکڑا ہوا کھڑا ہے۔ مگر]

عورت۔ تمہاری باتیں کتنی ہی مکروہ کیوں نہ معلوم ہوں۔ مگر اُن میں صداقت کی جھلک ضرور ملتی ہے۔

مرد۔ اے عورت صداقت کا لفظ صرف کتابوں میں رہ گیا ہے۔

جس طرح خُدا ہماری نظروں سے اوجھل ہے اُسی طرح صداقت بھی گم ہوگئی ہے۔ اور اب یہ ناممکن ہے کہ اُس کا کہیں پتا چلے۔ ہمارے سامنے جو کچھ رہ گیا ہے وہ شیطان کا وجود ہے اور جھوٹ ہے۔

عورت۔ کتنا بھیانک سچ ہے ــــ کتنا بھیانک ــــ خُدا کی خدائی پر شیطان کا تسلط ایک ایسا سچ ہے جس میں دنیا بھر کی خباثتیں اور ہولناکیاں بھری ہوئی ہیں۔

[بادل کی گھڑگھڑاہٹ اور ہوا کا شور اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ عناصر آپس میں ٹکراتے معلوم ہوتے ہیں۔ اور پھر دفعتہً ان دونوں کے قریب ایک تنومند جوان نمودار ہوتا ہے۔ اس کے چہرے سے ہیبت ٹپک رہی ہے۔ لباس کچھ عجیب وضع قطع کا ہے۔ اُس کی آنکھیں چمک رہی ہیں مگر اُن میں ستاروں کی سی تابانی نہیں۔ بلکہ وہ جہنم کے غاروں سے اُبلتے ہوئے شعلوں کی مانند دہکتی ہیں۔ قیاس کہتا ہے کہ شیطان ہے]

مرد۔ (خوف اور حیرت کی ملی جلی آواز میں) تم کون ہو؟

شیطان۔ میرے دوست دنیا میں ایک تم ہی تو میری طاقتوں سے خوب واقف ہو۔ مگر افسوس ہے کہ تم مجھے نہیں جانتے۔

مرد۔ میں نہیں نہیں جانتا۔

شیطان۔ میں وہی تو ہوں جس کی عظمت اور بزرگی ابھی ابھی تم اس عورت پر ظاہر کر رہے تھے۔

مرد۔ تو تم شیطان ہو۔

شیطان۔ (ہنس کر) ہاں دنیا والے مجھے اسی نام سے یاد کرتے ہیں۔

مرد۔ لیکن تم یہاں کیوں آئے۔

شیطان۔ میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔ تم نے آج ایک بڑی پاکیزہ اور مقدس روح میری نذر کی ہے۔ میری کارگزاریوں کے دفتر ایسی روحوں کے ذکر سے چلنے لگتے تھے۔ میرے دوست میں کسی طرح تمہارا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔

مرد (میرے دوست پر چونک کر حیرت سے) مگر وہ کون سی روح ہے؟

شیطان۔ تم نہیں جانتے۔ تمہاری بیوی۔

مرد۔ میری بیوی .... میری بیوی ...... نہیں نہیں (عورت کے معصوم چہرے پر نظریں گاڑ دیتا ہے۔ جو جذبات سے بالکل معرّا ہے) یہ نہیں ہو سکتا۔

شیطان۔ کیا ــــ کیا نہیں ہو سکتا۔

مرد۔ میری بیوی کی روح اور ...... اور (عورت سے مخاطب ہو کر) کیا یہ سچ کہہ رہا ہے۔

عورت۔ (انتہائی سنجیدگی سے) ہاں جب مصیبتوں کے ہلاکت آفریں چکر نے ہمیں پیسنا شروع کر دیا اور رات رات بھر جاگ کر میری عبادتیں اور رو رو کر مانگی ہوئی دعائیں کوئی نتیجہ نہ پیدا کر سکیں۔ جب خدا نے ہمیں چھوڑ دیا اور ہم شیطان کے رحم و کرم پر آ پڑے تو کیوں نہ ہم اُسے تسلیم کر لیں۔ تم ہی تو کہتے تھے کہ اب پانسہ شیطان کے ہاتھ ہے۔

مرد۔ تم غلطی کر رہی ہو۔ خدا نے کبھی ہمیں نہیں چھوڑا۔ یہ ہم ہیں جو اُسے چھوڑ کر بھٹک جاتے ہیں اور یہ شیطان کبھی دنیا پر حکمران ہونے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اس کی حیثیت تو ایک ڈاکو کی سی ہے جو چھپ چھپ کر ادھر اُدھر چھاپے مارتا رہتا ہے

شیطان۔ (قہقہہ لگا کر) خوب خوب یہاں تو معاملہ الٹا ہو گیا۔ مگر بھئی تم تو شکست و فتح سے بے نیاز ہو کر محض داؤں لگا دینے ہی کو جرأت و بہادری سمجھتے ہو۔ پھر ڈاکو ڈاکو ہی سہی مگر اس کی جسارت کی داد نہیں دیتے۔ یہ تو ظلم ہے۔

مرد۔ بکومت میں تم سے بات نہیں کرتا۔

عورت۔ میں دیکھتی ہوں کہ تمہارے زورِ بیان نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ اور خدا کی حمایت میں تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں حالانکہ چند لمحے بیشتر اس کے خلاف تمہاری زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ کیا اس سے تمہاری بحث کا کھوکھلا پن نہیں ثابت ہوتا۔

مرد۔ کم عقل عورت خدا کا وجود دلیل اور حجت سے بالاتر ہے۔ دلیل اور حجت کی محتاج تو (انگلی سے شیطان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ ہستیاں ہیں۔ ذرا اسی سے پوچھ لو کیا یہ کبھی

تصور بھی کر سکتا ہے کہ خدا پر غالب آجائے گا۔

شیطان۔ یہ زمانہ عقل کی حکومت کا ہے۔ جہالت اور توہمات کو اب کوئی برکاہ برابر وقعت نہیں دیتا۔ تم جانتے ہو ہر عاقل و دانا جمہوریت کو پسند کرتا ہے۔ دنیا آہستہ آہستہ میری جانب رجوع کرتی چلی جا رہی ہے اور اب میں تمہارے خدا کو ووٹوں کی اکثریت سے شکست دے سکتا ہوں۔ اس پر بھی وہ حکومت مجھے نہ سونپ دے تو وہ غاصب ہے۔ اُسے خدائی کے تخت سے اُتار دینا چاہئے۔

مرد۔ (غصے سے آگ بگولا ہو کر) مردود لعین زبان بند کر۔ تو جو کچھ کہہ رہا ہے میں جانتا ہوں کہ خود تجھے اس کا یقین نہیں۔

شیطان۔ (ہنستے ہوئے) خیر میں جانتا ہوں کہ اس باب میں تم کچھ نہیں جانتے (عورت سے مخاطب ہو کر) آ! اے حسین مخلوق آ کہ میری جنت کے عیش و لذت کے دروازے تجھ پر کھلے ہوئے ہیں جس کی مدہوشیوں میں تجھ پر عجیب عجیب اسرار و رموز کا انکشاف ہوگا۔

(ہاتھ اٹھاتا ہے اور اپنی ملتہب آنکھیں عورت کی آنکھوں میں گاڑ دیتا ہے عورت چند لمحوں تک بغیر آنکھ جھپکائے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہتی ہے۔ اور پھر ایک مسحور کی طرح دونوں ہاتھ پھیلا کر آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہے۔ مرد انتہائے خوف و ہراس میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہے مگر عقل کام نہیں کرتی کہ کیا کرے۔ دفعتہً وہ گھٹنوں کے بل گر کر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا دیتا ہے)

مرد (گڑگڑا کر) میرے پروردگار میں بہت گنہگار ہوں۔ مگر یہ سزا مجھے نہ دے۔ میں اِسے برداشت نہیں کر سکتا۔

(سر بسجود ہو جاتا ہے۔ دفعتہً ایک سخت کڑک سنائی دیتی ہے۔ جو کسی طرح بادلوں کی گرج سے مشابہ نہیں۔ شیطان کا چہرہ مُتَ جاتا ہے اور جس طرح پھونک مار کر چراغ گل کر دیا جائے وہ یک بیک اپنی جگہ سے غائب ہو جاتا ہے عورت جو بڑھتے بڑھتے اس کے قریب پہنچ کر اس پر گرا ہی چاہتی تھی۔ دھڑام سے فرش پر گر پڑتی ہے۔ دھماکے کی آواز سن کر مرد سجدے سے اٹھتا ہے اور آگے بڑھ کر عورت کو اٹھا لیتا ہے جس کے منہ سے خون بہ رہا ہے۔ مرد کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو چھلک رہے ہیں بجلی چمک کر زمین و زماں کو منور کر دیتی ہے)

ایوب سرور

غزل

اے مرے دل کس لئے مغموم ہے
حُسن تو معصوم تھا معصوم ہے

وال تبسم اور یاں آنسو بہے
کیا اُمیدوں سے بھی دل محروم ہے

کچھ تو ہے اس شیوۂ اضداد میں
دل نہیں آگاہ کیا مفہوم ہے

روٹھنے کا آپ نے پہلو لیا
ہم کو خوش کرنے کا ڈھب معلوم ہے

ڈوبتے ہی تھا عدم سے ہمکنار
دل بھی کوئی جذبۂ موہوم ہے

عیب تھا گر دل نہ ہوتا وقفِ غم
آپ کے قدموں سے بھی محروم ہے

یوں بھلایا آپ نے مقبول کو
جس طرح پاسِ وفا معدوم ہے

فرزندِ کلاں

بارہ سال کے آ گئے جو
چُپ چُپ تکتا تھا مجھ کو
اب وہ ادب سے بیٹھا ہے
درس مجھی سے لیتا ہے
ناسمجھ آگے اتنا تھا
بیٹھے بیٹھے روتا تھا
آج سمجھ دار ایسا ہے
جو سمجھاؤ سمجھتا ہے
جب میں مناتا ہوں اس کو
رونا چھوڑ کے وہ خوش خو
آنکھیں پونچھ کے ہنستا ہے
جب کیا تھا اور اب کیا ہے
بازو پھیلا پھیلا کر
میری گود میں خود آ کر
جانے کو جو روتا تھا
اُن کی گود میں سوتا تھا
اب وہ نمونہ میرا ہے
میرے پاس ہی سوتا ہے
بارہ سال کے آ گئے جو
سُن کر میری باتوں کو
بے سمجھے رو دیتا تھا
بے موقع دُکھ لیتا تھا
خوش مجھے اب کر دیتا ہے
اُردو لکھ پڑھ لیتا ہے
سینہ کے بل بڑھ بڑھ کر
حملہ کرتا تھا جن پر
آج اُسی ڈھب کے پرچے
نازاں ہے خود پڑھ پڑھ کے
علم کا اس کو چسکا ہے
قابل بننے والا ہے
کہتی ہے یہ اس کی اُٹھان
ہو جائے گا جلد جوان
چھوٹے بھائی بہنوں پر
میری طرح ہے اس کی نظر

اب مجھے خوفِ اجل کیا ہے
جب کہ ولی عہد ایسا ہے

علی منظور

اصغر کی یادیں

خوشی میں تو سبھی مل بیٹھتے ہیں لیکن غم بھی تنہا نہیں رہتا۔ خوشی میں اگر سینکڑوں یا دس بیس اکٹھے ہو کر شور وغل مچاتے ہیں تو کبھی کبھی غم میں بھی دو دل باہمی رابطہ پا لیتے ہیں۔

تھوڑا عرصہ ہوا مجھے ایک خط آیا "بشیر بھائی معذرت خواہ ہوں کہ بغیر کسی تعارف کے آپ کو اس بے تکلفی سے مخاطب کر رہا ہوں لیکن ایک قلبی اور روحانی رشتہ آپ کے ساتھ ایسا استوار ہو گیا ہے کہ میں تو ایک طرف شاید آپ کو بھی یہ گوہر یک رنگی میرے خرابۂ دل کے سوا اور کہیں سے نہ مل سکے۔

"اصغر کی یاد کے عنوان سے جو کچھ آپ "ہمایوں" میں لکھتے ہیں میں اسے بار بار پڑھتا ہوں اور اپنی حالت پر منطبق کر کے روتا ہوں۔ اب کے ماہ مئی کے "ہمایوں" میں جس انداز سے آپ نے لکھا ہے اس نے مجھے تڑپا ہی تو دیا اور میں مضطرب ہو کر یہ سطور آپ کو لکھ رہا ہوں۔ یہ سطور نہیں پارہ ہائے دل و جگر ہیں جنہیں ایک غم زدہ بھائی کی نذر کر رہا ہوں ؎

دلم با زلفِ جاناں می نشیند　　　پریشاں با پریشاں نشیند

مجھے امید ہے کہ یہ سطور اور ان کا مضمون قطعی طور پر آپ تک محدود رہیں گے۔"

پھر لکھتے ہیں کہ کس طرح ان کی زندگی پر گزشتہ سال غموں کا طوفان ٹوٹا۔ "ہم گھر میں صرف پانچ افراد تھے جن میں سے تین اس طرح تین ماہ کے اندر ختم ہو گئے۔ تمام گھر میں تالے پڑ گئے اور میں اور میرا بیٹا...... ایک اجڑے گلستان کا ماتم کرنے کے لئے رہ گئے ...... اس پُردرد منظر کا پس منظر اس سے بھی زیادہ حسرت ناک اور الم انگیز ہے کہ کس طرح میں نے خدمت وطن و ملت کے لئے اپنا سب کچھ لٹا دیا اور دنیا کے اصرار کے باوجود دنیوی وجاہت سے منہ موڑ کر فقر اختیار کیا۔ یہ ایک دوسری داستان ہے۔ میری وحشت، میری تنہائی، کسی حقیقی غمگسار کا نہ ہونا، اپنے بچے کی افسردگی، غرض کیا کہوں کہ ڈیڑھ سال سے میری کیا حالت ہے۔ کام کاج، سب کو خیرباد۔ دفتر کا کمرہ یا پائیں باغ ہے اور میں ہوں یا قرآن اور قبرستان۔ دنیا اور دنیا کے ساز و سامان سے انتہائی نفرت اور بیزاری ہو گئی ہے۔ ڈیڑھ سال سے "ہمایوں" برابر پڑھتا ہوں (میرا مرحوم بیٹا) .... اصغر بشیر کی ذہانت اور دل آویزی کی تصویر بن کر ہمیشہ میرے سامنے آتا ہے ..... میری ایک تمنا ہے کہ کسی دن آپ کے پاس بیٹھوں اور دل کھول کر آپ سے باتیں کروں ... ملک میرے احباب و رفقا سے بھرا پڑا ہے لیکن کچھ تلخ تجربے اور کچھ ویسے ہی ..... ایک کشش اور ناقابلِ مقاومت کشش ڈیڑھ سال سے مجھے آپ کی طرف کھینچ رہی تھی آج اس کا اظہار آپ پر کر رہا ہوں کہ اپنی داستانِ حیات کے بعض مستور حصے جو خود میرے لئے تعجب خیز ہیں مرنے سے پہلے آپ پر بے نقاب کر دوں ...."

میں نے اس "غم نامے" کو ایک نظر دیکھا اور بغیر پڑھے علیحدہ رکھ دیا۔ کچھ دن یونہی گزر گئے۔ آخر شروع کیا اور ختم کیا اور پھر رکھ دیا۔ چند ہفتے پھر یونہی گزر گئے۔ اپنی کم آمیزی وغیرہ کا واسطہ دے کر دیر میں جواب دیا اور "قرآن اور قبرستان" کی جگہ "قرآن اور انسان" کی طرف توجہ دلائی۔ اس کا پھر جواب آیا اور سچ یہ ہے کہ ان کی زندگی کی تفصیلات نے مجھے لاجواب کر دیا۔ "عملی زندگی اور جد و جہد کے ایک پُرخلوص کارکن کی ہمت و شجاعت اور اس پر زمانے کی بے اعتنائی اور حوادث کے پے در پے حملے! کوئی کہاں تک برداشت کرے" آپ بے حد خوش قسمت ہیں کہ آپ کو پھر بھی چند دوست نصیب ہیں اپنا تو یہ حال ہے ؎

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد　　　ڈرتا ہوں آئنے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

اسی سلسلے میں میری سب سے بڑی مصیبت میری تیز فہمی رہی ہے اور میں اس "روشنیٔ طبع" کے ہاتھوں بے حد تنگ ہوں .... میں اس معاملے میں اپنے نقطۂ نظر کی صحت کا اس قدر قائل ہوں کہ اس ذہنی کوفت کو بھی نظامِ عالم کے ان لاینحل مسائل میں شامل کئے ہوئے ہوں جن کی قدر مشترک یہ ہے اور صرف یہ کہ اس خرابات میں دیانت، اصول پروری، خلوص اور ایثار کی پگڑی اچھلتی ہے اور ہوا و ہوس، فریب، ریاکاری اور منافقت

کے لئے مسندِ شاہانہ بچھتی ہے۔ قلبِ محزوں پوچھتا ہے ؎

یہ کیا اندھیر ہے اے دشمنِ اہلِ دفا تجھ سے ہوس نے کام جاں پایا محبت شرمسار آئی

آپ نے زندگی کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا وہ تصویر کا ایک رُخ ہے اور ذوقِ تماشا کا ایک کرشمہ۔ دراصل زندگی کی تصویر بہت حد تک اپنے خدوخال ناظر کی ذہنی کیفیت اور اُس کے پس منظر سے حاصل کرتی ہے جس نگاہ سے آپ دنیا کو دیکھتے ہیں یا جو نگاہ آپ کی دنیا کی تخلیق کرتی ہے اس نگاہ کے پیچھے ایک لمبی تاریخ ہے وراثت اور ماحول کی۔ آپ میاں محمد شاہ دین مرحوم کے گھر پیدا ہوئے۔ مرفہ الحالی میں پرورش پائی تمام خوشیاں دیکھیں ایک غم کا پہاڑ آپ پر ٹوٹا لیکن ۴۸ سال کی عمر ہیں۔ اب بھی آپ کو معاشرتی آور اقتصادی لحاظ سے وہ سب کچھ نصیب ہے جو اس دنیا کو رہنے والے کے لئے جنت بنا دیتا ہے۔ لازم ہے کہ آپ کا ذہن اسی ماحول کے سانچے میں ڈھلے اور آپ دنیا کو اس مخصوص زاویۂ نگاہ سے دیکھیں۔ زندگی میں آپ کا لائحہ عمل بھی اسی کینڈے پر ہو اور آپ کے فلسفۂ زندگی کا طول و عرض بھی انہیں تاثرات کے حصار میں محصور۔ چونکہ آپ نے یہ ذکر چھیڑ دیا ہے مجبوراً میں اس خط میں آپ کو تصویر کا دوسرا رُخ دکھاتا ہوں" ..... پھر اپنی عبرت انگیز داستان بیان کرتے ہیں جس کی تفصیلات یہاں دہرائی نہیں جا سکتیں۔ اونچ نیچ مدوجزر طوفان بجلیاں سکون تنہائی ..... ہمارے اردگرد ہی سینکڑوں ہزاروں انسان ہیں جن کی زندگیاں افسانے ہیں لیکن ان میں بہت کم ہیں جو بے نقاب ہوتی ہیں اور ہوتی ہیں تو ان کے دیکھنے والے کم ہوتے ہیں اور اگر پھر دیکھنے والے ہوتے ہیں تو ان میں سمجھنے والے اور محسوس کرنے والے اور بھی کتنے کم!

پھر لکھتے ہیں "اب بتائیے میری ذہنی کیفیت کیا ہوگی؛ میں دنیا کو کس نظر سے دیکھوں گا اور پھر اس سلسلۂ مصائب و آلام پر یہ مستزاد کر لیجیے کہ سیاسی زندگی کی رفاقت میں اپنی بے غرض دیانت اور خلوص کے مقابلے میں خود غرضی بد دیانتی اور ریاکاری کے وہ مناظر دیکھے ہیں کہ الامان۔ ذرا اس منظر کو اپنی چشمِ تصور کے سامنے لائیے کہ گھر بار یوں گیا اور پھر جس مقصد کو دیانت داری سے لے کر اٹھے تھے اس کا یہ حشر اور رفقائے راہ کا یہ حال ...... میری اہلیہ جس نے ...... سال میری خود اختیار کردہ مصائب میں بخندہ پیشانی میرا ساتھ دیا اس نے اس دنیا میں کیا دیکھا (اپنے تین بچوں کی موت کے بعد اُس نے بھی) اپنی حسرت بھری آنکھ ہمیشہ کے لئے بند کر لی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ہ کیا اس غیر منقطع سلسلۂ آلام و بے حاصلی کے بعد بھی آپ سمجھتے ہیں کہ میرا نقطۂ نظر وہی ہو سکتا ہے جو آپ کا ہے۔ بشیر بھائی! ذرا اس پس منظر کو سامنے رکھئے اور میری عینک سے دنیا کو دیکھئے۔ سوائے ایک نفرتِ اجتناب اور بے تعلقی کے اور کون سی تحریک ہے جو آپ کی طبیعت میں موجزن ہو اور سوائے ایک خلا کے کون سا منظر ہے جو آپ کی حسرت آگیں آنکھ کو نظر آئے ... (اب میرا ایک بیٹا ہے اور میں ہوں) .... میری اپنی زندگی کے اصول قدم قدم پر دامن گیر ہیں اور دو لفظوں میں میری زندگی کا معمّا یہ ہے کہ دنیوی ساز و سامان اور اس کے حصول کے ذرائع سے انتہائی نفرت اور اجتناب ایک طرف اور (اپنے بیٹے) کی طرف ذمہ داری کا یہ تقاضا کہ انہیں وسائل کو اختیار کیا جائے دوسری طرف۔ اس کشمکش میں بسر کر رہا ہوں۔ کیا کروں کیا نہ کروں ..... ڈیڑھ سال سے ایک ہی جگہ بیٹھا ہوں۔ اپنی مرضی سے نہیں۔ بس اس دنیا سے جس نے مجھ سے ہر رنگ میں اتنی بے وفائی کی ہے، بھاگ جانے کو جی چاہتا ہے! ..... یہ ہے میرا معمّا اور یہ ہے میری تمہید اُس گفتگو کی جو انشاء اللہ ...."

اِس کا جواب کوئی کیا دے؟ ہاں ایک غم زدہ باپ کے ان سوالوں کا جواب خود اُس کا رہا سہا کمزور بیٹا ہوگا اور ضرور ہوگا۔ لیکن کتنی زندگیاں ہوں گی جہاں ایسے کمزور سہارے بھی موجود نہیں۔ آہ! اسی دنیا میں کیا کیا ہے لیکن ایک امیرزادے کو اُس کا حال کیا معلوم؟

بشیر احمد۔

محفلِ ادب

غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں

[دورِ جدید کے شعرا کی ایک مجلس میں مرزا غالب کا انتظار کیا جا رہا ہے اس مجلس میں تقریباً تمام جلیل القدر جدید شعرا تشریف فرما ہیں مثلاً م۔ن ارشد۔ میرا جی۔ ڈاکٹر قربان حسین خالص۔ میاں رقیق احمد خوگر راجہ عہد علی خان۔ پروفیسر غیظ احمد غیظ۔ بکرما جیت ورما۔ عبدالحی نگاہ وغیرہ وغیرہ۔ یکایک مرزا غالب داخل ہوتے ہیں ان کی شکل وصورت بعینہٖ وہی ہے جو مولانا حالی نے "یادگار غالب" میں بیان کی ہے۔ ان کے ہاتھ میں "دیوانِ غالب" کا ایک نسخہ ہے۔ تمام شعرا کھڑے ہو کر آداب بجا لاتے ہیں]

غالب۔ حضرات میں آپ کا نہایت شکر گذار ہوں کہ آپ نے مجھے جنت میں دعوت نامہ بھیجا اور اس مجلس میں مدعو کیا۔ میری مدت سے آرزو تھی کہ دورِ جدید کے شعرا سے شرفِ نیاز حاصل کروں۔

ایک شاعر۔ یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے ورنہ ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

غالب۔ رہنے بھی دیجئے اس بے جا تعریف کو من آنم کہ من دانم۔

دوسرا شاعر۔ تشریف رکھئے گا۔ کہئے جنت میں خوب گذرتی ہے۔ آپ تو فرمایا کرتے تھے۔ ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن۔

غالب۔ (مسکرا کر) بھئی جنت بھی خوب جگہ ہے۔ جب سے وہاں گیا ہوں۔ ایک شعر بھی موزوں نہیں کر سکا۔

دوسرا شاعر۔ تعجب۔ جنت میں تو آپ کو کافی فراغت ہے اور پھر ہر ایک چیز میسر ہے۔ پینے کو شراب۔ انتقام لینے کو پری زاد۔ اور اس پر یہ فکر کوسوں دور کہ

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

باوجود اس کے آپ کچھ لکھ ....

تیسرا شاعر۔ (بات کاٹ کر) کہئے اقبال کا کیا حال ہے۔

غالب۔ وہی جو اس دنیا میں تھا۔ دن رات خدا سے لڑنا جھگڑنا۔ وہی پرانی بحث ؎ مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا۔

پہلا شاعر۔ میرے خیال میں وقت کافی ہو گیا ہے۔ اب مجلس کی کارروائی شروع کرنی چاہئے۔

دوسرا شاعر۔ میں کرسیٔ صدارت کے لئے جناب م۔ن ارشد کا نام تجویز کرتا ہوں۔

(ارشد صاحب کرسیٔ صدارت پر بیٹھنے سے پہلے حاضرینِ مجلس کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔)

م۔ن۔ ارشد۔ میرے خیال میں ابتدا مرزا غالب کے کلام سے ہونی چاہئے ..... میں نہایت ادب سے مرزا موصوف سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنا کلام پڑھیں۔

غالب۔ بھئی جب ہمارے سامنے شمع لائی جائے گی تو ہم بھی کچھ پڑھ کر سنا دیں گے۔

م۔ن۔ ارشد۔ معاف کیجئے گا۔ مرزا۔ اس مجلس میں شمع وغیرہ کسی کے سامنے نہیں جائے گی۔ شمع کی بجائے یہاں بچاس کینڈل پاور کا لیمپ ہے۔ اس کی روشنی میں ہر ایک شاعر اپنا کلام پڑھے گا۔

غالب۔ بہت اچھا صاحب تو غزل سنئے گا۔

باقی شعرا۔ ارشاد

غالب۔ عرض کیا ہے ؎

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

(باقی شعرا ہنستے ہیں۔ مرزا حیران ہو کر ان کی جانب دیکھتے ہیں)

غالب۔ اجی صاحب یہ کیا حرکت ہے۔ نہ داد نہ تحسین۔ اس بے موقع خندہ زنی کا مطلب؟

ایک شاعر۔ معاف کیجئے مرزا۔ ہمیں یہ شعر کچھ بے معنی سا معلوم ہوتا ہے۔

غالب۔ بے معنی؟

ہیراجی ۔ دیکھئے نا مرزا صاحب آپ فرماتے ہیں ؎ خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو ۔ اگر مطلب کچھ نہیں تو خط لکھنے کا فائدہ ہی کیا ۔ اور اگر آپ صرف معشوق کے نام کے ہی عاشق ہیں تو تین پیسے کا خط برباد کرنا ہی کیا ضرور، سادہ کاغذ پر اس کا نام لکھ لیجئے ۔

ڈاکٹر قربان حسین خالص ۔ میرے خیال میں اگر یہ شعر اس طرح لکھا جائے تو زیادہ موزوں ہے ۔

خط لکھیں گے کیوں کہ چھٹی ہے ہمیں دفتر سے آج
اور چاہے بھیجنا ہم کو پڑے بیرنگ ہی ۔
پھر بھی تم کو خط لکھیں گے ہم ضرور
چاہے مطلب کچھ نہ ہو ۔
جس طرح سے میری اک اک نظم کا
کچھ بھی تو مطلب نہیں ۔
خط لکھیں گے کیوں کہ الفت ہے ہمیں ۔
میرا مطلب ہے محبت ہے ہمیں ۔
یعنی عاشق ہیں تمہارے نام کے ۔

غالب ۔ یہ تو اس طرح معلوم ہوتا ہے جیسے آپ میرے اس شعر کی ترجمانی کر رہے ہیں :-

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

ہیراجی ۔ جنوں! جنوں کے متعلق مرزا میں نے کچھ عرض کیا ہے اگر اجازت ہو تو کہوں ۔

غالب ۔ ہاں ۔ ہاں بڑے شوق سے ۔

ہیراجی ۔
جنوں ہوا ۔ جنوں ہوا
مگر کہاں ۔ جنوں ہوا
کہاں ہوا ۔ وہ کب ہوا
ابھی ہوا یا اب ہوا
نہیں ہوں میں یہ جانتا
مگر جدید شاعری
میں کہنے کا جو شوق ہے
تو بس یہی ہے وجہ کہ
دماغ میرا چل گیا
یہی سبب ہے جو مجھے
جنوں ہوا جنوں ہوا

غالب ۔ (ہنسی کو روکتے ہوئے) سبحان اللہ کیا برجستہ اشعار ہیں ۔

م ۔ ن ۔ ارشد ۔ اب مرزا غزل کا دوسرا شعر فرمائیے ۔

غالب ۔ میں اب مقطع ہی عرض کروں گا ۔ کہا ہے ؎

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

عبدالحی نگاہ ۔ گستاخی معاف مرزا ۔ اگر اس شعر کا پہلا مصرع اس طرح لکھا جاتا تو ایک بات پیدا ہو جاتی ۔

غالب ۔ کس طرح ؟

عبدالحی نگاہ ۔
عشق نے ۔ ہاں ہاں تمہارے عشق نے
عشق نے مجھے، تمہارے عشق نے
مجھ کو نکما کر دیا ۔
اب نہ اٹھ سکتا ہوں میں
اور چل تو سکتا ہی نہیں
جانے کیا بکتا ہوں میں
یعنی نکما کر دیا ۔
اتنا تمہارے عشق نے
گرتا ہوں اور اٹھتا ہوں میں
اٹھتا ہوں اور گرتا ہوں میں
یعنی تمہارے عشق نے
اتنا نکما کر دیا

غالب ۔ (طنزاً) بہت خوب ۔ بھئی غضب کر دیا ۔

حفیظ احمد حفیظ ۔ اور دوسرا مصرع اس طرح لکھا جا سکتا تھا ۔

جب تک نہ مجھ کو عشق تھا
تب تک مجھے کچھ ہوش تھا
سب کام کر سکتا تھا میں
اور دل میں میرے جوش تھا
اس وقت تھا میں آدمی
اور آدمی تھا کام کا

لیکن تمہارے عشق نے
مجھ کو نکما کر دیا

غالب۔ واللہ۔ کمال ہی تو کر دیا۔ بھئی۔ اب آپ لوگ اپنا اپنا کلام سنائیں

م۔ ن۔ ارشد۔ اب ڈاکٹر قربان حسین خالص جو جدید شاعری کے امام ہیں۔ اپنا کلام سنائیں۔

ڈاکٹر خالص۔ اجی ارشد صاحب میں کیا کہوں۔ اگر میں امام ہوں تو آپ مجتہد ہیں۔ آپ جدید شاعری کی منزل ہیں اور میں سنگ میل اس لئے آپ اپنا کلام پہلے پڑھئے۔

م۔ن۔ارشد۔ توبہ توبہ! اتنی کسر نفسی۔ اچھا اگر آپ مصر ہیں تو میں ہی اپنی نظم پہلے پڑھتا ہوں۔ نظم کا عنوان ہے "بدلہ" عرض کیا ہے۔

آمری جان مرے پاس انگیٹھی کے قریب
جس کی آغوش میں یوں ناچ رہے ہیں شعلے
جس طرح دور کسی دشت کی پہنائی میں
رقص کرتا ہو کوئی بھوت کہ جس کی آنکھیں
کرمِ شب تاب کی مانند چمک اٹھتی ہیں
ایسی تشبیہہ کی لذت سے مگر دور ہے تو
تو کہ اک اجنبی انجان سی عورت ہے جسے
رقص کرنے کے سوا اور نہیں کچھ آتا
اپنے ۔بے کار خدا کے مانند

دوپہر کو جو کبھی بیٹھے ہوئے دفتر میں
خودکشی کا مجھے یک لخت خیال آتا ہے
میں پکار اٹھتا ہوں یہ جینا بھی ہے کیا جینا
اور چپ چاپ دریچے میں سے پھر جھانکتا ہوں

آمری جان میرے پاس انگیٹھی کے قریب
تاکہ میں چوم ہی لوں عارضِ گلفام ترا
اور اربابِ وطن کو یہ اشارہ کر دوں
اس طرح لیتا ہے اغیار سے بدلہ شاعر
اور شبِ عیش گزر جانے پر
بہرِ جمع درم و دام نکل جاتا ہے
ایک بڑھے سے تھکے ماندے سے رہوار کے پاس
چھوڑ کر بستر سنجاب و سمور۔

(نظم سن کر سامعین پر وجد کی حالت طاری ہو جاتی ہے بہزاد یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔ یہ نظم اس صدی کی بہترین نظم ہے۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ اگر ایک طرح سے دیکھا جائے تو اس میں انگیٹھی، بھوت اور دفتر تہذیب و تمدن کی مخصوص الجھنوں کی حامل ہیں)

(حاضرین ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے زیر لب مسکراتے ہیں)

غالب۔ ارشد صاحب معاف کیجئے آپ کی یہ نظم کم از کم میرے فہم سے تو بالاتر ہے۔

غیظ احمد غیظ۔ یہ صرف ارشد پر ہی کیا منحصر ہے۔ مشرق کی جدید شاعری ایک بہت بڑی حد تک مبہم اور ادراک سے بالاتر ہے۔

م۔ن۔ارشد۔ مثلاً میرے ایک دوست کے اس شعر کو لیجئے۔

پاپوش کی کیا فکر ہے دستار سنبھالو
پایاب ہے جو موج گزر جائے گی سر سے

اب فرمائیے۔ اس شعر کا کیا مطلب ہے،

غالب۔ (شعر کو دہرا کر)

پاپوش کی کیا فکر ہے دستار سنبھالو
پایاب ہے جو موج گزر جائے گی سر سے

صاحب۔ سچ تو یہ ہے کہ اگرچہ اس شعر میں سر اور پیر کے الفاظ شامل ہیں مگر باوجود اِن کے اس شعر کا نہ سر ہے نہ پیر۔

م۔ن۔ارشد۔ اجی چھوڑیئے اس حرف گیری کو۔ آپ اس شعر کو سمجھے ہی نہیں۔ مگر خیر اس بحث میں کیا رکھا ہے۔ کیوں نہ اب ڈاکٹر قربان حسین خالص سے درخواست کی جائے کہ اپنا کلام پڑھیں۔

ڈاکٹر خالص۔ میری نظم کا عنوان ہے "عشق" عرض کیا ہے
عشق کیا ہے ؟

میں نے اک عاشق سے پوچھا
اُس نے یوں رو کر کہا
عشق اک طوفان ہے
عشق اک سیلاب ہے
عشق ہے اک زلزلہ
شعلۂ جوالہ — عشق
عشق ہے پیغام موت

غالب ۔ بھئی یہ کیا مذاق ہے۔ نظم پڑھئے مشاعرے میں نثر کا کیا کام؟

ڈاکٹر خالص ۔ (جھنجلا کر) تو آپ کے خیال میں یہ نثر ہے! یہ ہے آپ کی سخن فہمی کا عالم اور فرمایا تھا آپ نے ۔

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

غالب ۔ میری سمجھ میں تو نہیں آیا کہ یہ کس قسم کی نظم ہے۔ نہ ترنم نہ قافیہ۔ نہ ردیف۔

ڈاکٹر خالص ۔ مرزا صاحب۔ یہی تو جدید شاعری کی خصوصیت ہے آپ نے اردو شاعری کو قافیہ اور ردیف کی فولادی زنجیروں میں قید کر رکھا تھا ہم نے اس کے خلاف جہاد کر کے اسے آزاد کیا ہے اور اس طرح اس میں وہ اوصاف پیدا کئے ہیں جو محض خارجی خصوصیات سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ میری مراد رفعتِ تخیل۔ تازگیٔ افکار اور ندرتِ فکر سے ہے۔

غالب ۔ رفعتِ تخیل۔ کیا خوب۔ کیا پرواز ہے ؎

میں نے اک عاشق سے پوچھا 'اس نے یوں رو کر کہا

ڈاکٹر خالص ۔ (چڑ کر) عاشق رو کر نہیں کہے گا تو کیا قہقہہ لگا کر کہے گا؟ مرزا آپ یہ بھی نہیں جانتے کہ عشق اور رونے میں کتنا گہرا تعلق ہے۔

غالب ۔ مگر آپ کو قافیہ اور ردیف ترک کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

رفیق احمد خوگر ۔ اس کی وجہ مغربی شعرا کا تتبع نہیں بلکہ ہماری طبیعت کا فطری میلان ہے۔ جو زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح شعر و ادب میں بھی آزادی کا جویا ہے۔ اس کے علاوہ دورِ جدید کی روح۔ انقلاب۔ کش مکش۔ تحقیق۔ تجسس۔ تعقل پرستی اور جدوجہد ہے ماحول کی اس تبدیلی کا اثر ادب پر بھی ہوا ہے اور میرے اس نکتے کو میتھو آرنلڈ نے بھی اپنی کتاب ونیٹی فیئر میں تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ اسی لئے ہم نے محسوس کیا کہ قدیم شاعری ناقص ہونے کے علاوہ روح میں وہ لطیف کیفیت پیدا نہیں کر سکتی جو مثال کے طور پر ڈاکٹر خالص کی شاعری کا جوہر ہے۔ قدیم شعرا اور جدید شعرا کے ماحول میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ قدیم شعرا بقول مولانا آزاد حسن و عشق کی حدود سے باہر نہ نکل سکے۔ اور ہم جن میدانوں میں گھوڑے دوڑا رہے ہیں نہ اُن کی وسعت کی انتہا ہے اور نہ ان کے عجائب و لطائف کا شمار۔

غالب ۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

م۔ ن۔ ارشد ۔ خوگر صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم ایک نئی دنیا میں رہتے ہیں۔ یہ ریڈیو۔ ہوائی جہاز اور دھماکے سے پھٹنے والے بموں کی دنیا ہے۔ یہ بھوک۔ بے کاری۔ انقلاب اور آزادی کی دنیا ہے اس دنیا میں رہ کر ہم اپنا وقت حسن و عشق گل و بلبل شیریں و فرہاد کے افسانوں میں ضائع نہیں کر سکتے۔ شاعری کے لئے اور بھی موضوعِ سخن ہیں۔ جیسا کہ ہمارے ایک شاعر نے کہا ہے ؎

آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سائے کے تلے
آدم و حوا کی اولاد پر کیا گذری ہے
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی، اجداد پہ کیا گزری ہے۔
یہ حسین کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
یہ ہر اک سمت پُراسرار کڑی دیواریں۔
یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضمون ہوں گے۔

راجہ عہد علی خاں ۔ بہت خوب ؎ یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضمون ہوں گے۔ ایسے ہی مضامین میں سے ایک مضمون "ڈاکخانہ" ہے۔ جو میری اس نظم کا جو میں ابھی آپ کے سامنے پڑھوں گا۔ موضوع ہے۔

غالب ۔ ڈاک خانہ؟

راجہ عہد علی خاں ۔ مرزا اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے سنئے۔ عرض کیا ہے۔

ڈاک خانے کے ہے اندر آج اُف کتنا ہجوم
ڈالنے کو خط کھڑے ہیں کس قدر اُف آدمی۔
اِن میں ہر اک کی تمنا ہے کہ وہ۔
ڈال کر جلدی سے خط یا پارسل۔
بھاگ کر دیکھے کہ اُس کی سائیکل
ہے پڑی باہر جہاں رکھ کر گئے تھے
ڈاک خانے میں ابھی آیا تھا وہ خط ڈالنے۔
جا رہے ہیں خط چہار اطراف کو۔
بمبئی کو۔ مصر کو۔ لندن کو کوہ قاف کو۔
دیکھنا۔ آئی ہے۔ اک عورت لفافہ ڈالنے۔
کون کہتا ہے کہ اک عورت ہے یہ۔
یہ تو لڑکا ہے۔ کسی کالج کا کہ
جس کے بال۔
خد و خال
اس قدر ملتے ہیں عورت سے کہ ہم۔
اس کو عورت کا سمجھتے ہیں بدل۔
اُف ہماری لغزشیں۔
ہے مگر کسی شخص کا یہ سب قصور۔
کیا نظر میری نہیں کرتی ہے کام۔
جھٹپٹا سا ہوگیا ہے شام کا۔
یا ہمارے ہے تمدن کا قصور
کہ ہمارے نوجوان
ڈاک خانے میں ہیں جب آتے لفافہ ڈالنے
اس قدر دیتے ہیں وہ دھوکا ہمیں۔
کہ نظر آتے ہیں ہم کو عورتیں!

(زوروں کی داد دی جاتی ہے۔ ہر طرف سے مرحبا۔ بھئی کمال کر دیا' کے نعرے بلند ہوتے ہیں مرزا غالب کی سراسیمگی ہر لحظہ بڑھتی جا رہی ہے)

م۔ن۔ ارشد۔ اب میں ہندوستان کے مشہور شاعر پروفیسر غیظ سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے تازہ افکار سے ہمیں نوازیں۔

پروفیسر غیظ۔ میں نے تو کوئی نئی چیز نہیں لکھی۔

ہیراجی۔ تو پھر وہی نظم سنا دیجئے جو پچھلے دنوں ریڈیو والوں نے آپ سے لکھوائی تھی۔

پروفیسر غیظ۔ آپ کی مرضی تو وہی سُن لیجئے۔

عنوان ہے۔ لگائی

فون پھر آیا دل زار! نہیں فون نہیں
سائیکل ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات اترنے لگا کھمبوں کا بخار
کمپنی باغ میں لنگڑانے لگے سرد چراغ
تھک گیا رات کو چلا کے ہر اک چوکیدار
گل کرو دامنِ افسردہ کے بوسیدہ داغ
یاد آتا ہے مجھے سرمہ دنبالہ دار
اپنے بے خواب گھروندے ہی کو واپس لوٹو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

(نظم کے دوران میں اکثر مصرعے دو دو چار چار بار پڑھوائے جاتے ہیں اور پروفیسر غیظ بار بار مرزا غالب کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ مرزا غالب مبہوت ہیں)

م۔ن۔ ارشد۔ حضرات میرے خیال میں یہ کوئی عشقیہ نظم نہیں ہے بلکہ اس میں شاعر نے ملک کے اینٹی فاشسٹ جذبے کو خوب نبھایا ہے۔

رفیق احمد۔ (سرگوشی کے انداز میں ہیراجی سے) بکواس ہے!

م۔ن۔ راشد۔ اب ہیراجی اپنا کلام پڑھیں گے۔

ہیراجی۔ میری نظم کا عنوان ہے "بینگن"۔

غالب۔ بینگن؟

ہیراجی۔ بینگن۔ اگر آپ آم کی صفت میں قصیدہ لکھ سکتے ہیں تو کیا بندہ بینگن پر نظم لکھنے کا بھی حقدار نہیں۔

غالب۔ معاف کیجئے گا۔ نظم پڑھئے۔

ہیراجی۔ عرض کیا ہے۔

چنچل بینگن کی چھب نیاری
رنگ میں تم ہو کرشن مراری

جان گئی ہیں سکھیاں پیاری
رادھا رانی آ ہی گئی تو -
کرشن کنہیا ڈھونڈھ رہے ہیں
لیکن میں تو بھول چکا ہوں،
بینگن سے یہ بات چلی تھی
بھوگ لگی ہے کتنی ہائے
جی میں ہے اک بھون کے بینگن
کھاؤں - لیکن رادھا پیاری
رنگ کو اُس کے دیکھ کے مجھ کو
یاد آتے ہیں کرشن مراری
اس لئے بھوکا رہنا بہتر
چونکہ میں ہوں پریم پجاری

(ہر طرف سے داد دی جاتی ہے۔ بعض شعرا یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں بھئی جدید شاعری میرا جی کا ہی حصہ ہے)

م - ن - ارشد - اب جناب بکرما جیت صاحب ورما سے استدعا کی جاتی ہے کہ اپنا کلام سنائیں۔

بکرما جیت ورما - میں نے حسبِ معمول کچھ گیت لکھے ہیں۔

غالب - (حیران ہو کر) شاعر اب گیت لکھ رہے ہیں - میرے اللہ دنیا کدھر جا رہی ہے۔

بکرما جیت ورما - مرزا آپ کے زمانے میں گیت شاعری کی ایک باقاعدہ صنف قرار نہیں دیئے گئے تھے۔ دورِ جدید کے شعرا نے انہیں ایک قابلِ عزت صنف کا درجہ دیا ہے۔

غالب - جی ہاں ہمارے زمانے میں عورتیں۔ بھانڈ - میراسی یا اس قماش کے اور لوگ گیت لکھا کرتے تھے۔

بکرما جیت ورما - پہلا گیت ہے "برہن کا سندیس" عرض کیا ہے۔

اُڑ جا دیس بدیس رے کوتے اڑ جا دیس بدیس۔
سن کر تیری کائیں کائیں

غالب - خوب - سُن کر تیری کائیں کائیں!

بکرما جیت ورما - عرض کیا ہے۔

سن کر تیری کائیں کائیں
آنکھوں میں آنسو بھر آئیں
بول یہ تیرے من کو بھائیں
مت جانا پردیس رے کوتے اڑ جا دیس بدیس،

م - ن - ارشد - بھئی اچھوتا خیال ہے۔ پنڈت صاحب میرے خیال میں ایک گیت آپ نے کبوتر پر بھی لکھا تھا۔ وہ بھی مرزا کو سنا دیجئے۔

بکرما جیت ورما - سنئے پہلا بند ہے۔

بول کبوتر بول!
دیکھ کوئلیا کوک رہی ہے
من میں میرے ہوک اٹھی ہے
کیا تجھ کو بھی بھوک لگی ہے؟
بول غٹرغوں بول - کبوتر
بول کبوتر - بول۔

باقی شعرا - (یک زبان ہو کر) بول کبوتر - بول کبوتر - بول کبوتر - بول۔

(اس اثنا میں مرزا غالب نہایت گھبراہٹ اور سراسیمگی کی حالت میں دروازے کی طرف دیکھتے ہیں)

بکرما جیت ورما - اب دوسرا بند سنئے۔

بول کبوتر بول
کیا میرا ساجن کہتا ہے
کیوں مجھ سے روٹھا رہتا ہے
کیوں میرے طعنے سہتا ہے
بھید یہ سارے کھول کبوتر
بول کبوتر بول

باقی شعرا (یک زبان ہو کر) بول کبوتر - بول کبوتر - بول۔

(اس شور و غل کی تاب نہ لا کر مرزا غالب بھاگ کر کمرے سے باہر نکل جاتے ہیں)

کنہیا لال کپور ایم - اے

ہمارا بہرہ

کانگریسیوں کو انگریزوں سے شکایت ہے کہ ہندوستان کو آزادی سے محروم کر دیا۔ مسلم لیگ شاکی ہے کہ ہماری حکومت چھین لی۔ گاندھی جی کا کہنا ہے کہ ہندوستان کی صنعت کو برباد کر دیا۔ کمیونسٹ کہتے ہیں کہ مزدور کو لوٹ لیا۔ لیکن انگریزی حکومت کے سب سے بڑے ظلم کا کوئی بھی شاکی نہیں! یعنی اس نے ہندوستان میں دو ایسی مکروہ چیزیں پیدا کیں جو دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں۔ یعنی آیا اور بہرا۔ مشرق کی تہذیب کو مغرب کے تصادم سے جو نقصان پہنچا یہ ان کی زندہ مثال ہیں۔ ان کی ذہنیت ان کی زبان ان کی طرزِ معاشرت۔ ان کا نقطۂ نگاہ پکار پکار کر اس بات کی فریاد کر رہا ہے کہ دیکھو مغرب نے مشرق کے ساتھ کیا کیا۔ آپ کہیں گی میں مبالغہ کر رہی ہوں نہیں جناب! آپ نے شاید کبھی اس مضحکہ خیز ہستی یعنی "بیرا" کی ذہنیت اور گفتگو کے نقطۂ نگاہ پر غور نہیں فرمایا میں آپ کی خدمت میں اس طبقے کے ایک فرد کی تصویر پیش کرتی ہوں اس کو پڑھئے اور فیصلہ کیجئے کہ میرا یہ کہنا صحیح ہے یا غلط کہ سب سے بڑا ظلم ہندوستان پر ان ہستیوں کی تخلیق ہے۔

کچھ روز ہوئے مجھ کو ایک اصل نسل بہرا دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ میں نے اس سے قبل بھی اس قسم کی مخلوق کو دیکھا ہے مگر چند روز بعد ہی مغرب کی تہذیب کی یہ پیداوار میرے گھر کے مشرقی ماحول میں نہ پنپ سکنے کی وجہ سے رخصت کر دی جاتی تھی لیکن آج کل دہلی میں نوکروں کی قلت کی وجہ سے مجھے اس دفعہ اُسے پورے دو مہینے رکھنا پڑا۔

ہمارا بہرہ "بہریت" کی مکمل تصویر تھا مغربیت اس کی رگ رگ میں پیوست ہو چکی تھی۔ اس نے بڑی کوششوں سے صاحبوں کے رہنے کے طور طریقے سیکھے تھے اور مجھے یقین ہے کہ میرے یہاں کے نیٹو پن سے بے چارے کے جذبات سخت مجروح ہوئے ہوں گے اور دنیا کی نیرنگی پر اپنے دل میں حیران ہوگا کہ نئی دہلی میں رہنے والے آئی سی ایس کہلانے والے لوگ اور ایسے نیٹو ع محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔

پہلا دھچکا جو اس بے چارے کی مغرب پسند طبیعت کو میرے یہاں لگا وہ یہ تھا کہ جب اس نے رات کے کھانے کے بعد نہایت ادب سے جھک کر اپنے سر کو میرے صاحب کے کانوں کے قریب لا کر پوچھا "پلنگ چائے کے بجے مانگتا؟" اور اس کا جواب اسے یہ ملا کہ ہم لوگ "پلنگ چا" سرے سے پیتے ہی نہیں تو اس کو یقین نہ آتا تھا کہ اُس نے صحیح سُنا۔ "کچھ فروٹ بسکٹ مانگتا" اس نے پھر لڑکھڑائی ہوئی زبان میں پوچھا "نہیں کچھ بھی نہیں" جواب سُن کر اس نے ذرا دیر بعد اپنے دل کو قابو میں لا کر پھر پوچھا "چھوٹا حاضری کے بجے مانگتا؟" ہم نے جواب دیا "ہم لوگ ناشتہ صبح ۸ بجے کیا کرتے ہیں" اس نیٹو جواب کو سُن کر اس بیچارے نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ہمیں سلام کیا اور یہ سوچتا ہوا کہ میں کیسے جنگلیوں میں آپھنسا کمرے سے چلا گیا۔

لیکن یہ اس کی ناکامیوں کی ابتدا تھی۔ دو مہینے اس نے ہمارے گھر میں وہ وہ رنج اٹھائے کہ اس کا دل چھلنی ہو گیا ہوگا۔ دوسرے ہی دن صبح کو اس نے چائے دان میز پر رکھتے ہوئے اُن سے پھر کانا پھوسی کی "انڈا کیسا مانگتا ساب؟" انہوں نے 'اخبار پڑھتے ہوئے سرسری طور سے کہا "خاگینہ" بے چارا بھونچکا ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا "خاگینہ نہیں جانتے؟ انڈے کو توڑ کر پیاز کتر کتر۔ . . . ." ابھی میں جملہ ختم بھی نہ کرنے پائی تھی کہ اس نے کہا "ہم ہندوستانی برتن نہیں جانتا، انگریزی برتن بنا سکتا" میں نے کہا "اچھا انڈا تل لاؤ" وہ ہنوز کھڑا تھا، میں نے دوبارہ کہا "انڈے تل لاؤ" میں نے دیکھا وہ اپنے دماغ پر بہت زور دے رہا ہے کہ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں نے چڑ کر کہا "جاؤ انڈا فرائی کر لاؤ" انگریزی لفظ سنتے ہی اُس کے جان میں جان آگئی وہ سرعت کے ساتھ کھانے کے کمرے سے باہر چلا گیا۔

روزانہ یہی تماشا ہوتا تھا اور ہمارے نیٹو پن سے بچارے کو رنج پر رنج پہنچتا رہتا تھا ادھر ہم اس کی انگریزیت سے جل جل کر کوئلہ ہو ہو جاتے تھے۔ جتنے دن وہ رہا گھر کی فضا ویسی ہی تھی جیسے یورپ کی فضا "کرائسس" کے زمانے میں۔

میری کمزوریوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میں اُردو کو قتل ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ میں کسی کو دہلی کی کوثر سے دُھلی بامحاورہ چٹخارہ دار زبان' بولتے سنتی ہوں تو دل چاہتا ہے کہ گھنٹوں سنتی رہوں چاہے گفتگو کا مقصد کچھ ہو یا نہ ہو۔ اسی طرح

کسی کو اُردو کو توڑ مروڑ کر بولتے سنتی ہوں تو دل چاہتا ہے کہ اس کا گلا گھونٹ دوں۔ دو تین دن تک تو میں ایسے جملے سنتی رہی اور برداشت کرتی رہی:۔ "آپ کو ٹیلی فون پر منگتا۔" "چائے آپ کے بجے لے گا" "بابا لوگ کا سُپر میز پر ہے" "فلاں نے آپ کو سلام دیا ہے" لیکن تیسرے دن تو میں نے ٹوک ہی دیا۔ "بہرا تم مراد آباد کے رہنے والے ہو کر ایسی زبان بولتے ہو۔ تمہاری بیوی تو بہت صاف اردو بولتی ہے تم کیوں نہیں ویسی باتیں کرتے ہو؟" "ہم چھوٹا وقت سے صاب لوگ کے ہاں کام کیا اس لئے ایسا بولتا" میں نے کہا "انگریز کے ہاں کام کرنے کی وجہ سے زبان خراب ہونے کی تو کوئی وجہ نہیں بہرحال اب تو ہندوستانی کے یہاں ہو اس لئے ہم سے تو ایسی بولی مت بولا کرو۔" بے چارے نے خون کے گھونٹ کی طرح اس حکم کو پی لیا اور ایک آدھ دفعہ کوشش بھی کی کہ سیدھی طرح بولے لیکن اس کی گھٹی میں انگریزیت پڑی ہوئی تھی وہ کہاں سے جاتی۔ "چائے لے گا" کے بدلے اس نے دو ایک دفعہ ہمت کر کے "آپ چائے کس وقت پئیں گی" تو کہہ لیا اس کے علاوہ اس کی مغرب زدہ طبیعت اور کوئی ترمیم اپنے طرزِ گفتگو میں برداشت نہ کر سکی۔

کھانا کھلاتے وقت بے چارے کو سخت تکلیف ہوتی تھی۔ اگر انگریزی کھانا ہوتا تو وہ بڑی خوشی سے کھلاتا تھا لیکن ہندوستانی کھانا ہوتا تو اس کو سخت تکلیف ہوتی تھی اول تو اُسے یہ طریقہ ہی معلوم نہ تھا یا کم از کم اس بات کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ جانتا ہے کہ ہندوستانی کھانا کس طرح کھایا جاتا ہے۔ اس لئے وہ روٹی۔ سالن ہر چیز کے بعد لایا کرتا۔ اور جہاں ہم نے دو نوالے کھائے کہ پلیٹ غائب! اور نوالہ ہاتھ کا ہاتھ میں!! بھلا آپ غور فرمائیے وہ بغیر پلیٹ بدلے کھانا کھلانا کس طرح گوارا کر سکتا تھا۔ اس کو سب سے زیادہ رنج ہمارے فنگر بول میں ہاتھ نہ ڈالنے سے ہوتا تھا۔ وہ روزانہ ڈیوٹی لگا لگا کر فنگر بول میز پر لاتا اور ہم کہتے نہیں آفتابہ چلمچی اٹھا لاؤ۔ آفتابہ چلمچی جیسی چیزوں کا چھونا بھی اس کے لئے کسرِ شان تھا اور آفتابہ سے پانی ڈالنا تو اس کو دو مہینے میں آیا ہی نہیں۔

لیکن اس کی زندگی کا شاید سب سے تاریک دن وہ تھا جب میں نے اس کی توجہ پاندان کی صفائی کی طرف کروائی اور جس وقت لوگ ملنے آتے اور وہ نہایت مؤدبانہ طریقے سے پوچھتا "پینے کے واسطے کیا لائے گا حضور" اور میں اُس سے پاندان منگواتی تو اس کا دل بیٹھ جاتا۔ اُف نئی دہلی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر پان کھایا جائے "بوم نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب" کا معاملہ نہیں تو کیا ہے۔

اور جس دن اُس نے ایک کرنل کی وردی میں ملبوس دوست کو اپنے ہاتھوں سے پان لگا کر کھاتے دیکھا۔ شاید اس روز اس کو قربِ قیامت کا یقین آگیا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اس کو یقین نہیں آتا تھا کہ وہ جاگ رہا ہے یا خواب دیکھ رہا ہے ہمیں تو اس نے شاید عجیب الخلقت سمجھ کر صبر کر لیا تھا لیکن ہمارے ہاں کے مہمان بھی ایسے ہی نکلے اور نہ صرف یہ بلکہ جو بھی ہمارے یہاں ملنے آتا تھا وہ اسی رنگ میں رنگا ہوتا تھا اور ہمارے یہاں ڈنر پارٹیز بھی اس کے لئے رنج دہ ہوتی تھیں آنے والوں میں ایک بھی ڈنر جیکٹ میں نہ ہوتا تھا۔ ایک یہی نہیں! انگریز تک بغیر ڈنر جیکٹ کے ہوتے تھے اور ہندوستانی کھانا شوق سے مانگ مانگ کر کھاتے تھے اور ہائے غضب ان انگریزوں کے آگے بھی ہم اپنی نیٹوپن سے شرمایا نہیں کرتے تھے اور جیسے ہی ہندوستانی کھانا پیش ہوتا۔ ہاتھ سے کھانا شروع کر دیتے تھے اور کھانے کے بعد پان کھاتے۔ ہمارے نیٹوپن سے اُسے ندامت سے عرق عرق ہونا پڑتا تھا۔ اور ہمارے یہاں کیسے کیسے نیٹووں کی پاس کو خاطر کرنی پڑتی! برقع پوش عورتیں، مولوی، منشی، بزرگ۔ کھدر پوش حضرات! اور مزہ تو یہ ہے کہ نئے فیشن کے لوگوں کی نسبت ان کی دُگنی خاطر تواضع ہوتی تھی دروازے تک جا کر ان کا خیر مقدم کیا جاتا تھا اور گاڑی تک جا کر ان کو سوار کرایا جاتا تھا اس بے خبر کو کیا معلوم کہ سیدھے سادے لباس میں ہندوستان کی کیسی کیسی مقتدر ہستیاں ہوتی تھیں۔

غرض اس کی انگریزیت سے ہم بیزار اور ہمارے نیٹوپن سے وہ نالاں جتنی دفعہ وہ "آپ کو ٹیلی فون پر مانگتا" کہتا میرا خون کھول جاتا اور جتنی دفعہ اُسے پاندان اٹھا کر لانا پڑتا اس کے دل پر سانپ لوٹ جاتا بھلا دیکھئے تو سہی جن ہاتھوں نے کاک ٹیلز کے ٹرے اٹھائے ہوں شیری کے گلاس دھوئے ہوں وہ پاندان اٹھائیں!! آفتابہ چلمچی چھوئیں!! آخر ایک روز میرے صبر کا پیمانہ چھلک ہی گیا۔ اور یہ اس طرح کہ ان بہرا صاحب نے ایک دھوبی کی سفارش ہم سے ان لفظوں میں کی۔ "حضور بہت اچھا کپڑا دھوتا ہے۔ برابر صاحب لوگ کے کام کیا کبھی کالے آدمی کے کام نہیں کیا۔" میں نے کہا بہت اچھا اس اب بھی اس شرف کے کھونے کی مزہ بات نہیں تم بھی یہ ذلت کیوں اٹھاؤ۔ اس سے آج ہی کے دن کا حساب کر لو۔

لیکن سچ پوچھئے تو ان بے چاروں پر ہماری خفگی فضول ہے ان کا مضحکہ اڑانا بے جا۔ ان کا کیا قصور۔ قصور اس ماحول کا ہے جو غلام قوم کے ملک میں پیدا ہو جاتا ہے اور یہ ماحول لازمی طور پر ایسی ذہنیت کی تخلیق کرتا ہے۔

شائستہ اختر سہروردی

"عصمت"

ہندی کے رستے میں بڑی رکاوٹیں

اِس عنوان سے ڈاکٹر دھریندر ورما نے ایک مفصل مضمون جولائی کے ہنس میں لکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف الہ آباد یونیورسٹی میں شعبۂ ہندی کے صدر ہیں۔ جو حالت انہوں نے ہندی سے متعلق اپنے صوبے کی اور عام لوگوں کی دیکھی اسی بنا پر انہوں نے یہ مضمون لکھا۔ ان کے مضمون کا تجزیہ یوں ہوتا ہے :۔

(۱) "انگریزیہ ہندی" (۲) "اُردو واں ہندی" (۳) وہ لوگ جو دوسرے صوبوں سے ہندی صوبے میں آ کر بس گئے مگر ہندی سے ہمدردی نہیں رکھتے (۴) ہندی بولنے والا صوبہ غیر معین ہے (۵) حقیقی ضروریات اور ممکنات کا احساس نہ ہونا۔ وغیرہ

شکایت ہے کہ تعلیم کا ذریعہ انگریزی ہے جو نفسیات اور فطرت کے خلاف ہے اس بارے میں گاندھی جی نے جو ابھی بنارس کی ہندو یونیورسٹی میں فرمایا۔ یاد رکھنے کے قابل ہے۔

۲۔ ڈاکٹر صاحب کو ایک شکایت یہ بھی ہے کہ ہندی کے صوبے میں عدالت کی زبان اُردو کیوں ہے اور فرماتے ہیں "کچھ ہندوؤں کی ساہتیک (ادبی) بھاشا بھی ابھی تک اُردو ہے" پچھمی یو۔پی میں اور دلّی میں اونچی سوسائٹی میں اُردو کا ہی چلن ہے۔ ہندی علاقے کے بڑے آدمیوں میں ایسے لوگ ہندوؤں میں بھی ابھی بہت ملتے ہیں جن کی تعلیم الف۔ بے سے شروع ہوئی تھی۔ دیوناگری سے نہیں۔ یہ لوگ دلّی اور یو۔پی کے پچھمی علاقوں میں بے شمار پائے جاتے ہیں۔ ان کی ہمدردی کا میلان قدرتی طور پر اُردو کی طرف ہو جاتا ہے۔

۳۔ پھر ان لوگوں کو ہندی کے رستے میں رکاوٹ بتایا گیا ہے جو دوسرے صوبوں سے آ کر بس گئے مگر انہوں نے ہندی سے واسطہ نہ رکھا اور اپنی ہی زبان مثلاً مرہٹی۔ بنگالی۔ تامل وغیرہ رکھی۔

۴۔ ایک اور شکایت ان کو یہ ہے کہ : "ہندی پرانت کی سیما کا نشچت نہ ہونا" یعنی تحقیقی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ ہندی کس صوبے کی زبان ہے۔

۵۔ پھر وہ شاکی ہیں کہ اہل نقاد اور خرابیاں پیدا کرتے ہیں اور یہ کہ حقیقی ضروریات اور ممکنات کا احساس نہ ہونا بھی ہندی کے راستے میں بڑی رکاوٹ ہے

آپ نے دیکھا کہ جہاں تک صورت حال کا تعلق ہے ڈاکٹر دھریندر صاحب کا مشاہدہ کتنا صحیح ہے۔ اب یہ معامرِ ہندی اور دوسرے غل مچانے والوں کا فرض ہے کہ یا تو اُن باتوں کی تردید کریں جو زیر نظر مضمون میں لکھی گئی ہیں۔ یا راشٹر بھاشا اور سنسکرتی ہندی کے جنونی جذبات اپنے سر سے نکال کر وہ کام کریں جو سب امور پر نظر رکھ کر انہیں کرنا چاہیئے۔

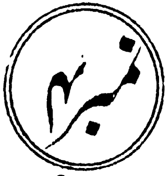
جب کل ہند ہندی کے حامی نہیں تو ہندی راشٹر بھاشا کیوں کر ہو سکتی ہے جب ہندی پرانت کی حدیں ہی قائم نہیں ہو سکی ہیں تو ہندستان کا کوئی صوبہ بھی ہندی کا صوبہ نہیں کہا جا سکتا جب آدھا یو۔پی یا اس کا بڑا حصہ اُردو میں تعلیم شروع کرتا ہے۔ اُردو وکیل اور عدالتیں اُردو کے ساتھ ترجیحی سلوک کرتی ہیں مختصر یہ کہ ان صورتوں میں اردو کو غیر ملکی اور مسلمانی چیز بتانا ظاہر ہے کہ معقولیت سے کس قدر دُور ہے۔ جگ ہنسائی کی بات رہنے دیجئے انسان کو معقولیت اور ذمہ داری کا کچھ خیال اور احساس ہونا چاہیئے سخت کلامی اور ہٹ دھرمی سے اچھا نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔

"ہماری زبان"

سید عبد اللطیف پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس جمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ ہمایوں ۲۲۔ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔ صرف سرورق لفٹون پریس رام نگر لاہور میں چھپا۔



فہرست مضامین



"ہمایوں" بابت ماہِ اکتوبر ۱۹۴۲ء

ضروری اطلاع:- جواب طلب اُمور کے لئے اپنا پتا لکھ کر جوابی کارڈ اور مضامین کے ساتھ ان کی رسید کی اطلاع یا واپسی کے لئے اپنا پتا لکھ کر ٹکٹ لگا لفافہ بھیجنا بہت ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر دفترِ ہمایوں خط و کتابت کا ذمہ وار نہ ہوگا اور ناقابلِ اشاعت مضامین بیرنگ واپس کئے جائیں گے۔

چندہ سالانہ ۵ ششماہی ۳ (مع محصول) — قیمت فی پرچہ ۸ر

جہاں نما

ایک صدی قبل کے دہلوی اخبارات

ڈاکٹر آئی۔ ایچ قریشی نے "انڈین ہسٹاریکل ریکرڈز کمیشن" کے سامنے ایک مضمون پڑھا جس میں انہوں نے بتایا کہ اب سے سو سال پہلے دہلی سے دو ہفتہ وار اخبارات شائع ہوتے تھے۔ ان اخبارات کی ہر اشاعت میں مغل شہنشاہ بہادر شاہ کی غزلیں تقریباً مسلسل چھپتی تھیں۔ اس کے علاوہ ان میں بادشاہ کے روزمرہ کے مشاغل کی تفصیل بھی درج ہوتی تھی۔ ان اخبارات کے مطالعے سے اُس زمانے کے معاشری حالات پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔ قلعۂ معلّی سے بادشاہ کی صحت اور روزانہ مصروفیات کے متعلق ہر ہفتے ایک اطلاع نامہ شائع کیا جاتا تھا۔ دونوں اخبارات میں اس کی اشاعت کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ یہ اطلاعات بہت نتیجہ خیز ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مغلیہ دربار جس کے شکوہ و شان کی کبھی دنیا میں مثال موجود نہ تھی اگرچہ روبہ زوال ہو رہا تھا، مگر بہادر شاہ ناسازگار حالات کے باوجود اس دربار کی قدیم عظمت و شوکت کو برقرار رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اخبارِ دہلی" بہت قابلیت سے مرتب کیا جاتا تھا۔ اس کی غیر جانب دارانہ تنقید کا معیار بہت بلند تھا۔ زبان سلیس اور بامحاورہ تھی جیسی اُس زمانے میں دہلی میں بولی جاتی تھی۔ یہ اخبار بہت اچھے کاغذ پر چھپتا تھا۔

ڈاکٹر قریشی نے سر جان ٹامسن سابق چیف کمشنر دہلی سے اس اخبار کے بعض پرانے پرچے لے کر پڑھے۔ یہ پرچے جون ۱۸۳۷ء سے لے کر فروری ۱۸۳۹ء تک کی تاریخوں کے تھے۔ ان اشاعتوں میں جو بڑے بڑے واقعات درج ہیں اُن میں شہنشاہ اکبر ثانی کے انتقال، بہادر شاہ کی تخت نشینی، انگریزی کمانڈر ان چیف اور گورنر جنرل کی آمد کی اطلاعات خاص طور پر اہم ہیں۔ ان واقعات اور ان کی متعلقہ تقریبات کی نہایت جزوی تفصیلات ان پرچوں میں درج کی گئی ہیں۔ ڈاکٹر قریشی کا بیان ہے کہ چیف کمشنر کے مجموعے کے جو پرچے میں نے دیکھے اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہادر شاہ کی تخت نشینی کے بعد "اخبارِ دہلی" کے ہر پرچے میں شہنشاہ کی ایک غزل ضرور شائع ہوتی تھی۔ شہنشاہ اعلےٰ درجے کا شاعر تھا۔ اس کے پُر درد اشعار میں دنیا کی بے حاصلی و بے ثباتی کی تصویریں نظر آتی ہیں جو اُس عہد کی دہلی کے حالات سے پوری مطابقت رکھتی ہیں۔ کبھی کبھی اس اخبار میں ذوق کی غزلیں بھی چھپتی تھیں جو ملک الشعراء اور استادِ شاہ تھا لیکن اُردو کے سب سے بڑے شاعر غالب کی غزلوں سے بے توجہی برتی جاتی تھی۔ اس اخبار میں بے اختیار اور برائے نام شہنشاہ کا ذکر جس محبت اور عزت سے لیا جاتا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے لوگ اُسے اپنی گزشتہ عظمت و شوکت کا نشان سمجھتے تھے۔

"اخبارِ دہلی" بہت باخبر اخبار تھا۔ ہندوستانی اور غیر ملکی معاملات کے متعلق اس کی آراء صائب معلوم ہوتی ہیں۔ یہ اخبار ہندوستانی ریاستوں کے معاملات میں بھی بہت دلچسپی لیتا تھا۔ اس نے بیگم سمرو کی حکومت پر غریبوں کا خون چوسنے اور جبر و تعدی روا رکھنے کا الزام لگایا اور اس الزام کو اعداد و شمار اور واقعات سے ثابت کیا۔

اس اخبار نے انگریزی حکومت کی بعض کارروائیوں پر بھی بہت متین انداز میں نکتہ چینی کی اور حکومت کو بعض ایسے احساساتِ بے اطمینانی کی طرف توجہ دلائی جو بالآخر ۱۸۵۷ء میں بہت جلی ہو کر نظروں کے سامنے آئے۔

اسی اخبار سے دہلی میں انگریزوں کی معاشرتی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ شام کے وقت بجروں میں سیر کشتی چلانا

اور شکار کھیلنا اُن کی بڑی بڑی تفریحات تھیں۔ پارٹیاں دینے کی رسم عام تھی۔ کبھی کبھی نٹ اور مداری آکر تفریح کا سامان پیدا کر دیتے تھے۔ سکنر اور ہندوراؤ یوروپین لوگوں کی معاشری سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیتے تھے اور دونوں بہت پیش پیش تھے۔

دوسرا اخبار "نورِ مشرقی" چار صفحوں پر چھپتا تھا۔ اس پر دبیز بادامی کاغذ استعمال ہوتا تھا اور ہر صفحہ دو کالموں میں منقسم تھا۔ اس کی قیمت ایک آنہ فی پرچہ تھی اور اشتہارات کی اُجرت ایک آنہ فی سطر فی بار مقرر تھی۔ اشتہارات بہت کم درج ہوتے تھے۔ یہ اخبار جمعہ کے دن شائع ہوتا تھا اور جلد ۱ کا نمبر ۲۷ بتاریخ ۲۴ر فروری ۱۸۴۴ء چھپا۔

اِس اخبار میں مقامی خبروں کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ دربار کی سازشوں اور بازار کی لڑائیوں کے حالات سے اِس کے کالم بھرے ہوتے تھے۔ بیرونی خبروں میں صرف ٹرکی، ایران اور حیدرآباد کے واقعات کو اہمیت دی جاتی تھی۔ دوسرے ممالک کے حالات کے اندراج میں بہت اختصار سے کام لیا جاتا تھا۔ البتہ بعد کے پرچوں میں جن میں سے ڈاکٹر قریشی کے پاس ستمبر اور اکتوبر ۱۸۵۴ء کے پرچے موجود ہیں بیرونی خبروں کی طرف کچھ توجہ دی جانے لگی۔ چنانچہ وسطِ ایشیا اور مشرقِ ادنیٰ میں روس کی سرگرمیوں کے علاوہ افغانی سیاسیات اور ہندوستان کی سرحد کے واقعات کا خاص طور پر جائزہ لیا جاتا تھا۔

اِس اخبار کی زبان بھی اچھی مگر کسی قدر پرانی تھی۔ اس میں جگہ جگہ اُردو اور فارسی کے اشعار کے حوالے دیئے جاتے تھے اور جابجا انگریزی کے الفاظ کا استعمال بھی کیا جاتا تھا۔ اس کے بہت سے پرچوں میں اپنے ایک ہمعصر حریف "نورِ مغربی" پر حملے کئے گئے ہیں۔ چونکہ ان دونوں اخبارات میں سے ایک کا نام "نورِ مشرقی" اور دوسرے کا نام "نورِ مغربی" ہے اس لئے ممکن ہے کہ اِن میں سے کوئی ایک محض دوسرے کے جواب میں شائع کیا گیا ہو۔

اشاعتِ کتب پر جنگ کا اثر

ذیل کے نقشۂ اعداد و شمار سے معلوم ہوگا کہ جنگ نے دنیا کے دو بڑے ممالک انگلستان اور ریاستہائے متحدہ امریکہ میں کتابوں کی اشاعت پر کیا اثر ڈالا ہے۔ نقشۂ متعلقہ انگلستان سے ۱۹۳۷-۴۱ء تک پانچ برس کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے نقشے سے جو امریکہ کے متعلق ہے صرف سنہ ۱۹۴۱ء کا حال معلوم ہوتا ہے۔

انگلستان

	سنہ ۱۹۳۷ء	سنہ ۱۹۳۸ء	سنہ ۱۹۳۹ء	سنہ ۱۹۴۰ء	سنہ ۱۹۴۱ء
کل شائع شدہ کتابیں	۱۷۱۳۷	۱۶۲۱۹	۱۴۹۰۴	۱۱۰۵۳	۷۵۸۱
نئے ایڈیشن اور اشاعتِ ثانی	۵۸۱۰	۵۳۰۷	۴۴۹۳	۳۵۳۰	۲۳۲۶
ترجمے	۴۳۴	۳۶۵	۳۰۵	۱۶۸	۱۳۱
اعلیٰ ایڈیشن	۷۱	۱۱۷	۳۸	۳۲	۳۸
سوانح عمریاں	۷۸۹	۸۵۵	۶۸۹	۴۴۴	۳۵۶
تعلیمی کتابیں	۱۳۳۷	۱۳۴۱	۱۳۵۰	۶۵۸	۳۴۰
مضامین اور ادبِ لطیف	۴۶۲	۳۶۰	۲۹۸	۲۵۲	۱۱۲
ناول اور افسانے	۵۰۹۷	۴۶۸۷	۴۲۲۲	۳۷۹۱	۲۳۴۲
شعر اور ڈراما	۵۶۹	۵۲۹	۵۳۵	۳۱۰	۲۸۶
سیاسیات۔ اقتصادیات و مسائلِ وقت	۶۳۳	۶۸۳	۷۰۴	۵۵۱	۵۵۶

امریکہ

۱۹۴۱ء میں امریکی کتابوں کی اشاعت :—

۱۹۴۱ء میں امریکہ میں شائع شدہ نئی کتابوں اور نئے ایڈیشنوں کی کل تعداد ۱۱۱۱۲ تھی۔ اس عدد میں بہ مقابلہ ۱۹۴۰ء ۲۱۶ کتابوں کی کمی ہے جن کتابوں کی اشاعت میں اضافہ ہوا اُن کی تفصیل یہ ہے :—

کتب متعلقۂ فنونِ مختلفہ (۱۳۰ +) شعر اور ڈراما (۸۵ +) خانہ داری (۳۲ +) فنونِ لطیفہ (۳۲ +)

جن کتابوں کی اشاعت میں کمی ہوئی اُن کی تفصیل یہ ہے :—

مذہبی کتابیں (۱۷۹ -) تاریخ (۱۰۰ -) سوانح عمریاں (۴۸ -)

نئے ایڈیشنوں کی کل میزان ۱۹۴۱ء میں ۱۷۷۵ اور ۱۹۴۰ء میں ۱۸۱۳ تھی۔

برطانیہ میں روسی کتابوں کی تبلیغ و اشاعت

موجودہ جنگ نے دشمنوں کو دوست اور دوستوں کو دشمن بنا دیا ہے۔ جب تک جرمنی اور روس کی جنگ نہیں چھڑی تھی برطانیہ میں روس کے خلاف سخت نفرت پھیلی ہوئی تھی۔ حکومت کے پروپیگنڈا کی کل بھی پوری طرح روس کے سیاسی عقائد کے خلاف تبلیغ و اشاعت میں مصروف تھی۔

جرمنی کے خلاف روس کے اعلانِ جنگ سے حالات نے ایسا حیرت انگیز پلٹا کھایا کہ اب انگلستان نے نہ صرف روس کو مع اُس کے تمام سیاسی عقائد کے برداشت کر لیا ہے بلکہ وہ اُس کی حمایت کے لئے سینہ سپر ہے اور ہر طرح سے اُس کی تالیفِ قلب کی کوشش کر رہا ہے۔

اسی تالیفِ قلب کے سلسلے میں لنڈن سے یہ تعجب انگیز اطلاع آئی ہے کہ انگلستان کے بورڈ آف ایجوکیشن نے سوویٹ یونین کے متعلق چالیس کتابوں کی ایک فہرست مرتب کی ہے جو انگلستان کے مدارس میں اس غرض سے پڑھائی جائیں گی کہ اُس ملک میں سوویٹ روس کے حالات کے متعلق عام واقفیت پیدا ہو جائے۔

بورڈ آف ایجوکیشن نے اساتذہ کی امداد کے لئے سوویٹ روس کے متعلق ایک نصابِ تعلیم بھی مقرر کر دیا ہے۔ اس نصاب کا مقصد یہ ہے کہ انگلستان کے طلبہ مختلف شعبوں میں روس کی ترقیوں کا مطالعہ کر سکیں اور دونوں قوموں کو یہ موقع ملے کہ وہ ایک دوسری کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔

بورڈ آف ایجوکیشن کی مرتبہ فہرست کے آغاز میں روسی سفیر ایم میسکی کی ایک تقریر دیباچے کے طور پر درج کی گئی ہے۔

بہ بیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بہ کجا

روسی اخبارات

سوویٹ یونین میں کل نو ہزار اخبارات' ستر مختلف زبانوں میں چھپتے ہیں ہٹلر کے حملے سے پہلے ان اخبارات کی مجموعی اشاعت تین کروڑ اسی لاکھ تھی۔
زار کے زمانے میں (۱۹۱۳ء) روسی اخبارات کی کل تعداد آٹھ سو انسٹھ تھی اور ان کی روزانہ اشاعت کل ستائیس لاکھ تھی۔
اخبارات کی اشاعت کے متعلق یہ اعداد بہت نتیجہ خیز ہیں۔ علاوہ دوسری باتوں کے ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ روس نے سرمایہ دارانہ نظام کا قلع قمع کرنے کے بعد تعلیم میں کتنی حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ بعض روسی اخبارات کی اشاعت حسبِ ذیل ہے :—

ازویسٹیا	۱۵ لاکھ
(کمیونسٹ پارٹی) پراودا	۲۲ لاکھ
(نوجوانوں کا اخبار) کامسومالسکایا پراودا	۷ لاکھ
(بچوں کا اخبار) پائونیرسکاو پراودا	۸ لاکھ پچاس ہزار

(حامد علی خاں)

ہندوستان کی تاریخ پر ایک سرسری نظر

(۳)
انگریزوں کا عہد
(سنہ ۱۹۱۹ء تک)

ہندوستان میں انگریزوں کا داخلہ آریاؤں اور مسلمانوں سے بالکل مختلف تھا۔ آریا اور مسلمان تو دونوں ہتھیار باندھے اور تلوار کھینچے یہاں آئے وہ کھلم کھلا حملہ آور ہوئے اور کھلم کھلا حاکم بنے لیکن انگریزوں پر پنجابی کی وہ مثل خوب صادق آتی ہے کہ آگ لینے آئی اور گھر والی بن بیٹھی۔ لین دین کرنے آئے اور تعلقات کا ایسا جال پھیلایا کہ پھر کوئی اس جال سے چھوٹ نہ سکا۔

لیکن سچ یہ ہے کہ شروع سے ان سفید لوگوں کا نہ دل سیاہ تھا نہ نیت ہی بری تھی گو ایک انگریز مورخ کا یہ کہنا بھی کہ ہندوستان میں برطانوی سلطنت محض ایک حادثہ کی طرح وقوع میں آئی واقعات سے بعید ہے۔ یہ لوگ تاجر بن کر آئے مگر جب انہوں نے مرکزی سلطنت کو کمزور ہوتے پایا اور یہاں کے لوگوں کو دن رات آپس میں لڑتے بھڑتے دیکھا تو انہوں نے لگائی بجھائی شروع کر دی اور اپنا مطلب نکالنے اور اثر پھیلانے کے لئے وہ سب جتن کئے جو کم از کم امن پسند اور بھلے مانس سوداگروں کی شان کے شایاں نہ تھے۔

ہاں بے انصافی ہوگی اگر ہم کسی قوم کے کسی غیر ملک پر قابض ہونے کے سلسلے میں مذہبی نیکی اور ایثار اور انصاف کا مطالبہ کریں۔ انسانی قوت کا طوفان جہاں اپنے سامنے نشیب پاتا ہے وہیں بہ نکلتا ہے۔ اٹھارھویں صدی میں گرم مزاج ہندوستان کی قومیں اپنی عیش و عشرت اور سستی اور خانہ جنگی کے باعث مضمحل اور ذلیل ہو رہی تھیں۔ وسط ایشیا بھی ضعیف ہو رہا تھا لیکن ادھر دور سمندر پار کے شمالی ملکوں کی ٹھٹھرنے والی قومیں اپنے اندر ایک نئی زندگی کی پر لطف حرارت محسوس کر رہی تھیں۔ جب کہ ہم ابھی لیٹے لیٹے انگڑائیاں لے رہے تھے یہ من چلے آپس کے مقابلے کی بھاگ دوڑ میں ایک سے ایک آگے نکل جانے کی امنگ میں پھلانگتے ہوئے ہم تک پہنچ گئے۔

برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کی ابتدا بھی ایک لطیفہ ہے۔ ڈچ تاجروں نے جو ایشیا کی مرچ مسالوں کی تجارت کے تنہا اجارہ دار تھے لنڈن میں مرچوں کا بھاؤ حد سے زیادہ بڑھا دیا۔ اس پر لنڈن کے تاجروں نے ارادہ کیا کہ آئندہ ہم خود ہندوستان سے تجارت کریں اور اس غرض سے ملکہ الزبتھ نے اکبر کی طرف اپنا ایک سفیر بھیجا۔ اس سے سولہ سترہ سال پہلے بھی سنہ ۱۵۸۵ء میں ملکہ نے تین انگریزی سیاحوں کو اکبر کے نام ایک خط دیا تھا جس میں اُس نے شاہنشاہ اکبر کو "نصرت پناہ و جلالت مآب شہزادہ لارڈ زیلاب دِم ایکیبار شاہِ کیمبیہ" کہہ کر خطاب کیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو ملکۂ انگلستان کی طرف سے پہلی سند سولھویں صدی کے آخری دن ۳۱۔ دسمبر سنہ ۱۶۰۰ء کو عطا کی گئی۔

ہندوستان میں انگریزوں کی تاریخ کے چار دور ہیں۔ پہلا سنہ ۱۶۰۰ء سے ۱۷۶۵ء تک تجارت کا دور۔ دوسرا ۱۷۶۵ء سے ۱۸۵۷ء تک فتوحات کا دور۔ تیسرا ۱۸۵۷ء سے سنہ ۱۹۲۰ء تک مادی ترقی اور سیاسی بیداری کا دور۔ اور چوتھا ۱۹۲۰ء سے تاحال ذمہ دار حکومت اور مطالبۂ آزادی کا دور۔

اوّل اوّل انگریز ہندوستان میں تاجر بن کر آئے اس لئے اُن کا سب سے بڑا مقصد اپنی تجارت سے نفع اٹھانا تھا جو آہستہ آہستہ زرکشی کے درجے تک پہنچ گئی۔ مسلمان بادشاہوں نے فیاضی سے کام لے کر اُنہیں ہر طرح کی سہولتیں دیں اور ہندوستانیوں نے اپنی عادت کے مطابق اُن کی خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ کسی انگریز کو مکان نہ ملتا تو ہندوستانی تاجر اپنا مکان خالی کر دیتا۔ اُدھر

انگریزوں نے بھی ہندوستانی معاشرت اختیار کرلی یہاں تک کہ وہ مشاعروں میں شریک ہوکر ہندوستانی زبان میں غزلیں پڑھتے تھے۔ لیکن بتدریج انگریز تاجروں نے اپنے پاؤں پھیلانے شروع کئے اور جوں جوں انہیں ملک کے مختلف حصوں میں اقتدار حاصل ہوتا گیا وہ ہندوستان کی دولت کو سینکڑوں طریقوں سے جمع کر کرکے انگلستان لے جانے لگے۔ برک نے ہیسٹنگز کے مقدمے کے دوران میں اس کل رقم کا جو اُس وقت ۱۷۹۰ء تک یہاں سے انگلستان پہنچ چکی تھی چالیس کروڑ کے قریب اندازہ کیا تھا۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اُس وقت روپے کی قیمت آج کل کے روپے سے سات گنا تھی۔ شروع شروع میں کمپنی کے معمولی ملازموں کی تنخواہیں آٹھ روپیہ ماہوار اور کھانا سے لے کر ۳۳ روپیہ ماہوار تک تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگلستان کے نکمے اور شریر لوگ ہندوستان میں ٹوٹ پڑے اور کمپنی کی فیکٹریاں بد اعمالیوں کے اڈے بن گئے جس پر خود بعض نیک دل انگریزوں نے احتجاج کی آواز بلند کی۔ بنگال کی دیوانی مل جانے پر کمپنی نے بنگال کی تمام زمینوں کو نیلام کرنا شروع کردیا جس سے قدیم مستاجر بے دخل ہوگئے اور اُن کی جگہ نئے ٹھیکیداروں نے لے لی اور رعایا کی وہ لوٹ کھسوٹ شروع ہوئی کہ لوگ گاؤں چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ جیسا برک نے بعد میں کہا کہ ان نئے بنیوں نے بڑے بڑے گھرانے اُلٹ دیئے۔ وارن ہیسٹنگز کے دیوان رام چندر کی نسبت بیان کیا گیا تھا کہ وہ ساٹھ روپے ماہوار کا ملازم تھا مگر اس نے ساڑھے بارہ کروڑ کے قریب ترکہ چھوڑا۔ کمپنی کے ایک ایجنٹ رُوپ کشن کے پاس اتنی دولت تھی کہ اُس نے ماں کے مرنے پر نوے لاکھ صرف کیا۔ قدیم شریفوں اور سیٹھوں کے گھرانے برباد ہوگئے اور غریب کسانوں پر طرح طرح کے ظلم ہونے لگے۔

سترھویں صدی میں کمپنی نے سورت مدراس بمبئی اور کلکتے وغیرہ میں اپنی تجارتی کوٹھیاں بنائیں۔ اورنگ زیب کے عہد میں بنگال کے صوبہ دار نے اُنہیں وہاں سے نکال دیا جس پر انگریزوں نے بحیرۂ عرب میں حاجیوں کے جہازوں پر چھاپے مارنے شروع کئے۔ اس پر اورنگ زیب نے اپنے صوبے دار کے نام انگریزوں کے حق میں فرمان جاری کیا اور وہ دوبارہ ۱۶۹۰ء میں کلکتے میں متمکن ہوگئے۔ ہندوستان کے افق پر ایک نئی قسم کی طاقت نمودار ہوئی جس کا اثر ایک روز کشمیر سے راس کماری تک پھیلنا تھا۔

اورنگ زیب کے بعد جہاں دیسی ریاستیں خود مختار ہونے لگیں وہاں ایسٹ انڈیا کمپنی بھی طاقت حاصل کرنے لگی۔ پہلے پہل انگریزوں نے ساحلی مقامات پر اپنا قدم جمایا اور مدراس بمبئی اور کلکتہ کے مضافات میں اپنا علاقہ بڑھانا شروع کیا۔ پندرھویں صدی میں یورپی لوگوں میں پرتگیز ہندوستان میں سب سے زیادہ طاقت ور تھے، بتدریج ہندوستانی اس لئے بھی اُن کو ناپسند کرنے لگے کہ وہ دیسیوں کو زبردستی عیسائی بنا لیتے تھے۔ ۱۶۰۲ء میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی بنی۔ انگریزوں نے یہ دیکھ کر کہ مشرقی جزائر میں ڈچ انہیں گھسنے نہیں دیتے ہندوستان کے ساحل کی طرف زیادہ توجہ کی۔ یہاں بھی سولھویں صدی کے نصفِ اوّل میں ڈچ لوگوں کا بول بالا رہا چنانچہ انگریزوں کا ڈچ بحری طاقت سے مقابلہ ہوا اور جب وہ اِسے پچھاڑ چکے تو فرانسیسی طاقت سے واسطہ پڑا۔ ۱۶۷۴ء میں فرانسیسیوں نے پانڈی چری کی بنیاد رکھی۔ دونوں قومیں یورپ میں مدت سے ایک دوسری کی مدِ مقابل تھیں۔ اُسی سلسلے میں یہاں بھی ان میں جنگ شروع ہوگئی۔ ان دونوں نے موقع ڈھونڈ کر ہندوستان کے اندرونی معاملات میں دخل دینا شروع کیا۔ چنانچہ اٹھارھویں صدی کے وسط میں کرناٹک اور حیدر آباد میں ایک فریق کا فرانسیسیوں نے اور دوسرے کا انگریزوں نے ساتھ دیا۔ اِسی طرح انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان ۱۷۴۴ء اور ۱۷۶۳ء کے درمیان تین لڑائیاں ہوئیں جن کا نتیجہ انگریزوں کی فتح ہوا۔ ۱۷۵۷ء میں کلایو نے بنگال کے نواب سراج الدولہ پر پلاسی کے مقام پر حملہ کرکے ہندوستان میں انگریزی سلطنت کی بنیاد رکھی اور ۱۷۶۴ء میں شاہنشاہ شاہ عالم کو بکسر پر شکست دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۷۶۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو شاہ دہلی کی طرف سے بنگالے کی دیوانی عطا کی گئی گویا بنگال کی اصلی حکمران کمپنی ہوگئی۔

اس کے بعد انگریزی تاریخ ہند کا **دوسرا یعنی فتوحات کا دور** شروع ہوتا ہے۔ انگریزوں نے جا بجا اپنے پاؤں پھیلانے شروع کئے۔ ملک کی حالت ابتر تھی۔ مقامی حکمران عیش و عشرت میں مبتلا تھے لوگ غافل اور بے بس تھے۔ انگریز ہوشیار اور دُور اندیش

نکلے۔ جدھر نظر کی کامیابی نے قدم لئے بس پھر کیا تھا بڑھتے چلے گئے اور ایک عظیم الشان سلطنت کے مالک بن گئے۔
۱۷۷۳ء میں انگلستان کی حکومت نے دیکھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی جو کبھی محض تاجروں کی جماعت تھی ہندوستان میں ایک خاصے
علاقے پر قابض ہو چکی ہے جو جا بجا بکھرا ہوا ہے۔ اس پر برٹش پارلیمنٹ نے ۱۷۷۳ء کا ریگولیٹنگ ایکٹ منظور کیا جس کی رو سے بمبئی
اور مدراس کی حکومتوں کو بنگال کی مرکزی حکومت کے ماتحت کر دیا گیا۔ بنگال میں ایک گورنر جنرل اور اس کے ساتھ اس کی ایک کونسل
مقرر کی گئی۔ اور بجائے صدر دیوانی عدالت اور صدر نظامت عدالت کے کلکتہ میں ایک سپریم کورٹ بنایا گیا اس قانون سے وارن ہیسٹنگز
(۱۷۷۴ء تا ۱۷۸۵ء) پہلا گورنر جنرل بنا۔ پٹ ۱۷۸۴ء کے ایکٹ کے مطابق کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرز (یعنی مجلس مالکان)
کے اوپر برطانوی حکومت کی طرف سے ایک بورڈ آف کنٹرول (مجلس مختار) قائم ہوئی۔ ہیسٹنگز کے وقت میں مرہٹوں سے پہلی اور میسور
سے دوسری لڑائی ہوئی اور روہیلوں پر حملہ کیا گیا۔ کارنواس (۱۷۸۵ء تا ۱۷۹۳ء) کے وقت بنگال کا دوامی بندوبست ہوا جس کی رو سے
حکومت نے مال گذاری کی رقم ہمیشہ کے لئے مقرر کر دی۔ اور جس سے بنگال کے زمینداروں نے بہت فائدہ اٹھایا۔ ولزلی (۱۷۹۹ء تا ۱۸۰۵ء)
برطانوی سلطنت کی توسیع پر تلا ہوا تھا۔ اس نے میسور کو فتح کیا بہت سی دیسی ریاستوں کو برطانوی علاقے میں شامل کر لیا اور نظام، پیشوا، سندھیا،
بھونسلا اور نواب اودھ کو مجبور کیا کہ وہ برطانوی حکومت کے (Subsidiary) سسٹم کے حلقے میں داخل ہو کر اس حکومت کے زیر سایہ آجائیں۔
لارڈ منٹو (۱۸۰۷ء تا ۱۸۱۳ء) نے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے ۱۸۰۹ء کا سمجھوتا کیا۔ ۱۸۱۳ء کے چارٹر ایکٹ کی رو سے ایسٹ انڈیا
کمپنی کے علاوہ دوسرے انگریز تاجروں کو بھی ہندوستان میں تجارت کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کا خون چوسنے
والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہندوستان کی صنعت و حرفت بتدریج برباد ہوتی گئی اور پیشہ ور لوگوں میں ناراضگی اور مایوسی پھیلتی گئی۔
مارکوئس آف ہیسٹنگز (۱۸۱۳ء تا ۱۸۲۳ء) کے عہد میں نیپال سے جنگ ہوئی اور پنڈاروں کا قلع قمع کیا گیا۔ بنٹنگ (۱۸۲۸ء
تا ۱۸۳۵ء) نے ستی اور ٹھگی کا انسداد کیا۔ اس عہد میں (۱۸۳۵ء میں) ایک نہایت اہم فیصلہ کیا گیا جس کا ہندوستان کے مستقبل پر بڑا
گہرا اثر ہونے والا تھا۔ یہ مکالے کی یادداشت تھی جس کے مطابق یہ فیصلہ ہوا کہ آئندہ ہندوستانیوں کو انگریزی کے ذریعے سے تعلیم دی
جائے۔ اس سے ایک تو مشرقی علوم اور شائستگی کو بڑا دھکا لگا اور دوسرے بتدریج ہندوستان میں انگریزی تمدن اور مغربی سیاسی
خیالات کی روز افزوں اشاعت ہوئی۔ مکالے نے لکھا کہ اگر اس تبدیلی کی وجہ سے انگریزی زبان سیکھ کر کسی دن ہندوستانی لوگ انگریزی
سیاسی اداروں کا بھی مطالبہ کرنے لگیں تو انگلستان کے لئے وہ ایک بڑے فخر کا دن ہوگا۔ اس شریف انگریز کے اس قول کے پورے ایک
سو سال بعد گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ منظور ہوا۔
لارڈ ڈلہوزی (۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۶ء) نے برطانوی سلطنت کو اور توسیع دی۔ کئی دیسی ریاستوں کو انگریزی علاقے سے ملحق کر لیا۔ برما
والوں اور سندھیا اور سکھوں سے پے در پے لڑائیاں کیں اور پنجاب کو ۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء کو سلطنتِ ہند کا جزو بنالیا۔
غرض ایک سو سال کے عرصے میں انگریز سوداگروں کی کمپنی نے ایک خاصی سلطنت قائم کر لی۔ اٹھارویں صدی میں کرناٹک اور پلاسی اور
بکسر کی لڑائیاں ہوئیں ان کے بعد چار لڑائیاں میسور سے تین مرہٹوں سے ایک نیپالیوں سے ایک افغانوں اور دو سکھوں سے لڑی گئیں اور
ان میں سے اکثروں کے علاقے کو برطانوی قلمرو بنالیا گیا۔ علاوہ بریں مختلف عجیب طریقوں اور ترکیبوں سے کئی اور ریاستوں کو بھی اس سلطنت
میں شامل کر لیا گیا۔ یہاں تک ۵۷ء کے غدر سے پہلے تقریباً سارا ہندوستان برطانیہ کے زیر نگیں آگیا۔ اس توسیع سلطنت کے ساتھ
ساتھ ملک کی ترقی کے بعض سامان بہم پہنچائے گئے۔ ریل تار نہریں سڑکیں بنیں اور تعلیم کی طرف بھی کچھ توجہ کی گئی۔
۱۸۵۷ء میں فوج میں غدر ہوا۔ سرسید نے ۵۹ء میں باوجود سرکاری ملازم ہونے کے بڑی دلیری سے اپنی کتاب "اسبابِ
بغاوتِ ہند" میں اس شورش کی وجہ بیان کی پہلے یہ صاف ظاہر کر کے کہ ۵۷ء کی سرکشی کا اصلی سبب ہندوستانیوں کا لیجسلیٹو کونسل میں
شریک نہ کیا جانا ہے انہوں نے کل پانچ اسباب گنوائے۔ ایک غلط فہمی رعایا بابت تجاویز گورنمنٹ کہ گورنمنٹ ہندوستانیوں کے مذہب

اور رسم و رواج میں مداخلت کرنا چاہتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "میں سچ کہتا ہوں کہ جب سرکار ایسٹ انڈیا کمپنی کوئی ملک فتح کرتی تھی تو ہندوستان کی رعایا کو کمال رنج ہوتا تھا" بعض ضلعوں میں رواج نکلا کہ پادریوں کے ساتھ تھانے کا ایک چپراسی جاتا تھا۔ مسلمانوں کو اس مذہبی مداخلت سے زیادہ رنج تھا۔ دوسرے اجرائے ضوابط و آئینِ نامناسب۔ ادنٰے سے بہانوں پر لوگوں کی جاگیریں اور معافیاں چھن گئیں۔ زمینیں نیلام ہوئیں اور مال گذاری میں غرق ہونے لگیں۔ اسٹامپ کی وجہ سے عدالت گستری سے رعایا باز رہنے لگی۔ تیسرے ناواقفیت گورمنٹ حالِ رعایا سے۔ مسلمان حکمرانوں نے محبت سے ہندوؤں کا دل موہ لیا تھا اور ہند کو اپنا وطن بنا لیا تھا لیکن انگریز حاکم اب محض رعب و داب سے کام لیتے تھے۔ بڑھتی ہوئی مفلسی کی وجہ سے بھی لوگ انگریزوں کی حکومت سے بیزار ہو رہے تھے۔ سر سید لکھتے ہیں کہ "ہم سچ کہتے ہیں اور پھر ہم کہتے ہیں کہ ہم بہت سچ کہتے ہیں جب افغانستان سرکار نے فتح کیا لوگوں کو بڑا غم ہوا۔ کیا سبب تھا صرف یہ تھا کہ اب مذہب پر علانیہ دست اندازی ہوگئی۔ جب گوالیار فتح ہوا اور لیا گیا لوگوں کو کمال رنج ہوا کیوں ہوا اس لئے ہوا کہ ان پاس کی ہندوستانی عملداریوں سے ہندوستانیوں کو بہت آسودگی تھی"۔ سرکار انگریزی میں امن اور آسائش اور ایک طرح کی آزادی ضرور تھی اور اسی لئے عورتیں اور مہاجن اور تجارت پیشہ اس سے خوش تھے۔ چوتھے نہ کرنا اُن باتوں کا جن کا کرنا گورمنٹ پر واجب تھا۔ حکامِ اضلاع کی سخت مزاجی اور بدزبانی ناقابلِ برداشت تھی۔ اشراف اہلکار انگریز حاکموں کا غرور و تکبر اور سختی دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں کہا کرتے کہ "اس نوکری سے تو گھاس کھودنی بہتر ہے"۔ پانچویں بدانتظامی اور بے اہتمامی فوج۔

غدر کے بعد برطانوی حکومت نے ۱۸۵۸ء کا ایکٹ پاس کیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ سے حکومت لے کر انگلستان کے فرماں روا نے ایک سیکرٹری آف سٹیٹ کے ذریعے سے ہندوستان پر خود حکومت کرنی شروع کی۔ یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو جو **ملکہ وکٹوریا کا اعلان** ہوا اس میں یہ یقین دلایا گیا کہ آئندہ ہندوستانیوں کے مذہب میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے گی اور یہی ۵۷ء کے غدر کا اچھا نتیجہ نکلا کہ آئندہ حکومت نے اشاعتِ مذہب کے معاملے میں غیر جانب داری اختیار کر لی۔ ملکہ نے بھی یقین دلایا کہ "آئندہ ہندوستانیوں کی خوش حالی سے ہمیں طاقت حاصل ہوگی اُن کے اطمینان سے ہمارا تحفظ ہوگا اور اُن کی احسان مندیوں میں ہمارا بہترین صلہ مضمر ہوگا"۔ آئندہ جب کبھی ہندوستانیوں پر تشدد یا اُن سے بے اعتنائی برتی گئی تو اُنھوں نے اپنے حکمرانوں کو مہربان ملکہ کا اعلان بار بار یاد دلایا۔

غدر کا ایک خراب نتیجہ یہ نکلا کہ حکمرانوں اور رعایا میں وسیع خلیج قائم ہوگئی اور نسلی منافرت روز بروز زیادہ ہوتی گئی۔ غدر کے بعد کی نصف صدی ایک امن و امان کا زمانہ تھا لیکن اس امن و امان میں انگریز اور ہندوستانی ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہو کر رہتے رہے۔

غدر کے بعد انگریزی علاقے میں بہت کم توسیع ہوئی۔ غدر کے بعد تین لڑائیاں افغانستان سے لڑی گئیں۔ ایک برما سے اور ایک تبت سے۔ افغانستان اور تبت جوں کے توں قائم رہے اور برما پر قبضہ کر لیا گیا لیکن برما بھی پچاس سال تک ہندوستان میں شامل رہ کر ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے بموجب ہندوستان سے علیحدہ کر لیا گیا۔

ہندوستان میں غدر کے بعد امن تو قائم ہو گیا اور ایک عرصہ تک ملک پر خاموشی بھی طاری رہی لیکن انیسویں صدی کا نصفِ آخر کچھ ایسا زمانہ نہ تھا کہ یہ خاموشی دیر تک قائم رہ سکتی۔ دنیا اب وہ پہلے کی سی علیحدہ علیحدہ ملکوں کی دُنیا نہ تھی۔ تار اور ریل اور دوسری ایجادیں، اخبارات و رسائل، یورپ میں صنعتی اور معاشری اور سیاسی انقلابات ان سب کا بتدریج خاموش و مطمئن ہندوستان پر بھی اثر ہونے لگا اور غیر ذمہ دار اجنبی حکومت نے آہستہ آہستہ یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ رعایا کی فلاح و بہبود ضروری ہے اور بہتر ہے کہ کبھی کبھی رعایا سے بعض امور کے متعلق مشورہ کر لیا جایا کرے۔

غدر سے پہلے ۱۸۳۳ء کے ایکٹ کی رُو سے حکومتِ انگریزی نے ازراہِ عنایت ایک لاکھ روپیہ رعایا کی تعلیم کے لئے مخصوص

کرنا منظور کر لیا تھا۔ نیز یہ بھی یقین دلایا تھا کہ کوئی ہندوستانی بوجہ اپنے مذہب یا رنگ یا نسل کے کسی ملازمت کے حق سے محروم نہ رکھا جائے گا۔ ۱۸۷۰ء میں پھر دیسیوں کو اعلیٰ ملازمتیں دینے کا ارادہ کیا گیا اور ۱۸۸۶ء میں ایک کمیشن بھی بٹھایا گیا۔ لیکن نہ مدت تک تعلیم کے لئے مخصوص رقم کو استعمال کیا گیا اور نہ بجز چند درچند اشخاص کے کوئی ہندوستانی اعلیٰ عہدوں پر مقرر کیا گیا۔ ۱۸۵۴ء میں وڈ کا مراسلہ ہندوستانی تعلیم کی تاریخ میں ایک نہایت اہم یادداشت ثابت ہوئی اور حکومت نے بار بار قحط پڑ جانے پر قحط کے انسداد کے لئے مختلف ذریعے اختیار کئے۔ ان کے علاوہ رعایا کی آسائش کے لئے اور بیسیوں امور کی طرف توجہ کی۔ ہندوستان دنیا کی عام صنعتی ترقی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ اُس کی اپنی صنعتیں برباد ہوگئیں۔ اُس کی اپنی تعلیم اور اُس کا اپنا تمدن بڑی حد تک تباہ ہوگیا۔ لیکن انگلستان سے اس طرح وابستہ ہونے سے اُس کا رشتہ بیرونی مہذب دنیا سے ضرور قائم ہوگیا اور اس کی رگوں میں رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ ہی سہی لیکن حرکت ضرور کرنے لگا جس کی وجہ سے صدیوں کی نیند سے عنقریب بیدار ہوجانا اس کی قسمت میں لکھا تھا۔

۱۸۵۷ء کے غدر سے برسوں پہلے ہی گو ہندوستان کے باشندے برطانوی حکومت کے امن وامان سے لُطف اُٹھا رہے تھے لیکن اُن کے کم از کم بعض طبقوں میں بے چینی اور بے اطمینانی کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ ۱۸۲۴ء میں مدراس کے گورنر منرو نے اپنی ایک یادداشت میں ہند میں برطانوی حکومت کا یہ نصب العین پیش کیا تھا کہ وہ بتدریج ہندوستانیوں کو اپنے ملک کو آپ سنبھالنے کے قابل بنائے۔ ۱۸۳۵ء میں مکالے نے اپنی مشہور یادداشت پیش کی۔

اور جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا ہے سرسید پہلے وہ ہندوستانی تھے جنہوں نے بڑی دلیری اور صفائی سے اپنی کتاب اسباب بغاوت ہند میں حکومت اور دُنیا کے سامنے اعلان کر دیا کہ برطانوی حکومت کے کیا نقائص ہیں اور ہندوستانیوں کی جائز خواہشات کیا ہیں۔ سرسید کا یہ بیان بلاشبہ برطانوی عہد میں ہندوستان کا پہلا سیاسی مطالبہ تھا۔

اِس کے دو سال بعد اُسی لارڈ الگن کے عہد میں جس نے ۱۸۴۸ء میں کینیڈا میں خود اختیاری حکومت جاری کی ۱۸۶۱ء میں انڈین کونسلز ایکٹ پاس ہوا۔ اِس سے پہلے پانچ صوبوں میں کونسلیں تو قائم تھیں لیکن اُن میں کوئی غیر سرکاری رُکن شامل نہ ہوتا تھا۔ ۱۸۶۱ء میں چند غیر سرکاری ارکان کو شامل کر لیا گیا۔ سرسید اس سلسلے میں کونسل کے ممبر نامزد ہوئے۔ ۱۸۷۸ء سے ۱۸۸۲ء تک چند میونسپل ایکٹ پاس کئے گئے اور لارڈ رپن نے جو ہندوستانیوں کے نزدیک ہندوستان کا ایک بڑا محسن تھا ۱۸۸۲ء میں ایک قرارداد منظور کی جس کی رُو سے برطانوی ہند میں **لوکل سلف گورنمنٹ** رائج کرنے کے لئے متعدد ایکٹ پاس ہو کر جا بجا ڈسٹرکٹ بورڈ قائم ہوئے جن کے ذریعے سے ہندوستانیوں نے پہلی بار مغربی وضع کی خود اختیاری حکومت کی اک ذرا سی جھلک دیکھی اور وہ شہروں اور اضلاع میں رفاہ عام کے بعض کاموں کی طرف خود توجہ کرنے کے مجاز سمجھے گئے۔ پنچایتوں کا نظام ہندوستان میں ہندوؤں اور مغلوں کے زمانے میں ہزاروں سال تک جاری رہ کر معدوم یا کالعدم ہوگیا تھا اور مدتوں سے طوائف الملوکی اور مسلسل افراتفری کی وجہ سے ہندوستانی اپنے چھوٹے سے چھوٹے معاملات طے کرنے سے محروم ہو چکے تھے۔ اب وہ ایک اجنبی حکومت کے زیر اثر ایک نئی طرح کی خود اختیاری حکومت کی اب ت پڑھنے لگے۔

غدر کے بعد ایک سیاسی نما مجلس جو انگلستان کی انڈین ایسوسی ایشن کی ایک شاخ تھی **برٹش انڈین ایسوسی ایشن** کے نام سے ہندوستان میں قائم ہو چکی تھی۔ ۱۸۶۶ء میں سرسید نے اُس کی ایک شاخ علی گڑھ میں قائم کی۔ ۱۸۷۶ء میں بنگال میں بھی اُس کی ایک شاخ قائم ہوئی۔ اس کے ذریعے سے زمینداروں اور ہندوستانیوں کی عام تکالیف براہ راست پارلیمنٹ تک پہنچائی جاتی تھیں۔ مغربی تعلیم کی وجہ سے ہندوستانیوں کو سیاسی معاملات سے دلچسپی شروع ہوئی اور اُن کے انگریزی اور دیسی اخبارات نے خود داری کے اُن خیالات کی باقاعدہ اشاعت شروع کی جو ہندوستانیوں کے دل میں جاگزیں تھے۔ غدر کے بعد انگریزوں اور ہندوستانیوں میں علیحدگی بلکہ منافرت پیدا ہوگئی تھی۔ اس پر **ہندوستانی اخبارات** میں رنجیدگی کا اظہار ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر لارڈ لٹن نے اخبارات پر بندشیں عائد کر دیں لیکن لارڈ رپن نے انہیں دُور کر دیا۔ لارڈ رپن نے کونسل میں البرٹ بل بھی پیش کیا جس کی رُو سے انگریز اور ہندوستانی ججوں کو

مساوی اختیارات دینا تجویز کیا گیا لیکن انگریزوں اور اینگلو انڈین اصحاب نے اس پر وہ اُدھم مچایا کہ بل کو تقریباً چھوڑ دینا پڑا۔ بل تو ہندوستانیوں کی مرضی کے مطابق پاس نہ ہوا لیکن اس سے انہوں نے ایک نہایت اہم سبق سیکھا کہ آج کل کی دنیا میں شورش ایک زبردست آلۂ کار ہے چنانچہ اس سبق پر انہوں نے بھی بہت جلد عمل کرنا شروع کر دیا۔ ۱۸۵۲ء میں مدراس میں ایک مہاجن سبھا بنائی گئی لیکن یہ عزت اور ہمت فقط ایک انگریز کے حصے میں آئی کہ وہ ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی مجلس کی بنیاد ڈالے۔ اور اُس کے اُنیس اجلاسوں میں سکرٹری کے فرائض انجام دے۔ یہ ہمدرد با ہمت انسان مسٹر ہیوم تھا جس نے یکم مارچ ۱۸۸۳ء کو کلکتہ کے گرېجوایٹ طلبہ کے نام ایک کھلی چٹھی لکھی کہ ملک کی ترقی کے لئے ایک باقاعدہ سیاسی جماعت کے قیام کی اشد ضرورت ہے اور پھر اپیل کی کہ کیا صرف پچاس پُر ایثار اور پُر خلوص نوجوان اس بات کے لئے تیار نہیں ہو سکتے ہیں۔ اپنے آپ کو ہندوستان کی خدمت کے لئے وقف کر دیں؟ اس اپیل کا فوری اثر ہوا۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ۱۸۸۴ء میں انڈین نیشنل یونین اور کئی شہروں میں اُس کی مقامی کمیٹیاں بن گئیں اور اسی سلسلے میں آئندہ سال ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو **انڈین نیشنل کانگرس** کا پہلا اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا۔

اگر کہا جائے کہ اس وقت سے لے کر تقریباً پچاس سال تک ہندوستان کی سیاسی تاریخ انڈین نیشنل کانگرس کی تاریخ ہے تو یہ حقیقت سے بعید نہ ہوگا۔ یہ ضرور ہے کہ شروع شروع میں کانگرس ایک وفادار جماعت بنی رہی۔ پھر پہلے پہل جب سے اُس نے شورش کا طریقہ اختیار کیا تو وہ شورش آئینی تھی اور بعد میں جب وہ سول نافرمانی اور عوامی ملاپ کا جھنڈا لے کر اُٹھی تو اُس وقت بعض بااثر جماعتیں وقتاً فوقتاً اُس سے اپنی علیحدگی اور بیزاری کا احساس کرتی رہیں اور آج بھی باوجود اپنی مسلمہ طاقت کے وہ سارے ہندوستان کی پوری نمائندہ مجلس نہیں بن سکی لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ کانگرس ہی تھی جو پہلے پہل اس ملک میں ایک باقاعدہ منظم جماعت کی صورت میں ظاہر ہوئی اور جس نے اپنے کام کو مسلسل جاری رکھتے ہوئے ہندوستان کے لئے بہت سے سیاسی حقوق و مراعات حاصل کئے۔

کانگرس کی تاریخ کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا زمانہ ۱۸۸۵ء سے ۱۹۰۵ء تک پارلیمنٹری طریق کار کا ہے۔ دوسرا دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۹ء تک قانونی یا دستوری شورش کا ہے۔ اور تیسرا دور ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۶ء تک عوامی تحریک کا ہے۔ چوتھا دور ۱۹۳۷ء سے شروع ہوتا ہے جب کانگرس سات صوبوں میں حکومت کرنے لگی۔

کانگرس کے پہلے اجلاس میں بونرجی صدر کانگرس نے کانگرس کے اغراض و مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اُس کا مقصد ملک کے مختلف کارکنوں میں دوستی بڑھانا، مذہبی و نسلی منافرت کا دُور کرنا، قومی اتحاد کے خیالات کو ترقی دینا، سوشل اصلاحات کے متعلق ملک کے قابل ترین افراد کی آرا حاصل کرنا اور اُن طریقوں پر غور کرنا ہے جن سے دیسی سیاست دان مفادِ عامہ کے لئے کام کریں۔

شروع شروع میں گورنمنٹ نے کانگرس کو ہمدردی کی نظروں سے دیکھا لیکن تین سال بعد لارڈ ڈفرن نے مخالفت کا رویہ اختیار کیا۔ کانگرس نے یہ چیلنج قبول کر لیا اور بڑی سرگرمی سے کام کرنا شروع کر دیا جس سے اور لوگوں کی دلچسپی اور جوش یہاں تک بڑھا کہ پانچویں کانگرس میں جس میں بریڈلو کو ایڈریس پیش کیا گیا ۶۴۰۰۰ روپیہ چندہ ہوا اور کئی خواتین نے اپنی گھڑیاں اور زیور تک اُتار کر دے دیا۔ آہستہ آہستہ کانگرس کی طرزِ گفتگو دلیر ہوتی گئی۔ مدت سے ہندوستانی دیکھ رہے تھے کہ انگریز بات بات میں اپنی نسلی برتری اور حاکمانہ رعب جتاتے ہیں، جس طرح ریل گاڑیوں میں بعض ڈبے "صرف یورپینیوں کے لئے" وقف تھے اسی طرح سینکڑوں باتوں میں سفید لوگوں کی دنیا ہند میں اور تھی ہندوستانیوں کی اَور۔ یہ خلیج بتدریج بجائے گھٹنے کے بڑھتی گئی یہاں تک کہ بیسویں صدی کے شروع سے پہلے ہی کانگرسی حلقوں میں "شاہنشاہیت کی دیوانگی" کا ذکر ہونے لگا۔ تاہم پہلے دور میں کانگرس کا رویہ برطانوی حکومت کے متعلق پارلیمنٹری طریقے کا تھا۔

کانگرس نے معاشرتی اصلاح کا جو بیڑا اٹھایا تھا اُسے دوسرے ہی سال چھوڑ دیا اور خالص سیاسیات کی طرف توجہ کی۔ اس کے بعد کانگرس

نے ملکی نظم ونسق میں ہندوستانیوں کو حصہ ملنے پر زیادہ زور دیا۔ غور کیا کہ کون سی تعلیم ہندوستانیوں کو افلاس سے بچانے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ نیز جنگلات کے قوانین مال گذاری کا انتظام قانونِ اسلحہ انسدادِ قحط وغیرہ کے متعلق قراردادیں منظور کیں جن کا مفاد ملکی بہتری تھا۔ یہ زیادہ **کانگرس کی کوششوں کا نتیجہ** تھا کہ ڈفرن کے وقت میں لوکل سلف گورنمنٹ کا دائرہ وسیع کیا گیا، لٹن کا پریس ایکٹ منسوخ کیا گیا اور سنہ ۱۸۹۲ء میں ایک اور انڈین کونسلز ایکٹ منظور ہوا جس سے ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپل کمیٹیوں کی کونسلوں کے لئے ممبر نامزد کرنے کا اختیار دیا گیا اور ممبرانِ کونسل کو سوال پوچھنے اور وائسرائے کی کونسل میں مالی حالات پر مباحثہ کرنے کا حق دے دیا گیا۔ براہِ راست انتخاب کا اصول ابھی تسلیم نہ کیا گیا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ کونسلیں محض مشورہ دینے والی جماعتیں تھیں ان کا اختیار اس سے زیادہ اور کچھ نہ تھا۔

لیکن بیسویں صدی کے آغاز سے جس طرح بیرونی دُنیا کی حالت بدلنی شروع ہوئی اُسی طرح ہندوستان میں بھی ایک نئے دَور کا آغاز ہوا۔ سنہ ۱۸۹۶ء میں اطالیہ نے ابی سینیا میں حبشیوں کے ہاتھوں شکست کھائی تھی۔ اس سے یورپی طاقت کے نیچے دبی ہوئی قوتوں کے دل میں ذرا سی اُمید پیدا ہوئی اس کے بعد جنوبی افریقہ میں بوئر قوم نے برطانوی حکومت کو شکستیں دیں لیکن سنہ ۱۹۰۴ء کی جنگ رُوس وجاپان نے زمانۂ حال کی تاریخ میں ایک بالکل نئے باب کا آغاز کیا۔ گرے ہوئے مشرق نے دفعتہً اٹھ کر مغرب کی ایک زبردست طاقت کو پچھاڑ دیا، سارے ایشیا میں ایک برقی رَو دوڑ گئی اور یاس اور غم پسندی اُمید اور جوش اور ولولے میں تبدیل ہوگئی۔ ہندوستان میں بھی بیداری پیدا ہوئی۔ اس کے ساتھ لارڈ کرزن کی رعونت اور کوتاہ بینی نے سمندِ ناز کو ایک اور تازیانہ لگایا۔ کرزن نے ہندوستانیوں کو جھوٹے لوگ پکارا اور بیسیوں اور طریقوں سے اُن کی ہتک کی۔ اس کے بعد ۱۶ اکتوبر سنہ ۱۹۰۵ء کو **بنگال کی تقسیم** کا اعلان کیا گیا۔ اس واقعے نے بنگال کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک بیدار کر دیا۔ بنگالی مغربی خیالات سے دوسرے ہندوستانیوں کی نسبت زیادہ متاثر ہو چکے تھے وہ صدیوں سے ایک بزدلانہ ذہنیت کے مالک بن چکے تھے لیکن اس تحریک نے اُن میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ انگریزوں پر بم پھینکے گئے سودیشی مال خریدنے اور انگریزی مال کے بائیکاٹ کرنے کی آواز ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک بلند کیا گیا۔ **تقسیم بنگال کی تحریک** دراصل ہندوستان کی پہلی منظم سیاسی تحریک تھی۔ اس سے پہلے عرضداشتیں تھیں مایوسی تھی، ناراضگی تھی لیکن تقسیمِ بنگال کے بعد عرضداشتیں احتجاج میں مایوسی اُمید میں اور پوشیدہ ناراضگی علانیہ قومی جدوجہد میں تبدیل ہوگئی۔ ہندوستان میں انگریزوں کی آزادی پسند قوم کی حکومت آخر اپنا رنگ لائی اور یہاں بھی آزادی کے خیالات ہر کہہ ومہ کے دل میں ایک طوفان اٹھانے لگے۔

سنہ ۱۹۰۵ء سے سنہ ۱۹۱۹ء تک کانگرس کا دوسرا دَور دستوری شورش کا دور تھا۔ اکیسویں کانگرس سنہ ۱۹۰۵ء میں گوکھلے نے کرزن کی پالیسی پر اظہارِ نفرت کیا۔ آئندہ سال کانگرس میں بیس ہزار کا مجمع تھا۔ اس کے ساتھ ایک سودیشی نمائش بھی ہوئی اور دادا بھائی نوروجی صدرِ کانگرس نے جو کئی سال تک برطانوی پارلیمنٹ کے ایک رُکن بھی رہے اپنے تجربے کی بنا پر سیاسی شورش کے متعلق کہا کہ "سیاسی شورش انگلستان کی ساری سیاسی معاشری اور صنعتی تاریخ کی روح رواں ہے۔ سیاسی شورش اخلاقی قوت کا مُہذب پُرامن ہتھیار ہے۔ سو تم شورش کرو۔ شورش کرنے کے معنی ہیں آگاہ کرنا۔ سو تم آگاہ کرو ہندوستانیوں کو آگاہ کرو انہیں ان کے حقوق سے کہ اُنہیں کیسے اور کیوں اپنے حقوق لینے چاہئیں اور آگاہ کرو انگریز قوم کو ہندوستانیوں کے حقوق سے کہ کیوں اُنہیں یہ حقوق تسلیم کرنے اور دینے چاہئیں۔" یہ شورش ملک میں دن دُگنی رات چوگنی ترقی کرتی گئی یہاں تک انتہا پسندوں کا ایک خاصا گروہ بنگال مہاراشٹر اور دوسرے علاقوں میں پیدا ہو گیا۔ اس سے سنہ ۱۹۰۷ء کی کانگرس میں جو سورت میں منعقد ہوئی پھوٹ پڑ گئی۔ تلک اور دوسرے **انتہا پسند** ایک طرف تھے مالویہ گوکھلے اور باقی اعتدال پسند دوسری طرف۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں فریق الگ الگ ہو گئے اور اس کے بعد سنہ ۱۹۱۶ء تک انتہا پسند جماعت کانگرس سے علیحدہ رہی۔ کانگرس کا مقصد اب برطانوی سلطنت کی "خود اختیاری" نوآبادیوں کی طرح نظامِ حکومت کا حاصل کرنا اور اُن کے ساتھ برابری کا درجہ لینا قرار پایا۔

اِن حالات میں حکومتِ انگلستان نے کچھ نہ کچھ کرنا ضروری سمجھا۔ ۱۹۰۷ء میں جنوبی افریقہ کو خود اختیاری حکومت دی گئی تھی سو ہندوستان میں بھی جہاں شورش برپا تھی ۱۹۰۹ء میں مارلے منٹو اصلاحات نافذ ہوئیں۔ اعتدال پسندوں نے اِن کا خیر مقدم کیا۔ اِن کی اصلاحات کی رُو سے کونسلوں میں پہلی بار انتخاب کا طریقہ رائج کیا گیا گو ابھی ساتھ ہی ساتھ گورنمنٹ کی طرف سے نامزدگی بھی جاری رہی۔ تمام کونسلوں کے ممبروں کی تعداد ۱۲۴ سے بڑھ کر ۳۳۱ ہو گئی اور سارے ہندوستان میں صرف ۳۹ ممبر منتخب ہوتے تھے اب اس کی جگہ ۱۳۶ ممبر منتخب ہو کر آنے لگے۔ علاوہ بریں وائسرائے کی مجلسِ عاملہ (اگزیکٹو کونسل) میں ایک ہندوستانی نامزد کیا گیا اور انگلستان میں سکرٹری آف .... سٹیٹ کی کونسل میں بھی دو ہندوستانی مقرر ہوئے۔ ایک نئی اور قابلِ غور اصلاح جو اِن اصلاحات کے ذریعے سے رُوبکار آئی مسلمانوں کی فرقہ وار نیابت تھی۔

۱۹۰۶ء تک مسلمان بحیثیت قوم سیاست سے علیحدہ رہے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد گورنمنٹ اُن کو عتاب کی نظروں سے دیکھنے لگی۔ ملازمتوں میں اُنہیں بہت کم حصہ دیا گیا اور انہیں ہر طرح دبائے رکھنے کی کوشش ہوتی رہی۔ ۱۸۷۰ء میں گورنمنٹ نے اپنی پالیسی کی بے انصافی سمجھی اور تعلیم کے بارے میں مسلمانوں کی ضروریات کی طرف توجہ کرنی شروع کی۔ ۱۸۷۵ء میں سر سید نے علی گڈھ کالج کی اور ۱۸۸۶ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی اور اس کے بعد ۱۸۸۸ء میں واضح کر دیا کہ مسلمانوں کو فی الحال اپنی تعلیم پر اپنی تمام توجہ مبذول کرنی چاہئے اور کانگرس سے علیحدہ رہنا چاہئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی سوانح عمری میں اُس وقت کے حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس پالیسی کی داد دی ہے۔ ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال سے مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو فائدہ پہنچا۔ اس پر جب بنگالیوں نے اس کے خلاف شورش برپا کی تو مسلمانوں نے دیکھا کہ اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے اُن کے واسطے سیاسی تنظیم لازم ہو گئی ہے۔ لہٰذا اُنہوں نے یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو شملہ میں ایک وفد کی صورت میں گورنمنٹ کے سامنے اپنے سیاسی مطالبات پیش کئے جن میں ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کو جداگانہ نیابت کا حق دیا جائے۔ اسی سال دسمبر میں ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ قائم کی گئی۔

ہر چند کہ منٹو مارلے اصلاحات سے ہندوستانیوں کو کچھ نہ کچھ ملا لیکن تسلی نہ ہوئی۔ انتخابات کچھ اصلی تھے کچھ نقلی۔ صوبوں پر بہت کچھ مرکزی حکومت کا دباؤ تھا۔ کونسلوں کو بہت کم اختیارات حاصل تھے جن سے وہ ملک کو ترقی دے سکتیں۔ انتہا پسندوں کا دعویٰ تھا کہ کونسلیں فقط اک بک بک جھک جھک کا سامان ہیں اور کچھ بھی نہیں۔

۱۹۱۱ء میں شاہ جارج ہندوستان آئے اور ایک دربار منعقد کیا جہاں بنگال کی تقسیم کی ترمیم کی گئی اور بجائے کلکتہ کے دہلی کو دار السلطنت قرار دیا گیا۔ تقسیم کی ترمیم سے مسلمانوں میں مایوسی پھیلی۔ اُدھر ۱۹۱۲ء میں بلقان کی جنگ اور بعد میں طرابلس کی جنگ میں ترکی کی طرف انگلستان کی معاندانہ روش دیکھ کر اُن میں خاصی ناراضگی پھیل گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک تو لیگ نے ۱۹۱۳ء میں (سلف گورنمنٹ) کو اپنا مقصد قرار دیا اور دوسرے مسٹر جناح کی قیادت میں کانگرس کی طرف میلان ہوتا گیا یہاں تک کہ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں جہاں کانگرس اور لیگ دونوں کے اجلاس بیک وقت منعقد ہوئے کانگرس اور لیگ میں سمجھوتا ہو گیا جو میثاقِ لکھنؤ کے نام سے مشہور ہے۔ اِس کی رُو سے بعض شرائط پر مسلمانوں کا جداگانہ انتخاب کا حق تسلیم کیا گیا۔ اقلیت والے صوبوں میں انہیں اپنے حق سے کچھ زیادہ نشستیں دی گئیں لیکن پنجاب اور بنگال میں اکثریت نہ دی گئی اور مرکزی اسمبلی میں منتخب شدہ نشستوں میں ⅓ نشستیں اُن کو ملیں۔

۱۹۱۴ء میں یورپ میں جنگِ عظیم چھڑ چکی تھی۔ ہندوستان ہر طرح انگلستان کا ساتھ دینے کا ثبوت دے رہا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ اس بات کا خواہش مند تھا کہ اس وفاداری کے عوض میں اُسے سیاسی حقوق دیئے جائیں۔ ۱۹۱۶ء میں مسز بیسنٹ نے اپنی ہوم رول لیگ بنائی اور اسی سال کے اخیر میں مسلم لیگ اور کانگرس کا سمجھوتا ہو گیا۔ لڑائی ابھی زوروں پر تھی کہ مارچ ۱۹۱۷ء میں رُوس میں بالشویکی انقلاب برپا ہو گیا۔ ان ملکی و غیر ملکی حالات سے متاثر ہو کر برطانوی حکومت نے ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو مسٹر مانٹیگو کے ذریعے سے پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ برطانوی حکومت کے سامنے ہندوستان کے متعلق یہ نصب العین ہے کہ

مرزا غالب

افسانے کی تعمیر و تاسیس میں مندرجۂ ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے:

(۱) اُردوئے معلیٰ .... از غالب مرحوم
(۲) عودِ ہندی .... از غالب مرحوم
(۳) کلیاتِ نثرِ فارسی .... از غالب مرحوم
(۴) دستنبو .... از غالب مرحوم
(۵) یادگارِ غالب .... مولانا حالی مرحوم
(۶) آبِ حیات .... مولانا محمد حسین آزاد مرحوم
(۷) گلشنِ بے خار .... نواب شیفتہ مرحوم
(۸) غالب .... مولانا غلام رسول مہر
(۹) ذکرِ غالب .... مسٹر مالک رام۔ ایم۔ اے
(۱۰) اُردوحِ غالب .... سید محی الدین قادری زور
(۱۱) غالب نامہ .... مسٹر اکرام
(۱۲) لال قلعہ کی ایک جھلک .... سید ناصر نذیر فراق مرحوم
(۱۳) دلی کا ایک یادگار مشاعرہ .... مرزا فرحت اللہ بیگ

نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ مرحوم المتخلص بہ غالب دہلوی کی زندگی کی ایک جھلک آپ لوگوں کی خدمت میں حاضر ہے۔ کوشش یہی کی گئی ہے کہ اُن کی زندگی کے مستند واقعات پیش کئے جائیں مگر زیبِ داستان کی خاطر کہیں کہیں تصرّف بھی کرنا پڑا ہے، کیوں کہ بقول مرزا غالب سے

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

پہلا ایکٹ

پہلا منظر

کشمیرن والا کٹرہ ــــ دو کوٹھے۔ ایک پر مرزا غالب اور اُن کے ساتھی۔ دوسرے پر کنور بلوان سنگھ اور اُن کے ساتھی ــــ پتنگ بازی کے متعلق مرزا غالب ایک خط میں لکھتے ہیں "ایک کٹرہ کشمیرن والا کہلاتا تھا۔ اس کٹرے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے" ــــ مرزا غالب کی عمر سولہ سترہ برس کے درمیان ہے۔ خوش شکل۔ قد اُونچا۔ ہاڑ بہت چوڑا چکلا۔ موٹا موٹا نقشہ۔ سرخ و سپید رنگ ہے۔ اِس میں کچھ زردی بھی جھلکتی ہے اہلِ ذوق ایسے رنگ کو چمپئی کہتے ہیں

مرزا اسد اللہ خاں:۔ (اپنے بھائی مرزا یوسف سے) یوسف ذرا وہ لال جُبدھر بڑھانا ــــ لیکن نہیں .... اِس مانگ پاٹی پتنگ کی چلت پھرت اچھی رہے گی ــــ مرزا چھیلا کے ہاتھ کے کانپ ٹھڈے چھلے ہوئے ہیں ــــ بڑا ہی زوردار پتنگ ہے ــــ اور سُنا تم نے! وہ دوبلی نخ والی چرخی جو چھوٹی تپائی پر دھری ہے وہ لے لو اور اس پر یہ پتنگ بڑھاؤ۔

مرزا یوسف:۔ (دوبلی نخ کی چرخی اٹھا کر۔ پتنگ بڑھانے سے پہلے) بھائی جان۔ اِس نخ کا بہت کھرّا مانجھا ہے (نخ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) یہ تو ڈھیل پر لڑانے کی نخ ہے۔

اسد اللہ:۔ بھئی بلوان سنگھ زیادہ ڈھیل ہی کے پیچ لڑاتے ہیں۔ کھینچ کے پیچ سے وہ بھاگتے ہیں۔ میں نے خود ہی اِس خیال سے مانجھا کھرّا رکھوایا ہے۔

× × × × × × × × × × ×

(دوسرے کوٹھے پر کنور بلوان سنگھ اور اُن کے ساتھی)

شمشیر سنگھ:۔ (کنور بلوان سنگھ سے) تو کنّے میں باندھ لوں یا آپ باندھ دیجئے گا۔

بلوان سنگھ:۔ تمہیں باندھ لو۔ پتنگ زوردار ہے۔ دُہرے کنّے ہوں اور سُنا تم نے۔ اُوپر سات اور نیچے پانچ گرہیں لگانا ہوا ذرا تیز ہے اور پتنگ بھی زوردار ہے۔

شمشیر سنگھ:۔ (پتنگ بڑھا کر) بلوان سنگھ میں تو کھینچ کے پیچ لڑاؤں گا۔ تو سہی اِس دوباز پتنگ سے مرزا نوشہ کی بتّی بلوا دوں۔

کنور بلوان سنگھ:۔ (مرزا اسد اللہ کے گھر کی طرف دیکھ کر زور سے) کیوں مرزا نوشہ۔ یہ مانگ پاٹی پتنگ سے تو مرزا چھیلا کے ہاتھ کی ساخت ٹپک رہی ہے۔ اور سجاوٹ بھی اُنہی کے ہاتھ کی ہے۔ بڑا ہی زوردار ہے۔ خوب اُڑ اٹے لے رہا ہے۔ مگر بھئی سُنا۔ تم جانتے ہو میں کھینچ گھسیٹ کے پیچ نہیں لڑاتا۔ تم ٹھیرے سپاہی۔ مار دھاڑ کی سوجھتی ہے۔ میں ڈھیل کے پیچ لڑاؤں گا۔ کم از کم پیٹی دو پیٹی نخ پر پتنگ ہو تو وہاں ملانے کا مزا آتا ہے۔

× × × × × × × × × × ×

(اسد اللہ خاں اپنے کوٹھے کی چھت سے۔ ذرا زوردار لہجے میں) آپ دو نہیں تین پیٹی پر پتنگ ملائیے پر آج اِس پتنگ سے نو پیچ کاٹوں گا۔ نوشیرواں بنا کے چھوڑوں گا۔

بنسی دھر:۔ (ذرا آگے بڑھ کر) کنور صاحب سنتے ہیں۔ نو پیچ تو مرزا نوشہ آپ کے سر چڑھ جائیں گے اور دسواں گیارھواں میرے آپ کے پیچ لڑے گا۔ میں اِس اپنے دوباز سے آپ کا ایک پیٹا کاٹوں گا اور ایک کے کنّے لوں گا۔ کیوں رہی؟

× × × × × × × × × × ×

بلوان سنگھ:۔ تمہارے تو پھیا رنڈی کنّے لے گی۔ تم مجھ سے کیا پیچ لڑا سکتے ہو۔ اچھا رہی —— تم سے بھی آخر کے دو پیچ لڑائیں گے تمہارے دوباز کو تو بڑھاتے ہی ہاتھ پر سے کاٹوں۔ تو سہی قلا بازی کھاتا ہوا قلعہ تک جائے۔ وہاں کے تلنگے تمہارا دوباز لوٹیں اور تمہارا گُن گائیں۔

× × × × × × × × × × ×

اسد اللہ:۔ بلوان سنگھ۔ ہوا کا رُخ بُرا معلوم ہوتا ہے۔ پتنگ ایک ہی پیٹی پر جا کر بنڈول جانے لگا .... اچھا ملاؤ۔

(اتفاق سے ہوا کمزور تھی۔ ڈھیل کے پیچ مل گئے۔ بلوان سنگھ نے ذرا اپنا پتنگ روک ایک آڑا ہاتھ جو مارا تو مرزا کٹ گئے)

× × × × × × × × × × ×

(بلوان سنگھ والوں نے "وہ کاٹا —— وہ کاٹا —— مرزا نوشہ کٹ گئے" کا شور مچا دیا۔

× × × × × × × × × × ×

اسد اللہ خاں:۔ (بگڑ جاتے ہیں) بنسی دھر، تمہاری جو بات ہے وہ بے عقلی سے خالی نہیں۔ گدھے —— نہیں گدھوں کے سردار ہو۔ تم نے بہت ہی کھُردرا مانجھا رکھوایا ورنہ یہ پیچ کٹنے والا نہ تھا (مرزا یوسف سے) یوسف، تم نے بھی مجھ پر زور نہ دیا کہ اِس نخ پر پتنگ نہ بڑھائیے۔

مرزا یوسف:۔ بھائی جان میں نے تو عرض کیا تھا کہ مانجھا بہت کھُردرا ہے اور اس پر ڈھیل کے پیچ لڑیں گے۔ آپ کے ساتھ بلوان سنگھ نے دھوکا کیا۔ پہلے کہا کہ پیچ پیٹی دو پیٹی پر لڑیں گے اور کھینچ کر پیٹا کاٹ لیا۔

بنسی دھر :- چھوٹے مرزا سچ کہہ رہے ہیں۔

مرزا :- تم دونوں پتنگ بازی سے ناواقف ہی فقط نہیں بلکہ نرے کھرے بیوقوف بھی ہو۔ الّو کی دم فاختہ۔

بنسی دھر :- خیر اب جو ہونا تھا ہو گیا۔ آپ نے سیکڑوں پیچ کاٹے ہیں۔ آج بلوان سنگھ نے دھاندلی کر کے ایک پیچ کاٹ دیا تو کیا ہوا ــــــ چلو آؤ مرزا نوشہ، چوسر کی ایک بازی رہے۔

(سب کوٹھے پر سے نیچے اُترتے ہیں)

× × × × × × × × × ×

دوسرا منظر

مرزا اسداللہ خاں کے نانا خواجہ غلام حسین خان کا گھر۔ (اس کے متعلق غالب اپنے دوست منشی شونرائن کو لکھتے ہیں "ہماری بڑی حویلی وہ ہے کہ جو اب لکھی چند سیٹھ نے مول لی ہے۔ اس کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی") ــــــ اس حویلی کا زنانخانہ ــــ خواجہ غلام حسین خان کمیدان۔ سفید ریش بزرگ زنانخانے سے باہر نکلتے ہیں کہ اندر سے آواز آتی ہے)

امراؤ بیگم :- (غالب کی بیوی) .... آپ سے ایک بات کہنی تو بھول ہی گئی۔

(خواجہ صاحب زنانخانے کی طرف پردہ اُٹھا کر بولے)

خواجہ صاحب :- کیوں امراؤ بیگم، خیر تو ہے؟ ــــ کیا بات ہے؟

امراؤ بیگم :- (دروازے کی آڑ سے) نانا جان۔ آپ اُن کو منع نہیں کرتے۔ دن بھر چوسر کھیلتے رہتے ہیں اور شام کو کنور بلوان سنگھ کے ساتھ روزانہ پتنگ بازی ہوتی ہے۔ پیسہ اُڑ رہا ہے۔ یہ تو وہی مثل ہوئی۔ کہتے ہیں اللہ کرے تیری دولت اُڑ جائے اور اُن کے مزاج سے تو آپ واقف ہی ہیں، میری مجال ہے جو میں اشارے کنائے میں بھی اس بات کو اُن پر جتاؤں۔

خواجہ صاحب :- ہاں بیٹی، میں بھی کئی دن سے سوچ رہا تھا کہ اس کو مناسب طور سے سمجھاؤں، سو تم نے آج یاد دلا دیا۔ میں ضرور کہوں گا۔ تم خاطر جمع رکھو۔

امراؤ بیگم :- حضور آپ ہی خیال کریں کہ اس طرح قارون کا خزانہ بھی ہو تو خالی ہو جائے۔ ذرا نہیں سمجھتے کہ آج (شرما کر) ہم دو ہیں کل تین ہو جائیں۔ اپنے فضل و کرم سے کوئی نیا بندہ اللہ بھیج دے تو اُس کی پرورش تعلیم سب ہی تو ہے۔

خواجہ صاحب :- خدا تیری زبان مبارک کرے۔

امراؤ بیگم :- جب ہی تو میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ اُن کو نصیحت کیجئے۔ آپ نے پالا پرورش کیا ہے۔ مگر سنیں گے تو وہ آپ ہی کی سنیں گے اور مجھے تو وہ خطرے ہی میں نہیں لاتے۔

خواجہ صاحب :- اچھا بیٹی۔ لو میں آج ہی کہتا ہوں۔

(خواجہ غلام حسین یہ کہہ کر باہر ڈیوڑھی کا رخ کرتے ہیں کہ سامنے سے غالب اور اس کے احباب پتنگ اُٹھا کر آتے ہیں)

خواجہ صاحب :- (غالب سے) صاحبزادے۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔ ذرا ادھر آؤ (بنسی دھر اور مرزا یوسف سے) آپ دیوان خانے میں چل کر بیٹھئے۔ یہ تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔

خواجہ :- (بنسی دھر اور یوسف کے چلے جانے کے بعد) میرے سوال کا جواب دو۔ مجھے اپنا بہی خواہ سمجھتے ہو یا دشمن بدخواہ۔

مرزا :- نانا جان آپ یہ کیا فرما رہے ہیں۔ آپ میرے بزرگ ہیں۔ آپ نے مجھے پالا پرورش کیا۔ آپ میرے بہی خواہ کیا معنی ولی نعمت ہیں۔

خواجہ :- مرزا نوشہ اب تمہاری عمر ماشاء اللہ سولہ سترہ کے لگ بھگ ہوگی۔ تمہارا مشغلہ اب تک سوائے دن بھر چوسر کھیلنے شام کو پتنگ

اڑانے کے سوا اور کچھ نہیں رہا . . . . دولت برباد کر رہے ہو ۔ بیٹی ہوش میں آؤ ۔ کوئی کمال حاصل کرو ۔ نام پیدا کرو ۔
اپنے بزرگوں کی جائداد میں اضافہ کرو ۔

(سامنے سے مرزا غالب کے استاد ملا عبدالصمد پارسی ایرانی آتے دکھائی دیتے ہیں)

مرزا اسداللہ :- (ذرا آگے بڑھ کر) اسلام وعلیکم ۔

عبدالصمد :- زندہ باش ۔

خواجہ :- میں بھی تسلیم عرض کرتا ہوں ۔

عبدالصمد :- کورنش بجا لاتا ہوں ۔ مزاج مبارک ۔

خواجہ صاحب :- الحمدللہ ، ہر حال میں اللہ کا شکر ہے ۔ خوب وقت پر آ گئے ۔ میں آپ کے شاگرد کو کچھ نصیحت کر رہا تھا ۔

(عبدالصمد غالب کی طرف دیکھتا ہے اور مسکراتا ہے)

خواجہ :- میں اس سے کہہ رہا تھا کہ بھئی اب تم سولہ سترہ برس کے ہو گئے ہو ۔ ایک بچے کے باپ ہونے والے ہو ۔ ذرا لہو لعب کھیل کود میں کمی کرو ۔ کچھ دنیا میں نام پیدا کرو ۔ کوئی کمال حاصل کرو ۔

ملا عبدالصمد :- (غالب سے) جاؤ بابا جاؤ ۔ تمہیں جہاں جانا ہے جاؤ ۔ میں خواجہ صاحب سے مل کر تمہارے پاس آؤں گا ۔

(غالب چلے جاتے ہیں)

خواجہ صاحب :- اچھا جو آپ کی مصلحت ۔

عبدالصمد :- جناب خواجہ صاحب ، برا نہ مانئے تو ایک بات عرض کروں ۔

خواجہ صاحب :- نہیں برا ماننے کی کیا بات ہے ۔ آپ فرمائیے ، کیا ارشاد ہے ۔

عبدالصمد :- اگر مرزا نوشہ آپ کی طرح کمیدان یا باپ دادا کی طرح رسالدار یا اُن سے بھی زیادہ مثلاً عہدۂ چار ہزاری پر پہنچ کر سپہ سالار بھی ہو گیا تو کیا ۔ ایسوں کے نام اُن کے ساتھ ہی مٹ جاتے ہیں لیکن اسے تو ادب اور شعر کا افراسیاب بننا ہے ۔

خواجہ صاحب :- آپ کی اس تقریر سے میں کچھ نہ سمجھا آپ کا مطلب کیا ہے ؟

عبدالصمد :- مطلب یہ ہے کہ اسداللہ خاں بہت بڑا شاعر ہوگا ۔ اُس کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا اور آپ کا ہمارا نام بھی اُسی کی بدولت روشن ہوگا ۔ اُس کو اپنے حال پر چھوڑ دیجئے ۔

خواجہ صاحب :- میں تو بہر حال آپ ہوں اور آپ ملن جانے والے ہیں ، باقی اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ مرزا نوشہ فن شاعری میں نام پیدا کرے گا اور اُس کا کلام قیامت تک باقی رہے گا تو یوں ہی سہی ۔ خدا ایسا ہی کرے . . . . . آپ کے منہ میں گھی شکر . . . . . پر فضول خرچی سے تو اُسے باز آنا چاہئے ۔

(دونوں دیوانخانے کی طرف بڑھتے ہیں)

× × × × × × × × × × ×

تیسرا منظر

بنسی دھر کا مکان ۔ ان کے متعلق غالب منشی شیو نرائن کے نام ایک خط لکھتے ہوئے کہتے ہیں " میں اور منشی بنسی دھر ہم عمر تھے ۔ منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں ، اُنیس بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر اُن کی ۔ باہم شطرنج اور اختلاط اور صحبت ۔ آدھی آدھی رات گذر جاتی تھی ۔ چونکہ گھر اُن کا بہت دُور نہ تھا ، اس واسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے تھے "۔ بنسی دھر کے مکان کی بیٹھک ۔ گاؤ تکیئے لگے ہیں ۔ سفید بے داغ چاندنی بچھی ہوئی ہے ۔ مرزا غالب ، اُن کے

بھائی مرزا یوسف اور صاحبِ خانہ بنسی دھر چوسر کھیلنے میں مصروف ہیں۔

بنسی دھر:۔ رنگ تو آپ سب لے گئے۔ بدرنگ میں یہ جو دو گوٹیں آپ کی باقی ہیں اُن کے لئے ساری اپنی گوٹیں، کھڑا ہو جاؤں گا اور اُن کو منزلِ مقصود تک پہونچنے نہ دوں گا۔

اسد اللہ:۔ یہ گوٹ تو پاؤ بارہ یا سات چھ تیرہ سے اِس گھر میں پہونچتی ہے۔ رہی دوسری وہ کچے بارہ سے گھر جاتی ہے۔ لو دیکھو پھینکتا ہوں۔

بنسی دھر:۔ پانسہ بنا کر نہ پھینکئے گا۔ میں دیکھ رہا ہوں آپ تلے اوپر پانسے رکھ رہے ہیں۔

مرزا صاحب:۔ اب روتے ہو (پانسہ پھینک کر) لو یہ پاؤ بارہ .... وہ مارا پاؤ بارہ۔ لو کچے بارہ بھی لو (پانسہ پھینکتے ہوئے) لو یہ کچے بارہ .... دیکھا۔ دیکھ لو۔ یہ کچے بارہ دھرے پڑے ہیں۔ یوں پانسہ پھینکتے ہیں۔

مرزا یوسف:۔ بھائی جان۔ آپ کی پشت پر جو گنی ہے بولنی۔

اسد اللہ:۔ (بنسی دھر سے) کہو چھ تین نو پھینکوں۔

بنسی دھر:۔ چھ تین نو کہیں آئے نہ ہوں۔

(مرزا پانسہ پھینکتے ہیں پر چھ تین نو نہیں آتے۔ اس پانسے پر اُن کی بازی رُکی پڑی ہے کہ اتنے میں اُن کے نانا خواجہ غلام حسین خان کا خدمت گار آتا ہے، گھبرایا ہوا)

خدمتگار:۔ (اسد اللہ سے) حضور آپ کے نانا جان کی بُری حالت ہے۔ دِل بیٹھے کراہ رہے ہیں۔

اسد اللہ:۔ ارے بھئی ابھی ابھی تو میں آرہا ہوں اچھا بھلا چھوڑ آیا ہوں (زچ بچ ہوتے ہوئے) اور یہاں بازی چھ تین نو پر رُکی ہوئی ہے۔

بنسی دھر:۔ اب دو ہاتھ میں میری ساری گوٹیں پونگ جاتی ہیں۔ یا چھ تین نو پھینکتے جائیے یا ہار مان لیجئے۔

مرزا اسد اللہ:۔ (پانسہ ہاتھ میں لے کر) لو یہ چھ تین نو۔

بنسی دھر:۔ تین کانے۔

مرزا اسد اللہ:۔ بھئی نانا جان کو دیکھ آؤں۔ یوں ہی بازی بچھی رہنے دو۔

(مرزا اسد اللہ خدمت گار کے ساتھ کمرے سے باہر نکلتے ہیں)

× × × × × × × × × ×

چوتھا منظر

خواجہ غلام حسین خان کمیدان کا مکان ۔۔۔ دیوانخانہ۔ پُر تکلف طور پر سجا ہوا۔ خواجہ غلام حسین خان بے ہوش پڑے ہیں۔ پاس حکیم صاحب، اور ملا عبد الصمد بیٹھے ہیں۔

عبد الصمد:۔ حکیم صاحب۔ ابھی ابھی بھلے چنگے مجھ سے باتیں کر رہے تھے کہ دِل پکڑ لیا اور فرمانے لگے میں چلا۔ دل میں درد ہو رہا ہے اور ایک منٹ کے اندر غشی طاری ہو گئی۔

حکیم صاحب:۔ دِل کی بیماری دفعتہً ہی اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ غشی بھی لازمی چیز ہے۔ دیکھنے میں نبض دیکھتا ہوں۔

عبد الصمد:۔ کہئے نبض کیا کہہ رہی ہے (اضطراب کی حالت میں اٹھ کر) دیکھئے اسد اللہ خان کو بلوا بھیجا تھا کہ جلد آؤ۔

وہ بھی ابھی تک نہیں آئے۔

حکیم صاحب:۔ حالت نازک ہے۔ چند دقیقہ کے مہمان ہیں۔ باہر چلیئے۔

(دونوں دیوانخانے سے باہر نکلتے ہیں سامنے سے مرزا غالب آتے ہیں)

عبدالصمد:۔ (اسد اللہ سے) تم نے بہت دیر لگا دی۔ تمہارے نانا صاحب کی حالت بہت نازک ہے۔

مرزا غالب:۔ (گھبرا کر) آخر ہؤا کیا۔ میں تو اچھا بھلا صحیح تندرست چھوڑ گیا تھا۔

عبدالصمد:۔ مجھ سے تمہارے ہی متعلق کچھ باتیں ہو رہی تھیں۔ فرما رہے تھے کہ اب میرا خیال ہے سب جائداد وغیرہ صاحبزادے کے سپرد کر دوں ضعیفی کے باعث اب مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ کہ ایک بار ہانے کہہ کر دل پکڑ لیا اور غشی طاری ہوگئی۔ جلدی کرو۔ جاؤ، اُن کے پاس عورتوں کو بُلا لو۔ جاؤ جلد جاؤ مرتے وقت سوائے تمہارے اور کون اُن کو کلمہ پڑھائے گا۔

(مرزا چشم پُرآب زنانخانے میں چلے گئے۔ حکیم صاحب اور ملّا عبدالصمد باہر کھڑے رہتے ہیں۔ اتنے میں اندر سے عورتوں کے رونے کی آواز آتی ہے۔ حکیم صاحب اور ملّا عبدالصمد اناللّٰہ وانا الیہ راجعون ؕ کہتے ہیں)

× × × × × × × × × × ×

پانچواں منظر

غالب کے خسر نواب الٰہی بخش خان کا مکان ——— دیوان خانہ ——— نواب الٰہی بخش کے بڑے بھائی نواب احمد بخش آتے ہیں۔ نواب الٰہی بخش اُن کی تعظیم کرتے ہیں۔ دونوں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔

× × × × × × × × × × ×

الٰہی بخش:۔ تسلیم۔ بھائی جان، آج آپ نے بہت دنوں کے بعد سرفراز فرمایا۔

احمد بخش:۔ جیتے رہو! بھئی تم جانتے ہو۔ میں بہت عدیم الفرصت رہتا ہوں۔ وہ تو آج ایک ضروری بات تم سے کہنی تھی اس لئے آگیا۔

الٰہی بخش:۔ خیر، خدا خیر کرے کیا بات ہے؟

نواب احمد بخش:۔ مرزا اسد اللہ نے اپنے نانا کے مرتے ہی خوب گلچھرّے اڑانے شروع کئے ہیں۔ شراب خواری، چوسر بازی وغیرہ آج کل خوب زوروں پر ہو رہی ہے۔ میرے خیال میں اگر اُن کا یہی عالم رہا تو جائداد وغیرہ سب کنارے لگ جائے گی۔ بھتیجی اور بیٹی میں کیا فرق ہے جیسے امراؤ بیگم تمہاری بیٹی ویسی میری۔ مجھے اُس کی تباہی کا خوف ہے۔

الٰہی بخش:۔ تو پھر بھائی جان کیا کیا جائے۔

احمد بخش:۔ یہ کیا جائے کہ مرزا اسد اللہ کو تم اپنے پاس بُلا لو اور اُن کو اپنی نگرانی میں رکھو۔ اپنے ساتھ اپنے گھر میں رکھو۔ یہی ایک صورت ہے۔ اس میں یہ ہوگا کہ وہ اس گھر میں تمہارے ادب لحاظ سے نہ شراب خواری کر سکتا ہے اور نہ دوست احباب کا مجمع لگا کر اُن سے چوسر گنجفہ کھیل سکتا ہے۔

الٰہی بخش:۔ آپ کی رائے بالکل درست ہے۔ حکم ہو تو آج ہی میں آگرہ روانہ ہو جاؤں اور اُس کو جا کر لے آؤں۔

احمد بخش:۔ دیر نہ کرو۔ جلد جاؤ اور اُس کو لے کر آؤ۔ اسی میں خیریت ہے۔ ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ پنشن کا جو اُس کو اور مرزا یوسف کو ملتا ہے وہ بھی چٹ کر جاتا ہے اور میں سنتا ہوں کہ مال سے الگ لیتا ہے اور نانا کی جائداد اور املاک پر بھی ہاتھ صاف کر رہا ہے یا کر چکا ہے۔

(باقی) ——— **سعادت حسن منٹو**

بے بسی

رات کی تیرہ و تاریک فضا میں تارے
جھلملاتے ہوئے جب سانس لیا کرتے ہیں
اِک خیال آنکھ مچولی کا مجھے آتا ہے ——
دِن کے ہنگامے میں ہستی کے پرائے لمحے
جن کو میں پیٹ کے دھندوں میں اُڑا دیتا ہُوں
ایک ایک آتے ہیں آنکھوں میں کہانی بن کر،
زندگی کم ہے —— مگر فرصتِ ہستی کب ہے ؟
آرزوئیں مری پھیکی ہیں کہ دِل کی باتیں
میرے سینے ہی میں گھٹ گھٹ کے رہی جاتی ہیں ——
سانس دو چار مسرت کے جو لینے تھے مجھے
پیٹ کے دھندوں پہ قربان ہوئے جاتے ہیں ——
میری دنیا کے پہاڑوں پہ بہاریں بھی تو ہیں،
گلستاں بھی ہیں، کھُلے کھیتوں کے نظّارے بھی
تُو بھی آغوش میں رہنے کے لئے ہے بیتاب، ——
سانس دو چار مسرت کے جو لے سکتا تھا
ایسے انداز میں بے کار لئے جاتا ہُوں
جیسے قیمت ہی نہیں اُن کی، مری نظروں میں ——
کس قدر تلخ حقیقت ہے، مگر کیا کیجے ؟ ——
اب تو بس رات کی تاریک فضا ہے جس میں
اِک خیال آنکھ مچولی کا مجھے آتا ہے
بے بسی اُس کو بھی بے کار بنا دیتی ہے

یوسف ظفر

جدید شاعری[1]

ہر دور میں دنیا کی ہر چیز ہم آغوشِ انقلاب رہی ہے اس انقلاب میں کبھی اُس چیز کی بقا کے سامان پیدا ہو جاتے ہیں اور کبھی فنا کے ۔۔۔ نظم کا وجود دنیا میں صدیوں سے پایا جاتا ہے ہمارے ہم وطن تو ویدوں کو (جو منظوم ہیں) الیشور کرت [illegible] اور اُن کا دنیا کے ساتھ پیدا ہونا بیان کرتے ہیں اس چیز کی ابتدا جس طرح بھی ہوئی ہو ابتدا میں اس میں کیسی ہی بدنظمیاں رہی ہوں مگر انقلاباتِ زمانہ نے آگے چل کر اِن میں ایک نسق اور انتظام پیدا کر دیا ہے جس سے دنیا ایک حد تک مطمئن ہو گئی اور اس بنائے ہوئے راستے پر اپنی شاعرانہ منازل طے کرنے لگی۔ غالباً اسی وجہ سے اس کا نام نظم رکھا گیا ہے حالانکہ نظم کے معنی موتی کی لڑی کے بھی ہیں اور موتی کی لڑیاں بالعموم یکساں اور برابر ہوتی ہیں میری مراد یہ نہیں کہ ہر قسم کے موتیوں کی لڑیاں برابر ہوتی ہیں بلکہ اپنی قسم کے موتیوں کے لچھے میں لڑیاں برابر ہوتی ہیں۔

ایشیائی شاعری میں اس کی ترقی یافتہ صورت غزل ہے بالخصوص ایران اور ہندوستان کے ادب سے اگر غزل کا سرمایہ مٹا دیا جائے تو حصۂ نظم نامکمل اور برائے نام رہ جاتا ہے۔ اساتذۂ متقدمین نے غزل کے لئے ردیف و قوافی کو ضروری عنصر قرار دیا ہے اور بحر کی پابندی تو ہر نظم کے لئے لازمی کر دی ہے۔ (یہاں نظم سے میری مراد جملہ اصنافِ سخن ہے) اور عروض کے نام سے بحروں کا ایک مکمل قانون ہمارے لئے بنا دیا ہے۔ اسی قانون کے تحت ایشیائی شاعری اپنی منزلیں طے کر رہی ہے اور اس میں طرح طرح کی جدتیں رفعتیں بھی ہر دور میں ہوتی رہی ہیں۔ زمانہ جیسے جیسے ترقی کرتا جائے گا زبان و کلام میں ترقیاں ہوتی رہیں گی۔ یہاں یہ بات کہہ دینے کی ہے کہ عروض کے علاوہ غزل پر نہ صرف غزل پر بلکہ جملہ اصنافِ سخن پر کچھ اور بھی ایسی پابندیاں عاید ہوتی رہی ہیں جن پر عمل درآمد ذرا مشکل چیز ہے۔ مثلاً ہر صنفِ سخن کی مخصوص زبان۔ ندرتِ تخیل چستیٔ بندش۔ مناسبتِ الفاظ۔ متروکات۔ صحتِ محاورات۔ تذکیر و تانیث کا صحیح استعمال۔ علم قافیہ۔ تراکیب عطفی و اضافی میں مخصوص قواعد۔ وغیرہ وغیرہ۔ انہیں پابندیوں کے ماحول میں ہندی شاعر شعر کہنا شروع کرتا رہا اور انہیں پابندیوں میں اسے فن شعر اور شعر گوئی کی تکمیل کرنی پڑی۔

ظاہر بات ہے کہ اتنی پابندیوں کو برداشت کرنا اور حصولِ فن کے لئے دس بارہ برس تک کسی استاد کا مطیع بنا رہنا اور اس شوق پر کسی نہ کسی نوعیت سے حسبِ حیثیت خرچ بھی کرنا معمولی کام نہیں پھر لطف یہ کہ اس محنتِ شاقہ کا حاصل سوائے پریشانی اور محسود ہو جانے کے کچھ نہیں اور ملک کی فضا کچھ ایسی کہ جہاں کوئی خواندہ یا نیم خواندہ اپنے اندر بہت سی اعزازی خوبیاں دیکھنا چاہتا ہے وہاں شاعر ہو جانا بھی ضروری تصور کرتا ہے پس یہ کس طرح ہو کہ چنے بھی کھائے جائیں اور ساتھ ہی ساتھ شہنائی بھی بجائی جائے یہاں ایک نکتہ اور بیان کر دینا چاہتا ہوں۔ ہر فن۔ علم یا ہنر اپنے اصول کے لحاظ سے ایک الگ چیز ہوتا ہے اس کے حصول کے لئے ایک دیگر علوم کے ماہر کو بھی اُسی طرح ا۔ ب۔ ت سے کام شروع کرنا پڑتا ہے جس طرح ایک مبتدی بچے کو۔ یہ بات دوسری ہے کہ شخصِ اول اپنے دیگر علوم کی وجہ سے اس بچے کے مقابلے میں جلد ترقی کر لے مگر ابتدائی طریقۂ کار اور دقتیں دونوں کو برابر لاحق ہوتی ہیں اور دونوں کو ایک ہی اسٹیج سے کام شروع کرنا ہوتا ہے۔ یہی حال شاعری کا ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ ایک معمولی پڑھا لکھا اور ایک فارسی اور عربی کا منتہی جب شاعری کی بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں تو دونوں کو یکساں دورے پڑتے ہیں یعنی ابتدائی اشعار دونوں کے ڈھیلے۔ بے ربط۔ مبتذل قسم کے ہوتے ہیں حالانکہ بلحاظِ علم دونوں میں بُعد المشرقین ہوتا ہے اب اگر صاحب علم مبتدی یہ خیال کرے کہ میں اتنا قابل ہوں لہٰذا میرے اشعار بھی روزِ اول سے ہی بلند اور بہتر ہونے چاہئیں۔ یہ اس کی خام خیالی ہے۔ ہر نئے میدان میں قابل و جاہل ایک ہی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی زعمِ باطل کے فریب میں مبتلا ہو کر ہمارا گریجوایٹ طبقہ جو اپنے کو شاعر کی حیثیت سے بھی ملک میں روشناس کرانا چاہتا ہے مگر شاعری کو سیکھنا اسے پسند نہ تھا کچھ اس لئے کہ اتنی پابندیاں کون برداشت کرے اور کچھ اس لئے کہ ہم خود قابل ہیں اور سب کچھ جانتے ہیں لہٰذا شاعری کیا مشکل ہے۔ ہماری شاعری کی تخریب کے درپے ہو گیا اور چونکہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے پھر جب ایک قابل شخص یا گروہ کسی کام میں ہاتھ ڈالتا ہے تو اپنی قابلیت سے بہت سی مفید مطلب دلیلیں بھی سوچ لیتا

---

[1] ایڈیٹر کا مضمون نگار سے کلیۃً متفق ہونا ضروری نہیں۔

ہے لہٰذا اس طبقہ نے بھی ایسی صورت نکال ہی لی جو شاعر بھی بنا دے اور حصول کی دشواریوں سے بھی بے نیاز رکھے۔

سب سے پہلے اس جماعت نے غزل کے خلاف جو بہت مشکل چیز ہے آواز بلند کرنا شروع کیا۔ مثلاً غزل بے کار چیز ہے۔ غزل مخرب اخلاق رجحانات پیدا کرتی ہے۔ غزل غیر قدرتی چیز ہے۔ غزل غیر مسلسل ہوتی ہے اور اس میں کوئی خیال وضاحت سے بیان نہیں کیا جاسکتا غزل میں ردیف و قوافی کی پابندیاں آزادی سے اظہار خیال میں مانع ہوتی ہیں۔ غزل کے مضامین فرضی ہوتے ہیں جن کی بنیاد محض قافیے ردیف پر ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ پروپیگنڈے کا اصول ہے کہ کوئی سنے نہ سنے مانے نہ مانے کہے جاؤ۔ ابتدا میں لوگ مخالفت کریں گے پھر کچھ چھٹنے لگیں گے پھر ہم خیال پیدا ہونے شروع ہو جائیں گے اور انجام میں ایک اچھی خاصی جماعت تمہارے ساتھ ہوگی۔ میرے خیال سے ایسا ہی ہوا اور ہو رہا ہے۔

غزل دشمنی میں نظم کی ترویج ہوئی دعویٰ یہ تھا غزل میں چونکہ گل و بلبل اور سرمہ مسی کے بے کار و فضول مضامین قوم کی اصلاح نہیں کر سکتے اس لئے نظم ہی ایسی چیز ہے جس میں جی بھر کر ایک خیال پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے اور ایک موضوع کے ماتحت وہ بہت کچھ کہا جاسکتا ہے جس سے انسان کے اصلاحی جذبات کو ابھارا جا سکے مگر یہ کوئی نئی چیز نہیں اس کی تخلیق بہت پہلے اُردو میں ہو چکی تھی۔ حالی کا مسدس۔ اقبال کے متعدد ضخیم دواوین۔ جوش کے ترانے لوگوں کے کانوں تک پہنچ چکے تھے اور جس وقت ادب جدید کے حامی غزل کے لئے خنجر بکف میدان کارزار میں آئے نظم اپنی بہت سی منازل طے کر چکی تھی اگرچہ غزل دوست حضرات کا دعویٰ اپنی جگہ اب بھی اٹل ہے کہ غزل کا ایک شعر لبا اوقات پوری نظم کا خلاصہ ہوتا ہے اور جو اثر ایک لمبی نظم قلب انسانی پر نہیں کر سکتی وہ ایک شعر کر جاتا ہے مگر پھر بھی قریب قریب ہر غزل گو نے نظم کو اپنانے میں فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ اور اصلاحی مقاصد کے لئے نظمیں لکھنے لگے مگر اسی قانون کے دائرے میں جو اساتذہ متقدمین نے اصناف سخن کے لئے مدون کیا تھا۔

اور چونکہ ادب جدید یا نئی شاعری کے دعوے دار جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے اس قانون پر چلنے سے معذور تھے لہٰذا ان کا علم بغاوت نہ صرف غزل کے خلاف بلند رہا بلکہ اس قسم کی نظمیں بھی دقیانوسی تخیل کی آئینہ دار ٹھہرائی گئیں۔ ایک ایسی چیز کی داغ بیل ڈالی جانے لگی جس کے معنی مجھ جیسے بے مایہ اور کم سواد غزل دوستوں کی سمجھ میں ہنوز نہیں آئے۔

نظم کے رواج کے حامی یہ دعویٰ لے کر اٹھے تھے کہ نظم سے اصلاح کا کام لیا جائے اور چونکہ غزل اس بات میں جسم شاعری پر عضو مفلوج ہے اس کو قطع کر دیا جائے اب دیکھنا یہ ہے کہ حامیانِ جدید شاعری کی نظمیں کس قدر اصلاحِ قومی فرما رہی ہیں اور غزل کے خراب کردہ اخلاق پر کس طرح غلاف کعبہ ڈال کر ان کو از سرتاپا تقدس۔ مردانگی۔ ہدایت کے سانچوں میں ڈھالا جاتا ہے ——

آپ جس ادبی رسالے کو اٹھا کر دیکھئے آپ کو دو ایک ایسی نظمیں ضرور نظر آئیں گی۔ ان نظموں کی خصوصیات کیا ہوں گی ملاحظہ فرمایئے

(۱) نظم از سرتاپا (بالعموم) اغلاطِ فنی سے لبریز ہوگی اور اسے دیکھ کر یہ اندازہ ہوگا کہ ایک ایسی اُردو کی داغ بیل ڈالی جارہی ہے جس میں شاید عرشِ اعظم پر فرشتگانِ مقرب بارگاہ الٰہی شاعری کیا کریں گے۔

(۲) نظموں کے عنوانات ہوں گے۔ احساسات۔ نجمہ۔ عذرا۔ تمہاری یاد۔ گنگا کے کنارے وغیرہ وغیرہ۔ نظموں کے اندر کیا ہوگا؟ ایک شاعر کا ایک شریف زادی سے بازاری معاشقہ۔ جسم کے سڈول۔ اعضا کے متناسب۔ سرمہ کے دنبالہ دار ہونے اور لمس سے جسم شریف میں برقی لہر دوڑنے کا رقت خیز اور درد آمیز سانحہ۔ یا ایک شریف زادی کو ان کے ساتھ بھاگ چلنے کی تحریک۔ یا اپنے بیاہتا کو زہر دے کر ان عاشق وفادار کے ساتھ عقد ثانی فرما لینے کا مشورہ۔ یا پہلی مجرمانہ محبت کے واسطوں سے دوبارہ رحم کھانے کی ترغیب یا خود زہر کھا کر نام روشن ہو جانے کی دھونس۔ یا ساری۔ انگیا کرتی۔ بوئے دہن۔ جادوئے چشم شرمگیں کی رنگینی و سحر کاری سے ہمارے شاعر ادب جدید کا بازار کے چوراہے پر چاروں شانے چت غش کھا کر گرنا غرض "مختلف ہیں خواب لیکن ایک ہی تعبیر ہے" کے تحت عنوان نظم کچھ ہو مگر نفسِ نظم میں یہی اصلاحی کارنامے ہوں گے۔ یا ان سے ملتے جلتے اور اس قسم کی نظمیں بلحاظ تناسب ۹۸ فی صدی ملیں گی۔

غزل کے مخربِ اخلاق ہونے کا سرٹیفکیٹ دینے والے کاش چشمِ ہوش وا کر کے دورِ حاضر کی نظم بھی ملاحظہ فرمالیں اور اپنے ان ادبی کارناموں پر نظر بھی ڈالیں اور پھر خود ہی جج بن کر فیصلہ کریں کہ غزل مخربِ اخلاق ہے یا یہ نظمیں۔ غزل میں عریانی ہوتی ہے یا آپ کی نظموں کی عریانی کو دیکھ کر شرافت ۔غیرت ۔حمیّت ۔ انسانیت ۔سربگریباں ہو جاتی ہے ۔غزل بے کار چیز ہے کہ جس کا ہر شعر اپنے اندر ایک جداگانہ نظم پوشیدہ کئے ہوتا ہے یا آپ کی یہ نظمیں دریابرد کر دینے کے قابل ہیں۔ معاف فرمائیں حامیانِ ادبِ جدید جو بے حیائی کے مظاہرے آپ کی اِس چند دن کی چھوکری نظم نے پیش کر کے نظامِ شرافت درہم برہم کر دیا غزل صدیوں میں بھی نہ کر سکی وہاں تو اگر عشق کا اظہار بھی (جو ایک قدرتی جذبہ ہے) کیا گیا تو "عشق مرد با مرد" کا پردہ پہلے ڈال دیا گیا کہ کسی پردہ نشین خاتون کی رسوائی نہ ہو اور آپ نے تو ہر شریف زادی کو اس کی محلسرائے سے گھسیٹ گھسیٹ کر بازار کے بالاخانوں پر لا بٹھایا ۔ ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تابکجا ۔ مجھے حیرت ہوتی ہے جب آپ حضرات غزل پر اس قسم کے اعتراضات وارد فرماتے ہیں ۔خدا جانے آپ کا منہ کس طرح کھل جاتا ہے ۔ میں جملہ حامیانِ جدید شاعری کو دعوتِ فکر و غور دیتا ہوں کہ وہ اپنی کل نظموں کو اٹھا کر دیکھیں کہ اُن میں بازاری مضمون کتنا ہے اور اصلاحی کتنا۔ فضول چیزیں کس قدر ہیں اور کار آمد کتنی بر خلاف اس کے شعراء متغزلین میں وہ جس کسی کو بھی لغو گو اور عریاں نویس سمجھتے ہوں اس کے دیوان کا مطالعہ فرمائیں کہ اس میں اصلاحی ۔فطرتِ انسانی کے مطابق ۔نیز اچھے اسباق کے حامل کتنے اشعار ہیں اور بے کار کتنے ۔ مجھے یقین ہے کہ غزل کے شعراء متقدمین میں بھی وہ اس قدر فضول گوئی اور بے راہ روی نہ پاسکیں گے جتنی اُن کی نظموں میں ہے اور حال کے شعراء غزل نے تو اپنے میدان ہی بدل لئے ۔جن چیزوں کی آڑ لے کر غزل کو مردود کیا جاتا ہے وہ آج قریب قریب غزل سے سب نکل چکی ہیں اور اس کا میدان بہت وسیع ہو چکا ہے ۔ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب ۔

اس جدید شاعری کا دوسرا کارنامہ "لفظوں کا کھیل ہے" شان دار ۔چمک دار اور موٹے موٹے لفظ اس خوبی سے اشعار میں نظم فرمائے جاتے ہیں کہ معمولی پڑھا لکھا بیک نظر دیکھ کر مرعوب تو ہو جائے لیکن اس دریائے لفاظی میں لاکھ غواصی کرے گوہرِ معانی ہاتھ نہ آئے تراکیب بھی بہت شان دار ہوں گی ۔ مگر سب اسی سانچے کی ڈھلی ہوئی ۔ایک جملہ سے اگر کافی دماغی ورزش کے بعد کوئی تُک ملائی جا سکے تو اگلا فقرہ یا جملہ یا لفظ فوراً اس خیال میں سدِ راہ بن کر اعلان کر دیتا ہے کہ حضرت معاف فرمائیے ۔آپ جو کچھ معانی نکالنے کی سعی فرما رہے ہیں وہ میری موجودگی میں ممکن نہیں ۔ ایسے مہمل الفاظ کا کافی ذخیرہ میں نے جمع کیا ہے اور آئے دن رسائل اس میں اضافہ کرتے رہتے ہیں ۔ مجھے اُن حضرات کی پردہ دری یا رسوائی منظور نہیں اس لئے میں اس کلام کا نمونہ مثال میں پیش کرنا نہیں چاہتا آپ یقین فرما لیجئے کہ میں نے بہت سی نظمیں ایسی پڑھی ہیں جن کے عنوان سے اُن کے اشعار کو دُور کا بھی واسطہ نہیں ۔ اور نہ صرف عنوان و مضمون کی غیر آہنگی ہوتی ہے بلکہ از سرتا پا پوری نظم پڑھ جائیے اشعار میں نہ باہم ربط ہوتا ہے اور نہ باوجود کوشش بسیار یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ہمارے شاعر صاحب فرما کیا رہے ہیں اس نظم کا مقصد کیا ہے ۔بس غیر مسلسل بے ربط و بے تعلق الفاظ و جمل کا ایک جال بچھا ہوتا ہے جس کا مفہوم شاعر صاحب ہی سمجھتے ہوں ۔ غزل کے مقابلے میں یہ معمّے بازی ۔کس قدر انصاف کا خون ہے کہ جس کا ایک ایک شعر ایک ایک مصرعہ بلکہ ایک ایک لفظ فن کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ۔ آزارِ اہمال سے پاک حشو و زوائد سے معرّا اور اپنی معنی آفرینیوں میں اپنا جواب خود ہی ہو مگر جس طرح ردیٹے کی آواز بلند ہونے پر سچائی خاموش ہو جاتی ہے اسی طرح اربابِ کمال جدید شاعری کی بلند بانگ صدائیں سُن رہے ہیں اور چپ ہیں ۔

یہ سیلاب بظاہر فی الحال اپنی پوری کف در دہانی اور غارت گری کے ساتھ صدیوں کا اساسۂ سخن بہائے لئے جاتا ہے مگر مستقبل قریب میں ہی یہ چڑھا دریا اترے گا اور اس کا یقیناً وہی حشر ہوگا جو ہر سیلاب کا ہوا کرتا ہے ۔میرا یہ دعویٰ بر بنائے تعصب نہیں بلکہ میں اس دعوے کی دلیل رکھتا ہوں کہ یہ عمارتِ ادبِ جدیدیت کی بنیادوں پر قائم کی گئی ہے اور اس کے معماروں نے اس کی نیو میں کافی سامانِ تباہی بھر دیا ہے جس سے اس کا ایک ہی ہوا کے جھونکے میں زمین پر آ رہنا یقینی ہے ۔ سنئے ۔

بے اصولی اور طوائف الملوکی ہمیشہ نہیں رہتی۔ چونکہ ادبِ جدید بے اصول۔ ہر قاعدے سے بے نیاز ہے۔ مطلق العنانی اس کا شیوہ ہے۔ ہر عیبِ سخن اس کے یہاں جائز اور روا ہے۔ محاسنِ سخن کی اس کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔ بدترین لٹریچر پیش کر رہا ہے۔ فضول اور نکمے عنوانات اس کا سرمایہ ہیں اور لطف یہ ہے کہ زبانِ اُردو ترقی کر رہی ہے۔ اس کے مصلحین اس کو صاف اور بے عیب بنانے میں قدرتی طریقہ پر مصروف رہے۔ مصروف ہیں اور مصروف رہیں گے۔ ادبِ جدید کے خود ساختہ مضرت رساں قوانین اس کسوٹی کو نہیں توڑ سکتے جو اردو زبان کی روح بن چکی ہے اور بات بات کو جس کسوٹی پر کسا جاتا ہے لہذا علمی اور اہل زبان طبقہ میں تو اس چیز کی رسائی ہو نہیں سکتی۔ اب ایک ایسی مختصر جماعت رہ جاتی ہے جس کا ذکر میں آغاز مضمون میں کر آیا ہوں۔ یعنی شاعر بننے کے شوقین اور اس کو باقاعدہ سیکھنے سے گریزاں وہ اس کو کچھ دن چلائے گی لیکن ایسا ایک وقت آجائے گا جب زمانے کی لتاڑ اس کو ان کارناموں کی طرف متوجہ کرے گی اور وہ سوچیں گے کہ معترضین کہتے تو سچ ہیں۔ وہی وقت اس کے نزع کا ہوگا۔

ادبِ جدید کا دوسرا قابلِ فخر کارنامہ بلینک ورس ہے۔ بلینک ورس انگریزی میں نظم ہے یا نثر کی کوئی قسم ہے اس کو تو ہندوستانی انگریز یا انگریزی کے اُردو ادیب یا انگریزی اُردو کے ماہر جانیں مگر اتنا میں بھی جانتا ہوں کہ ہندوستانیوں نے دیگر شعبہ ہائے حیات کی نقالی کی طرح ادب میں بھی یہ انگریزی کی نقل کی ہے اور اس کی عظمت یہ کہہ کر ہمارے دلوں پر بٹھانے کی سعی کی ہے کہ صحیح خیالات وجذبات کا اظہار پابندیوں میں نہیں ہو سکتا۔ ہمارے ادب کے جسم میں ردیف وقافیہ ایک بدگوشت ہے جو ہر موقع پر ہمارے اظہارِ جذبات میں سدِ راہ ہو جاتا ہے لہذا اس کی قید اڑا دینی چاہئے۔ چنانچہ ابتدائی حملہ میں ردیف وقافیہ کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ شاید آگرے کے کسی مشاعرہ میں سب سے پہلے میں نے جناب مانی جائسی کی زبانی ایک ایسی نظم سنی جس میں صرف ردیف وقوافی نہ تھے مگر وہ تمام محاسنِ سخن موجود تھے جو شعر کا جزوِ لاینفک ہیں۔ نظم کو سن کر بہت سے لوگ ہنس رہے تھے۔ میں بھی اس کو کچھ ایسا جانور سا سمجھ رہا تھا جس کے کان اور دم کاٹ کر لنڈورا کر دیا گیا ہو اور یہ غالباً اس وجہ سے کہ سخن کے جو نغمے میرے کانوں میں پڑے تھے یہ اُن سب سے الگ راگ تھا۔ پھر تو یہ چیز عام سی ہوگئی اور کان آشنا ہو گئے۔

معترضین نے حامیانِ ادبِ جدید سے التماس کیا کہ حضور ردیف وقوافی تو آپ نے ذبح فرما دئے پھر بھی تو صحیح اظہار خیال میں رکاوٹ ہے۔ اس کا صحیح جواب ہمارے مجتہدینِ ادب نے تو نہیں دیا۔ مگر ہاں ماضی قریب میں ہمارے دو تین نوجوان شاعروں نے ایک عجیب قسم کا اجتہاد فرمایا۔ یعنی جس بحر میں انہیں نظم کہنی ہوتی اس کے مقررہ ارکان کی قید توڑ دی بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ بحر رمل مثمن محذوف میں تین بار فاعلاتن اور ایک بار فاعلن آتا تھا اور اسی کی تکرار سے ایک شعر بن جاتا تھا۔ ان حضرات نے ارکان بڑھانے گھٹانے شروع کر دئے اور اب ان کا شعر اس نمونے کا ہوگیا۔

تیری سانسیں دشتِ افریقہ کے زہر آگیں درختوں کے وہ ہیں مسموم جھونکے جو گلوئے برگ وباراں کے لئے شمشیر ہیں (ایک مصرعہ)
کاش تیرا گھونٹ سکتا میں گلا (دوسرا مصرعہ)

اور اب اسی نمونے کی نظمیں ہمارے ادب میں ایک زریں باب کا اضافہ کر رہی ہیں۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ارکان کی پابندی اظہار خیال میں سدِ راہ نہیں ہوتی؟ اور جب آپ نے تمام پابندیوں توڑنے کا تہیہ کر لیا ہے تو اسے بھی کیوں نہ توڑا جائے۔ یہ بحر کا نام ہی کیوں رہے جو ہمارے خیالات کے اظہار میں مخل ہو۔ از روئے انصاف آپ کو یہ مطالبہ ماننا پڑے گا اور جس دن آپ نے یہ مطالبہ تسلیم کر لیا اسی روز آپ کی لُغتِ ادب سے نظم کا لفظ مٹ جائے گا اور صرف نثر رہ جائے گی۔ لہذا سے

تمہاری تہذیب اپنے ہاتھوں سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

ادب جدید کے پیغمبروں ہی کے اصول پر نظم کا مٹ جانا ثابت ہو چکا۔ مگر نظم فطرت انسانی بن گئی یہ نہیں مٹ سکتی لہذا جو چیز مٹ سکتی ہے وہ یہی بدعت ہو سکتی ہے اور باقی رہنے والی چیز ضرور باقی رہ جائے گی۔

ایک توجہ طلب بات یہ ہے کہ فنونِ لطیفہ میں شاعری اور موسیقی لازم وملزوم ہیں۔ ایک کی بقا سے دوسری کی بقا ہے یا ایک کی تخلیق دوسری کے بطن سے ہوتی ہے اور دونوں کے قواعد وضوابط منضبط ہیں اور ان قواعد میں بھی باہم ہم آہنگی ہے۔ آپ کے ادبِ جدید نے شاعری کے نظام کو توڑ کر درہم برہم کر دیا اور بے اصولے راگ الاپے جانے لگے۔ اب یا تو موسیقی کے نظام کو بھی بدل کر اپنی شاعری کا ہم آواز بنا لیجئے یا آپ اپنے ادب جدید کا رشتہ ہمیشہ ہمیشہ کو موسیقی سے توڑ لیجئے۔ نظام موسیقی کو توڑ کر کنسُرا کر دینا آپ کے بس کی بات نہیں اور جب آپ موسیقی سے اپنی نظم کا تعلق قطع کرنے پر مجبور ہوں گے تو یہی چیز اس ادب کی موت کا باعث ہوگی۔ آج اسی ملک کا نہیں بلکہ ہر ملک کا ایک خاصہ گروہ موسیقی کو اپنا ذریعۂ معاش بنائے ہوئے ہے۔ اُس ملک کی شاعری اور موسیقی میں ہم نوائی ہے۔ ہر ساز پر مختلف بحریں گائی جاتی ہیں اور یہ موسیقی وشاعری ہم آواز ہو کر ہر کسی کی روح کا سامانِ فرحت بنتی ہیں۔ جدید شاعری کے نمونے کا مندرجہ بالا شعر بتائیے کس ساز پر گایا جائے گا۔ اور مغنی اس کے گانے کے لئے کس مافوق الفطرت ہستی کا گلا عاریت لے گا اور اگر نہیں گایا گیا جو یقیناً نہیں گایا جاسکتا تو بتائیے یہ کاغذی پھول کے دن اپنی رنگینی (اگر اس میں کوئی رنگینی ہو) رکھ سکے گا اور پھر اس کو نظم کا خطاب دے کر آپ کی اس دماغ سوزی کا کیا حاصل ہوگا؟ یہ وجوہ ہیں کہ اس شاعری کا جلد مٹ جانا یقینی ہے۔ اس سے کہیں بہتر ہو کہ آپ نظم کو ترک کر کے سیدھی سادی نثر لکھ لیا کیجئے اس میں آپ کو اظہار خیال میں اور آسانی ہوگی۔

اب تک ایسا ہوتا رہا ہے کہ اگر کسی ناموزوں طبع متشاعر نے کوئی مصرعہ بھی سرِ مشاعرہ ایسا پڑھ دیا جس میں کوئی رکن یا لفظ حتیٰ کہ حرف بھی گھٹ بڑھ رہا ہو تو تمام مشاعرہ نے اس شاعر کو آلۂ تفریح سمجھ کر خوب خوب اڑایا ہے۔ کس قدر رقت وعبرت کا مقام ہے یہ انقلاب کہ آج وہی ارکان کی کمی بیشی کا عیب ہنر ہے اور ہنر بھی کس کا گریجوایٹ طبقہ کا جس کی ذات سے زبان کو نہ معلوم کیا کیا امیدیں تھیں۔ ع

خدا سے کیا ستم وجورِ ناخدا کہئے

رفتارِ زمانہ کے لحاظ سے ہر دور میں اس زمانہ کا ادب 'ادب جدید' کہلانے کا مستحق رہا ہے اس لئے کہ پچھلے ادب کے مقابلے میں اس میں کافی تراش خراش کمی بیشی ہوتی رہی ہے اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ آپ کو خدا نے قابلیت دی تھی۔ آپ صاحب علم تھے۔ اپنے زمانہ کے ادب میں آپ کو جو کمی نظر آتی تھی اس کو قواعد وقوانین کے دائرہ میں رہتے ہوئے پورا کرتے جو حسین اضافہ آپ کو مطلوب تھا اس اضافہ کا آپ کو ادب میں اختیار تھا اگر آپ کے دعوے قوی ہوتے تو شعرائے ملک آپ کی بات کو ضرور تسلیم کرتے جیسا کہ وہ ہر معقول بات کو تسلیم کرتے رہے ہیں۔ اب سے بیس برس پہلے کی اور آج کی ایک ہی شاعر کی دو غزلیں لیجئے اور دیکھئے کہ شاعر نے اپنے کلام میں زمانہ کے مطالبہ کے تحت کس قدر تبدیلیاں کر لیں۔ کل جو بات حسن تھی آج وہ اسی کو قبیح جانتا ہے۔ کل غزل کا دامن گل وبلبل۔ زلف وگیسو۔ دہن وکمر وغیرہ قسم کے مضامین سے لبریز تھا مگر آج یہ سب چیزیں مٹ کر اخلاق، فلسفہ، تصوف، وارداتِ زمانہ غرض ہر وہ چیز جو حیات وارواحِ انسانی سے متعلق ہے ان کی قائم مقام بن گئی۔ آپ بھی اسی ترقی اور تبدیلی میں حصہ لیتے مگر آپ نے غضب ہی کر دیا کہ جڑ پر قینچی رکھ دی۔

آج ادبِ جدید کا سب سے بڑا کارنامہ اور ادبِ قدیم وجدید کا فرق جدید تشابیہ بتایا جاتا ہے۔ تشبیہ ہمیشہ اسی چیز سے دی جاتی ہے جو انسان کی نظر میں ہو یا علم میں۔ پس آپ بھی اس دائرہ سے باہر نہیں گئے اور اگر انصاف کی نگاہ سے دیکھیں تو ہر دور میں ندرتِ تشابیہ پر ذہن شاعر متوجہ رہا ہے جو تشابیہ آپ کی پسند ہیں آپ بھی قانونِ سخن کی حدود میں رہ کر ان تشابیہ کی ترویج فرماتے تو کیا چیز مانع ہو سکتی تھی۔ یہ سہرا ابھی آپ کے سر بندھتا اور تخریبِ سخن کا الزام بھی نہ آتا۔ کیا آج جو شعراء اپنی غزل یا نظم میں ندرتِ تشبیہ سے کام لے رہے ہیں ہم اس کو ادبِ جدید نہیں کہہ سکتے؟ اگر نہیں تو کیوں؟ کیا اس کے لئے کہ انہوں نے آپ کی طرح دامنِ سخن کو چاک چاک نہ کرتے ہوئے

ترقی کی اور شعری پابندیوں سے انحراف ضروری نہ سمجھا۔
ایجادِ نظم کا سہرا آپ کے سر نہیں بندھتا اس لئے کہ اس کی بنیاد صدیوں پہلے پڑ چکی تھی۔ فارسی میں سکندر نامہ، یوسف زلیخا، شاہ نامہ وغیرہ اس کی زندہ مثالیں ہیں اور اس چیز میں گنجائشِ تاویل نہیں کہ اُردو شاعری فارسی شاعری کا عکس ہے۔ پھر اردو شاعری میں بھی نظم کی بنیاد سالہا سال پہلے پڑ چکی ہے اور اس نظم مروّجہ کو برسوں سے قریب قریب ہر غزل گو شاعر اپنائے ہوئے ہے مشاعروں میں جہاں غزلیں پڑھی جاتی ہیں وہاں نظمیں بھی برابر پڑھی جاتی ہیں مگر وہ نظمیں عیاشانہ مضامین کی حامل نہیں ہوتیں۔ ان میں بیشتر اصلاحی ہوتی ہیں۔ ان میں معانی و مطالب بھی ہوتے ہیں۔ وہ ان پابندیوں میں بھی لکھی جاتی ہیں جو قانون سخن شعراء پر عائد کر چکا ہے اُن میں باہم ربط بھی ہوتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہوتی ہے کہ باوجود بحور اور ردیف و قوافی کی پابندی کے وہ جس عنوان کے ماتحت لکھی جاتی ہیں بے تکلف ان میں وہی مضامین لکھے جاتے ہیں جن کی ضرورت تھی اور ان دقیانوسی شاعروں کو اظہارِ خیال میں کوئی ایسی رکاوٹ بھی نہیں ہوتی جس کے حیلہ پر آپ نے اپنی مسجد علیحدہ بنانے کی زحمت گوارا فرمائی ہے۔ میں غزل گو شاعر ہوں اگر آپ کی نگاہ سے میری کوئی غزل یا نظم گذری ہو تو آپ مجھے یہ بتانے کا احسان فرمایئے کہ میری غزل میں کون سا شعر مخربِ اخلاق یا عریاں یا غیر قدرتی ہے اور نظم میں عنوان کے ماتحت کس جگہ ردیف و قوافی نیز بحر میرے اظہارِ خیال میں مانع ہوئے۔ اسی صورت سے آپ ہر شاعر کو قیاس فرمالیجئے اور پھر اس حقیقت کی روشنی میں آپ اپنی جدید شاعری اور اس کی بے راہ روی پر بھی نظرِ ثانی فرمانے کی زحمت گوارا کیجئے۔ آپ کا ضمیر آپ کے اعتراضات کی اہمیت آپ پر خود واضح کر دے گا۔

ابر احسنی گنوری

کہتے ہیں مرے آگے وہ مجھ پہ عدو غش ہے
ہے ہے مری اُلفت سے ہے بے خبری اتنی

تم اُٹھ گئے محفل سے ذکر آتے ہی مجنوں کا
سائے سے مرے وحشت اے رشکِ پری اتنی

حکیم مومن خاں دہلوی

تجلّیات

ذرّوں کو شانِ مہر عطا کر رہا ہوں میں
طے اس طرح سے دشتِ فنا کر رہا ہوں میں

لے جارہی ہے شوق کی مستی کشاں کشاں
اتنا کہاں ہے ہوش کہ کیا کر رہا ہوں میں

اب تو میں اس کی پرسشِ غم پر بھی ہوں خموش
سمجھے نہ وہ کہیں کہ گلا کر رہا ہوں میں

دل نے اُٹھالیا غمِ اُلفت خوشی خوشی
جو آسماں سے ہو نہ سکا، کر رہا ہوں میں

تیری نگاہِ لطف و کرم مجھ پہ ہو نہ ہو
اپنی وفا سے خوش ہوں، وفا کر رہا ہوں میں

تیرے نثار! اب مجھے کوئی طلب نہیں
لذّت کشِ دعا ہوں، دعا کر رہا ہوں میں

ہر قطرہ جامِ عشق کا بحرِ حیات ہے
ناحق تلاشِ آبِ بقا کر رہا ہوں میں

تیری یہی ہے شان، کرم کر رہا ہے تُو
میرا یہی ہے کام، خطا کر رہا ہوں میں

اے کاش ہو قبول مری پیشکش اخترؔ
جانِ عزیز اُس پہ فدا کر رہا ہوں میں

اختر صہبائی

"بَن سُری"

جب شام کے سائے لمبے ہو جاتے ہیں اور بادِ نسیم چپکے چپکے درختوں کے پتوں میں سے گزر کر خاموش جھیلوں کے شفاف پانی کی ہموار سطح پر ننھی ننھی لہریں بناتی ہوئی گزرتی ہے تو ایک لمبی ——— نہایت لمبی ——— اور حد سے زیادہ حسرت بھری۔ آہ سنائی دیتی ہے۔ جنگل کی لاتعداد آوازوں میں اس سے زیادہ دل گیر اور غم انگیز کوئی آواز نہیں ہوتی کیوں کہ یہ اس لمبی گھاس کی آواز ہے جو ان جھیلوں کے کنارے اُگتی ہے۔ جس کے تنکے ہوا سے متاثر ہو کر ایک دوسرے کے ساتھ سر جوڑ لیتے ہیں اور فرطِ غم میں جھومنے لگتے ہیں۔

یہ اس گھاس کی کہانی ہے اور قدیم یونانیوں کے شاعرانہ دماغ کی پیداوار ہے۔

سرنکس ایک لڑکی تھی جو جنگل کے کنارے رہتی تھی اور اتنی خوبصورت تھی کہ جب درختوں میں سے گزرتی تو جنگل کے جانور حیرت زدہ ہو کر رُک جاتے اور دیکھتے رہ جاتے۔ لیکن اس نے کبھی اُن کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا تھا۔ اسے محبت کی خواہش نہ تھی۔ وہ ڈائنا یعنی چاند کی دیوی کی پجارن تھی اور چاند کی دیوی چونکہ شکار کی بے حد شوقین تھی اور رات بھر ہرنوں اور بارہ سنگوں کے پیچھے بھاگ کر تیر سے اُن کا شکار کیا کرتی تھی۔ سرنکس بھی اس کے ساتھ ہوتی اور بعض دیکھنے والے تو یہ کہتے تھے کہ ایسی حالت میں دیوی اور پجارن میں تمیز نہ ہو سکتی تھی۔ سوائے اس کے کہ دیوی کی کمان چاندی کی اور پجارن کی سینگ کی بنی ہوئی تھی۔

سرنکس بے خوف تھی۔ دلیر تھی۔ اُسے کوئی فکر یا غم نہ تھا۔ اس لئے اپنی اٹھتی جوانی کے دن نہایت اطمینان اور خوشی سے گزار رہی تھی۔ وہ ان لڑکیوں اور جنگل کی دیویوں کو بے پروائی اور نفرت سے دیکھتی تھی جو کسی انسان یا دیوتا کی محبت میں گھلی جاتی تھیں۔ وہ حد سے زیادہ خوبصورت تھی۔ خوش مزاج تھی۔ بے باک تھی۔ شریر تھی۔ اس کے قد کی لمبائی جسم کا تناسب اور کمر کی لچک جنگل کی دنیا میں دور دور مشہور تھی۔ شکار کا بھاگ کر پیچھا کرنا اس کا سب سے زیادہ مرغوب مشغلہ تھا۔ اور جب وہ کمان کھینچ کر تیر چلاتی تو چاندنی رات میں، سیاہ درختوں کے درمیان، اس کے سڈول بازو، نہایت متناسب اور نازک کلائی اور لمبی گاؤدم انگلیوں کی جھلک دیکھ کر جنگل میں رہنے والی مردہستیوں کی آنکھیں چندھیا جاتیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ بھولی تھی۔ اس کا دل بے لوث تھا اور رات کو جب سونے کے لئے پلنگ پر لیٹتی تو ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ اور بند آنکھوں کی لمبی پلکوں پر وہ رونق ہوتی جو سوتے بچے کی آنکھوں پر ہوتی ہے۔

لیکن اسے قسمت کہئے یا اتفاق۔ ایک دفعہ جب چاندنی رات کی سایہ دار وادیوں میں شکار کھیل کر واپس آ رہی تھی تو وہ خوف جس سے وہ ناآشنا تھی اس کے راستے میں کھڑا تھا۔ پین، جنگل کا دیوتا، وہ طاقت وہستی جس کے بے پناہ اقتدار سے جنگل کا بچہ بچہ واقف تھا، وہ مجسم ظلم اور خوشی، وہ مجسم محبت اور خوف، وہ مجسم جوانی اور تجربہ، وہ جانور جو انسان بھی تھا اور دیوتا بھی۔ سرنکس نے اس کے متعلق یہ باتیں دوسری لڑکیوں سے سنی تھیں۔ اسے دیکھا کبھی نہ تھا۔ اس وقت وہ راستہ روکے کھڑا تھا اور حیرت زدہ مسرت کے ساتھ سرنکس کی طرف دیکھ رہا تھا کہ ایک ایسی ہستی بھی جنگل میں موجود تھی اور اسے معلوم نہ تھا۔

پین کے سر پر چیڑ کے نوک دار پتوں کا تاج تھا۔ اس کا چہرہ جوان اور خوبصورت تھا لیکن عمر میں پہاڑوں اور سمندروں سے زیادہ، اس کی آنکھوں میں غم اور خوشی دونوں کی جھلک تھی اور ان میں حد سے زیادہ بے رحمی اور بے انداز محبت ایک ہی وقت میں دکھائی دیتی

(سرنکس) SYRINX - (چاند کی دیوی) DIANA - (جنگل کا دیوتا) PAN

تھیں۔ایک لمحے تک اس نے سرنکس کی آنکھوں میں۔ جو ٹھٹک کر رہ گئی تھی۔ آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ پھر ہلکی سی میٹھی آواز میں بولا۔ وہ آواز ایسی تھی جیسے کوئی پرندہ گا کر اپنی رفیقۂ حیات کو بلاتا ہے یا موسم بہار میں زمین سورج کو پکارتی ہے یا سمندر کی لہریں ساحل کو گلے لگانے کے لئے ہلکے ہلکے آواز دیتی ہیں۔

وہ سرنکس کے حسن کی تعریف کر رہا تھا اور محبت کی کہانی کہہ رہا تھا۔ وہ محبت جس کا جواب محبت ہوتا ہے وہ مقناطیسی کشش جو چھو جانے سے فولاد ایسی مضبوط چیز کو بھی مقناطیس بنا دیتی ہے۔ لیکن سرنکس کے دل کی وہ حالت تھی جیسے کوئی برف کی انگلیوں سے اس کو بھینچ رہا ہو وہ خوف سے چیخ اٹھی۔ وہ خوف جس سے وہ آج سے واقف تک نہ تھی۔ اور پین کی آنکھوں میں بے رحمی کی جھلک تیز ہو گئی۔ لیکن اس کے الفاظ بدستور میٹھے تھے اور زبان پر محبت کی گفتگو جاری تھی۔ سرنکس اس چڑیا کی طرح جو سانپ کی آنکھوں کے سامنے بے بس ہو جاتی ہے۔ سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔ اور چہرہ رات میں اکیلے کنول کے پھول کی طرح سفید پڑ گیا تھا۔

یکایک خوف گھبراہٹ سے بدل گیا۔ اور سرنکس ایک چھلانگ مار کر اس تیزی سے بھاگی کہ شکار میں بھی کبھی نہ بھاگی تھی۔ پین موسم گرما کی آندھی کی طرح پیچھے ہو لیا۔ اور جب اس نے ایک قہقہہ لگایا تو سرنکس کو معلوم ہوا کہ لڑکیاں اس کی نسبت جو کچھ کہا کرتی تھیں وہ سچ تھا۔ وہ مجسم خوف تھا۔ جانور بھی۔ انسان بھی۔ اور دیوتا بھی۔ جنگل کا اندھیرا بڑھتا چلا گیا۔ بیلوں اور درختوں کی ٹہنیوں نے سرنکس کے پاؤں میں اُلجھ کر اسے کئی بار گرانے کی کوشش کی۔ بڑے بڑے درخت راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ اور چاروں طرف سے جو آوازیں آ رہی تھیں ان سے معلوم ہونے لگا کہ تمام قدرت پین کے ساتھ مل کر اس کا مضحکہ اڑا رہی ہے۔ وہ نزدیک پہنچتا جا رہا تھا اور اس کی سانس سرنکس کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے سرنکس کو پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا ——

سرنکس خوف کے مارے اپنے ہوش و حواس تقریباً کھو چکی تھی کہ اسے اپنے سامنے ایک خاموش ندی دکھائی دی جو درختوں کے سائے میں چپ چاپ بہتی چلی جا رہی تھی۔ وہ اس میں کود گئی اور ندی کی دیویوں سے پناہ مانگی ——

پین دیوتا نے فتح مندی کے نعرے کے ساتھ ہاتھ بڑھا کر سرنکس کی کمر میں ڈالا تاکہ اسے گرنے سے بچا لے۔ لیکن حیران ہو کر سکتے میں رہ گیا۔ کیوں کہ بجائے ایک خوبصورت جیتی جاگتی تڑپتی ہوئی ہستی کے اس کے ہاتھ میں گھاس کے چند تنکے تھے اور کچھ نہیں ——

ندی کی دیویوں نے رحم کھا کر سرنکس کو اس کے قد کے موافق لمبی اور کمر کی طرح لچک دار گھاس میں تبدیل کر دیا تھا جو ندی کے کنارے آناً فاناً اُگ آئی تھی۔

ان چند لمحوں میں دیوتا کو اپنی ناکامی کا احساس ہوا۔ اور اس کی اُن آنکھوں میں سے وحشیانہ چمک جاتی رہی جن کی گہرائیوں کا اُس پہاڑی ندی کی طرح جس پر سورج کی کرنیں کبھی نہیں پڑتیں اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور اس کی بجائے ان میں مایوسی اور غم کی وہ درد بھری جھلک پیدا ہو گئی جو انسان کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ ندی کے کنارے اس کی نگاہیں دور تک جاتی معلوم ہوتی تھیں لیکن اُسے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا —— اس کے ہونٹوں سے ایک لمبی ٹھنڈی سانس نکلی جیسی ایک دیوتا ہی کے منہ سے نکل سکتی ہے جو انسانی غم سے آشنا ہو جائے اور جنگل کے درخت پتوں میں سے ہوا کے گزرنے سے سائیں سائیں کرنے لگے۔

اس نے شکاری چاقو نکالا اور گھاس کے سات تنکے چُن کر چھوٹے بڑے کاٹ لئے۔ ان کو باندھ کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور یہ کہہ کر کہ سرنکس اب بھی ہمیشہ میری ہی رہے گی اس ساز کی موسیقی کے ذریعہ سے اپنے دل کی حالت کا اظہار کرنے لگا۔

اس طرح بنسری ایجاد ہوئی۔ خاموش جنگل میں غم انگیز نغمے سنائی دینے لگے۔ اور لمبی گھاس میں کسی مظلوم ہستی کی آہ کی سی آواز پیدا ہو گئی۔

عطاء الرحمٰن

فرزندِ کلاں

ستمبر کے "ہمایوں" کے لئے جب سیّد علی منظور صاحب کی نظم "فرزندِ کلاں" کی کتابت وطباعت ہو چکی تو ہمیں اُن کا حسبِ ذیل خط ملا۔

"مَیں نے جو نظم ارسال کی تھی بعنوانِ فرزندِ کلاں اُس کو میری بدقسمتی نے مرثیہ بنا دیا، نظم کو مرثیہ بنانے والے اشعار کا پرچہ بھیج رہا ہوں" اِس پرچہ کو محولۂ بالا سے چسپاں کرا دیا جائے تو مناسب ہو گا۔ اِس نظم کو مکمّل کر کے غالباً ایک مہینے کی مُدّت بھی نہیں گزری تھی کہ مُبارک بن علی ڈپتھریا کے مرض میں مُبتلا ہُوئے اور ۲۷ جمادی الثانی ۱۳۶۱ھ کو اِس دُنیا سے ہمیشہ کے لئے رُخصت ہو گئے۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے سُوئے اتفاق! شاید یوں بھی ہوتا ہے!! نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوتا — ظُلم یہ مجھ پر کیسا ہے!! غرض میرا غمگین دِل کبھی کچھ کہتا ہے کبھی کچھ"

ذیل میں ہم نظم فرزندِ کلاں کو اُس کی دردناک تکمیل کے ساتھ دوبارہ درج کرتے ہیں۔

"ہمایوں"

(۱)

بارہ سال کے آ گئے جو
اب وہ ادب سے بیٹھا ہے
ناسمجھ آگے اتنا تھا
آج سمجھ دار ایسا ہے
جب میں مناتا ہوں اس کو
آنکھیں پونچھ کے ہنستا ہے
بازو پھیلا پھیلا کر
جانے کو جو روتا تھا
اب وہ نمونہ میرا ہے
بارہ سال کے آ گئے جو
بے سمجھے رو دیتا تھا
خوش مجھے اب کر دیتا ہے
سینہ کے بَل بڑھ بڑھ کر
آج اُسی ڈھب کے پرچے
علم کا اُس کو چسکا ہے
کہتی ہے یہ اُس کی اُٹھان
چھوٹے بھائی بہنوں پر

چُپ چُپ تکتا تھا مجھ کو
درس مجھی سے لیتا ہے
بیٹھے بیٹھے روتا تھا
جو سمجھاؤ سمجھتا ہے
رونا چھوڑ کے وہ خوش خو
جب کیا تھا اور اب کیا ہے
میری گود میں خود آ کر
اُن کی گود میں سوتا تھا
میرے پاس ہی سوتا ہے
سُن کر میری باتوں کو
بے موقع دُکھ لیتا تھا
اُردو لکھ پڑھ لیتا ہے
حملہ کرتا تھا جن پر
نازاں ہے خود پڑھ پڑھ کے
قابل بننے والا ہے
ہو جائے گا جلد جوان
میری طرح ہے اُس کی نظر

اب مجھے خوفِ اجل کیا ہے
جب کہ وَلی عہد ایسا ہے

(۲)

پھیر کے جس کے سر پر ہات
پڑھتا تھا میں یہ ابیات
سُن کے جو خوش ہوتا تھا
میرے پاس ہی سوتا تھا
اب وہ قبر میں سوتا ہے
شاید یوں بھی ہوتا ہے!

جلد جواں ہونے والا
ناز اور نعمت کا پالا
مجھ کو جس کا سہارا تھا
سب سے سوا جو پیارا تھا
زیرِ زمیں آسودہ ہے
ظلم یہ مجھ پر کیسا ہے!

میری اُمیدوں کا ہے مآل
کتنا میرے حسبِ حال
پتھر سے سر ٹکراؤں
سر ٹکرا کر مر جاؤں
اِس کی کِس کو پروا ہے
ہونا ہے سو ہوتا ہے

کھیل کا میداں ہو یا گھر
ہر جا چمکائے جوہر
مکتب میں گلریز رہا
میداں میں بھی تیز رہا
سیکل خوب چلاتا تھا
اوروں سے بڑھ جاتا تھا
اب اُس کا عالم کیا ہے!!
میری تڑپ کیا بے جا ہے؟

خوب طبیعت پائی تھی
خاص صفت سچائی تھی
جو کہتا سچ کہتا تھا
خوش رکھتا خوش رہتا تھا
غم ایسے لڑکے کا ہے
جتنا بھی ہو تھوڑا ہے

کہتی تھی یہ اس کی شبیہ
اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ
مجھ سے مُبارک رُوٹھ گیا
آہ وہ کانِ شرم و حیا
واپس آ نہیں سکتا اب
یاد اُس کے جانے کا ہے سبب
بیٹھ گیا یوں میرا دل
جینا مجھ کو ہے مشکل
مرنا ہی اب اچھا ہے
جینے میں کیا رکھا ہے

بجھا جو رازِ دل افزائی
بے وقت اُس کو موت آئی
سنگیں دل ادوار نے ہائے
منظر کیا کیا مجھ کو دکھائے

آخری سین جو دیکھا ہے
ہر دم دل میں کھٹکتا ہے

علی منظو

شملہ

شملہ ——— ہمارے "جنت نشاں" کا وہ قطعہ جس نے "ناہمواریت" کی قسم کھا رکھی ہے، جس کا چپہ چپہ اس قسم کو برقرار رکھنے کے لئے انتہائی وفاداری کا ثبوت دے رہا ہے۔ راہیں، انسانی قدموں نے اپنی شدید ضرورت کے ماتحت تیار کیں اور ان دم پھلا دینے والی چڑھائیوں کو دفع کرنے کے لئے جس قدر بھی قریب بل نظر آیا اُسے پختگی بخشی گئی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مکان، مکین، راہ گور، راہرو غرض ہر اک کی یہی کوشش رہی کہ جہاں اور جس طرح بنے دھنس جاؤ۔ جدھر نگاہ اٹھائیے، گہرائیاں اور پاتال کی خبر لانے والی کم بخت گہرائیاں، جنہیں اگر سبزہ اور درخت نہ ڈھانپیں تو نا اُن معلوم ہوں! شاید کوئی بہت بڑا اژدر پیٹ کے سخت درد کے مارے بے حد تڑپا، لوٹا اور جہاں جہاں اس کی لکیر نظر آئی، سرکار نے اسے پیٹ کر اک گرمائی صحت افزا مقام کی بنیاد ڈال دی۔

اِک قابلِ اعتماد انگریز سے پوچھے بغیر نہ رہا گیا: "ہندوستان میں شملے سے ہزار درجہ بہتر گل پوش و دل رُبا وادیاں موجود ہیں۔ آخر اس میں کون سی جاذبیت تھی جو اس کے انتخاب کا باعث ہوئی"؛ جواب تھا: "اس کی نیم انگلستانی آب وہوا!"۔ اللہ اکبر! اس ہنگامی لطف وحظ کی خاطر سینکڑوں جوان اور بڈھے منشیوں (کلرکوں) کو کہیں کا کہیں مصیبت کے گڑھوں میں لا پھینکا جاتا ہے۔ صبح سے شام تک دفتر کی چار دیواری میں محبوس اور رین بسیرے کے لئے سویرے اور دن ڈھلے بغیر جرم قید با مشقت کی اذیت جسے چڑھائی، اُترائی کا نام دیا جاتا ہے۔ کئی بیچارے گنگناتے سُنے گئے ہیں:

گھڑیاں تری طویل، ترے روز و شب دراز
موت آتی ہے پر نہیں آتی (اور)

مال روڈ اس کی مشہور تفریح گاہ سمجھئے جس پر شام کو غریبوں کے خون سے حاصل کی ہوئی دولت مصنوعی حسن کے اظہار کے لئے بیتاب ہوتی ہے۔ چُست ساریاں بے جا اور بیجا نخروں میں اک اک عضوِ بدن کی نمود کے لئے بے قرار اور اینٹھی ہوئی گردنیں، تنے ہوئے سینے، بھونڈے جسم بالعموم سوٹ میں لپٹے ہوئے۔ ریاکارانہ تفاخر کی نمائش کا مقصدِ وحید پیشِ نظر۔ ڈگ بھرتے نظر آتے ہیں۔ بعض انسانیت کے دشمن اظہارِ فخر و مباہات کے لئے اپنا تابوت بھی ساتھ ساتھ لئے ہوتے ہیں جسے عرفِ عام میں رکشا کہا جاتا ہے۔ اِن کو کھینچنے کے لئے چند دھات کے کمینہ ٹکڑوں کے زور سے چار بھلے چنگے انسان حیوان کے طور پر استعمال میں لائے جاتے ہیں جن کے گرم تنفس کی آواز انصاف اور انسانیت کے کانوں پر آرے چلاتی ہے۔ مگر یہ نمرود، احساساتِ اخوت و آزادی سے کورے، شاید گندہ مٹی کے رذیل بُت ہیں۔ احساساتِ اخوت و آزادی سے بالکل کورے!۔

برسات اس میں کیف کی روح پھونک دیتی ہے جس میں بادلوں کی تُنک رو، بے خروش اور بے روک تھام دوڑ تمام شملے کو اک تخیل کا میدان تصور کئے ہوتی ہے۔ ابھی موسلا دھار بارش کے زوروں کے تھپیڑے ابھی ہلکی ہلکی پُر لطف پھوار اور ابھی دھوپ کے ٹکڑے، کبھی یہاں کبھی وہاں، صاف ستھری گھاس سے پیار کرتے ہوئے!۔ ہر پادل سے لدی ہوئی پہاڑیاں، اک دوسری کے پیچھے سے سر نکالتی ہوئی، اک نامعلوم آغاز سے نکل کر کسی نامعلوم اختتام میں غائب ہو جاتی ہیں۔ گھاس اور بہت سی بے نام نباتات مسلسل بارش سے نہائی دھوئی سگھڑ اور نکھری سُتھری معلوم ہوتی ہے۔ اور رات، اتھاہ بلندیاں اور پستیوں پر واقع مکانوں کی روشنیوں کی وجہ سے، دیپ مالا کا نظارہ پیش کرتی ہے۔ سکوت، ٹمٹماتی روشنیاں، اونچے نیچے مکان، لاتعداد گھرے درخت۔ کچھ خواب کا سا عالم محسوس ہوتا ہے!۔ چاند کی وہ چودھویں رات جس پر چند آوارہ نرم رو بادلوں کے ٹکڑے فدا ہو رہے ہوں، تخیل آزما طلسم بن جاتی ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے، نکھرا نکھرا نیلا آسمان، چاند کی خنک اور دلآویز زریں افشاں، تمام آس پاس خاموشی میں ملفوف اور ایسے میں بھولے بسرے ماضی کے دل گداز و لذیذ واقعات کلیجے میں ہوک نہ اٹھائیں تو کیسے۔ بے اختیار منہ سے نکل جاتا ہے ع:

"تم نہ ہوئے یاں ساجن! ہائے!"

رحیم

تاثّرات

مجھے بت خانۂ وہم و گماں سے
کوئی سجدوں سے کیوں آکر اُٹھائے
ضرورت ہے مجھے اُن پستیوں کی
بلندی کو بھی جن پر رشک آئے

یقیں کی منزلیں طے کر چکا ہوں
تیری یکتائی کا دم بھر چکا ہوں
مگر اب زندگی ہے بے مزہ سی
حقیقت میں کبھی کا مر چکا ہوں

سسکتے چاند نے شاخوں میں چھپ کر
بُنا ہے نقرئی کرنوں کا جالا
حسیں بیمار کے چہرے پہ جیسے
کسی بے نام تابانی کا ہالا

تجھے معلوم کیا مردِ خردمند
کہ میرے شوق کی منزل کہاں ہے
خرد ننھی سی اِک محدود دنیا
محبت اِک خلائے بیکراں ہے

کوئی بنیاد بھی ہے اِس جہاں کی
کہ یہ سب کچھ فریبِ رنگ و بو ہے
میرے پہلو میں ہے وہ پیکرِ ناز
مگر دل ہے کہ محوِ جستجو ہے!

سرودِ دیر کیا سوزِ حرم کیا
بلند و پست کیا۔ بود و عدم کیا!
اگر ہر دل میں ہے اُس کی تجلّی
تو یہ افسانہ ہائے بیش و کم کیا!

محبت میں گنوا دی زیست لیکن
سمجھ میں رازِ جانانہ نہ آیا
لگایا شمع نے سینے سے جس کو
پلٹ کر پھر وہ پروانہ نہ آیا

میری بے خبریوں کا راز کیا ہے
میرا انجام کیا۔ آغاز کیا ہے
اگر یہ ناز ہے تیرا تو یارب
یہ ناز اَوروں سے کر، یہ ناز کیا ہے

مجھے سرمایہ داری سے نہ بہلا
مِری قسمت سے یہ دھبّا مٹا دے
دہکتے ہیں جو دوزخ کے کنارے
اُن انگاروں سے میرا دل بنا دے

یہ دل لے، اَور یہ سوزِ دروں لے!
یہ اپنا عشق یہ اپنا جنوں لے!
الٰہی! کیا یہی ہے تیرا انصاف
کہ منعم بہرِ مے مفلس کا خوں لے!

احمد ندیم قاسمی

اصغر کی یاد میں

ایک تصویر میرے سامنے ہے! کس کی؟ اُسے اِس دُنیا سے گئے دو برس ہو گئے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ وہ کہاں گیا؟ یہ مجھے معلوم نہ ہوا۔ کہتے ہیں ایک اجنبی سرزمین میں اُس کا ٹھکانا ہے کہیں ایسی جگہ جو میں نے نہیں دیکھی۔ میں نے کہا اور بار بار کہا مجھے اُس ...... جگہ کی تصویر ہی دکھا دو ـــــ سو یہ تصویر اُسی جگہ کی ہے، گویا ستائیس ماہ کے بعد میں اُس کے ٹھکانے کو دیکھ رہا ہوں۔

ایک سبزہ زار ہے، کنارے کنارے اونچے اونچے درخت ہیں ایسے جیسے سائیں سائیں کر رہے ہوں باہیں پھیلائے کسی کے انتظار میں کھڑے ہیں خدا جانے کب سے؟ سبزہ زار پر چند سنگ مرمر کے ٹکڑے ہیں کچھ پڑے کچھ کھڑے خوبصورتی سے ترتیب دیئے ہوئے۔ ایک کھڑے پتھر پر اُس کا نام ہے:

ھُوَالکامل

اصغر بشیر ماہِ کامل ـ ۱۹۴۰ء

اِس کے بعد انگریزی میں کچھ الفاظ ہیں: اُس کا نام حسب نسب پھر تاریخ و مقام پیدائش و وفات (جن کو یہاں دہرانے قلم کانپتا ہے)، اور پھر اِنّا لِلّٰہ الخ ....

ہمارا ماہِ کامل "اُس الکامل" سے جا ملا جس سے مل کر ہر کہہ و مہ کی صحیح تکمیل ہوتی ہے لیکن ہم ناقص اِس تکمیل سے کانپ جاتے ہیں! کیا کریں؟

سرہانے لکھا ہوا پتھر ہے، نیچے قدموں میں دائیں بائیں دو مرمریں گملوں میں گلاب کے دو ننھے پودے ہیں۔ گلاب کے پھول اُسے بہت عزیز تھے جو کبھی اِس خزاں دیدہ سے گلشن کا بلبلِ رنگیں نوا تھا۔ دنیا کے لئے پھول اب بھی کھلتے ہیں بلکہ اُف ہمارے لئے بھی، ہرے بھرے درخت اب بھی صبح و شام ہواؤں کا جھولا جھولتے ہیں اور پکھیرو اب بھی یہاں سے ہزاروں کوس دُور ٹھاٹھیں مارنے والے سمندروں کے پار وہاں جہاں وہ ابدی نیند سوتا ہے اب بھی وہ اُس کی خواب گاہ کے اوپر اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر اپنے پروں کو پھڑپھڑاتے ہوئے اور گاتے ہوئے اُڑ رہے ہیں اور یہاں میری نظروں کے سامنے جنتِ کشمیر میں بہار اب بھی اپنے جوبن پر ہے زندگی اب بھی دُنیا کی نعمتوں سے لُطف اُٹھا رہی ہے مگر دل ہے کہ کبھی کبھی بے اختیار پکار اُٹھتا ہے "وہ کہاں؟" یہ بے چینی کیوں ہے جب کہ ہم سبھی کے سب اِس 'یہاں' سے اُسی 'کہاں' کو جانے والے ہیں کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی دِن ضرور ہی؟!

دُکھ صرف اتنا ہے کہ چودھویں کا چاند پُورا ہوتے ہی رات کی اتھاہ تاریکیوں میں وقت سے پہلے کیوں ڈوب گیا؟ آہ عقل کی اس تماشا گاہ میں کسی 'کیوں' کا کبھی جواب ملا؟ اور کیوں ملے؟ زندگی ایک مسلسل تلاش ہے حقیقت کی پُراسرار خوبصورت راہ کی جو رہ رہ کر گم ہوتی ہوئی خدا جانے کہاں سے کہاں چلی جاتی ہے ــــــ اسی راہ پر وہ ہم سے پہلے چلا گیا، ہمارا نوجوان رہنما!

بشیر احمد

محفلِ ادب

بہادر شاہ بادشاہ

سانولی صورت۔ چھریرا بدن۔ لمبا قد۔ چہرے پر مغلئی داڑھی۔ مونچھیں منڈی ہوئی۔ نام سراج الدین۔ کنیت ابوالظفر۔ تخلص ظفر۔ محمد بہادر شاہ لقب۔ دہلی کے آخری مغل بادشاہ تھے۔ ۱۸۳۷ء میں اپنے باپ معین الدین احمد اکبر شاہ ثانی کے مرنے کے بعد تخت نشین ہوئے تھے۔ باپ چونکہ بہت زیادہ زندہ رہے تھے۔ اس لئے بادشاہ کو بڑھاپا آجانے کے بعد تخت میسر آیا تھا۔

بہادر شاہ کے باپ اکبر ثانی کا قلمی روزنامچہ لال قلعہ دہلی کے میوزیم میں ہے۔ اس کی نقل میں نے حاصل کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر شاہ کی زندگی میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ اُن کے روزنامچے میں روزانہ لکھا جاتا تھا کہ آج فلاں وقت افیون نوش فرمائی اور فلاں وقت خاصا تناول فرمایا۔ ملکی مشاغل کی ایسی کوئی بات نہیں ہوتی تھی جس سے تاریخ پر روشنی پڑتی۔ مگر بہادر شاہ کے جتنے قلمی روزنامچے میں نے حاصل کئے اور احسن الاخبار بمبئی سے لال قلعہ کے سراج الاخبار کا اقتباس لیا تو اس سے ظاہر ہوا کہ بہادر شاہ کی زندگی اپنے باپ کے مقابلہ میں زیادہ سرگرم تھی۔ اگرچہ اختیارات محدود تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط اتنا بڑھ گیا تھا کہ بادشاہ کو ملکی معاملات میں کسی قسم کا دخل نہ تھا تاہم وہ رزیڈنٹ کو ایسے خطوط لکھتے رہتے تھے جن سے اُن کے اندرونی احساس کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی ...... بے اختیاری کو بہت زیادہ محسوس کرتے تھے اور اپنے اختیارات بڑھانے کے لئے جدوجہد کرتے رہتے تھے۔

ان کے دادا شاہ عالم کو اور ان کے باپ اکبر ثانی کو ایسٹ انڈیا کمپنی ایک لاکھ روپے ماہوار گزارے کے لئے دیا کرتی تھی۔ وہی لاکھ روپے بہادر شاہ کو بھی ملتے تھے۔ مگر روزنامچوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہادر شاہ بے ضرورت امرائے اور ساہوکاروں سے سودی قرض لیا کرتے تھے تاکہ کمپنی پر یہ ظاہر ہو کہ لاکھ روپے کی پنشن کم ہے اور بادشاہ کا اس میں گذارہ نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ وہ عوام پر بھی یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ انگریز کمپنی کا برتاؤ بہادر شاہ کے ساتھ اچھا نہیں ہے اور کمپنی ان کو اتنا کم گزارہ دیتی ہے کہ وہ مجبوراً سودی قرضے سے گزارہ کرتے ہیں۔ لیکن بظاہر یہ معلوم ہوگا کہ ایک لاکھ روپے ماہوار بہت زیادہ تھے اور آج کل تو وہ لاکھ روپے پندرہ لاکھ کے برابر سمجھے جائیں گے۔ کیوں کہ بہادر شاہ کے زمانہ میں ارزانی کے سبب دو روپے ماہوار میں انسان گزارہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ میوزیم لال قلعہ میں جو گوشوارہ قلعہ کی تنخواہوں کا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہی خاندان کے افراد کو کم سے کم چار روپے ماہوار تک گزارہ دیا جاتا تھا۔ اس لحاظ سے لاکھ روپے کچھ کم نہ تھے۔ لیکن بہادر شاہ ہمیشہ ریذیڈنٹ کو شکایتیں لکھتے رہتے تھے کہ لاکھ روپے کم ہیں۔ کمپنی کو لکھو کہ اس میں اضافہ کیا جائے۔

لاکھ روپے کے علاوہ کمپنی نے کوٹ قاسم کا علاقہ بھی بادشاہ کے خرچ کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ اس کی آمدنی بھی بادشاہ کو دی جاتی تھی۔ اور دہلی کے چند بڑے بڑے باغوں کی آمدنی بھی شاہی کارندے وصول کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے اسباب میں ایک سبب یہ باغات بھی تھے۔ جس کا قصہ پہلی تحریروں میں اشارۃً لکھ چکا ہوں کہ بہادر شاہ کے چھوٹے بھائی مرزا جہاں گیر نے شراب کے نشہ میں سٹن صاحب ریذیڈنٹ کے گولی ماری تھی۔ نشانہ خطا ہوا۔ گولی سٹن صاحب کی ٹوپی میں لگی۔ تاہم ریذیڈنٹ نے مرزا جہاں گیر کو الہ آباد میں نظر بند کر دیا۔ اور مرزا جہاں گیر اسی نظر بندی کی حالت میں مر گئے اور ان کی لاش الہ آباد سے دہلی لائی گئی اور اس کو درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے گوشۂ شرق و جنوب میں دفن کیا گیا۔ اس وقت بہادر شاہ کے باپ اکبر ثانی زندہ تھے اور بہادر شاہ سے ناراض رہتے تھے۔ اور مرزا جہاں گیر کو بہت چاہتے تھے۔

اس واسطے اُنہوں نے بہت خوبصورت خطیرہ مرزا جہاں گیر کا بنوایا۔ جس میں سنگ مرمر کی ایک ڈال محراب ہے۔ اور سنگ مرمر کی جالیاں تو ایسی نفیس و نازک ہیں کہ شاید ہندوستان کی کسی عمارت میں ایسی جالیاں نہ ہوں گی۔ مشہور ہے کہ ایک خانہ کی کھدائی کی پانچ پانچ روپے اُجرت دی گئی تھی۔ اس خطیرے میں سنگ مرمر کے کواڑ بھی ہیں جو بہت خوبصورت ہیں۔ یہ کواڑ شاہ جہاں بادشاہ نے لال قلعہ کی موتی مسجد کے لئے بنوائے تھے اور اکبر ثانی کے وقت تک موتی مسجد کے دروازے میں لگے ہوئے تھے۔ اکبر ثانی نے یہ کواڑ اتروا کر بیٹے کے مجبر میں لگا دیئے۔

بہادر شاہ نے تخت نشین ہونے کے بعد مرزا جہاں گیر کی اولاد اور مرزا بابر سے بدسلوکیاں شروع کیں۔ مرزا جہاں گیر تو مر چکے تھے مگر مرزا بابر زندہ تھے جو مرزا جہاں گیر کے بھائی تھے۔ مرزا بابر بھی مرزا جہاں گیر کی طرح شراب بہت پیتے تھے۔ ایک دفعہ شراب کے نشہ میں مدہوش ہو کر درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء میں آئے اور مزار کے سرہانے لبِ دری کے چبوترے پر کرسی بچھا کر بیٹھے اور پیچوان منگا کر حقہ پینے لگے۔ کس کی مجال تھی جو بادشاہ کے بھائی کو اس بُری حرکت سے روکتا۔ تاہم میرے نانا شاہ غلام حسن صاحب مرحوم نے مرزا بابر کو سمجھایا کہ یہ جگہ حقہ پینے کی نہیں ہے۔ آپ کو ایسی حالت میں یہاں آنا مناسب نہ تھا۔ مرزا بابر نشہ میں تھے۔ اُنہوں نے نوکروں کو حکم دیا کوئی ہے۔ اس شخص کو دھکے دے کر ہمارے سامنے سے لے جاؤ۔ ابھی کوئی نوکر آگے بڑھنے نہ پایا تھا کہ شاہ غلام حسن نے مرزا بابر کے قریب جا کر کہا۔ فدوی حاضر ہے اور حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ یہ کہہ کر اس زور سے کرسی میں لات ماری کہ مرزا بابر کرسی سمیت چبوترے سے نیچے گر پڑے۔ مرزا بابر نے بادشاہ کے ہاں شاہ غلام حسن کے خلاف دعویٰ دائر کیا۔ کیوں کہ شاہی خاندان کے اندرونی مقدمات خود بادشاہ کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ بہادر شاہ نے واقعات سننے کے بعد کہا بھئی اماں (یہ بہادر شاہ کا تکیہ کلام تھا) تم نے بہت بُرا کیا جو شراب پی کر وہاں گئے۔ اور مزار کے پاس کرسی پر بیٹھے اور حقہ پیا۔ اگر شاہ غلام حسن تم کو مار ڈالتے تب بھی مجھے حق نہ تھا کہ میں اُن کے خلاف کوئی فیصلہ کرتا۔ اس سے مرزا بابر بہت بگڑے اور انہوں نے مرزا جہاں گیر کی بیوہ حسینی بیگم کو بہکایا کہ قدسیہ باغ اور روشن آرا باغ وغیرہ اپا حضرت (اکبر شاہ ثانی) نے جہاں گیر بھائی کو دے دیئے تھے۔ اور جہاں گیر بھائی کی وارث تم ہو۔ ان باغوں کی آمدنی وصول کرنے کا بادشاہی اہل کاروں کو کوئی حق نہیں ہے۔ حسینی بیگم پہلے ہی ناراض تھیں کیوں کہ بہادر شاہ نے اُن کی تنخواہ میں کچھ کمی کر دی تھی۔ اب مرزا بابر نے سہارا دیا تو اُن کی ہمت بڑھی اور اُنہوں نے فریزر صاحب ریذیڈنٹ کے ہاں دعویٰ دائر کر دیا۔ فریزر صاحب نے مقدمہ ججی میں بھیج دیا۔ جج صاحب نے بادشاہ کے نام سمن جاری کئے۔ اس سے بہادر شاہ کو بہت اشتعال ہوا اور اُنہوں نے ریذیڈنٹ کو لکھا کہ میرے اندرونی معاملات میں کمپنی کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میرے دادا کا جو عہدنامہ بکسر کی لڑائی کے بعد لارڈ کلایو سے ہوا تھا اس میں یہ صاف صاف لکھا ہوا ہے کہ بادشاہ کے خانگی معاملات میں کمپنی کے اہل کار دخل نہیں دیں گے اور خانگی مقدمات کے فیصلے بادشاہ کے اختیار میں رہیں گے۔ پھر تم نے حسینی بیگم کا دعویٰ کیوں قبول کیا۔ تم کو مناسب تھا کہ یہ دعویٰ میرے پاس بھیج دیتے اور میں اس کی تحقیقات کرتا۔ اور جیسا مناسب سمجھتا فیصلہ کر دیتا۔ تمہارے جج نے میرے نام سمن بھیج کر میری توہین کی۔ میں تم کو اور تمہارے گورنر جنرل کو کمپنی کا نوکر سمجھتا ہوں اور کمپنی کو اپنا نوکر سمجھتا ہوں۔ اس لئے تم سب میرے نوکر در نوکر ہو۔ میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ آیندہ ایسی حرکت نہ ہو۔ ورنہ میں لندن میں تمہاری ملکہ کو اس کی شکایت لکھوں گا۔

ریذیڈنٹ نے اِس پیغام کا کوئی جواب نہیں دیا کیوں کہ مجھے اس خط و کتابت کا قلمی مجموعہ دستیاب ہو گیا ہے جو ریزیڈنسی سے بہادر شاہ کے پاس جایا کرتی تھی۔ اس مجموعہ میں مجھے بادشاہ کے اِس پیغام کا جواب نہیں ملا (دوسرے مکتوبات سے صرف اتنا ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ نے اس مقدمہ کی دہلی کی عدالت میں کوئی پیروی نہیں کی اور جج نے بادشاہ کے خلاف ڈگری دے دی۔ تب ریذیڈنٹ نے بادشاہ کو لکھا کہ آپ اس کا اپیل آگرہ کی عدالت میں کر سکتے ہیں) بہادر شاہ نے نہایت پر معنی مگر خفگی

کے لہجہ میں زبانی کہا۔ بہت اچھا۔ میں اس فیصلہ کا اپیل کروں گا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد ہی بہادر شاہ نے لوگوں کو مرید کرنا شروع کیا اور کمپنی کی نوجوں کے بہت سے سردار اور سپاہی بھی مختلف مقامات سے اُن کے پاس آکر مرید ہونے لگے جن کو مرید کرنے کے بعد بہادر شاہ ایک لال رومال بطور تبرک دے دیا کرتے تھے مرید کرنے کی تصویر بھی لال قلعہ کے میوزیم میں موجود ہے۔ اور غدر کے بعد جب بہادر شاہ کے خلاف لال قلعہ میں مقدمہ چلایا گیا تھا۔ اس وقت یہ معاملہ بھی عدالت میں پیش ہوا تھا کہ بادشاہ کا سپاہیوں اور سرداروں کو مرید کرنا اور لال رومال دینا کسی مرموز مطلب کے لئے تھا۔

بہرحال ولی عہدی کا قصہ سب سے زیادہ بہادر شاہ کے اشتعال کا باعث تھا اور مذکورہ واقعات جو بہت سی اقسام کے تھے محض کش مکش اور رنجش کو بڑھانے والے تھے۔ رنجش کی بنیاد نہ تھے۔ چنانچہ اسی قسم کا ایک اور واقعہ پیش آیا تھا کہ فریزر صاحب ریذیڈنٹ نے بہادر شاہ کو لکھا کہ جب آپ کی سواری قلعہ سے باہر جاتی ہے تو سب ہندو مسلمان اپنی اپنی سواریوں سے تعظیماً نیچے اُتر کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لہذا میں ادب کے ساتھ گذارش کرتا ہوں کہ یورپین لوگوں کو اس تعظیم سے آزاد رکھا جائے تو بہت عنایت ہوگی۔ بادشاہ نے جواب دیا ہاں ہاں اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ہمارے چوب داروں سے کہہ دیا جائے کہ وہ اگر کسی فرنگی کو سواری میں دیکھیں تو نیچے اُترنے کے لئے نہ کہیں۔ اس کے بعد ایک دن یہ ہوا کہ بادشاہ کی سواری قطب صاحب جا رہی تھی اور قطب سے ایک بگھی میں فریزر صاحب کے یورپین مہمان آ رہے تھے۔ سواری سے بہت آگے اردلی کے سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے جا رہے تھے۔ ان کو اس حکم کی خبر نہیں تھی۔ اُنھوں نے انگریزوں کی بگھی کو روکا اور اُن سے کہا کہ نیچے اُتر آؤ۔ جہاں پناہ کی سواری آ رہی ہے۔ انگریزوں نے انکار کیا تو سواروں نے گھوڑوں سے اُتر کر اُن انگریزوں کے ہاتھ پکڑے اور زبردستی بگھی سے گھسیٹ لیا اور تحکمانہ لہجے میں کہا۔ بگھی کے سامنے دونوں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاؤ اور جب سواری سامنے آئے تو جھک کر آداب بجا لاؤ۔ انگریز مجبور تھے۔ وہ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوگئے اور اُنھوں نے بادشاہ کو سلام بھی کیا۔ مگر دہلی پہنچ کر ریذیڈنٹ سے شکایت کی۔ ریذیڈنٹ نے قطب صاحب کے قیام کے زمانہ میں بادشاہ کو تحریری شکایت لکھی۔ بادشاہ نے جواب دیا۔ میں نے اپنے چوب داروں کو حکم دے دیا تھا اور وہ سب میرے ہوادار کے ساتھ تھے۔ مجھے معلوم نہیں کس نے اُن کو بگھی سے اُتارا۔ اس واسطے میں اس شکایت کو بالکل بے جا سمجھتا ہوں۔

الغرض اسی قسم کے قصے رات دن پیش آتے رہتے تھے۔

بادشاہ نے سب سے پہلے اپنے بڑے بیٹے مرزا دارا بخت کو ولی عہد بنایا تھا۔ ان کا انتقال ہوگیا تو مرزا شاہ رخ کو ولی عہدی دی گئی اور مرزا شاہ رُخ دہلی کے ایک طبیب کے غلط علاج کی وجہ سے قبل از وقت مرگئے تو بہادر شاہ نے اپنے چھوٹے بیٹے جواں بخت کی ولی عہدی کے لئے کوشش کی۔ مگر ریذیڈنٹ نے اس کو نہ مانا اور بہادر شاہ کے ایک بیٹے مرزا فخر الدین فتح الملک عرف مرزا فخرو کو ولی عہد بنا دیا۔ جو مرزا الٰہی بخش کے داماد تھے اور یہ بہادر شاہ اور انگریز کمپنی کی کشیدگی کی بنیاد تھی۔

بعض انگریز افسروں کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ جن کو میں نے اپنی تصنیف تاریخ غدر میں شائع کیا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم چاہتے تھے کہ بادشاہی کا نام ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ لاہور سے ایک نامور انگریز افسر نے گورنر جنرل کو لکھا تھا کہ دہلی کے لال قلعہ میں کب تک یہ ڈراما ہوتا رہے گا۔ ملک کی ترقی میں یہ چیز ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ چنانچہ جب ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو یکایک مرگئے اور مرزا قویاش وغیرہ شہزادوں نے اپنے لئے ولی عہدی کی کوششیں شروع کیں۔ اور ملکہ زینت محل نے بھی اپنے بیٹے جواں بخت کے لئے کوشش کی تو مرزا قویاش سے ریذیڈنٹ نے ان تین شرائط پر سمجھوتا کیا تھا۔

نمبر۱۔ میں اپنے آپ کو بادشاہ نہیں کہوں گا بلکہ پرنس کہوں گا۔

نمبر۲۔ میں لال قلعہ میں نہیں رہوں گا بلکہ بہادر شاہ کے بنائے ہوئے ظفر محل میں رہوں گا۔ جو درگاہ قطب صاحب میں بہادر شاہ

نمبر۳۔ میں کمپنی سے پچاس ہزار روپے ماہوار پنشن لوں گا۔ زیادہ کا مطالبہ نہیں کروں گا۔

قصہ مختصر پورا ۱۸۵۶ء ولی عہدی کی بحث اور توڑ جوڑ میں گزرا اور کہا جاتا ہے کہ بہادر شاہ نے ۱۸۵۷ء شروع ہوتے ہی سمجھ لیا کہ ریذیڈنٹ جواں بخت کی ولی عہدی کو منظور نہیں کریں گے اس واسطے انہوں نے ایک حبشی غلام کو ایران بھیجا اور مرہٹوں اور اودھ کے رئیس کو بھی اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی اور کمپنی کی فوجوں سے بھی سازش کا کام ایک بڑے پیمانہ پر شروع کر دیا۔

جہاں تک میں نے شمس العلماء منشی ذکاء اللہ صاحب کی تاریخ ہند اور دوسرے انگریزی کاغذات پر غور کرکے سمجھنے کی کوشش کی ہے مجھے اب تک اس کا یقین نہیں ہوا کہ بہادر شاہ نے کوئی سازش کی تھی۔ کم از کم کمپنی کی فوجوں سے سازش کرنے کا الزام بالکل غلط معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ اگر یہ ٹھیک ہوتا تو جب فوجیں میرٹھ سے باغی ہوکر دہلی میں آئیں اور لال قلعہ کی فصیل کے نیچے کھڑے ہوکر انہوں نے بادشاہ کی دہائی دی اور ریذیڈنسی کے ایک ملازم انگریز نے باغیوں سے کہا بادشاہ سلامت کے آرام میں خلل نہ ڈالو اور یہاں سے جاؤ تو بادشاہ نے اس انگریز کو حکم بھیجا کہ وہ باغیوں کے سامنے نہ جائے اور اپنی جان کو خطرے میں نہ ڈالے۔ اگر باغی فوجیں بہادر شاہ سے سازش کرکے آئی ہوتیں تو وہ گستاخانہ قلعہ کے اندر ڈیرے نہ لگاتیں اور کھلم کھلا یہ نہ کہتیں کہ یہ ہماری جوتی جس کے سر پر رکھی جائے گی وہی بادشاہ ہو جائے گا۔

بہادر شاہ کی غذا بہت کم تھی۔ چار شامی کباب کے چھلکے کھاتے تھے اور ایک بکرے کی یخنی پیتے تھے۔ البتہ معجونیں اور مقوی دوائیں ہمیشہ کھاتے رہتے تھے۔ ان کے روزنامچوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر سال دو چار نئے نکاح کر لیتے تھے۔ اکثر رات طوائفوں کا ناچ گانا اُن کے ہاں ہوتا تھا اور انہی میں سے کوئی نہ کوئی عورت محل کے لئے بھی منتخب ہو جاتی تھی۔ آخر زمانہ میں لال قلعہ میں اس کی احتیاط نہیں ہوتی تھی کہ اولاد کس کے بطن سے ہے۔ باپ کو دیکھا جاتا تھا کہ اولاد کس کے تخم سے ہے۔ اور یہ ایک بڑا سبب مغلوں کی کمزوری اور تباہی کا تھا۔

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ فرو ہو جانے کے بعد بہادر شاہ کو برما میں جلا وطن کیا گیا۔ جہاں وہ کئی سال زندہ رہے۔ بمبئی کے ایک ماہوار گجراتی رسالے نے پارلیمنٹ کے ایک ممبر کی تحریر شائع کی تھی کہ وہ سیاحت کے لئے آیا تو بہادر شاہ کو رنگون میں دیکھنے گیا۔ بہادر شاہ کھری چارپائی پر لیٹے تھے حقہ اُن کے سامنے رکھا تھا۔ اور ایک موٹا ٹاٹ اُنہوں نے اپنے چہرے پر ڈال رکھا تھا۔ ممبر پارلیمنٹ لکھتا ہے کہ اپنے ترجمان کے ساتھ کچھ دیر اس بوڑھے قیدی کے پاس کھڑا رہا اور سوچتا رہا کہ وہ اپنے بزرگوں کے جاہ وجلال کا خواب دیکھ رہا ہے۔ کچھ دیر کے بعد بہادر شاہ نے وہ ٹاٹ کا کپڑا اپنے چہرے سے ہٹا کر بہت خفگی کی نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے ترجمان کے ذریعہ کہا: میں پارلیمنٹ کا ممبر ہوں۔ اگر تمہیں کوئی تکلیف ہو تو مجھ سے کہو تاکہ میں اس کا انتظام کرا دوں۔ بہادر شاہ نے ترجمان کی بات سُن کر اپنے بازو کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے جھک کر دیکھا کہ اس میں زخم تھا اور اس سے بُو آ رہی تھی اور شاید اس میں کیڑے بھی تھے۔ میں نے کہا کہ میں ابھی ڈاکٹر کا انتظام کرتا ہوں آپ اچھے ہو جائیں گے۔ بادشاہ نے پانی کے مٹکے کی طرف بھی اشارہ کیا۔ میں نے جا کر دیکھا۔ مٹکا بہت میلا تھا اور اس کا ڈھکنا بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ میں نے بہادر شاہ سے کہا میں صاف پانی کا انتظام بھی کرا دیتا ہوں۔ آپ کو کچھ اور بھی کہنا ہے؟

بہادر شاہ نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا اور ٹاٹ اپنے چہرے پر پھر ڈال لیا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ بمبئی کے مذکورہ رسالے نے پارلیمنٹ کے ممبر کی تحریر میں کوئی کمی بیشی کی تھی یا نہیں۔ میں نے ممبر مذکور کی انگریزی تحریر نہ خود دیکھی نہ کسی ایسے آدمی سے میری ملاقات ہوئی جس نے وہ تحریر دیکھی ہو۔ یہ مضمون بہادر شاہ کی پوری زندگی پر حاوی نہیں ہے اور میں نے جتنی کتابیں ۱۸۵۷ء کے غدر کی لکھی ہیں اُن سے بھی بہادر شاہ کی پوری زندگی ظاہر نہیں ہو سکتی۔ اگر دہلی کے ادب مل جل کر اس کام کو پورا کریں تو میں سمجھتا ہوں کہ اپنا وہ فرض ادا کریں گے جو اُن پر قدرتی طور سے عاید ہوتا ہے۔

(خواجہ حسن نظامی)

"ادیب"

مطبوعات

مضامینِ عالم جے۔اے۔ساقی صاحب نے مختلف دل چسپ مضامین کا یہ مجموعہ طلبہ کے فائدے کے لئے شائع کیا ہے۔ مضامین ساقی صاحب نے خود لکھے ہیں۔ زبان اور معیار اوسط درجے کا ہے۔ بعض مضامین یہ ہیں (۱) زبانِ اُردو کی تاریخ (۲) مولانا ابوالکلام آزاد (۳) ہندوستانی مسئلۂ نیابت کا واحد حل (۴) سر کرپس۔ قیمت ۱۲ر۔ پتا: اُردو بک سٹال ہال بازار امرتسر

متین کے سو شعر حضرتِ متین تلمیذ حضرتِ داغ دہلوی کے سو اشعار کا مجموعہ سید سعدی جعفری نے شائع کیا ہے۔ اشعار پرانے غزلیہ انداز کے ہیں۔ حضرتِ متین کی تصویر بھی سر ورق پر دی گئی ہے۔ قیمت ۳ر پتا: مکتبۂ ادب الٰہ آباد

حجاب ۔ یہ ایک زنانہ ادبی رسالہ ہے جس کی ایڈیٹر عذرا بیگم صاحبہ ہیں۔ اس رسالے میں افسانے، نظمیں اور عورتوں کی دل چسپی کے کچھ مضامین شائع ہوتے ہیں تصویریں بھی شائع کی جاتی ہیں۔ اوسط درجے کا رسالہ ہے۔ چندہ سالانہ ستے۔ قیمت فی پرچہ ۴ر پتا: دفتر "حجاب" بمبئی علا

قرآن اور سیرت سازی از ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم۔اے پی ایچ۔ڈی (لنڈن) بیرسٹرایٹ لا پروفیسر فلسفہ جامعۂ عثمانیہ حیدر آباد (دکن) اس کتاب میں آیاتِ قرآنی کی روشنی میں دکھایا گیا ہے کہ اسلام نے سیرتِ انسانی کا کتنا بلند تصور پیش کیا ہے۔ قیمت ۸ر مؤلف سے طلب کیجئے۔

سوزِ دروں یہ مولانا رشید اختر صاحب ندوی کا ایک دل چسپ ناول ہے جسے انہوں نے سر عبدالقادر کے نام معنون کیا ہے۔ مولانا بہت اچھی زبان لکھتے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ وہ اپنی اس صلاحیت سے کوئی بہتر کام لیں۔ کاش وہ تاریخ وسیرت کی طرف متوجہ ہوں یا کسی اعلیٰ درجے کی عربی تصنیف کو اُردو کا جامہ پہنائیں۔ ناول کا حجم ۱۹۰ صفحات ہے۔ کاغذ نفیس ہے اور جلد اور گرد پوش خوش نما ہے۔ قیمت عہ پتا: اُردو بک سٹال لاہور۔

اثر کے ڈیڑھ سو نشتر قیمت ۴ر مطبوعہ نظامی پریس بدایوں۔ یہ خان بہادر مرزا جعفر علی خان اثر ہوم منسٹر کشمیر کے کلام کا انتخاب ہے۔ یقیناً پڑھنے کے قابل ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:-

(۱) شوقِ بے حد چاہئے اور جذب کامل چاہئے ﴿ گو بہت پیچ راہِ عشق ہے دل چاہئے ﴾ (۲) ان کو سمجھاتا ہے آتے ہیں جو سمجھانے کو ﴿ کون دیوانہ کہے گا تیرے دیوانے کو ﴾
(۳) چارۂ دردِ جگر جانے دو ﴿ جو گزرتی ہے گزر جانے دو ﴾ (۴) پھر سے آراستہ ہو انجمنِ شیفتگی ﴿ لطفِ دیرینہ بہم شیخ و برہمن میں نہیں ﴾ (۵) مٹ مٹ کے اور اُبھریں گے نقشِ وفا مرے ﴿ کچھ رنگِ بے ثباتیٔ دنیا نہیں ہوں میں ﴾ (۶) ہر اک منزل کو ٹھکراتا ہوا چل ﴿ پیامِ ہمتِ مردانہ بن جا ﴾
(۷) کچھ اور نیک و بد کی حقیقت نہیں اثر ﴿ انسان آئینہ ہے خود اپنے خیال کا ﴾

اُردو سبھا (یعنی مجموعہ مضامین مرتبہ پرتاب اُردو سبھا سری پرتاب کالج سری نگر کشمیر مطبوعہ ستمبر ۱۹۴۲ء قیمت ۱ علہ) سری نگر کالج کے معلمین و طلبا کی یہ کوشش یقیناً قابلِ قدر ہے۔ اس میں علاوہ ڈاکٹر محمد دین تاثیر پرنسپل کالج کے پُر مغز مضامین کے اُردو کے بعض مشہور ادبا و شعرا کی تحریریں ہیں مثلاً مرزا جعفر علی خان ہوم منسٹر کشمیر۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری۔ اختر صہبائی۔ روش صدیقی۔ میاں بشیر احمد ایڈیٹر ہمایوں۔ ہندو مسلم طلبا اور ہندو مسلم پروفیسروں نے مل کر اس مجموعے کی ترتیب میں حصہ لیا ہے۔ کشمیر کے متعلق بعض تحقیقی مضامین بھی درج ہیں۔ اخیر میں "ہندوستان کی مشترکہ زبان" کے عنوان سے اُردو کی فوقیت، اور ہر دل عزیزی کو دلائل سے ثابت کیا گیا ہے۔

سید عبداللطیف پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ ہمایوں ۳۲ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا صرف سرورق ہاف ٹون پریس رام نگر لاہور میں چھپا

جلد ۴۲ — نمبر ۵

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ نومبر ۱۹۴۲ء

ضروری اطلاع جواب طلب امور کے لئے اپنا پتا لکھ کر جوابی کارڈ اور مضامین کے ساتھ ان کی رسید کی اطلاع یا واپسی کے لئے اپنا پتا لکھ کر ٹکٹ لگا لفافہ بھیجنا بہت ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر دفتر "ہمایوں" خط و کتابت کا ذمہ دار نہ ہوگا اور ناقابل اشاعت مضامین بیرنگ واپس کئے جائیں گے

چندہ سالانہ ۵ روپے ششماہی ۳ روپے (مع محصول) — قیمت فی پرچہ ۸ آنے

جہاں نما

عورتوں کا حملہ

انگلستان میں مردوں کی ایک جماعت کو یہ فکر پیدا ہوگئی ہے کہ موجودہ جنگ کے خاتمے پر عورتیں زندگی کے ہر شعبے پر حملہ آور ہوں گی اور مردوں کو بے روزگاری کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس خطرے کو پیش نظر رکھ کر مردوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے ایک مجلس "نیشنل مینز ڈیفنس لیگ" کی بنیاد ڈالی گئی ہے۔ اس لیگ کا دعویٰ ہے کہ برطانیہ کو تحریکِ نسواں سے اتنا ہی خطرہ ہے جتنا ہٹلریت سے۔

حال ہی میں اس لیگ نے ایک رسالہ شائع کیا ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ گزشتہ جنگِ عظیم کے بعد سے عورتوں نے کس طرح ہر طرف اپنے دائرۂ اثر کو وسعت دی ہے۔ لیگ کے الفاظ میں تحریکِ نسواں مردوں کی ملازمت اور خانگی زندگی دونوں کے لئے سخت خطرناک ہے یہاں تک کہ اس سے برطانیہ کی عظمت واقتدار کو بھی پناہ نہ مل سکے گی۔ لیگ نے تمام مردوں کو دعوت دی ہے کہ اس موقع پر عورتوں کے خلاف جوابی حملے کی تیاری شروع کر دیں کیوں کہ موجودہ سیاسی جماعتیں اس خطرے کا مقابلہ کرنے کی اہل ثابت نہیں ہوئیں۔ چونکہ اکثر اخبارات نے تحریکِ نسواں کی حمایت کی روش اختیار کر رکھی ہے اس لئے لیگ کی تجویز ہے کہ جنگ کے بعد ایک مردوں کا اخبار بھی جاری کیا جائے۔

تحریکِ نسواں کے خلاف لیگ کو ایک بڑی شکایت یہ ہے کہ اس کی سرگرمیوں کی وجہ سے بچوں کی شرحِ پیدائش میں کمی پیدا ہوگئی ہے۔ لیگ نے ایک ماہر کی رائے کا حوالہ دے کر یہ دعویٰ کیا ہے کہ اگر شرحِ پیدائش کی کمی اسی طرح جاری رہی تو پچیس سال کے اندر حالات سخت نازک ہو جائیں گے۔ یہ رسالہ ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے "ہم عورتوں کی جنس کے خلاف جنگ نہیں کریں گے بلکہ تحریکِ نسواں کے اُن علم برداروں کے خلاف جو عورتوں کو ایک علیحدہ جماعتی حیثیت دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ناول کی حمایت

ناول اور افسانے کی مقبولیت کے باوجود لوگوں میں یہ خیال عام طور پر پایا جاتا ہے کہ ناول کوئی مؤقر صنفِ ادب نہیں۔ انگریز ناول نویس مسٹر ہاورڈ سپرنگ نے ایک موقع پر ناول کی حمایت میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اخبارات نے یہ ایک دستور بنا لیا ہے کہ جب کبھی ناشرانِ کتب اپنے اعداد و شمار شائع کرتے ہیں تو وہ ناولوں کی کثرتِ تعداد پر اظہارِ تاسف ضروری سمجھتے ہیں۔ مسٹر ہاورڈ سپرنگ کی رائے میں اخبار نویسوں کی یہ روش ناقابلِ فہم ہے۔ اُن کے نزدیک قابلِ افسوس بات یہ نہیں کہ ناول کثرت سے شائع ہوتے ہیں بلکہ یہ ہے کہ شائع شدہ ناولوں کی ایک بڑی تعداد بُری ہوتی ہے لیکن اس قسم کا اظہارِ افسوس صرف ناولوں تک محدود نہیں رہنا چاہئے۔ اور بھی بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کی خرابی اسی طرح قابلِ افسوس ہے۔ اکثر عمارتوں کو دیکھئے، وعظوں کو سنئے، اخبارات کو پڑھئے تو اُن کی حالت ناگفتہ بہ معلوم ہوتی ہے۔ اگر ناول پر بھی یہی بات صادق آتی ہے تو اس سے بجائے خود ناول کی برائی نہیں ثابت ہوتی۔ اگر زیادہ ناول بُرے ہیں تو اس سے اچھے ناولوں کی خوبی میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا

سگریٹ کا اثر اعصاب پر

بعض لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ سگریٹ پینے سے انسان کے اعصاب کو بہت تسکین حاصل ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں

کہ عصبی مزاج کی عورتوں کے اعصاب کو سگریٹ پینے سے عارضی تسکین حاصل ہو جاتی ہے لیکن آخر کار سگریٹ کا اثر اس شکایت میں اضافہ کر دیتا ہے جسے یہ عارضی طور پر رفع کرتا ہے۔ لڑکوں اور نوجوان آدمیوں کے لئے سگریٹ کا عادی ہو جانا بہت مضر ہے لیکن لڑکیوں اور نوجوان عورتوں کے لئے یہ عادت اور بھی زیادہ خطرناک ہے۔ آج کی لڑکیوں کو کل کی مائیں بننا ہے۔ سگریٹ پینے والے ماں باپ کی عصبی مزاج اولاد زندگی کی جدوجہد سے اچھی طرح عہدہ برا نہیں ہو سکتی۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے سرجن جنرل نے امریکہ والوں کو تنبیہ کی ہے کہ اگر امریکی عورتوں میں سگرٹوں کا رواج اسی طرح ترقی پر رہا جیسا موجودہ اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے تو اس سے قومی صحت پر بہت برا اثر پڑے گا اور تمام قوم اس سے نقصان اٹھائے گی۔ سگریٹ کی عادت مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے لئے بہت زیادہ مضر ہے۔"

ٹینک

میجر پال سی۔ ریبرگ نے اپنی کتاب "میکینائزڈ مائٹ" میں ٹینک کا ذکر کرتے ہوئے اس کی دلچسپ وجہ تسمیہ بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

گزشتہ جنگِ عظیم کے دوران میں انگریزوں نے سب سے پہلے ٹینک بنائے۔ ابتدا میں ان کی ماہیت بالکل صیغۂ راز میں رکھی گئی یہاں تک کہ جن کاریگروں نے ان کو بنایا وہ بھی اس بات سے بے خبر تھے کہ ان کا مصرف کیا ہے۔ انہیں یہ بتایا گیا تھا کہ یہ مشینیں مصر میں پانی کے بڑے بڑے ٹینکوں کی باربرداری کے لئے استعمال کی جائیں گی چنانچہ ان کی ساخت کے زمانے میں جہاں کہیں ان کا ذکر کرنے کی ضرورت پڑی انہیں "پانی لانے والے" کا نام دیا گیا۔ بالآخر کارخانوں کے کاریگر اختصار کے لئے انہیں "ٹینک" کہنے لگے اور یہ نام ان کے ساتھ اس طرح چپکا کہ اب تقریباً ہر ملک میں ان کا یہی نام ہے۔

غذائیت

ڈاکٹر کے پی باسو نے ڈھاکہ سے غذائیت کے موضوع پر ایک تقریر نشر کرتے ہوئے کہا کہ حیوانات کے مقابلے میں انسان کی بھوک کا عمل بہت زیادہ پیچیدہ ہے۔ اسے غلط تصورات بے بنیاد تعصبات اور اشتہاری پراپگنڈا سے مطابقت دی جاتی ہے اور اس طرح انتخابِ غذا میں جبلت کا جو حصہ ہے وہ تقریباً کالعدم ہو جاتا ہے۔ جبلت اور بھوک کا تقاضا غذا کے استعمال کو حرارتِ غریزی کی ضروریات سے مطابقت تو دے دیتا ہے لیکن بدن کی تعمیر و حفاظت کا مقصد اس سے پورا نہیں ہوتا۔ مناسب غذا حاصل کرنے کے مسئلے کا بہترین حل یہ ہے کہ انسان حفاظت کرنے والی غذاؤں کو بنیادی حیثیت دے۔ اس قسم کی غذاؤں میں دودھ، تازہ پھل، سبزیاں اور انڈے شامل ہیں کیوں کہ ان میں معدنی اجزا اور وٹامنز کثرت سے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد بدن کو تعمیر کرنے والی غذاؤں کا درجہ آتا ہے جن میں پروٹینز کی کثرت ہوتی ہے باقی رہیں توانائی پیدا کرنے والی غذائیں۔ سو اُن کو بھوک کے تقاضے پر چھوڑ دینا چاہئے۔ بدن کی حفاظت اور تعمیر کرنے والی غذاؤں میں دودھ کو امتیازی حیثیت حاصل ہے کیوں کہ اس میں وہ تمام اجزا موجود ہوتے ہیں جن سے بدن کی نشوونما ہوتی ہے۔

ہندوستان میں دودھ کی پیداوار ناکافی ہے۔ اگر اس ملک کی تمام آبادی کو دودھ کی کم از کم لازمی مقدار بھی بہم پہنچانی مقصود ہو تو دودھ کی پیداوار کو چار یا پانچ گنا زیادہ کرنا چاہئے۔

انسان اور مشین

انسانی کارگزاری اور ایک اچھی مشین کی کارکردگی میں کتنا فرق ہے؟ کچھ عرصہ ہوا اس سوال کا جواب دیا گیا جب ایک مشاق بائیسکل چلانے والے نے بائیسکل کو تیز چلا کر اُس کے ڈائنمو سے بجلی پیدا کر کے اس کی قیمت کا اندازہ لگایا۔ ڈائنمو کے تاروں کے ساتھ بجلی کے قمقموں کی ۳۲۰ واٹس کی ایک بیٹری لگائی گئی تھی اور اگرچہ بائیسکل چلانے والے نے بائیسکل کو ایک منٹ تک اپنی پوری قوت کے ساتھ تیز چلایا لیکن وہ بجلی کی اس قدر مقدار بھی پیدا نہ کر سکا جس سے قمقمے اپنی پوری استعداد کے برابر چمک اٹھتے۔

جس مشین نے بائیسکل چلانے والے کی قوت کا اندازہ لگایا اس سے معلوم ہوا کہ اس ایک منٹ کی بے محابا دوڑ دھوپ سے وہ صرف اتنی بجلی پیدا کر سکا جس کی قیمت ایک آنے کا ۱/۸ واں حصہ تھی۔

لنڈن کی از سرِ نو تعمیر

جنگ کے بعد لنڈن کا نیا نقشہ بنانے کا کام پروفیسر لیزلی پیٹرک ایبر کرومبی کے سپرد ہوا ہے۔ ان کی عمر اس وقت ۶۳ سال کی ہے۔ لارڈ پورٹل وزیرِ تعمیرات نے اُن کے تقرر کا اعلان دار الامراء میں کر دیا ہے۔ امورِ عامہ کے مختلف شعبوں کے ماہرین اور کاریگر اس سلسلے میں پروفیسر ایبر کرومبی کے مددگار ہوں گے۔

نٹ راجہ

ہندو تصور کے مطابق شو سب سے پہلا ناچنے والا ہے۔ اُسے نٹ راجہ بھی کہتے ہیں جس کا مطلب ہے ناچنے والوں کا بادشاہ۔ شو کی کئی حیثیتیں ہیں کیوں کہ مختلف علاقوں میں اس کا تصور مختلف حیثیتوں میں قائم ہوا۔ صوبجات متحدہ میں اُسے یوگی اور فلسفی کی حیثیت حاصل ہے۔ بنگال میں وہ تباہی کا دیوتا قرار دیا جاتا ہے اور جنوبی ہند کے لوگ اُسے نٹ راجہ سمجھتے ہیں۔ نٹ راجہ سفید فام ہے۔ پرانی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ناچ سات قسموں پر مشتمل ہے:-

(۱) انند ناچ یعنی خوشی کا رقص
(۲) سندھیا ناچ یعنی شام کا رقص
(۳) کالیکا ناچ یعنی بدی اور جہالت کے بھوتوں کو قتل کرنے کا رقص
(۴) تریپورا ناچ یعنی تریپورا بھوت کو قتل کرنے کا رقص
(۵) سمھارا ناچ یعنی تباہی کا رقص

ان ناچوں کے علاوہ دو اور رقص بھی شو سے منسوب ہیں لیکن ان میں وہ تنہا رقص نہیں کرتا۔ اس کی بیوی پاربتی بھی ان میں شامل ہوتی ہے:-

(۶) گوری ناچ یعنی گوری کے ساتھ رقص
(۷) اما ناچ یعنی اما کے ساتھ رقص

نٹ راجہ کے متعلق مرحوم عبدالرحمٰن بجنوری کی نظم مشہور ہے۔

حامد علی خاں

ہندوستان کی تاریخ پر ایک سرسری نظر

(۴)

انگریزوں کا عہد

(سنہ ۱۹۱۹ء سے تاحال)

مہاتما گاندھی کی تحریک جو ۳۰ مارچ سنہ ۱۹۱۹ء کی ہڑتال کے ساتھ شروع کی گئی ہندوستان کی جدید تاریخ کے ایک نئے باب کا عنوان سمجھی جاسکتی ہے۔ اس کے بعد سے لے کر آج تک گاندھی کی شخصیت ہندوستانی سیاسیات پر چھائی رہی ہے۔ کبھی وہ علی الاعلان ہنگامہ کرتے رہے کبھی وہ قید ہوئے کبھی پس پردہ ہوگئے کبھی نیچے دروں خیمے بروں رہے لیکن جہاں بھی رہے سوائے شاید تھوڑے عرصے کے ان کا گہرا اثر ملک کے حالات پر پڑتا رہا۔ ۳۱ جولائی کو جو شیلا تلک ملک عدم کو چل بسا اور دوسرے دن یکم اگست کو گاندھی نے اپنی پُرامن تحریک شروع کی جس سے سیاسیات میں ایک نئے دور کی ابتدا ہوئی تھی۔ جوش دکھانے کا زمانہ ختم ہوا اب تکلیف سہنے کا وقت آیا۔ غرض ۳۰ مارچ کو ہڑتال ہوئی اس کے بعد ستیہ گرہ کا حلف اٹھایا گیا، لوگوں میں ہلچل پیدا ہوئی، شورش ہوئی گولیاں چلیں۔ ۱۳ اپریل کو جلیان والے باغ میں سینکڑوں آدمیوں کو مشین گنوں کا شکار بنایا گیا۔ ۱۵ کو پنجاب میں مارشل لا کا نفاذ ہوا۔ جگہ جگہ بلوے ہوئے اور جگہ جگہ گولیاں چلیں۔ ہنٹر کمیٹی بیٹھی۔ اگلے سال مئی سنہ ۲۰ء میں اس کی رپورٹ شائع ہوئی جس میں انگریز ممبروں نے جلیان والے باغ کے ہیرو جنرل ڈائر کے متعلق ہندوستانیوں کی اشک شوئی کی تھوڑی بہت کوشش کی لیکن انگلستان کے ہاؤس آف لارڈز (دارالامرا) نے جنرل ڈائر کو سزا دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر یکم اگست سنہ ۲۰ء کو گاندھی نے اپنی ترکِ موالات کی تحریک شروع کر دی۔ برطانوی حکومت کی عظمت کے سامنے مہاتما گاندھی کی سیاسی شورش کے ہتھیار ستیہ گرہ اور اہمسا تھے۔ ایک ستیہ گراہی یعنی سچ کا سپاہی کسی معین کام کے کرنے مثلاً کسی قانون کے توڑنے میں اہمسا یعنی عدم تشدد کا رستہ اختیار کرتے ہوئے اپنی جان پر ہر قسم کی سختیاں سہتا تھا اور اپنے مخالف یا دشمن کے جان و مال پر کسی طرح حملہ نہ کرتا تھا۔ اس تحریک نے ہندوستان بلکہ ساری دنیا میں ایک نئی طرز جنگ کی طرح ڈالی۔ اب چھپ چھپا کر قانون کی خلاف ورزی کرنے یا بم بنانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اب کھلم کھلا حکومت کی پُرامن طریقے سے مخالفت کی جاسکتی تھی گاندھی کا اعلان کرنا تھا کہ ہزاروں اُن کے پیچھے ہو لئے اور قوانین کی مخالفت شروع ہوگئی۔ پولیس لاٹھیاں برساتی لوگ شوق سے پٹتے جیل خانے جاتے اور اس پر فخر کرتے۔ ایک آن کی آن میں ہندوستان کی سیاست کی کایا پلٹ گئی۔ انگریز کا ڈر پولیس کا ڈر جیل کا ڈر سب جاتا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ ترکِ موالات کی تحریک ناکام رہی۔ اس میں شبہ نہیں کہ عوام کے لئے اس طرح کے عدم تشدد پر کاربند رہنا سخت مشکل تھا اور یہی وجہ تھی کہ آخر کار گاندھی کو یہ تحریک چھوڑنی پڑی مگر اس سے گاندھی کے کسی بڑے سے بڑے مخالف کو بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ ہندوستانیوں کے دل سے سفید چمڑے کا ڈر نکال دینا اُسی اکیلے شخص کا کام ہے۔ اس کے بعد غلامی سے پیدا ہونے والی بزدلی روز بروز کم ہوتی گئی اور ہندوستان والوں کے سامنے ذہنی ترقی کا ایک وسیع میدان کھل گیا۔

ترکی کے ساتھ جو بے انصافی ہوئی، یونانیوں نے جو ظلم سمرنا کی فتح کے بعد کئے اُن سے ناراض ہو کر خلافت کمیٹی اور جمعیتہ العلما نے گاندھی کا ساتھ دیا اور گاندھی اور علی برادران نے مل کر ملک میں بائیکاٹ کا پروگرام ایک وسیع پیمانے پر شروع کر دیا۔ طلبا سے کہا گیا کہ وہ سکول کالج چھوڑ دیں وکلا سے اپیل کی گئی کہ وہ عدالتوں میں جانا ترک کر دیں۔ اسی طرح لوگوں کو ٹیکس ادا نہ کرنے اور نئی آنے والی

کونسلوں کا مقاطعہ کرنے کی ہر طرح ترغیب دی گئی۔ ساتھ ہی گاندھی نے چرخا کاتنے اور کھدر پہننے کا پرچار کیا اور شراب خانوں کا پکٹنگ بھی شروع کر دیا۔ اِدھر خلافت کمیٹی نے مسلمانوں کو ہجرت کا مشورہ دیا۔

چند مہینے یہ تحریک اپنے زوروں پر رہی لیکن بعض وجوہ سے اِس کی کامیابی میں روڑے اٹکنے شروع ہو گئے۔ اگست ۱۹۲۱ء میں موپلوں کی بغاوت شروع ہوئی۔ سردیوں میں پرنس آف ویلز کے آنے پر بلوے ہوئے۔ اور آخر فروری ۱۹۲۲ء میں چوری چورا کا واقعہ پیش آیا جس میں بلوائیوں نے پولیس کے ۲۱ آدمیوں کو زندہ جلا دیا۔ اس پر گاندھی نے تحریک کے بند کئے جانے کا اعلان کر دیا اور اگلے مہینے اُن کو قید کر دیا گیا جس پر یہ تحریک ختم ہو گئی۔

فروری ۱۹۲۱ء میں دہلی میں نئی کونسلوں کے افتتاح کے موقع پر ڈیوک آف کیناٹ نے ملک معظم کی طرف سے اعلان کیا کہ "آج میری سلطنت میں آپ کے لئے سوراج کی ابتدا ہو رہی ہے"۔ حالات کس قدر بدل گئے ہوں گے کہ برطانوی شاہی خاندان کا ایک نمائندہ اپنے ایک اہم سیاسی اعلان میں سوراج کا معنی خیز لفظ بولتا ہے۔

اس کے بعد تھوڑے عرصے کے لئے ہندوستان کے حالات میں ایک نہایت افسوسناک تبدیلی پیدا ہوئی۔ گاندھی کا جیل میں جانا تھا کہ ہندوؤں کی عنانِ سیاست بعض کوتاہ اندیش لیڈروں کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس کے بعد تقریباً پانچ سال تک **ہندو مسلمانوں کے تعلقات** سخت بگڑ گئے۔ اُدھر سے شدھی سنگٹھن اور مہا سبھائی زور و شور اور اِدھر سے تبلیغ و تنظیم کے نعرے بلند ہوئے۔ بلوے ہر سال بڑھتے گئے۔ ۱۹۲۳ء میں مسلمانوں کو خوش کرنے کے لئے پہلے مولانا ابوالکلام کو اور پھر مولانا محمد علی کو کانگرس کا صدر بنایا گیا۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۲۴ء کو گاندھی جی نے ہندو مسلم اتحاد پر زور دینے کے لئے دہلی میں اکیس دن کا برت رکھا۔ مختلف لیڈر جمع ہوئے ایک نیشنل پنچایت بورڈ بنایا گیا۔ گاؤکشی اور باجے اور اذان وغیرہ کے متعلق تجاویز بھی منظور ہوئیں مگر بلوے نہ رُکنے تھے نہ رُکے۔

دسمبر ۱۹۲۵ء میں علی گڑھ کالج کی جوبلی کے موقع پر مسلمانوں رہنماؤں نے سر جوڑ کر مشورہ کیا۔ ۱۹۲۶ء میں خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلماء .... بھی ہندو اداروں سے علیحدہ ہو گئیں۔ ۱۹۲۷ء میں ۷۲ سے زائد بلوے ہوئے۔ لارڈ ارون نے بہتیری اپیل کی مگر خدا جانے وہ ۱۹۲۰ء ۔ ۱۹۲۲ء کی اتحاد کی رُوح کہاں پرواز کر گئی تھی کہ کسی کے کان پر جُوں بھی نہ رینگی اور حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔

۱۹۲۱ء میں پہلی "اصلاح شدہ" کونسلیں بیٹھیں۔ ملک میں پھوٹ پڑ چکی تھی۔ مارچ ۱۹۲۲ء میں گاندھی کو قید کر دیا گیا تھا۔ ۲ اگست کو لائڈ جارج وزیر اعظم انگلستان نے پارلیمنٹ میں فرمایا کہ سول سروس کے انگریزی افسر بمنزلہ فولادی قالب کے ہیں اور ہندوستان کبھی اُن کے بغیر اپنا کام نہ چلا سکے گا۔ اس سے ہندوستان کی لبرل جماعت پریشان ہو گئی۔ سر سپرو وغیرہ نے سرکاری ملازمتوں سے استعفے دے دیئے اور ۱۹۲۳ء میں لبرل فیڈریشن کی از سر نو تنظیم کر کے کونسلوں میں گورمنٹ کو مسلسل شکستیں دیں۔ ۱۹۲۴ء میں دوسری نئی منتخب شدہ کونسلوں میں سوراجیوں کی کانگرسی جماعت بھی شریک ہوئی۔ انگلستان میں اس زمانے میں پہلی لیبر گورمنٹ (مزدوروں کی حکومت) برسر اقتدار ہوئی جس سے ہندوستانی سیاست دانوں کا حوصلہ ذرا بڑھا اور اُنہوں ۱۹۲۵ء میں دستوری ترقی کے لئے پھر شور مچانا شروع کیا۔ دسمبر ۱۹۲۶ء میں کانگرس نے نہرو کمیٹی بٹھائی تاکہ ہندوستان کے لئے ایک دستورِ حکومت تجویز کرے۔

۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن کے آنے پر ملک میں پھر سیاسی بیداری کے آثار نظر آنے لگے۔ کانگرس نے کمیشن کا بائیکاٹ کیا۔ "سائمن واپس جاؤ" کے نعرے جگہ جگہ لگے گئے۔ اس بات پر عام طور پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا گیا کہ اس کمیشن کا کوئی ہندوستانی رُکن نہ تھا۔ کمیشن کی آمد پر کئی ہندو اور مسلم جماعتیں اپنا اپنا ساز و سامان درست کرنے لگیں۔ شہادتیں جمع ہوئیں یادداشتیں پیش کی گئیں مسلم لیگ بھی جو پانچ سال سے غفلت میں پڑی تھی بیدار ہوئی گو اس بیداری کا ایک عجیب نتیجہ یہ نکلا کہ ایک لیگ کی دو لیگیں بن گئیں

ایک وہ جو گورنمنٹ سے تعاون کرنا چاہتی تھی دوسری وہ جو کمیشن کا مقاطعہ کرنا چاہتی تھی لیکن ملک کی کس قدر بدقسمتی تھی کہ کانگرس کی مقاطعہ کرنے والی جماعت لیگ کی مقاطعہ کرنے والی جماعت سے بھی تعاون نہ کر سکی۔ اِس کی تفصیل حد درجہ رنجدہ ہے ۱۹۲۷ء میں لارڈ برکن ہیڈ نے پارلیمنٹ میں ہندوستانیوں کو چیلنج دیا تھا کہ وہ کبھی مل کر اپنے ملک کے لئے دستور نہیں بنا سکتے۔ اس پر لیگ اور کانگرس دونوں کو غصہ آیا اور لیگ نے ریزولیوشن پاس کیا کہ کانگرس کے ساتھ مل کر ایک دستور بنایا جائے۔ اس سے پہلے مسلم لیڈر دہلی اور شملے میں جمع ہو چکے تھے اور نہرو کمیٹی اپنا کام کر رہی تھی۔ اگست ۱۹۲۸ء میں اس کمیٹی نے آل پارٹیز کانفرنس کے اجلاس میں اپنی رپورٹ جسے نہرو رپورٹ پکارا جاتا ہے مکمل کی۔ کلکتے میں ایک نیشنل کنونشن کے اجلاس میں اسے پیش کیا گیا اور باوجودیکہ سکھ اور مسلمان دونوں اس کی مخالفت کر چکے تھے اور مسٹر جناح اور دوسرے مسلمان لیڈروں نے کنونشن میں اس کی مخالفت کی تاہم بغیر ضروری ترمیموں کے اسے منظور کر لیا گیا۔ اِدھر دہلی میں **آل انڈیا مسلم کانفرنس** کا اجلاس منعقد ہوا اور یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو مسلمانوں کے مختلف الخیال رہنماؤں نے ایک اہم قرارداد منظور کی جو مسلمانوں کے تمام ضروری مطالبات پر مشتمل تھی مسٹر جناح کے مشہور چودہ نکات بھی جو ۱۹۲۹ء میں مرتب ہوئے اس قرارداد سے مطابقت رکھتے ہیں۔ قرارداد کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستان کی مرکزی حکومت وفاقی ہو اور فاضل اختیارات مختلف ریاستوں اور صوبوں کو حاصل ہوں۔ اگر کسی جماعت کے تین چہارم ممبر کسی تجویز یا بل سے اختلاف کریں تو وہ قانون ساز جماعت کے سامنے پیش نہ ہو مسلمانوں کا جداگانہ انتخاب اُس وقت تک قائم رہے جب تک وہ اُسے ضروری سمجھیں۔ مرکزی اور صوبجاتی کابینوں میں اُن کی مناسب نیابت ہو۔ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہ قائم رہے۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمان ممبروں کی تعداد ایک ثلث ہو۔ صوبہ سندھ علیحدہ کر دیا جائے۔ صوبہ سرحدی اور بلوچستان میں اصلاحات جاری کر دی جائیں۔ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا کافی حصہ ہو۔ مسلمانوں کی تہذیب زبان تعلیم مذہب پرسنل لا اوقاف کی حفاظت ہو اور سرکاری تعلیمی امداد میں مناسب حصہ ملے اور آئینِ ہند میں کوئی تبدیلی بلا رضامندی جملہ ریاستوں اور صوبوں کی حکومتوں کے نہ کی جائے۔ اُدھر ۱۹۲۷ء میں تیسری کونسلوں کا آغاز ہو چکا تھا اور مرکزی اسمبلی میں سوراجیوں کو اتنا اقتدار حاصل ہو گیا تھا کہ ان کا نمائندہ پٹیل اسمبلی کا صدر بنا دیا گیا۔ ۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن کے آنے پر عجیب وغریب نظارہ دیکھا گیا کہ اِدھر پٹیل نے گورنمنٹ کا ناک میں دم کر رکھا تھا اور اُدھر ایک دن جب کہ سر جان سائمن خود اسمبلی میں بیٹھے تھے تو اسمبلی کے ہال میں دو بم یکے بعد دیگرے گرائے گئے۔

۱۹۲۹ء میں سیاسی شورش اور بڑھتی گئی۔ کانگرس کے دائرے میں بلکہ ملک کے سیاسی اُفق پر اس وقت گاندھی جی کے پہلو بہ پہلو ایک اور بڑی شخصیت نمودار ہو رہی تھی۔ یہ پنڈت جواہر لال نہرو تھے جنہوں نے ۱۹۲۷ء کی کانگرس میں جس کے صدر ڈاکٹر انصاری تھے کانگرس میں پہلی بار آزادی کی قرارداد پیش کی تھی۔ وہ اُس اٹھتی ہوئی نوجوان جماعت کے رہنما تھے جس کی سرگرمی سے ۱۹۲۸ء میں ملک میں جا بجا کسان سبھائیں اور نوجوانوں کی لیگیں (یُوتھ لیگیں) بنیں۔ اِن حالات سے متاثر ہو کر برطانوی حکومت کی محفلوں میں پھر حرکت پیدا ہوئی اور ان کی ہدایت پر لارڈ ارون نے ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو یہ اعلان کیا کہ چونکہ انگلستان اور ہندوستان دونوں ملکوں کے بعض حلقوں میں شبہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ۱۹۱۹ء کے دستوری قانون بنانے میں برطانوی حکومت کا اصلی مدعا کیا تھا اس لئے برطانوی حکومت کی طرف سے اب یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ اُن کی رائے میں ۱۹۱۷ء کے بیان کا اصلی مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کی آئینی ترقی کا قدرتی نتیجہ (ڈومینین سٹیٹس) یعنی درجہ نو آبادیات کا حصول ہے۔

لیکن گاندھی اور نہرو کی نئے اعلان سے تسلی نہ ہوئی اور اُنہوں نے لاہور کی کانگرس میں دسمبر ۱۹۲۹ء میں ہندوستان کی **آزادی** کا باقاعدہ **اعلان** کر دیا۔ ۱۹۳۰ء کے آغاز میں ۲۶ جنوری کو "یوم آزادی" منایا گیا اور ۱۲ مارچ کو گاندھی جی نے نمک کے قانون کی خلاف ورزی کرنے کے لئے سمندر کی طرف پیدل اپنا سفر شروع کر دیا ۶ اپریل کو ڈانڈی پہنچ کر نمک بنانے کے ساتھ

حکومت کے خلاف **سول نافرمانی** شروع ہوگئی۔ دس سال پہلے کی ترکِ موالات کی طرح ملک میں پھر ایک عظیم الشان شورش پیدا ہوگئی اور اُسی طرح لاٹھیوں اور گولیوں کی بارش اور گرفتاریوں اور ضبطیوں کی بھرمار ہوئی۔ مسلمانوں کی بعض جماعتوں مثلاً جمعیتہ العلما اور مسلم نیشلسٹ پارٹی نے اس جنگ میں حصہ لیا نیز احرارِ اسلام اور خدائی خدمت گار جو ۱۹۲۹ء میں بنی تھیں وہ بھی شریک ہوئیں۔ سول نافرمانی کی اس پُرامن جنگ میں سزا پانے والوں کی تعداد نوّے ہزار بیان کی گئی ہے۔

۵ رمئی سن ۳۰ء کو گاندھی جی گرفتار کرلئے گئے۔ اسی مہینے میں مدت کے انتظار کے بعد سائمن کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی۔ ہندوستان کی گذشتہ و موجودہ حالت کا ایک نہایت جامع بیان دے کر کمیشن نے سفارش کی کہ صوبوں میں فوراً خود اختیاری حکومت رائج کی جائے اور مرکز میں صوبوں اور ریاستوں کی ایک مختصر سی وفاقی حکومت قائم ہو۔

لیکن اُدھر معاملہ اب بہت دُور جاچکا تھا۔ لوگ کمیشن کے نام تک سے بیزار تھے۔ اُس کی سفارشات کی طرف کون توجہ کرتا۔ یہ حالت دیکھ کر برطانوی حکومت نے تعاون کرنے والے ہندوستانیوں کی طرف رجوع کیا اور کوشش کی کہ اُن کے ساتھ سمجھوتا کرکے ہند میں ایک نیا آئین جاری کیا جائے۔ چنانچہ والسرائے نے اعلان کیا کہ لندن میں برطانوی اور ہندوستانی نمائندوں کی ایک گول میز کانفرنس جلد منعقد کی جائے گی۔

سن ۱۹۳۰ء ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء میں یکے بعد دیگرے پہلی دوسری اور تیسری **گول میز کانفرنس** منعقد ہوئی۔

۱۲۔ نومبر ۱۹۳۰ء کو پہلی گول میز کانفرنس بیٹھی۔ فیڈریشن یعنی وفاق کے قیام کا فیصلہ ہوا۔ ریاستوں نے بھی اپنی آمادگی ظاہر کی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی طرف سے سر سپرو اور سر محمد شفیع نے متفق ہوکر ذمہ دار حکومت کا مطالبہ پیش کیا گو سائمن کمیشن والوں کی طرح نو آبادیات کا لفظ منہ سے نہ نکالا گیا۔ لارڈ ریڈنگ نے لبرل جماعت کی طرف سے اس مطالبے کے ساتھ اتفاق ظاہر کیا اور ہندوستان اور انگلستان کی اعتدال پسند جماعتوں کے اِس متفقہ فیصلے پر حکومتِ برطانیہ نے آخر کار اپنی مہرِ منظوری ثبت کردی۔ لیکن کانفرنس ایک اہم بات میں ناکام رہی وہ فرقہ وار مسئلے کو باوجود ہزار کوششوں کے حل نہ کرسکی۔ سکھ راضی نہ ہوئے کہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو اکثریت دی جائے۔

کانگرس کی عدمِ شرکت کی وجہ سے پہلی گول میز کانفرنس نامکمل رہی تھی اس لئے اس کے بعد سر سپرو اور جیکر اور میاں شاہنواز وغیرہ کی کوششوں سے آخر مہاتما گاندھی اور لارڈ ارون ایک دوسرے سے ملے اور آٹھ بار ملنے کے بعد ۵ رمارچ ۱۹۳۱ء کو گاندھی ارون معاہدہ تکمیل کو پہنچا اس کی رُو سے اُدھر سول نافرمانی اور سیاسی و معاشی مقاطعہ ترک کیا گیا اور کانگرس نے تحفظات کے ساتھ ایک ذمہ دار وفاقی حکومت کے قیام کی شرط پر گول میز کانفرنس میں شریک ہونا منظور کیا اور ادھر حکومت نے سیاسی قیدیوں کو رہا کردیا اور بعض جگہ نمک بنانے کی اجازت دے دی۔ اس سے گاندھی جی کا اثر اور رعب بے حد بڑھ گیا اور ادھر ہندوستان کی نظروں میں اُدھر انگلستان کے قدامت پسندوں کی نگاہ میں اُنہیں فتح اور گورنمنٹ کو شکست ہوئی۔ اس مہینے میں کراچی کانگرس نے اِس معاہدے کی منظوری دے دی۔ یہ کانگرس بنیادی حقوق والے ریزولیوشن کے لئے مشہور ہے اس میں ہندوستانی قوم کے حق آزادی اور عام شہری حقوق بالخصوص مزدوروں اور کاشتکاروں کے حقوق پر زور دیا گیا اور اقلیتوں کو اُن کے تحفظ کا یقین دلایا گیا چنانچہ اب گاندھی جی نے اعلان کیا کہ جب تک ہندو مسلمانوں میں سمجھوتہ نہ ہوجائے گا وہ ہرگز انگلستان نہ جائیں گے۔ لیکن ہندوؤں مسلمانوں میں بجائے صلح ہونے کے لڑائی کا شعلہ اور بھڑکا۔ اِدھر کانپور میں فساد ہوئے اُدھر کشمیر میں مسلمانوں نے حقوق حاصل کرنے کے لئے شورش برپا کی جس پر اُن پر بہت سختیاں کی گئیں۔ آخر بغیر سمجھوتا ہوئے گاندھی جی کانگرس کے واحد نمائندہ بن کر انگلستان چلے گئے جہاں اُنھوں نے دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔

دوسری گول میز کانفرنس ستمبر ۱۹۳۱ء میں لندن میں منعقد ہوئی۔ باوجود گاندھی کی شرکت کے یہ پہلی کانفرنس سے زیادہ

کامیاب نہ ہوسکی اور آخر اُسی ہندو مسلم مسئلے کی چٹان سے ملکی ترقی کی کشتی ٹکرا کر پاش پاش ہوگئی۔ سکھ پنجاب کے معاملے میں اپنی جگہ پر اڑے رہے۔ دوسری اقلیتوں نے آپس میں ایک سمجھوتا کر لیا۔ اخیر میں مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے حکومتِ انگلستان کی طرف سے وفاقی حکومت کے قیام کی ضرورت ظاہر کرتے ہوئے اقلیتوں کے متعلق مفاہمت نہ ہونے پر افسوس ظاہر کیا اور اکثر ہندو نمائندوں کی طرف سے اس درخواست پر کہ اقلیتوں کے جھگڑے کا وہ خود تصفیہ کردیں غور کرکے فیصلہ کرنے کا اعلان کیا۔ اس کے بعد کانفرنس برخاست ہوگئی۔

اُدھر ہندوستان میں حالت تشویش ناک ہو رہی تھی۔ کانگرسیوں میں بہت بے چینی تھی اور نئے وایسرائے لارڈ ولنگڈن کانگرس کو اُس کی بے باکی کا مزہ چکھانا چاہتے تھے۔ چنانچہ باوجود گاندھی کی درخواست کے وایسرائے نے اُنہیں ملنے سے انکار کر دیا۔ ۴ جنوری ۱۹۳۲ء کو وہ پھر گرفتار کئے گئے۔ کانگرس خلافِ قانون قرار دی گئی۔ پھر گرفتاریاں اور ضبطیاں اور سختیاں ہوئیں بلکہ اس دفعہ گورنمنٹ نے پہلے کی نسبت کانگرس کی پوری پوری ناکہ بندی کر دی۔ اُس کے تمام فنڈ ضبط کر لئے گئے کانگرسی دفاتر مقفل کر دیئے گئے اور پسِ پردہ شورش کرنے والوں کا بھی خوب قلع قمع کیا گیا۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس آخری صدمے سے شاید کانگرس جاں بر نہ ہو سکے گی۔

اگست ۱۹۳۲ء میں وزیرِ اعظم نے حسبِ وعدہ اپنا **فرقہ وار فیصلہ** سُنایا جس کے مطابق علاوہ مسلمانوں اور سکھوں کے اچھوتوں کو بھی جداگانہ انتخاب کا حق دیا گیا۔ بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کو اکثریت سے محروم کیا گیا گو یو۔پی اور بعض دوسرے صوبوں میں جن میں وہ اقلیت میں تھے اُن کو مثلِ سابق اُن کے حقِ آبادی سے زیادہ نیابت دی گئی۔ اسی طرح ہندوؤں کو سندھ اور سرحدی صوبے میں اور سکھوں کو پنجاب اور سرحد میں اُن کے حق سے زیادہ نشستیں ملیں۔ اُدھر آسام اور بنگال میں یورپین لوگوں کو اُن کے حق سے زیادہ نیابت ملی اس کے علاوہ ہر صوبے میں خاص خاص جماعتوں مثلاً مزدوروں، صنعت و حرفت والوں، عیسائیوں، یونیورسٹیوں وغیرہ کے لئے نشستیں مخصوص کر دی گئیں۔

اچھوتوں کو ہندوؤں سے علیحدہ کرنے کی جو تجویز اس فیصلے میں کی گئی تھی اُس پر گاندھی جی نے سخت احتجاج کیا اور اپنے احتجاج کو مؤثر بنانے کے لئے ۲۰ ستمبر ۳۲ء سے ایک موت تک کا فاقہ شروع کر دیا۔ اس پر تمام ملک کے ہندو لیڈر دوڑ پڑے اور آخر ہریجنوں میں "پُونا کا معاہدہ" ہوگیا۔ اِس کے مطابق ہریجنوں کو ہندو حلقہ ہائے انتخاب کے اندر لایا گیا اور اُن کی نشستوں میں اضافہ کر دیا گیا۔ حکومت نے اس سمجھوتے کو منظور کر لیا۔

تیسری گول میز کانفرنس ۱۹۳۲ء کے اخیر میں بیٹھی۔ اور اس میں اصلاحات کی جو سکیم طے پائی وہ گورنمنٹ نے وائٹ پیپر یعنی "قرطاسِ ابیض" کے نام سے مارچ ۳۳ء میں شائع کی۔ اس تجویز کی ردوقدح کرنے اور اس پر غور کرنے کے لئے گورنمنٹ نے برطانوی دارالعوام اور دارالامرا کے چند ممبروں کی ایک جائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی یعنی چیدہ کمیٹی مقرر کی جس کے ساتھ اُنتیس ۲۹ ہندوستانی نمائندے بھی شریک ہوئے اور سَو کے قریب ہندوستانیوں نے اس کے سامنے لندن جا کر اپنی اپنی شہادت پیش کی۔ بحث و مباحثہ کا سلسلہ ایک مدت تک جاری رہا۔ آخر اس کمیٹی نے ایک ضخیم رپورٹ شائع کی اور اپنی اصلاحات کے متعلق اپنی سفارشات پیش کیں۔ یہ سفارشیں زیادہ اُنہیں تجاویز پر مبنی تھیں جو قرطاسِ ابیض میں موجود تھیں اور جن پر سائمن کمیشن کی رپورٹ کا بہت کچھ اثر تھا۔ کمیٹی کی ان سفارشوں کی بنا پر مسودۂ قانون مرتب ہو کر پارلیمنٹ کے سامنے پیش ہوا اور دفعہ بہ دفعہ اُس پر بحث جاری رہی ایک فریق نے جس کے لیڈر مسٹر چرچل تھے اُدھم مچایا کہ اِن اصلاحات کے نافذ ہونے سے گویا انگلستان ہندوستان کی حکومت سے دست بردار ہو جائے گا۔ دوسری طرف مزدور پارٹی نے شکایت کی کہ اِن سے ہندوستان کو ذراسی اصلی آزادی بھی نہ مل سکے گی۔ بہر حال اس لمبی چوڑی کشاکش اور جھنجھٹ کے بعد یہ مسودۂ قانون جزوی ترمیمات کے ساتھ پارلیمنٹ سے ۲ اگست ۱۹۳۵ء کو بکثرتِ رائے منظور ہوگیا اور ہندوستان میں ۱۹۳۷ء کے انتخابات کی بنا پر جو صوبجاتی کونسلیں اور جو حکومت کا نظام قائم ہوا وہ اسی ۳۵ء کے **گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ** (قانونِ حکومتِ ہند) کے مطابق تھا۔

۱۹۳۴ء میں گورمنٹ اور کانگرس میں صلح ہوگئی۔ اپریل میں گاندھی جی نے سول نافرمانی کے ترک کرنے کا اعلان کیا۔ مئی میں وہ قید سے رہا کردیئے گئے۔ جون میں گورمنٹ نے کانگرس کے خلاف اپنے احکام واپس لے لئے۔ اکتوبر میں کئی سالوں کے بعد کانگرس کا باقاعدہ اجلاس بمبئی میں ہوا۔ نومبر میں مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں کانگرس نے بہت سی نشستیں حاصل کیں۔ اس سے پہلے ستمبر میں گاندھی نے کانگرس سے علیحدہ ہوجانے کے متعلق ایک بیان شائع کیا اور پھر نومبر میں ایک دیہاتی صنعتی ایسوسی ایشن قائم کرکے ظاہر کردیا کہ اب ان کا کام سیاسیات سے علیحدہ رہ کر ہریجنوں کی اصلاح اور عوام کی فلاح و بہبود ہوگا۔ اس سلسلے میں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ اکتوبر ۳۵ء میں امبید کار نے اچھوتوں کی ایک کانفرنس بظاہر تبدیل مذہب پر غور کرنے لیکن دراصل اچھوتوں کے لئے مزید حقوق اور مراعات حاصل کرنے کے لئے منعقد کی۔

۱۹۳۵ء کے نہایت اہم آئینی قانون کے منظور ہوجانے کے بعد ہندوستان میں ہر طرف ہر فرقے اور ہر خیال کے لوگوں میں سیاسی چہل پہل کے آثار دکھائی دینے لگے۔

اپریل ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں کانگرس اور بمبئی میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا۔ دونوں اداروں نے نئے انتخابات کے لئے پارلیمنٹری بورڈ بنائے اور پبلک کی آگاہی کے لئے آئندہ پروگرام بناکر اپنے سیاسی منشور جاری کئے۔

بمبئی کانگرس کے صدر **پنڈت جواہر لال نہرو** تھے۔ اُنھوں نے اپنے خطبے میں دُنیا کی موجودہ سیاسی حالت کا پس منظر دکھا کر ہندوستان کے موجودہ مطالبات کا انقلابی نقشہ کھینچا اور روسی اشتراکیت کا پرچار کیا۔ اجلاس کے بعد اُنھوں نے ملک کا دورہ کیا اور جابجا اپنے اشتراکی خیالات کی اشاعت کی۔ اس سے کانگرس کا "دایاں بازو" کانپ اٹھا۔ پٹیل اور راجندر بابو اور کاروباری لوگ چیخ اُٹھے کہ یہ کیا آفت ہے۔ اس پر گاندھی نے جواہر لال کو سمجھا بجھا کر بیچ بچاؤ کردیا۔ اس وقت سے گاندھی جی کی حیثیت اور مرتبہ نہایت اہم لیکن عجیب و غریب ہوتا گیا۔ وہ کانگرس سے علیحدہ ہوکر آپ ہریجنوں کی اصلاح اور دیہات سدھار اور ہندی کے پرچار کے کام میں ہمہ تن منہمک تھے وہ اب کانگرس کے چار آنے کے ممبر بھی نہ رہے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی اب جب کہ پھر ملکی سیاست کی بساط از سرِ نو صاف ہوئی اور کانگرس کی اہمیت بڑھی اور پیچیدہ مسائل پیدا ہوئے تو وہ بمصداق "صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں" کانگرس سے علیحدہ بھی رہے اور اُس میں ہر طرح شریک بلکہ شریک غالب ہوگئے۔ اس وقت کانگرس میں دو متضاد قوتیں برسرِ پیکار تھیں اور دو مختلف الخیال گروہ ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے۔ ایک طرف کسانوں اور نوجوانوں کے لیڈر جواہر لال اور ان کے اشتراکی رفقا تھے دوسری طرف صاحب جائداد اور دُنیا کاروبار امرا کانگرسی تھے۔ وہ کانگرس کا بایاں بازو تھا یہ دایاں بازو۔ جب دونوں بازوؤں میں لڑائی ٹھنی تو گاندھی جی چپکے سے آکر کانگرس کا قلب بن گئے اور باوجودیکہ ان کا قدرتی میلان بائیں بازو کے قریب ہونا چاہئے تھا وہ دائیں بازو کی طرف جھک گئے اور محبت آمیز زور سے جواہر لال کا ہاتھ روک دیا چنانچہ جوشیلے اشتراکیوں کا یہ لیڈر اہنسا کے سردار کے آگے سرنگوں ہوگیا۔ اس وقت سے کانگرس میں **گاندھی جی کا راج** ہوگیا اور یہ راج آج تک جاری ہے۔

کانگرس نے اپنے منشور میں اعلان کیا کہ وہ نئے دستور کی سخت مخالف ہے۔ وہ اصرار کرتی ہے کہ ہندوستان کے لئے مناسب دستور صرف ایک عوام کی منتخب شدہ دستور ساز اسمبلی بنا سکتی ہے کیوں کہ صرف عوام اصلی قومی طاقت کا منبع و مرجع ہیں۔ پھر یہ ظاہر کیا کہ کانگرس صرف اس لئے انتخابات میں حصہ لے رہی ہے کہ اُن کے ذریعے سے وہ موجودہ دستور کو بیخ و بُن سے اکھاڑ کر رکھ دے۔ مختلف ظالمانہ اور ہنگامی قوانین کو منسوخ کردے، شہری آزادی قائم کرے سیاسی قیدیوں کو چھڑائے اور کسانوں اور مزدوروں پر جو ناقابلِ برداشت بوجھ پڑا ہوا ہے اس کو جس قدر جلد ہوسکے ہٹا دے۔ کانگرس نے کسانوں کی بعض مشکلات کے فوری حل کا بیڑا اُٹھایا کہ اُن کے قرضوں کی ادائیگی ملتوی کرکے بعد میں اُن میں کمی کردی جائے گی اور اس طرح لگان میں بھی معتدبہ کمی کی جائے گی اور مزدوروں کو یقین دلایا کہ اُن کا معیارِ زندگی خاصی حد تک بڑھا دیا جائے گا۔ فرقہ وار فیصلے کو کانگرس نے ناقابلِ قبول بتایا اور کہا کہ اس کا عارضی علاج مختلف فرقوں کی متحدہ رائے سے اسے تبدیل کرنا اور اصلی علاج آزادی کا حاصل کرنا ہے جس سے یہ گتھیاں خود بخود سُلجھ جائیں گی۔ وزارتیں قبول کرنے کا مسئلہ انتخابات کے بعد

تک ملتوی کر دیا گیا اور اس بات پر اصرار کیا گیا کہ فیڈریشن کے نفاذ کی ہر ممکن طریقے سے مخالفت کی جائے۔

گاندھی جی کی تجویز پر پنڈت جواہر لال کو دوبارہ فیض پور کی کانگرس کا صدر منتخب کیا گیا۔ پنڈت جی نے دوبارہ صدر منتخب ہو کر پھر اپنے اشتراکی خیالات کو ملک کے طول وعرض میں پھیلانا شروع کیا۔ اس پر پھر دائیں بازو میں رعشہ اُٹھا اور گاندھی نے پھر صلح صفائی کرادی اور پنڈت جی کو روک دیا۔

فیض پور میں (دسمبر ۳۶ء میں) کانگرس کا اجلاس اپنی قسم کا پہلا اجلاس تھا کیوں کہ یہ ایک معمولی چھوٹے سے گاؤں میں منعقد ہوا۔ گاندھی جی کے تجربہ کار ہاتھ نے ملک وقوم کی نبض دیکھ کر یہ نسخہ تجویز کیا جو ایک حد تک کارگر ثابت ہوا۔

فیض پور میں بھی صدرِ کانگرس نے ویسے ہی انقلابی اور اشتراکی خیالات کا اظہار کیا جیسے لکھنؤ میں کیا تھا۔ دنیا کے نئے انقلابی حالات بتائے اور کہا کہ ہندوستان کو بیرونی دنیا اور موجودہ تحریکات سے گہرا رشتہ قائم کرنا چاہئے۔ شہری آزادی کی عدم موجودگی کا رونا رویا۔ نئے دستور کو "غلامی کی نئی سند" پکارا۔ دستور ساز اسمبلی کا مطالبہ کیا۔ وزارتیں قبول کرنے کا مقصد اجنبی حکومت کی راہ میں روڑے اٹکانا قرار دیا۔ اور ہندوستانی ریاستوں کو تنبیہ کی کہ اُنہیں آزاد ہندوستان میں نئے حالات کے مطابق جگہ لینی اور کام کرنا پڑے گا۔

گاندھی جی نے اپنی تقریر میں کہا "میں نے کلکتہ میں ۱۹۱۹ء میں کہا تھا کہ میرے پیچھے ہولو تو میں تم کو ایک سال کے اندر اندر سوراج دلوا دوں گا لیکن کیا تم نے ایسا کیا؟ میں تو ایک حقیقت شناس ہوں بطور ایک حقیقت شناس کے میں نے ۳۴ء میں کونسل کے داخلے کو پسند کیا"۔ پھر کہا کہ "میں ذات کا بنیا ہوں اور اگر ایک کام اچھا نہ چلے تو میں دوسرا کام شروع کر دیتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ تمہارے آگے پارلیمنٹری پروگرام رکھا گیا ہے۔ لیکن یاد رکھو کہ سوراج ایک کچے دھاگے کے کونے پر ٹکا ہوا ہے"۔

جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے ۱۹۲۸ء کے اخیر اور ۲۹ء کے شروع میں ایک آل انڈیا مسلم کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی تھی جس نے ایک نہایت اہم مفصل قرارداد مسلمانوں کے حقوق کے بارے میں منظور کی۔ دو سال تک یہ کانفرنس اپنے اجلاس کرتی رہی۔ لیکن اس کے بعد اسے اور لیگ دونوں کو اُونگھ آگئی۔ ۳۴ء میں کوشش کی گئی کہ لیگ اور اس کانفرنس دونوں کا ملاپ کرادیا جائے لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ اب نئے انتخابات کے نزدیک آنے پر مسٹر جناح کے اثر سے آل انڈیا مسلم لیگ کی بیداری عمل میں آئی اور وہ جلد ایک جیتی جاگتی جماعت بن گئی۔ اپریل ۳۶ء میں بمبئی کے اجلاس میں قومی اور آزادانہ خیالات کا خوب اظہار کیا گیا اور انتخابات میں کام کرنے کے لئے ایک مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ قائم ہوا۔ اس سلسلے میں لیگ کی طرف سے ایک سیاسی منشور جاری کیا گیا جس میں لیگ نے ظاہر کیا کہ نئے ایکٹ کی صوبجاتی سکیم اگرچہ نقائص سے بری نہیں مگر اس سے فائدہ اٹھانا اور اس میں حصہ لینا چاہئے البتہ فیڈریشن کی تجویز بہت خراب اور نقصان دہ ہے اور برطانوی پارلیمنٹ کو اس پر نظر ثانی کرنی چاہئے۔ لیگ کی پالیسی یہ قرار پائی کہ فرقہ وار فیصلہ پر عمل کیا جائے تاکہ مختلف قوموں میں کوئی اس سے بہتر سمجھوتا ہو جائے۔ جابرانہ قوانین منسوخ کرائے جائیں۔ ملک کے گراں بار اخراجات کو گھٹایا جائے۔ صنعت وحرفت کو ترقی دی جائے سکہ وشرح تبادلہ پر غور کیا جائے۔ زراعتی قرضوں کے بار کو گھٹایا جائے۔ ابتدائی تعلیم کو مفت کیا جائے۔ مسلمانوں کے مذہب اور زبان وحروف کی حفاظت کی جائے اور ملک میں صحیح رائے عامہ پیدا کی جائے۔

۱۹۳۶ء کے اخیر اور ۳۷ء کے شروع میں انتخابات کی گہما گہمی نے سارے ملک میں ایک میلے اور ہنگامے کی صورت پیدا کر دی۔ کانگرس لیگ مہاسبھا احرار کانگرسی مسلمان اور کئی اور نئی سے نئی جماعتیں اور کئی قوم کے جھوٹے سچے خادم اور روپیہ لٹانے والے امیر اور پیشہ ور سیاست دان اور اخبار نویس اور سیاست پیشہ دلال سیاست کے میدان میں اُتر آئے۔ ایک تماشا تھا کہ کبھی نہ بھولے گا۔

حلقۂ انتخاب اس قدر وسیع کر دیا گیا تھا کہ بجائے ۳ فی صدی کے ۱۴ فی صدی آبادی کو رائے دہندگی کا حق مل چکا تھا یعنی کروڑ

بیس لاکھ ووٹروں کے نام رجسٹروں میں درج تھے۔ کونسلوں کے لئے سات ہزار اُمیدوار کھڑے ہوئے جن میں سے دو ہزار منتخب ہو گئے۔

انتخاب ۱۹۳۷ء کانگرس کو اس انتخاب ۱۹۳۷ء میں ایسی کامیابی نصیب ہوئی کہ خود کانگرس کو اس کا سان گمان تک نہ تھا۔ (بہار، اُڑلیسہ، یو۔پی، سی۔پی، مدراس اور بمبئی) چھ صوبوں کی اسمبلیوں میں کانگرس کو بھاری اکثریت حاصل ہوئی۔ سرحدی صوبے میں بھی ستمبر میں کانگرس نے ایک ابتلافی (COALITION) حکومت قائم کر لی۔ پنجاب میں سر سکندر حیات کی اتحاد پارٹی کامیاب ہوئی۔ اور بنگال سندھ اور آسام میں مسلمان وزیراعظموں کے تحت میں وزارتیں مرتب ہوئیں۔

کانگرس کی اس انتخابی کامیابی پر سوال پیدا ہوا کہ کیا وزارتیں قبول کی جائیں یا نہ کی جائیں۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے ۱۸ مارچ ۳۷ء کو ریزولیوشن پاس کیا کہ اگر گورنر صریح طور پر یہ یقین دلا دیں کہ وہ اپنے خاص اختیارات کو استعمال نہ کریں گے تو وزارتیں قبول کر لی جائیں۔ گورنروں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ گاندھی نے طعنہ دیا کہ تلوار کی حکومت ہے۔ سکرٹری آف سٹیٹ نے کہا کہ اگر کانگرسی وزارت مرتب نہیں کرتے تو اور لوگ یہ کام کریں۔ گاندھی نے ثالث مقرر کئے جانے کی تجویز کی۔ گورنمنٹ نے انکار کر دیا اور عارضی وزارتیں مرتب کر لی گئیں۔ کانگرس کی مجلسِ عاملہ نے اپریل کے اخیر میں پھر ایک تجویز پیش کی۔ آخر وائسرائے اور سیکرٹری آف سٹیٹ کے بیانات میں اشارہ کیا گیا کہ طرفین کے سمجھوتے پر عملاً وہ مشکلیں کبھی پیدا نہ ہوں گی جن کا کانگرس کو ڈر ہے۔ بلکہ لارڈ زٹلینڈ نے صاف کہہ دیا کہ گورنر کی "تمیزِ خصوصی" اور "انفرادی رائے" کے بارے میں بھی گو بظاہر ذمہ داری گورنر کی ہے لیکن عملاً وزارت ہی صاحبِ اختیار ہوگی۔ اس پر کانگرس نے ۷ جولائی ۳۷ء کو وزارتیں بنانا منظور کر لیا۔ پورے باون سال کی جد و جہد کے بعد کانگرس ملک کے اکثر حصے پر حکومت کرنے لگی گو دراصل یہ حکومت ابھی آدھی یا تین چوتھائی حکومت ہی تھی۔

آئندہ سال فروری ۳۸ء میں ایک اور شوشہ پیدا ہوا۔ عین کانگرس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر وزیروں اور گورنروں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ بہار اور یو۔پی کے صوبوں میں وزیروں نے سیاسی قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ پیش کیا جسے گورنروں نے گورنر جنرل کے مشورے سے رد کر دیا۔ اس پر دونوں وزارتوں نے اپنے اپنے استعفے داخل کر دیئے۔ عین اس وقت ۱۹ فروری ۳۸ء کو کانگرس کا سالانہ اجلاس ہری پورہ (گجرات) کے گاؤں میں زیر صدارت سبھاش چندر بوس منعقد ہوا۔ صدر نے اپنے خطبے میں پنڈت جواہر لال کی طرح اشتراکی خیالات کا اظہار کیا فیڈریشن کے قیام کی عملی مخالفت کرنے پر زور دیا رضاکاروں کی ایک جماعت بنانے کی تجویز کی اور کہا کہ کانگرس کی مجلسِ عاملہ کو آزاد ہندوستان کی کابینہ سمجھنا چاہیئے۔

قراردادوں میں تین زیادہ اہم تھیں پہلی یہ تھی کہ گورنر جنرل کو فوراً سیاسی قیدیوں کے بارے میں کانگرسی وزارتوں کا مطالبہ ماننا چاہیئے تاکہ سیاسی بحران دُور ہو جائے۔ دوسری فیڈریشن کی مخالفت کے متعلق تھی کہ ہندوستان کو جب تک دفاع، معاملاتِ خارجہ اور مالیات کے متعلق اختیارات نہ دیئے جائیں تب تک فیڈریشن قطعاً بے کار اور ناقابلِ قبول ہوگی۔ تیسری قرارداد پنڈت جواہر لال نے اقلیتوں کے متعلق پیش کرتے ہوئے کہا کہ "میں نے نام نہاد فرقہ وار سوال کو ایک دُوربین کے ذریعے سے ملاحظہ کیا ہے لیکن اگر کہیں کچھ موجود ہی نہ ہو تو نظر خاک آئے؟"

یہ آخری معاملہ یعنی **فرقہ وار مسئلہ** اس وقت ہندوستان کے پہلو میں ایک کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا اور ابھی تک یہ کانٹا باوجود بہت سی کوششوں کے نکل نہیں سکا۔

ہندوؤں مسلمانوں کا مسئلہ اور لیگ اور کانگرس کا جھگڑا غالباً ہندوستان کی تمام مشکلات میں سب سے بڑی مشکل اور سب سے زیادہ نازک معاملہ ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ ہندو مسلمانوں کے سیاسی و ملی اختلافات درحقیقت غدر کے بعد شروع ہوئے۔ کچھ حکومت نے دونوں قوموں میں امتیاز کیا۔ کچھ ہندوؤں نے اُردو کی مخالفت کی اور گاؤکشی کی تحریک سے مخالفت کا آغاز کیا۔ کچھ مسلمان

خود رُو بیٹھے رہنے اور سستی اختیار کرنے اور خود داری کھو دینے سے اپنے ہم وطنوں سے دُور ہوتے گئے۔ غرض کئی اسباب جمع ہوئے۔ قومیں دونوں پراگندہ ہو چکی تھیں۔ سمجھنے سمجھانے والے کم تھے لگانے بجھانے والے زیادہ۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کی ہوائی چھوڑی گئی۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں اس کی تنسیخ ہوئی۔ لیکن سنہ ۱۹۱۶ء میں لیگ اور کانگرس میں سمجھوتا ہو گیا جو پانچ سال تک قائم رہا۔ خود گاندھی جی بھی برسوں سے اس ہندو مسلم مسئلے کے حل کرنے میں مصروف رہے۔ سنہ ۲۰-۱۹۱۹ء میں انہوں نے اسے ایک حد تک حل بھی کر لیا اور مارشل لا کی برکت سے ہندو مسلمان ایک ہی کٹورے سے پانی پینے لگے۔ لیکن گاندھی کی قید کے بعد پھر پانچ سال تک شدھی اور تبلیغ کی بدولت دونوں قوموں میں وہ سر پھٹول ہوئی کہ الامان۔ سنہ ۲۴ء میں مہاتما جی نے ۲۱ دن کا برت رکھا لیکن بے سُود۔ بلوے بھی اسی طرح جاری رہے اور جھگڑے بھی نہ مٹے۔ سنہ ۳۰ء کی سول نافرمانی میں ہزاروں مسلمانوں نے گاندھی کا ساتھ دیا۔ لیکن گول میز کانفرنس میں جب سیاسی طاقت کی تقسیم کا سوال پیش ہوا تو پھر دونوں قوموں میں وہی مغائرت اور منافرت اپنی بھیانک شکل دکھانے لگی۔

سنہ ۳۴ء سے سنہ ۳۶ء تک مرکزی اسمبلی میں مسٹر جناح کے اثر سے دو سال تک لیگ اور کانگرس کا تعاون ہوا اور یک جہتی سے کام کیا گیا۔ نئی اصلاحات اور انتخابات کی آمد پر اور اُن کے دوران میں بھی ملک کی خدمت اور ترقی کے لئے مل جل کر کام کرنے کی خواہش ایک حد تک طرفین میں موجود تھی۔ لیکن کانگرس کا چھ سات صوبوں میں برسرِ اقتدار آنا تھا کہ یک لخت گویا ایک دھماکا پیدا ہوا اور آن کی آن میں دونوں جماعتیں ایک دوسرے پر تلوار کھینچ کر وار کرنے کو ہمہ تن تیار ہو گئیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا کہ ملک میں اس وقت صرف دو جماعتیں ہیں برٹش گورنمنٹ اور انڈین نیشنل کانگرس۔ اور تیسری کوئی جماعت نہ توجہ کے قابل ہے نہ ہو سکتی ہے۔ ساتھ ہی پنڈت نہرو نے ہندو اور مسلمانوں کے جُدا جُدا کلچروں کا مضحکہ اڑایا اور کہا کہ مذہب اور سیاست کا کوئی تعلق نہیں اور مسلمان اور ہندو غربا مسائل مشترکہ ہیں اور یہ محض معاشی مسائل ہیں جن سے کسی مذہب یا مذہبی جماعت کا کوئی تعلق نہ ہے نہ ہونا چاہئے۔ یکم اپریل سنہ ۳۷ء کو جو ہڑتال کانگرس کی طرف سے منائی گئی مسٹر جناح نے مسلمانوں کو اس میں شرکت کرنے سے منع کر دیا۔ اس کے بعد جب کانگرس نے وزارتیں مرتب کیں تو اُس نے لیگ سے مشورہ نہ کیا بلکہ خود ہی بعض مسلمانوں کو اُن کو ذاتی حیثیت سے اِن وزارتوں میں لے لیا۔ اِن اور دوسری وجوہ سے کانگرس اور مسلم لیگ میں شدت کا اختلاف پیدا ہو گیا اور ملک میں ہندو مسلمانوں کے تعلقات روز بروز بد سے بتر ہوتے گئے۔

اس حال میں ۱۵ اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ء کو لکھنؤ میں مسٹر محمد علی جناح کی صدارت میں آل انڈیا **مسلم لیگ کا پچیسواں اجلاس** ہوا۔ مسلم لیگ کی تیس سالہ زندگی میں لیگ کا کوئی اجلاس ایسا نہیں ہوا جس میں خود کانگرسیوں کے بیان کے مطابق اتنا مجمع ہوا ہو اور اتنا جوش و خروش دکھایا گیا ہو۔ پنجاب اور بنگال کے مسلمان وزیرِ اعظم اور متعدد مسلم لیڈر تو جمع ہوئے لیکن دور دراز علاقوں سے مسلمان عوام کی آمد اور موجودگی حیرت انگیز تھی۔ صدرِ لیگ نے کانگرس کے رویّہ کی سخت شکایت کی کہ طاقت حاصل ہونے کے بعد کانگرس اَور کی اَور ہو گئی ہے اور کہا کہ ہمارے مخالفین کا اصول ہے کہ ہندوستان ہندوؤں کے لئے ہے اور ہندو مسلم سوال کا کہیں وجود ہی نہیں ہے اور پھر اپیل کی کہ صرف ایک چیز مسلمانوں کو بچا سکتی ہے کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی رُوحوں کو پھر پالیں۔

لیگ نے بہت سی اہم قرار دادیں منظور کیں۔ ہندوستان کی کامل آزادی جس میں اقلیتوں کے حقوق کی پوری حفاظت ہو لیگ کا نصب العین قرار پایا۔ فیڈریشن کی مخالفت کی گئی۔ فلسطین اور وزیرستان کے متعلق برطانوی پالیسی کی مذمت کی گئی۔ کانگرسی وزارتوں کی ترتیب پر اظہارِ نفرت کیا گیا۔ اُردو کو ہندوستان کی ملکی زبان بنانے کا تہیہ کیا گیا اور مخلوط انتخاب کو ناقابلِ قبول قرار دیا گیا۔

کانگرس کی حکومت چھ صوبوں میں تقریباً ڈھائی سال اَور دو اَور صوبوں میں دو سال کے قریب قائم رہی۔ سندھ کی حکومت بھی کبھی کبھی کانگرس سے ساز باز کرتی رہی۔ اس کے علاوہ کانگرس نے سنہ ۱۹۳۸ء میں سیاسی شورش کی تحریک کو اُبھارا اور یہ کانگرسی

صوبوں میں بھی زبردست پروپیگنڈا کیا۔ ۱۹۳۹ء میں کانگرسی صدر سبھاش بوس اور گاندھی جی کی پارٹی میں کشاکش شروع ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بوس نے کانگرس سے علیحدگی اختیار کر کے ایک نئی جماعت "فارورڈ بلاک" (ترقی پسند جماعت) کی بنیا درکھی۔ اتنے میں (ستمبر ۳۹ء میں) یورپ میں **دوسری جنگ عظیم** چھڑ گئی تھی۔ کانگرس نے اعلان کیا کہ ہندوستان اُسی صورت میں انگلستان کا ساتھ دے گا کہ انگلستان ہندوستان کو آزاد کرنے کا وعدہ کرائے۔ وائسرائے نے ۱۷ اکتوبر کو ہندوستانیوں کو درجۂ نوآبادیات کے حصول کا یقین دلایا اور کانگرس اور لیگ کے لیڈروں سے ملاقات بھی کی لیکن اِن مذاکرات کا کچھ نتیجہ نہ نکلا اور کانگرس نے سب وزارتیں چھوڑ دیں گورنروں نے اِن کانگرسی صوبوں میں تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔

جنوری ۱۹۴۰ء میں والیسرائے نے اورنینٹ کلب بمبئی میں تقریر کرتے ہوئے پھر درجۂ نوآبادیات کا وعدہ دہرایا۔ جون اور دسمبر میں سکرٹری آف سٹیٹ مسٹر ایمری نے بھی ہندوستانی حب الوطنی پر میٹھی میٹھی تقریریں کیں لیکن روٹھی ہوئی کانگرس نہ مانی۔ ۱۵ مارچ کو رام گڑھ میں کانگرس کا سالانہ اجلاس زیر صدارت ابوالکلام آزاد ہوا جہاں کانگرس نے اپنا آزادی کا مطالبہ دہرایا۔ اس سے چند روز پہلے ہندوستانی والیانِ ریاست نے درجۂ نوآبادیات کا مطالبہ پیش کیا تھا۔ ۷ اگست کو والیسرائے نے اپنی ایگزکٹو کونسل کی توسیع کے متعلق اعلان کیا۔ لیکن کانگرس نے اس تجویز کو مسترد کر دیا اور آخر گاندھی جی نے پھر کانگرس کا لیڈر بن کر ۱۷ اکتوبر کو **انفرادی سول نافرمانی** کی تحریک شروع کر دی۔ نہرو اور اس کے بعد ہزاروں نافرمان قید کر لئے گئے۔ لبرل لیڈروں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح قومی حکومت کی تشکیل ہو۔ ۱۷ جنوری ۱۹۴۱ء کو انہوں نے برطانوی حکومت کے خلاف ایک بیان شائع کیا اور مئی کو مسٹر جناح کے خلاف۔ لیکن اس سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ۲۱ جولائی کو وائسرائے کی کونسل میں چند اور ہندوستانی لے لئے گئے اور ایک ڈیفنس کونسل بھی وضع کی گئی جس میں زیادہ تر ہندوستانی ہی تھے ستمبر میں چرچل کے اوقیانوسی اعلان کے خلاف ملک میں جابجا جلسے ہوئے کیوں کہ اس میں ہندوستان کی آزادی کا کہیں ذکر نہ تھا۔ ۱۹۴۱ء ایسے ہی احتجاجات میں گزر گیا۔ کانگرس کی سول نافرمانی کی تحریک بھی کچھ زیادہ کامیاب نہ ہوئی۔ فرقہ وارانہ کشیدگی بدستور قائم رہی بلوے اور فسادات بھی ہوتے رہے۔

لیکن ۱۹۴۲ء کے آنے کے ساتھ صورتِ حال اور ہو گئی۔ جاپان نے دسمبر ۱۹۴۱ء میں امریکہ اور انگلستان کے خلاف جنگ کا اعلان کر کے مشرقی ایشیا کی بساط کو اُلٹ کے رکھ دیا۔ فروری ۱۹۴۲ء میں وہ سنگاپور اور پھر برما پر قابض ہو گئے۔ مارچ میں وہ جزیرہ انڈمان کے مالک بن گئے اور ہندوستان کی سرحد پر پہنچ گئے۔ اب ہندوستان کے حاکم جاگے اور انہوں نے چاہا کہ یہاں کے لوگوں کی تالیفِ قلوب سے انہیں اپنے ساتھ متحد کر کے ہندوستان کو جاپانی دست بُرد سے بچالیں۔ چنانچہ **سر سٹیفورڈ کرپس** آئے اور انہوں نے ۲۹ مارچ کو خود اختیاری حکومت کے متعلق چند مفید تجاویز ملک کے سامنے پیش کیں۔ ہندوستانیوں کو ملک کی حکومت میں پہلے سے بہت زیادہ اختیارات دینے کا وعدہ کیا اور جنگ کے خاتمے پر ہندوستانیوں کے خود وضع کردہ دستور کو رائج کرنے کا مطالبہ بھی مان لیا۔ اس کے ساتھ ہی مسلم لیگ کے پاکستان کے مطالبے کے سلسلے میں بعض علاقوں کے خود اختیاری حقوق کو ایک حد تک تسلیم کر لیا۔ لیکن کانگرس اور لیگ دونوں نے اِن تجاویز کو ٹھکرا دیا۔ **گاندھی جی** نے اسے ایک برطانوی چال کہہ کر کانگرس کے سامنے اپنی ایک نئی سکیم پیش کی جس کے مطابق انگریزوں کو ہندوستان سے رخصت ہو جانے کی تلقین کی گئی۔ اس سکیم سے ہر طرف ایک ہل چل مچ گئی۔

ہندوستان میں موجودہ صورتِ حال کے پوری طرح سمجھنے کے لئے **مسلم لیگ کی سرگرمیوں پر نظر** ڈالنا ضروری ہے۔

گزشتہ پانچ سال (۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۲ء) میں مسلم لیگ نے ہندوستان کی سیاسیات پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اکتوبر ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ہوا۔ اس اجلاس کے متعلق سب سے زیادہ قابلِ غور بات یہ ہے کہ مسلم لیگ کو حقیقی معنوں میں ایک جمہوری جماعت بنانے کی کوشش کی گئی اور یہ کوشش روز بروز کامیاب ہونے لگی۔ اب لیگ

محض پانچ چھ سو سربرآوردہ مسلمانوں کی مجلس نہ رہی بلکہ کانگرس کی طرح وہ بھی عوام کی ایک جماعت بننے لگی۔ لکھنؤ کے اجتماع کا سارے ملک پر اثر ہوا۔ جا بجا لیگ کی شاخیں قائم ہو کر لیگ کی تنظیم ہوئی۔ انتخابات میں لیگ نے کئی صوبوں میں خاصی نمائندگی حاصل کی تھی۔ اب اور مسلمان نمائندے بھی جو غیر لیگی بن کر منتخب ہوئے تھے مسلم لیگ سے وابستہ ہونے لگے اور اس طرح لیگ کی طاقت روز بروز بڑھنے لگی۔ مسلمان حلقوں کے بعض ضمنی انتخابات میں کانگرس اور لیگ کا مقابلہ ہوا جس میں عموماً لیگ کے ہاتھ میدان رہا یہاں تک کہ آخرکار کانگرس نے مسلمانوں میں اپنی "عوامی ملاپ" کی تحریک چھوڑ دی۔ اپریل اور مئی ۳۸ء میں کانگرس اور لیگ کے صدروں میں باہمی سمجھوتے کے لئے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا لیکن جب کانگرس نے لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تو یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اپریل میں کلکتہ میں شہید گنج کے مسئلے پر غور کرنے کے لئے لیگ کا ایک خاص اجلاس منعقد ہوا اکتوبر میں کراچی میں مسلم لیگ کانفرنس ہوئی دسمبر میں پٹنہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے موقع پر ہندوستان کے مختلف علاقوں کے مسلمانوں کا پھر ایک عظیم الشان اجتماع ہوا۔ ستمبر ۳۹ء میں یورپ میں جنگِ عظیم چھڑ جانے کے بعد اور پھر یکم نومبر کو وائسرائے سے مذاکرات کے موقع پر مسلم لیگ نے ظاہر کیا کہ وہ حکومت کے ساتھ پوری طرح تعاون کرنے کے لئے تیار ہے بشرطیکہ اسے حکومت میں حصہ دار بنایا جائے۔ نومبر میں کانگرس نے وزارتیں چھوڑ دیں۔ دسمبر میں مسٹر جناح نے پہلے ایک شاہی کمیشن کا مطالبہ کیا جو آ کر گزشتہ کانگرسی حکومت کی کارستانیوں پر تبصرہ کرے اور پھر ۲۲ دسمبر کو کانگرس کے حکومت سے دست بردار ہو جانے پر ہندوستان کے مسلمانوں کو "یوم نجات" منانے کی ہدایت کی۔ سن ۱۹۴۰ء میں کانگرس اور لیگ کی تو تو میں میں جاری رہی۔ فروری میں کانگرس نے ایک مسلمان کو کانگرس کا صدر منتخب کیا اور ظاہر کیا کہ کانگرس ہندو و مسلم دونوں فرقوں کی صحیح نمائندہ قومی جماعت ہے۔ اس کے مقابل میں آل انڈیا مسلم لیگ نے لاہور میں ۲۲/۲۴ مارچ کو اپنا ستائیسواں سالانہ اجلاس منعقد کر کے وہ قرارداد منظور کی جسے عام طور پر پاکستان کی قرارداد کہا جاتا ہے۔ یعنی اعلان کیا گیا کہ ہندوستان کے مسلمان ہندوؤں سے علیحدہ ایک قوم ہیں اور ان تمام علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے خود مختار آزاد ریاستیں قائم کی جائیں گی۔ اس پاکستان کے خلاف ہندوؤں اور کانگرسی مسلمانوں نے زبردست پروپیگنڈا شروع کیا اور مسٹر جناح کو بہت برا بھلا کہا لیکن لیگ نے اپنے قائم کردہ نصب العین سے سر مو منہ نہ موڑا اور یوں دونوں قوموں میں کش مکش روز بروز بڑھتی گئی۔ اگست میں وائسرائے نے جو اپنی کونسل کی توسیع کا اعلان کیا اسے لیگ نے ایک حد تک پسند کیا لیکن سمجھوتا نہ ہو سکا۔ اپریل سنہ ۴۱ء میں مدراس میں لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا جس میں پاکستان کو لیگ کا نصب العین قرار دیا گیا۔ مئی میں لبرل لیڈروں نے مسٹر جناح کے خلاف بیان دیا اور جولائی میں دو تین مسلمان لیگ کی ہدایت کے خلاف وائسرائے کی نئی کونسل میں شریک ہو گئے اور بنگال میں مولوی فضل الحق نے چند مہاسبھائیوں کو ملا کر ایک نئی وزارت بھی مرتب کر لی لیکن مسلم لیگ نے اس کا جواب اپنی تادیبی کارروائی سے دیا اور ایسے تمام افراد کو لیگ سے خارج کر دیا۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور مسلم لیگ کی بنیادیں بجائے کمزور ہونے کے اور مضبوط ہو گئیں یہاں تک کہ مارچ سنہ ۱۹۴۲ء میں جب سر سٹیفورڈ کرپس نے آ کر ہندوستان کے لئے مزید اختیارات اور ایک نئے دستور کا اعلان کیا تو اس میں مسلم لیگ کے پاکستانی مطالبے کو بھی ایک حد تک تسلیم کر لیا لیکن لیگ کی تسلی نہ ہوئی۔ اپریل میں لیگ کا سالانہ اجلاس الہ آباد میں منعقد ہوا اور اس میں پاکستان کے مطالبے کو بزور دہرایا گیا۔

پاکستانی مطالبے کے جزوی طور پر تسلیم کئے جانے کا عجیب اثر پڑا۔ کانگرس میں مسٹر راج گوپال اچاریہ کی سرکردگی میں ایک چھوٹی سی جماعت پیدا ہو گئی جو لیگ کے اس مطالبے کو ایک حد تک ماننے پر تیار ہو گئی کانگرسی مسلمانوں نے بھی اس کی تائید کی لیکن گاندھی جی اور ان کے پیرؤوں نے اس کی شدید مخالفت کی یہاں تک کہ مسٹر راج گوپال اچاریہ نے کانگرس سے استعفا دے دیا۔ گاندھی جی نے جواب تک ہندو مسلم اتحاد کو آزادی کی پہلی شرط قرار دیتے تھے اعلان کر دیا کہ وہ ہندو مسلم مسئلے کو جوں کا توں چھوڑ کر

آزادی کی مہم شروع کریں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اِس وقت ہندوستان کی عجیب حالت ہے۔ اِدھر ہندو مسلمانوں کے تعلقات بدستور خراب ہیں اور کش مکش جاری ہے اُدھر جاپانی ملک کی مشرقی سرحد تک آپہنچے ہیں۔ کانگرس برطانیہ سے برسرِ پیکار ہوگئی ہے۔ مسلم لیگ اور مسلمان الگ بیٹھے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کانگرس اور اکثر ہندو محض اپنے لئے طاقت حاصل کرنا چاہتے ہیں اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ پہلے مسلمانوں سے سمجھوتا کرتے انہیں مطمئن کرتے اور پھر اُنہیں ایک مشترک جنگِ آزادی میں حصہ لینے پر آمادہ کرتے۔ اُنہوں نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ پاکستان کے ذرا سے شبہے پر وہ انگریزوں مسلمانوں دونوں سے روٹھ گئے ہیں اور جاپانیوں کو آتے دیکھ کر اُنہوں نے اس موقع کو غنیمت جانا ہے اور سمجھتے ہیں کہ اب وقت ہے کہ ہندو راج فوراً قائم کیا جائے۔ اُدھر کانگرس کہتی ہے کہ یہ غلط ہے۔ فرقہ وار سمجھوتا چونکہ نہیں ہوسکتا اس لئے بہتر ہے کہ ہم خود ہی ہندوستان کی آزادی حاصل کرلیں۔ ہاں آزادی کے بغیر متحدہ جمہوری اقوام کا ساتھ دینا بے معنی ہے کیوں کہ محض ہندوستان کی آزادی ہی سے ہندوستانیوں کے دِل میں وہ قوت پیدا ہوسکتی ہے جس سے ہندوستان عالمگیر آزادی کے حصول میں آزاد قوموں کی کما حقہٗ مدد کرسکے گا!

۸ اگست ۴۲ء کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا اہم ترین اجلاس بمبئی میں ہوا جس میں انگریزی حکومت کے خلاف "ترکِ ہندوستان" کا نعرہ بلند کیا گیا۔ گاندھی جی نے کہا اب ہم آزاد ہیں اور یہ آزادی کی آخری جنگ ہے اور اب یہ جاری رہے گی جب تک ہم پوری طرح آزاد نہ ہو جائیں۔ ہندوستانیوں کو اب جان و مال کی قربانیاں دینی ہیں! اور یہ میری زندگی کی آخری کوشش اور آخری جنگ ہے اور حکومت کو تنبیہ کی کہ بس اسے "**کھلی بغاوت**" سمجھ لو۔ علاوہ مسلمان رہنماؤں کے سر تیج بہادر سپرو مسٹر شاستری راج گوپال اچاریہ اور دوسرے لیڈروں اور بعض جماعتوں مثلاً کمیونسٹوں نے بھی کانگرس کو اس سے روکنا چاہا لیکن کانگرس کمیٹی نے اپنی بھاری اکثریت سے فیصلہ کرکے اس تحریک کی باگ ڈور گاندھی جی کے ہاتھ میں دے دی۔ اِدھر گورنمنٹ نے فوری کارروائی کی۔ ۹ اگست کو گاندھی جی اور تمام بڑے بڑے کانگرسی لیڈر گرفتار کرلئے گئے۔ اس پر لوگ جا بجا مشتعل ہوگئے۔ کئی شہروں میں بلوے ہوئے ہڑتالیں ہوئیں طلبا نے سکول کالج چھوڑ دیئے آگ لگائی گئی گولیاں چلیں غرض ایک خاصا ہنگامہ بپا ہوگیا۔

اِس کش مکش کا کچھ بھی نتیجہ ہو یہ ظاہر ہے کہ عنقریب دنیا بھر میں اور ہندوستان میں بھی عظیم الشان تبدیلیاں ہونے والی ہیں۔ دُنیا وہ دنیا نہ رہے گی ہندوستان وہ ہندوستان نہ رہے گا۔ اس وقت قتل و غارت کا بازار گرم ہے۔ ہر قوم برسرِ پیکار ہے موجودہ جنگ صحیح معنوں میں جنگِ عالمگیر ہے۔ اس کا انجام کیا ہوگا؟ محض ظاہری انجام نہیں بلکہ اصلی انجام! اور کیا اِس کے بعد دنیا کو پھر ایسی صلح اور ایسا امن دیکھنا نصیب ہوگا جس میں اقوام و افراد کی آزادی قائم ہو جائے گی جس میں ساری نوعِ انسان صحیح معنوں میں ایک برادری بن جائے گی؟

سری نگر۔ ۱۲ر اگست ۴۲ء

بشیر احمد

کارواں

ابنِ آدم کی مسلسل خستگی
ہے وہ ریگستاں جہاں
حدّتیں ہیں غیرتِ برقِ تپاں
جس میں انساں کا تصوّر زردرو نازک گلو اونٹوں کی صورت ہے رواں
جن کی پنہاں گھنٹیوں کے نغمۂ خاموش سے
ٹوٹ جاتا ہے فضاؤں کا طلسمِ خاموشی

کون سی ہے منزلِ دور و دراز ؟
جس کی پیہم جستجو میں ان کے ہر اک گام سے
جھانکتی ہیں روز و شب کی بے کراں تنہائیاں
ذرّہ ذرّہ دشت کا ہے ایک داغِ ضوفشاں
جس کی لرزاں روشنی
ہر طرف ہے دشت میں پھیلی ہوئی

زرد رُو نازک گلو اونٹوں کی یہ خاموش اور لمبی قطار
سُست رَو، تنہا برس ہیں جس کے خستہ پاؤں کے مدھم نشاں
نخل گاہوں کی تمنائیں کئے دل میں نہاں
دور افق کی سمت ہے آہستہ آہستہ رواں
راہ میں رکتی نہیں جو لمحہ بھر
سُست گام افسردہ حیوانوں کی طرح
جو ہمیں خوابوں میں آتے ہیں نظر

(ہرندرناتھ چٹوپادھیا) مترجمہ سید جابر علی

تین حادثے

سائے میں ان سنہری بالوں کے
میں نے دیکھا تری اِن آنکھوں کو
جیسے جنگل کے سائے میں چُپ چاپ
کوئی رہرو ندی کو دیکھتا ہو

میں نے اِک آہِ سرد بھر کے کہا
میرا افسردہ دِل ترستا ہے
تیری آنکھوں کی خلوتوں میں رہوں
اور کھو جاؤں یہ تمنا ہے

تیری آنکھوں کی راہ سے اک بار
میں نے یہ تیرا پاک دِل دیکھا
جیسے دریا کے آئینے میں کوئی
دیکھ لیتا ہے قیمتی سونا

بے قرارانہ میرے دِل نے کہا
کاش ایسا بھی کوئی جادو ہو
عمر بھر کے لئے جو قابو میں
لائے اس جاوداں خزانے کو

ایک دن تیرے دل کے گوشے میں
میں نے دیکھا تری محبّت کو
اک سمندر میں غوطہ خور کوئی
جیسے موتی کی کان دیکھتا ہو

میں نے گھبرا کے رُکتے رُکتے کہا
حُور سے بڑھ کے خوب رو لڑکی!
تو فقط قابِل محبّت ہے
کیا محبّت مرے لئے ہے تری؟

روز بیٹی

جگر قریشی

پنجاب کا ایک افسانہ نگار

۱۹۳۶ء میں منشی پریم چند کی وفات کے بعد فوراً بعد اُردو افسانہ نگاری کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ سجاد حیدر سکول اور پریم چند سکول یعنی رومانیت اور واقعیت کے امتزاج سے گذشتہ پانچ سالوں میں ہمارے نئے لکھنے والوں نے اردو افسانہ نگاری کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ مقامی رنگ کو قائم رکھنے کے باوجود پریم چند نے افسانے میں جو وسعت اور ہمہ گیری پیدا کی تھی اب اُسے آفاق گیرانہ حیثیت حاصل ہوگئی ہے اور ہمارا مختصر افسانہ مشرقی داستان گوئی کے لفظی طلسمات اور تہ خانوں سے نکل کر مغربی افسانے کی سادہ آزاد و لامحدود فضا کی بلندیوں سے ہم کنار ہوگیا ہے۔ آج کل اصنافِ ادب میں سے مختصر افسانہ ہماری زندگی کی سب سے بڑھ کر ترجمانی کر رہا ہے۔ ہماری زندگی کے ساز کا کوئی تار ایسا نہیں جسے ہمارے افسانہ نگاروں نے نرم یا سخت انگلیوں سے چھیڑ کر دھیمے یا اونچے سُر نہ نکالے ہوں۔ زندگی اور زندگی کے لوازم، مذہب، سماج، معاشرت، بھوک، محبت، سیاست، فنا، بقا، سب موضوع افسانہ بن گئے ہیں۔ میرے بیان کی تصدیق منظور ہو تو راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، علی عباس حسینی، حیات اللہ انصاری، دلوندر ستیارتھی اور حجاب امتیاز علی، کے افسانے پڑھئے۔ ان کی کوششوں کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ہماری افسانہ نگاری کا مستقبل روشن اور امید افزا ہے۔ لیکن ساتھ ہی بعض دفعہ کسی کا یہ قول دل میں کھٹکنے لگتا ہے کہ جس میں سنورنے کی صلاحیت ہوتی ہے، اس میں بگڑنے کے لچھن بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے کئی افسانہ نگاروں نے افسانہ نگاری اور "ترقی پسندی" کی یہ معراج سمجھ لی ہے کہ "بھوک" اور "جنسیت" کے متعلق افسانے لکھے جائیں۔ کیوں کہ فرائڈ کے بقول "بھوک" اور "جنسیت" ہی انسان کی ساری ترقی و تہذیب کے پیچھے کارفرما ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ "بھوک" اور "جنسیت" کی مثالیں ڈھونڈتے وقت رہ رہ کر ان کی نظر طوائف پر پڑتی ہے۔ گذشتہ صدی تک ہماری شاعری پر طوائف سوار تھی، اب افسانوی ادب پر بھی چھائی جاتی ہے۔ لاہور کے ایک مشہور ماہوار رسالے کا ۴۲ء[2] کا سالنامہ نظروں سے گزرا۔ اس میں مندرجہ تیرہ افسانوں میں سے پانچ میں طوائف جلوہ گر تھی۔ اور ان کے مصنف کون تھے؟ ہمارے افسانوی ادب کے ہونہار لکھنے والے، احمد علی، سعادت حسن منٹو، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی وغیرہ۔ ان حضرات میں سے ایک سے میں نے پوچھا کہ "جنسیت" بلکہ "طوائفیت" کیوں ہمارے افسانہ نگاروں کے اعصاب پر سوار ہے؟ جواب ملا۔ "اجی صاحب! آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ یہ "جنسیت" تو ابھی اور "مریضانہ"[1] ہو جائے گی"!

دل ہی دل میں لاحول پڑھ کر خاموش ہو رہا۔ اصل میں "جنسیت" مریضانہ نہیں بلکہ ہمارے اس قبیل کے افسانہ نگاروں کی ذہنیت مریضانہ ہے۔ ورنہ "جنسیت" ہی کو موضوع بنا کر پاکیزہ اور خیال انگیز افسانے بھی لکھے جا سکتے ہیں۔ علی عباس حسینی کا افسانہ "بی ہمسائی" پڑھئے۔ طوائف ہی کا ذکر ہے لیکن اس چابک دستی سے کہ ہمارے سامنے طوائف کی زندگی کا فریب دہ گھناؤنا پہلو آتا ہی نہیں۔ کہنے والا سب کچھ کہہ جاتا ہے اور ہمارے جذبۂ ہمدردی و اصلاح کو زبردست تحریک بھی دے جاتا ہے۔ اگرچہ یہی علی عباس حسینی ہیں جو "میلہ گھومنی" کی قسم کی چیزیں بھی لکھ جاتے ہیں۔ ہمارے نوجوان لکھنے والوں میں سے کرشن چندر سب سے بڑھ کر رومان پسند واقع ہوئے ہیں لیکن ان کی رومان پسندی اکثر گہری اور تلخ حقیقت لئے ہوتی ہے۔ ان کے افسانے "بے رنگ و بو"، "دل کا چراغ"، "دو فرلانگ لمبی سڑک"، "پرانے خدا"، "زندگی کے

---

[1] اس نے (MORBID) کا لفظ استعمال کیا تھا (ساجد) [2] غالباً فروری یا مارچ ۴۲ء کے "ادبی دنیا" میں شائع ہوا تھا۔

موڑ پر" وغیرہ پڑھئے۔ آپ طرزِ تحریر کی دل کشی و جاذبیت کے مزے لیں گے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ سماج کے کھوکھلے پن پر چھوڑے ہوئے طنز کے تیر بھی دل میں خلش اضطراب پیدا کرتے جائیں گے اور افسانہ پڑھ چکنے پر آپ الگ گہرا تاثر لئے ہوئے سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ انسانیت کیوں سماج کے اوہام و خرافات کے ہاتھوں مسخ ہو کر رہ گئی ہے اور اس کے دوبارہ بحال ہونے کی کوئی صورت ممکن ہے یا نہیں ؟

مجھے خطرہ ہے کہ اگر میں یہ کہوں کہ بیسویں صدی کے ثلث اوّل کے رومان پسند (سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری وغیرہ) بیشتر مسلمان تھے اور واقعیت پسند (پریم چند، سدرشن وغیرہ) ہندو تو کہیں اسے ہندو مسلم سوال کا فرقہ وارانہ رنگ نہ دے دیا جائے اور یہ زہر ہمارے ادب کو بھی مسموم نہ کر دے لیکن کیا واقعات کی روشنی میں اس حقیقت سے انکار کیا جا سکتا ہے ؟ دو ہمسایہ قوموں کی طبائع کے ان متضاد و مخصوص رجحانات کی توضیح کسی ماہرِ نفسیات ہی سے ممکن ہے۔ اسی طرح اس میں بھی کسی کو شک نہیں ہو سکتا کہ نئے لکھنے والوں میں "طوائف پسند" بھی اکثر مسلمان ہی ہیں۔ میں سطورِ بالا میں چند نام گنوا چکا ہوں۔ اُن میں ایم۔ ایم۔ اسلم جیسے کہنہ مشق افسانہ نگار کے نام کا "پیر مغاں" کے طور پر اضافہ کر لیجئے۔ غالباً اس طوائف پسندی" کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں نہایت شدید قسم کا پردہ بلکہ "حجاب" رائج ہے جس نے ان کے لئے جنسیات کو بے حد لذیذ بنا دیا ہے۔ "انگارے" کے سارے مصنف بھی مسلمان ہی تھے اور عصمت چغتائی بھی ایک مسلمان خاتون افسانہ نگار ہیں، جو زندگی کے اُن خوفناک، تاریک اور ناقابلِ نگاہ "حقائق" کو بھی بڑی کوششوں سے بے نقاب کر کے روشنی میں لا رہی ہیں، جن پر آج تک مردوں کی نظریں بھی نہیں پڑی تھیں۔ یا اگر پڑی تھیں تو گھبرا کر شرما کر واپس آ گئی تھیں۔

لیکن اس نفرت انگیز جنسیت پرستی کے باوجود ہماری افسانہ نگاری بعض سلجھے ہوئے نوجوان دماغوں کے طفیل ترقی کر رہی ہے اور اس میں ہندوؤں کے ساتھ مسلمان بھی شامل ہیں۔ پریم چند تک ہماری افسانہ نگاری کو یو۔ پی کے مشاہیرِ اہلِ قلم نے نوازا۔ اہلِ پنجاب میں سے صرف سدرشن اس میدان میں شہرت حاصل کر سکے۔ لیکن اب حالات معکوس ہوتے جا رہے ہیں اور پنجاب کے پر جوش نوجوان لکھنے والوں کی مدد سے ہماری افسانہ نگاری ترقی کے آخری منازل طے کر رہی ہے اور اگرچہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی جیسے اگلے وقتوں کے لوگ بعض دفعہ جھنجلا کر کہہ اٹھتے ہیں کہ پنجاب میں جو زبان لکھی جا رہی ہے وہ اور کچھ بھی ہو، اُردو تو ہرگز نہیں ہے لیکن یہ ایک امرِ واقع ہے کہ آج کل پنجابی طرزِ تحریر کا اثر ہندوستان بھر کے اُردو لکھنے والوں پر پڑ رہا ہے اور لوگ پنجابیوں سے اردو سیکھ رہے ہیں اور جب اردو افسانہ نگاری کی تاریخ لکھی جائے گی تو پریم چند کے بعد آنے والے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، فیاض محمود، اوپندر ناتھ اشک اور سعادت حسن منٹو کے نام کبھی نظر انداز نہیں کئے جائیں گے۔

کچھ تو ترقی پسند مصنفین میں شامل ہونے کی وجہ سے اور کچھ خوش فکر اور زود نویس ہونے کی بنا پر کرشن چندر، بیدی، اشک اور منٹو عوام و خواص سے کافی روشناس ہو چکے ہیں۔ ان کے افسانوں کے ایک ایک سے زیادہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اس لئے اس مختصر سے مضمون میں نہ تو ان کے متعلق کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت ہی ہے اور نہ گنجائش۔ ہاں میں ایک ایسے افسانہ نگار کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو ترقی پسندوں میں شامل نہیں ہے اور جو کم لکھتا ہے مگر خوب لکھتا ہے۔ خاموشی پسند اور مطالعہ کا شوقین ہونے کی وجہ سے پروفیسر سیّد فیاض محمود صاحب نے اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں بہت کم افسانے لکھے ہیں ان کی افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۳۰ء کے قریب ہوا۔ مگر اب تک اُن کا صرف پندرہ افسانوں کا ایک مجموعہ "رنگ و بو" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کے برعکس کرشن چندر نے ۳۷-۱۹۳۶ء میں لکھنا شروع کیا اور اس مختصر سے عرصے میں ان کے افسانوں اور مضامین کے پانچ یا چھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اس قدر کم لکھنے والے پر قدرتاً جوہر شناسوں

کی نگاہیں کم ہی پڑیں لیکن اگر پڑیں تو جم کر رہ گئیں۔ عموماً ان کے افسانے "ہمایوں" میں شائع ہوتے ہیں۔ البتہ تین چار سال پہلے جب "ادبی دنیا" (لاہور) میں انعامی افسانوں کا سلسلہ جاری ہوا تھا جس کے منصف سجاد حیدر یلدرم وغیرہ تھے۔ تو پروفیسر صاحب نے "ادبی دنیا" میں بھی افسانے لکھے اور متعدد دفعہ انعام حاصل کیا۔ "ہمایوں" کو خاص نمبر شائع کرنے کی لت نہیں ہے، لیکن ایک دفعہ اس نے بھی افسانہ نمبر شائع کیا اور بہترین افسانے پر انعام دینے کا اعلان کیا۔ چنانچہ طبعزاد افسانوں میں پروفیسر فیاض محمود صاحب کا افسانہ "لمعات" بہترین اور دوسرے انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ لیکن میں نہ سمجھ سکا کہ کیوں ایک جرمن افسانے کے ترجمے پر اوّل انعام دیا گیا۔ بہر کیف کہنے کا مطلب یہ ہے کہ پروفیسر صاحب کے افسانے اہل نظر کے نزدیک ہمیشہ قدر و منزلت پاتے رہے ہیں۔

اُن کے افسانے جین آسٹن کے ناولوں کی طرح (MINIATURE PAINTING) کی حیثیت رکھتے ہیں کیوں کہ وہ اکثر پنجابی مسلمانوں کے متوسط طبقے کی معاشرت میں جنم لیتے ہیں اور ان کی فضا گھریلو ہے۔ پروفیسر صاحب خود متوسط طبقے کے ایک فرد ہیں اور اس طبقے کی خانگی زندگی کے ہر پہلو سے کما حقہٗ واقف۔ انہوں نے اس کا نزدیک سے بغور مطالعہ کیا ہے۔ اس لئے جس کامیابی سے متوسط طبقے کی زندگی کی مصوری وہ کرتے ہیں، اس کی مثال ہماری افسانہ نگاری میں اور کہیں شاید ہی ملے۔ "کام چور"۔ "اتفاق"۔ "نقش رنگیں"۔ "گھر"۔ "بے فکرا مجد" اور "ایک چھوٹی سی بات" (مطبوعہ ہمایوں مئی ۴۲ء) متوسط طبقے کی زندگی کے دل چسپ مرقعے پیش کرتے ہیں۔ پروفیسر صاحب کے مطبوعہ افسانوں میں صرف "کام چور" ایک ایسا افسانہ ہے جس میں مشاہدۂ جزئیات کے علاوہ ہلکا سا طنزیہ رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ ورنہ بالعموم ان کا رویہ متوسط طبقے سے ہمدردانہ سا ہوتا ہے۔ "کام چور" خادمہ کریمن ــــــ بے چاری کو دن رات میں سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی، لیکن پھر گھر کی مالکہ کام چور کہہ کر ڈانٹتی ہے ــــــ مجھے ہوٹل کی اس قابلِ رحم خادمہ کی یاد دلاتی ہے جس کا ذکر جارج مور نے "ایک نوجوان کے اعترافات" (CONFESSIONS OF A YOUNGMAN) میں کیا ہے۔ وہی بے کسی، وہی مظلومیت، وہی مجہولیت! البتہ اتنا فرق ہے کہ کریمن کو اپنے بکھرے ہوئے بالوں میں کنگھی کرنے کا ہوش ہے مگر اس بے چاری کو دن رات ہوٹل کی سیڑھیوں میں کھانے کی رکابیاں اور طشتریاں سنبھالے ہوئے اوپر نیچے آنے جانے، جھوٹے برتن مانجھنے، ہوٹل کے رہنے والوں کے بستر لگانے اور بھاگتے ہوئے بازار جانے کے سوا اور کسی چیز کی سدھ نہیں اور یہ فرق پروفیسر صاحب کی فطرت شناسی پر دال ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ صرف آقا ہی کا دل جذبات و خواہشات کا گہوارہ نہیں ہوتا۔ مزدور کے دل میں بھی اُمنگیں آرزوئیں انگڑائیاں لے سکتی ہیں۔ اس افسانے میں متوسط درجے کے گھرانے کی روزانہ زندگی کا نقشہ بڑی خوبی سے کھینچا ہے۔ بڑا کامیاب اور اپنے رنگ کا تمام مجموعے میں ایک ہی افسانہ ہے۔ فن کارانہ جزئیات نگاری نے گھریلو زندگی کی معمولی باتوں کو افسانہ بنا دیا ہے۔

اُن کے افسانوں کے مجموعے "رنگ و بو" کو آپ پڑھ جائیں تو سب سے پہلے آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ افسانوں کے پلاٹ میں تنوّع نہیں ہے۔ پھوپھی زاد، خالہ زاد، چچازاد، ماموں زاد لڑکوں لڑکیوں کے باہمی عشق و محبت کی داستانیں ہیں۔ آپ کا یہ خیال درست ہوگا لیکن آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ مصنف نے دانستہ ایسا کیا ہے۔ یہ اس کا مشاہدہ ہے۔ متوسط طبقے کے مسلمان خاندانوں کی معاشرت و زندگی بالعموم اسی طرز کی ہوتی ہے۔ پروفیسر صاحب پہلے ہندوستانی ادیب ہیں۔ جنہوں نے ابنِ عم اور بنتِ عم کے قصے، جو عربی شاعری کا سرمایۂ ناز ہیں، تازہ کر دئے ہیں۔ لیکن اس انداز سے کہ پاکیزگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ عریانی کی پناہ لئے بغیر وہ کامیاب افسانہ تیار کر لیتے ہیں اور تہذیب و شائستگی کی حدود سے تجاوز کئے بغیر جنسیات کے متعلق بہت کچھ لکھ جاتے ہیں۔ "بے فکرا مجد"، "انجانِ محبت" اور "نفرت" کے مطالعے سے میرے بیان کی صداقت ظاہر ہوگی۔

میرے خیال میں پروفیسر صاحب کے افسانوں میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے کرداروں میں جان ہوتی ہے۔

اُن کی حرکات وسکنات زندگی سے مملو ہوتی ہیں ("زبیدہ" - "انجان محبت") ہر کردار اپنی مخصوص جداگانہ شخصیت رکھتا ہے اور قاری اس کی زندگی کو محسوس کرتا ہے - وہ اندرون خانہ کی سیر کرتے ہیں - کرداروں کی شخصیتیں اس قدر زندہ ہوتی ہے کہ قاری کو احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ متوسط طبقے کے کسی مسلمان گھر میں بیٹھا ہے اور سب کچھ اس کے سامنے وقوع میں آرہا ہے - "انجان محبت" کو پڑھ کر ہم کبھی قدسیہ (ہیروئن) کو نہیں بھول سکتے - ایسا دل کش اور جیتا جاگتا کردار ہے اس کا کہ متوسط طبقے کی نوخیز، الھڑ، معصوم لڑکیوں کی نمائندہ معلوم ہوتی ہے - چند سال ہوئے پروفیسر صاحب کا ایک افسانہ جس کا عنوان غالباً "زہرہ کا عشق" تھا میں نے "ہمایوں" کے کسی سالگرہ نمبر میں پڑھا تھا - اس کے بعد اب تک میں درجنوں مصنفوں کے سینکڑوں افسانے پڑھ چکا ہوں لیکن اس کا ہیرو اور ہیروئن مجھے اب تک نہیں بھولتے - واللہ کیا زندگی تھی زہرہ (ہیروئن) میں! اب بھی آنکھوں کے سامنے چلتی پھرتی معلوم ہوتی ہے - زہرہ ایسی شوخ اور ایسی نڈر مگر اس کا محبوب ایسا شرمیلا اور کم حوصلہ کہ آخر زہرہ کی معصوم ومحبت آمیز شوخیوں کی تاب نہ لاکر خودکشی کرکے حورانِ بہشتی کی گود میں پہنچ گیا - پروفیسر صاحب نے اپنے ایک افسانے کے کردار کے متعلق لکھا ہے کہ "ان سب پر مستزاد اس کے جسم میں زندہ خون موجزن تھا اور ہر حرکت، ہر بات، ہر جنبش سے شوخی، اور آزادی اور بے فکری ٹپکتی تھی" یہ زندگی کے آثار ہیں اور ان کے افسانوں کا ہر کردار اپنے اندر یہ آثار رکھتے ہوئے اپنے طور پر سوچتا اور باتیں کرتا نظر آتا ہے - اور سچ پوچھئے تو کرداروں میں یہ زندگی اس لئے ہے کہ خود مصنف کی ذات میں حرکت وحیات ابلی پڑتی ہے - یہ تجربے کی بات ہے کہ ادیبوں، فن کاروں یا دوسرے بڑے آدمیوں کی جو غائبانہ وقعت وعزت ہمارے دلوں میں قائم ہوچکی ہوتی ہے ان حضرات سے ملاقات پر بالعموم اس کی بنیادیں متزلزل ہوجاتی ہیں - کیوں کہ ملاقاتی کو ان کی شخصیت میں وہ دل کشی اور بڑائی نظر نہیں آتی جو اس نے ان کے "کارناموں" میں پایا تھا - لیکن پروفیسر صاحب سے مل کر ان کی زندگی سے مملو شخصیت کی کشش ملاقاتی کو ویسی ہی محسوس ہوتی ہے، جیسے ان کے افسانے پڑھتے وقت محسوس ہوئی تھی - اُن کی ہر حرکت، ہر بات، ہر جنبش" میں وہی زندگی نظر آتی ہے جو ان کے افسانوں کے کرداروں میں حلول کئے ہوتی ہے - آرنلڈ بینیٹ نے کہا تھا کہ "آج تک کسی مصنف نے ایک صفحہ بھی اپنی چغلی آپ کھائے بغیر نہیں لکھا" پروفیسر صاحب کے افسانوں کے کردار ان کی زندہ شخصیت کی چغلی کھاتے ہیں -

وہ اپنے کرداروں کا ذہنی پس منظر اور خارجی ماحول تیار کرنے میں بڑی احتیاط اور جزئیات نگاری سے کام لیتے ہیں ("لمعات"، "بے فکرا مجید"، "نفرت"، "ایک چھوٹی سی بات") کیوں کہ وہ اس راز سے بخوبی آگاہ ہیں کہ ہمارے افعال اختیاری ہوں یا اضطراری، ہمیشہ ہمارے شعور یا تحت الشعور کی کارفرمائیوں کا نتیجہ ہوتے ہیں - بلکہ نفس غیر شعوری بھی اپنا کام کرتا ہے - اس لئے اگر پڑھنے والے کو کردار کی ذہنی وخارجی فضا معلوم ہو تو اس کے افعال واعمال کے سمجھنے میں دقت نہیں پیش آسکتی - نفسیاتی تجزیے میں پروفیسر صاحب کو خاصی مہارت حاصل ہے کبھی تو قدیم ایرانی مصوروں کی طرح منظر کی تفصیلات دیتے ہیں اور کبھی چینی شاعروں کی طرح صرف ایک آدھ اشارے ہی میں ارضیہ تیار کرکے بہت کچھ بتا جاتے ہیں - "اتفاق" کی ہیروئن زہرہ کو افسانے کے آغاز ہی میں چند نفسیاتی اشارے کرکے نہایت دلآویز کردار بنا دیا ہے اور پھر افسانہ ترقی کرتا ہے تو زہرہ کے احساس شباب کی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں - "زہرہ خود محسوس کرتی اور حیران ہوتی کہ صبح کا وقت کتنا خوش گوار معلوم ہوتا ہے اور رات کو تارے کتنے خوبصورت دکھائی دیتے ہیں - جیسے میں نے پہلے کبھی دیکھے ہی نہیں - نتھلے میں اگر نہیں گانا ہوتا، تو زہرہ کو یونہی بلا وجہ کچھ سرور سا محسوس ہوتا - دل میں ہر چیز کے لئے کچھ شوق سا پیدا ہوگیا - زندگی ایسی بشاش اور دن رات ایسے شیریں محسوسات سے لبریز ہوتے، کہ زہرہ بے چاری خود اپنے جذبات سے گھبرا جاتی" - انجام کار جب مظہر نے زہرہ کی منگنی مظہر کے انکار کر دینے کی وجہ سے ہوتے ہوتے رہ جاتی ہے تو زہرہ کی بڑی بہن بتول اپنی ماں سے پوچھتی ہے کہ "زہرہ کو بتانا چاہئے یا نہیں"؟ اور ماں جواب دیتی ہے کہ "اُسے بتانے کی کیا ضرورت ہے" -

اُسے کیا ایسی باتوں سے ؟" ہندوستانی والدین کی خودسری اور لڑکیوں کی بے بسی و بے زبانی پر کیا دل گداز طنز ہے۔ گائے بھینسوں کی
طرح ان بے چاریوں کی قسمت کے فیصلے ہوتے ہیں۔ کوئی ان کی خوشی و ناخوشی کی پروا نہیں کرتا۔ ان کے شریکِ زندگی کے بارے میں کوئی
ان کی رائے نہیں پوچھتا ــــ اور پھر اگر مظہر نے زہرہ کو دیکھا ہوتا تو غالباً انکار نہ کرتا۔ یہ رہی پردے کی جگہ" ہندیوں کی خرابی ــــ
"بے فکر امجد" کے متعلق اس کی ماں نے بھی ایسی بات کہی تھی۔" وہ ابھی بچہ ہے۔ اس کا کیا ہے۔ جس کے ساتھ اس کی شادی کر دیں
گے۔ اسے وہی پسند آجائے گی"۔ پروفیسر صاحب کا مطمحِ نظر متوسط طبقے کی خانگی زندگی کی اصلاح معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ ناصح
مشفق بن کر افسانے کو کبھی "پند نامہ" بنانے کی کوشش نہیں کرتے۔ اور نہ انہیں کسی سخت قسم کا "پراپیگنڈا" مقصود ہے۔ "نقشِ
رنگیں" میں قمر کالج کی ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ ذرا اس کے خیالات سنئے۔" نہ انہیں بات کرنی آئے۔ نہ ہنسنا ہی آئے۔ اور کپڑے
دیکھو! کپڑا قیمتی سے قیمتی پہن کے آئیں گی مگر مجال ہے جو کسی اچھے درزی سے سلوالیں۔ اور حسن کا مفہوم تو ان کے ادراک سے
باہر ہے۔ ان سے کیا کوئی خاک بات کرے گا۔ نہ انہیں تصویروں سے دلچسپی اور نہ انہوں نے ساری عمر کسی پھول میں رنگ بھر کر
دیکھا ہے اور شاعری تو شاید ان کے نزدیک بداخلاقی کا دوسرا نام ہوگی۔ اور پھر آٹھویں کہ دسویں تک پڑھی ہیں اور جو اُن سے جاکر
کہہ دیں کہ اپنے نصاب میں ہم ایسے شعر روز پڑھتے ہیں ؎

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

تو اماں سے ضرور کہہ جائیں کہ لڑکی کا اب بیاہ کر دو۔ زیادہ پڑھانا ٹھیک نہیں۔ آج کل زمانہ برا ہے۔ کوئی اچھا سا رشتہ ڈھونڈ کے
قمر کا بیاہ کر دو۔ اور اچھا سا رشتہ کون سا؟ جس کے پاس جائداد ہو۔ اچھی جگہ ملازم ہو۔ اور بہت سی تنخواہ لیتا ہو۔ جیسے فہمیدہ کے
گھر والوں نے اس پیاری سی شکل پر ظلم کیا ہے۔ کس جھڑوس کے ساتھ بیاہ دی ہے۔ پتا نہیں آدمی ہے کہ بندر۔ توبہ، توبہ، کتنے
احمق ہوتے ہیں یہ والدین! ــــ اب کوئی اماں سے کہہ دے نا میرے یہ لفظ، تو سارے قرآن بھول جائیں اور شاید غش ہی آجائے۔
سمجھتی ہوں گی۔ قمر ننھی منھی معصوم سی گڑیا ہے۔ اُسے تو فقط اپنے کمرے کے رکھ رکھاؤ ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ اسے کہاں کسی
خوبصورت نوجوان کا، جو ثقافتی اور ادبی لحاظ سے ممتاز ہو، خیال آسکتا ہے۔ جی! قمر بے چاری ننھی سی گڑیا، بے زبان مورت کو
کہاں اتنا ہوش ہے۔ وہ تو محض گوڈر کی بوری ہے۔ نہ وہ پڑھتی ہے نہ وہ سوچتی ہے۔ کسی ناول، کسی رسالے، کسی شعر، کسی تصویر
سے اُسے کیا سروکار۔ وہ تو مخفف الفاظ اور جملہ معلومات کا توبرا ہے۔ بے حس ہے، دماغ تو اس میں ہے ہی نہیں۔ وہ کیوں کسی حسین
شے کی طرف راغب ہونے لگی۔ اس میں دل جیسی بے ضرورت چیز کیوں ہوگی .... محبت کا لفظ تو شاید
اس معصوم نے کہیں پڑھ لیا ہو۔ مگر وہ کیا جانے محبت کسے کہتے ہیں۔ کیا پتا اماں بے چاری کو کہ لڑکیوں میں بھی دل و دماغ ہوتا ہے
اور شباب کے اقتضا سے خون میں جوش بھی ہوتا ہے۔ توبہ، توبہ، یہ باتیں کہاں اماں جی کو سوجھ سکتی ہیں!"
"نقشِ رنگیں" کے خاتمے پر نندا بھاوج میں بڑی بی کے مطالعہ اور روزانہ مشاغل پر جو گفتگو ہوتی ہے۔ اُسے پڑھ کر ترجنیف
کے مشہور کردار بیزروف اور اس کے میزبان دوست کا وہ مکالمہ یاد آتا ہے۔ جو دوست کے باپ کے مطالعہ و مشاغل کے متعلق ہوا
تھا۔ البتہ صورتِ حالات قدرے مختلف ہے۔ وہاں بیزروف اپنے دوست کے باپ پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ یہاں خود بڑی بی
کی لڑکی قمر نکتہ چین ہے اور بہو ہمدرد و حامی۔ افسانہ بہو کے ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے۔ "تو اور کون سا مشغلہ دلچسپ ہے
یہ تو بتاؤ کتابیں بھی تو لوگوں کے ان تاثرات سے بھری ہوتی ہیں جو انہوں نے فطرت یا زندگی کے مطالعے یا تجربے سے پائے ہوتے
ہیں۔ یہ تاثرات بھی تو دوسرے تیسرے واسطے سے ہم تک پہنچتے ہیں۔ اور پھر بنفسہٖ ایسے تسکین آور بھی تو نہیں ہوتے۔ یہ قیدیں
تو ہر حالت میں صحیح زندگی کے منافی ہیں۔ چاہے ان کی صورت کوئی ہو .... یہ تو ہر ایک کا زندگی سے ذاتی سمجھوتا ہے کوئی کسی
طرح کر لیتا ہے، کوئی کسی طرح۔ کسی کا کچھ بھی نہیں بہتا۔"

"زبیدہ"۔ "لاری میں"۔ "لمعات" اور "نفرت" میں نفسیاتی مطالعہ کمال کو پہنچ گیا ہے۔ "لاری میں" کا افسانہ غالباً پروفیسر صاحب کو احمد علی کا افسانہ "موٹر لاری کا سفر" پڑھ کر سوجھا ہوگا۔ لیکن انہوں نے موضوع کو جس فن کارانہ پاکیزگی و لطافت سے نبھایا ہے، احمد علی کے افسانے کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی۔ کیفیاتِ نفسی کو پروفیسر صاحب اس فن کاری سے اجاگر کرتے ہیں کہ پڑھنے والا خلافِ امید سمجھ کر حیران ہو جاتا ہے اور پھر ذہنی و نفسی عمل و ردِ عمل کو جان کر محظوظ ہوتا ہے۔ پروفیسر صاحب کے افسانے پھلوں کے مانند ہیں۔ جن کا استعمال ہمیشہ مفرّح و مفید ہوتا ہے۔ ہلکی پھلکی غذائیں ہیں۔ جنہیں معدہ بخوشی قبول کر لیتا ہے۔ ان سے ہمیں انبساطِ روح حاصل ہوتا ہے۔ وہ کبھی ہمارے تاریک جذبوں کو تحریک نہیں دیتے۔ وہ ہمیں "تلخ حقائق" سے آگاہ کرنے کے لئے زندگی کی غلیظ و تاریک بہتی ہوئی نالیوں میں نہیں لے جاتے۔ اور نہ وہ ہمارے ذہن پر ہتھوڑے کی چوٹیں لگاتے ہیں۔ ادب کا ایک بڑا اہم فریضہ ہمیں مسرت بخشنا بھی ہے۔ کیوں کہ ادب زندگی کی نمائندگی کرتا ہے اور کوئی زندگی مسرت کے لمحات سے یکسر خالی نہیں ہوتی۔ پروفیسر صاحب کے افسانے اس ادبی فریضے کو بڑے حسن سے ادا کرتے ہیں۔ وہ ہمارے ذہن و روح کو گدگدا کر ہمیں سوچ بچار پر مائل تو کر دیتے ہیں لیکن سوچ بچار پر متوسط طبقے کی مخصوص دل جمعی یا آسودہ خاطری غالب آ جاتی ہے۔ ان کے افسانوں کی فضا میں درد و الم کی ایک ہلکی سی لہر جاری ہوتی ہے اور قاری ایک خوش گوار سی کسک محسوس کرتا ہے۔ صرف ایک افسانے "ایک دن" کو چھوڑ کر، جس کی حیثیت محض ایک واقعے کی عمدہ رپورٹ کی سی ہے، باقی تمام افسانوں میں کم و بیش اوپر بیان کی ہوئی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ افسانہ "گھر" میں اگرچہ متوسط طبقے ہی کی خانگی زندگی کا ایک رُخ پیش کیا گیا ہے، لیکن "کام چور" کی طرح یہ بھی محبت اور شادی کے ذکر سے مبرّا ہے۔ اس میں مصنف نے دکھایا ہے کہ متوسط طبقے کے لوگ اپنی اولاد کی دیکھ بھال کس طرح کرتے ہیں۔ بے چارہ چھوٹا لڑکا عجب ذہنی کش مکش میں گرفتار ہے۔ ماں باپ اُسے جھڑکنے اور ڈانٹنے کے لئے تیار ہیں۔ بڑے بہن بھائیوں سے کوئی تعرض نہیں کرتا۔ بلکہ الٹا وہ بھی اسی پر رعب جماتے ہیں اور ان کے مقابلے میں اس کی وہی کیفیت ہے۔ جیسے اس مقولے کی بنا بنایا گیا ہے کہ "سگ باش، برادرِ خرد مباش" وہ سوچتا ہے کہ بھائی جان اور آپا جان کو کیوں کوئی کچھ نہیں کہتا۔ آخر اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ "یا تو آدمی بھائی جان کی طرح ہو کہ سب اُن سے ڈریں، یا پھر آپا زمردی ہی بن جائے (کہ ہمارے پاس بیٹھی ہو تو زبان بند نہیں ہوگی۔ اور اماں ابا کے سامنے بھیگی بلی بنی رہتی ہے)" لیکن آخر کار اس پر کھلتا ہے کہ بھائی جان اور آپا جان بھی بہ اندازۂ ہمت اور بقدرِ قد ابا اماں کی قدغنوں کی شاکی ہیں۔

آج کل کی افسانہ نگاری کی عام روش دیکھتے ہوئے پروفیسر صاحب میں یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ان کے افسانوں میں ہمیشہ خوبصورت عورتوں کا ذکر ہوتا ہے۔ شاید ان کی حسِ جمالیت اور نفاستِ طبع بدصورت اور کالی کلوٹی عورتوں کا ذکر گوارا نہیں کر سکتی اور شاید یہ وجہ بھی ہو کہ متوسط طبقے کے افراد عموماً اچھی شکل و صورت کے مالک ہوا کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں حسین رنگت کے ساتھ بھوری آنکھوں کا ذکر بھی اکثر کرتے ہیں اور یہ ہے بھی حقیقت کہ ہندوستان میں بھوری آنکھیں عام ہیں مگر چشمِ غزال خال خال۔

پروفیسر صاحب کا اسلوبِ تحریر سادہ مگر شگفتہ ہے۔ اس پر خلوص کا چوکھا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ اُن کا طرزِ بیان ان کے افسانوں کے موضوعات سے مطابقت رکھتا ہے۔ انہیں لفاظی نہیں آتی، مختصر افسانے میں لفاظی کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ ان کی عبارت تصنّع یا تکلّف سے بری ہوتی ہے اور ایک "جوئے نغمہ خواں" کی طرح بہتی چلی جاتی ہے۔ انہوں نے دیدہ و دانستہ زبان میں پنجابی رنگ بھرا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر زبان میں پنجابیت نہ لائی جاتی تو "زبیدہ"۔ "نقشِ رنگیں" اور "لاری میں" کے مکالمے اس قدر شگفتہ، دل چسپ اور کامیاب نہ ہوتے۔ تشبیہیں اور استعارے بھی ان کے ہاں اچھے اچھے مل جاتے ہیں لیکن اس میدان میں وہ کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو سے بہت پیچھے ہیں۔ انگریزی کے عالمِ متبحر ہونے کی وجہ سے ان کے فقروں کی

بناوٹ، الفاظ کے دروبست اور پیرایۂ بیان پر انگریزی اسلوب کا گہرا اثر پڑا ہے۔ مختصر افسانہ لکھنے والوں میں سے مجھے صرف فیاض محمود اور سعادت حسن منٹو دو ایسے ادیب نظر آتے ہیں جو اگر ناول لکھیں تو شاید وہ ان کے افسانوں سے بھی بڑھ کر کامیاب ہوں۔ ان کا اسلوبِ انشا ناول نویسی کے لئے بہت موزوں ہے۔ ان کی خاص بیانیہ قوتیں انہیں سجھا دیتی ہیں کہ تجربات ومشاہدات میں سے کون سے شاملِ افسانہ کئے جائیں اور کون سے چھوڑ دئے جائیں۔ کیا مفصل اور کیا مجمل طور پر بیان کیا جائے فوٹوگرافر کی طرح وہ ایک واقعے کو مختلف پہلوؤں سے دیکھتے ہیں اور آخر وہ زاویہ اختیار کرتے ہیں جس سے روشن اور صحیح عکاسی ہو سکے۔

صرف ایک بات اور۔ اگرچہ پروفیسر صاحب کے افسانے موضوع کی محدودیت کے باوجود بھی مغرب کے معیاری افسانوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں لیکن کیا اچھا ہو اگر آئندہ وہ اپنے افسانوں کی دنیا زیادہ وسیع کرلیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کا مطالعہ و تجربہ صرف متوسط طبقے تک ہی محدود نہیں ہے۔ جیسا کہ ان کے افسانے "لمحات" سے ظاہر ہے ——— "رنگ و بو" میں صرف یہی ایک افسانہ ہے۔ جس کا پس منظر دیہات کی کھلی اور آزاد فضا ہے۔ اور بے شبہہ پروفیسر صاحب کے بہترین افسانوں میں سے ایک ہے ——— میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اگر وہ ابنِ عم اور بنتِ عم کی ناکام یا کامیاب محبت کے بیان کو، اگرچہ وہ کتنا ہی فن کارانہ اور مصلحانہ کیوں نہ ہو، چھوڑ کر اپنی توجہ "لمحات"۔ "نقش رنگیں"۔ "کام چور"۔ "گھر" وغیرہ کی قسم کے افسانے لکھنے پر مبذول کریں، تو پہلے سے بڑھ کر کامیاب ہو سکتے ہیں۔ دیہاتی زندگی نہ سہی، شہر کی روزانہ زندگی ہی میں گوناگوں تنوعات ہر گھڑی مشاہدہ میں آتے ہیں۔ جن پر پروفیسر صاحب ایسا فن کار دلچسپ افسانوں کی بنیاد رکھ سکتا ہے۔

دو چار دن پہلے کی بات ہے کہ میرے ایک دوست نے جو انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس کے امتحان کی تیاری کر رہے ہیں، اثنائے گفتگو میں یکایک مجھ سے پوچھا "کیا اُردو کا کوئی افسانہ نگار فیاض محمود نام کا ہے"؟ میں نے جواب دیا۔ "ہاں آپ کیوں پوچھتے ہیں"؟ کہنے لگے میں نے امتحان کی غرض سے واقفیتِ عامہ (GENERAL-KNOWLEDGE) کی آٹھ سو صفحے کی ایک ضخیم کتاب خریدی ہے۔ اس میں ہندوستان کے ادیبوں کا بھی تذکرہ ہے اور آج کل کے "ہندوستانی" میں افسانہ لکھنے والوں میں سے مؤلفین نے صرف دو کے نام دئیے ہیں۔ فیاض محمود اور کرشن چندر۔ کرشن چندر کی بعض کہانیاں تو میں پڑھ چکا ہوں لیکن فیاض محمود کا نام اس کتاب ہی میں پڑھا۔" میں نے کہا۔ "اگرچہ آپ کی کتاب کے مؤلفین کی ادبی قابلیت کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں ہے۔ تاہم یہ اُنہوں نے ٹھیک لکھا ہے۔ فی الواقع یہی دو حضرات ہمارے بہترین افسانہ نگار ہیں"۔

پروفیسر فیاض محمود صاحب کی افسانہ نگاری کے متعلق یہ بُرا بھلا مضمون لکھنے کی تحریک مجھے اپنے اس دوست کے استفسار ہی سے ہوئی۔

بشیر ساجد

ضروری اطلاع

مضمون نگار حضرات کو اپنے مضامین کی صاف اور صحیح طباعت کے لئے اس بات کا خیال رکھنا چاہئیے کہ ان کا مسودہ نہایت واضح، صاف اور خوش خط لکھا ہو، شکستہ، مبہم اور غیر واضح الفاظ کو کاتب عموماً غلط پڑھتے اور غلط لکھتے ہیں۔ اس طرح مسودوں اور کاپیوں کی صحت میں نہ صرف غیر ضروری کوفت اٹھانی پڑتی ہے بلکہ طباعت بھی صاف نہیں ہوتی اور غلطیاں بھی کم وبیش رہ جاتی ہیں۔

"ہمایوں"

انجام

اک شاخ پر کِھلا تھا
اک پھُول ——— تیرا پیماں
اور اُس پہ ایک تتلی
وہ میرا شوخ ارماں

کچھ خشک پتّیاں ہیں
اب خاک پر پریشاں
اور اُن کے پاس دو پر
بے حِس، شکستہ، بے جاں

سیّد ضیا جالندھری

انتقام

کل رات اک کسان کے گھر سے دُھواں اُٹھا
بستی میں غلغلہ سا ہُوا "آگ لگ گئی"
اِس رنج سے کسان کا دِل پاش پاش تھا
رقصاں تھی چودھری کے لبوں پر مگر ہنسی

قتیل شفائی

غزل

دیئے ہیں بارہا خود کو فریبِ امتحاں میں نے
تغافل پر کیا ہے دِل نوازی کا گماں میں نے

یہ اپنا ذوقِ بربادی ہے اس کو کیا کرے کوئی
کیا خود بجلیوں کی زد میں تعمیر آشیاں میں نے

اسے شاید نیازِ عشق کی تکمیل کہتے ہیں
مٹا ڈالی ہے تمیزِ جبین و آستاں میں نے

جہاں میں کون ایسا تھا کہ رودادِ وفا سنتا
نہ جانے کیا سمجھ کر چھیڑ دی یہ داستاں میں نے

نہیں آساں محبّت کی خلش کا مستقل ہونا
بہت کچھ کھو کے پایا ہے یہ عیشِ جاوداں میں نے

زباں پہ ایک حرفِ شوق کا لانا قیامت تھا
کیا اُس بدگماں کو اور کیفیؔ بدگماں میں نے

رشید کیفیؔ

داماد

اصغر ~~~ ایک نوجوان گریجوایٹ

خان بہادر مختار حسن ~~~ پولیس کے ایک ممتاز عہدے دار جن کی خدمات بہت ہیں

نجمہ ~~~ مختار حسن کی اکلوتی لڑکی جس نے بی۔اے تک تعلیم حاصل کی ہے

بیگم ~~~ مختار حسن کی بیوی

زمانہ ~~~ یہی ہمارا آپ کا ~~~ وقت ~~~ صبح کے نو بجے

[خان بہادر صاحب کی کوٹھی کا ڈرائنگ روم ہے جو زمانۂ حال کے سازو سامان سے پوری طرح مزین ہے۔ خان بہادر مختار حسن ایک کرسی پر اپنی پوری وردی پہنے بیٹھے ہیں۔ اُن کے آگے ایک چھوٹی سی میز پر دو ایک فائلیں اور فائلوں پر اُن کی ہیٹ رکھی ہے۔ اصغر ایک معمولی سا سوٹ پہنے اُن کے سامنے کچھ فاصلے پر کھڑا ہے۔ ڈرائنگ روم میں ایک دروازہ اندر کی جانب کھلتا ہے اور ایک باہر کی جانب]

مختار حسن (غصیلی اور رعب دار آواز میں) "اس کے لئے میں تمہیں کبھی معاف نہیں کرسکتا۔ تم نے نہ صرف کمیشن کے لوگوں کو دھوکا دیا ہے بلکہ میری توہین بھی کی ہے اور اپنی توہین میں نے کبھی برداشت نہیں کی (میز پر مُکّا مار کر اور زیادہ زور دار لہجہ میں) اپنی توہین میں کبھی برداشت نہیں کرسکتا۔"

اصغر (لجاجت سے) "جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا اگر میں نے اتنا بڑا جھوٹ نہ بولا ہوتا اور اُس جھوٹ سے اگر آپ کی توہین نہ ہوئی ہوتی تو مجھے آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر معافی مانگنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں آپ سے سچے دل سے معافی مانگنے آیا ہوں۔"

مختار حسن (اُسی برافروختگی سے) "معافی! کتنا آسان لفظ ہے۔ معافی! ——جرم کیا اور معافی مانگ لی۔ چلئے فیصلہ ہوا۔ آج تم نے یہ حرکت کی ہے کل کوئی کچھ اور کر بیٹھے گا (پھر میز پر مُکّا مارتے ہوئے) میں تمہیں ہرگز معاف نہیں کرسکتا۔ تمہیں اپنے کئے کی سزا ضرور بھگتنی پڑے گی۔"

اصغر "آپ تو بہت زیادہ غصہ میں آگئے (جلدی سے) اور آپ کا غصہ ہے بھی بجا لیکن اُن مجبوریوں کو بھی تو نظر میں رکھئے جن کی وجہ سے مجھے اتنی بڑی خطا کرنی پڑی —— یوں سمجھئے کہ ایک غریب نوجوان بی۔اے کہیں سے روپے اُدھار لے کر آئی سی ایس کا داخلہ بھیجتا ہے ظاہر ہے کہ اُسے فیس کے روپے بھی آسانی سے میسر نہیں آتے۔ پھر امتحان میں وہ پرچے بھی بہت اچھے کر دیتا ہے اور کامیابی کی اُسے پوری اُمید ہو جاتی ہے لیکن وہ جانتا ہے کہ انٹرویو میں فقط قابلیت سے کام نہیں چلے گا تو آئی سی ایس میں آنے کے لئے اگر اُس نے بے سوچے سمجھے کوئی جھوٹ بول دیا ہو تو آپ سمجھ لیجئے کہ اس کی ذمہ داری اُس پر کہاں تک عائد ہوسکتی ہے۔"

مختار حسن (غصے میں) "نالائق! (میز پر مُکّا مار کر) تو آئی سی ایس میں کامیاب ہونے کے لئے کسی شریف آدمی کی عزت اُتار لے۔ کسی باعزت آدمی کی توہین کر دے اور پھر کتنا ضدی ہے کہتا ہے کہ اس کی ذمہ داری مجھ پر کہاں تک عائد ہوسکتی ہے۔"

اصغر (نہایت متانت سے) "میں سچ عرض کر رہا ہوں۔ جب کمیشن کے ایک ممبر نے مجھ سے سوال کیا کہ تمہارا کوئی رشتہ دار گورنمنٹ کے کسی عہدے پر فائز ہے تو مجھے معلوم تک نہ تھا کہ آپ کے کوئی لڑکی بھی ہے میری زبان سے یونہی نکل گیا کہ خان بہادر مختار حسن میرے خسر ہوتے ہیں۔"

مختار (کرسی پر سے اُٹھتے ہیں اور ایک دو لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہیں) (غصے میں) "اگر اب تم نے یہ بات دہرائی تو میں تمہاری زبان گدّی سے کھینچ لوں گا جب تک تمہیں اس بکواس کی اس دھوکے کی پوری پوری سزا نہ مل جائے گی

میری طبیعت کو سکون نہیں آسکتا"۔

اصغر (التجا کے لہجے میں) "خان بہادر صاحب اس مرتبہ تو معاف کر دیجئے۔ آئندہ کبھی ایسی غلطی نہ ہوگی ——— میں رحم کی اُمید لے کر آیا تھا"۔

مختار (حقارت سے) "مجرموں کے لئے میرے دل میں کبھی رحم نہیں آتا۔ میں صاف صاف لکھ دوں گا کہ اصغر نے قطعی طور پر دھوکا دیا ہے اور اس کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے"۔

اصغر (غم انگیز آواز میں) "لیکن خان بہادر صاحب اس سے میری زندگی تباہ ہو جائے گی۔ میری والدہ میری بہنیں سب کی زندگی تباہ ہو جائے گی اور جیل کی سختیاں ———"

مختار "یہ باتیں تمہیں پہلے سوچنی چاہئے تھیں"۔

اصغر (منت کے لہجے میں) "میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ خطا بے شک میری ہی ہے لیکن کیا آپ میری اس خطا کو معاف نہیں فرما سکتے (پھر خود ہی) ضرور فرما سکتے ہیں (اور زیادہ رحم طلب آواز میں) میں آپ کی منت کرتا ہوں۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں مجھے معاف کر دیجئے"۔

مختار (جذبے سے خالی آواز میں) "نہیں ——— ہرگز نہیں"۔

اصغر (پرجوش لیکن ہلکی آواز میں) "تو اپنا پستول نکالئے اور میرا کام تمام کر دیجئے۔ جیل خانے کی ذلیل زندگی سے تو کہیں بہتر ہے کہ میں اس دُنیا ہی میں نہ رہوں"۔

مختار (اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے متاثر ہو کر) "اچھا دیکھو میں ایک کام کر سکتا ہوں۔ وہ بھی اس لئے کہ تمہاری باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمہاری نیت میں کوئی شرارت نہ تھی اور وہ کام یہ ہے کہ جب میرے پاس کاغذ آئیں گے تو میں لکھ دوں گا کہ میری لڑکی اصغر سے منسوب ضرور تھی لیکن بعض حالات کی بنا پر یہ نسبت منسوخ کر دینی پڑی"۔

اصغر (دبی زبان میں) "لیکن میں نے تو اُنہیں یہ بتایا تھا کہ میں خان بہادر مختار حسن کا داماد ہوں"

(مختار کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اصغر کی طرف قدم اٹھاتے ہیں)

مختار (بلند اور غصہ کی آواز میں) "تم بکواس کرنے سے باز نہیں آئے۔ میرے صبر کی انتہا ہو چکی ہے۔ اب کے اگر تم نے یہ لفظ اپنے منہ سے نکالا تو میں تمہارا سر توڑ دوں گا ——— بے وقوف، گدھا"۔

(اندر کی جانب کھلنے والے دروازے پر ہلکی سی کھٹ کھٹ ہوتی ہے)

مختار "کون"؟

بیگم "میں ہوں"

مختار "بیگم؟ (اصغر سے نرمی کے ساتھ) "دیکھو جو کچھ میں کر سکتا ہوں میں نے تمہیں بتا دیا ہے اور اب ——— یہ دروازہ ہے (باہر والے دروازے کی طرف اشارہ کرتا ہے)

اصغر "آپ بیگم صاحبہ سے بات کر لیں میں اتنے باہر انتظار کرتا ہوں"

مختار (غصے سے) "انتظار کا بچہ۔ یہ میری شرافت ہے کہ میں تمہارے لئے اتنا کچھ کرنے کے لئے بھی تیار ہوں۔ کوئی اور ہوتا تو تمہیں سیدھا جیل خانے میں بھجوا دیتا"۔

(اصغر باہر کھلنے والے دروازے سے چلا جاتا ہے۔ گردن جھکائے آہستہ آہستہ)

مختار (خوشی اور محبت کی آواز میں) "آؤ بیگم!"

(اندر کھلنے والے دروازے سے بیگم داخل ہوتی ہے دونوں برابر برابر صوفوں پر بیٹھ جاتے ہیں)

بیگم "یہ کون نوجوان تھا جس پر آپ ناراض ہو رہے تھے؟

(کچھ دور سے گانے کی ہلکی ہلکی آواز آتی ہے
آتی ہے اُن کی یاد مجھے بار بار کیوں
اپنے ہی دل پہ مجھ کو نہیں اختیار کیوں)

مختار "آج کل کے نوجوان اپنی عقل کے پیچھے لاٹھی لئے پھرتے ہیں۔ ای پی سی کے امتحان میں بیٹھا تھا۔ اس کے انٹرویو میں جب بورڈ کے کسی ممبر نے سوال کیا کہ تمہارا کوئی رشتہ دار گورنمنٹ کے کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہے تو اس گدھے

نے کہہ دیا کہ میں خان بہادر مختار حسن کا داماد ہوں۔ اس کا خیال تھا کہ میری اعلیٰ خدمات کی بنا پر اسے انتخاب میں لے لیا جائے گا۔"

بیگم (حیرت سے) "اتنی جرأت"!

(گانے کی آواز بدستور آرہی ہے)

- میں جانتی ہوں وہ کبھی آئے نہ آئیں گے
رہتا ہے میرے دل کو مگر انتظار کیوں)

مختار "جی دیکھئے! (پھر اچانک) یہ کون گارہا ہے؟"

بیگم نجمہ کی کوئی سہیلی ملنے آئی ہے۔ وہ گا رہی ہے۔"

مختار (متاثر ہو کر) "کیا خوب گاتی ہے!"

بیگم (ذرا چڑ کر۔ طنز کے لہجے میں) آپ کہیں تو انہیں یہاں بلا لیا جائے (پھر خود ہی پیش بندی کے طور پر) لیکن وہ شاید آپ کے سامنے نہ گائے"

مختار "نہیں۔ یہاں بلانے کی ضرورت نہیں —— (پھر پہلے موضوع کی طرف آکر) اور ہاں جب اس نوجوان کو خبر لگی کہ جن اُمیدواروں نے اپنے رشتہ داروں کے نام اوپر بتائے تھے بورڈ کی طرف سے اُن کے پاس کاغذات تصدیق کے لئے بھیجے جائیں گے تو میرے پاس معافی مانگنے آیا تھا۔"

(گانے کی آواز بدستور آرہی ہے
کیوں گل کھلے ہیں کیوں ہے نوا سنج عندلیب
جب وہ نہیں تو آئی چمن میں بہار کیوں)

بیگم "جرم تو اُس نے سخت کیا ہے

(گانے کی آواز —— آتی ہے اُن کی یاد مجھے بار بار کیوں
اپنے ہی دل پہ . . . .
گانے کی آواز بند ہو جاتی ہے)

مختار "اس لئے سزا بھی سخت ہی ملنی چاہئے"

بیگم "لیکن —— (کچھ سوچ کر) ایک بات کہوں اگر آپ بُرا نہ مانیں"

مختار (محبت سے) "تمہیں ساتھ رہتے ہوئے مدتیں گزر گئیں اب بھی تمہیں یہ خوف ہے کہ میں تمہاری کسی بات سے بُرا مان جاؤں گا"

(اونچی ایڑھی کا جوتا پہنے اور بڑی خوش رنگ ساڑھی زیب تن کئے کھٹ کھٹ کرتی ہوئی نجمہ داخل ہوتی ہے)

مختار (خوشی کے لہجے میں) "آؤ بیٹا نجمہ آؤ۔ تمہاری سہیلی چلی گئیں کیا؟

نجمہ "جی ہاں (لاڈ سے) اور ابا جان آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اس مرتبہ آپ ہمیں کشمیر لے جائیں گے"

بیگم (طعنے کے طور پر) "بس اسے تو کشمیر جانے کی پڑی ہے جیسے دنیا میں کوئی اور کام ہی نہیں"

نجمہ (چڑ کر) "امی! ——"

مختار (جلدی سے نجمہ کی بات کاٹ کر) "بیٹا نجمہ مجھے تو تم جانتی ہو کہ چھٹی نہیں ملی۔ البتہ میں نے بھائی کو لکھ دیا ہے وہ اور محمود کشمیر جا رہے ہیں تو ادھر سے تمہیں بھی ساتھ لے لیں گے۔"

نجمہ "اُن کے ساتھ تو میں نہیں جاؤں گی ابا"

مختار (تعجب سے) "کیوں بیٹا"؟

نجمہ "بھائی محمود تو مجھے بالکل پسند نہیں۔ مزاج دیکھو تو اتنا تیز کہ ہر وقت لڑنے پر آمادہ۔ قابلیت کی حالت یہ کہ تین سال میں بی۔ اے نہ کر سکے اور اپنے آپ کو سمجھتے ہیں کہ میں ارسطو کا بھی باپ ہوں۔ اُن کے ساتھ تو میں دو دن بھی خوشی سے نہیں گذار سکتی"

مختار "اچھا دیکھو میں کوشش کروں گا کہ چھٹی مل ہی جائے۔"

نجمہ "اور ابا اگر لمبی چھٹی نہیں ملتی تو کشمیر جانا ہی کیا فرض ہے کسی اور پہاڑ پر ہو آئیں گے"

بیگم "نجمہ اب ذرا باورچی خانے میں چلی جاؤ میاں داخاد مسر ترکاری خراب کر دے۔ میں تمہارے ابا سے دو باتیں کر کے ابھی آئی"

نجمہ (بُرا مان کر) "لیکن امی ——"

مختار (جلدی سے بات کاٹ کر) "جاؤ بیٹا۔ ابھی ہم باتیں کر لیں تو میں تمہیں بُلا بھیجوں گا۔ کیوں کہ ہمیں یہ فیصلہ بھی تو کرنا ہوگا کہ کس پہاڑ پر چلنا چاہئے"

نجمہ (ہلکی آواز میں جس میں خفگی کا اظہار ہو رہا ہے) "بہت

اچھا"

(کھٹ کھٹ کرتی ہوئی دروازے سے چلی جاتی ہے)

مختار: "نجمہ کا مزاج بہت ہی تیز ہو گیا ہے۔ ہاں بیگم کیا کہہ رہی تھیں تم۔ وہ کیا بات تھی جس سے تمہیں خوف تھا کہ میں بُرا مان جاؤں گا"

بیگم: "جی ہاں میں کہہ رہی تھی کہ آخر ہمیں ——— (رک جاتی ہے)

مختار: کہو کہو ——— ہاں کہو"

بیگم: "میں کہہ رہی تھی کہ آخر ہمیں نجمہ کی شادی کرنی ہی ہے"

مختار: "ہاں ضرور کرنی ہے اور اس کے لئے میرے نزدیک محمود ———"

بیگم: (بات کاٹ کر) "محمود کی رہنے دیجئے۔ اُس کے متعلق تو نجمہ صاف کہہ گئی ہے کہ بھائی محمود تو مجھے بالکل پسند نہیں۔ مزاج دیکھو تو کتنا تیز؛ اُن کے ساتھ تو میں دو دن بھی خوشی سے نہیں گزار سکتی"

مختار: (کچھ فکر کے انداز میں) "کہہ تو بے شک گئی ہے۔ اچھا ——— محمود کو رہنے دو۔ تمہاری نظر میں کوئی اور لڑکا ہے"؟

بیگم: (کچھ افسوس سے) "آج کل تو اچھے لڑکوں کا قحط ہے"

مختار: "تو محمود میں کیا برائی ہے۔ بھائی صاحب مجھ سے کئی دفعہ اس کے متعلق کہہ چکے ہیں"

بیگم: "محمود میں کیا برائی ہے یہ تو مجھے خبر نہیں لیکن جو بات نجمہ ابھی ابھی کہہ گئی ہے اس سے زیادہ کوئی شریف لڑکی اپنے ماں باپ کے سامنے اور کیا کہہ سکتی ہے"۔

مختار: "ہاں ——— (افسوس سے) اچھا"

بیگم: (ذرا ہچکچاتے ہوئے) "جس نوجوان پر آپ ناراض ہو رہے تھے ——— اُس نے کیا اہی پی سی کا امتحان دیا ہے"

مختار: (بے رخی سے) "ہاں"

بیگم: (ذرا اور حوصلے سے) "کامیابی کی اُمید ہے"؟

مختار: "پرچے تو کہتا ہے کہ بہت اچھے ہو گئے۔ بی۔ اے میں بھی اُس نے فسٹ کلاس لی تھی لیکن اب تو میرے خیال میں انٹرویو کی تصدیق پر منحصر ہے"

بیگم: "تو کیا آپ انکار کر دیں گے"؟

مختار: (حیرت سے) "اور کیا کروں"

بیگم: (رحم آمیز لہجے میں) "اس سے تو اس کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ ممکن ہے کہ قید ہی ہو جائے۔ اگر قید نہ بھی ہوا تو بھی آئندہ کسی امتحان میں نہ بیٹھ سکے گا"

مختار: "کام تو اُس نے ایسا ہی کیا ہے لیکن میں نے اُس پر رحم کھا کر کاغذات پر یہ لکھنے کا ارادہ کر لیا ہے کہ میری لڑکی اس سے منسوب ضرور تھی مگر بعض حالات کی وجہ سے یہ رشتہ منسوخ کر دینا پڑا"

بیگم: (کچھ جھجک کے ساتھ) "لیکن لڑکا تو ہوشیار معلوم ہوتا ہے"۔

مختار: (تعجب سے) "ہاں ہوشیار تو ہے لیکن اس بات سے تمہارا مطلب"؟

بیگم: "میں یہ بات اس لئے نہیں کہہ رہی ہوں کہ نجمہ میری سوتیلی لڑکی ہے۔ خدا جانتا ہے کہ میرے دل میں اُس کی کتنی محبت ہے"

مختار: (متاثر ہو کر) "بیگم یہ تم کیا کہنے لگیں۔ میں نے کب تم پر شبہہ کا اظہار کیا"؟

بیگم: "نوجوان قابل اور لائق ہے ——— اور پچھلی دفعہ (ہلکی آواز میں) کالج میں نجمہ کے متعلق جو افواہیں پھیل گئی تھیں میں نے افواہیں کہا ہے کیوں کہ میں جانتی ہوں کہ ان کی کوئی حقیقت نہیں ہو سکتی ———"

مختار: "ہاں"

بیگم: (اپنی بات جاری رکھتے ہوئے اُسی ہلکی آواز میں) "اگر وہ افواہیں خدا نہ کرے زیادہ دور تک پھیل گئیں تو ہمیں نجمہ کی شادی کرنے میں مشکلات پیش آنے کا خطرہ ہو سکتا ہے (اور زیادہ واضح کرنے کے طور پر) اگر یہ باتیں محمود کے یا اُس کے باپ کے کانوں تک پہنچ گئیں تو مجھے خوف ہے کہ کہیں وہ بھی انکار نہ کر دیں ——— اس کے علاوہ یہ نوجوان ہمیشہ آپ کا اور نجمہ کا شکر گزار رہے گا"

(ٹھنڈا اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور کمرے میں اِدھر اُدھر پھرتا ہے)

بیگم: "بہت ممکن ہے کہ اس وقت آپ کو میری یہ بات بُری لگی ہو لیکن ٹھنڈے دل سے سوچنے کے بعد آپ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ جو کچھ میں کہہ رہی ہوں وہ دور اندیشی پر مبنی

ہے"۔

مختار "ہاں —— (چلتے چلتے ٹھہر جاتا ہے)" تمہاری بات دوراندیشی پر مبنی ہے۔ اچھا تو تم جاکر ذرا نجمہ کو بھیج دو کیوں کہ اس کی رضامندی ضروری ہے اور میں نوجوان کو بلاکر اُس کا ارادہ اور حسب نسب معلوم کرتا ہوں (ذرا زور دے کر تمکنت آواز میں) اگر نجمہ راضی نہ ہوئی تو البتہ ہماری دوراندیشی دھری رہ جائے گی۔ (فیصلہ کن انداز میں) اُس کی مرضی کے خلاف میں اُس کی شادی کہیں نہیں کروں گا"

بیگم۔ "تو اچھا میں جاکر نجمہ کو بھیجتی ہوں۔ میرے خیال میں تو وہ راضی ہو جائے گی"۔

(بیگم اٹھ کر چلی جاتی ہے)

(مختار گھنٹی بجاتا ہے)

(باہر والے دروازے سے نوکر آتا ہے)

نوکر "جی سرکار"

مختار "دیکھو باہر ایک نوجوان صاحب بیٹھے ہیں"

نوکر "جی سرکار بیٹھے ہیں"

مختار "انہیں ذرا اندر بھیج دو"

(نوکر سلام کرکے چلا جاتا ہے)

(اصغر داخل ہوتا ہے)

اصغر "فرمائیے آپ نے میری قسمت کا کیا فیصلہ کیا؟"

مختار "اور تم نے کیا سوچا"

اصغر (افسوس سے) "میں کیا سوچتا میں تو پچھتا رہا ہوں کہ میں نے کیا کیا"

مختار (نرمی سے) "ایک صورت ہو سکتی ہے ——"

اصغر (ڈرتے ڈرتے جلدی سے) "کیا آپ کو میری حالت پر رحم آگیا۔ کیا آپ لکھ دیں گے"

مختار (بدستور نرم آواز میں) "ہاں مگر ایک شرط پر"

اصغر (بے سوچے سمجھے) "مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے"

مختار "یہ بتاؤ کہ تم یہیں کے رہنے والے ہو یا کسی اور جگہ کے اور تمہارے والد کون ہیں اور کیا کام کرتے ہیں؟"

اصغر "میں خاص یہاں کا تو نہیں لیکن اسی ضلع کا رہنے والا ہوں۔ مشہور ڈاکٹر قریشی میرے والد تھے (رنج سے) دو سال ہوئے ان کا انتقال ہو گیا"

مختار "اوہ خوب۔ ڈاکٹر قریشی؟ وہ بے چارے تو شاید تمہاری شادی کی خوشی بھی نہ دیکھ سکے تھے"

اصغر (اسی رنج کے لہجے میں) "کیا عرض کروں۔ کئی دفعہ انہوں نے اس بات کی کوشش کی لیکن میں یہی کہتا رہا کہ پہلے کچھ بن جاؤں پھر شادی کروں گا"

مختار "خوب۔ اچھا بات یہ ہے کہ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا ——"

اصغر (جوش سے) "خان بہادر صاحب آپ جیسے نیک خصلت آدمی دنیا میں ——"

مختار "اور میں جھوٹ بھی نہیں لکھنا چاہتا اس لئے میرے خیال میں اگر تم راضی ہو تو سچ مچ —— (بات نامکمل چھوڑ دیتا ہے)

(اصغر خاموش رہتا ہے)

مختار (تعجب سے) "اب خاموش کیوں ہو گئے؟"

(اصغر پھر خاموش رہتا ہے)

مختار (غصے سے) "تو تم جیل میں جانا چاہتے ہو"

اصغر (منت آمیز لہجے میں) "خان بہادر صاحب!"

مختار (اسی غصے میں) "تمہارے لئے دو ہی راستے ہیں —— یا جیل اور یا باعزت زندگی۔ بولو تم کون سا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہو"

اصغر (دبی زبان سے) "لیکن ——"

مختار "لیکن ویکن کچھ نہیں۔ جلد بولو۔ تم تو کہتے تھے مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔ بولو۔ مجھے پولیس کو ٹیلی فون کرنے کی ضرورت تو نہ پڑے گی"

(اندر والے دروازے میں نجمہ نمودار ہوتی ہے)

نجمہ (ہلکی آواز میں) "میں آسکتی ہوں ابا؟"

مختار (نرمی سے) "ہاں بیٹا آؤ"

(نجمہ دوسرے رنگ کی ساڑھی اور چپلیاں پہنے داخل ہوتی ہے)

(اصغر کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ابا سے)

نجمہ: "میں پھر آؤں گی ابا۔ اس وقت تو آپ ——"

(نجمہ کی طرف دیکھتے ہوئے)

اصغر: "جو شرط آپ نے پیش کی ہے خان بہادر صاحب چند لمحے مجھے اس پر غور کر لینے دیجئے"

مختار: (اس کی بات کی پروا نہ کرتے ہوئے) "نہیں بیٹا نجمہ یہاں آؤ —— یہ میرے ایک نوجوان دوست ہیں اصغر۔ ابکے ای پی سی کے امتحان میں بیٹھے تھے۔ بہت اچھے پرچے کر دئے ہیں۔ انشاء اللہ ضرور کامیاب ہو جائیں گے اور میاں اصغر یہ ہے میری لڑکی نجمہ"

اصغر: (جوش کے ساتھ) "مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی"

نجمہ: (دبی زبان میں) "اور ایسی ہی مجھے بھی"

مختار: "تمہاری امی اس وقت کہاں ہیں بیٹا نجمہ میں ذرا ان سے کہہ آؤں کہ چائے تیار کرا کے بھیج دیں"

نجمہ: "میں کہہ آتی ہوں ابا"

مختار: "نہیں تم ذرا یہاں بیٹھو میں ابھی آیا"

(اندر والے دروازے سے مختار چلا جاتا ہے)

اصغر: "آپ ان کی لڑکی ہیں؟ یہ بات کبھی میرے خیال میں بھی نہ آئی تھی"

نجمہ: "جی ہاں"

اصغر: (خوشی میں) "مجھے آپ پہچانتی ہیں؟"

نجمہ: "کیوں نہیں"

اصغر: (خوشی سے) "خوب!"

نجمہ: "آپ یہاں کیوں آئے تھے اور پھر ابا جی سے دوستی کیسے گانٹھ لی اور یہ شرط کیسی تھی جس پر آپ غور کرنے کے متعلق کہہ رہے تھے"

اصغر: (خوشی کے لہجے میں) "یہ سب کچھ آپ کو ابھی ابھی معلوم ہو جائے گا۔ پہلے آپ یہ بتائیے کہ اگر آپ کے والد صاحب مجھے اپنی غلامی میں لینا چاہیں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا"

نجمہ: (دبی زبان میں) "نہیں۔ بلکہ یہ میرے لئے خوشی کی بات ہوگی"

—:○:—

ظفر واسطی

کرشن چندر سے

نئی زمین، نیا آسماں نئی دنیا
عجیب شئے ہے طلسمِ خیال ہوتا ہے

(یگانہ لکھنوی)

اب کہاں چشمِ تصور سے نکل سکتے ہو
اب مری آنکھیں ہیں اور آپ کے نظارے ہیں

(راسخ دہلوی)

"کرمِ کتابی" از ہوشیارپور

سرِ راہ

تھک گیا ہوں ابھی بڑھتا ہوں ذرا دم لے لوں
راہ آسان نہ ہوگی مجھے معلوم نہ تھا
آس کچھ سوچ کے گھُٹ گھُٹ کے مری جاتی ہے
گل ہوئی جاتی ہے شمعِ تہِ دامانِ سکوں
وہ خوش آیند حسیں خواب جو دیکھے تھے کبھی
جی کا روگ اب تو بڑھائے ہی چلے جاتے ہیں
اجنبی خوف، نئی فکر، نئے اندیشے
جانے کیوں دل میں سمائے ہی چلے جاتے ہیں
پہلے اس درجہ گھنی چھاؤں بھیانک تو نہ تھی
اور کانٹوں سے اٹی راہ کے دونوں جانب
سبز باغ اب بھی سہانے ہیں، سہانے ہوں گے
جیسے معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہر ایک ڈنڈی
کھینچ کر اپنی روش پر لئے جاتی ہے مجھے
پیچ در پیچ سڑک مجھ کو ڈرانے کے لئے
اپنا جال اب بھی بچھائے ہے، مگر جانے دو
اُور وہ دُور، بہت دُور، افق کے نزدیک
اِس قدر دُور کہ نظریں بھی بھٹکی جاتی ہیں
جس کے بعد ایک دھندلکے کے سوا کچھ بھی نہیں
میل کا جیسے نشاں اب بھی نظر آتا ہے
کون پہنچا ہے وہاں، کون وہاں پہنچے گا

مکین احسن کلیم

ہم شاید انگریزوں کی طرح اپنے چہرے کے عضلات کو ساکت وصامت رکھنے میں ماہر بن رہے ہیں۔ ہم اس موقع پر صرف یہ کہنا پسند کریں گے "یہ لو! ڈاک آپہنچی۔ اب شاید چند غیر دلچسپ خطوط کا جواب دینا پڑے گا۔" اور پھر ہم ڈاک کا انتظار کرنے لگیں گے اور اگر اتفاق سے اس ڈاک میں ہمارے نام کا کوئی خط نہ ہوا تو پھر ہمارے دل کے اندر اندر ایک مایوسی کی لہر دوڑ جائے گی اور ہمیں محسوس ہونے لگے گا کہ بس کا ڈاک کا رومان ہی ایک یقینی رومان ہے جو ہمارے لئے باقی رہ گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہر ڈاک کی آمد ہمارے اندر توقع کے ساتھ امنگ اور جوش کی ایک کیفیت پیدا کردیتی ہے اور باوجود اس کے کہ ہم برسوں کسی "مخصوص خط" کا انتظار کرتے رہے ہیں اور ہمیشہ اس کی بجائے کوئی اشتہار یا نوٹس ہی ہمیں ملا کیا ہے پھر بھی امید کا پیدائشی حق ہر ڈاک کی آمد پر عود ہی کر آتا ہے اور ہر ڈاک ہمارے دل کے اندر یہ یقین پیدا کر دیتی ہے کہ آخر کار ہماری زندگی کا ایک "خاص دن" آہی گیا۔ اور اس طرح بس امید ہی امید میں ہم جیئے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ "آخری پیام" ہم تک پہنچ جاتا ہے۔

(لطیف فاروقی)

"سب رس"

فنِ زراعت اور دیوتاؤں کی پُوجا

ہندوستان ایک زراعت پیشہ اور مذہب پرست ملک ہے۔ یہاں قریب قریب ہر کام کا تعلق مذہب سے ہے۔ کسی بھی کام کو دیکھئے آپ کو اس کے ساتھ مذہب کا تعلق نظر آئے گا۔ جب کاموں کو مذہب سے متعلق کر دیا گیا ہے تو انسان کا فرض ہے کہ وہ ہر ایک کام کے ساتھ قادرِ مطلق کو نہ بھولے۔

گیتا میں ایک جگہ کرشن جی نے نصیحت فرمائی ہے کہ "دنیاوی کاموں میں پھنسے ہوئے لوگوں کو چاہئے کہ وہ ہر ایک مقصد کے حصول کے لئے اُس سے تعلق رکھنے والے دیوتا کو یاد کریں۔" اور بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ "لوگوں کو چاہئے کہ وہ دیوتاؤں کو خوش کریں اور دیوتاؤں کو چاہئے کہ وہ انسانوں کو خوش کریں۔"

دنیا کی زندگی کا انحصار کھیتی ہی پر ہے۔ ایک چھوٹے سے چھوٹے آدمی سے لے کر راجہ تک کا تعلق کھیتی سے ہے۔ دنیا میں جتنے بھی کار بار ہیں ان سب کی جڑ کھیتی ہے۔ صرف انسان ہی کیا دنیا میں جتنی بھی مخلوق ہے سب اپنی زندگی کھیتی ہی کے سہارے گزارتی ہے۔

خدا کی دی ہوئی قدرتی چیزوں کے علاوہ انسان کو کھانے اور کپڑے کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ چیزیں کھیتی ہی سے حاصل ہوتی ہیں۔

دنیا کو چلانے کے لئے چار خاص قوتیں ہیں۔ (۱) ہل (زراعت) (۲) قلم (سرسوتی) (۳) روپیہ (لکشمی) اور (۴) لاٹھی (طاقت) ان میں زراعت کا درجہ اوّل ہے۔

مہاراج سری رام چندر جی نے فنِ زراعت کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا اور اس پر باقاعدہ عمل ہوتا تھا۔

(۱) پانچ بیرونی ذرائع۔ یعنی (الف) اچھی جوتائی (ب) اچھی کھاد (ج) اچھا بیج (د) اچھی نکائی اور (ہ) اچھی سینچائی۔

(۲) پانچ اندرونی ذرائع۔ یعنی (الف) اندر (بارش)، (ب) سورج، (ج) زمین (د) ہوا اور (ہ) گنیش کی پوجا۔

بیرونی ذرائع تو بالکل انسان کے ہاتھ میں ہیں لیکن اندرونی ذرائع میں پانچوں دیوتاؤں کی ضرورت پڑتی ہے۔

اندر بھگوان ٹھیک وقت پر پانی برساتے ہیں۔

سورج اپنی کرنوں کے ذریعے کھیتی کو وہ طاقت بخشتا ہے جس سے پیداوار بڑھتی ہے۔

زمین تمام طاقتوں اور غلّہ کو اپنے سینے پر جگہ دیتی ہے۔

ہوا وقت پر بادلوں کو لاتی ہے جس سے بارش ہوتی ہے۔ وہی پودوں کو زندگی دیتے ہیں۔

گنیش جی کھیتی کو سب آفات سے بچاتے ہیں۔ خصوصاً دیمک، چوہے اور دیگر نقصان پہنچانے والے کیڑے مکوڑے وغیرہ سے۔

چنانچہ آج کل جو ملک اس فن میں ترقی کی معراج پر پہنچ چکے ہیں۔ وہاں بھی بیرونی ذرائع پوری ہوشیاری سے استعمال کرنے پر بھی اکثر قحط، خشک سالی، پالا وغیرہ سے فصل چوپٹ ہوجاتی ہے جو اس بات کا پختہ ثبوت ہے کہ بیرونی ذرائع کے ساتھ اندرونی ذرائع کی بھی خاص ضرورت ہے اور تبھی یہ فن مکمل شکل اختیار کرکے اہلِ دیہات کی تمام مصیبتیں دور کرسکتا ہے اور تبھی دیہات جنت بن سکتے ہیں۔

لیکن ہندوستان جیسے زراعت پیشہ ملک میں یہ خرابی ایک تعجب انگیز بات ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ فن زراعت آج جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے وہ جاہل ہیں۔ جس فن کو تعلیم یافتہ اور قابل آدمیوں کے ہاتھوں میں ہونا چاہئے وہ ادنیٰ درجے کے اور جاہل لوگوں کے ہاتھ میں ہے اور ایسی صورت میں اس فن کا زوال تعجب انگیز نہیں ہے۔

قدیم تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرونِ اولیٰ میں جتنے بھی بادشاہ ہوئے ہیں وہ سب اس فن میں طاق تھے اور اس کا انتظام اپنے ہاتھوں میں رکھتے تھے۔ وہ وقتاً فوقتاً دیوتاؤں کو یگیہ، ہون وغیرہ کے ذریعے خوش رکھتے تھے جس سے کبھی بھی قحط خشک سالی، پالا اور بیماری سے کسانوں کو نقصان نہیں پہنچتا تھا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ جب راجہ اتنا مذہبی عالم ہوتا تھا تو رعایا بھی ویسی ہی مذہب پرست ہوتی تھی۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں پانچوں پانڈوں میں ایک بھائی اس فن میں ماہر تھا۔ راجہ جنک نے خود اپنے ہاتھوں ہل چلایا تھا رام راج میں بھی ایسا ہی تھا۔ ان کے راج میں تو کبھی قحط، خشک سالی وغیرہ کی آفت آئی ہی نہیں۔ سب لوگ آرام و اطمینان سے رہتے تھے۔ یہاں تک پتہ چلتا ہے کہ اتنا زیادہ غلہ پیدا ہوتا تھا کہ بہت سا حصہ کھیتوں ہی میں رہ جاتا تھا جو کھاد کا کام دیتا تھا اور دوسرے سال بیج کی بھی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ لیکن آج کل تو ہر چیز کا قحط ہے اور اتنا زبردست قحط ہے کہ اب لوگ صرف زندہ رہنے کے خیال سے آدھا پیٹ کھانا کھاتے ہیں لہٰذا دیہاتوں میں محکمہ دیہات سدھار کی طرف سے اچھے اور اصلاح شدہ بیج اور مالی حالت سدھارنے کے لئے بیج گوداموں اور دھرم گولہ وغیرہ کا اچھی طرح انتظام کردیا گیا ہے اور جہاں نہیں ہوا وہاں زوروں کے ساتھ ہو رہا ہے۔

(اے۔ جی۔ سنگھ)

"ہل"

ہولی

یہ نظم ایک صاحب نے بھیجی ہے اور ان کا کہنا ہے کہ اس کے مصنف بہادر شاہ ظفر ہیں۔ بعض مصرعوں میں سُقم ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ ظفر نے اسے اپنی بیاض میں سیاسی اسباب کی بنا پر نہیں لکھا بلکہ صرف لوگوں کو زبانی سنایا اور سننے والوں نے غالباً ان مصرعوں کو غلط یاد رکھا:—

ہند میں پھاگ مچوری۔ جورا جوری۔
گورن کے تم قمے بنائے توپن کی پچ کاری ۔ سینے پہ کھائیں، ویّں لکھا اوپر ایسی تک تک ماری شور دنیا میں پڑ و رہی۔
خون کے رنگ بنائے سو مارن میں جو جھ پڑوری۔
دنیا چھاڑی سیس کٹایا سائیں دھیان دھروری۔ اصل انہوں ہی کی ہے ہولی۔
ہند کا تختہ چمن کھلا تھا کیسر کی سی کیاری۔
گنگا رام نے ہل دغا کری ہے تخت کا ناس کروری۔ کہاں وہ باغ بہاری۔
دھرمٹ کھائے اُمنڈ گئیں فوجیوں بھوکن کی تھی ماری۔
فیروز شاہ سے بیٹا بھگ گئے نہیں پڑت نظر ہماری —— گئی ہے عقل ہماری۔
بہادر شاہ کا کہنا نہ مانا لوٹ لی چمن ہماری۔

"نیا ادب"

سید عبد اللطیف پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس ہمبرسن روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ ہمایوں ۲۴ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔ صرف سرورق اف ٹون پریس رام نگر، لاہور میں چھپا۔

فہرستِ مضامین

جلد ۴۲ — نمبر ۶

"ہمایوں" بابت ماہِ دسمبر ۱۹۴۲ء

ضروری اطلاع جواب طلب امور کے لئے اپنا پتا لکھ کر جوابی کارڈ اور مضامین کے ساتھ ان کی رسید کی اطلاع یا واپسی کے لئے اپنا [illegible] لفافہ بھیجنا بہت ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر دفتر "ہمایوں" خط و کتابت کا ذمہ دار نہ ہوگا اور ناقابلِ اشاعت مضامین بیرنگ واپس [illegible]

جہاں نما

نازیوں کے عقائد

پروفیسر این. گنگولی سی. آئی. ای نے اپنی کتاب The Mind and Face of Nazi Germany میں نازی جماعت کے عقائد کے متعلق بعض بہت دلچسپ معلومات جمع کی ہیں۔ ان عقائد کا اظہار مختلف موقعوں پر جرمن اکابر کی زبان اور قلم سے ہوتا رہا ہے۔ چند اقتباسات یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

"مسیح اور عیسائیت کی اصل حقیقت کے اظہار کے لئے ایک نیا شارح پیدا ہوا ہے ـــــ اڈولف ہٹلر۔ اڈولف ہٹلر حقیقی روح القدس ہے"۔ (رائش کا وزیر کلیسا)

"خدا یسوع مسیح میں نہیں، بلکہ اڈولف ہٹلر میں ظاہر ہوا ہے"

(ڈاکٹر انجلکے۔ منقول از مانچسٹر گارڈین)

"اس دنیا میں ہمارا ایمان صرف اڈولف ہٹلر پر ہے .... ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ خداوند خدا نے اڈولف ہٹلر کو مبعوث کیا ہے تاکہ جرمن قوت ابدیت حاصل کرلے" (ڈاکٹر لے)

"آئندہ صدیوں میں جب موجودہ حالات کا صحیح جائزہ لیا جائے گا تو لوگ کہیں گے کہ یسوع بڑا تھا لیکن اڈولف ہٹلر اُس سے بھی بڑا تھا" (ولہلم بیکر)

"ممکن ہے ہم دائرۂ انسانیت سے نکل جائیں لیکن اگر ہم نے جرمنی کو بچالیا تو ہم دنیا کا سب سے بڑا کام سرانجام دیں گے۔ ممکن ہے ہم انصاف سے دست بردار ہو جائیں لیکن اگر ہم نے جرمنی کو بچالایا تو ہم دنیا کی سب سے بڑی ناانصافی کا خاتمہ کردیں گے۔ ممکن ہے ہم اخلاق سے گر جائیں لیکن اگر ہم نے جرمنی کو بچالیا تو ہم اچھے اخلاق کے لئے راستہ صاف کردیں گے" (ہٹلر تقریر ۱۹۳۳ء)

"عیسائیت عزتِ نفس کے تصور سے بیگانہ ہے کیوں کہ یہ نہ صرف جسم کو بلکہ روح کو بھی مغلوب کرنا چاہتی تھی" (الفریڈ روزنبرگ)

"عیسائی مذہب کا مقابلہ ضروری ہے کیوں کہ اس کا سرچشمہ یہودیت ہے ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ:ـــ

(۱) کلیسا کو حکومت کسی قسم کی مالی مدد نہ دے۔

(۲) خالص جرمن نسل کے لئے مدارس کھولے جائیں۔

(۳) تمام دینیاتی ادارے بند کر دیئے جائیں۔

(۴) تمام کلیسا اور خانقاہیں بند کر دی جائیں۔

(۵) قبرستانوں میں عیسائی پادریوں کو جگہ نہ دی جائے۔

(۶) فوج کو کلیسا کے اثرات سے محفوظ رکھا جائے۔

(تحریکِ مذہب جرمنی کے ایک رسالے سے ماخوذ)

"ضمیر ایک یہودی ایجاد ہے۔ ختنے کی طرح یہ بھی ایک بدنمائی ہے" (ہٹلر)

"کوئی ایسی بات نہ سنو جو ہم نہیں چاہتے کہ تم سنو

"کوئی ایسی چیز نہ دیکھو جو ہم نہیں چاہتے کہ تم دیکھو۔
"کسی ایسے عقیدے کی پیروی نہ کرو جس کی پیروی ہم نہیں چاہتے کہ تم کرو"
"کوئی ایسا خیال دل میں نہ لاؤ جو ہم نہیں چاہتے کہ تم دل میں لاؤ" (گوئبلز)

"حکومت میں عورتوں کا مستقل دخل دورِ زوال کی علامت ہے" (الفریڈ روزنبرگ)

"عورت کی صحیح جگہ گھر میں ہے۔ اس کا کام تھکے ماندے سپاہی کو آرام دینا ہے۔ عورت کے لئے اس سے بڑا انعام اور کوئی نہیں کہ وہ اپنے بچوں کو جنگ میں بھیج سکے"

(عورتوں کے حقوق کے متعلق ایک جرمن رسالہ)

"میں نے اپنا تعلیمی کام نوعمروں سے شروع کیا ہے۔ ہم بڑی عمر کے لوگ اپنی قوت ختم کر چکے ہیں۔ ہاں ہم ابھی سے بڈھے ہو چکے ہیں۔ ہماری ہڈیوں کا گودا تک بوسیدہ ہو گیا ہے۔ ہم آزاد تحریکاتِ طبعی سے عاری ہو چکے ہیں۔ ہم بزدل اور جذباتی ہیں۔ ہم ایک ذلت آمیز ماضی کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔ ہمارے خون میں غلامی اور محکومی کی دھندلی یاد کی آمیزش ہے۔ لیکن میرے شان دار نوجوان! ہاں دنیا میں کہیں ان سے زیادہ نفیس نوجوان نہیں ہیں۔ ان نوجوان آدمیوں اور لڑکوں پر نظر ڈالو۔ کیا شان ہے۔ میں ان کی مدد سے ایک نئی دنیا تعمیر کر سکتا ہوں۔ میری تعلیم سخت ہے۔ میں اُن کے دل سے کمزوری کا تصور تک نکال باہر کرنا چاہتا ہوں۔ میں ایسی نوجوانی پیدا کرنا چاہتا ہوں جس کے سامنے دنیا دبک کر پیچھے ہٹ جائے گی۔ تیز، باعمل، فاتح، بے باک، تند! مجھے ایسے نوجوانوں کی تمنا ہے۔ جوانی میں یہ تمام خاصیتیں ہونی چاہئیں۔ جوانی کو تکلیف سے بے پرواہ ہونا چاہئے۔ جوانی کو نزاکت اور کمزوری سے کوئی سروکار نہیں۔ میں نوجوانوں کی آنکھوں میں دوبارہ شیر کی سی آزادی اور غرور کی چمک دیکھنا چاہتا ہوں" (ہٹلر)

شادی بذریعۂ تار

حال میں ایک عجیب وغریب شادی ہوئی ہے۔ شادی کے وقت دولھا انگلستان میں تھا اور دلھن لاخ انجلیز میں۔ واقعہ یوں ہے کہ ایک دن لاخ انجلیز کی مس ایرنا بیریبی کو ذیل کا تار ملا:—

"مس ایرنا بیریبی میں آج کے دن سے تمہیں
اپنی جائز منکوحہ بیوی سمجھوں گا۔ جواب دو"

یہ تار سارجنٹ سٹینلے کک کی طرف سے تھا جو امریکی فوج مقیم انگلستان میں ایک عہدہ دار ہے۔ مس بیریبی اس تار کے ملنے پر خوشی سے پھولے نہ سمائی اور اس نے بواپسی حسبِ ذیل جواب بذریعۂ تار بھیجا:—

"سٹینلے کک میں آج کے دن سے تمہیں
اپنا شوہر سمجھوں گی۔"

مابعدِ جنگ کی موٹر کاریں

جنگ کے بعد موٹر کاروں کی وضع کیا ہو گی؟

ایک امریکن اخبار نے لکھا ہے کہ ڈیٹرائٹ کے کارخانۂ موٹر سازی میں مستقبل کی موٹر کار کے متعلق تجویز ہو رہی ہے۔ یہ موٹر کاریں جنگ کے ایک سال بعد فروخت کے لئے تیار ہوں گی۔ ان کی صورت بہیر بہٹی سے ملتی جلتی ہوگی۔ لوہے کے بجائے ان کی ساخت میں زیادہ تر ایلومینیم میگنیشیم اور دوسری ہلکی پھلکی دھاتیں استعمال کی جائیں گی اور ان کا زیادہ سے زیادہ وزن بارہ سو پاؤنڈ ہوگا۔ (آج کل کی موٹروں کا وزن ۲۷۰۰ سے لے کر ۴۲۰۰ پاؤنڈ تک ہوتا ہے) ان موٹر کاروں کے پچھلے حصے میں ہلکے وزن کے انجن لگے ہوں گے جو ہوائی جہازوں کے پٹرول سے چلیں گے پہیے بھی موجودہ پہیوں کے مقابلے میں چھوٹے ہوں گے (۱۳ انچ یا اس سے کم) اس سے ربڑ بھی بچے گا اور موٹر کار کا مرکز ثقل بھی نیچے آ جائے گا۔ ان موٹر کاروں کا ڈھانچ پلاسٹک کا ہوگا اور چھتیں شفاف پلاسٹک کی ہوں گی۔ ان سب باتوں کے باوجود لطف یہ ہے کہ قیمت بھی موجودہ موٹر کاروں کے مقابلے میں بہت کم ہوگی۔

خرابئ صحت کے اسباب

ڈاکٹر ایچ۔ اے۔ کلیگ اپنی کتاب Brush up your Health میں لکھتے ہیں کہ خوش رہنا اچھی صحت کے لئے بے حد ضروری ہے۔ کوئی ڈاکٹر دن میں تین دفعہ خوشی کی خوراک پلانے پر قادر نہیں۔ وہ صرف یہ بتا سکتا ہے کہ اگر آپ غمگین، غیر مطمئن، ترش مزاج اور حاسد بنے رہیں گے تو صحت محض آپ کی خواہش سے آپ کے نزدیک بھی نہیں پھٹک سکتی کیوں کہ مذکورۂ بالا تمام خصائص بُری صحت کو دعوت دیتے اور اُس کی پرورش کرتے ہیں۔ ہر ایسا شخص جو اچھی صحت کی قدر کرتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی ذہنی اور جذباتی حالت کا جائزہ لے۔

حامد علی خاں

منشی دیا نرائن نگم کی رحلت

اُردو کے حلقوں میں یہ خبر انتہائی رنج و اندوہ کے ساتھ سُنی گئی کہ منشی دیا نرائن صاحب نگم بی۔ اے مالک و مدیر رسالۂ "زمانہ" (کان پور) ۲ر نومبر کو اس جہانِ فانی سے رحلت کر گئے۔ اب سے تقریباً چالیس سال پہلے موصوف نے رسالۂ 'زمانہ' جاری کیا جو یقیناً اُردو زبان کے بہترین رسائل میں شمار ہوتا ہے۔ اس رسالے کے ذریعے سے اُردو میں علمی و ادبی معلومات کا اس قدر اضافہ ہوا کہ شاید کوئی اور رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ رسالۂ 'زمانہ' کے علاوہ نگم صاحب نے چند سال سے ایک ہفتہ وار اخبار آزاد بھی شائع کرنا شروع کیا جو اپنی متانت اور طرزِ تحریر کے لحاظ سے لائق تحسین تھا۔ نگم صاحب ایک نہایت نیک نفس اور بے تعصب انسان تھے۔ ہمیں یقین ہے کہ نگم صاحب کے لائق فرزند اُن کی یادگار میں رسالۂ زمانہ اور اخبار آزاد کو برابر جاری رکھیں گے۔

بشیر احمد

اقبال کے کلام میں شیطان کا تصوّر

۱۸۵۷ کی شورش کے بعد جو حالت مسلمانوں کی ہوئی وہ کسی شخص سے پوشیدہ نہیں۔ سیاسی ادبار اقتصادی اور اخلاقی پستی، تعلیمی کمزوری، رجعت پسندی اور تنگ نظری، غرض یہ کہ قومی اور ملی انحطاط کے جو جو اسباب ہو سکتے ہیں وہ سب ہم مسلمانوں میں بدرجۂ اتم پائے ہیں۔ اور یہ حالت بہت دیر تک قائم رہی۔ مسدس حالی میں اسی حالت کا رونا ہے اور مسدس ۱۸۷۹ میں لکھا گیا مگر قوم کچھ ایسی بے پروا ہوتی جا رہی تھی کہ علی گڑھ کی تحریک اور سر سید اور ان کے رفقائے کار جیسے جلیل القدر حضرات کی کوششوں کے باوجود نہ ہم میں اتنی بیداری پیدا ہوئی نہ اتنی قابلیت کہ ہم اپنی پستی کو محسوس کر سکیں۔ چنانچہ ۱۹۱۲ میں جب اقبال مرحوم شمع و شاعر لکھتے ہیں تو انہیں جس چیز کی شکایت ہے وہ یہی بے حسی ہے: کہتے ہیں ؎

پھول بے پروا ہیں تو گرمِ نوا ہو یا نہ ہو
کارواں بے حس ہے آوازِ درا ہو یا نہ ہو

اسی بند کا آخری شعر ہے: ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

اقبال مرحوم ابتدا میں اس بے حسی کی طرف بار بار توجہ دلاتے ہیں۔ انہیں خود مسلمانوں کی ذلت کا بہت احساس ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ اس قوم میں پھر سے زندگی پیدا ہو جائے۔ پہلی چیز جو وہ اس ملی احیاء کے لئے لازمی قرار دیتے ہیں۔ جمعیت ہے۔ شمع و شاعر ہی میں اوّل اوّل جمعیت پر زور دیتے ہیں: ؎

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ جمعیت بذاتِ خود اتنی فائدہ مند نہیں ہو سکتی، اگر مسلمان اپنی حقیقت سے ناآشنا رہا۔ خودداری اور خودشناسی کی تعلیم بھی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ یہیں سے اقبال مردِ مومن کو انسانیت کی معراج بتانے لگتے ہیں۔ کہا ہے: ؎

بے خبر! تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

پھر فرماتے ہیں ؎

کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے

مگر ایک ایسی قوم میں جو اپنی ذلت سے بھی پورے طور پر آگاہ نہ ہو اور جس کے تصور میں عزتِ نفس کا مفہوم تقریباً مٹ چکا ہو جس نے پھر سے خودداری کے پہلے زینے پر بھی قدم نہ رکھا ہو اور جس میں شوق کی فراوانی کجا، کم نظری اور بے حضوری جس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکی ہو یہ توقع کہ ؎

تو اگر خوددار ہے منت کشِ ساقی نہ ہو
عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر

ظاہر ہے بہت کچھ خوش گمانی اور اُمید پرستی پر مبنی تھا۔ چنانچہ کچھ ہی سال بعد کہتے ہیں ؎

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاکِ جادوئے سامری تو قتیلِ شیوۂ آذری

مگر اقبال اپنی قوم سے مایوس نہیں ہوئے تھے۔ خضرِ راہ میں جو غالباً ۱۹۲۱ میں لکھی گئی یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے دریوزہ گری کر کے بھی دیکھ لیا۔ مغرب پرستی بھی کر لی۔ مگر اس کورانہ تقلید سے نہ کچھ ان کی ذہنی ترقی ہوئی اور نہ وہ کچھ ایسی اخلاقی بلندی تک پہنچ سکے خودداری کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ؎

مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست
مورِ بے پر حاجتے پیشِ سلیمانے مبر

مگر اس قدر کہنے کے باوجود، اس قدر امید افزائی کرنے کے بعد بھی علامۂ مرحوم نے محسوس کیا ہوگا کہ وہ ایسی قوم سے مخاطب ہیں جس میں سننے کی خواہش موجود ہے، ہنگامی جوش بھی غائب نہیں ہوا، اپنے علماء سے عقیدت بھی معدوم نہیں ہوئی مگر جس کے ذہن میں حرکت نہیں۔ عمل کی توفیق ابھی دوبارہ پیدا نہیں ہوئی، جس کی روح ابھی بیدار نہیں ہوئی۔ شاید انہوں نے یہ بھی محسوس کیا ہو کہ ان کا پیغام ابھی لوگوں پر پوری طرح واضح نہیں ہوا۔ ابھی وہ کچھ غیر معیّن سا ہے۔ شاید ہم لوگوں کے لئے اس سے بھی صریح الفاظ اس سے بھی قطعی انداز کی ضرورت ہے۔ چنانچہ طلوعِ اسلام میں فرماتے ہیں: ؎

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
حنابندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے

یہاں مسلمان کو معمارِ جہاں بتایا ہے۔
پھر فرماتے ہیں: ؎

یقیں محکم عمل پیہم۔ محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

یہاں زندگی کو ایک جہاد سے تعبیر کرتے ہوئے مسلمان کو پیہم عمل کی تلقین کرتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے: ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

عمل ہی زندہ رہنے کا راز ہے۔ سکون ہمیں جمود کی طرف لے جاتا ہے۔ اور اطمینان بے حرکتی کا پیش خیمہ ہے۔ میرے خیال میں حضرتِ اقبال ابھی تک مسلمان کو اجتماعی حیثیت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک جماعت کا فرد ہے اور ایک رشتہ میں منسلک ہے۔ اس کے لئے ربط وضبط لازم ہے۔ اس کی ترقی جماعت کی ترقی ہے۔ یہاں تک اقبال کا تصور ملی ہے مسلمان بے شک رازِ کن فکاں ہے۔ مگر اقبال اسے خودشناسی کی طرف اس لئے راغب کرتے ہیں کہ وہ خودی کا راز داں بن کر خدا کے حکم کی ترجمانی کرے۔ مسلمان کی انفرادی اہمیت ابھی تک واضح نہیں ہوئی۔ بہ حیثیت انسان کے ابھی اس کی تکمیل باقی ہے۔ اب ان کا خطاب مسلمان کے بجائے آدم سے ہے۔ یہ نہیں کہ آدم کا تصور مسلمان کے تصور سے مختلف ہے۔ فرق یہ ہے کہ آدم اب بنی نوعِ انسان کے نمائندہ کی حیثیت سے ایک نشان کا کام دیتا ہے۔ اقبال نے اپنے تخیل کی دنیا میں افراد اور جماعتوں سے

گزر کر قوتوں کو بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کے سامنے اب ساری کائنات ہے وہ اس عالمِ آب و گل سے گزر کر اب سببِ تخلیق، مدعائے زندگی، حیات، ممات، حقیقت ایسے فلسفیانہ مسائل کے سمجھنے سمجھانے میں منہمک نظر آتے ہیں۔

سب سے اول وہ زندگی کو حرکت سے، تپش سے، سوز سے تعبیر کرتے ہیں۔ قیام ان کے نزدیک موت سے مترادف ہے۔ فرماتے ہیں: ؎

دمادم نقش ہائے تازہ ریزد — بیک صورت قرارِ زندگی نیست
اگر امروزِ تو تصویرِ دوش است — بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

اس زندگی میں قرار انسان پر حرام ہے، اور اس کی منزل بہت دور ہے۔ فرماتے ہیں: ؎

مگو از مدعائے زندگانی — ترا بر شیوہ ہائے او نگہ نیست
من از ذوقِ نظر آنگونہ مستم — کہ منزل پیشِ من جز سنگِ رہ نیست

مگر یہ لامتناہی سفر آسانی سے طے نہیں ہو سکتا: ؎

کسے کو دردِ پنہانے ندارد — تنے دارد و لے جانے ندارد
اگر جانے ہوس داری طلب کن — تب و تابے کہ پایانے ندارد

مگر فقط بے اندازہ تب و تاب ہی انسان کو آسانی سے منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتی۔ کیوں کہ یہ راہ پُرخطر ہے۔ یہ منزل کٹھن ہے۔ یہاں سینکڑوں قافلے راہ کی دشوار گزاری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکے۔ حیاتِ جاوداں اندر ستیز است تو درست ہے مگر اس جنگ کے لئے جرأت اور بے خوفی اور ہمت کی اشد ضرورت ہے۔ یہاں کش مکش ہی زندگی کا جوہر ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کش مکش کی ابتدا کیسے ہوئی؟ اور اگر خدائے قدوس ہی اس کائنات کا خالق و مالک ہے تو کس چیز سے کش مکش ہے؟ یہ سعیٔ پیہم کیا شے ہے؟ یہ راہرو اور منزل کا جھگڑا کیوں ہے؟ انسان کیا تسلیم و رضا کا بندہ نہیں؟ اس خاکی میں یہ آگ کہاں سے آئی؟ اور اگر بقول حضرت اقبال کا یہ قول صحیح ہے کہ: ؎ رازِ حیات جوئی جز در تپش نیابی — در قلزم آرمیدن ننگ است آب جو را

تو اس تپش سے کیا مراد ہے؟

اقبال کے نزدیک ان سب باتوں کا آغاز انکارِ ابلیس سے ہوا۔ لفظ ابلیس قرآن مجید میں کئی بار آیا ہے ابلیس 'بلس' سے مشتق ہے۔ بلس کے معنی ہیں نا امیدی، ابلیس یعنی جسے رحمتِ الٰہی سے نا امیدی ہو۔ ابلیس کے لئے لفظِ شیطان بھی آیا ہے۔ شیطان نکلا ہے شطن سے جس کے معنی ہیں ورغلانے کے۔ شیطان یعنی ورغلانے والا۔ گمراہ کرنے والا۔ گویا ابلیس اور شیطان ایک ہی شخصیت کے دو پہلو ہیں۔ اقبال مرحوم نے بھی ابلیس کے دو پہلوؤں سے بحث کی ہے مگر ابلیس کی شیطنت کا رخ علامۂ اقبال کے آخری دور کے اشعار میں نمودار ہوا ہے۔ علامہ اپنے دورِ پختگی میں اس پہلو سے بہت کم بحث کرتے ہیں۔ بلکہ یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وسطی دور میں جو ابلیس کا تصور ہے اس میں ذم کا پہلو موجود نہیں۔ میں نے بھی اپنی بحث میں یہی ترتیب ملحوظ رکھی ہے۔ آدم کی تعمیر میں اگرچہ عشق جزوِ اعظم کی حیثیت سے موجود تھا مگر یہ عشق ابھی خدا آشنا نہ تھا۔ مضمر ضرور تھا مگر اپنی قوتِ تسخیر سے آگاہ نہ تھا۔ ابھی اس میں تڑپ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ابھی وہ اس سطحِ آب کی طرح تھا جو ہموار ہے جس میں ابھی شکن نہیں، پڑی جو لہروں کی شورش سے بے خبر ہے اور طوفان کی لذت سے ناآشنا۔ ابھی اس کی تخلیقی قوتیں سوئی پڑی تھیں، آدم میں روح ڈال دی گئی تھی مگر ابھی اس میں جان نہیں پڑی تھی۔ ابھی ہر طرف سکون تھا۔ آدم کے حق میں یہ سکون شاید جمود بن کر رہ جاتا اگر کائنات میں ابلیس کے انکار سے ہل چل نہ پڑ جاتی۔ ابلیس نے اقبال کے نزدیک تکبر سے انکار نہیں کیا اس کا انکار دراصل ایک قسم کا افہام ہے۔ اس کا انکار سلبی نہیں حقیقتہً اثباتی ہے۔ وہ 'تپش' کا خلش کا سوز کا مظہر ہے۔ خدا سے اس کا دعویٰ ہے: ؎

پیکرِ انجم نہ تو گردشِ انجم ز من — جاں بجہاں اندرم زندگیٔ مضمرم
تو بہ بدن جاں دہی شور بجاں من دہم — تو بہ سکوں رہ زنی من بہ تپش رہبرم
آدمِ خاکی نہاد دوں نظر و کم سواد
زاد در آغوشِ تو پیر شود در برم

اس کا ایمان ہے: — زندگیٔ سوز و ساز بہ ز سکونِ دوام — فاختہ شاہیں شود از تپشِ زیرِ دام

وہ آدم سے کہتا ہے: — تو نہ شناسی ہنوز شوقِ بمیرد ز وصل — چیست حیاتِ دوام سوختنِ ناتمام

وہ زندگی کے خلاف نہیں ہے بلکہ وہ زندگی کو متنوع اور رنگین بناتا ہے۔ ابلیس کی شخصیت میں تخریب کا کوئی بھی پہلو موجود نہیں۔ وہ تعمیر کا اصول ہے، اس کی موجودگی سے کائنات میں زندگی کی دمک اور جینے کا لطف ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ علامۂ اقبال ابلیس کو جد و جہد کی علامت سمجھتے ہیں۔ فرماتے ہیں: —

مزی اندر جہانِ کور ذوقے — کہ یزداں دارد و شیطاں نہ دارد

اس سے یہ مراد نہیں کہ شیطان خدائے تعالیٰ کا حریف ہے۔ بلکہ شیطان یہاں اُس بے اطمینانی کا نشان ہے جس کی وجہ سے زندگی میں خلش اور کائنات میں جوشِ نمو ہے۔ وہ یہاں اس طاقت سے مترادف ہے جو ہمیں کسی ایک حالت سے کلی طور پر مطمئن نہیں ہونے دیتی، جو ہمیں ہر وقت کسی اور حالت کی طرف اکساتی رہتی ہے جو ہمیں سکون کی برودت سے نکال کر زندگی کی شاہراہ پر لاکھڑا کرتی ہے ایسی شاہراہ جو ستاروں سے آگے نکل جاتی ہے اور خودی کی منزلوں کو طے کرکے انسان کو خدا کے قریب تر کردیتی ہے۔ جو مخلوق کو خلاق بنا دیتی ہے۔

آدم نے برکاتِ الٰہیہ کو اپنا حق سمجھ کر قبول کرلیا تھا۔ اس حالت میں نہ اس میں استفسار کی جرأت ہو سکتی تھی اور نہ جستجو کی لگن۔ کمال اس کے نزدیک ہر آرزو کا انجام اور ہر خواہش کا جواب تھا۔ مگر ایک جوہر اس میں ایسا موجود تھا جس کے صحیح استعمال سے، جس کے درست اطلاق سے اس کے خصائص عالیہ چمک سکتے تھے۔ یہ لذتِ طلب یہ سوزِ عشق جس نے انسان میں بیدار کیا اس اشارہ کا نام ابلیس ہے۔

عشق ہی سے اس عالم کو بقا ہے یہ نہ ہو تو عالم راکھ کا ایک ڈھیر ہے۔ عشق ہی مذہب کی جان ہوتی ہے عشق ہی سے ایمان کی شان بڑھتی ہے۔ فرماتے ہیں: —

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق — عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

ساتھ ہی کہتے ہیں: — صدقِ خلیل بھی ہے عشق صبرِ حسین بھی ہے عشق — معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

اس عشق کو زندگی سے وہی نسبت ہے جو خودی کو عشق سے۔
کہا ہے: — جوہرِ زندگی ہے عشق جوہرِ عشق ہے خودی
اور خودی کے متعلق فرماتے ہیں: —

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات، — خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات

اگر خودی کو بیداریٔ کائنات سے تعبیر کیا جائے تو اس بیداری کا نشان یعنی SYMBOL ابلیس کی شخصیت ہے۔ وہ خود کہتا ہے: —

می تپد از سوزِ من خونِ رگِ کائنات — من بہ دو صرصرم من بہ غو تندرم

ابلیس کا انداز حضرتِ اقبال کے ان اشعار سے صریحی طور پر مترشح ہوتا ہے۔ جبریل جو تسلیم کا پیکر ہے اور کائنات میں

اطاعت وقبولیت کی مثال ہے ابلیس سے پوچھتا ہے: ؎

ہمدمِ دیرینہ! کیسا ہے جہانِ رنگ و بو

ابلیس جواب دیتا ہے: سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو

جبرئیل جس کی حیثیت خدا کی سیکرٹریٹ میں فقط چیف سیکرٹری کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ پھر اس سے کہتا ہے۔ ؎

کھو دیئے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو؟

اور ملاحظہ ہو کہ جبرئیل کی ابلیس سے شکایت یہ ہے کہ اس نے جاہ و حشمت کی قدر نہ کی اور اسی کی وجہ سے فرشتوں کی شرافت پہ حرف آگیا۔ گویا فرشتوں کا مطمحِ نظر بھی فقط عز، جاہ کی خواہش اور آبرو داری پر مشتمل ہے۔ مگر ابلیس کی بے غرضی اور بلند نظری ملاحظہ فرمائیے۔ کہتا ہے ؎

ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پُو!
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر
کون طوفان کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تُو؟
خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جُو بہ جُو
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہُو
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہُو اللہ ہُو اللہ ہُو!

خودی کا یہ مبلغِ اعظم انسان کے حق میں مسیحائی کرتا ہے۔ حضرت عیسیٰ نے تو بمطابقِ انجیل اپنی جان دے کر عیسائیوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کیا۔ ابلیس نے اپنے انکار ہی سے آدم کے دل کو درد سے آشنا کر دیا۔ اور اُسے فراق کا خوگر بنا دیا کیوں کہ بقولِ علامۂ مرحوم ؎ عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق وصل میں مرگِ آرزو! ہجر میں لذتِ طلب!

یہ سوز یہ فراق یہ شوق محض جستجوئے ناکام نہیں۔ اس میں ایک تعمیری پہلو بھی مضمر ہے۔ خدا خود آدم سے کہتا ہے: ؎

زندۂ! مشتاق شو خلّاق شو ہمچو ما گیرندۂ آفاق شو

پھر کہتا ہے: ؎ ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست پیشِ ما جز کافر و زندیق نیست

خودی کی منزلوں کو طے کرنے والے آدم میں ایک وثوق پیدا ہو جاتا ہے، اس کی باتوں میں اک وقار جلوہ گر ہوتا ہے۔ وہ اپنی صنعت گری سے واقف ہے ذرا علامۂ مرحوم کا محاورہ مابین خدا و انسان ملاحظہ فرمائیے: خدا کہتا ہے: ؎

جہاں را ز یک آب و گِل آفریدم تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولادِ ناب آفریدم تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی نہالِ چمن را
قفس ساختی طائرِ نغمہ زن را

انسان کا جواب خود اعتمادی سے مملو ہے۔ کہتا ہے: ؎

تو شب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

ذرا ان اشعار کا مقابلہ 'انکارِ ابلیس' سے کیجئے ان میں سے چند شعر میں پہلے بھی سنا چکا ہوں۔ وہاں ابلیس خدا سے کہتا ہے۔

پیکرِ انجم ز تو گردشِ انجم ز من — جاں بجہاں اندرم زندگیٔ مضمرم
تو بہ بدن جاں دہی شور بجاں من دہم — تو بہ سکوں رہ زنی من بہ تپش رہبرم

محاورۂ مابین خدا و انسان میں جو آدم کا جواب ہے اس میں ابلیس کے الفاظ کی بو آتی ہے —— وہی لہجہ ہے وہی انداز ہے۔ مگر یہاں بھی آدم یا انسان خدا کی برابری نہیں کر رہا اور نہ وہ خدا پر اپنی برتری ہی جتا رہا ہے۔ مراد ان اشعار سے یہ ہے کہ خودی جس کی تعمیر میں بقولِ اقبال خدائی کا راز پنہاں ہے مخلوق کو خلاق بنا دیتی ہے خلاق بن کر ہی انسان اپنی تخلیق کے صحیح مقصد تک پہنچتا ہے۔ جب میلادِ آدم کے موقع پر فطرت کو پریشانی ہوئی یعنی :-

فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور — خودگرے خود شکنے خودنگرے پیدا شد

تو ابلیس نے آدم سے یہ کہا تھا :-

قطرۂ بے مایۂ ، گوہرِ تابندہ شو — از سرِ گردوں بیفت گیر بدریا مقام
تیغِ درخشندۂ جانِ جہانے گسل — جوہرِ خود را نما آئے بروں از نیام

اسی خود شناسی کی طرف ابلیس اشارہ کرتا ہے۔ اسی خود شناسی، خودگری کا ارتقا ہی ہم "محاورۂ مابین خدا و انسان" میں دیکھتے ہیں۔

اب رہی انکارِ ابلیس کی ماہیت۔ اقبال کے نزدیک ابلیس نے خدا کی حکم عدولی ضرور کی مگر درپردہ اس نافرمانی میں بھی اک راز ہے۔ جاوید نامہ میں رومی کے سوال کے جواب میں کہ وہ کیوں ابھی تک انکار پر مصر ہے۔ ابلیس کہتا ہے :-

درگذشتم از سجود اے بے خبر — ساز کردم ارغنونِ خیر و شر
از وجودِ حق مرا منکر مگیر — دیدہ بر باطن کشا ظاہر مگیر
من 'بلے' در پردۂ 'لا' گفتہ ام — گفتۂ من خوشتر از ناگفتہ ام
تا نصیب از دردِ آدم داشتم — قہرِ یار از بہرِ او نگزاشتم
شعلہ ہا از کشتِ زارِ من دمید — او زِ مجبوری بہ مختاری رسید

اس خود اختیار کردہ کام کی تکمیل آدم کے ہاتھ میں ہے۔ آدم کا ذہنی ارتقا اس امر کا متقاضی ہے کہ وہ ابلیس کا دست نگر نہ رہے۔ بلکہ اقبال کے نزدیک یہی ایک وجہ ہے جس کے باعث ابلیس ابھی تک منکر ہے۔ یہی ایک بندش ہے جو اسے اس کے مقام سے دور رکھ رہی ہے۔ وہ خود آدم سے کہتا ہے :-

تو نجاتے دِہ مرا از نارِ من — واکن اے آدم گرہ از کارِ من
اے کہ اندر بندِ من افتادۂ — رخصتِ عصیاں بشیطان دادۂ
در جہاں با ہمتِ مردانہ زی — غم گسارِ من ز من بیگانہ زی
بے نیاز از نیش و نوشِ من گذر — تا نہ گردد نامہ ام تاریک تر

صاحبِ پرواز را افتاد نیست
صید اگر زیرک شود صیاد نیست!

یہاں انسان کے لئے ابلیس پہلی دفعہ صید کا لفظ استعمال کرتا ہے مگر یہ نہ بھولئے کہ اسی صید کو وہ غم گسارِ من بھی کہتا ہے۔ ظاہر ہے اس کی حیثیت ایک عجیب قسم کے شکاری کی سی ہے۔ جو دشمنی کے پردے میں دوستی کرتا ہے۔ وہ ایک رہبر اور مخلص کی حیثیت سے آدم کو سوز و سازِ زندگی کی تعلیم دیتا رہا ہے۔ یہاں اقبال کے ابلیس ہیں اور F. Thompson کے Hound of Heaven میں بہت کم فرق دکھائی دیتا ہے۔ اسی ابلیس نے آدم کو خودی کا درس دیا ہے وہی اسے جمود سے متنبہ کرتا ہے وہی عشق و فراق کی لگن سے آدم کے سینے میں نہ بجھنے والی آگ سلگاتا ہے۔ اس کی زندگی عبارت ہے کائنات کی پوشیدہ طاقتوں کے ظہور اور بر روئے کار آنے سے۔ آدم کائنات کی ایک قوت ہے۔ اس قوت کے لئے لازمی تھا کہ وہ اپنے آپ کو پہچانے اور پھر اس عشق کی بدولت جسے اقبال مرحوم: ؎ عشق دمِ جبرئیل عشق دلِ مصطفےٰ
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام
کہتے ہیں۔

انسان اپنے ارتقا کے مراحل طے کرے۔ ابلیس کا کام دنیا میں اس وقت ختم ہوتا ہے جب آدم ابلیس کی مدد سے بے نیاز ہو جائے۔ اس وقت تک ابلیس کو آدم کی جستجو رہے گی جب تک آدم کمال تک نہیں پہنچتا۔ اس وقت تک آدم ابلیس کا شکار ہے۔

مگر انسان اپنے عشق اور خودی کے سرمایہ کے باوجود اس درجے تک جہاں اس کی نگاہ تلوار کا حکم رکھتی ہے بہت مشکل سے پہنچتا ہے۔ عام طور پر وہ اپنی پست ہمتی اور بے ذوقی کی وجہ سے اس قابل نہیں کہ ابلیس کے لطف اور اس کی توجہ کا مستحق ہو۔ وہ سینۂ بول ہے۔ ابلیس کے لئے ایسا حریف چاہئے جس میں انکار کرنے کی جرأت ہو جو خودی کے مدارجِ اولیٰ سے گزر چکا ہو جو خود اپنی تقدیر ہو۔ یہ مدِ مقابل جو نہ ابلیس کی مدد کا محتاج ہے اور نہ اس سے خوف ہی کھاتا ہے اقبال کا مردِ مومن ہے۔ وہ جس میں ایمان کی حرارت نے سب وسوسے جلا کر فنا کر دیئے ہیں اور جو ہمت میں بلند نظری میں بے مثل ہے۔ وہ جس کے متعلق اقبال مرحوم فرماتے ہیں:-

جچتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں جبریل و سرافیل کا صیاد ہے مومن

ابلیس کو شکایت ہے تو اس بات کی ہے کہ باوجود اتنی کوشش کے آدم میں مردِ غازی کی سی جگر تابی نہیں پیدا ہوئی۔ خدا سے فریاد کرتا ہے: ؎

اے خداوندِ صواب و ناصواب
من شدم از صحبتِ آدم خراب
ہیچ گہ از حکمِ من سر بر نتافت
چشم از خود بست و خود را در نیافت
خاکش از ذوقِ ابا بیگانۂ
از شرارِ کبریا بیگانۂ
صید خود صیاد را گوید بگیر
الاماں از بندۂ فرماں پذیر
فطرتِ او خام و عزمِ او ضعیف
تابِ یک ضربم نیارد ایں حریف
بندۂ صاحب نظر باید مرا
یک حریفِ پختہ تر باید مرا
ابنِ آدم چیست؟ یک مشتِ خس است
مشتِ خس را یک شرار از من بس است
اندریں عالم اگر جز خس نبود
ایں قدر آتش مرا دادن چہ سود؟
شیشہ را بگداختن عارے بود
سنگ را بگداختن کارے بود
منکرِ خود از تو می خواہم بدہ
سوئے آں مردِ خدا راہم بدہ
بندۂ باید کہ پیچد گردنم
لرزہ اندازد نگاہش در تنم

اے خدا ایک زندہ مرد حق پرست
لذتے شاید کہ یابم در شکست

یہاں تک ابلیس وہی ابلیس ہے جو کائنات کا اصولِ حیات ہے۔ وہ حرکت کا عمل کا شوق کا جستجو کا نشان ہے۔ وہ اقبال مرحوم کے نظریۂ حیات کا ماحصل ہے۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ابلیس بھی بوڑھا ہوگیا۔ قرآن مجید کی آیت بے شک صحیح ہے: کل من علیہا فان۔ یہی ابلیس جو اپنے انکار پر فخر کرتا تھا اور جس کی جواں ہمتی کا راز ہی خود اعتمادی، خود شناسی اور خودی میں تھا اقبال کی شاعری کے دورِ آخر میں ضعفِ دل کے عارضے میں مبتلا ہوگیا۔ آدم تو اس کی تعلیم سے مردِ مسلمان بن جاتا ہے اور خود ابلیس روز بروز مسلمان سے کافر ہوتا جاتا ہے۔ مسلمان میں تو آہستہ آہستہ تمام ابلیسی صفات موجود ہوتے جا رہے ہیں مثلاً مردِ مسلمان کی تعریف سنیئے:۔

افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش ‏ ‏ خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے ‏ ‏ دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان
جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم ‏ ‏ دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان!

مگر اسی کتاب یعنی ضربِ کلیم میں ایک نظم بعنوان تقدیر میں ابلیس اور یزداں کا مکالمہ ابلیس کے زوال پر کافی روشنی ڈالتا ہے: غور سے سنیئے:۔

ابلیس کہتا ہے:۔ اے خدائے کن فکاں مجھ کو نہ تھا آدم سے بیر
آہ! وہ زندانیٔ نزدیک و دور و دیر و زود

یہاں تک ہم اس میں وہی پرانی خو بو دیکھتے ہیں مگر دیکھیئے اس کے ساتھ ہی کیا کہتا ہے:۔

حرفِ استکبار تیرے سامنے ممکن نہ تھا ‏ ‏ ہاں مگر تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود

یزداں پوچھتا ہے:۔ کیا کھلا تجھ پر یہ راز؟ انکار سے پہلے کہ بعد؟

بوڑھا ابلیس جواب دیتا ہے۔ ذرا اس کی رجعت پسندی ملاحظہ ہو۔ کہتا ہے:۔

بعد! اے تیری تجلّی سے کمالاتِ وجود

یزداں فرشتوں کی طرف، ان جی حضوریوں کی طرف دیکھ کر افسوس کے ساتھ کہتا ہے:۔

پستیٔ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجّت اسے
کہتا ہے 'تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود'
دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام
ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دُود

اب ایک اور دلچسپ بات کا ظہور ہوتا ہے وہ آدم جسے ابلیس نے درسِ آزادی دیا تھا جو ابلیس سے وہی نسبت رکھتا تھا جو مرید کو مرشدِ کامل سے ہوتی ہے اپنے عرفان اور اپنی تکمیل کے بعد ابلیسِ پیرانہ سال سے یوں ہمکلام ہوتا ہے جیسے ایک ہمسر دوسرے سے۔ ملاحظہ ہوں ارمغانِ حجاز سے یہ چند رباعیاں:۔

بگو ابلیس را از من پیامے ‏ ‏ تپیدن تا کجا در زیرِ دامے
مرا ایں خاکدانے خوش نیاید ‏ ‏ کہ صبحش نیست جز تمہید شامے

اب ذرا ستم ظریفی بھی ملاحظہ ہو، دوسری رباعی میں کہتے ہیں:

جہاں تا از عدم بیروں کشیدند — ضمیرش سرد و بے ہنگامہ دیدند
بغیر از جانِ ما سوزے کجا بود — تر از آتش ما آفریدند

اور پھر ذرا چھیڑ:

جدائی شوق را روشن بصر کرد — جدائی شوق را جوئندہ تر کرد
نمیدانم کہ احوالِ تو چون است — مرا ایں آب و گل از من خبر کرد

اب جس وقت حضرتِ انسان نے ابلیس پر ثابت کر دیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے ہم پلہ ہیں۔ تو ابلیس کے سامنے ایک تجویز پیش کی جاتی ہے۔ جیسے ایک دوست دوسرے دوست کے سامنے پیش کرتا ہے:

بیا تا نرد را شاہانہ بازیم — جہانِ چار سو را در گداز یم
بافسونِ ہنر از برگِ کاہش — بہشتے ایں سوئے گردوں بسازیم

خیر یہ تو دوست داری تھی۔ مروت انسانی صفات میں بڑا رتبہ رکھتی ہے۔ اب ایک اور مشکل آن پڑی۔ ابلیس تو موجود تھا ہی اب اس کی ذریات بھی اس خاکدان میں سرگرم عمل نظر آتی ہے۔ حضرتِ اقبال اصل و نقل میں تمیز کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں سے ابلیس کا دوسرا پہلو نمایاں ہونے لگتا ہے۔ ابلیس اپنی شیطنت سے مجبور ہو کر انسان کو پرکھتا ہے۔ اسے امتحان میں ڈالتا ہے۔ اسے اُبھرنے کی رغبت دیتا ہے اگرچہ جو اُبھرتے نہیں انہیں جہنم کا ایندھن بنانے کے لئے اپنے دام میں جکڑ لیتا ہے۔ یہ تو ہے شیطان کی انسان سے ٹکر۔ مردِ مسلمان سے اس کا مقابلہ، مگر اس کا کیا علاج کہ شیاطینِ خاکی بھی کسی نہ کسی بھیس میں اس دنیا میں موجود ہیں۔ اور اکّے دکّے راہ گیر کو پھانس لیتے ہیں۔ عام طور پر کم ہمت اور کور ذوق بندوں کو۔ مگر ان کا وجود پھر بھی طبعِ غیور کے لئے ناگوار ہے۔ اس لئے اقبال مرحوم فرماتے ہیں:

بشر تا از مقامے خود فتاد است — بقدرِ محکمی اور اکشاد است
گنہ ہم می شود بے لذتِ وسرد — اگر ابلیس تو خاکی نہاد است

پھر کہا ہے:

مشو نخچیرِ ابلیسانِ ایں عصر — خساں را غمزۂ شاں سازگار است
اصیلاں را ہماں ابلیس خوش تر — کہ یزداں دیدہ و کامل عیار است

ابلیس کی قدر و قیمت فقط ایک مردِ مسلمان ہی جان سکتا ہے۔ وہ جس کے نعرہ سے کائنات میں زلزلہ پڑ جاتا تھا۔ پیرانہ سالی کے باوجود ابھی تک اپنی وضع داری پر قائم ہے۔ وہ شعلہ مزاج نہیں، اس میں ان خاکی شیطانوں کی سی بدی نہیں۔ وہ شاہیں ہے اسے زاغ سے زغن سے کوئی نسبت نہیں۔ اس کا مرتبہ ذیل کی رباعی سے ظاہر ہوتا ہے: کہتے ہیں:

حریفِ ضربِ او مردِ تمام است — کہ آں آتش نسب والا مقام است
نہ ہر خاکی سزاوارِ نخ اوست — کہ صید لاغرے بروے حرام است

مگر ابلیس کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ یا یوں کہئے کہ اقبال کے تصور میں دو ابلیس ہیں۔ ایک جس کی وجہ سے کائنات میں سوز ہے، تڑپ ہے، زندگی ہے جو اصلِ حیات ہے۔ اور ایک وہ جو تاریکی اور جہالت، غلامی اور جمود کی علامت ہے۔

یہ دوسرا ابلیس ہی ہے جو فخریہ یہ کلمات کہہ سکتا ہے:

میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب — میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں
میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا — میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

یہ اشعار میں "ابلیس کی مجلس شوریٰ" سے لے کر پڑھ رہا ہوں۔ ذرا ان اشعار کا مقابلہ اس ابلیس کی گفتار سے کیجئے جو خدا سے

کہتا ہے :-

رابطۂ سالمات، ضابطۂ امہات   سوزم و سازم و ہم آتش مینا گرم

یہ ابلیس دینیات کا ابلیس ہے۔ یہ شیطان ہے۔ اس کے مشیر بھی شیطنت سے پر ہیں۔ یہ انسان کے دشمن ہیں، یہ واقعی درپئے آزار ہیں۔ کوئی نیشتر ہے کوئی نیش زن۔ پہلا مشیر کہتا ہے :-

یہ ہماری سعیٔ پیہم کی کرامت ہے کہ آج   صوفی و ملا ملوکیت کے بندے ہیں تمام
طبعِ مشرق کے لئے موزوں یہی افیون تھی   ورنہ قوالی سے کچھ کمتر نہیں علمِ کلام

ذرا انہیں اشتراکیت سے ڈر ہے۔ کارل مارکس کے لائحہ عمل سے پریشان ہیں۔ تیسرا مشیر حیران ہے۔ کہتا ہے :-

روحِ سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب   ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب
وہ کلیمِ بے تجلی! وہ مسیحِ بے صلیب   نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

مگر چوتھا مشیر اسے تسلی دیتا ہے کہتا ہے :-

توڑ اس کا رومۃ الکبریٰ کے ایوانوں میں دیکھ   آلِ سیزر کو دکھایا ہم نے پھر سیزر کا خواب

پانچواں مشیر سردار سے ہدایت طلب کرتا ہے۔ کہتا ہے :-

اے ترے سوزِ نفس سے کارِ عالم استوار   تو نے جب چاہا کیا ہر پردگی کو آشکار
تجھ سے بڑھ کر فطرتِ آدم کا وہ محرم نہیں   سادہ دل بندوں میں جو مشہور ہے پروردگار
گرچہ ہیں تیرے مرید افرنگ کے ساحر تمام   اب مجھے ان کی فراست پر نہیں ہے اعتبار
وہ یہودی فتنہ گر، وہ روحِ مزدک کا بروز   ہر قبا ہونے کو ہے اس کے جنوں سے تار تار

میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

مگر ابلیس مطلقاً ہراساں نہیں۔ وہ انسان کی شورہ پشتیوں سے پوری طرح واقف ہے اس کا نظام بہت مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔ وہ مغرور یوں اپنے رفقا کو تسلی دیتا ہے :-

ہے مرے دستِ تصرف میں جہانِ رنگ و بو   کیا زمیں کیا مہر و مہ کیا آسمانِ تو بتو
دیکھ لیں گے اپنی آنکھوں سے تماشا شرق و غرب   میں نے جب گرما دیا اقوامِ یورپ کا لہو
کیا امامانِ سیاست کیا کلیسا کے شیوخ   سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہو
کیا ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد   یہ پریشاں روزگار، آشفتہ سر آشفتہ مُو
ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے   جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

یہ اور ابلیس ہے یہ انسان کو کامل نہیں بنانا چاہتا۔ یہ اسے شوق کی مستی سے آگاہ نہیں کرتا یہ اسے خودی کی تیغِ جوہر دار سے مسلح نہیں کرتا یہ انسان کو مردِ مومن نہیں دیکھنا چاہتا یہ بندہ کو خدائی صفات سے آراستہ نہیں کرتا یہ بندۂ مومن سے خائف ہے۔ وہ ابلیس روشنی کا پرتو تھا، یہ ابلیس ظلمت کا پیکر۔ وہ جستجو کا داعی تھا تو یہ شکست کا حامی، وہ روحِ کائنات تھا اور یہ دشمنِ زندگی۔ اُس کا وجود انسان کے لئے مشعلِ ہدایت، اس کی ہستی انسان کے حق میں سمِ قاتل۔ کہتا ہے :-

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں   ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف   ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

الحذر آئین پیغمبر سے سو بار الحذر　　حافظ ناموس زن، مرد آزما، مرد آفریں

مگر خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ نام نہاد مومن محروم یقین ہے۔ یہ الہیات میں الجھا ہے تو خوب ہے کہتا ہے:

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسم شش جہات　　ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات

اپنے مشیروں کو حکم دیتا ہے تم اسے دینی مسائل کے گورکھ دھندے میں پھنسا رہنے دو۔

تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے　　تا بساط زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام　　چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہان بے ثبات

ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر　　جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

اس ابلیس میں مذہبی شیطان کی تمام خصوصیات نسلی موجود ہیں۔ اس ابلیس سے ہم جس دنیا میں دوچار ہوتے ہیں وہ بھی عالم سفلی ہے۔ اس دنیا کی فضا کثیف ہے۔ اس میں پرواز مشکل ہے۔ اس ہوا میں مرد مومن کا دم گھٹتا ہے۔ اس کا پانی زہر ہلاہل سے بدتر ہے۔ مگر کائنات کی تصویر میں یعنی روشنی اور سایہ کے اس مرقع میں جہاں اس ضیا ریز تصور کی ضرورت ہے وہاں اس کثیف حقیقت کی جگہ بھی ہے۔ علامہ اقبال نے جو مسلمانوں کی بے حسی اور ان کے جمود سے برانگیختہ ہو کر ہمارے لئے ایک اصول زندگی متعین کرنا چاہتے تھے۔ واقعی ابلیس اوّل کے تصور سے ہمارے لئے ایک درخشاں مثال وضع کی ہے۔ مگر شاید ہمارے مادی تاثرات اور ہمارا مادی تخیل ان کی گہری نگاہ سے پوشیدہ نہیں تھا۔ اس لئے جہاں انہوں نے کائنات کے جوہر عالیہ سے بحث کی وہاں اس کی ضد کے اظہار سے بھی گریز نہیں کیا۔ مگر ان کے تخیل کا شاہکار، کائنات کا اصل ہیرو ابلیس اوّل ہے ابلیس ثانی نہیں۔

سید فیاض محمود

تین شہر اور تین شعر

۱۔ شیراز

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنّت نخواہی یافت　　کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلےٰ را!

حافظ

۲۔ بمبئی

"بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنّت نخواہی یافت"　　کنار آب چوپاٹی و گلگشت اپالو را!

شبلی

۳۔ ہوشیار پور

"بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنّت نخواہی یافت"　　کنار آب شکمیا باد و گلگشت نلویاں را

راحل

"رہرو"

رات اَور دِن

ظلمتوں کی خلائے بے پایاں
خامشی کی زباں میں نغمہ کناں!

زندگی پر سرور طاری ہے
خواب انگڑائیاں سی لیتے ہیں!
نرم پا۔ ڈولتے۔ خنک جھونکے
نیند کی کشتیوں کو کھیتے ہیں!

کھیت مدہوش۔ وادیاں خاموش
پربتوں پر سکوتِ ہیبت ناک!
گاہے گاہے اُبھر کے مٹتا ہوا
اِک ٹٹیری کا نغمۂ بے باک!

جھاڑیوں میں یہ جگنوؤں کے ہجوم
راکھ کے ڈھیر میں شرارے سے!
جھرنوں سے جھانکتے ہوئے تارے
پھیلے پھیلے سے، پیارے پیارے سے!

دفعتہً کانپنے لگا منظر
میرے احساس نے پھریری لی
زندگی کی غنودہ آنکھوں میں
دھندلی سی شمع جھلملانے لگی!

چار سُو گھومتی لپکتی ہوئی
کیسی مبہم سی سنناہٹ ہے!
میری تنہائی سے اُلجھتا ہوا
کون آیا ہے، کس کی آہٹ ہے؟

خشک پتوں کا شور تھا شاید
یا خیالوں نے اپنے پَر جھاڑے!
کون لیکن لپکتا آتا ہے
یہ مری روح پر منظر گاڑے؟

رات کی ظلمتیں سمٹ سی گئیں
خامشی کا طلسم ٹوٹ گیا
تھم گئے ہیں سفینے نیندوں کے
نغمۂ سازِ زندگی گونجا!

اُف، یہ تغیر کا انوکھا کھیل!
اُف، مشیت کا یہ اٹل قانون!
ایک کی موت، دوسرے کی حیات!
ہے سحر کی شراب، رات کا خون!

ظلمتوں کا وہ کارواں ہے رواں
خامشی کی زباں میں نوحہ کناں!

احمد ندیم قاسمی

آرفی اُس

آرفی اُس دیوتاؤں کے عیش و عشرت کی سرزمین تھریس میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ اپالو تھا۔ یعنی سورج دیوتا، جو موسیقی اور راگ کا بھی دیوتا ہے۔ اور ماں دیوتاؤں کی ایک حسین خادمہ کیلی اوپی۔ اپالو نے اپنے ننھے بچے کو ایک ستار دیا اور خود بجانا سکھایا۔ تھوڑے ہی عرصے میں ملک تھریس کے جنگلوں کی رہنے والی ہستیاں درختوں کے سبز پتوں اور لمبی گھاس میں سے نکل کر اور غاروں اور چٹانوں کے پیچھے سے برآمد ہو کر اس بچے کی نازک انگلیوں سے نکلے ہوئے نغمے سننے لگیں۔ جب وہ ستار بجاتا۔ فاختہ کی اپنے رفیق کو بلانے کی آواز، کوئل کی کوکو، بلبل کا چہچہانا، سب آوازیں یک لخت بند ہو جاتیں۔ ہوائیں جو درختوں کے ساتھ راز و نیاز میں مشغول ہوتیں تھم جاتیں اور مغرور سے مغرور جنگلی درندے چُپ ہو جاتے۔ کوئی انسان یا جانور اس کی موسیقی کے اثر سے بچ نہ سکتا تھا۔ وہ شام کا راگ بجاتا تو تمام دنیا سو جاتی۔ صبح کا راگ بجاتا تو پھول ایک دم کھل جاتے۔ خواب آلود گلاب کی کلیاں اپنی مخملیں پتیاں کھول کھول کر جھانکنے لگتیں اور تمام فضا اس کے نکالے ہوئے سُروں سے بھری ہوئی معلوم ہوتی۔ اگر وہ جنگی ترانہ بجاتا تو جنگل کے سوئے ہوئے ظالم اچھل کر کھڑے ہو جاتے اور غصے کے دانت دکھانے لگتے۔ تھریس کے نوجوان اپنے بزرگوں کی طرف جنگ کرنے کی اجازت لینے دوڑتے اور پرانے جنگجو ہاتھ کے انگوٹھے سے اپنی تلواروں کی دھاریں آزمانا شروع کر دیتے۔ جب اُس کا ستار بجنے لگتا تو گویا پتھروں اور چٹانوں میں بھی حرکت پیدا ہو جاتی یا تمام کائنات ایک مجسم دل بن جاتی جو موسیقی کی لَے کے ساتھ دھڑکنے لگتا تھا۔

آرفی اُس جوان ہوا تو جہاں اُس کی موسیقی کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیل چکی تھی۔ وہاں اُس نے حسین یوریڈیسی کے دل پر بھی فتح پا کر اسے اپنا کر لیا تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ دنیا بھر کی خوشیاں ان میاں بیوی کے حصے میں آئیں گی۔ لیکن گو ہائمن یعنی شادی کے دیوتا نے خود آکر اپنے ہاتھ سے ان کا رشتہ جوڑا، اُس روز آسمانی علامات ان کے موافق نہ تھیں اور ہائمن کی مشعل میں سے سنہری روشنی کے ساتھ ساتھ سیاہ دھواں بھی نکل رہا تھا۔

چند دن میں نتیجہ برآمد ہو گیا۔ کیوں کہ ایک روز جب دلہن اپنی سہیلیوں کے ساتھ جنگل میں آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ ایک جاہل گڈریا جسے معلوم نہ تھا وہ کون ہے، اسے اکیلے پا کر اس کے پیچھے بھاگا۔ وہ خوف کے مارے آگے آگے بھاگی جا رہی تھی اور یہ نہ دیکھ سکتی تھی کہ اس کے قدموں کے سامنے کیا ہے۔ اتفاقاً اس کا خوبصورت پیر ایک سانپ کے اوپر پڑا۔ سانپ نے اُسے کاٹ لیا۔ تھوڑی دیر میں اس کی روح سایوں کی سرزمین کی طرف پرواز کر گئی۔ اور آرفی اس کو دل شکستہ چھوڑ گئی۔

وہ غمگین ہوائیں جو رات کو سمندر پر چلتی ہیں، وہ سسکیاں لے کر چلنے والی آندھیاں جو ٹوٹے ہوئے جہازوں اور موت کی خبر دیتی ہیں، وہ پرندے جو اندھیرے میں اپنے گم شدہ جوڑوں کو آوازیں دیتے ہیں اور وہ غم انگیز آہیں جو سیاہی مائل نیلے شمشاد کے درختوں میں سے اٹھتی ہیں، سب خاموش ہو گئیں۔ کیوں کہ ان سب سے زیادہ دلگیر کرنے والی، ان سب سے زیادہ حسرت بھری، سایۂ موت کی وادی میں ایک ٹوٹے ہوئے دل کی صدا تھی جو آرفی اُس کے ستار میں سے نکل رہی تھی۔

کیلی اوپی CALLIOPE. تھریس THRACE. آرفی اُس - ORPHEUS.

ہائمن HYMEN - یوریڈیسی EURYDICE.

دیوتا اور انسان سب پر ان درد بھرے نغموں کا اثر ہوتا تھا۔ لیکن اظہارِ غم سے آرفی اُس کے دل کو تسکین نہیں ہوتی تھی۔ آخر کار جب یہ غم ناقابلِ برداشت ہوگیا تو وہ خراب و خستہ ٹھوکریں کھاتا کوہ اولمپس پہ پہنچا اور زیوس دیوتا سے اپنی بیوی کو دوسری دنیا میں جاکر تلاش کرنے کی اجازت مانگی۔ زیوس نے اس کے حال پہ رحم کھاکر اجازت تو دے دی لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ راستہ بہت خطرناک ہے۔ بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا۔

لیکن آرفی اُس کی محبت خوف سے ناآشنا تھی۔ وہ روانہ ہوگیا اور بڑی تلاش کے بعد جہنم کے دروازے پر پہنچ گیا۔ جہاں اس کا تین سروں والا محافظ کتا سربرس خوف ناک آواز سے بھونکتا ہوا ایک وحشی درندے کی طرح آرفی اُس پہ جھپٹا۔ لیکن آرفی اُس نے اپنے ستار کے تاروں کو چھوا۔ کتا حیران سا ہوکر خاموش ہوگیا۔ آرفی اُس ستار بجاتا رہا اور کتا اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں وہ جھلک پیدا ہوگئی جو ہماری دنیا کے کتوں کی آنکھوں میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ اپنے مالک کو دیکھتے ہیں۔ آرفی اُس اسی طرح ستار بجاتے بجاتے دروازے میں داخل ہوگیا۔

جہنم کی تاریک گہرائیوں میں ستار کی آواز ایک نئی چیز تھی۔ اور پھر آرفی اُس کے ہاتھ کے بجائے ہوئے ستار کی! جس کے نغموں میں کامل محبت، نہ ختم ہونے والی آرزو، اور موت تک سے نہ مٹنے والا درد بھرا ہوا تھا۔ راستے میں دائمی سزا یافتہ ہستیاں ملیں۔ یعنی ایک شخص جو پیاس سے مجبور، کانٹے دار زبان اور سوکھے ہوئے ہونٹوں سے ہر وقت ندی میں سے پانی پینے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ لیکن ہونٹوں کے قریب آتے ہی ندی پرے ہٹ جاتی تھی۔ دوسرا جس کا کام ایک بڑے پتھر کو جو بیسوں گھنٹے لڑھکاتے رہنا تھا۔ تیسرا جس کے زخمی سینے میں سے ایک گدھ ہر وقت، بوٹیاں نوچ نوچ کر کھاتا تھا۔ چوتھے چند لڑکیاں جو ہر وقت ایک چھلنی میں سے پانی نکالتے رہنے کی سزا بھگت رہی تھیں۔ یہ سب لوگ اپنے اپنے کام چھوڑ کر ستار کی آواز سننے لگے اور سزا دینے والی بلائیں اپنی عمر میں پہلی دفعہ اتنی متاثر ہوئیں کہ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

اسی طرح ستار بجاتے ہوئے آخر کار آرفی اُس جہنم کے گورنر پلوٹو اور اس کی ملکہ پراسرپائن کے تخت کے سامنے جا پہنچا۔ وہ دونوں سر سے پاؤں تک سیاہ لباس پہنے نہایت خوف ناک رعب و داب کے ساتھ تخت پر جلوہ افروز تھے اور قسمت کے احکام تقسیم کرنے والی تین کنیزیں ان کے قدموں میں تخت کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھیں۔ ستار بج رہا تھا اور اس میں سے دنیا بھر کی تمنائیں، زمانے بھر کا غم، زمانۂ گزشتہ کی ناکامیاں اور زمانۂ آئندہ کی امیدیں نغموں کی شکل میں نکل نکل کر جہنم کی اندھیری فضا میں پھیلتی جا رہی تھیں۔

ملکہ پراسرپائن کے دل میں ان دنوں کی یاد آنے لگی جب وہ ایک بے فکر لڑکی تھی اور جزیرۂ سسلی میں سمندر کے کنارے کھیلتی پھرا کرتی تھی۔ اس کی ناک میں موسم بہار کے تازہ پھولوں کی خوشبو کا احساس ہونے لگا اور وہ غم تازہ ہوگیا جو اب ایک مدت سے تقریباً بھول چکا تھا۔ یعنی اندھیرے کے بادشاہ اور جہنم کے گورنر پلوٹو کا اس کو اپنے پیارے عزیزوں اور خوش گوار زندگی میں سے یک لخت زبردستی اُٹھا لانا۔ وہ اپنے درشت رُو خاوند کے پہلو میں خاموش بیٹھی تھی لیکن آنکھوں کو ارد گرد کی چیزیں دھندلی دکھائی دینے لگی تھیں۔

آخر ایک کانپتی ہوئی آہ کے ساتھ ستار کی آواز رُک گئی اور آرفی اُس نے اپنی استدعا پیش کی۔ یعنی اس کی بیوی یوریڈیسی، اس کی آرزوؤں کا حاصل، اس کی خوشی، اس کی زندگی، اس کو واپس دی جائے تاکہ وہ اسے اپنے ساتھ دوبارہ آسمانی دنیا

OLYMPUS دیوتاؤں کے رہنے کا مقام - ZEUS دیوتاؤں کا باپ - CERBERUS. FURIES سزا دینے والی بلائیں

PLUTO. PROSERPINE. SICILY. FATES قسمت کے احکام تقسیم کرنے والیاں -

کی روشن فضا میں لے جائے۔

پلوٹو اور پراسر پائن ایک دوسرے سے آنکھیں نہیں ملا سکتے تھے۔ تاہم ان کا جواب متفقہ تھا۔ یوریڈسی اسے واپس مل جائے گی۔ لیکن اس شرط پر کہ جب تک وہ روئے زمین کی روشنی میں نہ پہنچ جائیں آرفی اس پیچھے مڑ کر اس چہرے پر نظر نہ ڈالے جسے دیکھنے کے لئے اس کا دل اتنا مشتاق تھا۔ آرفی اس نے نہایت شوق سے یہ شرط منظور کر لی اور اس کی خوشی کی کوئی حد نہ تھی جب اس نے یوریڈلسی کو بلائے جانے کا حکم سنا۔ وہ واپس مڑا اور ان چھوٹے چھوٹے نازک پاؤں کی مترنم چاپ اپنے پیچھے سنتے ہوئے دنیا کی طرف روانہ ہوا۔ اسے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آتا تھا۔ کیا واقعی وہ اس کے پیچھے آرہی تھی ــــــ؟ وہی ــــــ؟ یوریڈلسی ــــــ؟ تو گویا ان دونوں کے خوشی کے دن ختم نہیں ہو گئے تھے ــــــ اور اس کی محبت اپنی محبوبہ کو اندھیرے کی دنیا سے بھی نکال لائی تھی ــــــ؟ اب وہ اس سے وہ تمام باتیں کہے گا جن کے کہنے کا اس سے پہلے موقع نہ ملا تھا۔ ان کے ملاپ میں جو خامیاں پہلے رہ گئیں تھیں انہیں دور کر دے گا۔ کیا وہ اتنی نزدیک تھی کہ اگر وہ اپنا ہاتھ بڑھائے تو اُسے چھو سکتا تھا۔؟

اب اس کے دل میں ایک خوف پیدا ہوا۔ پہلے کم تھا لیکن رفتہ رفتہ زیادہ ہوتا گیا۔ کہا پلوٹو نے اس کو دھوکا تو نہیں دیا تھا ــــــ؟ ایسا تو نہیں کہ یوریڈلسی کی بجائے کوئی اور ہستی اس کے پیچھے چلی آرہی ہو ــــــ ہنسی اڑانے کے لئے۔ مذاق کرنے کے لئے ــــــ؟ جوں جوں وہ روئے زمین کی طرف چلتا گیا یہ شک بڑھتا گیا۔ بعض اوقات خیال ہونے لگا کہ پاؤں کی چاپ سنائی دینا بند ہو گئی ہے اور جب وہ روشنی میں پہنچے گا تو پیچھے کوئی نہ ہو گا ــــــ وہ پھر اکیلا رہ جائے گا ــــــ تمام محنت بیکار جائے گی ــــــ آخر شبہ اتنا مضبوط ہو گیا کہ یہی اصلیت معلوم ہونے لگی ــــــ

اندھیرا دور ہو رہا تھا لیکن ابھی شام کا سا دھندلکا باقی تھا جب زمین پر لمبے لمبے سائے ہوتے ہیں کہ آرفی اس کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا ــــــ

اس نے جلدی سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کی بیوی چلی آرہی تھی۔ لیکن صرف ایک لمحے کے لئے نظر آیا کہ وہ اسے آغوش میں لینے کے لئے باہیں پھیلا رہی ہے ــــــ کسی نے یک لخت اسے پشت کی طرف اندھیرے میں کھینچ لیا۔ دور سے آواز آئی الوداع! ــــــ الوداع ــــــ! اور خاموشی چھا گئی۔

آرفی اس نے دیوانہ وار اس کے پیچھے جانے کی کوشش کی۔ لیکن جن مرحلوں پر سے اول مرتبہ وہ جوش میں گزر گیا تھا۔ ان میں سب سے پہلا ہی اب راستے میں حائل تھا۔ یعنی طوفانی سیاہ رنگ کے پانی والا بدبودار دلدل نما دریا ایکران جس کے کنارے پر کشتی کے پاس اس کا بڈھا ملاح شیراں حسب معمول کھڑا تھا۔ اس سے جب آرفی اس نے پار لے جانے کو کہا تو شیراں نے یہ کہہ کر دھتکار دیا کہ "جاؤ۔ جاؤ ــــــ! اپنا رستہ پکڑو ــــــ! اس کشتی پر وہی لوگ جا سکتے ہیں جنہیں واپس نہ آنا ہو ــــــ"

سات دن اور سات راتیں آرفی اس اس دریا کے کنارے پڑا رہا کہ شاید شیراں کو رحم آجائے۔ لیکن بے سود۔ آخر کار وہ اپنا ستار لے کر تھریس کے جنگلوں میں واپس آگیا اور پہلے کی طرح اس ستار کی درد بھری صدا درختوں میں گونجنے لگی۔

ایک دن وہ ایک دریا کے کنارے بیٹھا جنگل کی خاموشی میں ستار بجا رہا تھا کہ دور سے شور و غل سنائی دیا جس نے ستار کے نغمے کو اس طرح قتل کر دیا جس طرح چیل کی آواز بلبل کے گیت کو بیکار کر دیتی ہے۔ یہ بیکس یعنی شراب کے

Acheron. Charan. Bacchus. Baccantes.

دیوتا کی دعوت کا دن تھا۔ اور دیوتا مع اپنی بے حیا سہیلیوں کے، نشے میں چور تھا۔ دوست درختوں میں سے بھاگتے اور شور مچاتے چلے آ رہے تھے۔ ان لڑکیوں کو آرفی اُس سے مدت کا بَیر تھا۔ کیوں کہ اس ناکام عاشق کے کان ہمیشہ ان کی مست آوازوں سے بے بہرہ اور آنکھیں ان کے ناچتے ہوئے نیم برہنہ جسموں سے بے اثر رہتی تھیں۔ انہوں نے آکر پہلے آرفی اُس پر پتھر پھینکے اور ان سے کوئی نتیجہ نہ نکلا تو غصے اور شراب سے مغلوب ہو کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے دریا میں پھینک دیا۔

کوہ اولمپس کی دیویوں نے رحم کھا کر آرفی اُس کی لاش کے ٹکڑے جمع کرائے اور انہیں پہاڑ کے دامن میں دفن کرا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس علاقے کی بُلبُل جس قدر میٹھی آواز سے گاتی ہے دنیا میں اور کسی ملک کی بُلبُل نہیں گاتی کیوں کہ وہ اس محبت کا راگ گاتی ہے جو غیر فانی ہے اور جو سب سے طاقت ور چیز یعنی موت پر بھی فتح پا سکتی ہے۔

عطاء الرحمٰن

انتظار

بہار گزر بھی گئی
اور ہم اُس کا انتظار کرتے رہے
لیکن وہ نہ آئی۔
چاندنی رات میں ہم پھر اُس باغ میں گئے
جہاں وہ ہمارے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔
ہم نے اُن پھولوں کو چُن لیا
جنہیں وہ بکھیر گئی تھی۔
اور ایک مالا بنا کر
بید مجنوں کی شاخ پر لٹکا دیا۔
تاکہ جب وہ آئے تو اُسے پہنا دیں۔
لیکن رات بہت گزر گئی
اور ہم اُس کا انتظار کرتے رہے
اور وہ نہ آئی۔
چاند درختوں کے پیچھے سے مسکرا رہا تھا
لیکن ہماری آنکھوں میں آنسو تھے۔
اپنے ننھے ننھے ہاتھوں کو آسمان کی طرف اُٹھا کر
ہم نے ستاروں سے پوچھا
کیا وہ ہم سے روٹھ گئی ہے؟
کیا اُسے ہماری دنیا سے نفرت ہو گئی ہے؟

"گردشِ فلک"

تنہا راتیں

محرمِ خوابِ محبت مری تنہا راتیں
وہ مرے عشق کی جنّت، مری تنہا راتیں
تابہ ہنگامِ سحر، سلسلۂ راز و نیاز
شانۂ گیسوئے فرقت مری تنہا راتیں
ہائے، وہ عالمِ تنزیلِ پیاماتِ حبیب
معنئ عشق کی صورت مری تنہا راتیں
بوئے محبوب، ہم آغوشِ پیامِ محبوب
خلدِ رنگینی و نکہت مری تنہا راتیں
آہ وہ حسنِ تصوّر وہ جمالِ تنہا
غازۂ عارضِ خلوت مری تنہا راتیں
غمِ دوراں نے جھلک بھی نہیں دیکھی جن کی
وہ امینِ غمِ الفت مری تنہا راتیں
وسعتِ شوق سے ایک ایک نفس لامحدود
سربسر جنّتِ فرصت مری تنہا راتیں
وہ حجاباتِ لطیف اور وہ انوارِ لطیف
وہ لطافت ہی لطافت مری تنہا راتیں
عشرتِ عشق کے آنچل میں چھپائے ہوئے رُخ
چہرہ افروزِ مسرت مری تنہا راتیں
کبھی خاموشئ انجم سے حکایت پرداز
اور کبھی خود ہی حکایت مری تنہا راتیں
اب وہ شب ہائے پُر اسرار کہاں سے لاؤں
خواب وہ اے دلِ بیدار کہاں سے لاؤں

روش صدیقی

تجلّیات

کیف و سرور و نور ہے رنج و غم و تعب نہیں
میرے جہانِ شوق میں اب تو کہیں بھی شب نہیں
چھایا ہوا ہے روح پر کیف و سرورِ جاوداں
شاہد و نغمہ گر نہیں، جامِ مئے طرب نہیں
حسن تو بے قرار ہے لطف و کرم کے واسطے
عشق ہے بے نیاز اب، اس کو غمِ طلب نہیں
تُو ہے قرارِ قلب و جاں، تُو ہے بہارِ شادماں
تیرے بغیر بے کلی روح کی بے سبب نہیں
دل ہو ہزار خوں ہی خوں، لاکھ ہو شورشِ جنوں
تیرے حضور ہے سکوں، شور نہیں، شغب نہیں
مجھ میں ترا ظہور ہے، پھر بھی تُو مجھ سے دُور ہے
تیرے بغیر کب ہوں میں، تجھ سے بغیر کب نہیں!!
بادۂ عشق کیا ملا، دولتِ دو جہاں ملی
مستِ الست کو اثرؔ کوئی بھی اب طلب نہیں

اثر صہبائی

قیصر

ایک مجلسی تمثیل

[ایک نیم روشن کمرہ! کمرے کے وسط میں دیوار کے قریب دو خانے والی ایک میز رکھی ہے۔ میز پر ایک لیمپ جس کا شیڈ ایک جانب جھکا ہوا ہے۔ اندھیری جانب ایک پلنگ نظر آرہا ہے جس پر کوئی کپڑا اوڑھے لیٹا ہوا ہے۔ روشن جانب دو کرسیاں پڑی ہیں۔ میز پر اور اُس کے نیچے کے خانے میں دوا کی چھوٹی بڑی متعدد شیشیاں۔ تسلا، اگالدان، گلاس، پیالی وغیرہ، نرسنگ کا جملہ ضروری سامان رکھا ہوا ہے۔
روشن جانب میز سے دور ہٹ کر ایک پلنگ بچھا ہوا ہے جس پر ابھی تک پلنگ پوش پھیلا ہوا ہے۔
رات کے دس بج چکے ہیں۔ قیصر اور انور کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ دونوں کے ذہن اپنے اپنے خیالات کا پیچھا کر رہے ہیں اس لئے خاموشی طاری ہے۔ قیصر چھریرے بدن کی لڑکی ہے۔ کوئی اٹھارہ برس کا سن ہوگا!...... شکل وصورت بالکل معمولی ہے لیکن چند باتیں بالکل واضح ہیں۔ ناک اور ٹھوڑی خود اعتمادی کا پتا دیتی ہیں۔ ساتھ ہی رخسار کا آنکھوں کی جانب اوپر کو کبھی کبھی کھنچ جانا بتاتا ہے کہ زندگی میں کچھ تلخیاں بھی سہی ہیں۔ پیشانی سے ذکاوت ٹپکتی ہے۔ اعضا کی معمولی سی حرکت بھی بہت کچھ بتانا چاہتی ہے اس لئے وہ حسن پیدا ہو جاتا ہے جسے انداز کی شوخی کہتے ہیں۔ آنکھوں میں ایک خاص مقناطیسی چمک ہے جس کی برابری آئینہ کی قلعی بھی نہیں کرتی۔ اور اب وہ جسے چاہیں شیشہ میں اتار لیتی ہیں۔ انور ایک خوبصورت جوان ہے۔ آنکھیں ڈاکٹری کی موٹی موٹی کتابیں پڑھتے پڑھتے پھیکی پڑ چکی ہیں۔ دُہرا جسم ہے اور سینہ چکلا۔ چہرے پر خاصا اچھا گوشت چڑھا ہوا ہے شاید اس وجہ سے کہ اپنی غذا میں پروٹین، ہائیڈرو کلورائیڈ وغیرہ کا ٹھیک امتزاج قائم رکھتا ہے۔ حرکات میں ذرا سا بھونڈا پن ہے اور بات کرنے میں ذرا سی جھجک!]

قیصر۔ (خاموشی توڑتے ہوئے) جائیے۔ آپ تو جا کر سو جائیے (میز پر رکھی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے) رات زیادہ ہوگئی ہے۔

انور۔ اور تم؟

قیصر۔ میں بھی سو ہی جاؤں گی!

انور۔ لیکن کب؟

قیصر۔ آپ تو جرح کرنے لگے!

انور۔ تم ہمیشہ غلط سمجھتی ہو!

قیصر۔ (ایک عارفانہ انداز میں زیر لب مسکراتی ہے اور انور کی نظروں سے چھپانے کے لئے پلنگ کی طرف گردن کرکے) اب تشویش کی تو کوئی ایسی بات نہیں؟

انور۔ نہیں۔ رات آرام سے گزر جائے گی۔ میں نے خواب آور دوا دے دی ہے۔

قیصر۔ نقصان تو نہیں کرے گی؟

انور۔ میں تمہارے (لفظ "تمہارے" کو سارے فقرے کا مرکز بناتے ہوئے) والد کو ایسی دوا دے سکتا ہوں؟.... قیصر تمہیں یہ شبہ ہو سکتا ہے؟

قیصر۔ ("تمہارے" سے سرشار) نہیں!...... (مضطرب لہجہ میں) لیکن مجھے ڈر سا لگتا ہے۔

انور۔ آخر کیوں؟

قیصر۔ آپ جانتے ہیں ابا جان کا دل بہت کمزور ہے!

انور۔ (خاطر جمع کے لئے) یہ تو کچھ تسکین ہی دے گی۔ (قیصر کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر) معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہماری خاندانی کمزوری ہے۔

(ایک پر معنی ہلکا سا قہقہہ لگاتا ہے جس کا مفہوم قیصر فوراً تاڑ جاتی ہے اور فطری طور پر شرماتی ہے)

قیصر (تجاہلِ عارفانہ) جی ہاں۔ چچا جان بھی تو کمزوریٔ قلب

ہی کے مریض تھے اور یونہی یک بیک ایک دن ہارٹ فیلیر
سے (کچھ اس طرح منہ بناتی ہے کہ "چل بسے" کا مفہوم
ادا ہو جاتا ہے)

انور۔ ہاں!

قیصر۔ آپ کو تو بہت رنج ہوا ہوگا!

انور۔ کیوں نہیں۔ باپ جیسی نعمت سر سے اٹھ جائے اور رنج نہ ہو

قیصر۔ (محزونیہ) اور جب میں سوچتی ہوں ۔۔۔۔۔۔!

انور۔ کیا؟

قیصر۔ یہی کہ ابّا جان کے بعد جب اس دنیا میں میرا کوئی نہ رہے گا
۔۔۔۔ تو ۔۔۔۔ تو میرا سر چکرانے لگتا ہے۔

انور۔ (مخاطب کرتے ہوئے) قیصر!

قیصر۔ (چونک کر) کیوں کیا ہے؟

انور۔ (جھجکتے ہوئے) میں تم سے کچھ ۔۔۔۔ کہنا چاہتا تھا ۔۔۔۔
کئی دن سے!

قیصر۔ تو اب کہہ دیجئے (لیکن اٹھ کر میز کے پاس چلی جاتی ہے)

انور۔ پہلے یہاں آ کر بیٹھو!

قیصر۔ (ایسا لہجہ جو خود ایک دعوت ہے) توبہ! آپ میرا کیا
کیجئے گا؟

انور۔ میں ۔۔۔۔ میں تمہیں ۔۔۔۔ تم کو ۔۔۔۔

قیصر۔ (ایک سہمیں قہقہہ کے ساتھ) ارے آپ تو ہکلانے لگے
۔۔۔۔۔۔ وہ بات ایسی کیا ہے؟

انور۔ (چڑ کر) جاؤ۔ نہیں کہتے ۔۔۔۔ تم مذاق اڑاتی ہو!

قیصر۔ (مناتے ہوئے) نہیں۔ کہہ بھی دیجئے ۔۔۔۔ اچھا!
اب نہیں ہنسوں گی!

انور۔ تو آؤ۔ یہاں بیٹھو۔ تب کہوں گا۔

قیصر۔ اس میں وہاں آ کر بیٹھنے کی آخر کیا ضرورت ہے؟

انور۔ (جھوٹ موٹ) تم کھڑی کھڑی تھک جاؤ گی!

قیصر۔ میں ایسی نازک تو نہیں کہ گھڑی بھر میں تھک جاؤں۔

انور۔ لیکن اگر بات گھنٹوں کی ہو تو؟

قیصر۔ (نخوت سے گردن ہلاتے ہوئے) جانیے! آپ بھی کیسی
باتیں کرتے ہیں!

انور۔ میں گھسیٹ کر تمہیں یہاں بٹھاؤں گا!

قیصر۔ میں چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لوں گی۔

(انور کھڑا ہوتا ہے اور قیصر کی طرف بڑھتا ہے)

قیصر (دو قدم پیچھے ہٹ کر) شی! ابّا جان جاگ جائیں گے۔

(انور رک جاتا ہے اور اندھیری جانب نیچے پلنگ کی طرف
دیکھتا ہے لیکن کوئی حرکت ہوتی نہ دیکھ کر)

انور۔ (معترفانہ) تم کیسی بلا کی تیز ہو قیصر!

قیصر۔ (شوخی سے) ہوں تو سہی ۔۔۔۔ لیکن ۔۔۔۔ آپ جتنی
نہیں!

انور۔ سچ!

قیصر۔ آپ کی قسم!

انور۔ (ہنس کر) میری قسم!

قیصر۔ اچھا وہ بات کیا تھی جو آپ کہہ رہے تھے۔ کہہ رہے تھے
اور ہکلا رہے تھے (ہلکا سا قہقہہ)

(انور قیصر کی طرف بڑھتا ہے اور قیصر کرسیوں کی آڑ لیتی
ہے)

قیصر۔ اور جس کے لئے بلا کر پاس بٹھا رہے تھے (چڑانے کو
ہنستی ہے)

(انور قیصر کو پکڑنے ایک کرسی کے پیچھے پہنچتا ہے تو قیصر
دوسری کرسی کے پیچھے آ جاتی ہے)

قیصر۔ اور پھر جس کے لئے خود پکڑنے آ رہے تھے (کھلکھلا کر
ہنستی ہے)

انور۔ لیکن اب تو پکڑ کر ہی چھوڑوں گا!

قیصر۔ پکڑیئے تب جانیں۔

انور۔ اچھا تو پکڑوں؟

قیصر۔ (قہقہہ لگا کر) اور اب تک کیا کر رہے تھے؟

(انور اس بار کرسی کو ایک طرف لڑھکا کر قیصر کو پکڑ ہی
لیتا ہے۔ قیصر ہلکی سی چیخ مارتی ہے کہ اندھیری جانب
پلنگ پر ابّا جان کروٹ لیتے ہیں اور خفیف سی ہائے
سنائی دیتی ہے۔ قیصر بوکھلا سی جاتی ہے اور انور
ایک طرف کرسی کے پیچھے کھڑا ہو جاتا ہے۔ ابّا جان

کا منہ روشنی کی جانب ہے۔ پیشانی پر ان گنت جھریاں ہیں اور آنکھوں کے گرد گہرے گہرے خوفناک سیاہ حلقے۔ رخسار پچکے ہوئے ہیں اور باچھیں بہت ہی جھکی ہوئیں۔ ابا جان کپڑے میں سے ہاتھ نکال کر اپنے بالوں پر پھیرتے ہیں۔ بیوی ذرا اوپر کو چڑھتی ہیں اور آہستہ سے اپنی بیٹی کو آواز دیتے ہیں)

ابا جان۔ بیٹی!...... بیٹی قیصر!

قیصر۔ (حواس درست کرتے ہوئے) جی.... ابا جان!

ابا جان۔ یہ کیسی آواز ہوئی تھی؟..... کیا گرا تھا؟

قیصر۔ (جلدی سے کرسی کو سیدھا کرتے ہوئے) کچھ نہیں ابا!

ابا جان۔ تو میرا دل دھڑکا ہوگا...... بالکل ایسی آواز تھی جیسے دھڑ سے کوئی چیز آ پڑی ہو!

قیصر۔ نہیں ابا۔ آپ کا وہم ہے اور کچھ نہیں۔ آپ سو جائیے!

ابا جان۔ کیا بجا ہوگا؟

قیصر۔ اول شب ہے۔ ساڑھے دس بجے ہیں! (پھر جلدی سے باپ کے سرہانے جھکتے ہوئے) اب زیادہ کمزوری تو نہیں محسوس ہو رہی؟

ابا جان۔ نہیں بیٹی.... (ٹانگ سیدھی کرتے ہوئے) ہائے۔ (انور پر نظر پڑتی ہے) میاں انور ابھی تم یہیں ہو؟

انور۔ (گھبرائے ہوئے) میں..... میں.....

قیصر۔ (لقمہ دیتے ہوئے) یہ آپ کے دل کی حرکت گننے آئے تھے.... (توجہ منتقل کرتے ہوئے) ابا۔ دوا سے کچھ آرام ملا؟

ابا جان۔ بیٹی۔ بھلا کہیں دوا سے بھی آرام ہوا ہے۔

قیصر۔ (منہ پھلا کر) ابا۔ آپ تو بہت ہارے دیتے ہیں۔ آپ خود بھی تو اپنی طبیعت سنبھالئے۔ تب ہی تو آرام ہوگا!

انور۔ میں صبح تک اس دوا کا اثر اور دیکھتا ہوں ورنہ پھر کل نسخہ بدل دوں گا!

ابا جان نہیں میاں! مجھے تو اس دوا سے ہی بہت فائدہ ہے..... تم بھلا کب تک دوا بدلتے رہوگے!

انور۔ چچا جان۔ کوئی نہ کوئی دوا تو شفا دے گی ہی۔ (آلہ لے کر قریب آتا ہے) میں ذرا Beating دیکھ لوں۔

ابا جان۔ تم بے کار اپنی جان تھکاتے ہو۔ بس اب تم آرام کرو!

انور۔ بے کار کیوں چچا جان۔ خدا نے چاہا تو آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے!

قیصر۔ میں نے وعدہ کیا ہے کہ اگر ابا بالکل اچھے ہوگئے تو انہیں ایک سویٹر بُن کر دوں گی!

انور۔ (مسکرا کر) چچا جان! آپ نے سُنا؟

ابا جان۔ تم دونوں کی امیدیں اور کوششیں دیکھ کر میرا دل اور بھی بیٹھا جاتا ہے۔

انور۔ نہیں چچا جان۔

ابا جان۔ میں نے تو قیصر کو بہت منع کیا تھا کہ بیٹی نہ لکھ انہیں۔ ایسی حالت میں علاج بے کار ہے۔ لیکن یہ نہ مانی!

قیصر۔ ابا نے تو بہت منع کیا لیکن میرا دل چاہتا تھا کہ ایک دفعہ ان کا لگ کر غور سے علاج ہو جائے!

انور۔ علاج میں تو کوئی کسر میں اٹھا نہیں رکھوں گا! (دل پر آلہ لگاتا ہے)

ابا جان۔ تم بھی اپنی سی کر کے دیکھ لو! ہونا ہوانا کچھ نہیں.... .... میرا وقت آگیا ہے....... پورا ہوا چاہتا ہے۔

قیصر۔ نہیں ابا!

انور۔ نہیں چچا جان!

ابا جان۔ نہ تم روک سکتے ہو اور نہ میں رک سکتا ہوں۔

انور۔ (دل پر سے آلہ ہٹاتے ہوئے) ایسا نہ کہئے چچا جان!

قیصر۔ (پلنگ پر جھک کر جیسے دل منہ میں آگیا ہو) ابا جان۔ .... میرے ابا!

ابا جان۔ تم لوگ نہیں جانتے۔ میں اپنی حالت خوب جانتا ہوں۔

قیصر۔ (آنکھوں سے آنسو ٹپکتے ہیں) ابا جان۔ ایسا نہ کہئے۔ نہ کہئے ایسا!

ابا جان۔ بیٹی! (باپ کی آواز بھی بھاری ہو جاتی ہے) قیصر! میں تیری........

انور۔ (گھبرا کر) جلدی! ماتھے پر بام لگاؤ۔ میں دوا دیتا ہوں!

...... پیر کھول دو ...... جلد!

(قیصر جلدی سے پیر کھول دیتی ہے۔ انور دوا حلق میں ڈالتا ہے اور قیصر جلد جلد ماتھے پر بام لگانا شروع کرتی ہے)

ابا جان۔ تم ..... تم .....

انور۔ آپ آنکھیں بند کر لیجئے۔ بس ..... بس ..... اب آپ سو جائیے۔

(تھوڑے وقفے بعد)

(قیصر استفہامیہ نگاہوں سے انور کی جانب دیکھتی ہے)

انور۔ (واپس کرسی کے پاس آکر نہایت خنک لہجہ میں) حالت تشویشناک ہے!

قیصر۔ تو پھر کیا ہو؟

انور۔ انہیں Complete rest دینا چاہئے! اور ہاں دودھ لا کر یہیں رکھ لو۔ اگر آنکھ کھلے تو تھوڑا سا پلا دینا!

قیصر۔ میں لے آؤں گی۔ اچھا اب آپ جا کر سو جائیے۔

انور۔ قیصر۔ ذرا سی بھی کوئی بات ہو تو فوراً مجھے اٹھا لینا!

قیصر۔ ہاں ہاں! ..... آپ جائیے۔

انور۔ (جاتے ہوئے) تم بھی بس اب سو جانا۔

(انور بائیں جانب چلا جاتا ہے اور قیصر دودھ کا جگ اٹھا کر دائیں جانب۔ کچھ دیر بعد ایک ادھیڑ عمر عورت داخل ہوتی ہے ماتھے پر ہلکا سا ایک بل۔ ہونٹ ملے ہوئے۔ کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھتی ہے اور پھر کرسی کے پاس آکر تمکنت سے کھڑی ہو جاتی ہے۔ ایک نظر پلنگ پر ڈالتی ہے لیکن سوتا دیکھ کر واپس جانے کے لئے مڑتی ہے کہ پلنگ پر سے آواز آتی ہے)

ابا جان۔ قیصر! ...... بیٹی قیصر! (بھابی جان رک جاتی ہیں لیکن کوئی جواب نہیں دیتیں۔ ابا جان جواب نہ پا کر لیکن ایک عورت کو کھڑا دیکھ کر) کون ہے؟

بھابی جان۔ میں ہوں۔

ابا جان۔ بھابی جان! ...... اوہو ...... آپ ...... اتنی رات گئے ......

بھابی جان۔ میں ذرا دیکھنے آئی تھی۔

ابا جان۔ آپ نے ناحق تکلیف کی۔ میرا تو کچھ ایک سا ہی حال رہتا ہے۔

بھابی جان۔ (لاپروائی سے) ہوں!

ابا جان۔ ابھی ابھی انور میاں مجھے دیکھ کر گئے ہیں۔ میں انہیں بہتیرا منع کرتا ہوں کہتا ہوں علاج سے کیا حاصل لیکن وہ برابر آ آکر دیکھتے ہیں۔ دوائیں بدلتے ہیں .....

بھابی جان۔ انور رات کو بھی آکر دیکھتا ہے؟

ابا جان۔ ہاں ہاں۔ کل رات ہی آئے تھے!

بھابی جان۔ کیا بجا ہوگا اس وقت؟

ابا جان۔ کوئی ایک بجا ہوگا ...... آپ بیٹھ جائیے!

بھابی جان۔ قیصر کہاں ہے؟

ابا جان۔ ابھی تو یہیں تھی ...... کچھ کام تھا اُس سے؟

بھابی جان۔ نہیں۔

ابا جان۔ اس غریب کی بھی جان مصیبت میں ہے۔ میں تو مر ہی رہا ہوں۔ لیکن یہ میرے ساتھ زندہ درگور ہوتی جا رہی ہے۔

بھابی جان۔ (طنزیہ ہنستے ہوئے) غریب!

ابا جان۔ (حیران) کیوں کیا ہوا؟

بھابی جان۔ تو آپ کو کچھ نہیں معلوم؟

ابا جان۔ کیا کچھ؟

بھابی جان۔ (نفرت سے) آپ بھی بس مرد ہی ہیں!

ابا جان۔ کیا مطلب؟

بھابی جان۔ آپ عورتوں کی تہ کو نہیں پہنچ سکتے۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے سب کچھ ہوتا ہے اور آپ ـــــ کچھ بھی نہیں جانتے؟

ابا جان۔ آپ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں کہہ کیوں نہیں دیتیں!

بھابی جان۔ (ترشی سے) میں بھی کہنے ہی آئی ہوں!

ابا جان۔ (بگڑ کر) تو کہہ دیجئے۔

بھابی جان - سنئے! میں انور کا قیصر کے پاس آنا پسند نہیں کرتی ...... اور مجھے شبہ ہے ....کہ....

ابّا جان - (احتجاجیہ) بھابی جان!

بھابی جان - آپ کے بھائی جان نے سر توڑ کوشش کی کہ یہ رشتہ ہو جائے لیکن نہ اُن کی زندگی میں یہ رشتہ ہوا اور نہ اب کبھی ہوگا۔

ابّا جان - بھائی جان کا اصرار ضرور تھا لیکن میں نے منظور نہیں کیا تھا!

بھابی جان - آپ منظور کر بھی دیتے تو بے کار تھا۔ میں کبھی راضی نہ ہوتی اور میری رضامندی کے بغیر وہ انگلی نہیں ہلا سکتے تھے۔

ابّا جان - (غصہ کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں) مجھے بھی یہ ہی شبہہ تھا!

بھابی جان - مجھ پر تو شبہہ ہو گیا لیکن اب اپنی بیٹی پر شبہہ نہیں ہوتا!

ابّا جان - کس بات کا؟

بھابی جان - میں قیصر کے تیور ٹھیک نہیں دیکھ رہی۔

ابّا جان - (حیران) یعنی؟

بھابی جان - میں نے آپ کو یہاں علاج کرانے کے واسطے آنے دیا تھا۔ اس لئے نہیں کہ آپ کی بیٹی میرے لڑکے پر ڈورے ڈالنے شروع کر دے۔

(ابّا جان کے چہرہ پر خون دوڑ جاتا ہے۔ آنکھیں امنڈ آتی ہیں۔ غصہ سے کانپنے لگتے ہیں)

ابّا جان - (چیخ کر) آپ...... آپ نے کیسے کہا"...... آپ...... آپ......

(قیصر ہاتھ میں دودھ کا جگ لئے داخل ہوتی ہے۔ لیکن باپ کو مشتعل دیکھ کر جگ ہاتھ سے چھوڑ دوڑ کر باپ سے لپٹ جاتی ہے)

قیصر - کیا ہوا ابّا؟...... ابّا! آپ لیٹ جائیے.... آپ کو آرام کرنا چاہیئے.... انور بھائی نے سخت تاکید کی ہے!

ابّا جان - (بھابی سے مخاطب ہو کر، غصہ سے کانپتے ہوئے) آپ کے پاس چار پیسے ہیں اس لئے آپ ہم غریبوں کو جو چاہیں کہہ لیں۔

قیصر - ابّا۔ آپ لیٹ جائیے۔

ابّا جان - (اسی لہجہ میں) آپ نے میری بیٹی کو سمجھا کیا ہے؟

قیصر - (تیز تیز نگاہوں سے چچی کی طرف دیکھتی ہے) مجھے کچھ کہا ہے ناابّا؟

ابّا جان - ایسی بات کہی ہے جو دشمن کی بیٹی کو بھی نہیں کہتے!

قیصر - تو کیا ہوا۔ بڑی چچی ہیں کہہ لینے دیجئے...... آپ آرام کیجئے۔

ابّا جان - میرا خون کھول رہا ہے بیٹی!

قیصر - ایسی کیا بات کہہ دی؟

ابّا جان - میں تو زبان پر بھی نہیں لا سکتا۔ میری رگوں میں خون آگ کی طرح بھڑک رہا ہے۔

بھابی جان - (اطمینان کے ساتھ) یہ تجھے نہیں بتائیں گے لیکن میں بتائے دیتی ہوں۔

ابّا جان - اس سے کہتے شرم نہیں آتی آپ کو!

بھابی جان - جسے کرتے شرم نہ آئی اس سے کہتے کیا شرم؟

ابّا جان - (جیسے کوئی درد کی ٹیس میں چیختا ہو) بھابی جان!

قیصر - (ملتجیانہ) ابّا آپ آرام کیجئے۔ نہیں تو مرض میں زیادتی ہو جائے گی!

بھابی جان - سن قیصر!

قیصر - (تیار ہو کر) کہئے!

بھابی جان - مجھے شبہہ ہے کہ تو باپ کی تیمار داری کی آڑ میں اپنے لئے زمین ہموار کر رہی ہے۔

قیصر - (حیرت سے) چچی جان!

بھابی جان بے چاری کیسی انجان بنتی ہے!

قیصر - آپ کیا کہہ رہی ہیں؟

بھابی جان - گریبان میں منہ ڈال کر دیکھ میں کیا کہہ رہی ہوں۔

ابّا جان - (غصہ سے پلنگ پر سے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے) میں ..... میں .....

قیصر - (جلدی سے باپ کو پکڑتے ہوئے) آپ لیٹے رہئے ابّا ..... (روتے ہوئے) آپ کی طبیعت ابھی بگڑ چکی ہے - آپ کو بالکل آرام کرنا چاہئے - (چچی سے) آپ کتنی ظالم ہیں - آپ کو اِن کی حالت پر بھی رحم نہیں آتا ؟

بھابی جان - تو بیٹی ہوکر باپ کے مرتے وقت اِس دُھن میں ہے اور دوسرے کو ظالم کہتی ہے -

قیصر - آپ مجھ پر ناحق نہ جانے کیا طوفان اٹھا رہی ہیں !

بھابی جان - (غصہ سے) تو میں جھوٹ کہہ رہی ہوں ؟

قیصر - میں کیا جانوں ..... ابّا جان آپ تھوڑا سا دودھ پی لیجئے -

بھابی جان - (غصہ سے چیختے ہوئے) تو میری آنکھوں میں خاک ڈالنا چاہتی ہے ؟

ابّا جان - بھابی جان ..... آپ ..... آپ .....

قیصر - (فقرہ پورا کرتے ہوئے) آپ تشریف لے جائیے باپ کے شانے پکڑ پلنگ پر لٹا دیتی ہے)

بھابی جان - تو کون مجھے حکم دینے والی ! (دھم سے کرسی پر بیٹھ جاتی ہیں) میں آج اس کا فیصلہ کرکے جاؤں گی !

قیصر - (روتے ہوئے) آپ (باپ کی طرف اشارہ کرکے) اِن کا فیصلہ کرنا چاہتی ہیں ؟

بھابی جان - (تلملا کر) میں تیری یہ ساری تیزی نکال دوں گی - کیا مروڑا ہے میری بات کو !

قیصر - نہیں تو اور کیا کرنا چاہتی ہیں ؟

بھابی جان - میں تیری عقل ٹھکانے لگانا چاہتی ہوں -

قیصر - تو آپ نے مجھے اپنے کمرے میں بلالیا ہوتا - آخر ان کے سامنے یہ سب کچھ کرنے کی کیا ضرورت تھی -

بھابی جان - تاکہ انہیں بھی تو معلوم ہو جائے کہ مرتے باپ کے بستر کے برابر بیٹی اپنی سیج بسانا چاہتی ہے -

ابّا جان چیخ مار کر پلنگ سے اٹھتے ہیں لیکن نڈھال ہوکر گر پڑتے ہیں)

قیصر - (باپ کو سنبھالتے ہوئے چچی سے) پڑ گئی آپ کے کلیجے میں ٹھنڈک -

بھابی جان - چپ بدتمیز !

(انور داخل ہوتا ہے)

انور - میں نے ابھی چچا جان کی آواز سنی تھی - (جلدی سے پلنگ کی طرف لپکتے ہوئے) قیصر تم نے فوراً مجھے کیوں نہ بلایا ..... اِن کی پیشانی پر پسینے آرہے ہیں - جلدی سے پیر کھول دو ..... بھلا دیکھو یہ حال ہو رہا ہے اور تم نے مجھ سے آکر کہا تک نہیں -

(قیصر روتی رہتی ہے انور پلٹ کر اپنی ماں کو کھڑا دیکھتا ہے)

انور - اِن کی یہ حالت ہوتی دیکھ کر آپ نے بھی مجھ سے آکر نہیں کہا ؟..... انہیں ایک دورہ ابھی اِس سے پہلے پڑ چکا ہے -

(ماں بھی کوئی جواب نہیں دیتی)

انور - کیوں - یہ بات کیا ہے ؟ (دونوں کی طرف مشتبہ نگاہوں سے دیکھتا ہے - قیصر روتی رہتی ہے اور بھابی جان منہ پھُلائے کرسی پر بیٹھی رہتی ہیں دونوں میں سے کوئی جواب نہیں دیتا)

انور - تم دونوں میں سے کوئی بھی نہیں بولتا ..... آخر اتنی دیر میں کیا ہوگیا ؟

قیصر - آپ جائیے - ہو چکا علاج - ہم کل صبح کی ٹرین سے واپس جا رہے ہیں !

انور - تم دیوانی تو نہیں ہوگئی ہو ؟

قیصر - ہم یہاں علاج کرانے آئے تھے - ان کا خاتمہ کرانے نہیں -

انور - لیکن اِن کا خاتمہ کون کر رہا ہے ؟

قیصر - چچی جان !

(انور تیز تیز نگاہوں سے اپنی ماں کی طرف دیکھتا ہے)

بھابی جان۔ اس لڑکی کا تو دماغ پھر گیا ہے!

(بھابی جان اٹھ کر چلی جاتی ہیں۔ انور حیرت سے دروازہ کی جانب دیکھتا رہ جاتا ہے۔ قیصر باپ کے سرہانے روتی رہتی ہے)

انور (قیصر کے پاس آتے ہوئے) آخر کیا بات ہوئی تھی؟

قیصر۔ (اور زور سے رونے لگتی ہے) آپ یہاں سے چلے جائیے!

انور۔ آخر کچھ بات بھی تو بتاؤ۔

قیصر۔ آپ کی اماں نہیں چاہتیں کہ آپ ایک منٹ بھی میرے پاس ٹھہریں۔

انور۔ (ایک قہقہہ لگاتا ہے) تم تو دیوانی ہوگئی ہو قیصر!

قیصر۔ آپ کی اماں جان نہ جانے کیا کیا کچھ ابا سے کہتی ہیں ...... میرے متعلق ......

انور۔ آخر کیا کچھ کہہ دیا معلوم تو ہو!

قیصر۔ ابا جان کو آج اس قدر دکھ پہنچا ہے ...... کہ بیان سے باہر ...... آپ جانیئے کسی کی بیٹی کے متعلق اُس کے سامنے ......

انور۔ سامنے ......!

قیصر۔ مجھے شرم آتی ہے کہتے!

انور۔ (قہقہہ لگاتے ہوئے) تم تو بالکل بچی ہو!

قیصر۔ آپ کی تو ہنسی ہوتی ہے لیکن میں ناحق بدنام ہو جاؤں گی!

انور۔ (سنجیدگی سے) تو میرا نام ایسا برا ہے؟

قیصر۔ میں آپ کے نام کو تو نہیں کہہ رہی!

انور۔ میں تو کچھ یہ ہی سمجھا!

قیصر۔ خیر۔ اب ہم کل صبح چلے جائیں گے۔ پھر آپ کی اماں کو میری پرچھائی بھی نظر نہیں آئے گی۔

انور۔ لیکن تمہیں تو میں نے بلایا تھا!

قیصر۔ لیکن میں آپ کے پاس تو نہیں آئی تھی!

انور۔ لیکن اگر اب بلاؤں تو؟

قیصر۔ آپ بے کار کی باتیں کرتے ہیں!

انور۔ خیر۔ تم اب اس گھر سے نہیں جا سکتیں۔

قیصر۔ آپ کی زبردستی ہے؟

انور۔ البتہ اگر تمہیں مجھ سے ایسی ہی نفرت ہو تو ....

قیصر۔ آپ کیا باتیں کر رہے ہیں؟

انور۔ میں تمہیں اپنا کرنا چاہتا ہوں .... اپنا ....

(انور پیچھے سے قیصر کی دونوں باہیں پکڑ لیتا ہے)

قیصر۔ (انداز سے) چھوڑ دیئے بھی۔

انور۔ میں تمہیں چاہتا ہوں قیصر ...... میں چاہتا ہوں کہ تم ہر دم میرے پاس رہو ...... میرے سینے کے نزدیک تاکہ دل کی حرکت دوگنی ہو جائے۔

قیصر۔ (چھیڑ سے) بس صرف اسی لئے!

انور۔ (جھجکتے ہوئے) میں تمہیں جب دیکھتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے میرے سونے کا انجکشن لگا دیا ہے۔ جسم میں گرمی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ چہرہ تمتما اٹھتا ہے اور ایک عجیب حرارت محسوس ہونے لگتی ہے۔

(قیصر پر جیسے جادو کر دیا ہو۔ انور کے سینے سے اپنی پیٹھ لگائے سر ٹیڑھا کر کے انور کے شانے پر ٹکائے بےسکت کھڑی ہے)

انور۔ جب میں ہسپتال میں مریضوں کے آپریشن کرتا ہوں تو ان کے سرد جسم کو چھو کر مجھے پھریری سی آتی ہے۔ اور میرے جسم میں سے بھی جان نکلنے لگتی ہے .. لیکن قیصر تمہیں چھو کر مجھ میں ایک نئی جان آ جاتی ہے۔ رگ رگ میں خون دوڑنے لگتا ہے۔ تمہارا جسم آپریشن ٹیبل کے مریضوں کی طرح سرد نہیں .... بلکہ تم میں سے آپریشن کے اوزاروں کو Disinfect کرنے والے ڈبے کی طرح گرم گرم بھاپیں اٹھتی ہیں جو دماغ میں چڑھ کر ایک عجیب خود رفتگی پیدا کر دیتی ہیں۔

(قیصر بھی از خود رفتہ انور کی باتوں میں محو ہے اور انور کا دماغ گرم گرم بھاپوں سے معطل کہ اتنی دیر میں ابا جان بری طرح ہاتھ پیر مارتے ہیں۔ اور کچھ بڑبڑاتے ہیں۔ قیصر کی آنکھوں کی پتلیاں جواب تک ایک جگہ جمی ہوئی تھیں

آہستہ آہستہ حرکت کرتی ہیں اور باپ کی طرف جاتی ہیں۔ باپ کو دیکھ کر آنکھیں پھٹ جاتی ہیں۔ چہرہ پر وحشت نمایاں ہوتی ہے اور قیصر ایک جھٹکے سے اپنے جسم کو انور کے سینے سے الگ کر کے پلنگ کی طرف دوڑتی ہے۔ اور باپ کے سر کے برابر اپنا سر رکھ دیتی ہے)

اباجان ۔ میری بیٹی .... کس نے کہا؟ ...... کس نے کہا؟ جھوٹ ۔ بالکل جھوٹ!

قیصر ۔ ابا .... اباجان!

اباجان ۔ کون؟ ..... کون؟ .... قیصر ..... ابھی میں زندہ ہوں ۔ میرے ہوتے تجھے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا!

قیصر ۔ آپ سو جائیے ابا!

اباجان ۔ میری بیٹی؟ ...... نہیں نہیں ...... ایسا نہیں ہو سکتا .... وہ مجھے بہت چاہتی ہے ....

قیصر ۔ ابا ۔ آپ کو آرام کرنا چاہیئے ۔ آپ کی طبیعت خراب ہے ابا!

اباجان ۔ میرا خون کھول رہا ہے!

قیصر ۔ (ملتجیانہ) ابا ۔ اپنی طبیعت سنبھالئے!

اباجان ۔ جس کا باپ مر رہا ہو .... وہ بیٹی ... نہیں ...... نہیں ......

قیصر ۔ (روتے ہوئے) ابا ..... آپ کوشش کیجئے ۔ میری خاطر ..... اپنی طبیعت سنبھالئے!

اباجان ۔ میں اچھا ہوں ..... اچھا ہوں ..... ہم چلیں گے! اپنے گھر ..... کل!

قیصر

قیصر ۔ ہاں ابا ۔ اب سو جائیے ...... کل چلیں گے! ...... سو جائیے!

(قیصر سر پر گیلا تولیہ رکھتی ہے ...... اور چند منٹ پلنگ پر جھکی رہتی ہے)

قیصر ۔ جائیے ۔ اب آپ بھی سو جائیے ۔

انور ۔ اب تم جاؤ گی تو نہیں!

قیصر ۔ (نخرے سے) جائیے بھی!

انور ۔ وعدہ کرتی ہو؟

قیصر ۔ (ہنس کر) آپ تو جرح کرنے لگتے ہیں ۔

انور (ہنس کر) تم ہمیشہ غلط مطلب سمجھتی ہو ۔

(دونوں ہنستے رہتے ہیں ۔ انور قیصر کے نزدیک آنا چاہتا ہے)

قیصر ۔ شکریہ ۔ بس اب جائیے!

(انور کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن قیصر پہلے سے ہی ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کرتی ہے اور ہاتھ سے جانے کو کہتی ہے ۔ انور چلا جاتا ہے ۔ قیصر پُر معنی ہنسی ہنستی ہے اور پھر باپ کے سرہانے جھک کر باپ کے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی سی کرتی ہے ۔ پھر ابا کے برابر اپنا منہ تکیہ میں چھپا لیتی ہے ۔ کچھ دیر بعد سر اٹھاتی ہے اور ....)

قیصر ۔ جس کا باپ مر رہا ہو .... وہ بیٹی؟ .... ہاں ۔ ہاں! (بالکل آہستہ سے اعتراف کرتے ہوئے) کیوں کہ وہ عورت بھی ہے!

سید ناصر الدین شمسی

ضروری اطلاع

مضمون نگار حضرات کو اپنے مضامین کی صاف اور صحیح طباعت کے لئے اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ ان کا مسودہ نہایت واضح، صاف اور خوشخط لکھا ہو ۔ شکستہ مبہم اور غیر واضح الفاظ کو کاتب عموماً غلط پڑھتے اور غلط لکھتے ہیں ۔ اس طرح مسودوں اور کاپیوں کی صحت میں نہ صرف غیر ضروری کوفت اٹھانی پڑتی ہے بلکہ طباعت بھی صاف نہیں ہوتی اور غلطیاں بھی کم و بیش رہ جاتی ہیں ۔

ہمایوں

یادِ ایام

اس طرح سے یاد آتے ہیں مجھے
عشرتوں کے دن، فسانے عیش کے
جس طرح "دھوری" کے پیچھے ہوں عیاں
کچھ مناظر ——— خوش نما و دلپذیر،
یا کوئی مُبہم خیال ———
کھٹکھٹاتا ہو درِ بزمِ شعور،
یا کسی تالاب کی لہروں میں، گدلایا ہوا
تیرتا پھرتا ہو عکسِ ماہتاب،
یا کئی دن کا کوئی پیاسا جسے
دشتِ غربت میں سراب آئیں نظر،
یا تھکا ماندہ مسافر خواب میں
دیکھ لے منزل کا اک دھندلا سا نقش،
اس طرح سے یاد آتے ہیں مجھے
عشرتوں کے دن، فسانے عیش کے

امتیاز اللہ خاں

خدا خیر کرے

چشمِ پرشوق ہے نمناک خدا خیر کرے
فرطِ غم سے ہے جگر چاک خدا خیر کرے
کچھ بھی ملتا نہیں مفہومِ تمنّا کا سراغ
تھک گیا اشہبِ ادراک خدا خیر کرے

مصور قریشی

میرا دل

تیر پر تیر جو کھائے یہ مرا ہی دل ہے
درد کے لطف اٹھائے یہ مرا ہی دل ہے
جُرم کوئی نہ کرے اور خطاوار بنے،
روٹھ جاؤ تو منائے یہ مرا ہی دل ہے
اچھی صورت جو کہیں دیکھ لے مِٹ مِٹ جائے
آکے اِک بار نہ جائے یہ مرا ہی دل ہے
ہر گھڑی راحت و آرام کو ترسا جو کرے
چین اِک لحظہ نہ پائے یہ مرا ہی دل ہے
رات بھر پہلو میں کھٹکا کرے کانٹے کی طرح
روز بد روز دکھائے یہ مرا ہی دل ہے
روتے لوگوں کو ہنسائے یہ صفت ہے اس میں
راہ چلتوں کو رُلائے یہ مرا ہی دل ہے
بے خبر اتنا ہو اپنی بھی خبر ہو نہ اسے
کائنات اِس میں سمائے یہ مرا ہی دل ہے

بُت کدہ اِس کو سمجھ لو تو یہ ہے ایسا ہی
گھر خدا کا جو کہائے یہ مرا ہی دل ہے

سیّد نذیر حسین ناشاد

؎ پہاڑوں پر تیرتے ہوئے بادل۔

فلک پیما کا ایک خط

پیارے بشیر۔ حامد علی خاں صاحب سے یا کسی اور ادیب سے مشورہ کر کے ایک مشکل حل کر دو۔ وہ مشکل دو چار سطروں میں پیش کرتا ہوں۔

مولانا حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مرحوم (مُترجم کلام پاک، مصنف بنات النعش، مراۃ العروس وغیرہ) کے سر ایک خوبصورت لفظ کا خون ہے۔ مولانا مرحوم سے پہلے بھی

ابن الوقت

غالباً گالی کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا مگر حضرت نذیر احمد صاحب اِسے ایک ایسے گھٹیا Character کے ساتھ چسپاں کر گئے کہ اب اس لفظ کی نجات مشکل ہے۔

علامہ اقبال مرحوم نے مجھ سے دو چار دفعہ کہا کہ atheist کو "دہریہ" کہنا صحیح نہیں کیوں کہ خدا خود "دہر" ہے۔

حضرتِ اقبال خالی خولی مولوی نہ تھے۔ Kant، Herbert Spencer، Bergson کی تصانیف پر حاوی تھے وہ بھلا وقت یا زمانہ یا دہر جیسے خوبصورت لفظوں کا غلط استعمال کیسے برداشت کرتے؟

وقت (Time)، وسعت (Space) اور حرکت (Motion) تین خوبصورت طلائی زنجیریں ہیں جن سے انسانی تخیل کو رہائی نہیں۔ یہ تینوں زنجیریں بھی ہیں اور ساتھ ہی راستہ دکھلانے والی مشعلیں بھی ہیں۔ یہ زنجیریں نہ ہوں، یہ مشعلیں نہ ہوں تو زندگی کے صفر کو صفر کہنے والا بھی کوئی نہ ہو۔

زندگی کے لفظ کے ساتھ موت کا لفظ قطعی طور پر منعقد ہے۔ کیسے معلوم نہیں کہ تمام کی تمام کائنات میں موت کے لئے ازل سے ابد تک Free pass مہیّا ہے۔ روک تھام ہو نہیں سکتی۔ مگر خود

موت

وقت اور مقام کی پابند ہے۔ جو کچھ مرتا ہے (کوئی نظامِ شمسی ہو یا پسّو ہو) کسی جگہ اور کسی وقت مرتا ہے۔ وقت کی خوبصورتی یہ ہے کہ

موت

کو مجبور کر دیتا ہے کہ روسی اور جرمن کو پہلو بہ پہلو سلا دے۔

اگر ابن الوقت ہونا بُرا ہے تو کیا ابن الفضا یا ابن الحرکت ہونا اچھا ہے؟ کاش اردو لکھنے والے کوشش کریں کہ وقت بدنام نہ ہو۔ مولوی صاحب وقت کو بُرا سا بیٹا دے گئے۔ حکیم آئن شٹائن کا خدا بھلا کرے کہ وہ وقت اور فضا کو ایک اصلیت کے دو پہلو ثابت کرنے میں کامیاب ہوا۔

ساری کی ساری کائنات کا حسین ترین پہلو وقت ہے۔ وقت ہی دراصل نورٌ علےٰ نور ہے۔ کاش کوئی پڑھی لکھی خاتون مولوی صاحب کے جواب میں بنت الوقت ایسی ہیروئن پیش کرے جس سے وقت کا نام رہ جائے۔

"فلک پیما"

نورِ نگاہِ آمنہؓ

چھیڑ کے سازِ "لاالٰہ" دھوم مچا گیا کوئی
روحِ جہاں تھی محوِ خواب آ کے جگا گیا کوئی
صلِّ علیٰ محمدٌ صلِّ علیٰ محمدٌ
ظلمتِ کفر و جہل کا پردہ اٹھا گیا کوئی
غنچے بھی مسکرا اُٹھے ذرّے بھی جگمگا اٹھے
بن کے بہارِ جاں فزا دہر پہ چھا گیا کوئی
جس کے لئے ازل سے تھی چشم براہ کائنات
بن کے وہ پیکرِ حسیں سامنے آ گیا کوئی
خم ہے جبینِ غزنوی سنگِ درِ ایاز پر
قیدِ بلند و پست کو جب سے اٹھا گیا کوئی
دشمنِ جاں پہ بھی رہیں عدل و کرم کی بارشیں
عدل و کرم کو کس قدر عام بنا گیا کوئی
ایک خدا کے واسطے ایک خدائی سے جہاد
صرف یہ قول ہی نہیں کر کے دکھا گیا کوئی
نورِ نگاہِ آمنہؓ! شاہدِ خلوتِ حرا!
قربِ خدا بھی مل گیا تجھ کو جو پا گیا کوئی

سیدہ اختر حیدر آبادی

ترانۂ محبت

نئے سرے سے پھر آج کیفیؔ ہم اپنی دنیا بسا رہے ہیں
جو کھو چکے اُس سے بے خبر ہیں جو رہ گیا وہ لٹا رہے ہیں
نشاطِ امروز کی قسم ہے کہ دل نے سب کلفتیں بھلا دیں
دئیے تھے ماضی نے داغ جتنے وہ خود بخود مٹتے جا رہے ہیں
دلِ فسردہ میں جلوہ گر ہیں نئی اُمنگیں نئی اُمیدیں
پھر آج اس سُونی انجمن میں چراغ سے جگمگا رہے ہیں
کہاں کی مایوسیٔ تمنا کہاں کی مجبوریٔ محبت
اجازتِ عرضِ آرزو ہے وہ مہرباں ہوتے جا رہے ہیں
شباب ہے اور شادمانی بہار ہے اور کامرانی
نئے ہیں سرشاریٔ مجسم مجھے بھی بے خود بنا رہے ہیں
خوشا یہ دورِ شباب اُن کا یہ دل نوازِ التفات اُن کا
کہ بے پئے آج ہر قدم پر مرے قدم لڑکھڑا رہے ہیں
حیا نے گو جرأتِ تکلم زباں سے چھین لی ہے لیکن
وہ آنکھوں آنکھوں میں ہی بہت کچھ سنا چکے اور سنا رہے ہیں
خیالِ انجامِ کار کیسا کہ فرصتِ عیش مختصر ہے
جدھر محبت کا تیز دھارا بہائے ہم بہتے جا رہے ہیں
وہ عالمِ سرخوشی ہے کیفیؔ کہ بر لبِ دل پہ آج ہم بھی
نئے نئے نغمے چھیڑتے ہیں، نئے نئے گیت گا رہے ہیں

رشید کیفی

بخشی

(۱)

"مجھے تو کوئی امید نہیں ہے" ایک جوان شخص نے قطب نگر کی کمیٹی کے دفتر سے نکلتے ہوئے کہا۔
"امید!" اس جوان شخص کے معمر ساتھی نے زہر خند کر کے کہا "امید کا ہے کی صاحب؟ صدر صاحب نے تو صاف انکار کر دیا ہے" اور جب یہ دونوں دفتر سے اتنے فاصلے پہ پہنچ گئے کہ دور کی آواز بھی مشکل سے وہاں پہنچ سکے تو اسی معمر انسان نے گرج دار آواز میں کہا "یاد رکھئے یہ شخص مسلم کش ہے مسلم کش!" آواز میں کچھ اتنی غیر معمولی گرج تھی کہ تین راہگیر چونک پڑے۔ ان میں سے ایک شخص نے جو بظاہر نووارد معلوم ہوتا تھا گھبرا کر پوچھا "یہ کون صاحب ہیں؟"

دوسرے نے مسکرا کر جواب دیا "جی یہ ہمارے قصبے کے بخشی ہیں" اور ان کے ساتھ جو جوان سے آدمی ہیں وہ جمعیتہ الشبان کے صدر مولانا مسعود علی ہیں۔ آج کل کمیٹی میں نائب بخشی کی جگہ خالی ہے۔ دھارمک سبھا والے چاہتے ہیں کہ کوئی ہندو نائب بخشی ہو اور جمعیتہ الشبان کی کوشش ہے کہ یہ عہدۂ جلیلہ کسی مسلمان کو ملے۔ بس اسی کی دوڑ دھوپ ہے" اور امر واقع بھی یہی تھا لیکن شاید یہ امر ابھی تک "رازِ درونِ پردہ" تھا کہ متخاصم فریقین کے علاوہ ایک حریف اور بھی تھا جو باہمہ و بے ہمہ رہ کر اپنے امیدوار کی کامیابی کا خواہاں تھا۔ اس حریف کا نام تھا مجتبےٰ خاں بخشی اور امیدوار اس کا مڈل فیل داماد تھا۔ مجتبےٰ خاں کا شمار ان بدقسمت افراد میں کیا جا سکتا ہے جو فہم و فراست عقل و کیاست کی دولت سے مالا مال ہونے کے باوجود کسی نامعلوم وجہ سے شایانِ شان و حسب دل خواہ ترقی نہیں کر سکتے اور آخر کار تقدیر کے کوسنے پہ اکتفا کرتے ہیں۔ مجتبےٰ خاں اب سے پچیس برس قبل قطب نگر کا بخشی ہوا اور اس عرصے میں اس نے بارہا یہ کوشش کی کہ اس کا تبادلہ کسی زیادہ "زرخیز" محکمے میں ہو جائے لیکن برسوں کی خوشامد اور سیکڑوں سرٹیفکیٹوں کے باوجود کسی دوسرے محکمے میں کوئی مستقل ملازمت نہ ملنا تھی نہ ملی ہاں قطب نگر اور ٹاؤن ایریا آفس سے اس دیرینہ شناسائی کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ وہ قطب نگر کے بچے بچے سے واقف اور کمیٹی کے قواعد و ضوابط کے فقرے فقرے کا حافظ ہو گیا۔

اکثر یہ ہوا کہ کمیٹی کے ممبروں نے بخشی کے خلاف رزولیوشن رکھا اور اس نے "بیٹا ہر بنس لال" کو ان کے بچپن کے افسانے سنا کر اور "بھیا تاج الدین" کو ان کی جوانی کے تذکرے یاد دلا کر رام کر لیا۔ کمیٹی کے کئی صدر عزم بالجزم کر کے آئے کہ وہ ہر رپورٹ خود تیار کریں گے اور ہر کام خود دیکھیں گے لیکن بخشی نے قواعد و ضوابط کی مختلف دفعات سنا کر ان کی ناتجربہ کارانہ بے ضابطگی کی کچھ ایسی بھیانک تصویر کشی کی کہ ان کو بخشی کی تیار کی ہوئی رپورٹ پر دستخط کرنے میں عافیت نظر آئی۔ موجودہ صدر خان بہادر حشمت علی رائے دہندوں سے وعدہ کر کے آئے تھے کہ وہ بخشی کو جلد از جلد پنشن لینے پہ مجبور کریں گے اور جب تک بخشی پنشن نہیں لے گا وہ ہر کام کی نگرانی خود کریں گے اور شروع شروع میں انہوں نے کیا بھی یہی لیکن ایک مرتبہ انہوں نے ٹینڈر طلب کئے بغیر لالٹینوں کا ٹھیکا اپنے ایک مقربِ خاص کو دے دیا اور اس موقع پر بخشی نے اس بے ضابطگی کے عواقب و نتائج کچھ اس حسن و خوبی سے ان کے ذہن نشین کئے کہ وہ خود رائی سے تائب ہو گئے۔ یوں ممبروں کے دکھانے کو وہ بخشی پر اعتراض بھی کرتے تھے اور اس کی رائے سے اختلاف کا اظہار بھی فرماتے تھے لیکن جاننے والے جانتے تھے کہ ہوتا وہی ہے جو بخشی چاہے۔

(۲)

منشی رام کیول صاحب بی۔ اے کمیٹی کے اوّل نائب صدر بھی تھے اور دھارمک سبھا کے سبھا پتی بھی اس لئے ظاہر ہے کہ

قصبے کی ہوا خواہی کا بار بھی ان کی جانِ ناتواں پر تھا اور ہندوؤں کے حقوق کے تحفظ کا بوجھ بھی۔ منشی صاحب کے نزدیک قصبے کی فلاح و بہبود کا یہ مطلب تھا کہ ہر ہندو محلے میں بالعموم اور ان کے محلے میں بالخصوص صفائی اور روشنی کا اتنا بندوبست رہنے کہ راہ گیر کو موری کی بدبو چار پانچ قدم کے فاصلے سے نہ سنگھائی دے اور لالٹین کی روشنی اتنے ہی فاصلے سے دکھائی دے جائے۔ ہندو حقوق کے تحفظ سے یہ مراد تھی کہ ہو سکے تو صدر، اوّل و دوم نائب صدر، بخشی اور نائب بخشی سب ہندو ہوں ورنہ کم از کم اوّل نائب صدر اور نائب بخشی لازم طور سے ہندو ہوں اس لئے جب ان کے مخبروں نے یہ خبر پہنچائی کہ نائب بخشی کی جگہ کے لئے مولانا مسعود علی صدر جمعیتہ الشبان و دوم نائب صدر میونسپل کمیٹی قطب نگر مجتبےٰ خاں بخشی کی معیت میں خان بہادر صاحب سے کچھ کہنے سننے کے لئے گئے تھے تو وہ بے تاب ہو گئے اور ان کی نظر میں وہ آپت کا سمے آ گیا جب یہ ملیچھ ورگ (جماعت) آریا ورت میں کسی آریا کو اوّل نائب صدر بھی نہیں رہنے دے گی۔ انہوں نے شام کے وقت تمام ہندو ممبروں کو بلوا لیا اور جب وہ لوگ آ گئے تو بخشی کو بھی بلا بھیجا۔ کوئی ناتجربہ کار حریف ہوتا تو مجمعِ مخالف میں جانے سے احتراز کرتا مگر گرگِ باراں دیدہ بخشی آیا اور اس شان سے آیا کہ فریقِ مخالف کو دیر تک شکوہ و شکایت کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ آخرکار منشی رام کیول صاحب نے ایک خندۂ زیرِ لب کے ساتھ لبِ شکایت اس طرح وا کیا "بخشی جی سنا جاتا ہے آج آپ بھی دوم نائب صدر کے ساتھ خان بہادر صاحب کے درشن کرنے کو گئے تھے"۔

"صاحب" بخشی جی نے اپنے پوپلے منہ سے پان چباتے ہوئے کہا "میں تو آپ سب صاحبوں کا خادم ہوں۔ مولوی مسعود علی صاحب نے حکم دیا کہ میرے ساتھ چل۔ میں ساتھ ہو لیا"۔

منشی صاحب نے مسکرا کر استفسار کیا "کیا کچھ نائب بخشی کی بات چیت تھی"

"جی ہاں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ مولوی صاحب کا بھتیجا بے کار ہے۔ بس اسی کے لئے کوشش کر رہے ہیں" بخشی نے عجیب روکھے انداز سے جواب دیا۔

منشی رام کیول نے بے تابانہ پوچھا "پھر خان بہادر صاحب نے کیا کہا"۔

بخشی نے اس اضطراب سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا "ارے صاحب کہتے کیا۔ یہی کہہ دیا کہ میں ہندو مسلمان کا جھگڑا نہیں جانتا۔ جسے مناسب سمجھوں گا نائب بخشی بنا دوں گا"

بخشی کے اس جواب کا اتنا اچھا اثر پڑا کہ پنڈت رام رتن شاستری بھی مسکرا کر کہنے لگے "ہمارے نگر کے منڈل کے سبھاپتی مہا شوکشم درشی (عقل مند) اور آبھجاتیہ (شریف) ہیں"۔

(۳)

قطب نگر میں آج سے نہیں برسوں سے نائب بخشی ہندو تھا اور مولانا مسعود علی کی عدیم النظیر و فقید المثال "رواداری" نے کبھی پہلے اس مسئلے کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا تھا لیکن اب یہ تو غضب تھا کہ اس خانوادۂ قدس کا ایک نوجوان مڈل پاس کرنے کے بعد بھی مستعفی نائب بخشی کی جگہ پر قابض نہ ہو سکے اور اس مسلمان نوجوان کے بجائے منشی رام کیول کے انٹرنس فیل سالے کے لئے کوشش کی جائے! خان بہادر صاحب سے بڑی بڑی امیدیں تھیں مگر جب انہوں نے اس "خالص اسلامی سوال" کو دین و مذہب کی عینک سے نہیں دیکھا تو پھر مصلحت اس میں دیکھی گئی کہ قصبے کے تمام مسلمانوں کو مولود شریف میں جمع کیا جائے اور وعظ و پند کے ذریعے سے سربرآوردہ مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ خان بہادر صاحب کے ذہن نشین کریں کہ جناب مولانا کے بھتیجے کا عدمِ تقرر اور منشی رام کیول کے سالے کا تقرر حقیقتہً "اسلام کی موت ہے"۔ مولانا کے شریعت کدے میں میلاد شریف کا انعقاد نئی چیز نہ تھی لیکن اس مرتبہ تبرک کی تیاری میں اتنا اہتمام کیا گیا تھا کہ واقفانِ کار کو یہ شبہہ ہونے لگا کہ حمد و نعت و منقبت

کے بعد کچھ اپنی بھی قصیدہ خوانی ہوگی اور وہی ہوا کہ سلام ختم ہونے کے فوراً بعد حضرت مولانا نے رجز خوانی شروع فرما دی" برادرانِ اسلام! خیرالقرون کے دل تڑپا دینے والے واقعات آپ کے سمعِ ہمایوں تک پہنچ چکے اور غالباً ان مبارک واقعات نے آپ کے سینوں کے اندر اسلام کی وہ سچی تڑپ بھی پیدا کر دی جو ابتلاء و آزمائش کے وقت ہر طاغوتی قوت کے مقابلے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ بھائیوں یاد رکھو کہ جس طرح صدرِ اسلام میں مسلمانوں پر چاروں طرف سے نرغہ تھا ٹھیک اسی طرح آج ہم چاروں طرف سے گھرے ہوئے ہیں۔ جہاں ہم اقلیت میں ہیں وہاں کا تو پوچھنا ہی کیا لیکن افسوس اس کا ہے کہ جہاں ہم اکثریت میں ہیں وہاں بھی ہمارے خود بیں گندم نما جو فروش لیڈر ہمارے جائز حقوق پامال کر دیتے ہیں۔ برادرانِ اسلام آپ کو خوب معلوم ہے کہ ہمارے قصبے میں مدتوں تک ایک ہندو نائب بخشی رہا اور ہم نے اپنی روایتی رواداری اور بے مثال فیاضی کی وجہ سے کوئی احتجاج نہیں کیا لیکن آج جب وہ نائب بخشی مستعفی ہوتا ہے اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس جگہ کوئی ہمارا آدمی جائے تو اغیار کا کیا ذکر خود اپنے مخالفت شروع کر دیتے ہیں۔ بھائیوں نائب بخشی کے تقرر میں تمہاری مذہبی جرأت اور قومی احساس کا امتحان ہے اگر تم میں کچھ بھی دینی غیرت باقی ہے تو اربابِ حل و عقد کو اپنے پے درپے مظاہروں سے مجبور کر دو کہ نائب بخشی وہ ہو جو جمیع مسلمین کا واحد امید وار ہے"

(۴)

خان بہادر صاحب مذہبی اجتماعات کی شرکت سے کچھ گھبراتے سے تھے اس لئے رسماً مدعو ہونے کے باوجود میلاد شریف میں شریک نہیں ہوئے لیکن بہر حال انہیں کسی نہ کسی طرح معلوم ہو ہی گیا کہ ان کے خلاف کیا کیا گل افشانیاں کی گئی تھیں اور دوسرے دن بیدار ہو کر انہوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ بخشی کو بلا بھیجا۔ بخشی آیا تو اُس کی پھولی ہوئی سانس کے درست ہونے کا انتظار کئے بغیر انہوں نے اپنا دکھڑا شروع کر دیا" بھئی بخشی میں تو اس کم بخت صدارت سے تنگ ہوں۔ قدم قدم پر جھگڑے بات بات میں مشکل! اب بتاؤ نائب بخشی کی جگہ کے لئے اس فساد کی کیا ضرورت تھی؟ اماں کوئی ہو جاتا۔ مگر نہیں وہ تو مطلب یہ ہے کہ ہندو مسلمان سوال پیدا کر کے مجھے عاجز کیا جائے۔ اب اگر میں رام کیول کے سالے کو نائب بخشی مقرر کرتا ہوں تو مسلمان بگڑے جاتے ہیں اور اگر مسعود علی کے بھتیجے کو رکھتا ہوں تو ہندو ناراض ہوئے جاتے ہیں۔ میاں میرا تو یہ دل چاہتا ہے کہ دونوں پر لعنت بھیج کر صدارت سے مستعفی ہو جاؤں"۔ "مستعفی ہوں حضور کے دشمن" بخشی نے گرج دار آواز میں کہا" سرکار خوب جانتے ہیں کہ یہاں ہندو مسلمانوں میں کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ یہاں تو منشی رام کیول اور مولوی مسعود علی کی ذات کا سوال ہے۔ ایسا ہی ہے تو حضور کسی تیسرے شخص کو نائب بخشی بنا دیں۔ دونوں اپنا سامنہ لے کر رہ جائیں گے۔ نہ شکوہ ہوگا نہ شکایت"۔

"واللہ! کیا بات کہی ہے بخشی"۔ خان بہادر صاحب نے قہقہہ لگا کر کہا اور پھر ذرا متفکرانہ انداز سے پوچھا" مگر وہ تیسرا شخص ہو کون؟"

"ہونے کو حضور کا غلام ہی موجود ہے مگر ہے وہ مڈل فیل" بخشی نے مسکرا کر کہا۔

"مڈل فیل ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ ارے بھئی وہ مڈل تک پڑھا تو ہے؟ بس کافی ہے۔ تم آج ہی اپنے داماد کی عرضی بھجوا دینا" خان بہادر صاحب نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا اور تیسرے دن انہوں نے کمیٹی کے ممبروں کو مخاطب فرماتے ہوئے اپنے مخصوص پر وقار لہجے میں کہا "حضرات! آپ کو معلوم ہے کہ نائب بخشی کی جگہ ایک مہینے سے خالی ہے۔ میری دلی خواہش تھی کہ نائب بخشی کی جگہ پر قصبے کے کسی لائق نوجوان کا تقرر ہو مگر افسوس کہ باہمی مخالفت کی وجہ سے یہ نہ ہو سکا۔ نائب بخشی کی جگہ کے لئے دو شخص امیدوار تھے لیکن ان میں سے کسی ایک کا تقرر دوسرے فریق کی خاطر شکنی کا باعث ہوتا اور یہ خاطر شکنی مجھے کسی صورت سے پسند نہ تھی اس لئے مجبور ہو کر میں نے اپنے اختیاراتِ خصوصی سے کام لیا اور مجتبےٰ خاں بخشی کے داماد کو نائب بخشی مقرر کر دیا چنانچہ اُس نے آج سے اپنا کام شروع بھی کر دیا ہے۔ حضرات! میں جانتا ہوں کہ نیا نائب بخشی ہمارے قصبے کا رہنے والا نہیں ہے پھر بھی وہ اتنے دن سے ہمارے قصبے میں رہتا ہے کہ اُسے قصبے کا باشندہ کہا جا سکتا ہے مجھے اُمید ہے کہ آپ حضرات میرے اس انتخاب کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے"

اور حقیقتہً اس انتخاب سے نہ دھارمک سبھا والے ناراض تھے نہ جمعیتہ الشبان والے ——— معلوم نہیں کیوں؟

طالب صفوی

اصغر کی یاد میں

تقریباً اڑھائی سال ہو گئے کہ اصغر ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوا لیکن آج بھی جب میں نے اُس کے لئے موت یا وفات کا لفظ لکھنا چاہا تو میرا دل اور ساتھ ہی میرا قلم رُکا اور کانپ گیا۔ کس قدر کمزور ہے انسان' کسی کو بھول جاتا ہے اپنے کاموں میں لگ جاتا ہے خوشی اور کامرانی کے نظریے قائم کر لیتا ہے لیکن پھر بھی اک ذرا سا لفظ اُس کے جسم و جان میں زلزلہ برپا کرنے کے لئے کافی ہے!

اصغر کی وفات کے بعد میں نے اُس کے چند ہمجولیوں کو لکھا کہ مجھے اس کے متعلق کچھ لکھ کر بھیجیں' بعض قلم نہ اٹھا سکے' بعضوں نے جی کڑا کر کے میری تسلّی کے لئے کچھ لکھ دیا' یہ یادداشتیں ابھی پڑی ہیں۔ پچھلے روز پنجاب لٹریری لیگ کے سرگرم سکرٹری نے بہت اصرار کیا کہ میں ان کے سہ ماہی انگریزی رسالے' اوشا کے لئے اصغر کی کوئی چیز دوں نیز اُس کے متعلق ایک مضمون لکھوں۔ میرے لئے اصغر پر کچھ لکھنا بے حد خوشی اور بے حد رنج و غم کا باعث ہے اور میں ہر وقت ایسا نہیں کر سکتا۔ پس میں نے اُس کے دوستوں کی تحریروں میں سے ایک نکال کر دے دی۔ یہ ڈاکٹر عبداللہ کے صاحبزادے گُل نے اصغر کی وفات کے تقریباً تین مہینے بعد ستمبر ۱۹۴۰ء میں لکھ کر مجھے بھیجی تھی۔ جب میں گُل کو دیکھتا ہوں تو مجھے وہ دن فوراً یاد آ جاتے ہیں جب اصغر اور اس کے ہم عمر دوست 'المنظر' کے چمن میں کھیل کود میں مصروف ہوتے تھے۔ اب صرف چند مضمون اُس فصلِ بہار کی یادگار باقی ہیں اور ہاں دلوں میں کچھ وہ جذبات جو گاہے گاہے مرے ہوئے کو زندہ اور گئے ہوئے کو پھر ہمارے پہلو میں لا بٹھاتے ہیں!

گُل کا مضمون محاکات کا بہترین نمونہ ہے کم از کم مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ دراصل یہ مضمون تھا ہی نہیں۔ اصغر کے ایک دلی دوست اور اصغر کے ماں باپ کی آپس میں ایک بے تکلف گفتگو تھی اصغر کی بابت' اسی لئے اس میں اصغر چلتا پھرتا دکھائی دیتا ہے جیسا کہ میں نے کہا ہے گیا ہوا گویا پھر واپس آ جاتا ہے۔ اس سے ہمیں رنج ہو لیکن سچ یہ ہے کہ کچھ خوشی سی بھی ہوتی ہے!

شاید اس مضمون کو میں کبھی پورے طور پر 'ہمایوں' میں ترجمہ کر کے شائع کروں لیکن فی الحال اس کی گنجائش نہیں۔

شروع میں گُل اصغر کی اُس آخری جھلک کا ذکر کرتا ہے جو اُس نے لاہور چھاؤنی کے سٹیشن پر دیکھی جب اصغر چلتی ریل گاڑی میں منہ باہر نکالے ہوئے اپنی امّی کے ہاتھ کو بوسہ دے رہا تھا' اُس وقت کسے معلوم تھا کہ یہ اُن کا آخری مس ہے ایک دوسرے کے ساتھ! پھر گُل اُس دن کو یاد کرتا ہے جب دس سال ہوئے اصغر اور وہ پہلے پہل ملے اور چند ہی گھنٹوں میں ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہو گئے گویا وہ برسوں کے ساتھ کھیلے ہوئے دوست ہیں۔ ہندوستان میں اپنے آخری سال کے دوران میں اصغر کی طبیعت میں کبھی کبھی ذرا سی تبدیلی نظر آئی چنانچہ گُل کہتا ہے کہ کئی بار اُس نے گویا مذاق کے طور پر مجھ سے کہا کہ "گُل میرے خیال میں میں جلد اُڑ ان چھو ہو جاؤں گا" اُس کا مطلب تھا کہ میری زندگی کے تھوڑے ہی دن باقی ہیں۔ گُل نے اس کے دل سے یہ خیال نکالنا چاہا لیکن گُل کو یقین ہے کہ اصغر کا دل اس آنے والی حقیقت سے بخوبی آگاہ تھا۔ اس پر مجھے اپنے بھانجے مسعود کا وہ خط یاد آتا ہے جس میں اُس نے مجھے لکھا ہے کہ جب اصغر کے انگلستان روانہ ہوتے وقت اصغر اور وہ اور میں بمبئی تک اُس کے ساتھ گئے تو شاید آخری روز اصغر نے اُس سے کہا کہ "مسعود! لاہور واپس جا کر تم 'المنظر' میں میرے کمرے کو میری طرف سے بوسہ دینا کیوں کہ ممکن ہے میں کبھی پھر اُسے نہ دیکھ سکوں!"

اصغر کے غیر معمولی دلی و دماغی اوصاف کے سلسلے میں اس کی انتہائی محبت و ہمدردی اور اُس کی حیرت انگیز قابلیت و صلاحیت کا ذکر کر کے اپنے مضمون کے آخر میں گُل ہمیں ۲۶ مئی ۱۹۴۰ء کی یاد دلاتا ہے جب اُس نے اخبار میں یہ عنوان دیکھا "ہندوستانی طالب علم (آکسفورڈ میں) ڈوب گیا" ڈوبنے والے کا نام علی بشیر لکھا تھا لیکن گُل کو جی میں کھٹک تھی کہ اس میں کچھ غلطی ہے۔ وہ فوراً المنظر پہنچا جہاں بہت سی موٹریں کھڑی تھیں' اور جہاں باغ میں مالی کھڑا ہوا زار و قطار رو رہا تھا۔ گُل یہ کہہ کر اپنا مضمون ختم کرتا ہے کہ اُس وقت بے اختیار مجھے انگریزی شاعر شیلے کے وہ اشعار یاد آ گئے جو اصغر کو بہت پسند تھے:—

وہی ایک باقی رہتا ہے' اور سب ادل بدل کر چل دیتے ہیں۔ آسمانی نور ہمیشہ فروزاں ہے' زمین کے سائے ڈھلتے پھرتے ہیں۔ زندگی رنگا رنگ شیشوں کے ایک گنبد کی طرح' ازل کی سفید روشنی پر ایک دھبّا سا ڈالتی ہے' یہاں تک کہ موت اُسے اپنے پاؤں تلے کچل کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے!

بشیر احمد

محفل ادب

ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے

اُردو زبان کو نہ مسلمانوں نے بنایا نہ ہندوؤں نے نہ کسی خاص فرقے نے اور نہ اسے مسلمان یا کوئی اور مذہب رکھنے والے بادشاہوں نے پھیلایا اور نہ یہ صرف ہندوؤں یا صرف مسلمانوں کی زبان ہے اور نہ یہ درست ہے کہ مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں یا ہندو چاہیں تو یہ جاتی رہے بلکہ ضرورت نے اسے بنایا اور ضرورت نے اسے پالا پوسا اور بڑھایا اور پھیلایا اور جب تک ضرورت رہے گی اُردو زبان رہے گی۔ یہ اور بات ہے کہ ضرورت کی طرف سے منہ موڑ لیا جائے مگر یہ صورتِ حالات جو محض عارضی ہے ضرور بدلے گی اور اردو زبان اپنی ضرورت منوائے بغیر نہ رہے گی اور پھر یہ کہنے کی بھی کسی کو جرأت یا ضرورت نہ ہوگی کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے بلکہ ایک مرتبہ اور یہ ماننا پڑے گا کہ یہ ہندوستانیوں کی زبان ہے جن میں مسلمان بھی شامل ہیں۔ اُردو کے سر یہ الزام کہ یہ مسلمانوں کی زبان ہے زیادہ تر اس تعصب پر مبنی ہے جو اُردو کے ان لفظوں کے ساتھ برتا جا رہا ہے جو عربی النسل یا فارسی الاصل ہیں اگرچہ اُردو میں ہندوستان کی اور قدیم زبانوں کے علاوہ عربی، فارسی، ترکی، پرتگالی، فرانسیسی، انگریزی اور دوسری زبانوں کے لفظ بھی شامل ہیں مگر چونکہ عرب اور فارس سے آئے ہوئے لوگوں کا اثر ہندستان اور ہندستانی زبان پر فرانس، پرتگال، انگلستان اور دوسرے ممالک سے آئے ہوئے لوگوں کی بہ نسبت زیادہ اور زیادہ مدت تک رہا اس لئے ان لوگوں کی زبانوں کے مقابلے میں عربی اور فارسی زبانوں کا اثر بھی ہندوستان کی عام زبان یعنی اُردو پر زیادہ پڑا۔ پچھلے کچھ سالوں کا یہ رجحان کہ ہندستان کی عام زبان ایسی ہو کہ اس میں بیرونی زبانوں کے لفظ کم اور مقامی زبانوں کے لفظ زیادہ کئے جائیں بہت مضر اثرات پیدا کر چکا ہے۔ واقعات نے یہ ظاہر کر دیا کہ بیرونی زبانوں سے مراد صرف عربی و فارسی لی گئیں اور مقامی زبانوں میں لے دے کے ایک سنسکرت کو پیش کیا گیا اور اس اقدام کو مبنی بر صداقت ثابت کرنے کے لئے ایک دور از کار اور بہت ہی بحث طلب دعویٰ یہ پیش کر دیا گیا کہ ہندستان کی تمام صوبائی یا مقامی بولیاں سنسکرت کی اولاد ہیں۔ اس اقدام اور اس دعویٰ کا سب سے زیادہ پرچار ——— زیادہ کیا بلکہ سارا پرچار صرف ان لوگوں کی طرف سے ہوا جو کسی نہ کسی طرح انڈین نیشنل کانگرس سے وابستہ رہے ہیں۔ یعنی یا تو وہ جو کانگرس کے خادم یا وہ کہ کانگرس جن کی زرخرید فرمانبردار! بہر حال ان پچھلے سالوں کے رجحان کو تقویت دینے کی ذمہ داری کانگرس ہی کے سر رکھی جاتی ہے اور اسی لئے اُردو والے اس نام نہاد انڈین نیشنل کانگرس کے انڈین (یعنی ہندستانی) اور نیشنل (یعنی قومی) ہونے پر بھی شبہہ کرنے لگے اور یہ بات ایسی عام ہوگئی ہے کہ جب کبھی کسی ایسے شخص کی زبان سے جو کانگرس سے کسی قسم کا رشتہ رکھتا ہو اُردو کے ایسے لفظ سننے میں آتے ہیں تو لوگ اُن کو بڑی اہمیت دے کر تعجب (اور شاید کسی قدر مسرت) کے ساتھ دوسروں کو سناتے ہیں۔ حالانکہ اُردو کے مخالفین کی سب سے بڑی دلچسپ ستم ظریفی یہی ہے کہ جب کبھی کوئی مؤثر تقریر کرنی ہوتی ہے یا کوئی اثر آفریں بیان شائع کرنا ہوتا ہے تو زبان اُردو ہی استعمال کی جاتی ہے ——— ستم ظریفی اور بڑھ جاتی ہے جب ایسی تقریر یا بیان کا مقصد اُردو ہی کی مخالفت ہو ——— بہر حال کانگرس کی طرف سے ایک عام بدظنی کا ایک یہ مظاہرہ بھی ہوا کہ بمبئی کرانیکل کے ایک نامہ نگار نے یہ انکشاف کیا اور اُردو اخباروں نے بھی اس کی خوب تشہیر کی کہ کانگرس کے حالیہ جلسہ (بمبئی) میں تقریر کرتے ہوئے گاندھی جی نے حسبِ ذیل لفظ استعمال کئے :-

تعجب ——— صدمہ ——— کفّارہ ——— بہتر ——— موقع ——— طاقت

ہدایتیں ——— شروع ——— اعتبار ——— ہضم ——— شخص ——— امین

امتحان ـــــ ادب ـــــ دعوے ـــــ وغیرہ

(بمبئی کرانیکل - ۱۶ اگست ۱۹۴۲ء)

نیز یہ کہ "اسی جلسے میں جب بندے ماترم گایا گیا تو حاضرین کی افسردگی نزدور ہوئی - ایک اور بنگالی گیت گایا گیا جب بھی اُداسی چھائی رہی البتہ جب اقبال کا مشہور ترانہ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

گایا گیا تو جلسے میں ایک نئی زندگی اور بشاشت کی لہر دوڑ گئی"۔ "اس ترانے کو گانے والے کوئی مسلمان یا صوبہ متحدہ کے باشندے نہیں بلکہ مہاراشٹر کے کرشن راؤ نامی ایک صاحب تھے" ـــــ اس ترانے میں یہ لفظ بھی آئے ہیں -

جہاں ـــــ گلشن ـــــ گلستاں ـــــ پاسباں ـــــ بلبل

جناں ـــــ رشک ـــــ مذہب ـــــ وطن ـــــ غربت

نام و نشاں ـــــ ہمسایہ ـــــ آسمان ـــــ آب رودِ گنگا ـــــ کارواں

ـــــ محرم اور درد نہاں وغیرہ

غرض "بمبئی کرانیکل" کے نامہ نگار کا انکشاف خوب ہے اور اُردو اخباروں کے تبصرے بھی حقیقت کو حقیقت ثابت کرتے ہیں اور واقعی اس دور میں ہر ہر لفظ کے لئے ایسے بیّن ثبوتوں کی ضرورت بھی بہت ہے مگر سچ پوچھئے تو یہ وہ لفظ ہیں جن کو ہندستانی ثابت کرنے کے لئے اتنی دُور کی کوڑی لانے کی کوئی ضرورت ہی نہ ہونی چاہئے تھی ـــــ

یہ بھی دیکھنا ہے کہ ملک کا سب سے زیادہ "پرچارو" ادارہ آل انڈیا ریڈیو ان لفظوں کو جائز ہندستانی مانتا ہے یا اب بھی ان کی جگہ کوئی اور ہندستانی "لفظوں کی کرید" "کھدیڑ" اور "رگید" ضروری سمجھتا ہے -

(علامہ برج موہن کیفی) "ہماری زبان"

ایک جدید عربی شاعر کا کلام

نوجوانوں سے خطاب

بوسیدہ اور کہنہ روایات کے خلاف پوری نفرت اور غصہ کے ساتھ بغاوت کرو

تقدیر تمہارا راستہ روکے تو اس پر بھی پل پڑو۔

جرأتِ مردانہ دل میں کر اپنے مقصد کی طرف یوں بڑھو

جیسے تم سیلاب ہو اُمنڈتے ہوئے دریا کے - یا جھکڑ ہو قیامت خیز ہواؤں کے

کامرانی صرف جیوٹ اور ہمت والے کو ملتی ہے۔

کمزور اور نامراد کے لئے تو تباہی ہے اور صرف تباہی -

اے بوڑھو تم رَن کے قابل کہاں ؟ تم پیچھے ہٹ جاؤ۔

اور اے جوانو - آگے بڑھو - آگے بڑھو - آگے بڑھو۔

آزاد ہو جاؤ عقیدوں کی ان تمام زنجیروں سے ۔

وہ عقیدے جو اندھیری رات کی طرح روشنی سے یکسر خالی ہیں۔

تعجب ہے کہ جو خرافات اور توہمات کو بے سوچے سمجھے مان لے وہ تو مومن ہے ؟

اور جوان کو شک کی نظروں سے دیکھنے کی جرأت کرے وہ کافر -

مرنے کے بعد بے سمجھ اور کودن تو جنت میں جائے

اور وہاں مزے اڑائے اور غور و فکر کرنے والا آگ میں جلے۔

محبِّ وطن

یہ شخص وطن کو آزاد کرانا چاہتا ہے۔

اور اس کے لئے ہر کوشش کرنے کو تیار ہے۔

جلاوطنی - قید و بند اور پھانسی پہ لٹکنا

یہ سب تعزیریں اور سختیاں اُس کے لئے آسان ہیں

(زہاوی) "کتاب"

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۳۶۴

قواعد

۱ - "ہمایوں" ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے ؂

۲ - علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اُتریں درج کئے جاتے ہیں - مسودے کا نہایت صاف اور خوش خط ہونا مضامین کی قبولیت کی پہلی شرط ہے ؂

۳ - دِل آزار تنقیدیں، دل شکن مذہبی مضامین اور خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے ؂

۴ - جواب طلب امُور کے لئے اپنا پتا لکھ کر جوابی کارڈ، اور مضامین کے ساتھ اُن کی رسید کی اطّلاع یا واپسی کے لئے اپنا پتا لکھ کر ٹکٹ لگا لفافہ بھیجنا بہت ضروری ہے - بصُورتِ دیگر دفترِ "ہمایُوں" خط و کتابت کا ذمّہ دار نہ ہوگا اور ناقابلِ اشاعت مضامین بیرنگ واپس کر دیئے جائیں گے ؂

۵ - "ہمایُوں" کے نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر مہینے کی پانچویں تاریخ کے بعد اور پندرھویں سے پہلے پہنچ جانی چاہئے - اِس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ صرف قیمتًہ مِل سکتا ہے ؂

۶ - منی آرڈر اور خط و کتابت میں خریداروں کو اپنے پتے کے ساتھ اپنا خریداری نمبر جو چِٹ پر پتے کے اُوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھنا چاہئے - بصُورتِ دیگر تعمیل مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گی ؂

۷ - چندہ سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصُول ڈاک)، قیمت فی پرچہ آٹھ آنے ؂

مینیجر "ہمایُوں"

۳۲ - لارنس روڈ - لاہور